

بِسلسلہ دفاع ناموس انبیاء عظام و صحابہ کرامؓ

امام طبری کون؟

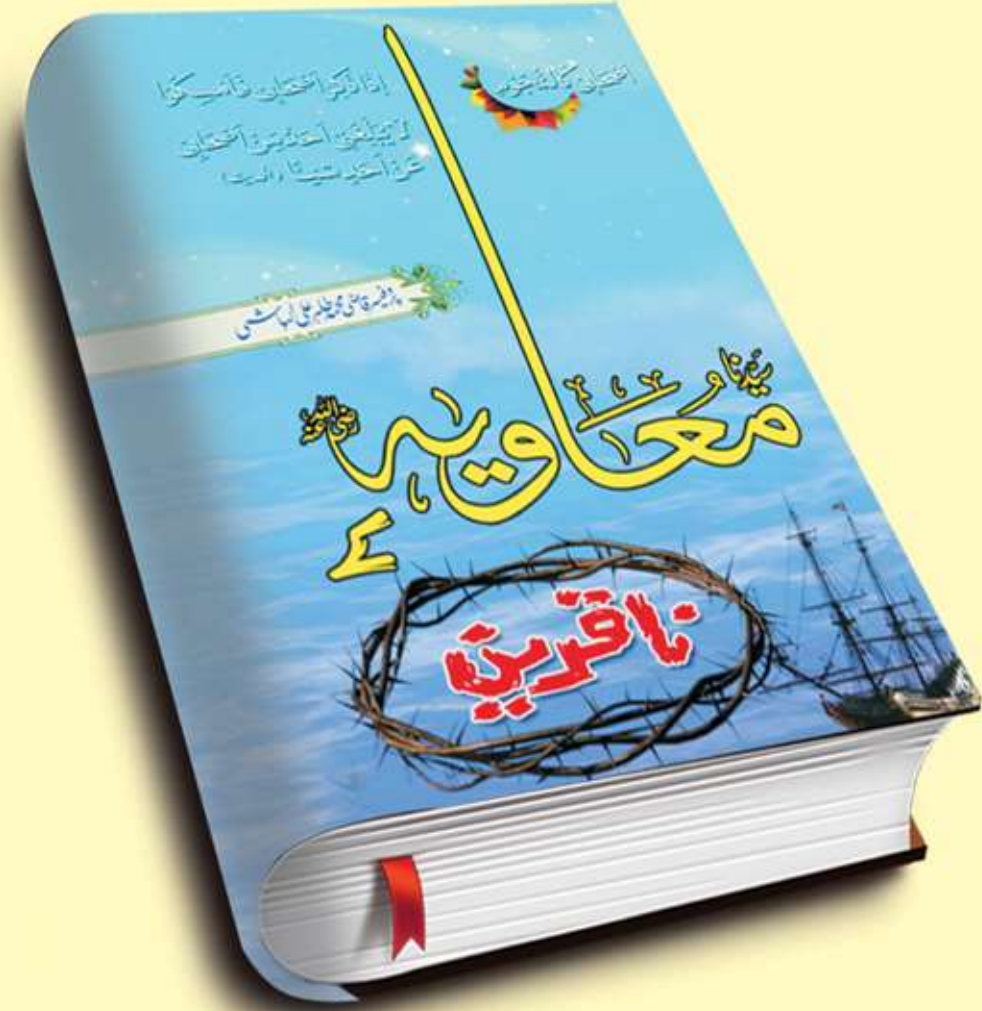
مؤرخ مجتہد یا افسانہ سَن

پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی

امام طبری

مؤرخ مجتہد یا افسانہ سَن

پروفیسر قاضی
محمد طاہر علی الہاشمی



قاضی چن پیر الہاشمی اکیڈمی
سیدنا معاویہؓ چوک حویلیاں ایبٹ آباد



لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كَرِهُونَ ۝ (الزخرف: ۷۸)
بے شک ہم لے آئے تمہارے پاس حق لیکن تم میں سے اکثر حق سے نفرت کرنے والے تھے۔

امام طبری کون مورخ، مجتہد یا افسانہ ساز؟

پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی

﴿جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں﴾

کتاب: امام طبری کون _____ مورخ، مجتہد یا افسانہ ساز؟
پروف شدہ
مؤلف: پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی
طبع اول: شعبان 1437ھ / مئی 2016ء
صفحات: 832
کمپوزنگ: محمد صابر حیدری / محمد اعجاز خان بہادر
0321-2000571
ناشر: قاضی چن پیر الہاشمی اکیڈمی مرکزی جامع مسجد
سیدنا امیر معاویہؓ چوک حویلیاں - ہزارہ
نگران اشاعت: محمد صابر حیدری
0321-9814745
زیر تعاون: =/1200 روپے
طبع کا پتہ:
۱۔ قاضی چن پیر الہاشمی اکیڈمی -
مرکزی جامع مسجد سیدنا معاویہؓ چوک حویلیاں - ہزارہ
0313-5617873
0336-0546613
0347-3556811

انتساب

راقم الحروف اس ادنیٰ کاوش کو

انبیائے عظام علیہم السلام

اور

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

کے نام

بہمد عقیدت و احترام منسوب کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

دنیا میں احرام کے قائل ہیں جتنے لوگ
میں سب کو مانتا ہوں مگر مصطفیٰ کے بعد

در دل مسلم مقام مصطفیٰ است آموئے مازنام مصطفیٰ است
ہر یکے ازما غلام مصطفیٰ است ملت ما از نظام مصطفیٰ است

پروفیسر قاضی محمد طاہر علی البہاشی

خطیب مرکزی جامع مسجد

سیدنا معاویہؓ چوک حویلیاں - ہزارہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كُرْهُونَ (الزخرف: ۷۸)
بے شک ہم لے آئے تمہارے پاس حق لیکن تم میں سے اکثر حق سے نفرت کرنے
والے تھے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ
أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ... (النساء: ۱۳۵)

اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے انصاف پر کواہی دینے
والے محض اللہ کے لئے۔ چاہے کواہی دینا پڑے تمہیں اپنے نفسوں کے خلاف یا
اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف...

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا... (البجرات: ۶)
اے ایمان والو! اگر تمہیں کوئی فاسق خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا
کرو...

”عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم: کَفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ“
(صحیح مسلم - باب انہی عن الحدیث بکل ماسم - جلد ۱ - ص ۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
ارشاد فرمایا: کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لئے بس اتنی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی
سنائی بات بیان کرتا پھرے (اور اس کی تحقیق نہ کرے)

فہرست مضامین

نمبر شمار	نام مضمون	صفحہ نمبر
1	عرض مؤلف	12
2	ہمارے افسانہ ساز مؤرخین از - اوریا مقبول جان	43
3	علامہ طبری مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز از - محمد اسماعیل ریحان	47
4	احتیاط لازم ہے از - محمد اسماعیل ریحان	65
5	”خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے“ از - اوریا مقبول جان	79
6	ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید طبری (۲۲۳ھ - ۳۱۰ھ)	84
7	کیا ابن جریر طبری دوسھے؟	90
8	امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی	97
9	امام طبری کا دور	120
10	امام طبری اور ترقیہ	123
11	امام طبری اور شیعیت	126
12	تشیع عند المتقدمین	131
13	امام طبری اور عقیدہ موالات	139
14	امام طبری اور حدیث غدیر خم	142
15	رفض طبری پہ شہادت خوارزمی (م ۲۸۳ھ)	148
16	رفض طبری پہ شہادت سلیمان (م ۳۱۳ھ)	149
17	رفض طبری پہ شہادت ابو حنیان (م ۷۴۵ھ)	156
18	امام طبری اور آیت وضوء	158

19	امام طبری اور آیت مباہلہ	165
20	امام طبری اور آیت ولایت	173
21	امام طبری اور آیت مؤذۃ قرنی	179
22	امام طبری اور آیت تطہیر	184
23	امام طبری اور حدیث کساء	189
24	تاریخ طبری	194
25	زواۃ طبری	211
26	۱۔ شعیب بن ابراہیم الکوفی	212
27	۲۔ سیف بن عمر	214
28	۳۔ سلمۃ اللہ بن	216
29	۴۔ محمد بن اسحاق	217
30	۵۔ عبد الرحمن بن زید بن اسلم	218
31	۶۔ مقاسم بن سلیمان	220
32	۷۔ سدی کبیر	222
33	۸۔ سدی صغیر	224
34	۹۔ محمد بن السائب کلبی	226
35	۱۰۔ عطیہ العوفی الکوفی	229
36	۱۱۔ ابو جعفر لوط بن یحییٰ	232
37	۱۲۔ ہشام کلبی	234
38	۱۳۔ محمد بن عمرو اقدی	237
39	۱۴۔ محمد بن حمید رازی	239

امام طبری --- کون؟ فہرست مضامین

40	روایات طبری اور توہین صحابہؓ	242
41	روایات طبری اور توہین سیدنا معاویہؓ	251
42	سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت	268
43	مولانا اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ	276
44	مشاجرات صحابہؓ کا شرعی حکم	317
45	بلا تحقیق نقل روایت کا شرعی حکم	330
46	تفسیر الطبری	339
47	عقیدہ عصمت انبیاء علیہم السلام	354
48	اہل تشیع کا نظریہ عصمت	361
49	تفسیر طبری اور توہین انبیاء	365
50	تفسیر طبری اور توہین آدم علیہ السلام	370
51	توہین آدمؑ، منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت	386
52	تفسیر طبری اور توہین ابراہیم علیہ السلام	405
53	تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام	416
54	”نمر ہان“ رب سے کیا مراد ہے؟	426
55	”وَلَقَدْ هَمَمْتُ بِهِ ۖ وَهَمَّ بِهَا“ اور تفسیر طبری	431
56	آیت: ”وَلَمْ أَخْنُهَا بِالْغَيْبِ“ اور تفسیر طبری	459
57	حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی پر گواہیاں	469
58	۱۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا بیان	470
59	۲۔ زوجہ عزیز کا اعتراف	471
60	۳۔ عزیز مصر کا بیان	472

امام طبری --- کون؟ فہرست مضامین

61	۴۔ شاہد کا بیان	473
62	۵۔ زمان مصر کا بیان	475
63	۶۔ اللہ تعالیٰ کی گواہی	476
64	۷۔ بللیس کا اعتراف	477
65	امام طبری کی ”زانی“ گواہی	478
66	بیوہ عزیز سے حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح	484
67	تفسیر طبری اور توہین حضرت داؤد علیہ السلام	498
68	تفسیر طبری اور توہین سلیمان علیہ السلام	516
69	تفسیر طبری اور توہین سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم	524
70	افسانہ غرائیق	525
71	”شیطان آیت“ مؤلفہ سلمان رشدی	539
72	افسانہ غرائیق اور مستشرقین	542
73	روایات غرائیق میں تضادات	550
74	روایات غرائیق کی استنادی حیثیت	554
75	افسانہ غرائیق کا قرآن عزیز سے تصادم	559
76	افسانہ غرائیق، علمائے اسلام کی نگاہ میں	568
77	۱۔ امام ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ)	569
78	۲۔ امام ابن حزم اندلسی الظاہری (م ۴۵۶ھ)	570
79	۳۔ امام بیہقی (م ۴۵۸ھ)	571
80	۴۔ قاضی ابوبکر ابن العربی (م ۵۴۳ھ)	572
81	۵۔ امام قاضی عیاض (م ۵۴۴ھ)	578

امام طبری --- کون؟ فہرست مضامین

82	۶۔ امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ)	582
83	۷۔ امام ابو عبد اللہ قرطبی (م ۶۷۱ھ)	583
84	۸۔ علامہ ابوالبرکات نسفی حنفی (م ۷۱۰ھ)	584
85	۹۔ علامہ خازن (م ۷۳۱ھ)	586
86	۱۰۔ امام ابو حیان اندلسی (م ۷۴۵ھ)	587
87	۱۱۔ امام ابن کثیر (م ۷۷۳ھ)	590
88	۱۲۔ علامہ کرمانی (م ۸۶۲ھ)	591
89	۱۳۔ علامہ بدر الدین عینی حنفی (م ۸۵۵ھ)	592
90	۱۴۔ علامہ قسطلانی (م ۹۲۳ھ)	594
91	۱۵۔ شیخ الاسلام امام ابوسعود (م ۹۸۲ھ)	595
92	۱۶۔ امام شوکانی (م ۱۲۵۰ھ)	596
93	۱۷۔ علامہ محمود آلوسی (م ۱۲۷۰ھ)	597
94	۱۸۔ مفتی محمد عبدہ (م ۱۳۲۳ھ)	600
95	۱۹۔ مفسر احمد مصطفیٰ المراغی (م ۱۳۶۳ھ)	602
96	۲۰۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء)	603
97	۲۱۔ شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان (۱۹۸۰ء)	606
98	۲۲۔ مفکر اسلام مولانا مفتی محمود (م ۱۳۰۰ھ/۱۹۸۰ء)	608
99	۲۳۔ مولانا امین احسن اصلاحی (۱۹۹۷ء)	610
100	۲۴۔ پیر سید محمد کرم شاہ ازہری (م ۱۳۱۸ھ/۱۹۹۸ء)	612
101	۲۵۔ علامہ ناصر الدین البانی (م ۱۳۴۰ھ/۱۹۹۹ء)	619
102	۲۶۔ علامہ غلام رسول سعیدی (۱۳۳۷ھ/۲۰۱۶ء)	620

امام طبری --- کون؟ فہرست مضامین

103	۲۷۔ مولانا سلیم اللہ خان صدروف اہل تشیع پاکستان	623
104	افسانہ غرائیق، اہل تشیع کی نگاہ میں	627
105	شیعہ مفسر شیخ محسن علی نجفی	627
106	افسانہ غرائیق، قادیانیوں کی نگاہ میں	629
107	محمد علی لاہوری قادیانی (م ۱۹۵۱ء)	629
108	خلاصہ بحث افسانہ غرائیق	633
109	افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟	637
110	تفسیر طبری اور قصہ زید و زینبؓ	653
111	قصہ زید و زینبؓ اور مستشرقین	681
112	قصہ زید و زینبؓ: روایت طبری کی استنادی حیثیت	690
113	قصہ زید و زینبؓ: روایت طبری کی درایتی حیثیت	696
114	قصہ زینبؓ علماء اسلام کی نگاہ میں	700
115	۱۔ قاضی ابوبکر ابن العربی (م ۵۳۳ھ)	701
116	۲۔ قاضی عیاض (م ۵۳۳ھ)	703
117	۳۔ امام ابو حیان اندلسی (م ۷۴۵ھ)	704
118	۴۔ امام ابن کثیر (م ۷۷۳ھ)	705
119	۵۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)	706
120	۶۔ علامہ محمود آلوسی (م ۱۲۷۰ھ)	707
121	۷۔ مولانا عبدالحق حقانی دہلوی (م ۱۳۳۵ھ)	708
122	۸۔ مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء)	710
123	۹۔ مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی (م ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء)	711

124	۱۰۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی (م ۱۹۷۳ء)	713
125	۱۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی (م ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۷ء)	715
126	۱۲۔ شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان (م ۱۳۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء)	716
127	۱۳۔ پیر سید محمد کرم شاہ ازہری (۱۳۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء)	717
128	۱۴۔ شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب	719
129	قصہ زینب: خلاصہ بحث	720
130	قصہ زینب اور جمہور مفسرین	723
131	جمہور مفسرین کے متضاد اقوال	734
132	کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کا اخفاء کیا تھا؟	753
133	کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے ڈرتے تھے؟	758
134	”وَسُخِّفَ فِي نَفْسِكَ...“ کا مخاطب کون؟	778
135	سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ	790
136	سیدہ ام ایمنؓ	794
137	سیدہ ام کلثومؓ بنت عقبہ	798
138	سیدہ ودعہؓ بنت ابی اہب	801
139	سیدہ زینبؓ بنت جحش	802
140	کیا حضرت زینبؓ ہی قصور وار ہیں؟	805
141	سیدہ زینبؓ بحیثیت ام المؤمنین	816
142	اختتامیہ	818
143	ماخذ، مصادر و مراجع	821
144	پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی کی دیگر علمی و تحقیقی کتب	832

عرض مؤلف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لأهله والصلوة على أهلها... أما بعد!

آزاد کشمیر کے ایک تبلیغی سفر سے واپسی پر محترم جناب محمد صابر حیدری نے پاکستان کے ایک نامور صحافی، پیکر حمیت اور جذبہ حب النبیؐ سے سرشار محترم جناب اوریا مقبول جان اور ”روزنامہ اسلام“ کے فاضل کالم نگار مولانا اسماعیل ریحان صاحب کے چند ”کالم“ برائے مطالعہ عنایت کئے جو زیر نظر کتاب ”امام طبری کون... مورخ، مجتہد یا افسانہ ساز؟“ کی تالیف کا باعث بن گئے۔ ان ”کالموں“ کو اگرچہ قارئین کے تقابلی مطالعہ کی خاطر روزنامہ ایکسپریس اور روزنامہ اسلام کے شکریہ کے ساتھ کتاب کا باقاعدہ حصہ تو بنادیا گیا ہے مگر یہاں اس سے مقصود صرف ایک ”اقتباس“ پر تبصرہ ہے۔

چنانچہ محترم اوریا مقبول جان صاحب رقم طراز ہیں:

”طبری عام مسلمانوں کی بات کرتا تو برداشت تھا لیکن اس نے تو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے بارے میں بھی دو عدد من گھڑت قصے اس قدر فضول اور بیہودہ انداز میں تحریر کئے ہیں کہ انہیں درج کرنے کی بھی ہمت نہیں پاتا۔ ان دونوں فضول قصوں کا نہ کہیں قرآن میں ذکر ہے اور نہ ہی احادیث کی کتابوں میں۔ لیکن طبری نے اپنے ذہن کی غلاظت کو تاریخ کی چاشنی بنا کر پیش کیا ہے۔“ (روزنامہ ایکسپریس۔ ۷ جولائی ۲۰۱۵ء، عنوان: ”ہمارے افسانہ ساز مؤرخین“)

”روزنامہ اسلام“ کے فاضل کالم نگار مولانا محمد اسماعیل ریحان صاحب کے استفسار پر ان دو ”بے ہودہ“ قصوں کی وضاحت کرتے ہوئے جناب اوریا مقبول جان صاحب لکھتے ہیں کہ:

”تاریخ طبری کے حوالے سے ایک قرض تھا، جو میں نے ادا کیا ہے۔ میں اسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دو گستاخانہ من گھڑت افسانے تخلیق کرنے کا مصنف سمجھتا ہوں،

جس کا ذکر نہ قرآن پاک میں اس طرح ہے نہ احادیث کی کتب میں، اور میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت کی وجہ سے طبری سے نفرت کرتا ہوں۔ ایک واقعہ حضرت زیدؓ کی سیدہ نعبہ سے طلاق کا، جسے کمال بے ہودگی سے اس نے تحریر کیا اور دوسرا واقعہ غرائیق۔ کسی معترض کا لم نگارہ اخبار نویس یا دانشور میں حوصلہ ہے تو صرف سیدہ نعبہ والا واقعہ پڑھ کر دیکھ لے اور اس کے باوجود جرات رکھتا ہے تو اسے من و عن اپنے کالم کی زینت بنا کر دکھا دے۔“ (بحوالہ روزنامہ اسلام ۹/ اگست ۲۰۱۵ء، روزنامہ ایکسپریس ۱۳/ جولائی ۲۰۱۵ء))

اس کے جواب میں روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار مولانا محمد اسماعیل رحمان صاحب نے پہلے پانچ اقتضا میں امام طبری کا بلند مقام متعین کرتے ہوئے انہیں ایک عظیم ”مفسر مجدد، فقیہ، مجتہد اور مؤرخ“ ثابت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: روزنامہ اسلام ۲۹۔ جولائی تا ۲۱ اگست ۲۰۱۵ء بہ عنوان: ”علامہ طبری.. مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز“۔

پھر اصل نفس مسئلہ ”قصہ غرائیق اور قصہ زید و نعبہ“ پر چار اقتضا میں اظہار خیال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: روزنامہ اسلام ۱۲ تا ۱۹ اگست ۲۰۱۵ء، تحت ”احتیاط لازم ہے“ متذکرہ ”۹“ کالموں کے جواب میں جناب اوریا مقبول جان صاحب نے ایک کالم سپرد قلم کیا ہے جس میں موصوف لکھتے ہیں:

”... دنیا کی ہر تاریخ جھوٹے اور کذاب راویوں کی روایتوں سے بھری پڑی ہے۔ کسی بھی مسلمان مؤرخ نے کبھی بھی اس معاملے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ میں نے اس سلسلے میں تاریخ طبری کا حوالہ خاص طور پر دیا تھا، کیونکہ یہ مغرب کے ان مصنفین کی محبوب کتاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں پر دشنام طرازی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں حوالے اسی قسم کی کتابوں سے ملتے ہیں۔ اس پر یار لوگوں نے ”طبری“ کے دفاع میں بہت کچھ لکھا اور میں نے جواب میں صرف یہ نوٹ تحریر کیا کہ ”طبری پر لکھنا میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کیونکہ دو واقعات ایک حضرت نعبہ اور حضرت زیدؓ کی طلاق اور دوسرا واقعہ ”غرائیق“ طبری نے جس انداز میں بیان کیا ہے کوئی انہیں کالم

میں لکھنے کی ہمت تو ایک طرف پڑھنے کی برداشت نہیں رکھتا۔ میری حیرت کی اس وقت انتہاء نہ رہی جب میرے سیکولر دوست تو میری اس وضاحت پر خاموش ہو گئے، لیکن چند علمائے امت اپنی تلواریں سونت کر مجھ پر پل پڑے۔ وہ لوگ جن کا دفاع میں صرف اللہ کی رضا کے لئے کرتا رہا ہوں۔ ان علماء نے طبری کا دفاع صرف اس لئے کیا کہ گذشتہ چند سو سالوں سے ان کے مدارس میں ”تفسیر جلالین“ پڑھائی جاتی ہے اور اس میں اس واقعہ غرائیق کا ذکر ہے، جس کا ماخذ طبری کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ میرا معاملہ نہ طبری سے پر خاش کا ہے اور نہ ہی بلاذری اور ابن سعد سے۔ میرا دکھ یہ ہے کہ جس کسی نے میرے سلاف پر انگلی اٹھائی ہو، میرے دین کے نقص بیان کرنا ہوں وہ ان مؤرخین کے جمع کئے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیتا ہے۔ الحاد کا دروازہ انہی کے جمع کئے گئے جھوٹ سے کھلتا ہے۔ آپ اسلام کے خلاف لکھی جانے والی تمام کتابوں کو اٹھا لیں، تو ہین رسالت پر مبنی کتب کا مطالعہ کریں اور ان میں کہیں نہ کہیں طبری اور اس کے قبیل کے مؤرخین جھانکتے نظر آئیں گے۔ وہ لوگ انہی کی روایات کو نبیا دینا دیتے ہیں۔

حیرت ہے وہ تمام ”شامین رسول اللہ“ تو ایسی باتیں تحریر کرنے پر واجب القتل قرار دیئے جاتے ہیں اور جس مؤرخ نے یہ جھوٹ اکٹھا کر کے تاریخ کا حصہ بنایا وہ محترم۔ پتہ نہیں کیوں میرے ان صاحبان علم علماء کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث یاد نہیں آتی کہ ”کسی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے آگے سنا تا پھرے۔ کی

ا ہمارے مؤرخین نے ایسا نہیں کیا؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی تاریخ مرتب کی جائے جو حدیث اور تاریخ کے راویوں کی چھان پھٹک کے بعد لکھی جائے۔“ (روزنامہ ایکسپریس ۴۔ ستمبر ۲۰۱۵ء بہ عنوان: ”خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے“)

سخت حیرت ہے کہ ایک عام اردو اور انگریزی خواں صحافی اور بیورو کریٹ پر ایک عالم دین اور اصل عربی مآخذ پر دسترس رکھنے والے کالم نگار کے ”مفصل اور مدلل“ کالموں کا ذرہ برابر بھی کوئی اثر نہ ہوا جبکہ دوسری طرف روزنامہ اسلام کے ”سرپرستوں“ سمیت ملک بھر کے ہم مسلک علماء امام طبری کے ”دفاع“ میں ان کے پیش کردہ ”دلائل“ پر عیش عیش

کراٹھے۔ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ آج ۲۲۔ رجب ۱۴۳۷ھ/ ۳۰۔ اپریل ۲۰۱۶ء یعنی آٹھ ماہ کے طویل عرصہ میں کوئی تردیدی مضمون یا ”اعتذار“ نظر سے نہیں گذرا۔

اور تعجب بالائے تعجب یہ کہ بھرپور اور پُر زور احتجاج کے باوجود روزنامہ اسلام کی ”انتظامیہ“ بھی ٹس سے مس نہ ہوئی اور اس پر کوئی ”سکوت“... طاری ہو گیا ورنہ ”عصمت انبیاء“ اور ناموس صحابہ کے بارے میں اس سے زیادہ ”حساس اور آگاہ“ اور کون ہو سکتا ہے؟

چاہئے تو یہ تھا کہ روزنامہ اسلام کے ”سرپرست“ ان کالموں کے متنازعہ مواد پر تحقیق اور غیر متعصب علماء کی ایک کمیٹی مقرر کرتے یا کم از کم ”روزنامہ اسلام“ میں ایک ”اعتذار“ ہی شائع کرا دیتے کیونکہ امام طبری کے منافی عصمت اور مبنی بر توہین مواد کے دفاع میں لکھے گئے کالم بھی تو آخر اسی روزنامے میں ہی شائع ہوئے تھے۔ اگر ”بفرض محال“ روزنامہ اسلام کے سرپرست اس ”زہریلے مواد“ سے ”بے خبر اور لاعلم“ تھے تو تحریری اور ٹیلی فونک احتجاج حتیٰ کہ مولانا تنویر الحقن احرار خطیب جامع مسجد ابو بکر صدیق تلمہ گنگ ضلع چکوال کی طرف سے ۶۔ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو ڈاک نمبر:

LN/IS 014, LN/IS 013, LN/IS 012 کے تحت بھیجے گئے ایک ”قانونی“ نوٹس بوساطت محمد عرفان الحق ایڈووکیٹ ہائی کورٹ بنام محمد اسماعیل ربیعان، انجینئر مولانا محمد افضل احمد خان ایڈیٹر، اور مفتی محمد زرین خان چیف ایڈیٹر و پبلشر روزنامہ اسلام، جس میں ہر سہ حضرات کالم نگار، ایڈیٹر و چیف ایڈیٹر سے گستاخانہ مواد کے دفاع و اشاعت پر ”روزنامہ اسلام“ کے ادارتی صفحہ پر تحریری طور پر معافی مانگنے کا مطالبہ کیا گیا، اس کے بعد تو کم از کم ضرور حرکت میں آجاتے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی ”مہرم“ میں کسی کی ”لا علمی اور بے خبری“ کو ”عذر“ تسلیم نہیں کیا جاتا اگر بالفرض اسے ”عذر“ کے طور پر قبول کر بھی لیا جائے تو پھر بھی روزنامہ اسلام کے سرپرست ہرگز ہرگز ”معدورین“ میں شامل نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ لوگ تو چاند کی ”ولادت“ سے بہت پہلے اس کی تاریخ ولادت اور وقت ولادت حتیٰ کہ ”دکھائی“ دینے کے وقت سے بھی آگاہ ہوتے ہیں۔ کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ روزنامہ اسلام کے ”سرپرست“

”تب سے اب تک“ بے خبر ہی رہے؟

”لا ریب“ مفتی محمد زرین خان صاحب اس شرعی و فتنی ”قاعدے“ سے بھی آگاہ ہیں کہ: ”التوبة على حسب الجنابة لمن كانت جهوراً فجهاً أو لمن كانت سرّاً فسرّاً“۔ نجانے اس ”شرعی قاعدے“ پر عمل کا وقت کب آئے گا؟

کیا ”استعداد“ نہ شائع کرنے اور طویل ”سکوت“ اختیار کرنے کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ روزنامہ اسلام کے سرپرست اپنے کالم نگار کے ساتھ کامل اتفاق رکھتے ہیں؟ یا پھر وہ کسی ”مصلحت“ کی خاطر سکوت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں کالم نگار کے اس حصے کے ساتھ بھی اتفاق ہے جس میں ”عشق رسالت“ کے تقاضے کے تحت اور یا صاحب کجلیل القدر عالم (طبری) کی توہین کے ارتکاب پر آخرت میں گرفت کا خوف دلاتے ہوئے ”اعلانیہ“ رجوع کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو: روزنامہ اسلام ۱۲/ اگست ۲۰۱۵ء۔ راقم الحروف بھی ”فاضل کالم نگار“ اور روزنامہ اسلام کی ”انتظامیہ“ کی خدمت میں یہی درخواست پیش کرتا ہے کہ منافی عصمت اور مبنی بر توہین روایات کی اشاعت اور ان کا ”دفاع“ کرنے پر ”شریعت کے اس حکم کے مطابق کہ جو غلطی علانیہ ہو اس سے رجوع بھی اعلانیہ ہونا چاہئے“ پر عمل پیرا ہو کر اپنی اسلام پسندی کا عملی مظاہرہ کریں۔

اس تناظر میں جب علمائے کرام کی ”سردہری“ کا یہ عالم ہے تو پھر جناب اور یا مقبول جان کو دینی غیرت و حمیت اور استقامت و ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنے پر بے ساختہ و بے اختیار خراج تحسین پیش کرنے کو جی چاہتا ہے جنہوں نے تمام ”مدلل“ جوابی کالم پڑھنے کے بعد ان سے متاثر یا مرعوب ہوئے بغیر واشگاف الفاظ میں اعلان برأت کیا ہے۔ اور یا صاحب نے تو امام طبری کی منقولہ سراسر منافی عصمت اور مبنی بر توہین قصے کو نقل کرنے سے گریز کرتے ہوئے نہایت ہی برا اعتماد انداز میں یہ لکھ دیا کہ:

”کسی معترض کالم نگار، اخبار نویس یا دانشور میں حوصلہ ہے تو صرف سیدہ نعتب والا واقعہ پڑھ کر دیکھ لے اور اس کے باوجود برأت رکھتا ہے تو اسے من و عن اپنے کالم کی زینت بنا کر دکھا دے“

موصوف کا اعتقاد اپنی جگہ درست تھا کہ کوئی کالم نگار، اخبار نویس یا دانشور پڑھنے کی ہمت کر سکتا ہے نہ ہی لکھنے کا حوصلہ۔ پاکستان میں موجود ہزاروں کالم نگاروں، اخبار نویسوں اور دانشوروں حتیٰ کہ سیکولر طبقہ نے بھی اس ”اعتقاد“ کو ٹھیس نہیں پہنچائی اور انہوں نے باقاعدہ اس اعتماد پر پورا اتر کر بھی دکھا دیا مگر صد افسوس کہ مولوی کالم نگار اور مولوی اخبار نویس نے مولویوں ہی کے اخبار ”روزنامہ اسلام“ میں یہ ”کالم“ سرانجام دے کر سیکولر طبقے کو بھی درطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اور یا مقبول جان کا چیلنج تو پڑھنے اور لکھنے کی حد تک ہی تھا مگر روزنامہ اسلام کے ”فاضل“ کالم نگار نے حضرت زید اور سیدہ زینب کا قصہ ”من وعین“ نقل کرنے کے بعد ”جواب آں غزل“ کے طور پر اٹا اور یا صاحب کو ہی چیلنج دے دیا کہ:

”قارئین! واقعہ میں من وعین نقل کر چکا ہوں۔ آپ نے پڑھ لیا ہے۔ اس میں کون سی بات ایسی ہے جسے بے ہودہ اور گستاخانہ کہا جائے اور طبری پر تو بین رسالت کا الزام عائد کیا جائے۔ کیا یہ بات معیوب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت کو جسے طلاق ملنے والی تھی اور سیرت و صورت، حسب و نسب ہر لحاظ سے اعلیٰ تھی، سہارا دینے کا سوچ رہے تھے۔۔۔ اسے عیب شمار کیا جائے گا یا اخلاق کی انتہاء۔ (حالانکہ طلاق کا ذکر تو بقول طبری نگاہ پڑنے اور ان کی محبت کے دل میں کھب جانے کے بعد آیا تھا۔ از مؤلف کتاب ہذا) یا یہ بات ناقابل یقین ہے کہ ایک دن سیدہ رضی اللہ عنہا دو پٹے کے بغیر گھر میں تشریف فرما تھیں؟ اگر ایسا تھا تو یہ کوئی محال بات نہیں۔ ایک گرم ملک میں، گھر کی تنہائی میں کوئی عورت کچھ دیر کے لیے اوڑھنی اتارے ہوئے ہو تو کیا اسلام میں اس پر پابندی ہے یا یہ اخلاق سے ماوراء حرکت ہے یا غیر محرم پر نگاہ رسالت کا اچانک پڑ جانا محال بات ہے؟ اس کا ذکر عصمہ انبیاء کے منافی اور اسے نقل کرنا تو بین رسالت ہے؟ یہ تو تب ہوتا جب انبیاء کرام بشری تقاضوں یا سہو سے مبرا ہوتے۔ اُمت کا کبھی بھی یہ عقیدہ نہیں رہا کہ پیغمبر اپنے تمام کمالات و امتیازات کے باوصف بشری خصوصیات سے بے نیاز ہوتے ہیں۔۔۔ اگر کوئی اصل عربی میں طبری کی روایت پڑھے شاید روایت کا یہ فقرہ سب سے زیادہ عجیب بلکہ سخت ناگوار محسوس

ہوگا۔ ”توقع اعجابها فی قلب النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی پسندیدگی آئی۔) ہم اپنی سطحی و جذباتی ذہنیت کی بناء پر کم از کم اس عبارت کو ضرور گستاخانہ قرار دے دیتے مگر کیا سمجھتے کہ خود اللہ کے فرمان کے مطابق یہ ناممکن بات نہیں۔ پیغمبر کے دل میں حسن کی پسندیدگی آجانے کے امکان کا ذکر خود خالق کائنات نے کیا ہے: ”لَا يَجِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدِ وَلَا أَنْ تَبْدُلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْبَدْتَ خُسْنُهُنَّ“ ان کے علاوہ اور عورتیں آپ کے لئے حلال نہیں ہیں اور نہ یہ درست ہے کہ آپ ان بیویوں کی جگہ دوسری بیویاں کر لیں اگرچہ آپ کو ان (دوسری عورتوں) کا حسن اچھا معلوم ہو (الاحزاب: ۵۲) طبری کی روایت میں صرف ”اعجاب“ (پسندیدگی) کا ذکر ہے۔ آیت میں زیادہ صراحت کے ساتھ ”اعجاب حسن“ (حسن کی پسندیدگی) کا لفظ ہے۔ اچھی چیز کا اچھا لگنا، ایک فطری بات ہے۔ قلب و نظر کے صحت مند ہونے کی علامت ہے۔ خوشبو ہر کسی کے مشام کو محسوس کرتی ہے اور اگر کسی کو نہیں محسوس ہوتی تو یہ خوبی نہیں، احساس کی کمزوری شمار ہوگی۔ پس اس روایت کو کس لحاظ سے گستاخانہ کہا جائے گا! ایک متاثر کن شخصیت سے متاثر ہونا کوئی انہونی بات ہو سکتی ہے؟ جمال اور بد صورتی میں فرق کر لیا اگر گناہ ہے تو ضرور روایت کو عصمت انبیاء کے مخالف قرار دیا جاسکتا ہے، اور اگر یہ کوئی گناہ نہیں بلکہ اللہ کی دی ہوئی ان فطری نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو کم و بیش ہر انسان کو نصیب ہے تو پھر اس واقعے کو تو بین رسالت پر مبنی قرار دے کر طبری کو گستاخ قرار دینا بھی غلط ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ طبری میں اس امکان کو واقعاتی شکل میں بیان کیا گیا ہے، یعنی ایسا ہوا تھا قرآن مجید میں امکان بیان کیا گیا ہے یعنی ایسا ہو سکتا ہے، یہ ذکر نہیں ہے کہ ایسا کبھی ہوا بھی تھا۔ (روزنامہ اسلام ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء)

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ موصوف کی متدل آیت کریمہ سے ”اعجاب حسن“ کا امکان بھی ثابت نہیں ہوتا۔ تفصیل زیر نظر کتاب میں اپنے مقام پر ملاحظہ فرمائیں۔
کیا کسی گناہ کا ”قصہ“ اور ”ارتکاب“ دونوں برابر قرار دیئے جاسکتے ہیں؟

انبیائے کرام تو خیر معصوم ہوتے ہیں، کیا کسی عام ”انسان“ کے بارے میں بھی یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ اس سے اس فعل کے صدور وارثکاب کا امکان پہلہذا وہ اس کا مرتکب بھی ہوا ہوگا۔ موصوف کے اپنے اعتراف کے مطابق قرآن میں اس کا امکان بیان کیا گیا ہے جبکہ طبری میں قورع۔ جامعہ الرشید کے مفتیان کرام سے درخواست ہے کہ وہ خود ہی آگے بڑھ کر ایسے ”مفتزیوں“ کے بارے میں کوئی فتویٰ جاری کریں جنہوں نے اس امکان کو ”قورع“ میں تبدیل کر ڈالا ہے۔

فاضل کالم نگار امام طبری کی واقدی سے منقولہ روایت کے بارے میں کہتے ہیں:

”واقدی کی روایت میں موجود ان چار زاہد اجزاء کو لے لیں تب بھی انصاف سے بتائیے کہ ان میں کون سی بات گستاخی والی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن سے متاثر ہونا ہی عجیب لگ سکتا ہے، مگر اعجاب حسن کے امکان کا ذکر خود قرآنی آیت میں ہے۔ اگر روایت کو گستاخانہ کہا جائے تو اس آیت کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ اور اگر آیت میں کوئی تاویل ہو سکتی ہے تو وہی اس روایت میں بھی مانی جاسکتی ہے۔ اگر قرآن مجید کی بات سچ ہے (اور کسی مسلمان کو اس کی صداقت میں شبہ نہیں ہو سکتا) تو جو کچھ روایت میں نقل ہوا وہ بھی نہ محال ہے نہ عصمتِ انبیاء کے منافی۔ (روزنامہ اسلام ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء)

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ موصوف کے بیان کردہ چار اجزاء میں سے کم از کم پہلی جزء کا واقدی کی روایت میں سرے سے ذکر ہی نہیں ہے جبکہ دوسرے جزء میں بھی واقدی کے الفاظ سے مطابقت نہیں پائی جاتی۔

فاضل کالم نگار قصہ زید و زینب کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

”یاد رہے کہ یہ واقعہ طبری سے پہلے سیرت نگاری کے امام محمد بن سعد نے طبقات الکبریٰ میں، مشہور محدث امام حاکم نیشاپوری نے اپنے شہرہ آفاق حدیثی مجموعے ”مستدرک حاکم“ میں، علامہ سیوطی نے تفسیر الدر المنثور میں، علامہ شربینی نے تفسیر السراج المبرور میں، علامہ حلبی نے سیرت حلبیہ میں بھی نقل کیا ہے۔“ (روزنامہ اسلام ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء)

اس عبارت سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارے بزرگ امام طبری سے پہلے

گزرے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ابن سعد کے سوانح کورہ بزرگ سب ہی طبری کے بعد آئے ہیں اور ان ہی کے خوشہ چین ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیا ان بزرگوں کے نقل کر دینے سے ایک جھوٹا اور من گھڑت قصہ صحیح سمجھ لیا جائے گا؟

اسی طرح موصوف نے اسی بحث میں نہایت ہی واشگاف الفاظ میں ایک قول کو علامہ آلوسی کی طرف منسوب کرتے ہوئے معترضین قصہ کو ایک ”انمول“ تاویل سے خاموش کرنے کی بھی کوشش فرمائی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”قریبی دور کے مامور محقق، فقیہ و مفسر علامہ آلوسی نے اپنی شاہکار تفسیر ”روح المعانی“ میں اس واقعے کو ذکر کر کے کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسا قصہ نقل کرنے سے احتراز ضروری ہے لیکن اگر یہ قصہ درست ہو تو اسے قلبی میلان پر محمول کیا جائے گا جو انسان کے بس میں نہیں۔ (روح المعانی: ج ۲۲ ص ۲۵) کفر یا گستاخی کا فتویٰ انہوں نے بھی کسی پر نہیں لگایا۔“ (روزنامہ اسلام ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء)

اس قول کو واضح طور پر علامہ آلوسی کی طرف منسوب کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ وہ تو ماقبل ہیں۔ اب اصل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

”وقی شرح المواقف أن هذه القصة مما يجب صيانة النبي صلى الله عليه وسلم عن مثله فان صحت فمیل القلب غیر مقلوب مع ما فيه من الابتلاء لهما...“
یہ قول علامہ آلوسی کا اپنا نہیں ہے بلکہ انہوں نے یہ بات ”شرح مواقف“ کے حوالے سے نقل فرمائی ہے۔ اور اس میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا ہے کہ ایسا قصہ نقل کرنے سے احتراز ضروری ہے۔ اگر درست ہوتا تو اسے نقل کرنے سے منع نہ کیا جاتا۔

فاضل کالم نگار نے جس قول کو علامہ آلوسی کا قول قرار دیا ہے وہ ان کا قول نہیں ہے۔ ان کا اپنا قول اور فیصلہ تو یہ ہے کہ: ”وللقصاص فی هذه القصة كلام لا ينبغي أن يجعل فی حيز القبول“ (روح المعانی الجزء الثاني والعشرون ص ۲۴)

قصہ کو اور داستان سرا لوگوں نے اس قصہ کے متعلق جو لچر باتیں اور افسانے تراش

رکھے ہیں وہ کسی حیثیت سے اس لائق نہیں کہ انہیں قبول کیا جائے۔

علامہ آلوسی کے اس فیصلہ سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ وہ اس قصہ کو ”قصہ کوہ داستان سرا“ کوکوں کا وضع کردہ اور لغو و باطل قرار دیتے ہوئے کسی ”تاویل“ کے ساتھ بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ سخت تعجب ہے کہ روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار نے جو بات علامہ آلوسی نے نہیں کہی وہ ان کی طرف منسوب کر دی اور جو فیصلہ انہوں نے سنایا تھا اسے نہ صرف یہ کہ نظر انداز کر دیا بلکہ غیر کے قول کو ان کا قول بنا کر راتے ہوئے اس پر یہ ”حکم“ بھی لگا دیا کہ ”کفر یا گستاخی کا فتویٰ انہوں نے بھی کسی پر نہیں لگایا۔“

موصوف اگر تھوڑا سا غور کر لیتے تو ”گستاخی“ کا فتویٰ انہیں اسی ”فیصلہ“ میں نظر آ سکتا تھا۔ کیا جس قصے کو علامہ آلوسی خود بے ہودہ و لغو اور باطل سمجھتے ہوئے کسی تاویل سے بھی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو اگر اس لہجہ اور بے ہودہ قصے کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا جائے تو کیا وہ اسے گستاخی نہیں قرار دیں گے؟ کیا ایک لہجہ اور بے ہودہ قصہ کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت بذات خود ایک گستاخانہ عمل نہیں ہے؟

بہر حال فاضل کالم نگار نے واقعی اور علامہ آلوسی کی طرف بعض باتیں غلط طور پر منسوب کر دیں جبکہ اس کے بارے میں خود موصوف کا اپنا فیصلہ یہ ہے کہ:

”غلط بیانی دشمن کے بارے میں بھی نہیں کرنی چاہئے اور اگر کوئی کرے تو ہمارا فرض ہے کہ حقیقت بیان کر دیں“ (روزنامہ اسلام ۳۰ جولائی ۲۰۱۵ء)

روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار لکھتے ہیں کہ:

”جہاں تک ”غرائق“ والے واقعے کا تعلق ہے، وہ اس سے بھی زیادہ مشہور ہے۔ کیلے طبری نے یہ روایت نقل نہیں کی... کیلے امام طبری پر نفی، اعتزال، روایت سازی اور توہین رسالت کا الزام کیوں؟ یہاں تو محدثین اور مفسرین کی پوری قطاران ”جرائم“ میں شریک ہے۔ قارئین! یہ بہت ہی سچی بات ہوگی کہ ہم چند کتابیں بلکہ چند اوراق پڑھ کر بڑے بڑے اماموں کے ایمان پر جرح شروع کر دیں... حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے مذکورہ واقعے

اور غرائق والی روایت پر محدثین اور محققین نے جرح بھی کی ہے، مگر بڑے سنجیدہ اور علمی انداز میں۔ روایتوں کو نقد و نظر کے معیار پر پرکھا ہے، روایت و درایت کے اصول پر ان کا جائزہ لیا ہے اور انہیں مسترد بھی کیا ہے، مگر کسی نے ان کے ناقل علماء کو گستاخ یا جعل ساز نہیں کہا۔ یہ براہ راست دوسروں کی نیت اور ایمان پر حملہ ہے اور اسلاف اس سے بہت احتیاط کرتے تھے... روایت سیدہ زینبؓ اور روایت غرائق جیسے درجنوں مسائل ہیں کہ مدارس دینیہ میں تفسیر، حدیث، عقائد اور فقہ کے پیریڈز میں ان پر روزانہ بحث ہورہی ہوتی ہے۔ کہیں کسی روایت پر سند کے لحاظ سے جرح ہورہی ہوتی ہے، کہیں کسی موقف کو روایت کی روشنی میں مسترد کیا جا رہا ہوتا ہے۔ کبھی امام شافعی پر بات ہورہی ہوتی ہے کبھی ابن ماجہ پر۔ کہیں شیخ البانی کی کسی تحقیق کی تردید پہلو کہیں ابن جریر اور علامہ شوکانی پر جرح، کہیں ابن تیمیہ کی کسی عبارت پر بحث پہلو کہیں ابن حجر اور حافظ زہبی کی آراء کا تقابل۔ مگر کہیں آپ یہ نہیں دیکھیں گے کہ اسلاف میں سے کسی کو گستاخ، کسی کو کافر، کسی کو وضع ساز، کسی کو کذاب اور کسی کو زندیق کہا جاتا ہو۔ درحقیقت مستشرقین اور ان کے تلامذہ منکرین حدیث کے فکری حملوں سے دفاع کا یہ طریقہ بہت ہی کمزور ہے کہ وہ جس روایت پر اشکال کریں، ہم اسے اپنے علمی ورثے سے خارج کرنے (کا) اعلان کر دیں۔ ایسی کون سی چیز ہے جو ان کج فہموں کے نزدیک قابل اعتراض نہیں۔ واقعہ زینب سے کہیں زیادہ زور و شور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعداد و ادراج پر اعتراض کیا جاتا ہے! اسے غلط رنگ دے کر آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت و پاکیزگی پر انگلی اٹھائی جاتی ہے، تو کیا اس کے جواب میں ہم ”امہات المؤمنین“ کا ذکر سیرت و تاریخ سے نکال دیں...“ (روزنامہ اسلام ۱۲/۱ اگست ۲۰۱۵ء)

موصوف قبل ازیں اپنے ایک دوسرے مضمون میں قصہ زینبؓ سے متعلق اور یا صاحب کی طبری پر تنقید کے حوالے سے یہ لکھ آئے ہیں کہ:

”کالم نگار (اور یا صاحب) ایک خطرناک ترین انکشاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: طبری عام مسلمانوں کی بات کرتا تو برداشت تھا...“ (ملاحظہ ہو: روزنامہ اسلام ۳۱ جولائی ۲۰۱۵ء)

موصوف نے اسے ”ظہریہ“ انداز میں خطرناک ترین قرار دیا ہے پھر اس کا ”ڈنگ“ نکال کر رکھ دیا ہے۔

روزنامہ اسلام کے ”فاضل“ کالم نگار کے مذکورہ اقتباسات سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے امام طبری کی قصہ زید و غرائق سے متعلق منقولہ سراسر منافی عصمت انبیاء و رتبہ برتوین روایات کا کس قدر دفاع کیا ہے؟ اس کی مفصل و مدلل وضاحت زیر نظر کتاب میں اپنے مقام پر ملاحظہ فرمائیں۔

ستم بالائے ستم یہ کہ موصوف نے امام طبری کی منافی عصمت اور کذب و افتراء پر مبنی روایت کو آیت قرآنی کے برابر قرار دے دیا ہے کہ:

”اگر روایت کو گستاخانہ کہا جائے تو اس آیت کا بھی انکار کرنا پڑے گا اگر آیت میں کوئی تاویل ہو سکتی ہے تو وہی اس روایت میں بھی مانی جاسکتی ہے۔ اگر قرآن مجید کی بات سچ ہے تو جو کچھ روایت میں نقل ہوا وہ بھی نہ محال ہے اور نہ ہی عصمت انبیاء کے منافی۔“ (روزنامہ اسلام ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء ”احتیاط لازم ہے“)

کیا ”روزنامہ اسلام“ کے سرپرستوں کو ”آیت و روایت“ کے مذکورہ تقابل میں بھی کوئی توہین و تحقیر نظر نہیں آئی؟ کیا ”تفکیرات“ کی خبریں قبل از وقت نشر کرنے والے روزنامہ اسلام کے داری صفحہ پر شائع ہونے والے اس توہین آمیز ”مواد“ سے بے خبر اور لاعلم رہے؟

کیا حضرت اقدس مفتی رشید احمد صاحب کی رحلت کے ساتھ ہی علمائے حق کا وہ عظیم کردار بھی رخصت ہو گیا ہے جو اس حدیث میں بتایا گیا ہے؟ کہ:

”يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلْفٍ عِلْوَهُ، يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِبِينَ وَ انْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ وَ تَاوِيلَ الْجَاهِلِينَ“ (مشکوٰۃ - کتاب العلم)

اس علم کو بعد کے آنے والے صاحبانِ عدل (نیک) لوگ اٹھائیں گے اور اسی علم سے حد سے گذر جانے والے تحریف باطل پرستوں کی افتراء پر دازی اور جاہلوں کی تاویل کو دہرائیں گے۔

کیا ”روزنامہ اسلام“ کے ”سرپرست“ اس ڈگر سے ہٹ نہیں گئے؟ کیا انہوں نے

روزنامہ اسلام میں ”تاریخ صحابہ اور راہِ اعتدال، ایک خط کا جواب، علامہ طبری... مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز، احتیاط لازم ہے“ کے نام سے شائع ہونے والے ”سولہ“ کالموں میں جاہلوں کی تاویلات، باطل پرستوں کی آمیزش اور غالیوں کی تحریف کو دہرایا ہے؟ یا انہیں تحفظ دیا ہے؟

کیا پیکرِ حمیت بانی جامعہ الرشید اور روزنامہ اسلام کے سرپرست اعلیٰ کی زندگی میں اس نوعیت کے مضامین کی اشاعت کا تصور بھی کیا جاسکتا تھا؟ روزنامہ اسلام میں ان کالموں کی اشاعت کے بعد اس بات کا شدید خدشہ ہے کہ روزنامہ اسلام کے ”سرنامہ“ کے عین نیچے لکھے گئے الفاظ ”بدعاء شیخ المشائخ...“ کہیں ”بدعاء شیخ المشائخ...“ میں نہ تبدیل ہو جائیں، شاید اسی لئے موجودہ انتظامیہ نے یہ الفاظ ہٹا دیئے ہیں کہ قارئین کی توجہ ”بدعاء یا بدعاء“ کی طرف مبذول ہی نہ ہو۔ ”الیس منکم رجل رشید؟“

روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار نے اپنے کالموں میں امام طبری و امثالہ کے ”ذیل صفائی“ کا کردار بخوبی نبھانے کے ساتھ ساتھ قارئین کو مغالطہ دینے کی بھی کوشش کی ہے کہ وہ اگرچہ ان روایات کی صحت کے قائل نہیں ہیں اور ان کا تعلق روایت کے مآخذین میں سے ہے۔ لیکن سخت حیرت ہے کہ اس ”ادعا“ کے باوصف قصہ نصب و غرائق سے متعلق امام طبری کی منقولہ روایات کو عصمت کے منافی اور مبنی برتوہین بھی نہیں سمجھتے۔

قارئین کرام! اس کی وضاحت تو کتاب کے اندر آ رہی ہے لیکن یہاں فاضل کالم نگار کے اس ”استفسار“ یا ”چیلنج“ کہ ”اس میں کون سی بے ہودگی ہے؟“ کے جواب میں امام ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید (سنی) الطبری صاحب ”جامع البیان فی تاویل القرآن“ و ”تاریخ الامم والملوک“ کی انبیاء کرام سے متعلق چند ایسی روایات پیش کی جا رہی ہیں کہ جنہیں پڑھ کر ایک مسلمان تو کجا بلکہ ایک شریف غیر مسلم انسان بھی پکاراٹھے گا کہ ”طبری نے اپنی ذہن کی غلاظت کو تاریخ کی ہی نہیں بلکہ تفسیر کی بھی چاشنی بنا کر پیش کیا ہے“۔

روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار امام طبری کی منافی عصمت اور مبنی برتوہین روایت کی ”صفائی“ پیش کرنے اور دفاع کرنے کی یہ وجہ بتاتے ہیں کہ:

”مجھے یہ روایت نقل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر صورت حال ایسی بن گئی کہ اسے نقل کرنا ناگزیر ہو گیا۔ خاموشی کی صورت میں نہ صرف طبری بلکہ جلالین پڑھنے پڑھانے والے بھی علماء و طلبہ اور اسلاف کی بہت سی نامی گرامی شخصیات پر کفر کی شدید ترین قسم یعنی توہین رسالت کا لیبل لگ رہا تھا۔ کچھ لوگ اسلاف کو بے ایمان اور گستاخ کہہ رہے تھے۔ اور کچھ لوگ دوسری انتہاء پر جا کر پوچھ رہے تھے کہ توہین رسالت پر سزا کیوں ہے جبکہ علماء خود اس کے مرتکب ہوتے آرہے ہیں اور انہیں کوئی سزا نہیں دی گئی۔ یہ مواد اخبارات اور سوشل میڈیا میں آکر عجیب بد مزگی پیدا کر رہا تھا، پس اظہار حقیقت کے لیے قلم حرکت میں لانا لازم تھا۔“ (روزنامہ اسلام ۹ اگست ۲۰۱۵ء)

”جواب آں غزل“ کے طور پر راقم الحروف کو بھی امام طبری و امثالہ کی منقولہ سراسر منافی عصمت انبیاء اور مبنی بر توہین روایات نقل کرنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن موصوف کا ایک طرف یہ چیلنج اور دھجی کہ ”انصاف کی بات یہ ہے کہ ان روایات میں کوئی بے ہودگی اور توہین و گستاخی نہیں پائی جاتی“ اور دوسری طرف صورتحال ہی کچھ ایسی بن گئی تھی کہ انہیں نقل کرنا ناگزیر ہو گیا۔ خاموشی کی صورت میں نہ صرف صحابہ کرامؓ پر بغاوت حتیٰ کہ کفر کا لیبل لگ رہا تھا بلکہ حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت یوسف، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ علیہم السلام پر العیاذ باللہ شرک کا ارتکاب، قدرت الہی میں شک، معبودان باطلہ کی تعریف، شیطان کا نبی کی صورت اختیار کر کے چالیس دن تک حکومت کرنا، شیطان کا انبیاء پر تصرف و تسلط اور بد اخلاقی کی غلیظ ترین اور شدید ترین قسم کے اثرات لگ رہے تھے جن کا تصور بے حیائی کے ”نائٹ کلبوں“ میں ہی کیا جاسکتا ہے۔

امام طبری و امثالہ کی منقولہ سراسر منافی عصمت انبیاء اور صحابہ کرام کی توہین پر مشتمل روایات کے دفاع میں باقاعدہ لنگر لنگوٹ کس کر اور قصد اُردھ حرکت میں لائے جانے والے ”قلم“ سے نکلنے والا مواد مسلمانان پاکستان کے قابل اعتماد اور قابل بھروسہ نیز اسلامی صحافت کے علم بردار اخبار ”روزنامہ اسلام“ کے ادارتی صفحات پر شائع ہو کر عجیب بد مزگی

پیدا کر رہا تھا اس لئے انبیاء کرام علیہم السلام کے دفاع اور ناموس صحابہؓ کے تحفظ اور ”کالم نگار“ اور روزنامہ اسلام کے ”سرپرستوں“ پر اتمام حجت کی خاطر ”نقل کفر، کفر نہ باشد“ کے اصول کے تحت چند روایات پیش کی جارہی ہیں۔ جبکہ فاضل کالم نگار نے منافی عصمت اور مبنی بر توہین بعض روایات کو ان کی صفائی پیش کرنے کی خاطر ہی نقل کیا ہے۔

اگر موصوف و امثالہ امام طبری کو امام المفسرین، محدث، فقیہ، مجتہد اور عظیم مؤرخ کے روپ میں پیش نہ کرتے تو ان روایات کو یہاں ہرگز نقل نہ کیا جاتا۔ اللہ ”علیہم السلام“ الصلور“ شاہد ہے کہ عقیدہ عصمت انبیاء کے تحفظ، احقاق حق، ابطال باطل اور مسلمانوں کو زنا و قہ و ملاحدہ کی وضع کردہ اور اسرائیلی روایات سے آگاہ کرنے کی خاطر انتہائی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے، بہتی و پیتی آنکھوں، دھڑکتے دل اور لرزتے دکانچے ہوئے قلم سے امام المفسرین، محدث، فقیہ و مجتہد کی تصنیف لطیف ام التفاسیر ”جامع البیان فی تادیل القرآن“ اور ”تاریخ الامم والملوک“ سے اشارتاً چند روایات کا حوالہ پوری امت مسلمہ سے معافی کی درخواست کے ساتھ رد یقارن کیا جاتا ہے تاکہ وہ آسانی یہ فیصلہ کر سکیں کہ ”امام طبری کون تھے؟ کیا مفسر، محدث، فقیہ، مجتہد اور قابل اعتماد مؤرخ تھے؟ یا فی الواقع افسانہ ساز یا اس سے بھی بڑھ کر کچھ اور ہی تھے۔ (یہ ملحوظ رہے کہ ”امام طبری“ سے متعلق یہ سوال ان کی منقولہ زنا و قہ و ملاحدہ کی وضع کردہ باطل اور اسرائیلی روایات کے پیش نظر کیا جا رہا ہے)

روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار کے ہر دلعزیز، محبوب اور ممدوح مؤرخ امام طبری نے حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زبیر، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت عمرو بن العاص، حضرت ابوسفیان، حضرت عباس بن عبدالمطلب اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کی توہین، تنقیص اور تحقیر (اصل عبارات و حوالہ جات کتاب میں ملاحظہ کریں) کے علاوہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر جابجا لعن طعن کے علاوہ ان کی تکفیر سے متعلق روایات بھی نقل کی ہیں۔

فقال سمرة: لعن الله معاوية، وتوفى جعفر في وسط خلافة معاوية لعنه

اللہ، وتوفی نوقل بالمدينة في خلافة يزيد بن معاوية لعنه الله، ان معاوية بن ابى سفيان ضالّ مضلّ، اذا رأيتم معاوية على منبري فاقتلوه، و ممّا استحق به اللعنة من الله و رسوله، ان معاوية في تابوت من نارقى أسفل درك منها والعنوا من لعنه الله و رسوله وقارقوا من لانتالين القرية من الله و رسوله ألا بمفارقة، اللهم العن أبا سفيان بن حرب و معاوية ابنه، اللهم العن ائمة الكفر وقادة الضلالة و أعداء الدين و مجاهدي الرسول و مغيري الاحكام و مبدلي الكتاب و سفاكي الدم الحرام، اللهم إنا نتبرأ اليك من موالاة أعدائك و من الاغماض لأهل معصيتك كما قلت: ”لا تجد قوما يؤمنون بالله واليوم الآخر يوادون من حاد الله و رسوله“

سمرقہ بن جندب نے کہا: اللہ معاویہ پر لعنت کرے، جعفر، معاویہ لعنہ اللہ کی خلافت کے درمیان میں فوت ہوئے، نوفل نے مدینہ میں یزید بن معاویہ (ان دونوں پر اللہ لعنت کرے) کی خلافت میں وفات پائی، معاویہ بن ابی سفیان یقیناً گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے، نبی اکرم کا ارشاد ہے کہ جب تم معاویہ کو میرے منبر پر دیکھو تو اس کو قتل کر دینا۔ آپ نے فرمایا معاویہ جہنم میں آگ کے صندوق میں ہے جو اس کے سب سے نیچے کے درجے میں ہے، مجملہ ان امور کے جن کی وجہ سے معاویہ اللہ اور اس کے رسول کی لعنت کا مستحق ہے۔ (کچھ اور امور بھی ہیں مثلاً قتل حجر بن عدی، ابن الحنفیہ، استحقاق زیاد و اختلاف یزید وغیرہ...)۔

”روزنامہ اسلام“ کے کالم نگار اور اخبار کے سرپرستوں کے مدد و حمایت امام طبری کا حضرت معاویہؓ پر لعن طعن سے ابھی دل سیر نہیں ہوا اور معلوم نہیں کہ وہ کس ”حال“ میں یہ بددعا نقل کر گئے کہ:

اور اس پر لعنت کرو جس پر اللہ و رسول نے لعنت کی، اس سے علیحدگی اختیار کرو جس سے علیحدگی کے بغیر تم اللہ کی قربت نہیں حاصل کر سکتے۔ اے اللہ لعنت کر ابو سفیان بن حرب اور اس کے بیٹے معاویہ پر... اے اللہ لعنت کر کفر کے اماموں، گمراہی کے پیشواؤں، دین کے دشمنوں، رسول سے لڑنے والوں، احکام میں تغیر کرنے والوں، کتاب کے بدلنے والوں

اور محترم خون بہانے والوں پر۔ اے اللہ ہم تیرے دشمنوں کی دوستی سے، تیرے گناہ گاروں سے چشم پوشی کرنے سے تیرے سامنے اپنی بے زاری ظاہر کرتے ہیں جیسا کہ تو نے کہا ہے کہ: ”تو کسی جماعت کو جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان لاتے ہیں ایسا نہ پائے گا کہ وہ ان لوگوں سے محبت کریں جو اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں۔“

تاریخ الامم والملوک میں صحابہ کرامؓ پر تبر، ان کی توہین و تنقیص کے بعد امام المفسرین جناب (سنی) طبری کی تفسیر سے انبیاء کرامؑ ہم السلام کی توہین کے چند اشارات ملاحظہ فرمائیں: امام طبری سورۃ الاعراف آیت ۱۹۰ کی تفسیر میں متعدد روایات نقل کرتے ہیں جن میں واضح طور پر یہ بتلایا گیا ہے کہ حضرت آدمؑ وحوئے نے شیطان کے حکم پر اپنے بیٹے کا نام شیطان کے نام پر عبدالحارث رکھا تھا اور اس طرح وہ دونوں ”یعنی آدم وحوئے“ شرک فی الطاعت کے مرتکب ہوئے۔

حضرت ابراہیمؑ کے دل میں شیطان نے شک ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے رب سے یہ سوال کیا کہ: ”زَبَّ اَرْنَى كَيْفَ تُخْبِي الْمَوْتَى“ یعنی احیاء موتی کے بارے میں شیطان نے قدرت الہی کے متعلق شک ڈالا تھا۔

امام طبری نے حضرت یوسفؑ کی شدید ترین توہین کرتے ہوئے ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهْمٌ بِهَا“ کے تحت ۱۹ روایات نقل کی ہیں۔ موصوف نے عزیر مصر کی بیوی ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ“ کا ”ہم“ (جو ”لام“ اور ”قد“ کی تائید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے) یہی بتلایا ہے کہ: ”استلقت له، استلقت علی قفاھا“

وہ عورت سارے دروازے بند کر کے یوسفؑ کے سامنے کمر کے بل سیدھی اور چٹ لیٹ گئی۔ زچہ عزیر کے ”ہم“ کے برعکس حضرت یوسفؑ (جن کا ہم بغیر تائید کے بیان ہوا ہے) کا ”ہم“ اور قصد و خیال جس انداز سے بیان کیا گیا ہے وہ اس عورت کے ”ہم“ سے کہیں زیادہ ہے:

”حتى رقی لها، ولم يتخوف منها، خلوفى بعض بيوتہ، حلّ الهميان، حلّ السرويل، نزع ثيابه، حلّ ثيابه أو ثيابها، جلس منها مجلس الخاتن، جلس منها مجلس الرجل من امرأته، جلس بين رجلها، قعد بين رجلها...“

یوسفؑ اس عورت کے لئے نرم و مائل ہو گئے، انہوں نے اس سے کوئی خوف محسوس نہیں کیا، اس کی

خلوت گاہ میں چلے گئے، ازار بند کھولا، شلوار اتار دی، اپنے کپڑے اتارے یا اس عورت کے بھی کپڑے اتارے، اس عورت کی ”مجلس خاتن“ کی جگہ بیٹھ گئے۔ (اگر اب بھی کوئی یوسفؑ کے ”ہم“ قصد و خیال کو نہ سمجھا ہو تو امام طبری اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:)

یوسف زوجہ عزیز کے اس مقام پر بیٹھ گئے جہاں ایک مرد اپنی بیوی سے جماع کرتے وقت بیٹھتا ہے، یوسفؑ اس عورت کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھ گئے۔۔۔

امام طبری تقریباً تمام ہی روایات میں حضرت یوسفؑ کے متعلق مذکورہ الفاظ کی ”گردان“ پڑھتے اور لکھتے رہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ وہ اس: ”هَمْ“ یوسفؑ کو صحیح سمجھ کر نقل کرتے رہے۔ انہوں نے کسی نشے اور مدہوشی کی حالت میں مذکورہ خرافات نقل نہیں کیں بلکہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اور یہ جاننے ہوئے کہ یہ ”یکواسات و خرافات“ ان کے قلم سے اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام کے بارے میں لکھے جا رہے ہیں:

”فان قال قائل: وكيف يجوز أن يوصف يوسف بمثل هذا وهو لله نبي؟“

پھر اس کے بعد دلائل کے ساتھ بتایا کہ اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے بندوں کو آزماتے رہتے ہیں۔ کیا امام طبری کی منقولہ مذکورہ روایات کے منافی عصمت اور مبنی بر توہین ہونے میں کوئی مسلمان ذرہ برابر بھی شک کر سکتا ہے؟

موصوف نے ”وَهَمْ بِهَا“ کے تحت جو مناظر پیش کئے ہیں ان کی موجودگی میں عقیدہ عصمت انبیاء کا کوئی معنی ہی باقی نہیں رہتا۔ سوال یہ ہے کہ امام طبری اور ان کے راویوں کو حضرت یوسفؑ کے ”هَمْ“ کے بارے میں کس نے آگاہ کیا ہے؟ حضرت یوسفؑ نے خود یا زوجہ عزیز نے؟ کیونکہ موقع پر تو کوئی تیسرا شخص موجود ہی نہیں تھا۔ سخت تعجب ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی تقریباً ۲۴۰۰ سال پہلے کے ایک واقعہ کے بارے میں یہ حضرات ٹامک ٹونیاں مار رہے ہیں جبکہ روزنامہ ”اسلام“ میں ان کا دفاع ہو رہا ہے۔

”روزنامہ اسلام“ کے کالم نگار لکھتے ہیں: ”مگر کسی نے ان کے مقلد علماء کو گستاخ یا جعل ساز نہیں کہا۔ یہ براہ راست دوسروں کی نیت اور ایمان پر حملہ ہے اور اسلاف اس سے

بہت احتیاط کرتے تھے۔ (روزنامہ اسلام ۱۱۔ اگست ۲۰۱۵ء)

کیا امام طبریؒ دامثالہ نے انبیاء کرام اور صحابہ کرام کی نیتوں پر براہ راست حملہ نہیں کیا؟ مگر اس کے باوجود امام طبری کا ”کلیجہ“ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا۔ انہوں نے ”وَهَمْ بِهَا“ کے تحت ”۱۹“ روایات نقل کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف انتہائی مکروہ انداز میں ”هَمْ سَوَء“ کی نسبت کی ہے پھر بعد میں واقعہ کے تمام متعلقین کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت کے اعلان کے بعد جب کوئی زمینی گواہ طبری کو دستیاب نہ ہو سکا تو انہوں نے جبریلؑ کی گواہی کی بناء پر حضرت یوسفؑ کو ”هَمْ سَوَء“ کا مرتکب قرار دے دیا۔ چنانچہ امام طبری سورہ یوسف آیت ۵۲ ”وَلَمْ أَخْنُ بِالْغَيْبِ“ کے تحت لکھتے ہیں:

جب یوسفؑ نے عزیز مصر کو یقین دلایا کہ میں نے ان کے پیچھے ان کی خیانت نہیں کی (”وَلَمْ أَخْنُ بِالْغَيْبِ“) فغمزہ جبریل فقال: ولا حين هممت بها، فقال يوسف وعا ابْرِي تَفْسِي... قال له جبريل: اذكر همك... ولا حين حلت سرويلك... تو جبریل نے یوسفؑ کو ٹوکتے ہوئے اور ہاتھ سے ٹھوکا لگاتے ہوئے اور خلوت گاہ کا منظر یاد کراتے ہوئے کہا کہ کیا اس دن تم نے خیانت نہیں کی تھی جب اس عورت نے تیرے ساتھ برائی کا ارادہ کر لیا تھا اور تم نے بھی اس کے ساتھ ایسا ہی ارادہ کیا تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کیا تم نے اس وقت خیانت نہیں کی تھی جب تم نے اپنی شلوار بھی اتار دی تھی؟ اعلیٰ ذہن اللہ

امام طبری سورہ ”صن“ آیت ۲۱ کے تحت حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: حضرت داؤدؑ نے ایک مرتبہ اپنے محل کی چھت پر ٹپلنے کے دوران پڑوس میں ایک خوبصورت ترین عورت کو غسل کرتے ہوئے دیکھا تو وہ آپ کو پسند آ گئی پھر اس کے خاوند کو قتل کرانے کی نیت سے بارہا دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے بھیجا یہاں تک کہ وہ تیسری مرتبہ قتل ہو گیا تب اس کی بیوہ سے خود شادی کر لی۔

موصوف اسی سورہ کی آیت ۳۴ کی تفسیر میں سلیمان علیہ السلام کے متعلق لکھتے ہیں کہ: شیطان نے سلیمان کی انگوٹھی چیلے بہانے سے حاصل کر کے اس کو سمندر میں پھینک

دیا اور خود سلیمان کی شکل اختیار کر کے چالیس دن تک امور سلطنت انجام دیتا رہا۔
امام طبری نے سورۃ الحج کی آیت ۵۲ کے تحت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام دھر دیا کہ آپ نے سورۃ النجم کی تلاوت کے دوران مشرکوں کے معبودوں کی تعریف فرمائی تو مشرک بھی آپ کے ساتھ سجدہ میں گر گئے اور یہ شیطانی کلمات خود شیطان نے آپ کی زبان مبارک سے جاری کرائے تھے۔

اسی طرح امام طبری نے اپنی تفسیر اور تاریخ دونوں میں سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۷ کی تفسیر میں یہ لکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید کے گھر گئے مگر وہ موجود نہ تھے اور اس دوران ان کی بیوی سیدہ زینبؓ پر آپ کی نگاہ پڑ گئی تو ان کی محبت آپ کے دل میں کھب گئی۔
روزنامہ اسلام کے ”فاضل“ کالم نگار مولانا محمد اسماعیل رحمان نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق مؤخر الذکر دونوں قصوں کے متعلق لکھا کہ ان کے نقل کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ نہ یہ قصے منافی عصمت اور نبی بر تو ہیں ہیں اور نہ ہی ان کے مقلدین کو اسلام نے گستاخ قرار دیا ہے یا ان کے خلاف کوئی فتویٰ جاری کیا ہے۔

آئیے موصوف کے اس ”دعویٰ“ کو اسلاف کے اقوال کی روشنی میں جانچنے سے پہلے قصہ غرائق سے متعلق امام طبری کا موقف معلوم کر لیں:

امام طبری سورۃ الحج کی آیت ۵۲ کی تفسیر میں ۱۵ روایات لائے ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ: ”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دن کے وقت کھلے عام جب سورۃ النجم کی تلاوت فرما رہے تھے تو شیطان نے آپ کی تلاوت میں آپ کی زبان پر ”تلك الغرائيق العلی...“ کے شرکیہ کلمات جاری کر دیئے تھے۔ رات کو جب جبریلؑ نے آپ سے یہ کلمات سننے کو کہا: میں نے تو آپ کو یہ شرکیہ کلمات نہیں بتائے تھے۔ جس سے آپ سخت غمگین ہوئے اور فرمایا میں نے اللہ پر افتراء کر دیا ہے کہ جو کلمات اللہ نے نہیں بتائے تھے میں نے انہیں اللہ کی طرف منسوب کر کے پڑھ دیا۔

تفسیر طبری میں واضح طور پر یہ الفاظ آئے ہیں:

”ألقي عليه الشيطان كلمتين، فلما أُمسى أتاه جبريل، فعرض عليه السورة،

فلما بلغ الكلمتين التين ألقى عليه الشيطان، فقال: ما جئتك بهاتين، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: افتريت علي الله وقلت علي الله ما لم يقل...“
امام طبری نے قصہ غرائق سے متعلق منقولہ تمام روایات کے ذریعے یہ بات ثابت کی ہے کہ: شیطان نے بتوں کی تعریف پر مبنی کلمات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری کر دیئے تھے: ”ألقي عليه الشيطان كلمتين، ألقى الشيطان علي لسانه، فألقى الشيطان في أمنيته، فأجري الشيطان علي لسانه، فألقى الشيطان في تلاوة النبي صلى الله عليه وسلم: تلك الغرائيق العلی... إذا حدث ألقى الشيطان في حديثه“
اس کے بعد طبری کی روایات کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان کے القاء کردہ شرکیہ کلمات باقاعدہ اپنی زبان سے ابھری فرمائے اور جبریل کے سامنے بھی دہرائے۔ ”فكلم بهما، فجعل يتلوها فقرأها النبي صلى الله عليه وسلم بذلك، فعرض عليه (أي علي جبريل)۔

امام طبری نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین پر مبنی روایات، آپ پر شیطان کا تسلط، آپ کے کلام میں شیطان کے کلام کی آمیزش وغیرہ نقل ہی نہیں کیں بلکہ انہیں صحیح بھی تسلیم کیا۔ کیا کوئی مومن بالقرآن طبری کی منقولہ صریح توہین آمیز روایات کی کوئی تاویل کر سکتا ہے؟ یا انہیں ایک لمحہ کے لئے بھی صحیح تسلیم کر سکتا ہے؟

موصوف نے نہ صرف تفسیر میں بلکہ اپنی تاریخ میں بھی قصہ غرائق کو صحیح سمجھ کر نقل کیا ہے۔ ”روزنامہ اسلام“ کے فاضل کالم نگار مولانا اسماعیل نے قصہ غرائق کی تائید میں کتب کی ایک فہرست پیش کر کے یہ تاثر دیا ہے کہ اس سلسلے میں ”محدثین اور مفسرین کی ایک پوری قطاران ”جرائم“ میں شریک ہے“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ امام طبری و امثالہ کی عزت عزیز ہے۔ اس ”قطار“ پر بھی موصوف کا الزام ہے ورنہ ان میں سے اکثر نے اس واقعہ کو ردید کرنے کے لئے ہی نقل کیا ہے۔

صدافسوس! موصوف یہاں طبری کی محبت میں انصاف کا خون کر گئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت کے سراسر منافی، ایک من گھڑت و باطل قصہ کو رد کرنے کے بجائے کتب کی ایک طویل

فہرست دے کر ”روزنامہ اسلام“ کے قارئین کو نہ صرف تذبذب میں مبتلا کر گئے بلکہ ایک طرح اس کی توثیق بھی کر بیٹھے۔ اس کی تفصیل آگے کتاب میں متعلقہ مقام پر ملاحظہ فرمائیں۔

امام طبری کی قصہ غرائیق سے متعلق منقولہ ایک درجن سے زائد روایات ”چیچ چیچ“ کر کہہ رہی ہیں کہ شریک کلمات شیطان نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جاری کرائے۔ یہ چیز سراسر عصمت کے منافی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین پر مبنی ہے۔ یہ بات یقیناً باعث حیرت ہے کہ روزنامہ اسلام کے کالم نگار نے جس محنت شاقہ کے بعد قصہ غرائیق کی تائید میں کتب کی ایک طویل فہرست مرتب کی ہے معلوم نہیں کہ اس میں سلمان رشدی کی تالیف ”شیطانی آیات“ کا ذکر کرنا کیوں بھول گئے؟؟ حالانکہ رشدی نے قصہ غرائیق کی بناء پر ہی اپنی کتاب کا نام شیطانی آیات رکھا تھا۔

(THE SATANIC VERSES)

جہاں تک ”روزنامہ اسلام“ کے کالم نگار مولانا اسماعیل ریحان صاحب کی اس بات کا تعلق ہے کہ ”اسلاف میں سے کسی نے بھی اس روایت کی بناء پر فتویٰ نہیں لگایا“ امام ابن خزیمہؒ نے کہا قصہ غرائیق زندیق لوگوں کا وضع کردہ ہے۔

”هَذَا مِنْ وَضْعِ الزُّنَادِقَةِ“

امام ابن جزمؒ نے فرمایا کہ قصہ غرائیق سفید جھوٹ اور من گھڑت ہے۔

امام فخر الدین رازیؒ نے کہا کہ:

”أَمَّا أَهْلُ التَّحْقِيقِ فَقَدْ قَالُوا: هَذِهِ الرِّوَايَةُ بَاطِلَةٌ مَوْضُوعَةٌ... وَاحْتَجُّوا

عَلَيْهِ بِالْقُرْآنِ وَالسُّنَّةِ وَالْمَعْقُولِ... إِنَّ هَذِهِ الْقِصَّةَ بَاطِلَةٌ...“

محقق علماء کا فیصلہ ہے کہ یہ روایت جھوٹی اور باطل ہے اور گھڑی ہوئی ہے۔ یہ سارا قصہ ہی من گھڑت ہے۔

اس قصہ کی کوئی تاویل درست نہیں ہے۔ یہ روایت اپنی تمام تاویلات، احتمالات اور اختلاف الفاظ کے ساتھ مسترد کر دینے کے قابل ہے۔

علامہ محمود آلوسیؒ بحوالہ ابو منصور ماتریدی لکھتے ہیں کہ:

”تلك الغرائيقي العلي“ یہ ان باتوں میں سے ایک بات ہے جو شیطان اپنے زندیق پیروکاروں کے دلوں میں ڈالتا ہے تاکہ ضعیف الایمان لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کریں اور انہیں شک و بدگمانی میں مبتلا کریں اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کی روایتوں سے ہر اوجڑہ ہیں۔

علامہ آلوسیؒ نے قصہ غرائیق کو صحیح سمجھنے والوں کی تمام روایات کو بعیدہ، فاسدہ اور باطلہ قرار دینے کے بعد کیا ہی خوب کہا ہے کہ:

میری عمر کی قسم! اس روایت کے بارہ میں یہ بات مان لینا بہت آسان ہے کہ شیطان نے خود اس کو روایت کے راویوں کی زبان پر جاری کر دیا ہے بہ نسبت اس کے کہ یہ مان لیا جائے کہ شیطان مردود نے ان شریک کلمات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر القاء کر دیا تھا بعد میں اللہ تعالیٰ کو اس میں مداخلت کر کے منسوخ کرنا پڑا۔

علامہ آلوسیؒ امام طبری کی منقولہ روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اس باب میں انتہائی بدترین قول جو ہم نے دیکھا اور جس کا فساد ظاہر ہے ان لوگوں کا قول ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ان شریک کلمات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود آیتوں کے درمیان اس لئے داخل کر لیا تھا کہ آپؐ ان (مشرکوں) کے ایمان کے حریص تھے پھر آپؐ نے اس سے رجوع کر لیا تھا (طبری) ایسے قائلین پر تو بہ کرنا واجب ہے۔ بہت بڑی بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے جو سوائے جھوٹ کے کچھ نہیں کہتے۔

علامہ محمد الصادق امراہیم عرجون نے اپنی کتاب ”محمد رسول اللہ“ میں قصہ غرائیق کو موضوع اور ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ جن حضرات نے اسانید کی کمزوری کے باوجود اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ کثرت طرق اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ اس واقعہ کی کوئی ”اصل“ ہے۔ علامہ عرجون ان حضرات پر خوب بر سے ہیں بلکہ ”مولانا اسماعیل ریحان کی طرح“ وہ علماء جنہوں نے اس واقعہ کی صحت کا انکار کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ اگر بالفرض اس واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے تو

اس کی بی تاویل ممکن ہے۔ علامہ عربوں نے یہ ”چور“ دروازہ نکالنے والوں کا بھی خوب رد کیا ہے اور فرمایا کہ یہ قصہ زاول تا آخر جھوٹ ہے اس کی کوئی تاویل ممکن نہیں ہے۔

یہ ایک گھڑا ہوا افسانہ ہے جو ہر لحاظ سے باطل ہے۔ اول و آخر ایک خبیث جھوٹ ہے، یہ ایک کافرانہ جھوٹ ہے جسے گھڑنے والا یا تو کوئی احمق اور جاہل جوان ہے یا کوئی حاسد اور بے ایمان بوڑھا جو اسلام کا دشمن ہے یا کوئی فسادی منافق اور فاجر ہے اور یہ افسانہ اس کے دل میں شیطان مردود ڈالتا ہے۔

مشہور محدث مفسر مصطفیٰ المراقی مصری قصہ غرائیق کے متعلق لکھتے ہیں:

بعض زنا و قد و ملاحظہ نے اس آیت (الحج ۵۲) کی تفسیر میں ایسی جھوٹی احادیث کی آمیزش کی ہے کہ جن کا وجود کتب صحاح میں سے کسی کتاب میں بھی نہیں پایا جاتا۔ دین کے تمام اصول غرائیق کے قصے کو جھٹلاتے ہیں اور عقل سلیم بھی اس کے بطلان کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ پس علماء پر واجب و لازم ہے کہ وہ اس من گھڑت قصے کو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیں اور اس کی تاویل و تخریج میں اپنا وقت ضائع نہ کریں کیونکہ لفظ محدثین نے اس قصہ کے، اصول دین (جو ہر قسم کے ریب و شک سے پاک ہیں) سے متصادم ہونے کی بناء پر اس کے وضعی اور جھوٹا ہونے کو نص سے ثابت کیا ہے۔

مفکر اسلام مولانا مفتی محمود لکھتے ہیں کہ اس قصے کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہی شیطان کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکی تو آپ کے لائے ہوئے دین پر اعتماد کیوں کر ہوگا؟ لہذا صاحب جلالین کی یہ تفسیر لغو و فضول ہے۔

سخت تعجب ہے کہ روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار قصہ غرائیق کا تاویلات باطلہ، فاسدہ و بعیدہ کے ساتھ دفاع کر رہے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”امام بغوی نے واضح کیا ہے کہ اگر قصے کو مان بھی لیا جائے تو ظاہری مطلب نہیں لیا جائے گا جو عصمت انبیاء سے متعارض ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ”تلك الغرائيق العلي“ کے شرکیہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں شیطان نے کہے تھے، مشرکین کو وہم ہو گیا تھا

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرما رہے ہیں۔ (روزنامہ اسلام ۱۱ اگست ۲۰۱۵ء) قصہ غرائیق سے متعلق امام طبری کی روایات کا خلاصہ پیچھے گزر چکا ہے جنہیں تسلیم کر لینے سے نصوص قرآنیہ کی مخالفت لازم آتی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، عصمت اور عزت داغ دار ہوتی ہے۔ امام طبری کی خرافات پر امام بغوی کی اس باطل تاویل کا اطلاق بھی صحیح نہیں ہے کہ شرکیہ کلمات شیطان نے کہے تھے لیکن مشرکین نے وہم کی وجہ سے انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات سمجھ لیا۔

سخت تعجب ہے کہ امام بغوی کے بقول مشرکوں کو تو صرف وہم ہوا ہے مگر امام طبری کو ”یقین“ ہے کہ شرکیہ کلمات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ادا فرمائے ہیں جو شیطان نے آپ کی خواہش کے عین مطابق آپ پر القاء کئے تھے۔ اسی لئے امام طبری نے ”۱۵“ روایات نقل کی ہیں جن میں بہ بکرا بتایا گیا ہے کہ شیطان نے ہی یہ الفاظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر ڈالے تھے جس کا آپ نے جبریل علیہ السلام کے سامنے اعتراف بھی کیا تھا۔ اور یہ سب کچھ آپ کی اپنی تمنا اور خواہش کے مطابق ہوا تھا۔ العیاذ باللہ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے خلاف امام طبری کی منقولہ تمام روایات لغو، باطل اور ملاحظہ و زنا و قد کی وضع کردہ ہیں جو عصمت انبیاء کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی توہین پر بھی مبنی ہیں۔

حب صحابہ بعد گو اول بگو حب رسول
بغض صحابہ کفر است کیست گستاخ رسول
لہذا جو حضرات کسی بھی اعتبار سے، کسی بھی تاویل کی رو سے، کسی بھی درجے میں اور کسی بھی ”اصل“ کی بناء پر ”امام طبری“ کی منقولہ روایات کی صحت کے قائل ہیں یا ان کا ”دفاع“ کرتے ہیں تو وہ امام فخر الدین رازی اور علامہ سید محمود آلوسی کے مندرجہ ذیل فیصلے پر غور کر لیں۔ امام فخر الدین رازی ان لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں جو ”وَعَلَّمَ زَيْبًا“ کے تحت حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف فعل قبیح منسوب کرتے ہیں:

”هؤلاء الجهال الذين نسبوا إلى يوسف عليه السلام هذه الفضيحة إن كانوا من أتباع دين الله تعالى فليقبلوا شهادة الله تعالى على طهارته، وإن كانوا من أتباع إبليس وجنوده فليقبلوا شهادة إبليس على طهارته“ (التفسير الكبير جلد ۶ ص ۴۴۱)

یہ جاہل، جنہوں نے اس گندے عمل کو حضرت یوسفؑ کی طرف منسوب کیا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرمانبرداروں میں سے ہیں تو وہ اس امر میں یعنی یوسفؑ کی پاکدامنی پر اللہ تعالیٰ کی کواہی کو قبول کر لیں ”کہ یوسفؑ میرے مخلص بندے ہیں اور مخلص بندوں پر شیطان کا کوئی زور نہیں چل سکتا“ ”إِنَّ عِبَادِي لَأَشْكُرُ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا“ اور اگر وہ شیطان اور اس کے لشکروں کے پیروکار ہیں تو پھر وہ حضرت یوسفؑ علیہ السلام کی پاکدامنی پر ابلیس کی شہادت کو قبول کر لیں:

”فَبِعِزَّتِكَ لَا تُغَيِّرُهُمْ أَجْمَعِينَ ۚ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ ۝“ (ص ۸۲-۸۳)

”پس تیری عزت کی قسم! ضرور میں ان سب کو گمراہ کر دوں گا سوائے ان میں سے تیرے مخلص بندوں کے“ یعنی تیرے مخلص بندوں پر میرا کوئی دائرہ نہیں چلتا۔

کاش! مولانا اسماعیل ریحان صاحب اور روزنامہ اسلام کے ”سرپرست“ امام طبری و امثالہ کی تعظیم و تکریم کے بجائے ان عظیم ہستیوں کے احترام و تعظیم کو مقدم رکھتے جن کی رفعتیں اور عظمتیں قرآن کریم اور احادیث متواترہ سے ثابت ہیں۔

کاش! موصوف امام طبری و امثالہ کے مصنوعی ”تقدس“ کے دفاع کی خاطر انبیائے کرام علیہم السلام اور صحابہ عظام رضی اللہ عنہم کے منصوص تقدس و احترام کو داؤ پر نہ لگاتے۔ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں لاشعوری طور پر ”رفع صوت“ جیسا سوء ادب بھی ضبط اعمال کا موجب ہے تو اس سے بدرجہا بڑے اور بالقصد سوء ادب کے مرتکبین کا انجام بد کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ اعاذنا اللہ منہ۔

ہم ایمان بالرسول کے مکلف ہیں نہ کہ ایمان ”بالرواة والرجال والطہرین و امثالہم“ کے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ انبیائے کرام اور صحابہ عظام کی شخصیات امام طبری و

امثالہ سے زیادہ معظم ہیں۔ اگر کسی روایت سے ان کی شان میں حرف آتا ہو تو ہمارے ایمان کا تقاضا ہے کہ ایسی داستانوں کو زمین پر دے مارنا چاہئے نہ یہ کہ انہیں ”روزنامہ اسلام“ کے اداریہ صفحات کی زینت بنا دیا جائے۔

زیر نظر کتاب کی تالیف کے وقت ابتداء خیال تھا کہ محترم جناب اوریا مقبول جان صاحب نے جن دو واقعات کی نشاندہی کی تھی صرف انہیں ہی زیر بحث لایا جائے لیکن جوں جوں امام طبری کا مزید تعارف ان کی تفسیر و تاریخ کے ذریعے ہوتا گیا تو نئے نئے موضوعات و عنوانات سامنے آتے چلے گئے اور ہر مضمون خود ہی پکارنے لگا کہ ”جائیں جا است“۔

قوی امید ہے کہ قارئین کرام کو اس کتاب کے مطالعہ سے زیر بحث مسئلہ کے متعلق کامل سکون اور اطمینان قلب حاصل ہوگا۔ نیز انہیں حسب ذیل دو راستوں میں سے صحیح راستہ منتخب کرنے میں بھی ضرور مدد ملے گی:

۱۔ کیا وہ امام طبری یا ان کے راویوں کی وفاقیت پر انھما را وراعتا ذکر کے حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت یوسف، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور سید الانبیاء محمد مصطفیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلامات پر (العیاذ باللہ) شرک کے ارتکاب، قدرت الہی میں شک، معبودان باطلہ کی تعریف، شیطان کا نبی کی صورت اختیار کر کے چالیس دن تک حکومت کرنا، شیطان کا انبیاء علیہم السلام پر تسلط و تصرف اور بد اخلاقی کے غلیظ ترین اور شدید ترین قسم کے الزامات کا تصور کر سکتے ہیں؟

-----یا-----وہ-----

۲۔ منافی عصمت اور مبنی بر توہین روایات کو امام طبری و امثالہ اور ان کے راویوں کے ”سہو، خطا، اوراج، تدلیس، قصور فہم اور وجل پر محمول کر کے انبیائے عظام اور صحابہ کرامؓ کی عظمت، تقدس اور ناموس کو داغ دار ہونے سے بچاتے ہیں؟

مؤخر الذکر راستہ اختیار کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ منافی عصمت اور مبنی بر توہین واقعات انبیائے کرامؓ کی طرف منسوب کرنا یقیناً جرح اعمال کا باعث ہے لہذا سلامتی ایمان و نجات کی خاطر پہلے راستے کو چھوڑ دینا ضروری ہے۔ کیونکہ امت مسلمہ ایمان بالرجال و

الروایۃ کی مکلف نہیں ہے بلکہ وہ ایمان بالرسول کی مکلف ہے۔

امام فخر الدین رازی نے کیا خوب فرمایا ہے:

واعلم أن بعض الحشوية روى عن النبي صلى الله عليه وسلم إنه قال :
”ما كذب إبراهيم عليه السلام إلا ثلاث كذبات“ فقلت الأولى أن لا نقبل مثل
هذه الأخبار فقار على طريق الاستحسان فإن لم نقبله لزمنا تكذيب الرواة فقلت له :
يا مسكين إن قبلناه لزمنا الحكم بتكذيب إبراهيم عليه السلام وإن ردناه لزمنا
الحكم بتكذيب الرواة ولا شك أن صون إبراهيم عليه السلام عن الكذب أولى من
صون طائفة من المجاهيل عن الكذب (التفسير الكبير جلد ۱۸ ص ۱۱۹)

یہ بات جان لو کہ ایک حشوی نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت نقل کی کہ ”ما کذب ابراہیم علیہ السلام الا ثلاث کذبات“ میں نے اس کو کہا: بہتر یہ ہے کہ ہم اس طرح کی روایات کو قبول نہ کریں تو وہ بہت ہلکا بھوکا کر کے لگا: اگر ہم اس کو قبول نہ کریں تو راویوں کی تکذیب لازم آئے گی! میں نے اس سے کہا: ارے مسکین! اگر ہم ان کو قبول کر لیں تو پھر ہمیں ابراہیم علیہ السلام کی طرف جھوٹ کی نسبت لازم آئے گی، اور اگر رو کریں تو راویوں کی طرف جھوٹ کی نسبت لازم آئے گی، اور اس میں کیا شک ہے کہ چند مجہول راویوں کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنا زیادہ بہتر ہے۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ زیر نظر کتاب کا مطالعہ پوری دل جمعی، کامل یکسوئی اور مکمل غور و فکر کے ساتھ غیر جانبدارانہ طور پر قرآن مجید کی درج ذیل آیات کریمہ کی روشنی میں کریں۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ لِيُقَسِّطَ لَكُمْ أَوْالِدَ الَّذِينَ آمَنُوا“ (النساء ۱۳۵)

اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے انصاف پر، کواہی دینے والے محض اللہ کے لئے۔ چاہے کواہی دینا پڑے تمہیں اپنے نفسوں کے خلاف یا اپنے والدین اور

قریبی رشتہ داروں کے خلاف۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ لِيُقَسِّطَ لَكُمْ أَوْالِدَ الَّذِينَ آمَنُوا“ (النساء ۸۵)

اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے اللہ کے لئے کواہی دینے والے انصاف کے ساتھ اور ہرگز نہ کسائے تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو یہی زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے۔

آخر میں ”ایڈیٹر“ روزنامہ اسلام انجینئر مولانا محمد افضل احمد خان اور ”چیف ایڈیٹر“ مفتی محمد زرین خان صاحب سے ایک ہی خواہ، ایک ہمدرد، ایک طالب علم، ایک مسلمان کی حیثیت سے اور سب سے بڑھ کر ”الدین النصیحة“ کے تحت پُر زور استدعا ہے کہ وہ اپنے روزمرہ کے اوقات میں سے اس ”دینی کام“ کے لئے بھی کم از کم اتنا وقت ضرورتاً نکال لیں جتنا وقت وہ دیگر ”سور“ کی انجام دہی کے لئے نکالتے ہیں۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ”روزنامہ اسلام“ میں تنازعہ مضامین کی اشاعت کی بناء پر یہ ان کی اولین ذمہ داری اور ایک شرعی و دینی و ”اسلامی“ فریضہ بھی ہے۔ بصورت دیگر عند اللہ و عند الناس ان کی ”فرد جرم“ میں ”تسابل وتغافل“ کی ایک شق کا مزید اضافہ بھی ہو جائے گا۔

بے باکی تنقید پہ ناخوش تو ہو لیکن
جب آئینہ دیکھو گے، ہمیں یاد کرو گے

اور
کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ
وگرنہ ایں مجال ما کجا بود

راقم الحروف مولانا محمد اسماعیل رحمان صاحب کے مضامین ”تاریخ صحابہ اور راوی اعتدال“ (پانچ اقساط۔ ملاحظہ ہو: روزنامہ اسلام ۲۲-۲۳-۲۶-۲۷-۲۸ جولائی ۲۰۱۵ء)، ”ایک خط اور اس کا جواب“ (دو اقساط: ملاحظہ ہو: روزنامہ اسلام ۲-۵ ستمبر ۲۰۱۵ء)، ”علامہ

امام طبری۔۔۔ کون؟

عرض مؤلف

طبری۔۔۔ مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز؟ (پانچ اقساط۔ ملاحظہ ہو: روزنامہ اسلام ۲۹ جولائی تا ۲ اگست ۲۰۱۵ء) اور ”احتیاط لازم ہے“ (چار قسطیں۔ ملاحظہ ہو: روزنامہ اسلام ۹ تا ۱۲ اگست ۲۰۱۵ء) کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد پورے شرح صدر کے ساتھ اس رائے پر قائم ہے کہ ان مضامین میں منافی عصمت انبیاء روایات کی ایک کونتا سید کے علاوہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تنقیص بھی پائی جاتی ہے (جو امام طبری کا مرغوب مشن ہے)

”روزنامہ اسلام“ (جو مسلمانان پاکستان کا بالعموم اور مسلک علمائے دیوبند کا بالخصوص ایک ترجمان اخبار ہے) میں ان متنازعہ مضامین کی اشاعت سے یقینی طور پر امت مسلمہ کے جذبات مجروح ہوئے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اس سے ”بغض معاویہ“ کا شکار ایک طبقہ ضرور ”مسروڑ“ ہوا ہے۔ لہذا روزنامہ اسلام کی ”انتظامیہ“ اور اس کے سرپرست اس تمام حوالے سے بری الذمہ قرار نہیں دیئے جاسکتے۔ اب یہ ان حضرات پر منحصر ہے کہ وہ اس بات کی ”علافی“ سے کس طرح عہدہ آہوتے ہیں۔

باری تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ غلطیوں اور لغزشوں کو معاف کرے، عقیدہ عصمت انبیاء کے تحفظ اور ناموس صحابہؓ کے دفاع میں اس حقیر کاوش کو شرف قبولیت بخشے ہوئے اسے امت مسلمہ کی اصلاح کا ذریعہ بنائے۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے اہل مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلا بل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

انظروا الی ما قال ولا تنظروا الی من قال۔ لن اخطأت فمنی ولن اصب فمّن اللہ
راقم الحروف اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے اس کا بہتر فیصلہ غیر متعصب، غیر جانب
دار حق کے متلاشی اور شخصیت پرستی کے شرک سے پاک، منصف مزاج اہل علم ہی کر سکتے ہیں۔
روزنامہ اسلام کے سرپرست حضرات راقم الحروف کی زیر نظر کتاب ”امام طبری کون؟

امام طبری۔۔۔ کون؟

عرض مؤلف

مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز؟ کو اپنے ”سکوتی فیصلہ“ پر ”نظر ثانی“ کی درخواست میں تبدیل کر کے
مجلس شوریٰ، اور دیگر ذمہ داران کے مشترکہ اجلاس میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور زیر غور لائیں۔

اثر کرے، نہ کرے سن تو لے میری فریاد

نہیں ہے داد کا طالب یہ بندہ آزاد

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ۔

الحمد لله على وضوح الحق، إن الحق لا يعرف بالرجال، وإن الرجال يعرفون
بالحق، لأن الحق هو معتبر دون الرجال، والحق أحق بالتباعد مما إذا بعد الحق
إلا الضلال قائم تصرفون۔

پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی

خطیب مرکزی جامع مسجد سیدنا معاویہؓ چوک حویلیاں ہزارہ

بروز ہفتہ ۲۲ رجب ۱۴۳۷ھ/۳۰ اپریل ۲۰۱۶ء

ہمارے افسانہ ساز مؤرخین

ایران کے دارالحکومت تہران کے ایک جانب بلند و بالا پہاڑ البرز کے اس پار ایک انتہائی خوبصورت خطہ ہے جسے مازندران کہتے ہیں۔ ماضی میں اسے طبرستان کہتے تھے۔ یہ خطہ انتہائی سرسبز ہے اور البرز پہاڑ سے کیسپین سمندر تک پھیلا ہوا ہے۔ کیسپین جسے ایرانی دریائے خذ کہتے ہیں، وسطی ایشیاء کے کئی ممالک کے درمیان ایک بہت بڑا جھیل نما سمندر ہے۔ یہاں سے بخارات اٹھتے ہیں، بادل بنتے ہیں، البرز کی بلندیوں سے ٹکراتے ہیں اور مازندران کے علاقے کو سرسبز و شاداب بناتے ہیں۔ کیسپین سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ ہر ملک نے ایک خوبصورت سڑک تعمیر کی ہے جس پر ہر چند کلو میٹر کے فاصلے پر سیر و تفریح کے لئے خوبصورت آبادیاں موجود ہیں۔ ایسی ہی ایک چھوٹی سی خوبصورت آبادی ”امول“ میں گیارہ سو سال قبل ۸۳۸ عیسوی میں مسلمانوں کی تاریخ مرتب کرنے والا ایک فرد پیدا ہوا۔ والدین نے اس کا نام محمد رکھا، اس کے والد کا نام جریر اور دادا کا نام یزید تھا، ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید۔ لیکن دنیا سے اپنے علاقے طبرستان کے حوالے سے الطبری کے طور پر جانتی ہے۔ اس نے سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا اور بارہ سال کی عمر میں اپنے گھر سے قصبہ ”رے“ موجودہ تہران میں مشہور مفسر الرازی سے درس لینے گیا۔ رازی اس وقت بہت ضعیف العمر ہو چکے تھے۔ تقریباً پانچ سال بعد وہ بغداد چلا گیا۔ وہاں امام احمد بن حنبل کا بہت شہرہ تھا۔ اسلامی تاریخ میں معتزلہ کے فتنے کے مقابلے میں جس قدر صعوبتیں اور تشدد امام احمد بن حنبل نے برداشت کیا اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ لیکن طبری کے بغداد پہنچنے سے پہلے ہی امام احمد بن حنبل خالق حقیقی سے جا ملے۔ طبری نے ان کے شاگردوں سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد شافعی مسلک کے استادوں سے بھی

پڑھا۔ اس کے بعد وہ شام، فلسطین اور مصر چلا گیا اور وہاں شیعہ اور اسماعیلی علماء سے کسب فیض کیا۔ طبری بغداد واپس آیا تو بغداد پر عباسی خلیفہ المعتضد کی حکومت تھی۔ اس وقت طبری کی عمر پچاس سال ہو چکی تھی۔ طبری دربار سے وابستہ تو نہ ہوا لیکن اس کے خیالات عباسی خلفاء کے معتزلی خیالات سے ہم آہنگ ہوتے چلے گئے اور پھر اس نے اپنی فقہ اور اپنے مسلک کی بنیاد رکھی جسے..... ”الجری“ کہا جاتا ہے۔ یہ مسلک اس کی موت کے فوراً بعد ہی دم توڑ گیا۔ اسلامی تاریخ میں امام احمد بن حنبل کا تمام مسالک میں احترام پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ مسئلہ خلق قرآن پر استقامت نہ دکھاتے تو آج اسلامی علم کی میراث ہی مختلف ہوتی۔ معتزلہ کے فتنہ پر داؤز قرآن کو مخلوق ثابت کرنا چاہتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر ایک دفعہ اس امت نے قرآن کو مخلوق مان لیا تو پھر جس طرح ہر مخلوق میں تبدیلی کی جاسکتی ہے ویسے قرآن میں بھی وقت اور حالات کے مطابق تبدیلی کی جاسکے گی۔

امام احمد بن حنبل کی بصیرت اور قربانی نے اس امت کو اس فتنے سے محفوظ رکھا۔ اسلامی تاریخ میں امام احمد بن حنبل کا واحد ناقداً و مخالف محمد بن جریر الطبری نظر آتا ہے۔ یہ اس قدر مخالف تھا کہ عباسی خلفاء کے دور میں لوگ نفرت کے طور پر گزرتے ہوئے اس کے گھر پر پتھر پھینکا کرتے تھے۔ لوگوں کی مخالفت اس قدر بڑھی کہ عباسی خلفاء نے ایسے لوگوں کو قید میں ڈالنا اور کوڑے مارنا شروع کر دیا جو طبری کو برا بھلا کہتے تھے۔ ۱۷۱/۱۸ فروری ۹۲۳ء کو وہ انتقال کر گیا اور عباسیوں نے اسے کسی خفیہ مقام پر دفن کر دیا تاکہ لوگ اس کی قبر کی بے حرمتی نہ کریں۔ ایران جیسے علاقے میں پیدا ہونے کے باوجود طبری کا رنگ کافی سیاہی مائل تھا، بڑی بڑی آنکھیں، لمبا قد، چھریا بدن، اس نے لمبی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ صحت کی حفاظت کے لئے گوشت اور چربی وغیرہ نہیں کھاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ موت تک اس کی داڑھی میں سفید بال نہیں آئے تھے۔ سال کی عمر میں اس نے اپنی مشہور اور متنازع ترین ”تاریخ الرسل والملوک“ لکھی۔ یہ وہ تاریخ ہے جس کے ستر مندرجات آج تک امت مسلمہ میں فتنہ و فساد اور فرقہ بندی و نفرت کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ اور مغرب کے سیکولر

انہیں ہتھیار بنا کر ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

طبری مغرب کے اسلام دشمنوں کا محبوب مؤرخ ہے۔ شروع شروع میں جب یورپ میں تحریک احیائے علوم شروع ہوئی تو عیسائی چرچ نے باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت اپنے زیر اثر کچھ مؤرخین کو اسلام کی تاریخ اور اسلامی کتب کے ترجمے کی ذمہ داری سونپی۔ انہوں نے سب سے پہلے الیگزینڈر پانگانی کا قرآن کا ترجمہ ۱۵۳۷ء میں شائع کیا۔ اس ترجمے میں جان بوجھ کر ایسی غلطیاں کیں جن سے قرآنی آیات کے مطالب بدل جاتے تھے۔ ترجمے کو ایک خاص مقصد کے تحت استنبول برد کیا گیا۔ پانگانی جب اسے لے کر خلیفہ کے پاس پہنچا تو وہ سخت غصے میں آگیا اور اس نے اسے تلف کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے تمام نسخے جلا دیئے گئے لیکن پھر بھی اس وقت دنیا میں اس تحریف شدہ قرآن کے آٹھ نسخے موجود ہیں جن میں سے دو برٹش میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس تحریف شدہ قرآنی ترجمے کے ساتھ ساتھ دوسری کتاب جو مغرب کے ان متعصب اور بد نیت لوگوں نے عیسائی چرچ کی سربراہی میں ترجمہ کر کے چھاپی وہ تاریخ طبری تھی۔

طبری کی تاریخ چھاپنے کی ایسی کیا ضرورت محسوس کی گئی۔ اس کے پیچھے کون سے ایسے مقاصد تھے۔ اس تاریخ میں ایسا کیا درج تھا کہ مغرب کے ان متعصب تاریخ دانوں کے ہاتھ میں آگیا اور پھر وہ آج تک اسلام اور مسلمانوں کو اپنا تختہ مشق بنائے ہوئے ہیں۔ طبری اور اس قبیل کے کئی مؤرخین ہیں جنہوں نے من گھڑت، جھوٹے اور یہودہ افسانوی قصوں کو مسلمانوں کی تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ ان قصوں کی نہ تو کوئی سند دیتے ہیں اور نہ ہی ان کے پاس ان کے ماخذ کا کوئی علم ہے۔ خود طبری نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے ”میں نے اس کتاب میں وہی کچھ لکھا ہے جو میں نے سنا ہے یا مجھے بتایا گیا ہے۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اس کتاب میں میں نے ماضی کے کسی آدمی یا واقعہ کا ذکر کیا ہے اور پڑھنے اور سننے والا اس کو قابلِ اعتراض یا تنقید و تردید کے قابل سمجھے تو یاد رہے کہ میں نے وہی کچھ لکھا ہے جو مجھے بتایا گیا ہے۔“ جس کتاب کو بازاری قصوں کی کتاب ہونا چاہئے تھی اسے مستند ترین تاریخ سمجھ کر یورپ نے پیش کیا۔ طبری

عام مسلمانوں کی بات کرتا تو برداشت تھا لیکن اس نے تو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے بارے میں بھی دو عدد من گھڑت قصے اس قدر فضول اور یہودہ انداز میں تحریر کئے ہیں کہ انہیں درج کرنے کی بھی ہمت نہیں پاتا۔ ان دونوں فضول قصوں کا نہ کہیں قرآن میں ذکر ہے اور نہ ہی احادیث کی کتابوں میں۔ لیکن طبری نے اپنے ذہن کی غلاظت کو تاریخ کی چاشنی بنا کر پیش کیا ہے۔ طبری کے تحریر کردہ قصوں کو ولیم میورسے لے کر میکس ویبر، جرجی زیدان، ٹنگمری واٹ اور موجودہ مؤرخین ایسے پیش کرتے ہیں جیسے اصل سچ یہی ہے۔ مقصد صرف مسلمانوں کی سب سے قابلِ احترام شخصیات کے بارے میں فتنہ کھڑا کرنا ہے۔ اس لئے کہ پوری تاریخ طبری صحابہ سے لے کر عباسی دور تک ایسے افسانوں سے بھری ہوئی ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے تمام افسانے من گھڑت قصے جن میں اختلاف کی بو آتی ہو، مسلمانوں کے کردار کی خرابی نظر آئے۔ سب طبری اور اسی قبیل کے مؤرخین کی ایجادات ہیں اور یہ مؤرخین مغرب اور اس کے سیکولر حواریوں کو بہت محبوب ہیں۔ گزشتہ چھ سو سال سے یہ مغربی مؤرخین اسلام پر کتابیں تحریر کر رہے ہیں لیکن کوئی قرآن کی تعلیمات کا ذکر نہیں کرتا۔ کوئی حدیث کی کتابوں سے معلومات نہیں لیتا۔ سب جانتے ہیں کہ دنیا بھر میں مسلمانوں نے حدیث کی احتیاط کے سلسلہ میں اسماء الرجال کا ایک علم ایجاد کیا جو تاریخ کو مستند بناتا ہے۔ لیکن چونکہ مسئلہ تذلیل اور امت کی تذلیل ہے اس لئے جھوٹی افسانوی تاریخ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس امت کی پانچ قہموں میں دین کے نافذ العمل اصولوں پر ذرا برابر اختلاف نہیں۔ شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی سب سو کو حرام، زنا پر سنگسار، چوری پر ہاتھ کاٹنا، جھوٹ، غیبت، وعدہ خلافی کو گناہ سمجھتے ہیں۔ سب پانچ نمازوں، ان کے اوقات، تمیز روزوں، حج اور زکوٰۃ پر متفق ہیں۔ کوئی اس کا ذکر نہیں کرے گا۔ تاریخ اٹھائے گا جو جھوٹے من گھڑت قصے کہانیوں پر مبنی ہے اور اس امت کے سارے جھگڑے تاریخ سے جنم لیتے ہیں۔ اور اسے ہوا دینے میں ان تمام مشرقین کا دخل ہے جو ہمارے خیر خواہ بن کر ہم پر کتابیں لکھتے رہے اور ہمارے ہاتھ کا ماضی کو زہرا آلود کرتے رہے۔ (بحوالہ روزنامہ ایکسپریس ۷ جولائی ۲۰۱۵ء)

علامہ طبری... مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز

پہلی قسط:

چند دن پہلے ایک معاصر روزنامے میں ”ہمارے افسانہ ساز مؤرخین“ کے عنوان سے ایک انتہائی قابل احترام، سینئر صحافی اور نامور مصر کی تحریر نظر سے گزری، جسے پڑھ کر راقم انگشت بدنداں رہ گیا۔ اسلام سے موصوف کی جذباتی وابستگی، ملیت اسلامیہ کے لیے ان کی دروندی اور اہل مغرب کی فکر و نظر کے خلاف ان کی مساعی کا بندہ خود بھی قائل ہے اور انہیں صحافت کے محاذ پر امت مسلمہ کا وکیل اور اسلام کا بے باک سپاہی تصور کرتا ہے، مگر اس تحریر کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ علم تاریخ یا کم از کم زیر بحث موضوع کے بارے میں ان کا مطالعہ بالکل سطحی ہے۔ امام طبری کے حالات و کردار اور ان کی تاریخ کی حیثیت کے متعلق ان کے فرمودات کا غالب حصہ حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ موصوف نے یہ کالم، مستشرقین کی سازشوں کی نقاب کشائی کے لیے لکھا ہے، مگر اس میں پیش کردہ مواد خود ان مستشرقین کی ترجمانی کر رہا ہے، جو ہماری تاریخ کو بے اعتبار کرنے کی کوشش کرتے آئے ہیں۔

ابن جریر طبری کی کردار کشی کرتے ہوئے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا کوئی حوالہ پیش نہیں کیا، اس لیے اس کی کوئی علمی حیثیت نہیں۔ علامہ طبری کے حالات کے بارے میں قدیم اسلامی تآخذ میرے سامنے ہیں، ان میں موصوف کی دی ہوئی معلومات کا کوئی ثبوت نہیں۔ شاید جدید تآخذ میں جہاں جگہ جگہ مستشرقین کی خرافات کا گرا پڑا مواد دکھرا ہوا ہے، ایسے ”انکشافات“ مل جاتے ہوں گے۔ موصوف کی تحریر سے تو یہی ظاہر ہے کہ انہوں نے محض انگریزی مصادر کا مطالعہ کر کے یہ نادر تحقیقات پیش کی ہیں۔ مثلاً پورے کالم میں

انہوں نے ایک جگہ بھی جبری تاریخ نہیں لکھی۔ ہر جگہ عیسوی سن نقل کیا ہے۔ عربی تآخذ دیکھے ہوتے تو یہ التزام نہ ہوتا۔ انہوں نے امام طبری کی جائے پیدائش کو ”آمول“ لکھا ہے۔ جبکہ صحیح عربی تلفظ ”أُمْل“ ہے۔ ظاہر ہے کسی انگریزی کتاب میں اسے (Amol) ہی لکھا جاسکتا ہے۔ محترم کالم نگار نے کوئی اسلامی تآخذ دیکھا ہوتا تو اسے ”آمول“ نہ بناتے۔ پس ظاہر ہے کہ انہوں نے نادانستہ طور پر مستشرقین کے مواد سے استفادہ کر کے یہ کالم لکھا ہے جس کے مندرجات خلاف حقیقت ہیں۔

کالم نگار فرماتے ہیں: ”اسلامی تاریخ میں امام احمد بن حنبل کا واحد ناقد اور مخالف محمد بن جریر الطبری نظر آتا ہے، یہ اس قدر مخالف تھا کہ عباسی خلفاء کے دور میں لوگ نفرت کے طور پر اس کے گھر پر پتھر پھینکا کرتے تھے۔ لوگوں کی مخالفت اس قدر بڑھی کہ عباسی خلفاء نے ایسے لوگوں کو قید میں ڈالنا اور کوڑے مارنا شروع کر دیا جو طبری کو بدابھلا کہتے تھے۔“ ہمیں تاریخی ریکارڈ میں کوئی ایسا شواہد تک نہیں ملا، جس سے عباسی خلفاء کا طبری کی مخالفت پر لوگوں کو قید میں ڈالنا کوڑے مارنا ثابت ہو۔ رہا لوگوں کا ایک عالم دین کے گھر پر پتھر پھینکنا تو یہ کوئی روز کا معمول نہ تھا۔ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا کہ متعصب حنبلیوں نے جمعہ کے دن جامع مسجد میں ان سے امام احمد بن حنبل کے مسلک کے بارے میں کچھ سوالات پوچھے اور ان کے جوابات کو غلط رنگ دیتے ہوئے ان پر حملہ کر دیا۔ ابن جریر طبری نے بھاگ کر اپنے گھر میں پناہ لی۔ لوگوں نے گھر پر پتھر اور شروع کر دیا۔ مجبوراً سرکاری پولیس نے آکر انہیں ہٹایا اور ایک دن رات تک گھر پر پہرہ دیا۔ (معجم الادباء: ج ۸ ص ۷۰)

ایسے شریر لوگوں کی ایذا رسانی سے امام طبری کی ذات پر کوئی الزام آسکتا ہے نہ ان کے مقام و مرتبے اور مقبولیت پر۔

موصوف کا یہ دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ وہ امام احمد بن حنبل کے ناقد تھے۔ اس کا کوئی ثبوت ہے تو پیش کیا جائے۔ ہمیں ان کی زندگی اور تصانیف میں ایسی کوئی چیز نہیں دکھائی دی، جس سے اشارہ بھی ملتا ہو کہ ان کا امام احمد بن حنبل سے عقائد میں کوئی اختلاف

امام طبری --- کون؟

علامہ طبری... مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز

تھا۔ اپنی تصنیف ”صریح السنہ“ میں انہوں نے تین جگہ امام احمد بن حنبلؒ سے روایت لی ہے۔ ایک جگہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”جن کا قول کافی شافی ہے، اللہ کی رحمت و رضامندی جن کے شامل حال ہے اور جن کی پیروی رشد و ہدایت ہے، وہ ہیں احمد بن حنبل۔ اللہ ان سے راضی ہو۔“ (صریح السنہ: ص ۲۵)

ربا فروغی مسائل میں اختلاف، تو وہ اصولاً شافعی اور اپنے علم کی وسعت کی بناء پر مجتہد تھے، اس لیے امام احمد کی پیروی ان پر لازم نہیں تھی۔ یہ درست ہے کہ اس دور کے بہت سے حنبلی ان کے مخالف تھے، مگر اسلامی مآخذ کو ابھی دیتے ہیں کہ اس اختلاف میں زیادتی حنبلی علماء کی طرف سے تھی۔ ان لوگوں نے تعصب کی بناء پر امام طبریؒ کی کردار کشی شروع کی۔ اس تعصب کی وجہ کچھ سمجھ نہیں آتی، شاید حنبلی حضرات چاہتے تھے کہ تمام مسلمان امام احمد بن حنبل کی تقلید کریں۔ ابن جریر طبری اس پر آمادہ نہ تھے۔ اس بناء پر انہیں نہ صرف ہدف تنقید بنایا گیا، بلکہ غلط عقائد بھی ان کی طرف منسوب کر دیے گئے۔ ظاہر ہے متعصب حنبلیوں کے اثرات اور ایذا رسانی سے علامہ طبری کی جلالت شان کچھ کم نہیں ہو جاتی، کیونکہ اس دور میں حنبلی حضرات امام ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کے خلاف بھی اسی طرح متعصبانہ مہم میں مشغول تھے۔ اس دور میں تالیف کردہ حنابلہ کی مشہور کتاب ”السنہ“ پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو واضح ہوگا کہ اس میں امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کو قرآن کے مخلوق ہونے کا قائل، بلکہ اس گمراہی کا بانی بتایا گیا ہے، انہیں بدعتی، خارجی اور منکر شریعت کہا گیا ہے۔ (روایات ۱۶۵، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷)

امام طبریؒ کی کردار کشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ امام ابو حنیفہؒ کے مداح تھے۔ انہوں نے اپنی تصنیف ”ذیل المذیل“ میں امام اعظمؒ کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے لکھا ہے: ”وہ فقیہ، عالم اور متقی تھے۔“ اس پر بعض علماء ان کے مخالف ہو گئے اور ان کو بدنام کرنے لگے۔ (معجم الادباء ج ۸ ص ۷۷)

اسی قسم کی مہم میں بغداد کے ایک حنبلی عالم ابن ابی داؤد پیش پیش تھے۔ ان کے پیروکار

امام طبری --- کون؟

علامہ طبری... مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز

حضرات، بغداد کے باشندوں اور وہاں آنے والے طلبہ کو ابن جریرؒ کے خلاف اکساتے رہتے۔ ابن جریر طبری نے اس صورت حال میں کوششیں کورتج دی اور مجمع عام میں درس ترک کر کے خود کو گھر میں تصنیفی و تالیفی کام تک محدود کر لیا۔ (سیر اعلام: ج ۱۲ ص ۷۷)

ایک واقعے سے اس صورت حال پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک عالم ابن علی نیشاپوری بغداد آئے اور محدث ابن خزیمہ سے ملے۔ ابن خزیمہ نے ان سے پوچھا: ”کیا آپ محمد بن جریر سے روایات لکھ چکے ہیں؟“ وہ بولے: ”نہیں، کیونکہ وہ (عام مجالس) میں ظاہر نہیں ہوتے اور حنبلی ان کے پاس آنے جانے سے روکتے ہیں۔“ ابن خزیمہ بولے: ”تم نے اچھا نہیں کیا تم کسی اور کی روایات نہ لیتے، مگر ابن جریر سے روایات سن لیتے۔“

علامہ سبکی فرماتے ہیں: ”ابن جریر طبری کے مجمع عام میں نہ آنے کا یہ مطلب نہیں کہ ان پر کوئی پابندی تھی۔ حنبلیوں کی اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ ایسا کر سکتے۔ ابن جریر طبری کا مقام اتنا بلند تھا کہ ان کے مخالفین انہیں محبوس نہیں کر سکتے تھے، مگر ابن جریرؒ نے خود ہی اپنے آپ کو محدود کر لیا تھا تا کہ اپنی عزت کے پیچھے پڑنے والے گھٹیا لوگوں سے دور رہیں۔ پس وہ اسی سے ملتے تھے جسے پسند کرتے تھے اور جس کے بارے میں یقین ہوتا کہ وہ سنت کا پیرو کار ہے۔ ابن علی نیشاپوری کی طرح دوسرے شہروں سے آنے والے اصل حالات نہیں جانتے تھے اور ابن جریر کے حال سے ناواقفیت کی بناء پر وہ ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں کی باتوں سے متاثر ہو جاتے تھے، اس لیے ان سے ملاقات ترک کر دیتے تھے۔“ (طبقات الشافعیہ الکبریٰ: ج ۳ ص ۱۲۵-۱۲۶)

موصوف نے ابن جریر کو معتزلی، دنیا پرست اور بدعتی حکومت کا ایجنٹ باور کراتے ہوئے فرمایا ہے: ”طبری بغداد دو ایس آیا تو بغداد پر عباسی خلیفہ المعتضد کی حکومت تھی۔ اس وقت طبری کی عمر پچاس سال ہو چکی تھی۔ طبری دربار سے وابستہ تو نہ ہوا مگر اس کے خیالات عباسی خلفاء کے معتزلی خیالات سے ہم آہنگ ہوتے چلے گئے۔“

اس افسانے کے جواب میں عرض ہے کہ طبری جب بغداد تشریف لائے تھے، تو اس

امام طبری۔۔۔ کون؟

علامہ طبری۔۔۔ مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز

سے بہت پہلے بغداد کے خلفاء معتزلی خیالات سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ معتزلہ کا فتنہ مامون الرشید کے دور میں شروع ہو کر معتصم اور واثق کے دور تک برپا رہا۔ متوکل عباسی نے آکر معتزلہ کا زور توڑ دیا تھا۔ انہیں سرکاری عہدوں سے معزول کر کے علمائے اہل سنت کو دوبارہ عزت دی گئی تھی۔ اس وقت امام احمد بن حنبل زندہ تھے۔ یوں یہ فتنہ سر پڑ گیا اور حکومتی صفوں میں اہل سنت کا غلبہ ہو گیا جو بنو عباس کے آخری دور تک رہا۔ کوئی بھی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، ابن جریر کے دور کے عباسی خلفاء کا معتزلی ہونا ثابت نہیں ہوگا۔ طبری کی اپنی کتب اٹھا کر ملاحظہ کر لیں۔ وہ معتزلہ کے سخت حریف دکھائی دیں گے۔

(روزنامہ اسلام۔ ۲۹ جولائی ۲۰۱۵ء)

دوسری قسط:

معتزلی عقیدے ”خلق قرآن“ کی تردید میں وہ واضح طور پر لکھتے ہیں: ”ہمارے نزدیک قرآن مخلوق نہیں چاہے وہ لکھا جائے، تلاوت کیا جائے یا پڑھا جائے۔۔۔۔۔ جو ہم سے اس کے خلاف عقیدہ نقل کرے یا منسوب کرے یا دعویٰ کرے کہ ہم اس کے سوا کچھ کہتے ہیں تو اس پر اللہ کی لعنت اور غضب نازل ہو۔ اللہ اسے سب کے سامنے رسوا کرے۔“ (صریح السنۃ: جس ۱۸، مطبوعہ دار الخلافہ، کویت)

معتزلہ کا کہنا تھا کہ آخرت میں اہل جنت کو اللہ کی زیارت نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ ایک ناممکن اور خلاف عقل بات ہے۔ امام طبری نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: ”ہمارا عقیدہ جس پر ہم نے اہل سنت کو قائم پایا ہے، یہ ہے کہ اہل جنت کو اللہ کا دیدار ہوگا جیسا کہ صحیح احادیث میں منقول ہے۔“ (صریح السنۃ: جس ۲۰)

معتزلہ، کبیرہ گناہوں کے مرتکبین کو کافر اور جہنمی بتاتے تھے۔ ابن جریر اس بارے میں فرماتے ہیں: ”وہ فاسق اور نافرمان مسلمان ہیں، ہم انہیں جنتی کہتے ہیں نہ جہنمی۔ ان کا معاملہ اللہ کی مشیت پر ہے، چاہے تو انہیں عذاب دے، چاہے تو اپنے فضل سے معاف کر دے۔“ (التبصیر: ۱۸۴)

امام طبری۔۔۔ کون؟

علامہ طبری۔۔۔ مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز

معتزلہ قبر میں مردے کو عذاب ہونے کا انکار کرتے تھے اور کہتے تھے جب جسم سے روح نکل جائے تو اسے عذاب کیسے ہو سکتا ہے۔ ابن جریر طبری نے اس بارے میں اہل سنت کے عقائد کی وکالت میں دلائل پیش کیے اور فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول روایات سے ثابت ہے کہ قبر کا عذاب برحق ہے۔“

(التبصیر فی معالم الدین: جس ۲۰۷، ماشر دار العاصمہ)

معتزلہ نصوص میں مذکور اللہ کی بعض صفات متشابہات مثلاً استواء علی العرش، آسمان دنیا پر نزول وغیرہ کے لیے عقلی تاویلات پیش کرتے تھے اور ان کے ظاہری مطلب کا انکار کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے امام ابن تیمیہ تک علمائے اہل سنت کھنٹا طرین طبقہ کسی تاویل کے بغیر ان نصوص پر ایمان لانے کا قائل تھا۔ یہی ابن جریر طبری کا مسلک تھا۔ انہوں نے عقل پرستوں کے پیشوا جہم بن صفوان پر بھی نکیر کی اور عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ معتزلی عقائد کی جڑوں پر اس طرح تیش چلایا کہ مخالفین کے لیے کوئی جواب نہیں رہ گیا۔ (دیکھئے: التبصیر: جس ۱۴۱ تا ۱۴۳)

غرض ابن جریر معتزلی تھے نہ انہوں نے حکمرانوں سے متاثر ہو کر اعتراف کا راستہ اختیار کیا۔ وہ بھلا حکمرانوں کے لیے دین و مذہب کیوں بیچتے، وہ تو اپنے دین، امانت اور اخلاص کی حفاظت کے لیے سرکاری عہدوں اور شاہی انعامات کو بھی عمر بھر ٹھکراتے رہے۔ اگرچہ انہوں نے امام احمد کی طرح کوڑوں اور جیل کی اذیت برداشت نہیں کی، کیونکہ اس وقت حکومت میں معتزلہ کا غلبہ ختم ہو چکا تھا، تاہم اس وقت معتزلی عقائد کے خلاف علمی سطح پر ٹھوس کام کی ضرورت تھی اور امام طبری نے مضبوط عقلی و نقلی بنیادوں پر یہ کام کیا، جس کی اہمیت ہرگز نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

مسئلہ خلق قرآن کے بارے میں کالم نگار نے ایک نادر تحقیق پیش کی ہے اور معتزلہ پر بھی ایک خلاف حقیقت الزام چسپاں کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”معتزلہ قرآن کو مخلوق ثابت کرنا چاہتے تھے، جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر ایک دفعہ اس امت نے قرآن کو مخلوق مان لیا تو پھر

امام طبری۔۔۔ کون؟

علامہ طبری۔۔۔ مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز

جس طرح ہر مخلوق میں تبدیلی کی جاسکتی ہے، ویسے ہی قرآن میں بھی وقت اور حالات کے مطابق تبدیلی کی جاسکتی گی۔“

غلط بیانی دشمن کے بارے میں بھی نہیں کرنی چاہیے اور کوئی کرے تو ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ حقیقت بیان کر دیں۔ معتزلہ کے عقائد و نظریات، ان کی تاریخ اور تصانیف ہمارے سامنے ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے تاریخ دعوت و عزیمت کی پہلی جلد میں اس عقلیت پسندانہ تحریک کی نشوونما اور اس کے مقابلے میں علمائے اسلام کی خدمات پر تفصیل روشنی ڈالی ہے۔ دیگر درجنوں علماء صدیوں سے اس موضوع پر بیسیوں کتب لکھ چکے ہیں۔ کسی پر یہ انکشاف نہیں ہوا کہ معتزلہ کا مقصد قرآن کریم میں تبدیلی کرنا تھا۔ معتزلہ کی گمراہی اپنی جگہ، مگر قرآن مجید میں تبدیلی اور تحریف کے وہ بھی قائل نہیں تھے۔ اگر کالم نگار کی مراد معانی قرآن کی تبدیلی ہے تو یہ تو جیہ بالکل غلط ہے۔ معانی میں تحریف کی مذموم کوشش خلیفہ قرآن کے عقیدے پر موقوف نہیں۔ درجنوں باطل فرقے جو خلیفہ قرآن کے عقیدے سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے، قرآن کے مطالب کو توڑ موڑ کر پیش کرتے آئے ہیں۔

معتزلہ قرآن کریم کے مخلوق ہونے کو بذات خود ایک بنیادی عقیدہ مانتے تھے۔ اس کے ذریعے ان کا کوئی اور مقصد حاصل کرنا ثابت نہیں۔ قرآن کے الفاظ کو محفوظ رکھنے کے لیے وہ بھی پر جوش تھے۔ انہوں نے تحریف لفظی کو جائز نہیں سمجھا۔ علامہ رجسٹری معتزلی کی تفسیر الکشاف دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ کس طرح انہوں نے قرآن کی معجزانہ بلاغت کو تسلیم کر لیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ امام احمد بن حنبل نے بھی معتزلہ پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا۔ اگر معتزلہ کا مقصد قرآن کو بدلنا ہوتا تو ان پر کفر کا فتویٰ لگتا نہ کہ بدعت کا۔ حیرت ہے کہ ایک مشہور فرقے کے معرکتہ الآراء عقیدے کا اصل مقصد اس دور کے علماء کو سمجھ نہ آ سکا۔ بارہ صدیوں بعد ایک صحافی نے پہلی بار یہ راز فاش کیا!

کالم نگار فرماتے ہیں: ”اس نے اپنی فقہ اور مسلک کی بنیاد رکھی جسے الجبریری کہا جاتا ہے۔“

امام طبری۔۔۔ کون؟

علامہ طبری۔۔۔ مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز

ایسا ہرگز نہیں تھا۔ وہ بنیادی طور پر شافعی المسلک تھے۔ اصول میں امام شافعی کے پیروکار رہے۔ تحصیل علم کے بعد جب وہ بغداد آئے تو دس سال تک افتاء کی خدمت میں مشغول رہے۔ اس دوران وہ فقہ شافعی کے مطابق فتاویٰ دیتے رہے۔

(طبقات الشافعیہ سبکی: ج ۳ ص ۱۲۳)

ان کا شمار چوٹی کے شافعی علماء میں ہوتا ہے۔ علامہ سبکی نے طبقات الشافعیہ میں ان کا ذکر جس محبت و عقیدت سے کیا ہے، وہ اس کا واضح ثبوت ہے۔ علامہ سبکی لکھتے ہیں: ”ابن جریر ہمارے چنے ہوئے اصحاب میں سے ایک تھے، اس بات میں کسی کو کوئی شک نہیں۔“ (طبقات الشافعیہ: ج ۳ ص ۱۲۷)

ہاں چونکہ وہ مقام اجتہاد پر فائز تھے، اس لیے جیسے امام ابوحنیفہ کے تلامذہ امام ابو یوسف اور امام محمد بعض مسائل میں الگ رائے رکھتے ہیں، اسی طرح امام طبری بھی بعض چیزوں میں اجتہادی رائے کے مالک تھے اور ایک حلقہ ان کا پیروکار تھا۔

کالم نگار کا کہنا ہے کہ: ”یہ مسلک اس کی موت کے فوراً بعد ہی دم توڑ گیا۔“

یہ بات غلط ہے، علمائے اہل سنت میں سے بعض نامی گرامی ہستیاں ابن جریر کے مسلک سے وابستہ رہیں، جن میں علی بن عبد العزیز، دولابی، احمد بن یحییٰ اور ابو بکر بن کامل کا نام مشہور ہے۔ (معجم الادباء: ج ۸ ص ۶۲) طبری کے نامور ترین فیض یافتہ علامہ المعانی بن زکریا تھے، جن کے بارے میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ وہ اپنے دور میں فقہ، نحو، لغت اور ادب کے سب سے بڑے عالم تھے۔ (طبقات الحفاظ: ج ۱ ص ۲۹۱)

اور یا صاحب نے انہیں شیعہ اور اسماعیلی علماء کا شاگرد بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”وہ شام، فلسطین اور مصر چلا گیا اور وہاں شیعہ اور اسماعیلی علماء سے کسب فیض کیا۔“

یہ بھی قطعاً غلط بیانی ہے۔ اس دور میں شام، فلسطین اور مصر میں شیعہ یا اسماعیلی علماء کا نہیں، شافعی فقہاء کا دور دورہ تھا، لوگ انہی کے پاس دو درو سے آیا کرتے تھے۔ ابن جریر، اپنے تین ساتھیوں محمد بن ہارون، محمد بن خزیمہ اور محمد بن نصر کے ساتھ ان شہروں میں

امام طبری۔۔۔ کون؟

علامہ طبری۔۔۔ مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز

گئے تھے۔ ان چاروں نے ایک ساتھ شافعی فقہاء و محدثین سے استفادہ کیا۔ بعد میں یہ چاروں بغداد آئے اور وہاں فقہ شافعی کی اشاعت کی۔ (طبقات الشافعیہ: ج ۳ ص ۱۲۸) (روزنامہ اسلام۔ ۳ جولائی ۲۰۱۵ء)

تیسری قسط:

موصوف نے بلاوجہ یہ تاثر دیا ہے کہ وہ شیعی عقائد کے حامل تھے، ان پر شیعوں کی شاگردی یا شیعیت کی اشاعت کا الزام بالکل غلط ہے۔ شیعوں کے غالی فرقوں اثناعشری یا اسماعیلیہ کی بات تو ایک طرف رہی، تفضیلی شیعوں سے بھی ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ تاریخ طبری، عقیدے کی کتاب نہیں، روایات کا مجموعہ ہے۔ اسے دیکھ کر ان کے دین و ایمان پر اعتراض کرنا غلط ہے۔ اپنا دین و عقیدہ انہوں نے کتب عقائد میں نقل کر کے لوگوں کو اس کی طرف دعوت دی ہے۔

وہ ”صریح السنۃ“ میں واضح طور پر لکھتے ہیں: ”اصحاب رسول میں افضل ترین، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں۔ پھر عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ ہیں۔ پھر علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔“ (ص ۲۴)

بعض حضرات ابن جریر طبری کے شیعہ ہونے پر حافظ ذہبیؒ کے ان الفاظ کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں جو میزان الاعتدال میں ہیں۔ اس میں حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں: ”فیہ تشیع یسیر وموالاة لاتضر۔“ ان میں معمولی سا تشیع اور (اصحاب علی کی طرف) جھکاؤ تھا جو مضمر نہیں تھا۔“ (میزان ج ۳ ص ۲۹۸، ۲۹۹)

مگر اس سے ان کا اہل سنت سے خارج ہونا ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ خود حافظ ذہبیؒ نے شہادت دی ہے کہ معمولی سا جھکاؤ تشیع کی جانب تھا جو نقصان دہ نہ تھا۔ غالباً اس سے مراد یہ ہے کہ سیاسی حمایت کے لحاظ سے طبری کا جھکاؤ علویوں کی طرف تھا ورنہ ان پر اہل سنت سے ہٹ کر کوئی عقیدہ یا عمل اختیار کرنا ثابت نہیں۔ حافظ ذہبیؒ سیر اعلام النبلاء میں اس بات کو یوں واضح کرتے ہیں کہ ہلکے سے تشیع کا الزام تھا۔ فرماتے ہیں: ”وشنع علیہ بیسیر

امام طبری۔۔۔ کون؟

علامہ طبری۔۔۔ مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز

تشیع، وما رأینا الا الخیر“ ان پر معمولی تشیع کا الزام لگایا گیا مگر ہم نے ان میں خیر ہی دیکھی) (سیر اعلام: ج ۳ ص ۲۷۷)

عقائد کے بارے میں کسی نے ان پر بد اعتمادی ظاہر نہیں کی، وہ اہل سنت کے بہترین وکیل تھے۔ کسی عالم نے انہیں معتزلی، شیعہ یا بدعتی قرار نہیں دیا، وہ شیعی اور معتزلی عقائد کی کھل کر تردید کرتے رہے۔ ایک بار ان کی موجودگی میں کسی سے پوچھا گیا کہ جو شخص حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہدایت یافتہ امام نہ مانے، اس کا کیا حکم ہے۔ اس نے کہا: وہ بدعتی ہے۔ اس پر ابن جریر طبری نے غضبناک ہو کر کہا: ”صرف بدعتی! اسے قتل کیا جانا چاہیے۔“ (یعنی وہ مرتد و زندیق ہے، شرعی عدالت اس پر مرتد کی سزا نافذ کرے) (لسان المیزان: ج ۵ ص ۱۰۱)

التبصیر فی معالم الدین میں وہ امامت و خلافت کے مسئلے پر اس خوبی سے روشنی ڈالتے ہیں کہ بے اختیار دوا دینے کو جی چاہتا ہے۔ وہ علمائے اسلام میں سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس ضمن میں عبداللہ بن سبا کی دیسہ کاریوں کا پول کھولا ہے، وہ شیعی عقائد کا ذکر کر کے فرماتے ہیں: ”ہمارے نزدیک یہ سب گمراہی ہے، امت کے دائرے سے خروج ہے۔“

(دیکھئے: التبصیر فی معالم الدین: ص ۱۶۳ تا ۱۶۵)

یہاں یہ بات یاد رہے کہ پہلی صدی ہجری سے تیسری صدی ہجری کے اواخر تک ”تشیع“ کا مطلب آج کل جیسی شیعیت نہ تھا۔ اس دور میں ”تشیع“ اہل بیت کی طرف جھکاؤ میں مبالغے کا دوسرا نام تھا، جبکہ صحابہ سے بے زار طبقے کو اس دور میں ”رافضی“ کہا جاتا تھا۔ بخاری و مسلم سمیت صحاح ستہ کے تمام مؤلفین کے شیوخ میں ایسے حضرات موجود تھے جن کے بارے میں کتب جرح و تعدیل ”فیہ تشیع“ کا اعلان کرتی ہیں، مگر وہ بدعتی تھے نہ رافضی۔ ان کا تشیع عقائد کے لحاظ سے مضمر نہ تھا، اس لیے ان حضرات کی امانت و دیانت میں کوئی شک تھا۔ پس ابن جریر طبری کے مقام میں ”فیہ تشیع“ کی ”جرح“ سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

حافظ ذہبیؒ ان سے رافضیت کی تہمت دور کرنے میں وکیل صفائی کا کردار ادا کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”حافظ احمد بن علی سلیمانی نے کہا کہ وہ روافض کے لیے روایتیں گھڑتے تھے، یہ ایک اڑائی ہوئی جھوٹی تہمت ہے۔ ابن جریر مسلمانوں کے قابل اعتماد پیشواؤں میں سے ایک تھے۔ ہم ان کے خطا سے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے مگر ہمارے لیے یہ جائز نہیں کہ جھوٹی اور نفسانی باتیں لے کر ان کی کردار کشی کریں۔ علماء کی ایک دوسرے کے بارے میں آراء پر غور کرنا چاہیے، خصوصاً جب ایسے بڑے امام کا معاملہ ہو۔ شاید حافظ سلیمانی کی مراد (ابن جریر بن یزید طبری نہیں بلکہ) محمد بن جریر بن رستم ابو جعفر الطبری ہے، جو رافضی تھا، اس کی کئی کتابیں ہیں مثلاً الرواۃ عن اہل البیت۔“ (میزان الاعتدال: ص ۴۹۹)

حافظ ذہبیؒ کے کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ابو جعفر محمد بن جریر الطبریؒ دو تھے، تاریخ طبری والے ابن جریر اہل سنت تھے۔ انہی کے ہم نام ابو جعفر محمد بن جریر ابن رستم الطبریؒ رافضی تھے۔ نام و نسب اور کنیت کی غیر معمولی مشابہت کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ طبریؒ کو شیعہ سمجھنے کی غالباً ایک وجہ اور ہے، ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

”من کنت مولاه فعلی مولاه“ (جس کا میں دوست اس کا علی بھی دوست) یہ حدیث سند کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے، اور حدیث غدیر خم کے نام سے مشہور ہے۔ شیعوں کی مخالفت میں اس دور کے ایک محدث ابو بکر بن داؤد نے اس حدیث کے ثبوت میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ یہ دیکھ کر طبری نے اس حدیث کے ثبوت پر دلائل دیتے ہوئے ایک رسالہ ”کتاب الفصائل“ لکھا جس میں پہلے خلفائے راشدین کے مناقب بیان کیے گئے، پھر حدیث غدیر خم پر اعتراضات کا جواب دیا گیا۔ (سیر اعلام النبلاء: ج ۴ ص ۲۷۷) حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں: ”میں نے حدیث غدیر خم کے بارے میں ان کا رسالہ دیکھا جو چار حصوں میں تھا، میں نے اس کا ایک حصہ دیکھا ہے، ان کی روایات کی وسعت نے مجھے حیران

کر دیا۔“ (سیر اعلام النبلاء: ج ۴ ص ۲۷۷)

کوئی بعید نہیں کہ ماصیوں نے اس حدیث کے دفاع کے باعث انہیں شیعہ مشہور کرنا شروع کر دیا ہو، حالانکہ طبریؒ کو خود شیعوں کی طرف سے ایذا رسانی کا سامنا رہا۔ جب وہ حبلیوں کی مخالفت سے تنگ آکر ۲۹۰ھ میں اپنے آبائی وطن طبرستان واپس گئے تو دیکھا کہ وہاں رافض پھیل رہا ہے۔ ابن جریر طبری نے ہم وطنوں کی اصلاح کے لیے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل پر رسائل لکھے جس پر وہاں بھی ان کی مخالفت شروع ہو گئی۔ طبرستان کے حاکم نے ان کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ طبریؒ کو ایک بزرگ نے بروقت اطلاع دے دی اور وہ وہاں سے نکل گئے۔ حاکم نے ان بزرگ کو گرفتار کر کے ایک ہزار کوڑے مارے جبکہ طبریؒ خیریت سے واپس بغداد پہنچ گئے۔ (معجم الادباء: ج ۸ ص ۷۷)

کالم نگار ایک خطرناک ترین انکشاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”طبری عام مسلمانوں کی بات کرتا تو برداشت تھا لیکن اس نے توسید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے بارے میں بھی دو عدد من گھڑت قصے اس قدر فضول اور بے ہودہ انداز میں تحریر کیے ہیں کہ انہیں درج کرنے کی بھی ہمت نہیں پاتا۔ ان دونوں فضول قصوں کا نہ کہیں قرآن میں ذکر ہے اور نہ ہی احادیث کی کتابوں میں۔ لیکن طبری نے اپنے ذہن کی غلاظت کو تاریخ کی چاشنی بنا کر پیش کیا ہے۔“

موصوف سے گزارش ہے کہ چاہے آپ انہیں نقل کرنے کی ہمت نہ پاتے ہوں لیکن ان کا حوالہ تو دیجیے۔ آپ کی علمیت اور عمق نگاہی کے شاہکار تو قارئین دیکھ چکے ہیں۔ اس لیے ضروری نہیں کہ کسی روایت کا وہی مطلب ہو، جو آپ سمجھے ہوں۔ عربی کتب تو یقیناً آپ کی دسترس سے باہر ہیں۔ طبری کے سارے حالات آپ نے انگریزی تراجم وغیرہ سے اخذ کیے ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ پورے کالم میں ایک واقعہ بھی سنہ ہجری کے حوالے سے نہیں لکھا گیا، ہر جگہ عیسوی تاریخ کا حوالہ دیا گیا ہے۔

جس قسم کی غلاظت کا ذکر آپ فرما رہے ہیں، وہ اپنے علم و فہم کی کمی کا کرشمہ بھی

امام طبری۔۔۔ کون؟

علامہ طبری۔۔۔ مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز

ہوسکتا ہے۔ ایسا چونکا دینے والا مواد آپ کو طبری کی تاریخ ہی میں نہیں، بخاری اور مسلم میں بھی مل جائے گا۔ اہل علم ان کا اصل مطلب جانتے ہیں، اس لیے بار بار پڑھ کر بھی انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی، مگر ایک دوسرے شیعہ کافر جب ان موٹی موٹی علمی کتب کا از خود مطالعہ شروع کر دے اور اپنی فہم ناقص کو ہی حرف آخر تصور کر لے تو اسے تاریخ ہی نہیں حدیث اور تفسیر میں بھی جگہ جگہ جھٹکنے لگ سکتے ہیں۔

(روزنامہ اسلام۔ ۳۱ جولائی ۲۰۱۵ء)

چوتھی قسط:

ایسا ہی ایک جھٹکا کھا کر دوا علیٰ تعلیم یافتہ صاحبان راقم کے پاس آدھکے اور فرمانے لگے: ”امام بخاری نے تو بدین رسالت کردی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لکھ دیا کہ وہ لوگوں کو پیٹھ پیٹنے کا حکم دیتے تھے۔ ہم نے بخاری میں اسے چیک کیا ہے۔ بخاری خرافات کا مجموعہ ہے۔“

میں نے عرض کیا: ”بخاری استادوں کے قدموں میں بیٹھ کر پڑھی جاتی ہے۔ سگرت پیتے ہوئے بستر پر لیٹ کر نہیں۔ جس طرح آپ بخاری پڑھ رہے ہیں، اس طرح بخاری کے علم کی جگہ جہالت کا بخاری آسکتا ہے۔ حدیث اپنی جگہ صحیح ہے، بخاری ہی میں نہیں، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں بھی ہے۔ مگر اس کا مطلب علماء سے سمجھنا چاہیے۔“

اس کے بعد میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ایک جزئی واقعہ تھا، خطراتی صورت حال تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خاص لوگوں کو بیماری کی خاص حالت میں یہ مشورہ دیا تھا۔

اس کے علاوہ شارحین حدیث نے جو توجیہات کی ہیں، وہ سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک صاحب تو کچھ قائل ہو گئے، مگر دوسرے صاحب یہی کہتے ہوئے رخصت ہوئے کہ کچھ بھی ہو جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی غلیظ بات نہیں کہہ سکتے تھے، ذخیرہ حدیث پھینک دینے کے قابل ہے۔ ایمان صرف قرآن پر ہونا چاہیے۔

امام طبری۔۔۔ کون؟

علامہ طبری۔۔۔ مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز

اب معلوم نہیں اور یا صاحب نے طبری میں کون سا واقعہ پڑھ کر ان پر تو بدین رسالت کا الزام لگا دیا۔ ان کا یہ کہنا کہ ”ان دونوں فضول قصوں کا نہ کہیں قرآن میں ذکر ہے اور نہ ہی احادیث کی کتابوں میں۔“ اسی وقت معتبر ہوگا جب وہ ان کا حوالہ دیں۔ قرآن میں نہ سہی، ذخیرہ حدیث میں ان کے مل جانے کا غالب امکان ہے، کیونکہ حدیث بخاری و مسلم جیسی پانچ چھ کتب میں محدود نہیں۔ اگر یہ واقعات کتب حدیث میں مل گئے تو اور یا صاحب ہی بتائیں کہ کیا ان کے بارے میں شارحین کی تاویل و تشریح کو اختیار کرنا صحیح ہوگا یا یہ تبصرہ کرنا کہ ”یہ لوگ اپنی ذہنی غلاظت کو حدیث کی چاشنی بنا کر پیش کرتے ہیں۔“

ہمارے اسلاف کا ذہن غلیظ نہیں تھا، بلکہ دینی علوم سے ناواقف برعم خود اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کا زاویہ نگاہ غلط ہے۔ اگر تعصب کی عینک لگا کر دیکھیں تو تاریخ کے کئی اوراق ہی نہیں، حدیث اور فقہ میں کتاب الطہارۃ اور کتاب النکاح و طلاق کے کئی ابواب بھی شرمناک محسوس ہوں گے۔ اگر ایک عام آدمی میڈیکل کی کتب کا مطالعہ پر سرسری نگاہ ڈالے تو وہاں بھی بہت سی چیزیں انتہائی بے غیرتی محسوس ہوں گی۔ گانا لوجی میڈیکل کا ایک شعبہ ہے۔ اس کی کوئی کتاب آپ اپنے بچوں کے سامنے نہیں کھول سکتے۔ ان کے مندرجات آپ کسی کالم میں نقل نہیں کر سکتے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ بے ہودگی اور بے حیائی ہے۔ افسوس کہ مستشرقین کا گروہ اور منکرین حدیث کا ٹولہ، سنت کے بارے میں یہی کچھ کر رہا ہے اور اسی قسم کی مشق محترم کالم نگار نے تاریخ کے متعلق کر ڈالی ہے۔

محترم کالم نگار فرماتے ہیں: ”علامہ ابن جریر طبری کی مشہور تاریخ ”تاریخ الرسل و الملوک“ ایک متنازع ترین مآخذ ہے۔“

یہ بالکل غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیرت اور تاریخ دونوں میں مسلمان طبری سے استفادہ کیے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے۔ تمام مشہور کتب تاریخ مثلاً علامہ ابن اثیر کی الکامل، علامہ ابن جوزی کی المنتظم، حافظ ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ اور ابن خلدون کی دیوان المبتدأ والخبر میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر عباسی خلفاء کے دور زوال کا بیشتر حصہ

تاریخ طبری ہی سے لیا گیا ہے۔

اسی طرح طبری کے بعد آنے والے تقریباً تمام سیرت نگاران کے خوشہ چیں رہے ہیں۔ بیہقی کی دلائل النبوة، حافظ ابن قیم کی زاد المعاد، قاضی عیاض کی الشفا، علامہ سیوطی کی الخصائص الکبریٰ، علامہ قسطلانی کی مواہب لدنیہ، برہان الدین حلبی کی انسان العیون، زرقانی کی شرح مواہب..... یہ سب محمد بن جریر الطبری کی روایات سے بھری پڑی ہیں۔ اگر اسلاف سے مخرف ہو کر اپنی تحقیقات پر کسی کو زیادہ زعم ہے، تو اسے تاریخ و سیرت کے اس تمام ذخیرے سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

کالم نگار تاریخ طبری کو من گھڑت قصوں کی بازاری کتاب تصور کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”ان قصوں کی نہ وہ کوئی سند دیتے ہیں اور نہ ہی ان کے پاس ان کے تاخذ کا کوئی علم ہے۔“

”طبری اور اس قبیل کے کئی مؤرخین ہیں جنہوں نے من گھڑت، جھوٹے اور بے ہودہ افسانوی قصوں کو مسلمانوں کی تاریخ کا حصہ بنا دیا۔“

”طبری نے اپنے ذہن کی غلاظت کو تاریخ کی چاشنی بنا کر پیش کیا..... پوری تاریخ طبری صحابہ سے لے کر عباسی دور تک ایسے افسانوں سے بھری ہوئی ہے۔“

صاف ظاہر ہے کہ موصوف نے تاریخ طبری اٹھا کر بھی نہیں دیکھی ورنہ ایسی جاہلانہ بات نہ کہتے۔ طبری نے شروع میں تاخذ بھی بیان کیے ہیں اور اس کے بعد ہر روایت کی سند بھی نقل کی ہے۔

کالم نگار تاریخ طبری کے بارے میں فرماتے ہیں: ”یہ وہ تاریخ ہے جس کے منقر مند رجات آج تک امت مسلمہ میں فتنہ و فساد اور فرقہ بندی کا باعث بنے ہوئے ہیں اور مغرب کے سیکولر انہیں ہتھیار بنا کر ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔“

اس کے جواب میں عرض ہے جناب نے تعداد کم بتائی ہے۔ اس قسم کی روایات کا شمار تو سیکڑوں میں ہے، جنہیں لے کر مستشرقین ہمیں طعنہ دیتے ہیں۔ مگر اس کا حل یہ

تو نہیں کہ ہم خود ہی اپنی علمی میراث کو جھوٹے قصوں کا پلندہ قرار دے کر اس سے دست بردار ہو جائیں۔ اسلام کا کون سا علم ہے جس کی کتابوں کو مستشرقین نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر خوبصورت ترین انداز میں شائع نہیں کیا۔ تفسیر، فقہ، حدیث، اسماء الرجال اور سیرت کی درجنوں نایاب کتب مستشرقین نے طبع کرائی ہیں، جبکہ ہمارے ہاں وہ قلمی نسخوں کی شکل میں ہی تھیں۔ مستشرقین کی دوسری ٹیم نے ان کتب کا بدنامی سے مطالعہ کیا اور سیکڑوں چیزیں نکال کر اسلام پر اعتراضات کا انبار لگا دیا ہے۔ کولڈ زیہر، سوبیل زونیم اور کارل بروک مان جیسے دانش وران مغرب کی تصانیف میں صرف تاریخ ہی ہدف تنقید نہیں، قرآن مجید، تفسیر اور حدیث رسول پر بھی جا بجا اعتراضات ہیں۔ کیا اس کا رد عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہم قرآن وحدیث سے دست کش ہو جائیں؟

ہمارے علماء جس طرح قرآن وحدیث کے بارے میں مستشرقین کے حملوں کا مضبوط علمی و فکری بنیادوں پر دفاع کرتے آئے ہیں، اسی طرح تاریخ کے میدان بھی ان کے شبہات کا مؤثر جواب دیتے رہے ہیں۔ قرآن کے دفاع میں ہم لغت عربی، سنت رسول، آثار صحابہؓ اور اقوال مفسرینؒ سے مدد لے کر آیات کا صحیح محل اور مطلب واضح کرتے ہیں۔ احادیث اور تاریخ کے دفاع میں ہمارا اصول یہ ہوتا ہے کہ جو ضعیف، مشکوک یا جھوٹے راویوں کی روایات ہیں، ہم ان کی سند پر بحث کر کے کہتے ہیں کہ یہ ہمارے خلاف حجت نہیں بن سکتیں۔ اگر صحیح روایت لے کر انبیاء کرام یا صحابہ کرام پر الزام تراشی کی جاتی ہے تو وہاں آیات قرآنی، احادیث، آثار صحابہ، اقوال شارحین حدیث اور عقلی دلائل سے مدد لے کر بات کا اصل پس منظر واضح کیا جاتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مستشرقین کے مقابلے کے لیے جس علمی استعداد کی ضرورت ہے، اس کے لیے ساہا سال علماء کی جوتیوں میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ یہ صلاحیت موجودہ عصری تعلیمی اداروں کی ڈگریوں سے حاصل ہوتی ہے نہ صحافت اور ادب کی چوٹیاں سر کرنے سے۔ اسی لیے ہمارے تعلیم یافتہ دوست مستشرقین کی تحریریں پڑھ کر دفاع اسلام کے لیے جوش میں

امام طبری --- کون؟

علامہ طبری... مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز

ضرور آتے ہیں، مگر دفاع کے غلط طریقے اپنا کر اپنے ہی خلاف بچھائے گئے جال میں آجاتے ہیں۔ (روزنامہ اسلام - یکم اگست ۲۰۱۵ء)

پانچویں اور آخری قسط:

جناب کا یہ بھی ارشاد ہے: ”طبری مغرب کے اسلام دشمنوں کا محبوب مؤرخ ہے۔۔۔۔۔ تاریخ طبری کو معتبر تاریخ کی حیثیت سے پیش کرنا مستشرقین کی سازش ہے۔۔۔۔۔ جس کتاب کو بازاری قصوں کی کتاب ہونا چاہیے تھا، اسے مستند ترین تاریخ سمجھ کر یورپ نے پیش کیا۔۔۔۔۔“

قارئین ملاحظہ فرما ہی چکے ہیں کہ چوتھی صدی ہجری سے لے کر آج تک علمائے اسلام تاریخ طبری سے مسلسل استفادہ کر رہے ہیں۔ علامہ ابن جوزی، علامہ ابن اثیر، حافظ ابن کثیر، علامہ سیوطی، قاضی عیاض، علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، علامہ ابن خلدون سے لے کر علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی تک تاریخ، حدیث اور سیرت پر عظیم الشان کام کرنے والے ہر عالم نے اس کتاب کے حوالے دیے ہیں۔ اس لیے اس سے بڑھ کر جھوٹ اور کیا ہوگا کہ تاریخ طبری پہلے غیر مستند تھی اور اسے مستند بنا کر پیش کیا ہے مستشرقین نے۔ جناب مستشرقین کے وجود سے بہت پہلے سے علماء، امام طبری کے خوشہ چین چلے آ رہے ہیں، اس کے ترجمے بھی صدیوں سے کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ طبری کی وفات کو نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ بخارا کے حاکم امیر ابوصالح سامانی نے اس کا فارسی ترجمہ کر لیا مگر اس میں اسناد کو حذف کر دیا گیا۔ یہی فارسی ترجمہ ۹۲۸ھ میں ترکی میں منتقل ہوا، ۱۲۶۰ھ میں ترکی ترجمہ طبع ہو کر مشہور ہوا، مستشرقین نے ۱۸۷۴ء میں اسی فارسی ترجمے کو فرنگی میں ڈھالا جو چار جلدوں میں شائع ہوا، پھر فرنگی سے اسے لاطینی میں منتقل کیا گیا۔

اسلامی دنیا میں اس وقت پر لیس عام نہ تھا۔ مستشرقین نے ۱۸۷۹ء سے ۱۸۹۸ء تک دس سال کی محنت کے بعد قدیم عربی نسخے کو پر لیس میں طبع کرا کے عام کیا، ایک مدت تک

امام طبری --- کون؟

علامہ طبری... مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز

دنیا نے اس نسخے سے استفادہ کیا۔ قریبی دور میں عرب محقق ڈاکٹر ابو الفضل ابراہیم نے طبری کے قدیم عربی نسخے حاصل کیے جو ترکی اور ہندوستان کے کتب خانوں میں محفوظ تھے۔ مستشرقین کے نسخے کا ان سے تقابل کرنے کے بعد ایک صحیح ترین نسخہ تیار کیا گیا جو ۱۹۶۰ء میں دارالمعارف مصر سے شائع ہوا۔ یہ تھا تاریخ طبری کی اشاعت کا مختصر قصہ۔ مستشرقین کا اس میں حصہ ضرور ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ تاریخ طبری انہی کی ہو جائے۔

موصوف نے اپنی تحقیقات کا اختتام اس جملے پر فرمایا ہے: ”تاریخ جھوٹے من گھڑت قصے کہانیوں پر مبنی ہے اور اس امت کے سارے جھگڑے تاریخ سے جنم لیتے ہیں۔“

یہی شکایت منکرین حدیث کو ذخیرہ حدیث سے ہے۔ وہ درجنوں باہم متعارض روایات مثال میں پیش کر کے کہتے ہیں: ”ان میں سے کسی حدیث پر حنفی عمل کر رہے ہیں اور کسی پر شافعی۔ پس امت میں جھگڑوں کی ساری بنیاد حدیث ہے۔“ تو کیا ان کی ہفوات مان کر حدیث کو ترک کر دیا جائے گا۔

اصل بات تاریخ کی ہے نہ حدیث کی۔ امت کے اصل جھگڑے اسلاف پر عدم اعتماد سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہی عدم اعتماد کا روگ ہمارے کالم نگاروں کو بھی لاحق ہو رہا ہے۔ اگر کل کلاں کچھ لوگ ان کی رائے مان کر اسلاف کو برا بھلا کہتے ہوئے ان کے پیچھے چل پڑے تو ایک نیا مکتب فکر وجود میں آتے کیا دیر لگے گی۔ آج تک تمام گمراہ فرقے اسی طرح پیدا ہوتے آئے ہیں۔ (روزنامہ اسلام - ۲/ اگست ۲۰۱۵ء)

احتیاط لازم ہے

پہلی قسط:

تفسیر جلالین دینی مدارس میں صدیوں سے داخل نصاب ہے، جو دو مشہور مفسرین علامہ جلال الدین محلی اور علامہ جلال الدین سیوطی کا مشترکہ علمی کارنامہ ہے۔ دونوں نے چند رہ چند رہ پاروں کی تفسیر لکھی ہے۔ اس تفسیر میں سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۷ کا شان نزول یوں بیان کیا گیا ہے: ”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کا نکاح حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے کرا دیا۔ کچھ مدت بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ حضرت زینب پر پڑی۔ آپ کے دل میں ان کی محبت آئی اور زید رضی اللہ عنہ کے دل میں کراہت۔ زید رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں زینب کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اپنی اہلیہ کے ساتھ نباہ کرو۔“

یہی واقعہ محمد بن سعد کی الطبقات الکبریٰ، محمد بن جریر کی تاریخ طبری، انہی کی تفسیر طبری اور علامہ سیوطی کی تفسیر الدر المنثور میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ طبری کی روایت درج ذیل ہے: ”مجھے یونس نے بتایا، انہوں نے کہا کہ ہمیں ابن وہب نے خبر دی، انہوں نے کہا کہ ابن زید کہتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زید بن حارثہ کا نکاح زینب بنت جحش سے کرا چکے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد تھیں۔ پھر ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زید سے ملنے کا ارادہ کر کے گئے۔ گھر کے دروازے پر بالوں سے بُنا ہوا پردہ تھا۔ ہوانے پردہ اٹھا دیا اور وہ کھل گیا۔ وہ (حضرت زینب) اپنے برآمدے میں تھیں، سر کھلاتھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ان کی پسندیدگی آئی۔ جب یہ ہوا تو وہ

(زینب) دوسرے (زید بن حارثہ) کے لیے (اللہ کے حکم سے) ناکوار خاطر بنا دی گئیں، پس وہ آئے اور کہا، اے اللہ کے رسول میں اپنی اہلیہ کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ فرمایا: کیا ہوا، تمہیں کوئی شے بری لگی۔ عرض کیا: نہیں اللہ کی قسم، یا رسول اللہ! مجھے ان کی کوئی بات بری نہیں لگی، میں نے انہیں اچھا ہی پایا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی بیوی سے نباہ کرو اور اللہ سے ڈرو۔ اسی بارے میں اللہ کا ارشاد ہے: ”اور جب آپ اس شخص سے کہہ رہے تھے، جس پر اللہ نے احسان کیا اور آپ نے بھی اس پر احسان کیا کہ اپنی بیوی سے نباہ کر اور اللہ سے ڈرو، اور آپ اپنے دل میں وہ بات چھپا رہے تھے جسے اللہ نے ظاہر کرنا تھا۔“ یعنی اپنے دل میں یہ چھپا رہے تھے کہ اگر زید نے اسے چھوڑ دیا تو میں اس سے نکاح کر لوں گا۔ (تاریخ طبری: ج ۲ ص ۹۰) اس واقعے کے بعد کچھ دنوں بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق ہوئی اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آکر ام المؤمنین بن گئیں۔

مجھے یہ روایت نقل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر صورت حال ایسی بن گئی کہ اسے نقل کرنا ناگزیر ہو گیا۔ خاموشی کی صورت میں نہ صرف طبری بلکہ جلالین پڑھنے پڑھانے والے سبھی علماء و طلبہ اور اسلاف کی بہت سی نامی گرامی شخصیات پر کفر کی شدید ترین قسم یعنی توہین رسالت کا لیبل لگ رہا تھا۔ کچھ لوگ اسلاف کو بے ایمان اور گستاخ کہہ رہے تھے۔ اور کچھ لوگ دوسری انتہاء پر جا کر پوچھ رہے تھے کہ توہین رسالت پر سزا کیوں ہے جبکہ علماء خود اس کے مرتکب ہوتے آرہے ہیں اور انہیں کوئی سزا نہیں دی گئی۔ یہ مواد اخبارات اور سوشل میڈیا میں آکر عجیب بد مزگی پیدا کر رہا تھا، پس اظہار حقیقت کے لیے قلم حرکت میں لانا لازم تھا۔

یہ بد مزہ بحث شروع ہوئی جب محترم اور یا مقبول جان نے اپنے کالم ”ہمارے افسانہ ساز مؤرخین“ میں تحریر کیا تھا: ”طبری عام مسلمانوں کی بات کرتا تو برداشت تھا، لیکن اس نے توسید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے بارے میں بھی دو عدد من گھڑت قصے اس قدر فضول

اور بے ہودہ انداز میں تحریر کیے ہیں کہ انہیں درج کرنے کی بھی ہمت نہیں پاتا۔“
میں نے اس کے جواب میں محترم اور یا مقبول جان صاحب سے گزارش کی تھی: ”چاہے آپ انہیں نقل کرنے کی ہمت نہ پاتے ہوں، لیکن ان کا حوالہ تو دیجیے۔۔۔۔۔ ضروری نہیں کہ کسی روایت کا وہی مطلب ہو، جو آپ سمجھے ہوں۔“

اس کے بعد محترم کے ایک کالم کے آخر میں لگا ہوا درج ذیل جوابی نوٹ سامنے آیا:
”تاریخ طبری کے حوالے سے ایک قرض تھا، جو میں نے ادا کیا ہے۔ میں اسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دو گستاخانہ من گھڑت افسانے تخلیق کرنے کا مصنف سمجھتا ہوں، جس کا ذکر نہ قرآن پاک میں اس طرح ہے نہ احادیث کی کتب میں اور میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت کی وجہ سے طبری سے نفرت کرتا ہوں۔ ایک واقعہ حضرت زیدؓ کی سیدہ زینبؓ سے طلاق کا، جسے کمال بے ہودگی سے اس نے تحریر کیا اور دوسرا واقعہ غرائیق۔ کسی معترض کالم نگار، اخبار نویس یا دانشور میں حوصلہ ہے تو صرف سیدہ زینبؓ والا واقعہ پڑھ کر دیکھ لے اور اس کے باوجود جرأت رکھتا ہے تو اسے من وعن اپنے کالم کی زینت بنا کر دکھا دے۔“

قارئین! واقعہ میں من وعن نقل کر چکا ہوں۔ آپ نے پڑھ لیا ہے۔ اس میں کون سی بات ایسی ہے جسے بے ہودہ اور گستاخانہ کہا جائے اور طبری پر تو بڑی رسالت کا الزام عائد کیا جائے۔ کیا یہ بات معیوب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت کو جسے طلاق ملنے والی تھی اور سیرت و صورت، حسب و نسب ہر لحاظ سے اعلیٰ تھی، سہارا دینے کا سوچ رہے تھے۔۔۔۔۔ اسے عیب شمار کیا جائے گا یا اخلاق کی انتہاء۔ یا یہ بات ناقابل یقین ہے کہ ایک دن سیدہ رضی اللہ عنہا دو پٹے کے بغیر گھر میں تشریف فرما تھیں؟ اگر ایسا تھا تو یہ کوئی محال بات نہیں۔ ایک گرم ملک میں، گھر کی تنہائی میں کوئی عورت کچھ دیر کے لیے اور حنی اتارے ہوئے ہو تو کیا اسلام میں اس پر پابندی ہے! یا یہ اخلاق سے ماوراء حرکت ہے! یا غیر محرم پر لگاؤ رسالت کا اچانک پڑ جانا محال بات ہے؟ اس کا ذکر عصمتِ انبیاء کے منافی اور اسے نقل

کرنا تو بڑی رسالت ہے؟ یہ تو تب ہوتا جب انبیاء کرام بشری تقاضوں یا سہو سے مبرا ہوتے۔ امت کا کبھی بھی یہ عقیدہ نہیں رہا کہ پیغمبر اپنے تمام کمالات و امتیازات کے باوصف بشری خصوصیات سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ انبیاء کرام کو نیند آتی تھی، بھوک لگتی تھی، وہ کھاتے پیتے تھے، خرید و فروخت کرتے تھے۔ انہیں غصہ بھی آتا تھا، رنج بھی ہوتا تھا۔۔۔۔۔ (وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا) ”جب موسیٰ (علیہ السلام) لوٹے اپنی قوم کی طرف غضب ناک، افسوس کرتے ہوئے“ (اعراف: ۱۴۰) پیغمبروں کو ڈر اور خوف سے بھی سابقہ پڑتا تھا: (فَأَصْبَحَ فِي الْمَدِينَةِ خَائِفًا يَتَرَقَّبُ) ”پھر وہ (موسیٰ علیہ السلام) صبح کو آئے شہر میں ڈرتے ہوئے اور محتاط (القصص: ۱۷) پیغمبروں کو بھوک اور پیاس بھی لگتی تھی: (كُنَّا نَأْكُلُ الطَّعَامَ) ”وہ دونوں (حضرت مسیح اور حضرت مریم) کھانا کھاتے تھے۔ (المائدہ: ۷۵) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں سہو ہونا بھی حدیث سے ثابت ہے۔ (موطا: حدیث: ۳۸ سنن نسائی کبری: حدیث: ۱۱۵۰) ایک آدھ بار سوتے رہ جانا اور فجر کی نماز قضا ہونا بھی ثابت ہے۔ (طحاوی: حدیث: ۲۱۶۶)

سہو یا بھول چوک کے ایسے اکاؤنٹات گناہ کے زمرے میں نہیں آتے کہ عصمت کے منافی ہوں۔ یہ سب نکو بنی حکمتوں کے تحت ہوتا تھا، تا کہ ہر قسم کے حالات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور سیرت امت کے سامنے آجائے۔ کسی غیر محرم پر اچانک بلا قصد لگا پڑ جانا بھی سہو کی ایک شکل ہے۔ علماء و فقہاء نے اچانک لگا پڑ جانے کو بغیرہ گناہ بھی نہیں کہا۔ کسی کا اس میں اختلاف نہیں، کیونکہ خود ارشاد نبوی ہے: پہلی (اچانک) نظر تھجھے معاف ہے، اور دوسری کی تیرے لیے گنجائش نہیں۔ (مسند احمد: ج ۲ ص ۴۶۴۔ فان الاولیٰ لك والاخرة عليك)

جو حضرات واقعہ زینب کو تو بڑی رسالت کی حد تک بے ہودہ قرار دے رہے ہیں وہ بتائیں کہ جو چیز شریعت میں ایک عام امتی کے لیے گناہ نہیں، کیا پیغمبر کے لیے گناہ ہو جائے گی۔ جو چیز صغیرہ گناہ بھی نہیں، کیا نبی سے اس کا صادر ہو جانا، عصمتِ انبیاء کے خلاف ہوگا؟ ہم مسلمان ہیں مگر افسوس کہ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات

امام طبری --- کون؟

احتیاط لازم ہے

والاصفات کے بارے میں عقیدہ کیا ہونا چاہیے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا صفات ہیں، کیا امتیازات ہیں، کیا اخلاق و کمالات ہیں، کن چیزوں سے آپ موصوف ہیں۔ ہم میں سے بعض لوگ اپنی نادانیت یا محبت رسول کے بارے اپنے مخصوص تصورات کی بناء پر پیغمبروں کے بارے میں ایسے خیالات رکھتے ہیں کہ گویا بشری صفات کو ان کے لیے تسلیم کرنا یا بشری تقاضوں کی بھول کر بھی ان کی طرف نسبت کر دینا ان کے خیال میں تو ذیل رسالت ہے۔

اگر کوئی اصل عربی میں طبری کی روایت پڑھے شاید روایت کا یہ فقرہ سب سے زیادہ عجیب بلکہ سخت ماکوار محسوس ہوگا۔ ”فوقع اعجابها في قلب النبي صلى الله عليه وسلم“ (حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی پسندیدگی آئی۔) ہم اپنی سطحی و جذباتی ذہنیت کی بناء پر کم از کم اس عبارت کو ضرور گستاخانہ قرار دے دیتے مگر کیا سمجھتے کہ خود اللہ کے فرمان کے مطابق یہ ممکن بات نہیں۔ پیغمبر کے دل میں حسن کی پسندیدگی آ جانے کے امکان کا ذکر خود خالق کائنات نے کیا ہے: ”لَا يَجِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدِ وَلَا أَنْ تَبْكُلَ بَيْهًا مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَغْنَيْكَ حُسْنُهُنَّ“ ان کے علاوہ اور عورتیں آپ کے لئے حلال نہیں ہیں اور نہ یہ درست ہے کہ آپ ان بیویوں کی جگہ دوسری بیویاں کر لیں اگرچہ آپ کو ان (دوسری عورتوں) کا حسن اچھا معلوم ہو (الاحزاب: ۵۳) (روزنامہ اسلام ۹/ اگست ۲۰۱۵ء)

دوسری قسط:

طبری کی روایت میں صرف ”اعجاب“ (پسندیدگی) کا ذکر ہے۔ آیت میں زیادہ صراحت کے ساتھ ”اعجاب حُسن“ (حسن کی پسندیدگی) کا لفظ ہے۔ اچھی چیز کا اچھا لگنا، ایک فطری بات ہے۔ قلب و نظر کے صحت مند ہونے کی علامت ہے۔ خوشبو ہر کسی کے مشام کو معطر کرتی ہے اور اگر کسی کو نہیں محسوس ہوتی تو یہ خوبی نہیں، احساس کی کمزوری شمار ہوگی۔ پس اس روایت کو کس لحاظ سے گستاخانہ کہا جائے گا! ایک متاثر کن شخصیت سے متاثر ہونا کوئی انہونی بات ہو سکتی ہے؟ جمال اور بد صورتی میں فرق کر لینا اگر گناہ ہے تو ضرور روایت کو عصمتِ انبیاء کے مخالف قرار دیا جاسکتا ہے، اور اگر یہ کوئی گناہ نہیں بلکہ اللہ

امام طبری --- کون؟

احتیاط لازم ہے

کی دی ہوئی ان فطری نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو کم و بیش ہر انسان کو نصیب ہے تو پھر اس واقعے کو تو ذیل رسالت پر مبنی قرار دے کر طبری کو گستاخ قرار دینا بھی غلط ہے۔

اتنا ضرور ہے کہ طبری میں اس امکان کو واقعاتی شکل میں بیان کیا گیا ہے، یعنی ایسا ہوا تھا۔ قرآن مجید میں امکان بیان کیا گیا ہے یعنی ایسا ہو سکتا ہے، یہ ذکر نہیں ہے کہ ایسا کبھی ہوا بھی تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عالی کے لحاظ سے ہم یقیناً یہی چاہتے ہیں کہ اعلیٰ سے اعلیٰ بات آپ کی طرف منسوب ہو۔ ادنیٰ نامناسب چیزوں کی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی کی جائے۔ اس لیے محققین کی پیروی کرتے ہوئے اس واقعے کا انکار کرنا ہی بہتر ہے کیونکہ یہ ایک ضعیف روایت ہے مگر ساتھ میں قرآن میں مذکور ”امکان“ کا پہلو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمارے لیے اس روایت پر عصمتِ انبیاء کی نفی اور راوی پر تو ذیل رسالت کا حکم لگانے کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ اس بحث کے دو پہلو ہیں۔ (۱) یہ واقعہ ثابت ہے یا نہیں (۲) یہ واقعہ عصمتِ انبیاء کے منافی اور گستاخانہ ہے یا نہیں، اسے نقل کرنے والے تو ذیل رسالت کے مرتکب ہیں یا نہیں۔ محققین کے نزدیک یہ واقعہ پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔ رقم بھی انہی حضرات کی رائے کا قائل ہے۔ رہا نفس واقعہ کا تو ذیل رسالت پر مبنی ہونا، تو یہ مسئلہ غور و فکر کا تقاضا کرتا ہے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا مذکورہ قصہ طبری میں دو اسناد سے منقول ہے۔ ایک ابن زید کے حوالے سے جو میں نے پوری روایت لفظ بلفظ نقل کر دی ہے۔ دوسری روایت واقدی کی ہے جو ذرا طویل ہے، مگر قصہ بالکل یہی ہے، صرف چند باتیں زیادہ ہیں: ”ہذا ایک یہ کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اس وقت آنا کوندھ رہی تھیں۔ دوسرے یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر جلدی سے چادر اوڑھ لی اور اندر تشریف آوری کا کہا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوٹ گئے۔ تیسرے یہ کہ لوٹتے ہوئے آپ ”سبحان الله العظيم سبحان الله مصرف القلوب“ کا ورد کر رہے تھے۔ چوتھی بات یہ کہ حضرت زید کو واقعے کا اندازہ ہو گیا تھا، اس لیے حاضر ہو کر عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، شاید زینب آپ کو پسند آئی ہوں، میں انہیں طلاق دے دیتا ہوں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کر دیا۔

واقعی کی روایت میں موجودان چار زاید اجزاء کو لے لیں تب بھی انصاف سے بتائیے کہ ان میں کون سی بات گستاخی والی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن سے متاثر ہونا ہی عجیب لگ سکتا ہے، مگر اعجاب حسن کے امکان کا ذکر خود قرآنی آیت میں ہے۔ اگر روایت کو گستاخانہ کہا جائے تو اس آیت کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ اور اگر آیت میں کوئی تاویل ہو سکتی ہے تو وہی اس روایت میں بھی مانی جاسکتی ہے۔ اگر قرآن مجید کی بات سچ ہے (اور کسی مسلمان کو اس کی صداقت میں شبہ نہیں ہو سکتا) تو جو کچھ روایت میں نقل ہوا وہ بھی نہ محال ہے نہ عصمتِ انبیاء کے منافی۔

یاد رہے کہ یہ واقعہ طبری سے پہلے سیرت نگاری کے امام محمد بن سعد نے طبقات الکبریٰ میں، مشہور محدث امام حاکم نیثا پوری نے اپنے شہرہ آفاق حدیثی مجموعے ”مستدرک حاکم“ میں، علامہ سیوطی نے تفسیر الدر المنثور میں، علامہ شربینی نے تفسیر السراج المبرور میں، علامہ حلبی نے سیرت حلبیہ میں بھی نقل کیا ہے۔ عرب محقق ڈاکٹر خلیل عبدالکریم مرحوم (م ۲۰۰۲ء) نے ”لوعبدالمنجر“ میں واقعہ زینب بنت جحش پر بہت معتدل اور مفصل کلام کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس بارے میں مفسرین کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ نے اس واقعے کی روایات کو معتبر مانا ہے اور انہی کو شان نزول میں نقل کیا ہے، ان حضرات میں قتادہ، عبدالرحمن بن زید، عکرمہ، محمد بن یحییٰ، مقاتل، امام شعبی، ابن جریر، ابن جریر طبری، دحتری، بیضاوی، ابوسعود، ابن جزری، علامہ یعنی اور امام سیوطی جیسے لوگ ہیں۔ (کیا یہ بھی تو بدین رسالت کے مجرم سمجھے جائیں گے۔) دوسرا گروہ ان روایات کو سند کی کمزوری کی وجہ سے مسترد کرتا ہے۔ ان میں زہری، سدی، ابوبکر باقلانی، ابن حزم، ابن العربی، قاضی عیاض، قرطبی، ابن کثیر، ابن قیم اور ابن حجر جیسے حضرات شامل ہیں۔ راقم بھی اسی دوسرے گروہ کی رائے کو درست سمجھتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے گروہ کے علماء پر کچھ اچھا لالہ جائے۔ قریبی دور کے نامور محقق، فقیہ و مفسر علامہ آلوسی نے اپنی شاہکار تفسیر ”روح المعانی“ میں اس واقعے کو ذکر کر کے کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسا قصہ نقل کرنے سے احتراز ضروری ہے لیکن اگر یہ قصہ درست ہو تو اسے قلبی

میلان پر محمول کیا جائے گا جو انسان کے بس میں نہیں۔ (روح المعانی: ج ۲۲ ص ۲۵) کفر یا گستاخی کا فتویٰ انہوں نے بھی کسی پر نہیں لگایا۔

جہاں تک ”غرائیق“ والے واقعے کا تعلق ہے، وہ اس سے بھی زیادہ مشہور ہے۔ اکیلے طبری نے یہ روایت نقل نہیں کی۔ محمد بن سعد نے الطبقات الکبریٰ میں، امام ہزار نے اپنی مسند میں، امام طبرانی نے اپنی معجم کبیر میں، امام ڈیلمی نے مجمع الزوائد میں، امام بیہقی نے دلائل النبوة میں، علامہ سبکی نے الروض الانف میں، قسطلانی نے المواہب اللدنیہ میں، ابن اثیر نے الکامل فی التاریخ میں اور حافظ ذہبی نے تاریخ الاسلام میں اسے نقل کیا ہے۔ مفسرین میں سے ابواسحاق الزجاج (۳۱۱ھ) نے معانی القرآن میں، ابن ابی حاتم (۳۲۷ھ) نے تفسیر القرآن العظیم میں، فقیہ ابواللیث سرقندی (۳۷۳ھ) نے تفسیر بحر العلوم میں، امام ابواسحاق الثعلبی (۴۲۷ھ) نے الکشف والبيان عن تفسیر القرآن میں، قاضی القضاة ماوردی (۴۵۰ھ) نے تفسیر النکت والعيون میں، علامہ سعفی (۴۸۹ھ) نے تفسیر القرآن میں، امام بغوی (۵۱۰ھ) نے معالم التنزیل میں، امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) نے تفسیر مفاہیح الغیب میں، علامہ عزالدین عبدالسلام (۶۶۰ھ) نے اپنی تفسیر میں، بیضاوی (۶۸۵ھ) نے انوار التنزیل میں، امام نسفی (۷۱۰ھ) نے مدارک التنزیل میں اور علامہ خازن (۷۴۱ھ) نے لباب التاویل میں، غرائیق کا یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ اکیلے امام طبری پر فرض، اعتزال، روایت سازی اور توہین رسالت کا الزام کیوں؟ یہاں تو محدثین اور مفسرین کی پوری قطاران ”جرائم“ میں شریک ہے۔ (روزنامہ اسلام۔ ۱۰/ اگست ۲۰۱۵ء)

تیسری قسط:

قارئین! یہ بہت ہی سطحی بات ہوگی کہ ہم چند کتابیں بلکہ چند اوراق پڑھ کر بڑے بڑے اماموں کے ایمان پر جرح شروع کر دیں۔ آئیے دیکھیے! انہی مسائل کو اہل علم کس انداز میں لیتے ہیں اور کس طرح ان سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے مذکورہ واقعے اور غرائیق والی روایت پر محدثین اور محققین نے جرح بھی کی ہے، مگر بڑے سنجیدہ اور علمی انداز میں۔ روایتوں کو نقد و نظر کے معیار پر پرکھا ہے، روایت و درایت کے

اصول پر ان کا جائزہ لیا ہے اور انہیں مسترد بھی کیا ہے، مگر کسی نے ان کے ناقل علماء کو گستاخ یا جعل ساز نہیں کہا۔ یہ ہر دو راست دوسروں کی نیت اور ایمان پر حملہ ہے اور اسلاف اس سے بہت احتیاط کرتے تھے۔ حدیث نہیبؐ پر اہل علم کی تنقید مشہور ہے۔ ایک نہیں متعدد علماء نے اس کی سند پر جرح کی ہے، محققین اسے کئی وجوہ سے مسترد کرتے ہیں:

(۱) راوی عبدالرحمن بن زید بن اسلم تاج البعین کے درمیانی دور کے آدمی ہیں، ان کی وفات ۸۲ھ میں ہوئی ہے، اس لیے پیدائش کا زمانہ ۱۰۰ھ کے آس پاس ہوگا۔ وہ صحابی ہیں نہ تابعی، ان سے پہلے ایک دو راوی ضرور ہیں جن سے یہ واقعہ نقل ہوا ہے۔ چونکہ وہ نامعلوم ہیں لہذا سند خود بخود منقطع اور ناقابل اعتماد ہوگئی۔

(۲) عبدالرحمن بن زید بھی محدثین کے نزدیک ضعیف شمار ہوتے ہیں۔ وہ بذات خود نیک و صالح آدمی تھے، لیکن عبادت و مجاہدے کی کثرت کے باعث ان کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا، اس لیے روایات بھول جاتے تھے۔ (المندیب: ج ۶ ص ۱۷۸) اس لیے ان کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

(۳) دوسری روایت واقدی سے منقول ہے اور واقدی بھی ضعیف راوی ہیں۔ ایسی ضعیف روایتیں، عقیدے بلکہ احکام حلت و حرمت میں بھی دلیل نہیں بن سکتیں۔

(۴) سند میں یہ ضعف تو ہے ہی، اس کے علاوہ متن کا یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ اپنے دل کی بات یا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بتا سکتے تھے یا اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں واضح فرماتا۔ ہمیں ایسی کوئی صریح عبارت نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ملتی ہے نہ اللہ کے کلام میں، جس سے حضرت نہیب رضی اللہ عنہا کا ”اعجاب حسن“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثابت ہوتا۔ اللہ نے ”اعجاب حسن“ کا امکان ضرور بیان کیا ہے، مگر ہر ممکن شے واقع نہیں ہوتی۔ یہ کہنا کہ ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں حضرت نہیب رضی اللہ عنہا کی پسندیدگی آئی“ یقیناً سند میں موجود کسی راوی کا اپنا خیال اور بیان ہے، جو اس قدر نازک معاملے میں دلیل نہیں بن سکتا۔

غرائیق والے قصے پر بھی علماء کی جرح موجود ہے۔ امام بغوی اور امام رازی دونوں نے اپنی اپنی تفاسیر میں غرائیق والی روایات نقل کی ہیں اور ان کے باعث عصمت انبیاء پر وارو

شبہات کے جوابات دیے ہیں اور ان روایات کی مناسبت تو جہات پیش کی ہیں۔ امام بغوی نے واضح کیا ہے کہ اگر قصے کو مان بھی لیا جائے تو ظاہری مطلب نہیں لیا جائے گا جو عصمت انبیاء سے متعارض ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ”تلك الغرائيق العلي“ کے شریک الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں شیطان نے کہے تھے، مشرکین کو وہ ہم ہو گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرما رہے ہیں۔ دوسری طرف قاضی عیاض نے الشفا میں اور حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی مشہور تفسیر میں تو جہات اور تاویلات کی جگہ سند پر محدثانہ و محققانہ نگاہ ڈالی ہے اور مختلف طرق کو جانچ کر فیصلہ کیا ہے کہ یہ روایات ضعیف الاسناد ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں۔

قارئین! اہل علم اصول کے مطابق بحث کرتے ہیں اور حدود و قیود کا لحاظ رکھ کر موقف پیش کر دیتے ہیں۔ یہ کم علمی کی بات ہے کہ محدث و مطالعے کے بل بوتے پر اسلاف کو ہدف تنقید بنایا جائے اور توہین رسالت جیسے الزامات عائد کر دیے جائیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس سرہ الاعتدال میں تحریر فرماتے ہیں: ”مجھے حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل، دو اخبار پڑھ لیے یا ایک مہمل مضمون کسی اخبار میں لکھ دیا اور ان لوگوں پر تنقید شروع کر دیتے ہیں جو علوم کے سمندر پیے ہوئے ہیں۔ ہمیشہ یاد رکھو، کسی پر تنقید کرنے اور رد کرنے کے واسطے اس کی بات کی حقیقت اور اس کے دلائل کی قوت معلوم ہونا ضروری ہے۔ یہ انتہائی حماقت ہے کہ بغیر بات سمجھے ان پٹ شتاپ ہا تکنا شروع کر دے۔ ہم لوگوں کی مثال اس بندر کی سی ہے ایک ادراک کی گرہ کہیں سے اٹھالی اور اپنے آپ کو پنساری سمجھنے لگے۔“ (الاعتدال ص ۲۲)

آگے فرماتے ہیں: ”عالم میں کیسا انقلاب رونما ہو گیا ہے۔ کابر کا احترام بالکل جاتا رہا ہے۔ پھر اگر اہل علم اپنے علم کی روشنی میں ان کے خلاف کچھ بات کہیں، تب بھی ایک وجہ میں گنجائش ہو سکتی ہے مگر وہ اہل قلم جن کا مضمون لکھ دینا ہے یا ایک شہرہ تفریر کر دینا ہے، ایسے بے جا الفاظ سے روکتے ہیں جو اپنے سے چھوٹوں کے لیے بھی استعمال کرنا ماموزوں ہے۔ ان باتوں کو دیکھ کر میرے استعجاب کی انتہا نہیں رہتی۔ میری ایک بات غور سے سنو، ہمیشہ ایسی چیز پر

لب کشائی کرو جس کے پورے مالہ و ماعلیہ پر عبور ہو۔“ (الاعتدال: ص ۲۳)

روایت سیدہ نسیبہؓ اور روایت غریبہ جیسے درجنوں مسائل ہیں کہ مدارس دینیہ میں تفسیر، حدیث، عقائد اور فقہ کے پیرائے میں ان پر روزانہ بحث ہو رہی ہوتی ہے۔ کہیں کسی روایت پر سند کے لحاظ سے جرح ہو رہی ہوتی ہے، کہیں کسی موقف کو روایت کی روشنی میں مسترد کیا جا رہا ہوتا ہے۔ کبھی امام شافعیؒ پر بات ہو رہی ہوتی ہے کبھی ابن ماجہؒ پر۔ کہیں شیخ البانیؒ کی کسی تحقیق کی تردید ہے۔ کبھی ابن حزمؒ اور علامہ شوکانیؒ پر جرح، کہیں ابن تیمیہؒ کی کسی عبارت پر بحث ہے۔ کبھی ابن حجر اور حافظ ذہبیؒ کی آراء کا تقابل۔ مگر کہیں آپ یہ نہیں دیکھیں گے کہ اسلاف میں سے کسی کو گستاخ، کسی کو کافر، کسی کو ضعیف ساز، کسی کو کذاب اور کسی کو زندیق کہا جاتا ہو۔

تو تین رسالت کفر و ارتداد کی تمام اقسام میں شدید ترین ہے۔ کسی پر کفر کا فتویٰ لگانا آسان بات نہیں بہت بڑی جرأت اور بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ فقہاء اس بارے میں اس قدر احتیاط کرتے ہیں کہ اگر کسی شخص کا کوئی قول یا کوئی فعل ناپاوارے پہلوؤں سے کفر معلوم ہوتا ہو، صرف ایک پہلو سے دیکھا جائے کہ وہ کفر نہ ہو تو اسے گنجائش دیتے ہوئے احتیاطاً کافر نہیں کہتے۔ ہاں اگر وہ کفر یہ پہلو پر اصرار کر کے اپنے لیے خود کوئی گنجائش نہ چھوڑے تو الگ بات ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ نے اپنی آپ جنت میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ کوئی شخص تمباکو لینے گیا، تمباکو فروش سے مختلف اقسام کا تمباکو لے کر اسے چکھتا اور کہتا کہ اس سے زیادہ کڑوا دکھاؤ۔ ہر قسم کا تمباکو چکھ کر بھی مطمئن نہ ہوا تو تمباکو فروش نے کہا: ”اس سے زیادہ کڑوا تو بس اللہ کا نام ہے۔“ یہ سنتے ہی شور مچ گیا کہ یہ کافر ہے، اللہ کے نام کو کڑوا کہہ رہا ہے۔ عام علماء سے پوچھا گیا تو انہوں نے بھی کہا کہ کافر ہو گیا۔ مگر ایک فقیہ نے اس مسئلے پر غور کیا اور فرمایا کہ یہ شخص پکا مؤمن ہے۔ اس نے اللہ کی توہین نہیں تعریف کی ہے۔ تمباکو والوں کے ہاں کڑوا پن تعریف ہے، تنقیص نہیں۔ اس شخص کا مطلب تھا کہ اس سے زیادہ لطف والی چیز بس اللہ کا نام ہے۔

کسی کے قول و فعل پر کفر کا فتویٰ لگانا فقہاء اور مفتیان ہی کو زیب دیتا ہے۔ وہی اس بارے میں تمام پہلو دیکھ کر صحیح اور محتاط رائے دے سکتے ہیں۔ پھر اگر معاملہ کفر کی اس خاص قسم

کا ہونے تو تین رسالت کہا جاتا ہے تو ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے۔ اور جس پر الزام عائد کیا جا رہا ہے، اگر وہ کوئی عالم، فقیہ، محدث اور دینی پیشوا ہے تو مسئلہ انتہائی نازک صورت اختیار کر جاتا ہے۔ ایسے میں ایک دو اہل علم کی رائے معتبر نہیں ہونی چاہیے بلکہ فقہاء کی ایک جماعت اس قول و فعل پر غور کرے کہ آیا اس کا کوئی صحیح محل ہو سکتا ہے۔ اگر سب کو یہ محسوس ہو کہ یہ گستاخی اور توہین ہے اور اس میں کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی، تب ہی تکفیر کا فتویٰ جاری ہونا چاہیے ورنہ احتیاط ہی لازم ہے۔ ایسا نہ ہو ہم اپنے جذباتی پن یا کم علمی کی وجہ سے کسی کی بات کو غلط پیرائے میں لے کر اسے تو تین رسالت سے تعبیر کر دیں۔ (روزنامہ اسلام - ۱۱/ اگست ۲۰۱۵ء)

چوتھی اور آخری قسط:

درحقیقت مستشرقین اور ان کے تلامذہ مگر تین حدیث کے فکری حملوں سے دفاع کا یہ طریقہ بہت ہی کمزور ہے کہ وہ جس روایت پر اشکال کریں، ہم اسے اپنے علمی ورثے سے خارج کرنے (کا) اعلان کر دیں۔ ایسی کون سی چیز ہے جو ان کج فہموں کے نزدیک قابل اعتراض نہیں۔ واقعہ نسیب سے کہیں زیادہ زور شور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعداد و زودواج پر اعتراض کیا جاتا ہے! اسے غلط رنگ دے کر آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت و پاکیزگی پر انگلی اٹھائی جاتی ہے تو کیا اس کے جواب میں ہم ”امہات المؤمنین“ کا ذکر سیرت و تاریخ سے نکال دیں اور کہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف ایک نکاح ثابت ہے، باقی سب محدثین اور سیرت نگاروں کی جعل سازی ہے! اگر ہم یہ کہنے لگیں تو مستشرقین کو بھلا اور کیا چاہیے! وہ ہمیں اسلاف سے برگشتہ ہی تو کرنا چاہتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر کفار شروع سے بے ہودہ قسم کے اعتراضات کرتے آئے ہیں، مگر صحابہ کرامؓ اس کا جواب کس طرح دیتے تھے! نمونہ لحظہ ہو۔ ایک کافر نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے طعنیہ انداز میں پوچھا: ”تمہارے نبی تمہیں سب کچھ سکھاتے تھے، بول و براز کرنا بھی۔“ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں کہا کہ ہمارے نبی ایسی باتیں نہیں کرتے تھے۔ صاف صاف فرمایا: ”ہاں بالکل! حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں بتاتے تھے کہ ہم قبلہ

امام طبری --- کون؟

احتیاط لازم ہے

رخ ہو کر دائیں ہاتھ سے استنجانہ کریں، تین ڈھیلوں سے کم استعمال نہ کریں، جن میں ہڈی یا لید نہ ہو۔“ ﴿مسلم: کتاب الطہارۃ، باب الاستطابہ۔ سنن ابوداؤد، کتاب الطہارۃ، حدیث ۷۶﴾ اور یا مقبول جان صاحب کے علم و قلم کو میں اُمت کا اثاثہ سمجھتا ہوں، ان کی بے باکی اور خلوص کا معترف ہوں۔ مغربیت اور سیکولرزم کے مقابلے میں وہ جس طرح اہل اسلام کا دفاع کر رہے ہیں، وہ انتہائی قابلِ قدر ہے۔ میں ان کے لیے دعا گو ہوں۔ میرے موجودہ گزشتہ کالموں کے کسی جملے سے انہیں تکلیف پہنچی ہو تو میں تہ دل سے معذرت خواہ ہوں۔ میں ہرگز ان کی عزت و تکریم میں کمی نہیں چاہتا اور اگر کوئی دوسرا ایسا کرے تو مجھے افسوس ہوگا۔ ہاں اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ وہ اسلام کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے اعتدال کا دامن تھامیں۔ اگر میری باتوں میں انہیں کوئی وزن محسوس ہو تو عشقِ رسالت ہی کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی رائے سے رجوع کریں۔ شریعت یہی حکم دیتی ہے کہ جو غلطی علانیہ ہو، اس سے رجوع بھی علانیہ ہونا چاہیے۔ ایک جلیل القدر عالم کی اہانت، کوئی معمولی بات نہیں، آخرت میں اس پر شدید پکڑ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ حرکت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی نہیں سخت ماریضی کا باعث بن سکتی ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ کی تحریر کا یہ ٹکڑا غور سے پڑھیے: ”جو لوگ علمائے حق کے درپے آزار ہیں، ان کی اہانت اور تذلیل کفر سمجھتے ہیں اور کرتے ہیں، وہ غالباً بلکہ یقیناً علماء کی بہ نسبت اپنا نقصان زیادہ کر رہے ہیں۔ علماء کا تو زیادہ سے زیادہ یہ نقصان کریں گے کہ کچھ دنیاوی متاع میں شاید نقصان پہنچا سکیں، بشرطیکہ وہ قدر میں کچھ کمی کرنے پر قادر ہوں یا دنیوی عزت و جاہ کو جو نہایت ہی بے وقعت اور ناپائدار چیز ہے، نقصان پہنچا سکیں گے۔ مگر یہ لوگ اپنے آپ کو برباد کر رہے ہیں اور اپنا دینی نقصان کر رہے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ شخص میری امت میں سے نہیں ہے جو ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے، ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے عالم کی قدر نہ کرے۔ (ترغیب)۔ اس ارشاد نبوی کے بعد علماء کو علیٰ اعموم گالیاں دینے والے، برا بھلا کہنے والے، اپنے کو امت محمدیہ میں شمار کرتے رہیں لیکن صاحب امت ان کو اپنی امت میں شمار کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین شخص ایسے ہیں

امام طبری --- کون؟

احتیاط لازم ہے

جن کو منافق کے سوا کوئی شخص ہلکا (ذلیل) نہیں سمجھ سکتا، ایک وہ شخص جو اسلام کی حالت میں بوڑھا ہو گیا ہو، دوسرے اہل علم، تیسرے منصف بادشاہ (ترغیب)۔ حافظ ابن عساکر فرماتے ہیں: علماء کے گوشت (یعنی غیبت) نہایت زہریلے ہیں اور ان کی شان میں گستاخی کرنے والوں کی پردہ دری میں اللہ کی عادت سب کو معلوم ہے کہ جو لوگ علماء کی اہانت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی پردہ دری فرماتے ہیں۔ جو شخص ان کو عیب لگانے میں لب کشائی کرتا ہے۔ اس کے مرنے سے پہلے حق تعالیٰ شانہ اس کے دل کو مردہ بنا دیتے ہیں۔ (الاعتدال: ص ۱۴۸) حضرت شیخ آگے لکھتے ہیں: ”یہ میرا مقصود ہرگز نہیں ہے کہ عالم جو بھی کہے وہ صحیح ہے اور اس کے کسی قول پر رد اور انکار نہ کیا جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جس کے قول پر رد نہ کیا جاسکے یا اس کے اقوال و افعال میں غلطی کا احتمال نہ ہو، لیکن رد کرنے کے واسطے اور غلطی پکڑنے کے واسطے بھی شریعت مطہرہ میں حدود قائم ہیں، اس کے درجات ہیں، اس کے قواعد اور آداب ہیں تا وقتیکہ ان سے واقفیت نہ ہو، رد کرنے کا حق بھی کسی کو نہیں۔“ (الاعتدال: ص ۱۵۲)

جناب اور یا مقبول جان کا مدارس دینیہ سے عقیدت مندانہ تعلق ہے اور وہ دینی پروگراموں میں معزز زمہان کی حیثیت سے تشریف بھی لاتے رہتے ہیں۔ گزارش ہے کہ کبھی کبھار وقت نکال کر کسی دینی مدرسے کی حدیث، فقہ یا تفسیر کی کلاس میں بھی شرکت کر لیا کریں۔ اندازہ ہو سکے گا کہ وسعتِ نظری کیا ہوتی ہے، علمی بحث کس طرح کی جاتی ہے اور اختلافِ رائے کی حدود کیا ہوتی ہیں؟ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ کی تصنیف ”الاعتدال فی مراتب الرجال“ (جس کا حوالہ اس مضمون میں کئی جگہ دیا گیا ہے) اختلافِ رائے کی حدود سمجھنے کے لیے بہت ہی مفید ہے۔ ان شاء اللہ اس کا مطالعہ کرنے سے فکر و نظر کو وسعت ملے گی اور ان شاء اللہ زبان و قلم کے استعمال میں احتیاط کی توفیق نصیب ہوگی۔ (روزنامہ اسلام ۱۲/ اگست ۲۰۱۵ء)

از۔ اوریا مقبول جان

”خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے“

مدتوں سے میرا یہ دستور رہا ہے کہ میں آج کے پُر آشوب دور میں ان لوگوں کے دفاع کو اپنا فرض عین سمجھتا ہوں جو نا مساعد حالات، زمانے کی بے رخی، معاشی حالات کی ستم ظریفی اور اہل اقتدار کے ظلم و ستم کے باوجود منبر و محراب پر اللہ کے دین کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔ مسجد کا ایک خطیب دانستہ یا نادانستہ طور پر اسلام کی علامت ہے اور ان لوگوں نے کمال جانفشانی سے اس علامت کو قائم رکھا ہے۔

ان کے اسلاف جن کے یہ وارث ہیں انہوں نے عمر بھر ایک دوسرے کے خیالات، نظریے، عقیدے اور تشریح و توضیح کا احترام کیا۔ فقہ کے چاروں امام اپنی تشریح کو ایک رائے تصور کرتے تھے اور دوسرے کی رائے کا احترام کرتے تھے۔ یہ سب تمہید مجھے اس لئے باندھنا پڑ رہی ہے کہ آج سے کچھ عرصہ قبل میں نے ”ہمارے افسانہ ساز مؤرخین“ کے عنوان سے ایک کالم تحریر کیا جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی ایمانیات، عقائد اور ان محترم شخصیات، جن کے کردار کی کواہی اللہ نے قرآن اور رسول اللہ نے اپنی احادیث میں دی ہے، انہیں تاریخ کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھیں گے تو یہ ظلم عظیم ہوگا۔ اس لئے کہ تاریخ بے سرو پا داستانوں اور جھوٹ سچ کا ملغوبہ ہے۔ دنیا کی کوئی تاریخ اپنے سچے اور کھرے ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ جنہیں اللہ صمد یقین، شہداء اور صالحین کے لقب سے پکارتا ہے اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جن کے مرتبے کی تصدیق کرتے ہیں ان کو تین سو سال بعد لکھے جانے والے جھوٹ اور سچ کے پلندے، یعنی تاریخ کی کواہی پر رکھ کر پکھنا زیادتی ہے۔

مسلمان دنیا میں فخر کے ساتھ سینہ تان کر ایک بات کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے حدیث نویسی جو مغرب کے ہاں بھی تاریخ ہی کی ایک قسم سمجھی جاتی ہے، اس میں جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کا ایک ایسا علم ایجاد کیا، جس نے یہ طریقہ وضع کیا کہ ہر سنی سنائی بات یا روایت اس قابل نہیں ہوتی کہ اسے تحریر کیا جائے جب تک اس کو بیان کرنے والے اپنے کردار میں سچے، ایماندار اور صاحب امانت نہ ہوں۔ لیکن دنیا کی ہر تاریخ جھوٹے اور کذاب راویوں کی روایتوں سے بھری پڑی ہے۔ کسی بھی مسلمان مؤرخ نے کبھی بھی اس معاملے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ میں نے اس سلسلے میں تاریخ طبری کا حوالہ خاص طور پر دیا تھا، کیونکہ یہ مغرب کے ان مصنفین کی محبوب کتاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں پر دشنام طرازی کرنا چاہیں تو انہیں حوالے اسی قسم کی کتابوں سے ملتے ہیں۔ اس پر پار لوگوں نے ”طبری“ کے دفاع میں بہت کچھ لکھا اور میں نے جواب میں صرف یہ نوٹ تحریر کیا کہ ”طبری پر لکھنا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کیونکہ دو واقعات ایک حضرت زینبؓ اور حضرت زیدؓ کی طلاق اور دوسرا واقعہ ”غرائق“ طبری نے جس انداز میں بیان کیا ہے کوئی انہیں کالم میں لکھنے کی ہمت تو ایک طرف پڑھنے کی برداشت نہیں رکھتا۔“

میری حیرت کی اس وقت انتہاء نہ رہی جب میرے سیکولر دوست تو میری اس وضاحت پر خاموش ہو گئے، لیکن چند علمائے امت اپنی تلواریں سنوت کر مجھ پر پل پڑے۔ وہ لوگ جن کا دفاع میں صرف اللہ کی رضا کے لئے کرتا رہا ہوں۔ ان علماء نے طبری کا دفاع صرف اس لئے کیا کہ گزشتہ چند سو سالوں سے ان کے مدارس میں ”تفسیر جلالین“ پڑھائی جاتی ہے اور اس میں اس واقعہ غرائق کا ذکر ہے، جس کا ماخذ طبری کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ سب سے پہلے ولیم میور نے اس واقعہ کے حوالے سے اپنے غلاظت بھرے مضامین لکھے۔ دفاع طبری اور میری مذمت کا سلسلہ ملکوں ملکوں پھیل گیا اور تازہ ترین مضمون بھارت کے مولانا عبد المتین منیری صاحب نے تحریر کیا ہے۔ پہلے تو انہوں نے مجھے طنزاً سول مردوں سے وابستہ کہہ کر بات کا آغاز کیا اور پھر شک ظاہر کیا کہ شاید میں عربی زبان سے ناواقف ہوں اور یہ بھی فرض کر لیا کہ میں

امام طبری۔۔۔ کون؟

”خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے“

نے ہو سکتا ہے انگریزی ترجمے سے تاریخ طبری پر بھی ہو۔ انہوں نے مجھے اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور معافی مانگنے اور غلطی کا علی الاعلان اظہار کرنے کے لئے کہا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے معافی تو میں دن رات مانگتا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس روئے زمین پر میں بہت ہی گناہ گار اور عاصی شخص ہوں جس کی بچت صرف اور صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے بغیر ممکن نہیں۔ میرا عربی کا علم بھی کمزور ہے اور میں علوم دین کے سمندر کا اس طرح غواہ نہیں جیسے علماء دین ہوتے ہیں۔ میں خود کو ان کے سامنے طفل مکتب سمجھتا ہوں۔ لیکن میں کیا کروں کہ جب قرآن پاک ایک واقعہ کی تفصیل بیان کرتا ہے اور معتبر احادیث میں بھی اس کی تفصیل بالکل ویسی ہی ہوتی ہے۔ لیکن تین سو سال بعد پیدا ہونے والا مؤرخ بالکل اس کے الٹ تحریر کر رہا ہوتا ہے۔ تاریخ کا تو عالم یہ ہے کہ خود ابن جریر طبری کے ایک ہونے کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ ایک ابن جریر بن رستم اور دوسرا ابن جریر بن یزید ہے اور دونوں ہی مصنفین ہیں۔ ایک کوشیجہ علماء طباطبائی، ابن الندیم، علی بن داؤد حلی، ابو جعفر طوسی اور سید خوی اہل تشیع میں سے مانتے ہیں اور دوسرے کو سنی علماء کا دوجہ دیتے ہیں۔ اور کہیں بھی معلوم نہیں پڑتا کہ تصدیق کی جائے کہ کوئی کتاب کس طبری کی لکھی ہوئی ہے۔

لیکن اگر تاریخ طبری کو ہی دیکھا جائے، جو زیر بحث ہے تو ڈاکٹر خالد طلال کبیر نے طبری کے اہم راویوں کا جائزہ لیا ہے جو ان کے نزدیک بارہ ہیں۔ یہ طبری کی تاریخ کا بنیادی ماخذ ہیں۔ ان بارہ میں سات وہ ہیں جن پر ائمہ جرح و تعدیل جھوٹے یا متہم بالکذب ہونے کا الزام لگاتے ہیں اور پانچ ثقہ راوی ہیں۔ اب یہ دروغ کو راویوں یعنی وہ جن پر جھوٹے ہونے کا الزام ہے ان کی روایتوں کی تعداد ملاحظہ کریں۔

نمبر شمار	نام راوی	تعداد روایات
(۱)	محمد بن سائب کلبی	۱۲
(۲)	ہشام بن محمد بن سائب کلبی	۵۵
(۳)	محمد بن عمر واقدی	۴۴۰

امام طبری۔۔۔ کون؟

”خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے“

(۴)	سیف بن عمر شیبی	۷۰۰
(۵)	ابو جعفر لوط بن یحییٰ	۶۱۲
(۶)	ہشام بن عدی	۱۶
(۷)	محمد بن اسحاق بن یسار کی	۱۶۴

ان تمام کو ملا کر ۱۹۹۹ روایات بنتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں طبری نے سچے اور ثقہ راویوں کی صرف ۲۰۹ روایات کو تاریخ کا حصہ بنایا ہے۔

نمبر شمار	نام راوی	تعداد روایات
(۱)	زمیر بن بکاء	۸
(۲)	محمد بن سعد	۱۶۴
(۳)	موسیٰ بن عقبہ	۷
(۴)	خلیفہ بن خیاط	۱
(۵)	دہب بن منبہ	۴۶

تاریخ طبری میں یہ ہے جھوٹے اور ثقہ راویوں کی روایتوں کا تناسب۔ حالت یہ ہے کہ عباسی حاکم معتضد باللہ کا رسالہ بغیر کسی چھان پچھ کے تاریخ کا حصہ بنایا گیا جو خالصتاً بنو امیہ سے بغض و عناد اور قبائلی دشمنی کی بنیاد پر تحریر کیا گیا تھا۔

مہم بالکذب اور جھوٹے راویوں کی روایتیں طبری نے بلا کم و کاست تحریر کر دیں اور کئی تو ایسی ہیں جن میں معمولی سی عقل بھی استعمال کی جاتی تو قصہ جھوٹا محسوس ہوتا۔ جیسے سیدہ زینبؓ والے واقعہ میں ایسے لگتا ہے جیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پہلی دفعہ دیکھا ہے جب کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد تھیں۔ یہیں سے مؤرخ کی نیت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اس تاریخ میں اپنی مرضی کا فسانہ جمع کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس تاریخ طبری کا جو نسخہ ہے وہ خوش قسمتی سے عربی میں ہے اور قاہرہ سے چھپا ہے اور جسے میں اپنی کمزور عربی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اور ترجمہ بھی دیکھتا ہوں۔ آپ حیران ہوں گے کہ طبری کی تفسیر کے رجال کا

کام تو مصر کے محمود شا کرنے کیا ہے لیکن کسی نے آج تک تاریخ طبری کے رجال اور راویوں پر مفصل کام نہیں کیا۔ اس لئے اگر مسلمانوں کی تاریخ کے راویوں کی تحقیق کی جائے کہ ان میں کردار کے اعتبار سے جھوٹا کون تھا تو پھر آدھی سے زیادہ تاریخ جھوٹ کا پلندہ ثابت ہوگی۔

میرا معاملہ نہ طبری سے پر خاش کا ہے اور نہ ہی بلاذری اور ابن سعد سے۔ میرا دکھ یہ ہے کہ جس کسی نے میرے سلاطین پر انگلی اٹھائی ہو، میرے دین کے نقص بیان کرنا ہوں وہ ان مؤرخین کے جمع کئے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیتا ہے۔ الحاد کا دروازہ انہی کے جمع کئے گئے جھوٹ سے کھلتا ہے۔ آپ اسلام کے خلاف لکھی جانے والی تمام کتابوں کو اٹھالیں، تو بین رسالت پر مبنی کتب کا مطالعہ کریں اور ان میں کہیں نہ کہیں طبری اور اس کے قبیل کے مؤرخین جہاں تک نظر آئیں گے۔

وہ لوگ انہی کی روایات کو بنیاد بناتے ہیں۔ حیرت ہے وہ تمام ”شائمین رسول اللہ“ تو ایسی باتیں تحریر کرنے پر واجب القتل قرار دیئے جاتے ہیں اور جس مؤرخ نے یہ جھوٹ اکٹھا کر کے تاریخ کا حصہ بنایا وہ محترم۔ پتہ نہیں کیوں میرے ان صاحبان علم علماء کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث یاد نہیں آتی کہ ”کسی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے آگے سنا تا پھرے۔ کیا ہمارے مؤرخین نے ایسا نہیں کیا؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی تاریخ مرتب کی جائے جو حدیث اور تاریخ کے راویوں کی چھان پچھان کے بعد لکھی جائے۔ اللہ مسعود احمد بی ایس سی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جنہوں نے ”تاریخ اسلام والمسلمین“ لکھی جو قرآن و حدیث کی روایتوں پر مبنی ہے۔ یہ انتہائی اہم کام تھا جو مرحوم نے کیا اور یہ ان کی جماعت المسلمین کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔ اس کے ساتھ تاریخ کے راویوں کی تحقیق بھی ضروری ہے۔ اور ایسی سچی تاریخ ہماری ضرورت ہے۔ (روزنامہ ایکسپریس ۴۔ ستمبر ۲۰۱۵ء)

{نوٹ: مسعود احمد بی ایس سی کے افکار و نظریات جاننے کے خواہش مند حضرات زیر نظر کتاب کے مؤلف کی تالیف ”فرقہ مسعودیہ اور جماعت المسلمین کا علمی محاسبہ“ کی طرف مراجعت کریں۔}

امام طبری

(۲۲۴ھ --- ۳۱۰ھ)

امام طبری عام طور پر ”ابو جعفر محمد بن جریر الطبری“ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے دادا ”یزید“ کے نام تک اتفاق پایا جاتا ہے البتہ پردادا کے نام میں اختلاف ہے۔

امام ذہبی (م ۴۸۰ھ) اور حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) نے ”محمد بن جریر بن یزید“ کے تحت ہی ان کا ”ترجمہ“ لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو: میزان الاعتدال۔ الجزء الثالث ص ۴۹۹۔ لسان المیزان الجزء الخامس ص ۱۰۰۔

امام ذہبی نے اپنی ایک دوسری کتاب میں خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) کے حوالے سے یہ شجرہ بیان کیا ہے کہ: ”محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب“ (سیر اعلام النبلاء الجزء الرابع عشر ص ۲۶۹) یاقوت حموی (م ۶۲۶ھ) نے بھی مذکورہ شجرہ ہی لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو: معجم الادباء المجلد السادس ص ۵۱۳ جمیل العطار (جنہوں نے ”جامع البیان عن تاول آی القرآن“ کی توثیق و تخریج کی ہے) ابن جریر کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ:

”هو أبو جعفر محمد بن جرير بن يزيد بن خالد الطبري، وقيل: يزيد بن كثير بن غالب: مؤرخ، مفسر، محدث، مقري، فقيه، أصولي، من أكابر الأئمة المجتهدين.“ (جامع البیان عن تاول آی القرآن، الجزء الاول ص ۴۔ طبع بیروت)

امام طبری بحر قزوین کے جنوب میں واقع طبرستان کے شہر ”آمل“ میں ۲۲۴ھ کے اواخر یا ۲۲۵ھ کے آغاز میں پیدا ہوئے۔

سولہ سال کی عمر میں تحصیل علم کے لئے مختلف ملکوں اور شہروں بالخصوص عراق، شام، مصر، کوفہ، بصرہ اور بغداد میں سرگرداں رہے۔ حتیٰ کہ ہر علم و فن میں کمال حاصل کیا۔ تفسیر، حدیث، فقہ

اور تاریخ میں ان کی شہرت رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ (طلب العلم بعد الأربعین و مبین۔ سیر اعلام النبلاء الجزء الرابع عشر ص ۲۶۷)

احمد بن کامل الشجری (م ۳۵۰ھ) نے خود امام طبری سے روایت کی ہے کہ:

حفظت القرآن ولی سبع سنین، وصلیت بالناس وانا ابن ثمانی سنین، وکتبت الحديث و انا ابن تسع سنین“

میں نے سات سال کی عمر میں قرآن کریم یاد کیا، آٹھ سال کی عمر میں لوگوں کو نماز پڑھائی اور نو سال کی عمر میں حدیث لکھنا شروع کی۔

امام طبری تحصیل علم کے بعد بغداد میں درس و تدریس کے علاوہ دس سال تک منصب افتاء پر بھی فائز رہے اور اس دوران وہ فقہ شافعی کے مطابق فتوے دیتے رہے جس کی بناء پر ان کا شمار شافعی علماء میں ہونے لگا، بالآخر بغداد میں ہی ہفتہ کی شام ۲۸ شوال ۳۱۰ھ کو انتقال کر گئے۔ ان کی تدفین اگلے دن اتوار کو اپنے گھر میں ہی عمل میں آئی کیونکہ لوگوں نے انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے سے روک دیا تھا۔ ایک قول کے مطابق ان کی قبر مصر میں بتائی گئی ہے۔ لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے۔ (وما اشتهر قبره بمصر فغير صحيح)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (م ۱۳۹۹ھ) لکھتے ہیں کہ:

”بعض فقہی مسائل اور حدیث غدیر خم کے معاملہ میں شیعہ مسلک سے اتفاق کی بناء پر بعض لوگوں نے خواہ مخواہ انہیں شیعہ قرار دے ڈالا اور ایک بزرگ نے تو ان کو امام من ائمة الامامية“ تک قرار دے دیا۔۔۔ دراصل سب سے پہلے حنابلہ نے ان پر فرض کا الزام اس غصہ کی بناء پر لگایا تھا کہ وہ امام احمد بن حنبل کو صرف محدث مانتے تھے فقیہ نہیں مانتے تھے۔ اسی وجہ سے حنبلی ان کی زندگی ہی میں ان کے دشمن ہو گئے تھے، ان کے پاس جانے سے لوگوں کو روکتے تھے اور ان کی وفات کے بعد انہوں نے مقابلہ مسلمین میں ان کو دفن تک نہ ہونے دیا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے گھر پر دفن کئے گئے۔“ (خلافت و ملوکیت ص ۳۱۳-۳۱۴)

یا قوت حموی (م ۶۲۶ھ) لکھتے ہیں کہ: ”ودفن لیلاً خوفاً من العامة لأنه کان

یتهم بالتشیع...“ (معجم الادباء المجلد السادس ص ۵۱۴)

امام طبری عوام کے خوف سے رات کے وقت دفن کئے گئے کیونکہ وہ شیعیت سے متم تھے۔

علامہ ابن اثیر جزری (م ۶۳۰ھ) لکھتے ہیں کہ:

دفن لیلاً بداره لأن العامة اجتمعت، و منعت من دفنه نهاراً و ادعوا عليه الرقص ثم ادعوا عليه الالحاد...“ (اکامل فی التاريخ جلد ۸ ص ۱۳۳)

”امام طبری رات کے وقت اپنے گھر پر ہی دفن کئے گئے کیونکہ عام لوگ جمع ہو گئے تھے جنہوں نے دن کے وقت انہیں دفن کرنے سے روک دیا تھا، پہلے ان پر فرض یعنی رافضی ہونے کا پھر اس کے ساتھ ساتھ ان کے طہر ہونے کا بھی دعویٰ کیا گیا۔“

امام ابن کثیر (م ۷۴۴ھ) لکھتے ہیں کہ:

”ودفن فی داره لأن بعض عوام الحنابلة و رعاہم منعوا من دفنه نهاراً و نسبوا الی الرقص“ (البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۱۴۷)

”امام طبری اپنے گھر میں ہی دفن کئے گئے کیونکہ بعض حنابلہ نے دن کے وقت انہیں دفن کرنے سے روک دیا تھا اور انہیں رافضیوں کی طرف منسوب کیا تھا۔“

امام طبری کے ”تشیع و فرض“ پر مستقل بحث آگے آ رہی ہے۔ مگر اس الزام کے باوجود علماء نے ان کے علم و فضل کا واضح طور پر اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی (م ۶۳۳ھ) لکھتے ہیں کہ:

”کان أحدائمة العلماء، یحکم بقوله، ویرجع الی رأیه لمعرفته و فضله، و کان قد جمع من العلوم ما لم یشاركه فیہ أحد من اهل عصره، فکان حافظاً لکتاب الله، عارفاً بالقراءات، بصیراً بالمعانی، فقیهاً فی أحکام القرآن، عالماً بالسنن و طرقها، صحیحها و سقیمها و ناسخها و منسوخها، عارفاً بأقوال الصحابة والتابعین، عارفاً بأیام الناس و أخبارهم“ (سیر أعلام النبلاء الجزء الرابع عشر ص ۲۶۹)

”وہ ائمہ علماء میں سے ایک امام ہیں، ان کے قول پر فیصلہ کیا جاتا ہے اور ان کی رائے

کی طرف رجوع کیا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے علم و فضل کے لحاظ سے اس لائق ہیں۔ علوم میں ان کی جامعیت ایسی تھی کہ ان کے معاصرین میں کوئی شخص ان کا شریک نہ تھا۔ وہ قرآن کے حافظ، قرأت و معانی اور احکام قرآن کے ماہر، عظیم مفسر و محدث، صحیح و سقیم اور مانع و منسوخ سے آگاہ، صحابہ تابعین کے اقوال و آثار سے آشنا، مسائل حلال و حرام سے واقف اور تاریخی اخبار و واقعات کے زیر دست عالم تھے۔

قاضی ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

ابن جریر ائمہ مجتہدین میں سے تھے اور کسی کے مقلد نہ تھے۔ شیخ ابوالاسحاق شیرازی نے طبقات الفقہاء میں ان کو مجتہدین میں شمار کیا ہے۔ وہ ایک معروف فقہی مسلک رکھتے تھے۔ ان کے معتقدین کو ”جریریہ“ کہا جاتا ہے مگر یہ مسلک دیگر فقہی مسلک کی طرح عصر حاضر تک زندہ نہ رہ سکا۔ ابن جریر دہجہ اجتہاد پر فائز ہونے سے پہلے امام شافعیؒ کے دامن سے وابستہ تھے۔ اس کی دلیل طبقات الکبریٰ میں مذکور ابن جریر کا یہ قول ہے کہ:

”میں نے بغداد میں فقہ شافعی کا اعلان کیا اور اس کے مطابق دس سال تک بغداد میں فتوے دیتا رہا“ (وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۲۲۳)

امام ابن کثیرؒ (م ۷۴۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

”كان أحد أئمة الإسلام علماً وعملاً بكتاب الله و سنة رسوله“
وہ کتاب و سنت کے علم اور اس کے مطابق عمل کے لحاظ سے ائمہ اسلام میں سے تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

”من كبار أئمة الإسلام المعتمدين“ (لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۰۰)

وہ بڑے اور قابل اعتماد ائمہ اسلام میں سے تھے۔

امام جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

”ابن جریر پہلے شافعی المسلک تھے۔ پھر انہوں نے الگ ایک فقہی مسلک کی بنیاد رکھی۔ بہت سے لوگ آپ کے اتباع و مقلدین میں شامل تھے۔ اصول و فروع پر آپ نے

بہت سی کتب تصنیف کی ہیں۔“ (طبقات المفسرین ص ۳)

مفکر اسلام ڈاکٹر علامہ خالد محمود فرماتے ہیں کہ:

”...قدماء میں سب سے پرانی تفسیر کون سی ہے؟ تفسیر طبری، ابن جریر تو یہ سب سے پہلی تفسیروں میں سے ہے، جس نے قرآن کی مکمل تفسیر لکھی، باقی اس کے بعد آنے والے اس سے مستفید ہوتے رہے، اس کا کام کیا ہے؟ کہ یہ تفسیر نہیں، بلکہ یہ حدیث کی کتاب ہے، کس طرح حدیث کی کتاب ہے؟ ہے تو قرآن کی تفسیر کے متعلق، لیکن حدیث کی کتاب یوں ہے کہ یہ بیان کرتے ہیں... حدثی فلان، قال الخبری فلان... یہ کہہ کر جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں، ان سے تفسیریں لاتے ہیں تو یہ اصل میں امام احمدیث ہوا، جب اس نے کہا کہ... حدثی فلان... تو امام احمدیث ہوا اور موضوع چونکہ اس کا تفسیر ہے، تو یہ تفسیر کا امام ہوا، اب یہ تفسیر کبیر، تفسیر رازی، جلالین کو یہ اعزاز کسی اور کو حاصل نہیں، کیوں؟ یہ محدث ہے، اور سند لاتا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال نقل کرتا ہے، تو ابن جریر معتبر آئمہ حدیث میں سے ہے۔“ (مناظرے اور مباحثے ص ۳۵۵-۳۵۶ مرتبہ ابن یونس، مکتبہ سید احمد شہید، شاعت مئی ۲۰۱۰ء)

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ:

”علامہ طبری اوّلے درجے کے مفسر، محدث اور مؤرخ ہیں۔ بعض حضرات نے ان پر شیعہ ہونے کا الزام عائد کیا لیکن محققین نے اس الزام کی تردید کی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اہل سنت کے جلیل القدر عالم ہیں بلکہ ان کا شمار ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے۔“
(معارف القرآن جلد اول ص ۵۶، تحت ”مقدمہ“)

مؤلفات طبری:-

- ۱- آداب المناسک (ابن عساکر ۳۵۲: ۸)
- ۲- آداب النفوس (یاقوت ۱۷: ۱۸)
- ۳- اختلاف علماء الامصار
- ۴- احادیث غلیظ خم
- ۵- البصیر (أوالتبصیر) فی علوم الدین
- ۶- تهذیب الآثار و تفصیل الثابت من الأخبار
- ۷- تاریخ الامم والملوک / تاریخ الرسل والانبیاء والملوک والخلفاء (المعجم الادباء- جلد ۶ ص ۵۱۷)، تاریخ الرسل والملوک- طبع بیروت
- ۸- الجامع فی القراءات
- ۹- ذیل المنیل
- ۱۰- صریح السنة
- ۱۱- کتاب العدد والتزیل
- ۱۲- کتاب الفضائل
- ۱۳- مختصر الفرائض
- ۱۴- المسند المجرد
- ۱۵- لطیف القول فی احکام شرائع الاسلام
- ۱۶- عبارة الرؤیا- (لم یتمه)
- ۱۷- جامع البیان عن تأویل آی القرآن (جامع البیان عن تأویل آی القرآن الجزء الاول ص ۱۱-۱۲- طبع بیروت)

کیا ابن جریر طبری دوست تھے؟

امام ذہبی (م ۴۲۸ھ) حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) اور اکثر علماء اہل سنت نے ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید طبری کو فہم، محدث، فقیہ، مجتہد، مؤرخ اور اہل سنت کا قابل اعتماد امام تسلیم کیا ہے اور ان کے ”رفض و تشیع“ کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ دراصل طبری نام کے دو مشہور صاحب تصنیف عالم گزرے ہیں۔ ایک ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید طبری اور دوسرے ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم طبری ہیں۔ اول الذکر سنی ہیں اور ثانی الذکر شیعہ۔ مگر نام و نسب اور کنیت و سکونت میں اشتراک کی وجہ سے بعض لوگوں نے غلط فہمی کی وجہ سے سنی طبری کو بھی ”شیعہ“ قرار دے دیا ہے۔

امام ذہبی (م ۴۲۸ھ) نے سنی طبری کا ذکر رجال نمبر ۳۰۶۷ جبکہ شیعہ طبری کا ذکر رجال نمبر ۳۰۷۷ کے تحت کیا ہے۔

اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے بھی سنی طبری کا ذکر رجال نمبر ۳۴۴ جبکہ شیعہ طبری کا ذکر رجال نمبر ۳۴۵ کے تحت کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: میزان الاعتدال - الجزء الثالث ص ۲۹۸-۲۹۹، لسان المیزان الجزء الخامس ص ۱۰۰-۱۰۳)

یہ ملحوظ رہے کہ امام ذہبی اور ابن حجر جیسے ماہرین فن رجال نے شیعہ طبری کے سن ولادت اور سن وفات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ سنی و شیعہ دونوں ”طبریوں“ کا ”ملک“ (طبرستان) ایک، دونوں کا ”شہر ولادت“ (آمل) ایک، دونوں کا ”وقت ولادت“ ایک، دونوں کا ”مکان ولادت“ ایک (مولد چونکہ اسم ظرف ہے اس لئے صرف ”ظرف زمان“ میں ہی دونوں متحد نہ تھے بلکہ ”ظرف مکان“ میں بھی دونوں متحد تھے) دونوں کا ”یوم ولادت“ ایک،

امام طبری --- کون؟

کیا ابن جریر طبری دو تھے؟

دونوں کی ”تاریخ ولادت“ ایک، دونوں کا ”ماہ ولادت“ ایک، دونوں کا ”سال ولادت“ (۲۲۴ھ) ایک، دونوں کی ”کنیت“ (ابو جعفر) ایک، دونوں کا ”نام“ (محمد) ایک، دونوں کے ”والد کا نام“ (جریر) ایک، دونوں کی ”شکل و صورت“ ایک، دونوں کا ”سن وفات“ ایک اور شاید دونوں کی ”قبر“ بھی ایک ہی ہو۔

”کنیت، نام، ولدیت اور سکونت“ کے ایک ہونے سے تو یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ ابن جریر طبری اصل میں ایک ہی شخصیت کا نام تھا جس کے آگے چل کر دو طبری بنائے گئے ہیں البتہ اہل سنت کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کی خاطر ”داؤد“ کے نام میں فرق روا رکھا گیا ہے یعنی سنی طبری کے دادا کا نام بالاتفاق ”یزید“ تھا جبکہ شیعہ طبری کے دادا کا نام ایرانیوں کے حسب خواہش و منشاء ”رستم“ رکھ لیا گیا۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سنی طبری کا سال ولادت اور وفات (۲۲۴ھ - ۳۱۰ھ) دونوں محفوظ ہیں جبکہ شیعہ طبری کے سال ولادت اور وفات دونوں کے بارے میں اسماء الرجال اور تاریخ کی کتابیں بالکل ”خاموش“ ہیں۔ اگر شیعہ طبری کے سال ولادت اور وفات سے ائمہ رجال آگاہ ہوتے تو اسے قطعاً مخفی نہ رکھتے۔

اگر دونوں کا سال ولادت اور وفات، جائے ولادت اور وفات، اور دونوں کا ”محلہ“ مختلف ہوتا تو عمر یا محلہ اور زمانی تقدم و تاخر کے اعتبار سے دونوں ”طبریوں“ میں بآسانی فرق و امتیاز کیا جاسکتا تھا۔ کاش کہ کوئی سنی یا شیعہ ماہر فن رجال و تاریخ اس ”مقصدہ“ کو بھی حل کر دیتا کہ شیعہ طبری ”ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم“ فلاں سن میں پیدا ہوئے، فلاں سن میں وفات پائی اور فلاں جگہ ان کی تدفین عمل میں آئی۔

ابن جریر طبری کو دنیا سے رخصت ہوئے ۱۱۲۷ سال بیت گئے اور کنیت و سکونت اور نام و نسب میں اشتراک کے باوجود محض دادا کے نام (رستم و یزید) کے اختلاف سے ”ایک“ ابن جریر کے ”دو“ ابن جریر بنائے جا رہے ہیں۔ بعض علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ ”رستم و یزید“ ایک ہی شخص کے دو نام تھے، پہلا نام ”رستم“ تھا جسے بعد میں تبدیل کر کے ”یزید“ رکھ دیا گیا۔

امام طبری --- کون؟

کیا ابن جریر طبری دو تھے؟

سنی طبری کے پردادا کے بھی دو نام ”خالد الطبری“ اور ”کثیر الطبری“ (محمد بن جریر بن یزید بن خالد/محمد بن جریر بن یزید بن کثیر) بتائے گئے ہیں۔ کیا یہاں بھی دو مختلف شخص مراد لئے جائیں گے؟ (جامع البیان عن تأویل آی القرآن الجزء الاول ص ۴ - طبع بیروت، سیر اعلام النبلاء - الجزء الرابع عشر ص ۲۶۹)

آج بھی ایک ہی شخص کے دو، دو نام پائے جاتے ہیں۔ اگر رستم و یزید دو مختلف آدمیوں کے نام ہیں تو معلوم نہیں کہ ”اللہ وسائی اور نور جہاں، حیات محمد خان اور کوثر نیازی، جاوید چوہدری اور یاسر محمد خان، ابوالیث ندوی اور شیر محمد یا ابن انشاء اور شیر محمد یا عبدالکریم اور شورش کاشمیری، مدرسہ نصرۃ العلوم کے شیخ الحدیث مولانا زہد الراشدی اور عبدالمتین یا انور حسین اور نفیس الحسنی، امیر المؤمنین ملا منصور اختر اور ولی محمد، یا جامعہ الرشید کراچی کے مفتی محمد اور روزنامہ اسلام کے ایڈیٹر مفتی محمد زرین خان، مفتی طاہر شاہ صاحب یا مفتی ابولبابہ شاہ منصور اور مولانا شیر محمد، یا قاری عبدالرحمن اور ندیم تابانی، یا ہفت روزہ ”بچوں کا اسلام“ کے ایڈیٹر اشتیاق احمد مرحوم اور عبداللہ فارانی، اور اسی طرح بے شمار اہل قلم کو مستقبل میں کہیں دو، دو مختلف شخصیات نہ قرار دے دیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض محقق علماء نے واضح طور پر کہا ہے کہ سنی و شیعہ طبری دراصل ایک ہی شخصیت ہے۔ سنی طبری کے پردادا کا نام کسی نے ”خالد“ لکھا ہے اور کسی نے ”کثیر“۔ اسی طرح سنی طبری کے دادا ”یزید و رستم“ بھی ایک ہی شخص کے دو مختلف نام ہیں۔ واللہ اعلم بہر حال سنی طبری کے دور میں اگر فی الواقع کسی شیعہ ”ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم طبری“ کا کوئی وجود تھا بھی تو وہ زیر نظر کتاب میں ہرگز، ہرگز، ہرگز مراد نہیں ہے بلکہ یہاں وہ سنی ”ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید طبری“ ہی زیر بحث ہیں جن پر تمام ائمہ اہل سنت کا اتفاق ہے اور جنہوں نے علاوہ دیگر کتب کے ام التفسیر ”جامع البیان فی تأویل القرآن“ اور ”تاریخ الامم والملوک“ جیسی شہرہ آفاق اور مآخذ کتابیں ”یادگار“ چھوڑی ہیں۔ ان کے ”تشیع“ پر مفصل بحث تو آگے آ رہی ہے لیکن یہاں قارئین کو یہ بتانا خالی از حجبی نہ ہوگا کہ علمائے اہل سنت نے

امام طبری --- کون؟

کیا ابن جریر طبری دوتھے؟

امام طبری کی تمام تر عظمت کے باوجود ان کی تمام ”تفسیری و تاریخی“ روایات کو جوں کا توں قبول نہیں کیا بلکہ اس بات کی بھی نشاندہی فرمائی ہے کہ جس واقعہ کے متعلق دیگر محدثین اور قدیم مؤرخین کی طرف سے تائید نہیں پائی جاتی تو اس میں صرف طبری کے بیان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ مولانا محمد نافع صاحب ایک روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”یہ روایت طبری کی ہے اور طبری کا مقام روایات کے بارے میں جس نوعیت کا ہے وہ اس فن کے کبار علماء سے مخفی نہیں۔ التاریخ لابن جریر الطبری مرویات کا ایک کشتکول ہے جس میں ہر طرح کا مال دستیاب ہو جاتا ہے۔ صحیح و سقیم، ضعیف و قوی، رطب و یابس، راست و دروغ سب قسم کا مواد اس تاریخ میں فراہم ہے اور طبری مکمل یا نامکمل سند پیش کر کے ناظرین کے سامنے روایات کا ایک انبار لگا دیتا ہے۔ اب اس سے صحیح چیزیں اخذ کرنا اور بے کار اور ردی مواد کو متروک قرار دینا قارئین و ناظرین کی صوابدید پر ہے۔

پھر اس فن کے قواعد کی روشنی میں مواد حاصل کرنا متیقظ اور بیدار مغز اہل علم کا کام ہے۔ عام آدمی کو سوائے حیرت و استعجاب کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“ (سیرت حضرت امیر معاویہ جلد دوم ص ۳۸۵۔ مطبوعہ ”تخلیقات“ لاہور۔)

موصوف ایک دوسری کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

غور طلب یہ بات ہے کہ صاحب التاریخ محمد ابن جریر الطبری کے لئے عباسیوں کے اس فراہم کردہ غلیظ مواد کو سن و عن نقل کر کے اپنی تصنیف میں شامل کرنے کا کون سا داعیہ تھا؟ اور اس نے کون سی مجبوری کی بناء پر یہ کار خیر پورا کیا؟ کو یا الطبری نے اس مواد کو اپنی تاریخ میں درج کر کے آنے والے لوگوں کو اس پر آگاہ کیا اور سب و شتم اور لعن طعن کے جو دلائل عباسیوں نے مرتب کر دئے تھے ان پر آئندہ نسلوں کو مطلع کرنے کا ثواب کمایا۔ چنانچہ شیعہ اور روافض رسالہ مذکورہ میں مندرجہ مواد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی کتب میں ابوسفیانؑ اور حضرت امیر معاویہؓ پر مطاعن قائم کرتے ہیں اور شدید اعتراضات پیدا کرتے ہیں۔

درحقیقت الطبری نے اہل اسلام میں انتشار پھیلانے اور افتراق ڈالنے کے لئے

امام طبری --- کون؟

کیا ابن جریر طبری دوتھے؟

بڑی عجیب تدبیر اور حکمت عملی اختیار کی، جس سے مخالفین صحابہ کو ایک کونہ رہنمائی حاصل ہوئی اور ان کو عداوت پوری کرنے کے لئے ایک تیار شدہ مواد دستیاب ہو گیا۔

کئی لوگ ان دلائل پر نظر کرنے سے متذبذب ہوں گے، کئی ناظرین صحابہ کرام سے متنفر ہوں گے اور بعض قارئین دل برداشتہ ہو کر اموی صحابہ سے منحرف ہو جائیں گے۔ الطبری کو اس باطل مواد کا اس تفصیل سے ذکر ہی نہیں کرنا چاہئے تھا بلکہ صرف ایک واقعہ تاریخی حیثیت سے اجمالاً ذکر کر دینا کافی تھا جیسا کہ باقی مؤرخین نے واقعہ ہذا کو اجمالاً درج کیا ہے اور دلائل کی تفصیل کی طرف نہیں گئے۔ اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے ذکر کیا تھا تو پھر اس مواد کے بطلان پر کچھ کلام کرنا لازم تھا تا کہ لوگ اس سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں لیکن الطبری نے ایسا نہیں کیا۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب التاریخ الطبری کی نیت بخیر نہ تھی بلکہ فاسد تھی اور ان صحابہ کرامؓ کے حق میں ”الطبری“ خود سوء ظن کا مریض تھا۔“ (فوائد نفعیہ جلد اول ص ۵۸۰-۵۸۱)

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (م ۱۲۳۹ھ) کا موقف یہ ہے کہ طبری کا موجودہ نسخہ بھی تحریف شدہ ہے اور شیعہ مؤرخین نے سنی طبری کی کتاب میں شیعہ روایات داخل کر دی ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

”مؤرخین (اہل سنت) کو ایک اور ڈھب سے دھوکا دیتے ہیں اور نئی چال چلتے ہیں وہ اس طرح کہ تاریخ کی ایک کتاب لکھتے ہیں اور اس میں اہل سنت کی معتبر کتب و تاریخ سے بلا خیانت حوالہ جات نقل کرتے ہیں لیکن جب صحابہ کرام کا ذکر اور ان کے باہمی تنازعات کا موقع آتا ہے تو ان کی بعض برائیاں محمد بن جریر طبری شیعہ کی تاریخ سے جو اس نے مذمت صحابہ میں لکھی ہے، نقل کر دیتے ہیں یا اس کی کتاب ”ایضاح الرشید“ (ایضاح المسترشد) سے جو امامت کے بیان میں ہے کوئی حوالہ درج کر دیتے ہیں مگر ان کتابوں کا نام وضاحت سے ذکر نہیں کرتے مثلاً یوں کہہ دیں کہ تاریخ طبری میں یوں لکھا ہے یا مصنف تاریخ طبری نے اپنی ایک اور تصنیف میں اس طرح بیان کیا ہے اور اس عدم وضاحت سے مقصد ناظرین کو یہ دھوکا دینا ہوتا ہے کہ وہ یہ خیال کر لیں کہ یہ حوالہ محمد بن جریر

امام طبری --- کون؟

کیا ابن جریر طبری دو تھے؟

طبری شافعی کا ہے (جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امام طبری نے شافعییت ترک کر کے مذاہب اربعہ سے الگ اپنا ایک فقہی مذہب متعارف کرا دیا تھا) جو تاریخ کی بہت مشہور کتاب اور اصح التواریخ سمجھی جاتی ہے۔ اسی طبری کی ایک کتاب تاریخ کبیر بھی ہے۔ اس دھوکا میں پڑ کر نقل و نقل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور اس نقل کو صحیح سمجھنے والے بحر ضلالت کے بھنور میں بھنس کر غوطے کھاتے رہتے ہیں۔ طبری کی تاریخ کبیر اب نادرا لوجود ہے اس کا اصل نسخہ بہت کم دستیاب ہے جو نسخہ ملتا ہے وہ اس کا اختصار ہے اور یہ اختصار بھی ساطی نامی شیعہ کا تحریف کردہ ہے اور اس مختصر کے مترجمین میں اکثریت شیعوں کی ہے۔ (تحدیث اثنا عشریہ ص ۱۲۶ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی تحت ”ہاون داں دھوکا“)

حضرت موصوف ”تاریخ کبیر“ کے جس نسخہ کو نادرا لوجود اور کم دستیاب قرار دے رہے ہیں وہ امام طبری نے لکھا ہی نہیں تھا بلکہ تفسیر کی طرح اس کو بھی مختصر لکھا تھا کیونکہ شاگردوں نے کہا تھا کہ اگر آپ نے ”تاریخ کبیر“ لکھی تو یہ تمام ہونے سے پہلے ہماری عمروں کو ختم کر دے گی۔ اس جواب پر امام طبری نے ”انا للہ“ پڑھا اور کہا: ”ممانت الہم“ آج کل لوگوں کی ہمت پست ہو گئی ہے چنانچہ انہوں نے تاریخ کو بھی تفسیر کی طرح مختصر کر دیا۔ (ملاحظہ ہو: معجم الادباء المجلد السادس ص ۵۱۵۔ طبع بیروت)

بہر حال حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی مذکورہ عبارت سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اگر سنی طبری پر ”تشیع“ کا ”الزام“ نہ بھی ہو تو پھر بھی ان کی کتب میں اہل تشیع نے اپنی روایات ”تھوک“ کے حساب سے داخل کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ سنی طبری کے مترجمین میں بھی اکثریت شیعوں ہی کی رہی ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اہل تشیع کی دسیسہ کاری کے متعلق فرماتے ہیں کہ: ”شیعہ علماء کی ایک جماعت بڑی سعی و کوشش سے اہل سنت کی تفاسیر اور سیرت کی ان کتابوں میں جو علماء اور طلباء میں بہت کم معروف و مشہور ہوں یا نادرا لوجود ہوں ایسی جھوٹی باتیں ملا دیتے ہیں جو شیعہ مذہب کی تائید اور اہل سنت کے مذہب کی تردید کرتی ہوں۔“

امام طبری --- کون؟

کیا ابن جریر طبری دو تھے؟

دہلی کے بادشاہ محمد شاہ کے زمانہ میں امراء شیعہ میں دو افراد مرتضیٰ خان اور مرید خان نامی تھے۔ ان کا وطیرہ ہی یہ ہوتا تھا کہ اہل سنت کی کتابوں مثلاً صحاح ستہ، مشکوٰۃ، یا بعض تفاسیر کو خوش خط لکھواتے اور امامیہ کی کتابوں سے اپنے مطلب کی کوئی حدیث لے کر ان میں شامل کر دیتے پھر اس مخطوطہ کو جلدوں اور اب زرعے مزین کر کے نہایت کم قیمت پر گلی کوچوں میں فروخت کر دیتے“ (حوالہ مذکور ص ۱۰۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اہل تشیع تاریخ کے علاوہ اہل سنت کی کتب تفسیر، حدیث اور سیرت میں بھی مدتیس و تدلیس سے باز نہیں آئے جس کے نمونے سنی امام طبری کی ”جامع البیان فی تاول القرآن“ اور ”تاریخ الامم والملوک“ میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔

لہذا اس صورت میں بھی محمد بن جریر بن یزید طبری کی تفسیر و تاریخ پر کلی طور پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا مگر وہ اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف ”تشیع و رفض“ سے متہم ہیں بلکہ وہ ”روافض“ کے لئے روایات گھڑنے کا فریضہ بھی ادا کیا کرتے تھے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ”سنی“ طبری کی تفسیر و تاریخ میں ”ذیل“ ستم پایا جاتا ہے ایک یہ کہ اہل تشیع ان کتابوں میں تدلیس سے کام لیتے ہوئے اپنے مذہب کی روایات داخل کرتے رہے اور دوسرا ستم یہ کہ امام طبری تشیع و رفض کی طرف اپنے ذاتی اور طبعی میلان کی بناء پر مذہب شیعہ کی تائید میں نہ صرف روایات گھڑ گھڑ کر اپنی کتابوں میں شامل کرتے رہے بلکہ ان کے شیوخ اور تلامذہ میں شیعہ، روافض، واضعین اور کذابوں کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ لہذا اس ”سنی“ طبری کی موجودگی میں کسی شیعہ طبری کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔

زیر بحث عنوان سے متعلق مزید معلومات اگلے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

امام ابن جریر طبری عہد عباسی کے معروف مورخ و مفسر گزرے ہیں۔ اسلامی علوم کے زمانہ تدوین سے تعلق رکھنے کی وجہ سے علوم اسلامیہ پر گہرے اثرات ڈالنے والوں میں سر فہرست ہیں۔ اگر ان قدر تصنیفات چھوڑیں، جن میں خاص طور پر صحابہ و تابعین کے اقوال سے مزین ایک ضخیم تفسیر ”جامع البیان عن تاویل آی القرآن“ المعروف تفسیر طبری اور حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے لیکر اپنے زمانے تک کی مبسوط تاریخ ”تاریخ الامم والملوک“ اپنے موضوع پر بنیادی کتب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تفسیر و تاریخ کے میدان میں آنے والے تقریباً تمام نامور مصنفین نے ان کتب کو ماخذ بنایا۔ امام ابن جریر اپنی جلالت شان اور گونا گوں صلاحیتوں کے باوجود اپنے زمانے میں خاصے تنازعات کا شکار رہے، امام داؤد ظاہری کے ساتھ معاصرانہ چپقلش رہی، اور نوبت یہاں تک پہنچی، کہ یہ ”مخاصمت“ اگلی نسل میں بھی منتقل ہوئی، علامہ ذہبی، امام داؤد ظاہری کے صاحبزادے اور امام ابن جریر سے متعلق لکھتے ہیں: نو قد وقع بین ابن جریر و بین ابن ابی داود، موکان کل منهما لا ینصف الآخر (الذہبی، شمس الدین احمد بن محمد، سیر اعلام النبلاء، بیروت، مؤسسة الرسالة ۱۴۰۳ھ، ج ۱۴ ص ۲۷۷) ترجمہ: امام ابن جریر اور ابن ابی داؤد کے درمیان تنازعہ پیدا ہوا، اور دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ حنابلہ کے ایک گروہ کے ساتھ طویل مخالفت رہی، جس کے متعدد اسباب تراجم کی کتب میں مذکور ہیں۔ اس طویل کشمکش کا اثر یہ ہوا کہ حنابلہ کے علاوہ دوسرے طبقات بھی ابن جریر کے مخالف ہو گئے، ابن اثیر الکامل میں لکھتے ہیں:

و اما بعض الحنابلة تعصبوا علیه و وقعوا فیہ فتبعهم غیرہم (الجزیری، ابن الاثیر محمد بن محمد بن عبد اللہ، الکامل فی التاريخ، بیروت، دار الکتب العلمیہ ۱۴۰۷ھ، ج ۷ ص ۹)

ترجمہ: بعض حنابلہ نے ابن جریر کے معاملے میں تعصب اختیار کیا، اور ان کی مذمت و مخالفت میں لگ گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے لوگ بھی آپ کے مخالف ہو گئے۔ بعض نامور محدثین نے ان پر تشیع و رفض کا الزام لگایا۔ (جن پر بحث ہم آگے کریں گے) متنوع تنازعات کے اثرات یہاں تک پہنچے کہ موصوف اپنے آخری زمانے میں گھر میں محصور ہو کر رہ گئے۔

و کانت الحنابلة حزب ابی بکر بن ابی داود، فکتروا و شغبوا علی ابن جریر، و ناله اذی، و لزم بیتہ۔ (الذہبی، شمس الدین احمد بن محمد، سیر اعلام النبلاء، بیروت، مؤسسة الرسالة ۱۴۰۳ھ، ج ۱۴ ص ۲۷۷)

ترجمہ: حنابلہ ابن ابی داؤد کے حامی تھے۔ انہوں نے درپے ابن جریر کے خلاف فتوے فساد پر کیا، اور ان کو اذیتیں دیں۔ بالآخر ابن جریر گھر میں محصور ہو کر رہ گئے۔

انہی تنازعات کا اثر ہے کہ ان کی وفات اور نمازہ جنازہ کے بارے میں بھی متضاد قسم کی روایات ہیں۔ علامہ حموی نے معجم الادباء میں لکھا ہے: قال غیر الخطیب: و دفن لیلًا خوفًا من العامة لأنه یتم بالتشیع، و أما الخطیب فإنه قال: ولم یؤذن بہ أحد، فاجتمع علی جنازته من لا یحصى عددہم إلا اللہ، و صلی علی قبرہ عدة شہور لیلًا و نہارًا (الحموی، یاقوت شہاب الدین ابو عبد اللہ، معجم الادباء، بیروت، دار الغرب الاسلامی ۱۴۱۲ھ، ج ۶ ص ۲۴۴)

ترجمہ: خطیب کے علاوہ بقیہ مورخین نے لکھا ہے کہ ابن جریر کورات کے وقت عام لوگوں کے خوف سے دفن کیا گیا، کیونکہ ان پر شیعہ ہونے کا اتہام تھا، جبکہ خطیب نے کہا ہے کہ ان کے جنازے پر کسی کو نہ بلانے کے باوجود لوگوں کی ایک کثیر تعداد جمع ہو گئی، اور ان کی قبر پر کئی مہینے رات دن تک لوگ جنازہ پڑھتے رہے۔

خطیب بغدادی اور دیگر جملہ مورخین کے بیانات میں تضاد اور اس میں صحیح ضابط سے قطع نظر خطیب کی روایت کا آخری حصہ بلاشبہ مبالغہ پر مبنی ہے کہ قبر پر مہینوں تک جنازہ پڑھنے کا مسلمانوں میں بشمول نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر اور صحابہ کرام کے قبور کے رواج و تعامل کبھی نہیں رہا۔

امام طبری --- کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

امام ابن جریر جرح و تعدیل کے میزان میں:

امام ابن جریر اپنے زمانے میں متنوع تنازعات کا شکار ہونے کے باوجود بعد کے اہل علم میں بڑے مقبول ہوئے۔ ان کی لکھی ہوئی تصنیفات مشرق و مغرب میں پھیل گئیں، خصوصاً تفسیر اور تاریخ سے متعلق ان کی کاوشیں بنیادی مرجع قرار پائیں۔ اس لیے کتب رجال میں بڑے شاندار الفاظ میں ان کا ذکر کیا گیا ہے اور متعدد ائمہ نے ان کی جلالت شان، فوہ علم، وسعت نظر اور امامت علمی کا ذکر کیا ہے۔ اختصار کے پیش نظر ہم تعدیل کے ان اقوال سے صرف نظر کرتے ہیں۔ اور امام ابن جریر پر ہونے والی جرح پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ پر ساری جرح کا خلاصہ ”تشیع و نفی“ ہے۔ درجہ ذیل حضرات نے ان پر یہ جرح کی ہے:

۱۔ علاہ ذہبی رحمہ اللہ متکلم فیہ رجال کے تذکرے پر مشتمل اپنی کتاب ”میزان الاعتدال“ میں لکھتے ہیں: فیہ تشیع و موالات لا تنضر (الذہبی، شمس الدین احمد بن محمد، میزان الاعتدال، بیروت، دار المعرفۃ ۱۳۸۲ھ، ج ۳، ص ۹۹)۔

یعنی امام ابن جریر میں تشیع اور اہلبیت کے ساتھ معمول سے زیادہ مودت تھی، لیکن یہ موالات ضرر کی حد تک نہیں پہنچی تھی۔

۲۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ”لسان المیزان“ میں عینہ یہی بات فرمائی ہے۔ (العسقلانی، ابن حجر، احمد بن علی، لسان المیزان، بیروت، والبشار الاسلامیہ ۱۴۲۳ھ، ج ۷، ص ۲۵)۔

۳۔ چوتھی صدی ہجری کے معروف محدث احمد بن علی سلیمانی، جن کے بارے میں علامہ ذہبی نے ”ولم یکن لہ نظیر فی زمانہ إسنادا وحفظا ودراية وإتقاناً“ (الذہبی، شمس الدین احمد بن محمد، سیر اعلام النبلاء، بیروت، موسسۃ الرسالۃ ۱۴۰۳ھ، ج ۷، ص ۲۰۱) کے الفاظ استعمال کیے ہیں، ابن جریر کے بارے میں فرماتے ہیں: کان یضع للروافض (العسقلانی، ابن حجر، احمد بن علی، لسان المیزان، بیروت، والبشار الاسلامیہ ۱۴۲۳ھ، ج ۷، ص ۲۵)۔

یعنی امام ابن جریر روافض کے لیے احادیث گڑھا کرتے تھے۔

امام طبری --- کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

۴۔ چوتھی صدی ہجری کے معروف امام لغت اور شاعر ابو بکر محمد بن عباس الخوارزمی، جو امام ابن جریر کے بھانجے تھے، علامہ ذہبی نے ”سیر اعلام النبلاء“ (الذہبی، شمس الدین احمد بن محمد، سیر اعلام النبلاء، بیروت، موسسۃ الرسالۃ ۱۴۰۳ھ، ج ۶، ص ۵۲۶) میں، ابن خلکان نے ”وفیات الاعیان“ (ابن خلکان، ابو العباس احمد بن محمد، وفیات الاعیان، بیروت، دار صادر، ج ۲، ص ۴۰۰) میں، علامہ سمعانی نے ”الانساب“ (السمعی، ابو سعد عبد الکریم بن محمد، الانساب، حیدرآباد، دار المعارف العلمانیہ ۱۳۸۲ھ، ج ۵، ص ۲۱۳) میں، علامہ یاقوت الحموی نے ”معجم الادباء“ (الحموی، یاقوت شہاب الدین ابو عبد اللہ، معجم الادباء، بیروت، دار الغرب الاسلامی ۱۴۱۲ھ، ج ۶، ص ۴۳۳) میں اور معروف علماء کے شیوخ پر متعدد کتب کے مصنف ابو طیب ماکف بن صلاح العصور نے ”الروض الباسم فی تراجم شیوخ الحاکم“ (المصوری، ابو طیب ماکف بن صلاح، الروض الباسم فی تراجم شیوخ الحاکم، ریاض، والعاصمۃ ۱۴۳۱ھ، ج ۲، ص ۱۰۵۰) میں ان کے تذکرے کے ساتھ ”ابن اخت محمد بن جریر الطبری“ (امام ابن جریر کا بھانجا) لکھا ہے۔ اپنے ماموں ابن جریر کے مسلک کے بارے میں فرماتے ہیں:

بأمل مولدی وبنو جریر ... فأحوالی ویحکی المرء خالہ

فہا أنا رافضی عن تراث ... وغیری رافضی عن کلالہ

(الحموی، یاقوت شہاب الدین ابو عبد اللہ، معجم الادباء، بیروت، دار الغرب الاسلامی ۱۴۱۲ھ، ج ۶، ص ۴۳۳) آمل میری پیدائش ہے، اور ابن جریر کے بیٹے میرے ماموں ہیں، اور آدمی اپنے نھیا ل کے مشابہ ہوتا ہے۔ سنو میں درشتا رافضی ہوں، جبکہ باقی لوگ دور کے رافضی ہیں۔

۵۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لسان المیزان میں معروف مفسر ابو حیان الاندلسی کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی تفسیر میں لفظ صراط کی تحقیق میں ابن جریر طبری کو امام من الامامیہ لکھا ہے۔ (العسقلانی، ابن حجر، احمد بن علی، لسان المیزان، بیروت، والبشار الاسلامیہ ۱۴۲۳ھ، ج ۷، ص ۲۵)۔

لیکن اس جرح کے بارے میں انصاف کی بات یہ ہے کہ اس میں ابن حجر صاحب سے تسامح ہوا ہے۔ ابو حیان نے اپنی تفسیر البحر المحیط میں معروف شیعہ عالم ”ابو جعفر الطوسی“ سے تسامح ہوا ہے۔

امام طبری --- کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

کولفظ صراط کی تحقیق میں امام ابن الامامیہ لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

وقال ابو جعفر الطوسي في تفسيره وهو امام من ائمة الامامية الصراط
بالصاد لغة قريش، هي اللغة الجيلة (الاندلسي، ابوحيان، محمد بن يوسف،
البحر المحيط، بيروت، دار الكتب العلمية ١٣٤١هـ، ج ١ ص ١٤٤)

یہ تحقیق ابو حیان نے الطوسی کی تفسیر ”الانبیاء“ سے نقل کی ہے۔ اور انبیاء میں الطوسی نے یہی تحقیق لکھی ہے۔ صراط کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بالصاد لغة قريش وهي اللغة الجيلة (الطوسي، شيخ الطائفة، ابو جعفر، محمد
بن حسن، التبيان في تفسير القرآن، بيروت، دار احیاء التراث العربی، ج ١ ص ١٢٢)

ابن جریر طبری کی تفسیر میں ابو حیان کی نقل کی ہوئی کوئی تحقیق نہیں ملتی اور نہ ابو حیان نے اپنی تفسیر میں لفظ صراط کی تحقیق میں ”ابو جعفر الطبری“ کا حوالہ دیا ہے۔ حافظ صاحب نے تسامحاً (ممکن ہے کہ حافظ صاحب کے پاس جو نسخہ ہو، اس میں الطوسی کی جگہ الطبری لکھا ہو ہو، لہذا نسخ کی غلطی بھی ہو سکتی ہے) ”ابو جعفر الطوسی“ کو ”ابو جعفر الطبری“ بنا دیا۔

تشیع ورفض کی جرح پر تبصرہ:

حافظ ابن حجر و علامہ ذہبی نے تو تشیع کی جرح کے ساتھ یسیر اور لادضر والی بات نقل کر کے ابن جریر صاحب کے تشیع کی بنا پر ان کے ضعف کا رد کر دیا۔ البتہ یہ بات بہر حال برقرار رہے گی کہ ابن جریر صاحب کو شیعہ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام کے بارے میں ان کے نظریے میں اہلسنت والجماعت کے مسلک سے انحراف تھا، اب یہ انحراف کس درجے کا تھا؟ اس کی وضاحت مذکورہ حضرات نے نہیں کی، البتہ یسیر اور لادضر کے الفاظ کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ انحراف خطرناک درجے کا نہ تھا۔ تشیع کے مفہوم اور معتقدین و متاخرین کے نزدیک اس کے اطلاقات سے قطع نظر امام ابن جریر جس زمانے کے ہیں، اس زمانے میں شیعہ بطور فرقہ کے ممتاز ہو چکا تھا، چنانچہ شیعہ اثنا عشریہ (جو اہل تشیع کا مین سٹریم طبقہ ہے) کی سب سے پہلی باقاعدہ کتاب ”الکافی“ کے مصنف محمد یعقوب الکلینی اور امام ابن جریر کا زمانہ ایک ہے۔ امام ابن جریر کی وفات ۳۱۰ھ اور الکلینی کی وفات ۳۲۹ھ میں

امام طبری --- کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے دونوں ہم عصر قرار پاتے ہیں۔ تشیع ورفض کے شیوع کے زمانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے صرف تشیع کی جرح بھی کافی بڑی جرح ہے۔

علامہ احمد بن علی سلیمانی اور الخوارزمی نے تو بلا کم و کاست امام ابن جریر کو رافضی قرار دیا ہے۔ اس جرح کے جواب کے لیے جب ہم کتب رجال میں پر نظر ڈالتے ہیں، تو سوائے اس کے اور کوئی جواب نہیں ملتا، کہ ہر دو حضرات کی جرح معروف ابن جریر کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ اس نام سے ایک اور ابن جریر تھے، جو مسلک شیعہ تھے، یہ جرح شیعہ ابن جریر کے بارے میں ہے، نام کی مشابہت کی وجہ سے اس جرح کو ابن جریر کے بارے میں سمجھا گیا۔ چنانچہ سلیمانی کی جرح کے بارے میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

ولو حلفت أن السليمانی ما أراد إلا الآتي لبررت والسليمانی حافظ متقن كان
يلدري ما يخرج من رأسه فلا اعتقد أنه يطعن في مثل هذا الإمام بهذا الباطل (العتقانی،
ابن حجر، احمد بن علی، لسان المیزان، بيروت، والبشائر الاسلامیہ ۱۴۲۳ھ، ج ۷، ص ۲۵)

ترجمہ: اگر میں قسم کھاؤں تو حائث نہیں ہوں گا کہ سلیمانی کی مراد دوسرے شیعہ ابن جریر ہیں۔ سلیمانی حافظ الحدیث اور معتد ہیں۔ اپنی زبان سے سوچ سمجھ کر الفاظ نکالتے ہیں۔ میں یقین نہیں کر سکتا کہ سلیمانی جیسا شخص امام ابن جریر جیسا امام کے بارے میں یہ باطل جرح کریں۔

شیعہ ابن جریر اور اس کی تاریخی حقیقت سنی کتب کی روشنی میں:

علامہ ذہبی و عسقلانی رحمہما اللہ کی بعض کتب (سیر اعلام النبلاء، میزان الاعتدال اور لسان المیزان) میں ابن جریر طبری رحمہ اللہ کے تذکرے کے ضمن میں طبری صاحب کے ہم نام، ہم ولدیت اور ہم وطن ایک اور ابن جریر شیعہ کا ذکر ملتا ہے۔ ہم اولادیتوں کتب سے ابن جریر شیعہ کا پورا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔

سیر اعلام النبلاء میں ہے: محمد بن جریر بن رستم: أبو جعفر الطبري قال عبد
العزیز الکتانی: هو من الروافض، صنف كتباً كثيرة في ضلالهم، له كتاب: ”الرواة
عن أهل البيت“، وكتاب: ”المسترشد في الإمامة“ (الذهبي، شمس الدين احمد بن

امام طبری --- کون؟

امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

محمد، سیر اعلام النبلاء، بیروت، مؤسسة الرسالة ۱۴۰۳ھ، ج ۱۴ ص ۲۸۲)

ترجمہ: محمد بن جریر بن رستم الطبری، جن کے بارے میں عبد العزیز الکتانی نے لکھا ہے کہ وہ روافض میں سے تھے، ان کے مذہب میں متعدد کتب لکھیں جیسے الرواة عن اہل البیت اور کتاب المستر شد فی الامامة

میزان الاعتدال میں ہے: رافضی لہ توالیف، منها کتاب الرواة عن اہل البیت، رماء بالرقض عبد العزیز الکتانی (الذہبی، شمس الدین احمد بن محمد، میزان الاعتدال، بیروت، دار المعرفة ۱۳۸۲ھ، ج ۳ ص ۹۹) یہ (محمد بن جریر بن رستم) رافضی ہیں۔ کتاب الرواة عن البیت ان کی تصنیف ہے۔ الکتانی نے انہیں رافضی سے متهم کیا ہے۔

لسان المیزان میں حافظ صاحب لکھتے ہیں:

محمد بن جریر بن رستم أبو جعفر الطبری. رافضی لہ توالیف منها کتاب "الرواة عن اہل البیت" رماء بالرقض عبد العزیز الکتانی. انتہی۔ وقد ذکرہ أبو الحسن بن بانویہ فی تاریخ الری بعد ترجمة محمد بن جریر الإمام فقال: هو الأملی قدم الری وكان من جلة المتکلمین علی مذهب المعتزلة، له مصنفات. روى عنه الشریف أبو محمد الحسن بن حمزة المرعشی. قلت: وروی، عن أبي عثمان المازنی وجماعة. وعنه أبو الفرج الأصبهانی فی أول ترجمة أبي الأسود من کتابہ۔

وذكره شيخنا في النيل بما تقدم أولا وكأنه سقط من نسخة وزاد بعد لعل السليمانی إلى آخره: وكأنه لم يعلم بأن في الرافضة من شاركه في اسمه واسم أبيه ونسبه وإنما يفترقان في اسم الجد ولعل ما حكى، عن محمد بن جریر الطبری من الاكتفاء في الموضوع بمسح الرجلين إنما هو هذا الرافضی فإنه منهم (المستطانی، ابن حجر، احمد بن علی، لسان المیزان، بیروت، والبشار الإسلامیہ ۱۴۲۳ھ، ج ۷ ص ۲۹)

امام طبری --- کون؟

امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

ترجمہ: ابن جریر ابن رستم رافضی ہے، عبد العزیز الکتانی نے انہیں رافضی سے متهم کیا ہے، ان کی ایک تصنیف "الرواة عن البیت" ہے۔ ابو الحسن ابن بانویہ نے تاریخ الری میں ابن جریر بنی کے بعد ان کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے: وہ آملی ہے، ری میں وارہوئے، معتزلہ کے بڑے متکلمین میں سے ہیں، کئی کتب کے مصنف ہیں۔ ان سے ابو محمد الحسن بن حمزہ المرعشی نے روایت کی ہے۔

میں (حافظ ابن حجر) کہتا ہوں کہ انہوں نے ابو عثمان المازنی اور ایک بڑی جماعت سے روایات لیں۔ اور خود ان سے ابو الفرج الاصبہانی نے اپنی کتاب میں ابو الاسود کے ترجمے میں روایت لی ہے۔ (الی آخرہ)

اہلسنت کے پورے ذخیرہ رجال میں علامہ ذہبی و عسقلانی وہ اولین شخصیات ہیں جنہوں نے شیعہ ابن جریر کا ذکر کیا ہے، ہر دو حضرات سے پہلے رجال کی چار سو سالہ تاریخ میں رجال یا فہارس الکتاب والمصنفین کی کسی بھی معتبر کتاب میں ابن جریر شیعہ کا ذکر نہیں ہے۔ اس موقع پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تاریخ و تفسیر کی اولین کتب لکھنے والی معروف شخصیت ابن جریر (سنی) کے ہم نام، ہم وطن، ہم ولدیت اور ہم عصر ایک اور ابن جریر (شیعہ) تھے، اور وہ شیعہ ابن جریر بھی سنی کی طرح اپنے مسلک کی معروف اور مقتدا شخصیت تھی تو یقیناً اس سے گمراہ کن التباس پیدا ہونے کا خدشہ تھا، اس کی وضاحت ہمیں چار صدیوں کے علمی ذخیرے میں کیوں نہیں ملتی؟ علم رجال کی تاریخ میں یہ بات ناممکن ہے کہ اتنی بڑی شخصیت جو حیرت انگیز طور پر اہلسنت کے ایک معروف امام کے ساتھ متعدد جہات سے مشابہت کی حامل ہو، چار سو سالہ رجال کے ذخیرے میں اس کے حالات تو کجا، اس کا نام و نسب بلکہ محض تذکرہ بھی نہ آ سکے۔ اس کے علاوہ علامہ ذہبی و عسقلانی کے ذکر کردہ ترجمے میں ایسے اشارات ملتے ہیں، جن کی وجہ سے ہم اس "افسانوی شخصیت" کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن جریر شیعہ کا ذکر "ابو الحسن بن بابویہ" (لسان المیزان میں "بابویہ" کی جگہ بانویہ) لکھا ہوا ہے، جسے تعییف پر محمول کیا جاسکتا ہے، اس نام سے بسا رتلاش کے باوجود کوئی شخصیت نہ مل سکی، شاید اسی لیے شیعہ

امام طبری --- کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

عالم محسن العالمی نے اسے ”بابویہ“ سمجھا کما سیاتی (تاریخ الری میں کیا ہے، شیعہ علماء کے ہاں اس نام سے قم کے معروف عالم اور شیخ صدوق کے والد مراد لیے جاتے ہیں، لیکن اس نام سے ان کی کوئی کتاب شیعہ کتب رجال میں نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر مذکورہ حوالے سے متعلق معروف شیعہ عالم محمد محسن العالمی اپنی کتاب ”اعیان الشیعہ“ میں لکھتے ہیں:

وفی لسان المیزان: ابراہیم بن ادريس القمي ذكره ابو الحسن بن بابويه في رجال الشيعة انتهى - والظاهر ان المراد بابي الحسن بن بابويه هو علي بن الحسين بن موسى بابويه القمي ولد الصلوق فانه يكتفي ابا الحسن ولم يعلم اين ذكره - (الاثنين محمد محسن، اعيان الشيعه، بيروت، دارالتعارف للمطبوعات، ۱۴۱۹ھ، ج ۳ ص ۴۳)

ترجمہ: لسان المیزان میں ہے، ابراہیم بن ادريس القمي، ابو الحسن ابن بابویہ (یا درہے لسان کے موجودہ نسخہ میں بابویہ کے بجائے بانویہ لکھا ہوا ہے)۔ (المستقلانی، ابن حجر، احمد بن علی، لسان المیزان، بیروت، والیشار الاسلامیہ ۱۴۲۳ھ، ج ۳ ص ۲۳۳) جیسا کہ ابن جریر کے ترجمے میں ہے۔ (نے رجال شیعہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ابو الحسن بن بابویہ سے مراد علی بن حسین بن موسیٰ بابویہ القمی مراد ہیں۔ جو شیخ صدوق کے والد ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں، کہ ابو الحسن بن بابویہ نے کس جگہ اس راوی کا تذکرہ کیا ہے۔

۲۔ حافظ صاحب نے ابن جریر شیعہ کو ابو عثمان المازنی کا شاگرد لکھا ہے، جبکہ ابو عثمان المازنی کے تلامذہ میں اس نام کا کوئی راوی نہیں ہے، البتہ اس سے ملتا جلتا ایک نام ملتا ہے۔ علامہ حموی معجم الادباء میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

قرأت في ”كتاب الأمالي“ لأبي القاسم الزجاجي قال حدثنا أبو جعفر أحمد بن محمد بن رستم الطبري صاحب أبي عثمان المازني (الحموي، ياقوت شهاب الدين ابو عبد الله، معجم الادباء، بيروت، دار الغرب الاسلامی ۱۴۱۴ھ، ج ۲ ص ۱۸۱۲) ترجمہ: میں نے زجاجی کی کتاب الامالی میں پڑھا کہ ہم سے ابو جعفر احمد بن محمد بن رستم طبری نے بیان کیا، جو ابو عثمان المازنی کے شاگرد ہیں۔

امام طبری --- کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

الہبرست میں ابن ندیم ان کی تصانیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

ومن علماء البصريين: أبو جعفر احمد بن محمد بن رستم بن يزيد بن الطبري وبعد في طبقة أبي يعلى بن أبي زرعة وله من الكتب كتاب غريب القرآن كتاب المقصور والمملود كتاب المذكر والمؤنث كتاب صورة الهمز كتاب التصريف كتاب النحو - (ابن ندیم، ابوالفرج محمد بن اسحاق، الہبرست، بیروت، دارالمعرفۃ ۱۳۹۸ھ، ص ۸۹)

ترجمہ: علمائے بصرہ میں سے ایک ابو جعفر احمد بن محمد بن رستم بن یزدبان طبری ہے، اور ابو یعلیٰ بن ابی زرعة کے طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی کتب یہ ہیں: غریب القرآن، کتاب المقصور، کتاب الحمد، کتاب المذکر والمؤنث، کتاب صورۃ الهمز، کتاب التصریف، کتاب النحو اسی کو مختصر کر کے ابو جعفر بن رستم کہا جاتا ہے، چنانچہ ایک اور جگہ کتاب غریب القرآن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کتاب غریب القرآن لأبي جعفر بن رستم الطبري (ایضاً ص ۵۲)

اسی ابو جعفر احمد بن محمد بن رستم بن یزدبان الطبری کا ترجمہ تاریخ بغداد (البغدادی، الخطیب، ابو بکر احمد بن علی، تاریخ مدینۃ السلام، بیروت، دارالکتب العلمیہ ۱۴۲۵ھ، ج ۵ ص ۲۳۳) اور معجم الادباء (الحموی، یاقوت شهاب الدین ابو عبد الله، معجم الادباء، بیروت، دار الغرب الاسلامی ۱۴۱۴ھ، ج ۳ ص ۲۵۷) میں ملتا ہے۔

درجہ بالا عبارات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ علامہ ذہبی و عسقلانی نے جس ابن جریر شیعہ کا ذکر کیا ہے، اس نام سے تو کتب رجال کے پورے ذخیرے میں کوئی شخصیت نہیں ہے، انہوں نے اسے ابو عثمان المازنی کا شاگرد لکھا ہے، جبکہ کتب رجال میں ابو عثمان المازنی کے تلامذہ میں اس نام کا کوئی راوی نہیں ہے، البتہ اس سے ملتا جلتا ایک شخص ہے، جو نام، ولدیت میں ابن جریر کے مشابہ نہیں ہے، کیونکہ ابن جریر کا نام ”ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری“ ہے۔ جبکہ اس راوی کا نام ”ابو جعفر احمد بن محمد بن رستم بن یزدبان الطبری الحموی“ ہے، دونوں ناموں کو ملاحظہ کرنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ ان دونوں میں خاصا فرق ہے۔ نیز یہ فرق اس طرح سے مزید نمایاں ہو جاتا ہے، کہ ابو عثمان المازنی کے

امام طبری --- کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

شاگرد و مختصر کر کے ”ابو جعفر بن رستم“ کہا جاتا ہے، جس سے جزوی مشابہت کا امکان بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ابو جعفر بن رستم خالص لغوی، نحوی اور قرأت قرآنیہ کے ماہر عالم تھے۔ اور ان کی جملہ تصانیف اسی کے گرد گھومتی ہیں، ان کے مسلک پر کسی کتاب میں کوئی تصریح نہیں ملی، البتہ غالب امکان یہ ہے کہ یہ سنی عالم ہونگے۔ کیونکہ خاص طور پر قرأت سے شغف ان کے تشن پر دلالت کرتا ہے، اس لیے کہ شیعہ علماء قرأت قرآنیہ کے قائل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ علامہ ذہبی و عسقلانی نے جن کتب کو ابن جریر شیعہ کی طرف منسوب کیا، ان میں سے بھی کوئی کتاب ابو جعفر بن رستم کی تصنیفات کے ذیل میں نہیں ملتی۔

شیعہ کتب سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، کہ جس شخص کو ابن جریر سنی کا ہم نام و ہم عصر ثابت کیا جا رہا ہے، وہ یہی ابو جعفر احمد بن محمد بن رستم الطبری مراد ہیں، چنانچہ تیرہویں صدی کے معروف شیعہ محقق سید بحر العلوم کی کتاب ”الفوائد الرجالیہ“ کے کشفی لکھتے ہیں:

محمد بن جریر بن رستم الطبری الأملی: هو صاحب (کتاب غریب القرآن) كما ذكره ابن النديم في الفهرست (طباطبائی، بحر العلوم، سید مہدی، الفوائد الرجالیہ، طہران، مکتبۃ الصادق ۱۳۶۳ھ، ج ۴، ص ۱۲۱)

محقق مذکور نے ابن جریر شیعہ کی ایک کتاب ”غریب القرآن“ بتائی ہے، اور یہ کہ ابن ندیم نے اس کا ذکر بھی کیا ہے، جبکہ ابن ندیم کے حوالے سے ہم ماقبل میں لکھ آئے ہیں، کہ صاحب غریب القرآن ابو جعفر احمد بن محمد بن رستم الطبری ہے، نہ کہ ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری، محقق بحر العلوم کے ذکر کردہ نام کی کسی شخصیت کا اہم سبب میں ذکر نہیں ہے۔

شیعہ سنی کتب کے مذکورہ حوالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ابن جریر سنی کے ہم نام جس شخصیت کو بتایا جا رہا ہے، اس کی عمومی طور پر دو علامتیں بیان کی جاتی ہیں، ایک یہ کہ وہ ابو عثمان المازنی کا شاگرد ہے، دوسرا یہ کہ ابن ندیم نے کتاب غریب القرآن کے تذکرے میں اس کا ذکر کیا ہے، اور ان دو علامتوں سے متصف شخص ”ابو جعفر احمد بن محمد بن رستم الطبری“ ہے نہ کہ ”ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری“، اور وہ بھی خالص ایک لغوی، نحوی اور قرأت کے ماہر

امام طبری --- کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

عالم ہیں، جن کی تصنیفات انہی دائروں میں گھومتی ہیں، کتب رجال میں سے کسی میں بھی اس کے مسلک شیعہ یا عالم علمائے شیعہ کے طور پر ذکر نہیں ہے۔

شیعہ ابن جریر اور اس کی تاریخی حقیقت شیعہ کتب کی روشنی میں:

اہلسنت کی کتب کی روشنی میں درج بالا بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ ابن جریر شیعہ کی شخصیت محض ”افسانوی“ ہے، ابو عثمان المازنی کے ایک شاگرد ابو جعفر احمد بن محمد بن رستم الطبری کو ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری بنا دیا گیا۔ اور اس بے چارے کے ذمے ایسی کتب لگا دی گئیں، جن کا ذکر کتب رجال سے لیکر فہارس الکتب تک ان (ابو عثمان المازنی کے شاگرد) کے حالات میں نہیں ملتا۔ اسی وجہ سے شیعہ کتب میں بھی ابن جریر کے ذکر کے حوالے سے خاصا تضاد پایا جاتا ہے، ہم پہلے اس تضاد کا ذکر کرتے ہیں، پھر اس تضاد کو حل کرنے کے لیے متاخرین شیعہ علماء کی تطبیق پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

پانچویں صدی ہجری کے معروف شیعہ عالم احمد بن علی النجاشی اپنی کتاب ”رجال النجاشی“ میں لکھتے ہیں: محمد بن جریر بن رستم الطبری الأملی أبو جعفر، جلیل، من أصحابنا، کثیر العلم، حسن الکلام، ثقة فی الحدیث، له کتاب المسترشد فی الإمامة أخبرناہ أحمد بن علی بن نوح، عن الحسن بن حمزة الطبری قال حدثنا محمد بن جریر بن رستم بهذا الكتاب ويسائر كتبه۔ (النجاشی، ابو العباس، احمد بن علی، رجال النجاشی، قم، مؤسسة النشر الاسلامی ۱۴۱۶ھ، ص ۳۷۶)

عباس القمی اپنی کتاب ”الکافی واللقاب“ میں لکھتے ہیں:

واما ابن جریر الطبری الشيعي فهو ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری الأملی من اعظم علمائنا الامامية فی المائة الرابعة، ومن اجلائهم وثقتهم، صاحب کتاب دلائل الامامة والایضاح والمسترشد. (القمی، عباس، الکافی واللقاب، طہران، مکتبۃ الصدر، ج ۱، ص ۲۴۲)

امام طبری --- کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

ترجمہ: ابن جریر طبری شیعہ چوتھی صدی ہجری کے ہمارے جلیل القدر اور معتمد علماء میں سے ہیں۔ جن کی کتب میں دلائل الامامة، الايضاح اور المسترشد شامل ہیں۔

ان دو علماء کی عبارات سے ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ ابن جریر شیعہ چوتھی صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں۔ عباسی ائمہ نے صراحة المائنة الرابعة کہا، جبکہ نجاشی صاحب نے ان کے تلامذہ میں حسن بن حمزہ طبری کا ذکر کیا ہے، اور حسن بن حمزہ طبری کی وفات خود نجاشی کے نزدیک ۸۵۳ھ ہے۔ اس کے علاوہ عباسی ائمہ کی عبارت سے ان کی تصنیفات میں تین کتب ”دلائل الامامة، الايضاح اور المسترشد“ ملتی ہیں۔ چوتھی صدی ہجری کے علماء میں سے ماننے کی صورت میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ابن جریر شیعہ ابن جریر سنی کے ہم عصر ہیں، کیونکہ ابن جریر سنی کی وفات بھی چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ہوئی ہے۔ بعض کتب شیعہ میں ہم عصر ہونے کا ذکر صراحتاً بھی ملتا ہے۔

معاصر شیعہ عالم ”حسین عبد اللہ الرضی“ اپنی کتاب ”تاریخ علم الرجال“ میں لکھتے ہیں:

محمد بن جریر بن رستم الطبری الکبیر یکنی (أبا جعفر) دین فاضل، ولیس هو صاحب التاريخ فانه عامی المنهج. والمترجم معاصر لسمیه محمد بن جریر الطبری صاحب تاریخ الأمم والملوک وصاحب التفسیر الکبیر۔ (الرضی، حسین عبد اللہ، تاریخ علم الرجال، ص ۷۸) (نسخہ اکترویہ)

اس میں مصنف نے تصریح کر دی ہے کہ ابن جریر شیعہ ابن جریر سنی کے ہم عصر تھے۔ دوسری طرف کتب شیعہ ہی میں کچھ ایسے اشارات بھی ملتے ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن جریر شیعہ، سنی ابن جریر سے تقریباً ایک یا ڈیڑھ صدی متاخر ہیں۔

بارہویں صدی ہجری کے معروف شیعہ مورخ و محقق سید ہاشم البحرانی اپنی کتاب ”مدیر المعاجز“ میں ابن جریر طبری کے طریق سے ایک روایت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

أبو جعفر محمد بن جریر الطبری: قال: نقلت هذا الخبر من أصل بخط شيخنا أبي عبد الله الحسين بن عبيد الله الغضائري - رحمه الله - قال:

امام طبری --- کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

حاشیہ: أبو الحسن علی بن عبد الله القاسانی (البحرانی، سید ہاشم، مدینة المعاجز، قم، مؤسسة المعارف الاسلامیہ ۱۴۱۶ھ، ج ۸، ص ۲۲)

ترجمہ: ابو جعفر محمد بن جریر طبری کہتے ہیں کہ یہ خبر میں نے اپنے استاد ابو عبد اللہ الحسین الغضائری کے لکھے گئے اصل (کتاب) سے نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ مجھے ابو الحسن القاسانی نے یہ حدیث بیان کی ہے الی اخرہ

اس روایت میں ابن جریر طبری نے الغضائری کو اپنا استاد کہا، جبکہ الغضائری کے بارے میں شیعہ کتب میں لکھا ہوا ہے کہ ۲۱۱ھ تک وہ حیات تھے، (الطوسی، شیخ الطائفة، محمد بن حسن، رجال الطوسی، قم، مؤسسة النشر الاسلامی ۱۴۱۵ھ، ص ۲۲۲) اس طرح سے اس روایت سے ابن جریر شیعہ کا تعلق چوتھی صدی کے بجائے پانچویں صدی کے طبقے (یعنی سنی ابن جریر سے پوری ایک صدی متاخر) سے بنتا ہے۔

عراق کے مشہور شیعہ عالم و مجتہد شیخ عبد اللہ المامقانی نے اپنی ضخیم کتاب ”تنقیح المقال فی علم الرجال“ میں ابن جریر شیعہ کو مشہور شیعہ عالم اور شیعہ کے چار بنیادی مراجع میں سے دو کے مصنف محمد بن الحسن الطوسی کا ہم عصر لکھا ہے۔ اور شیخ طوسی کی وفات ۴۶۰ھ ہے۔ اس طرح سے ابن جریر شیعہ سنی ابن جریر سے تقریباً ڈیڑھ صدی متاخر بنتے ہیں۔ ابن جریر شیعہ پر مفصل بحث کے بعد لکھتے ہیں:

فتحقق مما ذكرنا كله أن محمد بن جریر بن رستم الطبری من أصحابنا إثنان، كبير وهو السابق، وصغير وهو هذا، وكلاهما ثقتان عدلان مرضيان، ولكل من هما كتاب في الامامة، فلالول كتاب ”المسترشد“، وللثاني كتاب دلائل الامامة (المامقانی، عبد الله، تنقیح المقال فی علم الرجال بحوالہ المسترشد فی الامامة، قم، مؤسسة الثقافة الاسلامیہ، ص ۴۰)

شیعہ کتب میں ابن جریر کے طبقے اور زمانہ کی تعیین سے متعلق یہ تضاد ابن جریر شیعہ کے افسانوی ہونے پر روز روشن کی طرح دلالت کرتا ہے۔ البتہ معاصر شیعہ محققین نے اس

امام طبری۔۔۔ کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

تضاد کو بھانپ لیا۔ اور تطبیق دیتے ہوئے ابن جریر شیعہ کو ایک شخص کے بجائے دو شخص مانے۔ (مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی) اس طرح سے کویا کل تین ابن جریر ہوئے۔ ایک سنی ابن جریر (مصنف تاریخ طبری و تفسیر طبری) دوسرے شیعہ ابن جریر، جو سنی کے ہم عصر ہیں اور تیسرے ڈیڑھ صدی کے بعد آنے والے شیخ طوسی کے ہم عصر۔ یہ تطبیق شیعہ کتب و علماء کی سب سے بڑی بائیوگرافی لکھنے والے شیعہ محقق آغا بزگ طهرانی نے ”الذریعہ الی تصانیف الشیعہ“ میں دی ہے۔ لکھتے ہیں:

الایضاح فی الامامة للشیخ ابی جعفر محمد بن جریر بن رستم بن جریر الطبری الاملی الامامی الموصوف بالکبیر فی قهرس الشیخ الطوسی تمییزا له عن محمد بن جریر المتأخر عنه الذی کان معاصر الشیخ الطوسی والنجاشی ومشارکا معهما فی الروایة عن مشایخهما فی کتابہ دلائل الامامة وکان محمد بن جریر الکبیر الامامی المتقدم معاصرا لسمیه محمد بن جریر بن یزید بن کننہ بن غالب الطبری العامی صاحب التاريخ والتفسیر الکبیرین الذی توفي سنة ۳۱۰، ولابن جریر الکبیر مؤلف الايضاح هذا أيضا کتاب المسترشد (الطهرانی، الشیخ آغا بزگ، الذریعہ الی تصانیف الشیعہ، بیروت، دارالاضواء، ج ۲ ص ۴۸۸)

ترجمہ: ایضاح فی الامامة ابو جعفر محمد بن جریر طبری الملی کی تصنیف ہے، جسے ”کبیر“ کہا جاتا ہے، شیخ طوسی کی (اثر ست میں اس کا ذکر ہے۔ کبیر کہنے کی جہاں سے بعد میں آنے والے محمد بن جریر سے ممتاز کرنا ہے، جو طوسی و نجاشی کے ہم عصر ہیں، اور اپنی کتاب دلائل الامامة میں انہی حضرات سے روایت کرتے ہیں، جو مذکورہ دو حضرات (طوسی و نجاشی) کے شیوخ و اساتذہ ہیں محمد بن جریر کبیر سنی ابن جریر کے ہم عصر ہیں۔ ان کی کتب میں ایضاح کے ساتھ المسترشد بھی ہے۔

۲۔ آخر میں اس بات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ شیعہ کتب تراجم میں ابن جریر کبیر کا سن ولادت اور سن وفات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ سن ولادت کا تو عدم ذکر سمجھ میں آتا ہے، پر سن وفات کا ذکر نہ ہونا اور معلوم نہ ہونا (خواہ احتمالاً ہی ہو) سمجھ سے بالاتر ہے

امام طبری۔۔۔ کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

بخصوص ایسا شخص جن کے ساتھ شیعہ کتب میں ”من اعظام علمائنا“ جیسے الفاظ ملتے ہیں۔ چنانچہ ”المسترشد“ کے محقق شیخ احمد المحمودی لکھتے ہیں:

بقی هنا شیء، وهو: انی لم أشر إلی سنة ولادة المؤلف ولا عام وفاته إذ لم يتعرض أحد من المترجمین فی رجالهم، وهذا أيضا من حظ المؤلف، إذ ترجمه من هو أقرب العهد إلیه کلنجاشی والشیخ الطوسی والمفید، مع عنايتهم التامة بشأنه ومؤلفاته، ومع ذلك لم يتعرضوا لذكر عام ولادته وحتى سنة وفاته شيئا (الطبري، محمد بن جریر بن رستم، المسترشد فی الامامة، قم، مؤسسة الثقافة الاسلامیة، ص ۸۷)

جبکہ ابن جریر صغیر کے بارے میں علامہ مامقانی نے لکھا ہے:

ولیس له ذکر فی کلمات أصحابنا الرجالیین۔ (ایضاً، ص ۳۸)

یعنی اس کا ذکر ہی ذخیرہ رجال میں نہیں ہے۔

البتہ پورے ذخیرہ رجال میں ذکر نہ ہونے کے باوجود ان کی (طرف منسوب) کتاب ”دلائل الامامة“ چھپی ہے۔ اور شیعہ حلقوں میں متداول ہے۔ یہ دلچسپ

بحث کا حاصل:

اس پوری بحث کا حاصل قارئین کے سامنے نکات کی شکل میں پیش کرنا چاہوں گا۔ اور آخر میں اس سلسلے میں ایک اہم اشکال پیش کر کے جائزت چاہوں گا۔

۱۔ سنی ابن جریر کے ہم نام، ہم عصر، ہم ولدیت اور ہم وطن جس ابن جریر کا ذکر کیا جا رہا ہے، اس کا اولین ذکر ابن جریر کے تقریباً چار سو سال بعد علامہ ذہبی و عسقلانی کی بعض کتب میں ملتا ہے۔

۲۔ ہر دو حضرات سے قبل اہلسنت کے پورے ذخیرے میں، خواہ کتب رجال و تراجم ہوں یا فہارس الکتاب، کسی میں بھی شیعہ ابن جریر کا مستقل یا تبعاً تذکرہ نہیں ملتا۔

۳۔ علامہ ذہبی و عسقلانی نے شیعہ ابن جریر کے تذکرے میں ایک خاص بات یہ ذکر

امام طبری --- کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

کی ہے کہ وہ ابو عثمان المازنی کے شاگرد ہیں۔

۴۔ ابو عثمان المازنی کے شاگردوں میں ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم طبری کے نام سے تو کوئی شخص نہیں ہے، البتہ ابو جعفر احمد بن محمد بن رستم بن یزید بن طبری ملتا ہے۔ جنہیں مختصراً ابو جعفر بن رستم کہا جاتا ہے۔

۵۔ متعدد قرائن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے، کہ ابن جریر کے ہم نام شخصیت سے مراد یہی ابو جعفر بن رستم مراد ہیں۔ لیکن یہ شخص نام، ولدیت میں ابن جریر سنی کے مشابہ نہیں ہے۔ نیز ابو جعفر بن رستم ایک خالص لغوی، نحوی اور قراءات قرانیہ کے ماہر عالم ہیں۔ اور انہی موضوعات کے گرد ان کی تصنیفات گھومتی ہیں۔ جبکہ شیعہ ابن جریر کے بارے میں یہ ملتا ہے کہ وہ ایک خالص مسلکی عالم تھے۔ اور مسلکی موضوعات پر ان کی کتب ہیں۔ نیز علامہ ذہبی و عسقلانی اور شیعہ کتب میں جن تصنیفات کو ان کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے، ان میں سے کسی بھی کتاب کا ذکر ابو جعفر بن رستم کے ترجمے میں نہیں ملتا۔

۶۔ مذکورہ شخص مراد لینے کا ابو عثمان المازنی کے شاگرد ہونے کے علاوہ سب سے بڑا قرینہ یہ ہے کہ شیعہ کتب میں ابن جریر شیعہ کے تذکرے میں یہ بات ملتی ہے کہ ابن ندیم نے ان کی ایک کتاب ”غریب القرآن“ کا ذکر کیا ہے، اور ابن ندیم نے ابو جعفر بن رستم کی غریب القرآن کا ذکر کیا ہے۔ شیعہ ابن جریر یعنی ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم طبری کا ذکر ابن ندیم نے نہیں کیا ہے۔

۷۔ شیعہ کتب میں ابن جریر شیعہ کے تذکرے میں ایک تضاد تو یہ پایا جاتا ہے کہ بعض علمائے شیعہ نے اسے ابن جریر سنی کا ہم عصر اور چوتھی صدی ہجری کے علماء میں سے بتایا ہے۔ جبکہ دوسرے کچھ شیعہ علماء نے اسے پانچویں صدی ہجری یعنی سنی ابن جریر سے ایک یا ڈیڑھ صدی متاخر بتایا ہے۔

۸۔ اس تضاد کو معاصر شیعہ محققین نے یوں حل کیا ہے کہ خود شیعہ ابن جریر دو بنائے ہیں۔ جو دونوں ہم نام، ہم کنیت، ہم ولدیت، ہم وطن ہیں۔ طرفہ تماشیا یہ کہ ان دونوں کے دادا کا نام بھی ایک ہے۔ ان میں فرق صرف کبیر و صغیر کا ہے۔ سنی ابن جریر کے ہم عصر کو ابن

امام طبری --- کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

جریر کبیر اور پانچویں صدی کے ابن جریر کو صغیر کہا جاتا ہے۔

۹۔ ان دو میں سے کوئی تصنیف کس ابن جریر کی ہے؟ خود اس سلسلے میں بھی علمائے شیعہ کے مختلف بیانات ہیں۔ عباس القمی کے نزدیک دلائل الامامہ، الایضاح اور المستدرک ابن جریر کبیر کی تصنیفات ہیں۔ جبکہ محقق طہرانی کے نزدیک دلائل الامامہ ابن جریر صغیر کی تصنیف ہے۔ جبکہ بعض شیعہ علماء کے نزدیک یہ دو کی بجائے ایک کتاب ہے، جسے کبھی المستدرک، کبھی المستدرک فی الامامہ اور کبھی دلائل الامامہ کہا جاتا ہے۔ (اس کتاب پر مستقل بحث آگے آ رہی ہے)

۱۰۔ ابن جریر شیعہ کے نام سے کبیر و صغیر دو شخصیات کا مسئلہ شیعہ علمائے تراجم میں متفقہ نہیں ہے۔ بعض صرف ایک ہی ابن جریر شیعہ کے قائل ہیں۔ جو ابن جریر سنی کے ہم عصر ہیں۔ جبکہ کچھ شیعہ علماء کے نزدیک ابن جریر شیعہ کے نام سے کبیر و صغیر دو شخصیات ہیں۔ چنانچہ عباس القمی نے الکفی والالقباب میں صرف ایک ابن جریر شیعہ کا ذکر کیا ہے۔ اور دلائل الامامہ (جو دو ابن جریر شیعہ ماننے والوں کے نزدیک دوسرے ابن جریر کی تصنیف ہے) کو بھی ابن جریر کبیر یعنی سنی ابن جریر کے ہم عصر کی تصنیف قرار دیا ہے، جبکہ آغا بزگ طہرانی کے نزدیک ایک کی بجائے دو ابن جریر شیعہ ہیں۔ اور دلائل الامامہ پہلے کی بجائے دوسرے متاخر ابن جریر کی تصنیف ہے۔

ایک اہم اشکال اور اس کا ممکنہ جواب:

مندرجہ بالا بحث سے قاری کے ذہن میں خود بخود ایک اشکال پیدا ہوتا ہے، کہ ابن جریر سنی کے ہم نام ایک اور افسانوی شخصیت گھڑنے کے کیا مقاصد ہیں؟ ایک ابن جریر سے دو اور دو سے تین بنانے میں کیا راز مضمحل ہے؟

اس سوال کا تحقیقی و تسلی بخش جواب تو وہی لوگ دے سکتے ہیں، جنہوں نے یہ فرضی شخصیت بنانے اور وضع کرنے کا عمل سرانجام دیا۔ البتہ قرائن کی روشنی میں اس کے کچھ ممکنہ جوابات دیے جاسکتے ہیں۔ ہماری نظر میں اس پورے تاریخی عمل کے بنیادی طور پر دو بڑے مقاصد معلوم ہوتے ہیں:

امام طبری۔۔۔ کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

تاریخ طبری تفسیر طبری کے مصنف امام محمد بن جریر طبری اپنی جلالت شان، وسعت علم اور کمال کو خصوصیات کے باوصف اپنے معاصرین، خاندانی حضرات اور بعد میں آنے والے اجلہ علماء کے اس تبصرے سے نہ بچ سکے کہ موصوف میں ”تشیع ورفض“ کے اثرات تھے۔ (جس کے حوالے ماقبل میں گزر چکے ہیں) اور اس الزام کی کچھ نہ کچھ تائید ان کی تفسیر اور خاص طور پر تاریخ سے ہوتی ہے۔ خصوصاً تاریخ میں صدر اول کے المناک حوادث میں اس وقت کے غالی شیعہ مورخین و رواۃ پر کلی اعتماد اس تاثر کو مزید قوی کرتا ہے۔ تاریخ کے مقدمہ میں اگرچہ موصوف نے یہ کہہ کر اپنے تئیں اپنے آپ کو بری کر دیا کہ اگر کچھ ناگوار باتیں اس کتاب میں ملیں تو وہ ہمارے پاس رواۃ کی طرف سے آئی ہیں، ہم صرف اس کے ناقل ہیں۔ (الطبری، ابو جعفر محمد بن جریر، تاریخ الامم والملوک، قاہرہ، دارالمعارف، ۱۳۸۷ھ، ج ۸ ص ۸)

مقدمہ میں یہ وضاحت اس بات کی خبر دیتا ہے کہ خود مصنف کو بھی اس کا احساس تھا کہ اس کے بعض مقامات اہلسنت والجماعت کے بنیادی نظریے اور فریم ورک کے منافی ہیں۔ اس لیے مقدمہ میں اپنے آپ کو بری کرنے کی صراحت ضروری سمجھی۔ لیکن اس وضاحت کے باوجود یہ سوال برقرار رہتا ہے کہ جب مصنف کا مقصد تاریخی روایات کی محض جمع و ترتیب تھی، تو صدر اول کے واقعات میں محض غالی شیعہ ورفضی روایات ذکر کرنے پر کیوں اکتفاء کیا گیا؟ اس وقت کے مصنف اور اہلسنت والجماعت کے معتمد رواۃ سے صدر اول کے واقعات کی صحیح نقل سے اعراض کیوں برتا گیا؟ حالانکہ جمع و ترتیب کا تو تقاضا تھا کہ صحیح و غلط دونوں قسم کی روایات کو کتاب میں جگہ دی جاتی۔ صدر اول کی المناک داستانوں کا صرف ایک رخ پیش کرنے کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ عالم عرب سے دو محققین (محمد بن طاہر البرزنجی اور محمد بن حسن حلاق) کی تحقیق سے صحیح و ضعیف طبری چھپی ہے، اس میں جملہ صفین دونوں کو ملا کر صحیح اور معتمد روایوں کی کل روایات تقریباً رہ گئی ہیں، جن کا حجم محض بیس صفحات ہیں، (الطبری، ابو جعفر محمد بن جریر، صحیح تاریخ طبری، بیروت، دار ابن کثیر ۱۴۲۸ھ، ج ۳ ص ۳۷۷ تا ۳۹۷) جبکہ ضعیف موضوع اور ناقابل اعتماد

امام طبری۔۔۔ کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی

راویوں کی روایات کا کل حجم تقریباً دو سو صفحات ہیں۔ (الطبری، ابو جعفر محمد بن جریر، ضعیف تاریخ طبری، بیروت، دار ابن کثیر ۱۴۲۸ھ، ج ۸ ص ۸۱۵ تا ۸۲۹) بیس اور دو سو کا یہ تفاوت بتاتا ہے کہ کس طرح اس دور کے واقعات کو یک رخ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

ابن جریر طبری صاحب پر تشیع ورفض کے اتہامات اور تاریخ میں اکثر مقامات پر شیعہ نقطہ نظر پیش کرنے کی وجہ سے اس بات کا قوی امکان تھا کہ ان کی تاریخ بعد میں شجر ممنوعہ قرار پاتی، اور شیعہ نقطہ کی ترجمان سمجھی جاتی۔ اس لیے ابن جریر طبری سے اس اتہام کو دور کرنے کے لیے ایک دوسرے ابن جریر کا فسانہ گھڑا گیا، تاکہ یہ باور کرایا جاسکے کہ مذکورہ اتہامات دوسرے ہم نام کے بارے میں ہیں، غلط فہمی سے ابن جریر سنی کے بارے میں سمجھ لیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ تشیع ورفض کا صرف اور صرف یہی جواب ہمیں کتب رجال میں ملتا ہے کہ یہ اتہامات دوسرے ابن جریر کے بارے میں ہیں۔ جب علماء کے اتہام کا دوسرے ابن جریر کی صورت میں اچھے طریقے سے دفیہ ہو گیا، تو ان کی کتب خود بخود ایک معتمد عالم کی کتب کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ اور وہ روایات اہلسنت کے مصادر میں اس طرح سے گھل مل گئیں کہ محتاط ترین مفسرین حافظ ابن کثیر و ابن خلدون جیسے حضرات بھی ان روایات سے اپنا دامن نہ چھڑا سکے۔ الغرض دوسرا ابن جریر بنانے کی پہلی وجہ قرآن کی روشنی میں ابن جریر صاحب سے تشیع ورفض کے اتہامات کی براءت یا کم از کم اس کی شاعت و قباحت میں تخفیف تھی۔ اور اس میں ان لوگوں کو قطعی طور پر کامیابی ملی کہ حافظ ابن حجر سے لیکر عصر حاضر تک اگر کوئی ابن جریر کے تشیع ورفض کی بات کرتا ہے، تو فوراً یہ کہہ کر اسے رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ الزامات سنی ابن جریر کی بجائے شیعہ ابن جریر کے بارے میں ہیں۔ یاد رہے ہمارا مقصد ابن جریر سنی کو شیعہ ثابت کرنا نہیں، اور نہ ہی ابن جریر کی جملہ تصانیف کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے، بلکہ مدعا صرف اتنا ہے کہ صدر اول کے المناک حوادث کے بارے میں ان کی فکر اور سوچ کے دھارے اہلسنت والجماعت کے محتاط مسلک کی بجائے شیعہ ورفض کے تنقیصی سوچ سے ملتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ قابل قدر علمی کارناموں

امام طبری --- کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی کے باوجود تشیع ورفض کے اتہام سے نہ بچ سکے۔

۲۔ ابن جریر کے ہم نام جن دو شیعہ شخصیات کبیر و صغیر ابن جریر کو مانا گیا، علمائے شیعہ نے ان کے تذکرے میں متعدد کتب کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے موجودہ دور میں ایک کتاب ”دلائل الامامة“ چھپی ہے۔ تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اثنا عشر کی امامت کے اثبات پر آثار و روایات سے دلائل ذکر کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں علمائے شیعہ میں ایک بحث تو یہ چھڑی ہے کہ یہ کتاب ابن جریر کبیر (سنی ابن جریر کے ہم عصر) کی تصنیف ہے یا ابن جریر صغیر کی، چنانچہ عباس الثمینی نے اس کتاب کا ذکر ابن جریر کبیر کی تصانیف کے ذیل میں کیا ہے۔ جبکہ دیگر علماء خصوصاً آغاز رگ طہرانی کے ہاں یہ ابن جریر صغیر کی تصنیف ہے۔ (دونوں حوالے ماقبل میں گزر چکے ہیں) طہرانی صاحب نے مزید لکھا ہے کہ ابن جریر کبیر کی تصانیف میں امامت پر کتاب کا نام ”المسترشد“ ہے۔ مصنف کے اختلاف کے ساتھ اس کتاب کے نام میں بھی اختلاف ہے۔ شیعہ کی بعض کتب میں المسترشد اور دلائل الامامة ایک ہی کتاب کے نام ذکر کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اعجاز حسین کلتوری اپنی کتاب ”کشف الحجب و الاستار عن اسماء الكتب و الاسفار“ میں لکھتے ہیں:

دلائل الامامة للشيخ الجليل محمد بن جرير الطبري الامامي ويسمى بالمسترشد (الكلتوري، اعجاز حسين، كشف الحجب والاستار، قم، مكتبة اية العظمى المرعشي ۱۴۰۹ھ، ص ۲۱۴) اس کے علاوہ معروف شیعہ محدث علامہ باقر مجلسی بحار الانوار میں لکھتے ہیں:

وكتاب دلائل الامامة للشيخ الجليل محمد بن جرير الطبري الامامي ويسمى بالمسترشد (المجلسي، محمد باقر، بحار الانوار، بيروت، مؤسسة الوفاء ۱۴۰۳ھ، ج ۱۹) دلائل الامامة اور المسترشد ایک ہی کتاب کا نام ہے یا دو الگ الگ کتب ہیں؟ نیز دونوں ایک ابن جریر (کبیر) کی تصنیف ہیں یا دونوں کے مصنف الگ الگ ہیں؟ یہ بحثیں جاری تھیں کہ ایران سے المسترشد کے نام سے کتاب چھپ گئی۔ جس کے محقق احمد الحمودی نے اس کے شروع میں ایک ضخیم مقدمہ لکھا، جس میں دلائل الامامة اور المسترشد کے ایک یا

امام طبری --- کون؟ امام ابن جریر طبری کی شخصیت اور ایک تاریخی غلط فہمی دو کتب ہونے پر بھی بحث کی، لیکن بالآخر الگ الگ ہونے پر کوئی قابل ذکر قرینہ نہ ہونے کی وجہ سے محقق مذکور نے یہ اعتراف کر لیا:

أقول: ومن هذا الكلام أيضا يستفاد أن دلائل الامامة يعتبر المجلد الثاني لكتاب المسترشد فتأمل جدا (الطبري، ابو جعفر، محمد بن جرير بن رستم، قم، مؤسسة الثقافة الاسلامية، ص ۸۱)

ایک اور جگہ معتمد علمائے شیعہ کے شواہد کو سامنے رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

واحتمل بعض العلماء من وضع الكتاب ان يكون المجلد الثاني للمسترشد كما تقدم ولعله هو الصواب (ایضا۔)

طرفہ تماشائیہ کہ یہی اقرار خود اس سے پہلے دلائل الامامة کے ناشران نے بھی اس کے مقدمے میں کیا تھا، ایک یا الگ الگ کتاب پر بحث کے بعد لکھتے ہیں:

و هذا يفيد ان الكتابين عنده لرجل واحد وانما هما جزان كل منهما باسم علي حدة (الطبري، ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم، بيروت، مؤسسة الاعلمى للمطبوعات ۱۴۰۸ھ، ص ۴) درج بالا بحث سے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ دلائل الامامة اور المسترشد دونوں ایک ہی کتاب کے دو نام اور ایک ہی کتاب کے دو جزء ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ کسی کتاب کے محقق کی بات کتاب سے متعلق بڑی اہم سمجھی جاتی ہے، اس سلسلے میں متعدد علمائے شیعہ کے اعتراف کے ساتھ دونوں کتب کے محققین نے بھی اس کے ایک ہونے کو رائج قرار دیا ہے۔ اور یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ شیعہ کتب کے مطابق المسترشد ابن جریر کبیر یعنی سنی ابن جریر کے ہم عصر کی تصنیف ہے۔ لہذا دلائل الامامة جب اس کا ایک جزو اور حصہ قرار پایا تو یہ بھی اسی مصنف کی کتاب ہے۔

ابن جریر کبیر یعنی سنی ابن جریر کے ہم عصر شخصیت کی حقیقت اور اس کے افسانوی وجود سے ماقبل میں ہم بحث کر چکے ہیں کہ اس نام کوئی شخصیت تاریخ میں نہیں گزری، ابو عثمان المازنی کے ایک شاگرد ابو جعفر احمد بن محمد بن رستم طبری کو ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم طبری بنایا

گیا۔ جب ابن جریر کبیر کے نام سے کسی شیعہ عالم کا وجود نہیں ہے، تو لامحالہ سوال اٹھتا ہے کہ پھر مذکورہ کتاب کس کی لکھی ہوئی ہے؟ اور اس کا مصنف کون ہے؟

فہارس الکتاب میں اس نام کی کتاب ہمیں سنی ابن جریر کے تذکرے میں ملتی ہے۔ یہ بات درج ذیل حضرات نے ذکر کی ہے:

۱۔ ابن ندیم نے اپنی کتاب "الہرست" میں المسترشد کو محمد بن جریر طبری (سنی) کی تصنیف قرار دیا ہے۔ ابن جریر کی کتب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کتاب المسترشد کتاب تہذیب الآثار ولم یتمہ (ابن ندیم، ابوالفرج، محمد بن اسحاق، الفہرست، بیروت، دار المعرفۃ ۱۳۹۸ھ، ص ۳۲۷)

۲۔ ساتویں صدی ہجری کے عالم ابن ساعی "الدر الثمین فی اسماء المصنفین" میں ابن جریر کی کتب کے ذیل میں لکھتے ہیں:

کتاب الخفیف فی الفقہ، و کتاب المسترشد (البابابی، اسماعیل بن محمد امین، ہدیۃ العارفین، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ج ۲ ص ۲۷۱)

۳۔ صاحب ہدیۃ العارفین امام ابن جریر کی تصنیفات گناتے ہوئے لکھتے ہیں:

کتاب المحاضر والسجلات، کتاب المسترشد (ابن ساعی، علی بن انجب، الدر الثمین، تیونس، دار الغرب الاسلامی ۱۴۳۰ھ، ص ۹۴)

جب المسترشد ابن جریر سنی کی کتاب ہے، تو کوئی بعید نہیں کہ اس کتاب اور اس کے مصنف دونوں کو پہچاننے کے لیے ایک اور ابن جریر کی شخصیت ایجاد کی گئی ہو، تاکہ محمد بن جریر طبری صاحب "کان یضع للروافض" (یہ نقد معروف محدث احمد السلیمانی نے ابن جریر صاحب پر کیا ہے، المسترشد کی مذکورہ کہانی اور اس نقد میں گہرا ربط معلوم ہوتا ہے) کی تہمت سے بھی بچیں اور کتاب بھی محفوظ رہے۔ واللہ اعلم بالصواب (بشکریہ سہ ماہی المظاہر کوہاٹ ص ۲۵ تا ۲۶، شمارہ ۲، ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ، جمادی الثانیہ ۱۴۳۷ھ)

امام طبری کا دور

(از ۲۲۴ھ تا ۳۱۰ھ)

امام طبری معصم باللہ بن ہارون الرشید کے دور خلافت (۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ) میں ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور انہوں نے واثق باللہ بن معصم باللہ (۲۲۷ھ تا ۲۳۲ھ)، متوکل علی اللہ بن معصم باللہ (۲۳۲ھ تا ۲۳۶ھ)، معتز باللہ بن متوکل علی اللہ (۲۳۶ھ تا ۲۳۸ھ)، مستعین باللہ بن معصم باللہ (۲۳۸ھ تا ۲۵۱ھ)، معتز باللہ بن متوکل علی اللہ (۲۵۱ھ تا ۲۵۵ھ)، ہندی باللہ بن واثق باللہ (۲۵۵ھ تا ۲۵۶ھ)، معتز باللہ بن متوکل علی اللہ (۲۵۶ھ تا ۲۷۹ھ)، معتز باللہ (۲۷۹ھ تا ۲۸۹ھ)، منکب باللہ بن معتز باللہ (۲۸۹ھ تا ۲۹۵ھ) اور مقتدر باللہ بن معتز باللہ (۲۹۵ھ تا ۳۲۰ھ) کے دور تک کل دس عباسی خلفاء کا زمانہ خلافت پایا اور بالآخر مؤخر الذکر خلیفہ یعنی مقتدر باللہ کے دور خلافت میں ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

امام طبری نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "تاریخ الامم والملوک" میں ۳۰۲ھ تک کے حالات اور واقعات قلم بند کئے۔

عباسی خلافت پر "ایرانییت" کی چھاپ گہری تھی لہذا ان کے خلفاء، وزراء اور عمال حکومت میں اہل تشیع کثرت سے شامل تھے۔ امام طبری کی ولادت سے پہلے مامون الرشید کا دور (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ) سیاہ دور گزر رہا ہے۔ اس خلیفہ نے علانیہ شیعیت قبول کر کے سرکاری طور پر اعلان کرایا کہ جو شخص معاویہ بن ابی سفیان کے حق میں کلمات خیر کہے گا تو حکومت اس کی حفاظت سے بردارمہ ہے۔ ملاحظہ ہو: دول الاسلام لہذا ہی جلد اول ص ۱۲۹۔ تحت حالات ۲۱۱ھ۔

قدیم مؤرخ علامہ مسعودی (م ۳۴۶ھ) لکھتے ہیں کہ:

۲۱۲ھ میں مامون الرشید نے منادی کرائی کہ جو شخص معاویہ کا خیر کے ساتھ ذکر کرے

گا تو حکومت اس کی حفاظت سے بری الذمہ ہے۔ (مروج الذهب جلد ۴ ص ۶۰ تحت ذکر ایام المامون، نداء المامون فی امر معاویہ و سبہ)

مامون الرشید نے ہی اپنے دور (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ) میں حضرت ابو سفیانؓ، حضرت معاویہؓ کی توہین و تکفیر اور ان پر لعنت کے جواز پر مشتمل ایک مدلل ”کتاب“ بطور خاص تیار کرائی جسے معتضد باللہ نے ۲۸۴ھ میں نافذ کرنے کا عزم کیا مگر وہ بوجہ اس پر عمل نہ کر سکا۔ یہی دور امام طبری کے عروج اور جو بن کا دور شمار ہوتا ہے۔ حضرت معاویہؓ کے ”موجبات لعن“ پر مشتمل جس کتاب کو شیعہ خلفاء مامون الرشید، معتضد باللہ اور اس کے بعد اس کے دونوں بیٹے ملتنی باللہ اور مقتدر باللہ اپنے باؤں سالہ دور اقتدار میں تمام تر جاہ و جلال کے باوصف منظر عام پر نہ لاسکے اسے ”سنی“ طبری نے اپنی کتاب ”تاریخ الامم والملوک“ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شامل کر کے حضرت معاویہؓ اور دیگر اموی صحابہؓ پر لعنت و تہرا کا ”جواز“ فراہم کر دیا۔ اس کا مفصل ذکر آگے زیر عنوان ”روایات طبری اور توہین سیدنا معاویہؓ آ رہا ہے۔“ ظاہر ہے کہ امام طبری کو اس ناپاک جسارت پر باقاعدہ سرکاری و سیاسی سرپرستی حاصل تھی کیونکہ اس کے بغیر ایک ”خفیہ سرکاری دستاویز“ کا طبری کے ہاتھ لگنا ایک امر محال تھا۔

امام طبری (۲۲۴ھ تا ۳۱۰ھ) کے دور کی سیاسی حیثیت کے علاوہ ایک ”مذہبی“ حیثیت بھی تھی۔ اہل تشیع کے اعتقاد میں یہ دور ”غیبت صغریٰ“ کا دور تھا جو ۲۶۰ھ تا ۳۲۹ھ جاری رہا۔ پھر ۳۲۹ھ سے تا قیام قیامت (یعنی خروج و ظہور مہدی) ”غیبت کبریٰ“ کا دور رہے۔ ”غیبت صغریٰ“ میں تو شیعہ مذہب مدون ہی نہیں ہوا تھا بس اس دوران میں ”امام زماں“ کے خاص محرم راز سفیروں کی ان کے پاس خفیہ آمد و رفت رہتی تھی اور ان سفیروں کے ذریعے اہل تشیع اپنے امام کی خدمت میں خطوط، درخواستیں اور قیمتی تحائف بھیجا کرتے تھے اور یہی سفیر ”امام زماں“ کی طرف سے خطوط کے جوابات قوم تک پہنچاتے تھے۔ ان سفیروں کی تعداد چار ہے:

(۱) ابو عمر و عثمان بن سعید (۲) ابو جعفر محمد بن عثمان

(۳) ابو القاسم حسین بن روح نوہختی (۴) ابو الحسن علی بن محمد السمری

اسی دور ”غیبت صغریٰ“ میں شیعہ مذہب کی سب سے زیادہ مستند کتاب ”اصول کافی“ مؤلفہ ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی (م ۳۲۹ھ) امام غائب کی خدمت میں پیش کی گئی جس پر امام موصوف نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا ”ہذا کاف لشیعتنا“ یہ کتاب ہمارے شیعوں کے لئے کافی ہے۔

اس دور میں بظاہر شیعہ، سنی کے مابین کوئی تفریق نہیں تھی۔ اہل تشیع تعلیمی، تدریسی، سیاسی، سماجی اور مذہبی طور پر اہل سنت کے ساتھ گھلے ملے ہوئے تھے۔

امام طبری (۲۲۴ھ تا ۳۱۰ھ) نے اپنی زندگی کے ۸۶ سالوں میں سے ۳۶ سال (یعنی ۲۶۰ھ تک) تین اماموں (علی نقی، حسن عسکری، مہدی) اور ۵۰ سال (یعنی ۲۶۱ھ تا ۳۱۰ھ) تک ”غیبت صغریٰ“ کا دور پایا۔ اس دور میں مجموعی حیثیت سے ”شیعیت“ کی عمارت صرف ”تقیہ“ کے بل بوتے پر قائم تھی۔

علمائے اہل سنت کے مطابق اہل تشیع نے اہل سنت کی کتب تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ میں ”تدلیس“ کے علاوہ ایک دھوکا دہی یہ بھی کی کہ ”تقیہ“ کے لبادے میں ”سنی“ بن کر یا کسی شیعہ عالم کو ”سنی“ مشہور کر کے اس سے شیعیت کے فروغ کا کام لیتے رہے۔ اس کام کے لئے امام طبری سے زیادہ کوئی شخصیت موزوں نہیں ہو سکتی تھی اس لئے ”سنیت“ کے لبادے میں انہوں نے موصوف کو میدان میں اتارا اور عوام کو دھوکے میں مبتلا رکھنے کے لئے ایک فرضی (ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم) طبری کو شیعہ طبری قرار دے دیا۔

امام طبری اور تقیہ

آیت اللہ خمینی (م ۱۹۸۹ء) لکھتے ہیں کہ:

”تقیہ، عقل کے روشن ترین احکام میں سے ہے اور تقیہ کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی حقیقت کے خلاف کچھ کہے یا کوئی کام قانون شریعت کے خلاف کرے، ہر وہ شخص جس کے پاس معمولی عقل بھی ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ تقیہ اللہ کے قطعی احکام میں سے ہے جیسا کہ روایت میں ہے کہ جو آدمی تقیہ نہ کرے تو اس کا کوئی دین نہیں ہے“ (کشف الاسرار ص ۱۲۸-۱۲۹) موصوف آگے چل کر تقیہ بازمجہد نور اللہ شومتری کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

”یہ بزرگ شیخ بہائی اور صفویہ کے ہم عصر تھے اور اکبر آباد ہند میں رہتے تھے اور تقیہ کے کمال کے ساتھ زندگی گزارتے تھے یہاں تک کہ اکبر بادشاہ ان کا ہم عقیدہ ہو گیا اور ان کو سنیوں میں سے سمجھتے تھے۔ انہیں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز کیا اور انہوں نے خفیہ طور پر تصنیف کا کام شروع کر دیا یہاں تک کہ اکبر بادشاہ فوت ہو گیا اور اس کا لڑکا جہانگیر بادشاہ ہوا لیکن یہ برادر قاضی القضاۃ کے منصب پر کام کرتے رہے، یہاں تک کہ مخالفین سمجھ گئے کہ وہ شیعہ ہے پھر بعد میں انہیں قاضیوں اور سلطان کے حکم سے اتنا مارا پیٹا گیا کہ وہ مر گئے“ (حوالہ مذکور ص ۱۵۶)

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ:

”ان کے علماء نے تقیہ کا لبادہ اوڑھ کر اپنے آپ کو اہل سنت کے محدثین ظاہر کیا اور علم وحدیث کے قابل اعتبار محدثین اہل سنت سے علم حدیث حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے اور صحیح اسناد یا دو حفظ کیں۔ ظاہری زہد و تقویٰ سے اپنے کو آراستہ و پیراستہ کیا۔ ان کی اس ظاہری حالت سے اہل سنت کے طلبائے حدیث نے بھی دھوکا کھایا اور ان کی شاگردی کو

قابل اعتماد سمجھا اور ان سے علم حدیث پڑھا۔

اہل علم میں اعتماد پیدا کرنے کے بعد انہوں نے یہ حرکت شروع کی کہ صحیح وحسن احادیث کی روایت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی گھڑی ہوئی احادیث بھی خلط ملط کر دیں۔ عوام تو کیا خواص تک اس دھوکا اور فریب کے شکار ہوئے۔“ (تحفہ اثنا عشریہ ص ۹۳ تحت سلجواں دھوکا) کتنے ہی شیعہ علماء تقیہ کا لبادہ اوڑھ کر شیعیت کو فروغ دیتے رہے اور کتنے ہی شیعہ علماء کو خود اہل تشیع نے ”سنی عالم“ مشہور کر کے اپنا کام چلایا۔

چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ:

”امامیہ، اثنا عشریہ اور زیدیہ کو چھوڑ کر کسی اور فرقہ کے عالم کا نام لے کر نہایت شد و مد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش خام کرتے ہیں کہ وہ متعصب سنی تھا اور بعض تو اس کو کٹر خارجی بتاتے ہیں پھر اس کی طرف سے کوئی عبارت نقل کرتے ہیں جس سے اہل سنت کے مذہب کا بطلان اور امامیہ اثنا عشریہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے اور اس حرکت سے غرض مذمومہ یہ ہوتی ہے کہ دیکھنے والا غلط فہمی میں پڑے اور الجھن میں مبتلا ہو کر یہ سوچے کہ جب مصنف اتنا متعصب سنی ہوتے ہوئے ان روایات کو بیان کرتا ہے اور پھر ان کی تردید کے بجائے اس پر سکوت اختیار کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایات صحیح ہی ہیں۔“ (حوالہ مذکور ص ۹۶) اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ”تقیہ“ اہل تشیع کا ایک بنیادی اصول اور ائمہ کا دین ہے۔ اہل تشیع حضرت جعفر صادق کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

”التقیہ دینی و دین آبائی“ تقیہ میرا دین اور میرے آباء کا دین ہے۔ اہل تشیع نے ”تقیہ“ کی بدولت خود حضرت علیؑ اور حضرت جعفر صادق کے ایک مدحیہ جملہ سے بھی ”دو پہلو“ مفہوم اخذ کر لیا۔ جب حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے متعلق ان کی رائے دریافت کی گئی تو انہوں نے فرمایا: ”کنا ائما مین عادلین ما تا علی الحق“ اس کی ”تشریح“ یوں کی گئی کہ ”کنا ائما مین عادلین عن الحق، ما تا علی الموت“ ملاحظہ ہو: ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام ص ۶۱۹۔

حضرت علیؓ کی طرف منسوب ایک قول یہ بھی ہے کہ:

”إنهما إمامان، عادلان قاسطان ماتا على الحق“ یعنی وہ دونوں عادل و منصف امام تھے اور حق پر فوت ہوئے لیکن وہ یہاں ”عادل“ کو ”عدل“ کے اسم فاعل کے طور پر نہیں لیتے بلکہ ”عدول“ سے لے کر یہ معنی کرتے ہیں کہ وہ دونوں حق سے انحراف کرنے والے تھے۔ اسی طرح ”قاسط“ کو ظلم کے معنی میں لے کر یہ معنی مراد لیتے ہیں کہ وہ دونوں ظالم تھے کیونکہ ”قسط“ لغت احمد میں سے ہے اور اس کے معنی انصاف کے بھی ہیں اور ظلم کے بھی۔

ایک شیعہ نے تہذیب کہا کہ: ”خیر الناس بعد رسول اللہ ابابکر“ تو سنی خوش ہو گئے کہ یہ ابوبکر صدیقؓ کی فضیلت کا قائل ہو گیا ہے۔ مگر امام رضاؑ نے اس کی یہ تاویل بیان کی کہ اگر ”خیر الناس بعد رسول اللہ ابوبکر“ کہتا تو فضیلت ثابت ہوتی لیکن اس نے تو یہ کہا کہ ”خیر الناس بعد رسول اللہ ابابکر“ یعنی ابوبکر! رسول اللہ کے بعد سب آدمیوں سے بہتر... اس سے وہ مطلب نہیں نکلتا جو سنی جہال سمجھ رہے ہیں۔ ایک سنی نے ایک شیعہ سے کہا کہ کیا تو اس بات کا قائل ہے کہ رسول اللہ کے بعد ابوبکر ہی امام ہے؟ تو اس نے کہا: ”نعم“ لیکن اس سے ”وہ“ گائے، بھیڑ“ مراد لئے۔ پھر اس شیعہ سے کہا گیا کہ ”واللہ کہہ کر قسم اٹھاؤ تو اس نے ”وہ“ کے تلفظ سے یہ لفظ دہرایا جیسے ”وہی زید عن امر کلنا“ یعنی زید فلاں کام سے پھر گیا۔

پھر اس پر زور دیا گیا کہ ”واللہ کہہ اور ہاء“ کو ظاہر کر دو اس نے ہاء کی زیر کے بجائے پیش کے ساتھ ادا کیا ”واللہ“ جو قسم کے معنی میں نہیں بولا جاتا۔ ملاحظہ ہو: آثار حیدری ص ۳۲۲۔ لہذا تہذیب کی اصل حقیقت کو سمجھنا عام ادیبوں، دانشوروں، صحافیوں اور سیاسی مولویوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

اسی طرح امام طبری سے اگر صحابہ کرامؓ کی مدح ثابت ہے تو ان کی توہین اور لعن طعن حتیٰ کہ تکفیر بھی ثابت ہے جن کے ذکر آگے مستقل عنوان کے تحت آ رہا ہے۔

امام طبری اور شیعیت

امام طبری اپنی تمام تر جلالت علم کے باوصف اپنے آپ کو رفض زدہ ماحول کے زہریلے اثرات سے نہ بچا سکے اور جن علمائے اسلام نے انہیں اہل سنت کا معتمد امام قرار دیا ہے انہوں نے ہی ان میں ”تشیع“ کا اعتراف بھی کیا ہے چنانچہ یاقوت حموی (م ۶۲۶ھ)، ابن اثیر جزری (م ۶۳۰ھ)، امام ذہبی (م ۷۴۸ھ)، امام ابن کثیر (م ۷۴۴ھ) اور حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ان کی زندگی میں ہی ان پر ”رفض، تشیع و الجاؤ“ کا الزام عائد ہو گیا تھا جس کی بناء پر وہ وفات کے بعد عوام کے خوف سے رات کے وقت گھر پر ہی دفن کئے گئے۔

امام ذہبی اور ابن حجر عسقلانی نے ان کے ”رفض“ کی تو تردید کی ہے مگر ان کے ”تشیع“ کی نفی نہیں کر سکے۔

امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ”فیہ تشیع و موالاة لا تنصر“ جبکہ ابن حجر نے ”تشیع“ کے ساتھ ”یسیر“ کا اضافہ کیا۔ ملاحظہ ہو: میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۳۵، لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۰۰۔ ”تہذیب و کتمان“ کے اس خاص دور میں سنی امام طبری میں تھوڑی سی شیعیت اور موالات کا اقرار دراصل ”قد بدت البغضاء من اقواہم و ما تخفی صدورہم اکبر“ کا صدق ہے۔ ان حضرات کا ”لا تنصر“ کہنا امام طبری کی توثیق نہیں بلکہ مذہب شیعہ سے خود اپنی ماورائی کی دلیل ہے۔ بھلا جس شخص میں ”تشیع و موالاة“ دونوں جمع ہو جائیں تو اس کا تشیع ”یسیر یا غیر مصر“ کیوں کر ہو سکتا ہے؟ سخت حیرت ہے کہ انہم رجال تو امام طبری میں ”تشیع و موالاة“ تسلیم کر رہے ہیں مگر مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”بعض حضرات نے ان پر شیعہ ہونے کا الزام عائد کیا ہے لیکن محققین نے اس الزام

کی تردید کی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اہل سنت کے جلیل القدر عالم ہیں بلکہ ان کا شمار ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے۔“ (معارف القرآن جلد اول ص ۵۶۔ تحت ”مقدمہ“)

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امام طبری کے بڑے بڑے کلائے صفائی بھی ان کے تشیع کی نفی نہیں کر سکے۔ مگر صدافسوس موصوف نے یہاں غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی تردید کر ڈالی جو بالکل خلاف واقع ہے۔ علاوہ ازیں موصوف یہاں ”محققین“ کے بجائے اگر ”مقلدین“ کا لفظ استعمال فرماتے تو ان کی بات کسی حد تک درست ہو سکتی تھی لیکن انہوں نے ”محققین“ کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو یقیناً محل نظر ہے۔ ”محققین“ جمع کا لفظ ہے جس کا اطلاق تین سے کم پر درست نہیں۔ کاش! اس ”دعویٰ“ کے مطابق کم از کم تین ”محققین“ کے اسمائے گرامی درج کر دیتے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امام طبری کے افکار و نظریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، بقائمی ہوش و حواس کوئی ایک ”محقق“ بھی ان کے تشیع کی نفی نہیں کر سکتا۔

بانی جماعت اسلامی مولانا مودودی صاحب رقم طراز ہیں کہ:

”بعض فقہی مسائل اور حدیث غدیر خم کے معاملہ میں شیعہ مسلک سے اتفاق کی بناء پر بعض لوگوں نے خواہ مخواہ انہیں شیعہ قرار دے ڈالا اور ایک بزرگ نے تو ان کو امام من ائمة الامامية“ تک قرار دے دیا حالانکہ اہل سنت میں کون ہے جس کا کوئی قول بھی کسی فقہی مسئلے یا کسی حدیث کی تفسیر کے معاملے میں شیعوں سے نہ ملتا ہو۔۔۔ دراصل سب سے پہلے حنابلہ نے ان پر رفض کا الزام اس غصہ کی بناء پر لگایا تھا کہ وہ امام احمد بن حنبل کو صرف محدث مانتے تھے فقیہ نہیں مانتے تھے۔ اسی وجہ سے حنبلی ان کی زندگی ہی میں ان کے دشمن ہو گئے تھے، ان کے پاس جانے سے لوگوں کو روکتے تھے اور ان کی وفات کے بعد انہوں نے مقابلہ مسلمین میں ان کو دفن تک نہ ہونے دیا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے گھر پر دفن کئے گئے۔ اسی زیادتی پر امام ابن خزیمہ کہتے ہیں ”لقد ظلمته الحنابلة“ اس کے بعد ان کی بدنامی کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ ان ہی کے ہم عصروں میں ایک اور شخص محمد بن جریر الطبری کے نام سے معروف تھا اور وہ خود شیعہ تھا لیکن کوئی شخص جس نے کبھی آنکھیں کھول کر خود تفسیر ابن جریر اور تاریخ طبری کو پڑھا ہے اس

غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ ان کا مصنف شیعہ تھا یا یہ دونوں کتابیں اس شیعہ محمد بن جریر طبری کی لکھی ہوئی ہیں۔“ (خلافت و لوکیت ص ۳۱۳۔ ۳۱۴)

مولانا مودودی صاحب نے یہاں اگرچہ امام طبری کے ہم عصر ایک دوسرے شیعہ طبری کا بھی ذکر کیا ہے مگر اس کے ساتھ یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ تفسیر طبری اور تاریخ طبری سنی طبری ہی کی تالیفات ہیں شیعہ طبری کے ساتھ ان کتابوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہذا اراقم الحروف کا یہ دعویٰ ہے کہ ”جس شخص نے کبھی آنکھیں کھول کر خود تفسیر ابن جریر اور تاریخ طبری کو پڑھا ہے اس غلط فہمی میں ہرگز نہیں پڑ سکتا کہ ان کتب کا مصنف کوئی راسخ العقیدہ ”سنی“ ہو سکتا ہے۔

مولانا مودودی صاحب کی طرح دیگر ارباب سیر نے بھی امام طبری کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ حنابلہ نے ان پر ”رفض“ کا الزام لگایا اور انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا البتہ حافظ ابن حجر نے بروایت ”احمد بن کمال“ یہ لکھا ہے کہ امام طبری کی وفات کی خبر کسی کو نہیں دی گئی پھر بھی ان کے جنازے میں اتنے لوگ اکٹھے ہو گئے جن کی تعداد اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا اور ان کی قبر پر کئی ماہ تک دن رات نماز جنازہ پڑھی جاتی رہی۔ ملاحظہ ہو: (لسان المیر ان جلد ۵۔ ص ۱۰۲)

کاش! اس کثرت کے ساتھ اور اس کثیر تعداد میں امام طبری کی نماز جنازہ پڑھنے والے ان کی زندگی میں ان کی کچھ ”مدد“ کرتے تا کہ وہ حنابلہ کی ایذا دہی سے بچ آ کر کوشہ نشینی اختیار نہ کرتے اور ”درس“ دینے اور مسجد میں باجماعت نماز کی ادائیگی سے بھی محروم نہ رہتے۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کئی ماہ تک، دن رات، قبر پر نماز جنازہ پڑھے جانے کی جو سعادت امام طبری کو حاصل ہوئی وہ خیر القرون میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سمیت کسی صحابی، تابعی، اور تابع تابعی کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔ اس ”اعزاز“ کے مستحق پوری امت میں صرف امام طبری ہی قرار دیئے گئے حالانکہ قبر پر اس ”میت“ کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے جسے نماز جنازہ ادا کئے بغیر دفن کر دیا گیا ہو وہ بھی تین دن کے اندر اندر جن میں

لاش کے نہ بچنے کا احتمال ہوتا ہے۔

پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ پہلی مرتبہ مدفن سے پہلے نماز جنازہ کی ادائیگی سے جب ”فرض کفایہ“ پر عمل ہو گیا تھا تو پھر بعد میں کئی ماہ تک دن رات قبر پر اس عمل کا اعادہ و تکرار آخر کس فقہی مذہب میں پایا جاتا ہے؟

حافظ ابن حجر عسقلانی کی پیش کردہ روایت کے ”موضوع“ ہونے کے لئے اتنی بات ہی کافی تھی لیکن اس میں ایک سقم یہ بھی ہے کہ احمد بن کامل (م ۳۵۰ھ) اور ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) کے درمیان کافی ”خلا“ ہے۔ پھر خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) نے بھی یہ روایت بیان کی ہے۔ جبکہ خطیب، احمد بن کامل کی وفات کے ۴۲ سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ غالباً اسی سقم کے باعث مولانا مودودی صاحب جیسے وکیل صفائی نے اس روایت کو ترک کر کے صرف اس بات پر اکتفاء کر لیا کہ حنابلہ نے انہیں ”مقابر مسلمین“ میں دفن نہیں ہونے دیا تھا جس کی وجہ سے وہ گھر پر ہی دفن کر دیئے گئے۔

دکلائے صفائی کی بیان کردہ وجوہات تو بالکل ہی خلاف واقع اور بعید از فہم ہیں کہ حنابلہ نے امام احمد کو محض ”فقہ“ نہ تسلیم کرنے کی بناء پر تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے امام طبری پر نہ صرف ”رفض والحاد“ کا الزام لگایا بلکہ ان کی کردار کشی بھی کی، ان کی طرف غلط عقائد منسوب کئے، ان کے پاس جانے سے مسلمانوں کو روکا، ان پر مسجد میں درس دینے اور باجماعت نماز پڑھنے کی پابندی لگا دی حتیٰ کہ انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن تک نہ ہونے دیا جس کی وجہ سے وہ گھر پر ہی دفن کئے گئے۔

سخت حیرت ہے کہ ایک عظیم مفسر، محدث جلیل، فقیہ و مجتہد اور نامور مؤرخ امام طبری پر ایک قلیل گروہ (یعنی حنابلہ) کی طرف سے ایک طویل عرصہ تک یہ مظالم ڈھائے جاتے رہے جبکہ حکومت کے علاوہ باقی تمام مسلمان (حنفی، مالکی، شافعی) عام انسانی ہمدردی کے تقاضا کو بھی بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک خاموش تماشاخی کا کردار ادا کرتے رہے، پھر تعجب بالائے تعجب یہ کہ امام احمد بن حنبل کو ”فقہ“ نہ تسلیم کرنا جیسے ”سبب مخالفت“ سے

”رفض و تشیع“ کے الزام کی آخر کیا مناسبت اور کیا تعلق ہے؟ کسی امام کو صرف ”محدث“ تسلیم کرنا اور ”فقہ“ تسلیم نہ کرنا آخر دنیا کی کس لغت میں ”رفض و تشیع“ کہلاتا ہے؟ اگر بالفرض امام طبری، امام احمد کو محدث کے ساتھ ساتھ ”فقہ“ بھی تسلیم کر لیتے تو کیا پھر ان پر عائد ”رفض“ کا الزام ختم ہو جاتا؟

امام طبری کے دکلائے صفائی کی یہ دلیل اس قدر کمزور ہے کہ وہ کسی گاؤں کی ”پنجائیت“ میں بھی پیش کرنے کے قابل نہیں ہے اس دلیل سے تو الٹا یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ حنابلہ کا یہ الزام بالکل صحیح تھا اور امام طبری اپنے بعض افکار و نظریات کے حوالے سے ایک عام شیعہ ہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر ”رافضی“ بھی تھے۔ (اس پر بحث آگے آرہی ہے) کیونکہ اگر وہ صرف شیعہ ہی ہوتے تو پھر ان سے مدفن کے موقع پر اس قسم کا سلوک ہرگز نہ ہوتا۔

علاوہ ازیں اس وقت بغداد میں اہل تشیع کی بھی ایک مؤثر قوت موجود تھی، کم از کم وہ ان کا ضرور دفاع کرتے، یہ بات بھی قابل غور ہے کہ امام طبری (م ۳۱۰ھ) سے قبل کتنے ہی شیعہ عوام و خواص اور علماء و مجتہدین وفات پا چکے تھے لیکن ان میں سے کسی کے ساتھ بھی کوئی ”نامناسب“ سلوک روا نہیں رکھا گیا اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ امام طبری میں علاوہ ”تشیع و رفض“ کے بعض ”محدانہ“ افکار بھی پائے جاتے تھے (و ادعوا علیہ الرفض ثم ادعوا علیہ الالحاد۔ الکامل فی التاريخ لابن اثیر) جن کی بناء پر انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن تک نہ ہونے دیا۔

جہاں تک اہل تشیع کی اس معاملے سے ”غیر جانبداری“ کا تعلق ہے تو اس کی ایک وجہ یہ سمجھ آتی ہے کہ ”وہ یہ چاہتے تھے کہ مرنے کے بعد بھی امام طبری کی لاش ”تقیہ و نفاق“ کے کفن میں ڈھکی رہے تاکہ اس سے اہل سنت ہمیشہ دھوکا کھاتے رہیں اور انہیں ”امام اہل سنت“ ہی باور کرتے رہیں۔ بہر حال امام طبری کی شیعیت ”تقیہ و کتمان“ کا سہارا لئے بغیر بھی ہزار پردوں میں چھپانے سے بھی ہرگز نہیں چھپ سکتی۔

تشیع عند المتقدمین

امام طبری کے وکلاء صفائی، امام ذہبی کے الفاظ: ”فیہ تشیع و موالاة لا تنضر“ یا ابن حجر عسقلانی کے الفاظ: ”فیہ تشیع یسیر و موالاة لا تنضر“ سے امام طبری کی شیعیت پر استدلال کرنے والوں کے جواب میں یہ ”دلیل“ پیش کرتے ہیں کہ:

امام ذہبی اور ابن حجر کی ان الفاظ سے مراد یہ ہے کہ امام طبری میں معمولی سا تشیع اور اصحاب علیؑ کی طرف جھکاؤ پایا جاتا تھا جو مضرت نہیں تھا۔ نیز پہلی صدی ہجری سے تیسری صدی ہجری کے اواخر تک ”تشیع“ کا مطلب آج کل جیسی شیعیت نہ تھا۔ اس دور میں ”تشیع“ اہل بیتؑ کی طرف جھکاؤ میں مبالغہ کا دوسرا نام تھا جبکہ صحابہؓ سے بیزاری طبع کو اس دور میں رافضی کہا جاتا تھا لہذا امام طبری کے ترجمہ میں ”فیہ تشیع“ کی جرح سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

ملاحظہ ہو: روزنامہ اسلام - ۳۱/ جولائی ۲۰۱۵ء

مقدمین کے عرف میں ”تشیع“ کی حقیقت پر بحث تو آگے آرہی ہے لیکن یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ امام طبری کے ”تشیع و موالاة“ کو ”یسیر و لا تنضر“ کے الفاظ سے معمولی سمجھنا خود وکلاء صفائی کی مذہب شیعہ سے اپنی ماوثقی کی دلیل ہے، امام طبری کی توثیق ہرگز نہیں۔ ظاہر ہے کہ علمی دنیا میں کسی محدث یا وکیل کی ماوثقی کو دلیل کے طور پر نتو پیش کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے قبول کیا جاسکتا ہے۔ جو حضرات شیعہ مذہب سے تھوڑا سا بھی ”مس“ رکھتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کسی شخص میں ”شیعیت“ خواہ کتنی ہی ”یسیر“ کیوں نہ ہو وہ ”لائق“ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ پھر جس شخص میں ”تشیع و موالاة“ دونوں جمع ہو جائیں تو معلوم نہیں کہ اس کا ”تشیع“ ”یسیر“ یا غیر مضرت کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے؟

وکلاء صفائی کا اصل بیان تو ”فیہ تشیع و موالاة“ پر ختم ہو گیا ہے جبکہ ”یسیر و لا تنضر“ بیان

واقعہ نہیں بلکہ مذہب شیعہ سے ماوثقی پر مبنی ان کی ذاتی رائے ہے جس سے امام طبری کی شیعیت کسی صورت میں بھی ”یسیر و لا تنضر“ نہیں ہو سکتی بلکہ وکلاء صفائی کے امام طبری کے متعلق ”فیہ تشیع و موالاة“ علویوں کی حمایت، اہل بیت کی طرف جھکاؤ میں غلو اور حدیث غدیرؑ کی حمایت میں چار حصوں پر مشتمل کتاب کی تصنیف، جیسے حقائق تسلیم کرنے کے بعد موصوف کے ”اجلے دامن“ پر لگے ہوئے شیعیت کے بدنامہ داغ اور وجہ کو کسی ”صابن یا سرف“ سے زائل نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا وکلاء صفائی کا امام طبری کے دفاع میں اس دلیل سے استدلال کرنا کہ ”پہلی صدی ہجری سے تیسری صدی ہجری کے اواخر تک تشیع کا مطلب آج کل جیسی شیعیت نہ تھا۔“ خود فریبی ہی نہیں بلکہ فریب دہی کی بھی بدترین مثال ہے۔

اس تمہید کے بعد ”تشیع عند المتقدمین“ کی حقیقت ملاحظہ فرمائیں:

”شیعہ“ کے لغوی معنی مطیع و فرمانبردار، پیروکار، جماعت اور گروہ کے ہیں۔ یہ لفظ واحد، جمع، مذکر اور مؤنث سب کے لئے یکساں مستعمل ہے۔ ”شیعی“ شیعہ فرقہ سے منسوب، ”تشیع“ شیعہ ہونا ہے۔

سید مرتضیٰ حسین فاضل بحوالہ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ:

”یعنی لغت میں شیعہ کے معنی ہیں ساتھی اور پیروکار۔ سلف سے اب تک فقہاء و متکلمین کے روزمرہ کے معمول میں حضرت علیؑ اور اولاد علیؑ کے پیروکاروں کو شیعہ کہا جاتا ہے۔ درحقیقت شروع ہی سے حامیان حضرت علیؑ شیعہ کہلاتے تھے مگر جنگ جمل اور جنگ صفین نے حضرت علیؑ کے طرفداروں کو خصوصی طور پر نمایاں کر دیا۔“ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ جلد ۱ ص ۸۹۹)

سیاسی طور پر سب سے پہلے حضرت علیؑ کے دور خلافت میں شیعیان علیؑ، شیعیان عثمانؓ اور شیعیان معاویہؓ کے نام سامنے آئے اور اس کے ساتھ ہی مذہب شیعہ کی تخلیق و تدوین کا خفیہ کام بھی شروع ہو گیا تھا جو عبداللہ بن سبا اور اس کی پارٹی تک محدود رہا لیکن خالقین مذہب شیعہ سیاسی و مذہبی دونوں محاذوں پر سرگرم عمل رہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ شیعہ کے متعلق

متقدمین و متأخرین کی اصطلاح جدا جدا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ:

”والتشیع محبة علی و تقدیمه علی الصحابة: فمن قدمه علی ابی بکر و عمر فهو غال فی تشیعه و يطلق علیه رافضی و لا فشیعی فان انضاف الی ذلك السب او التصريح بالبغض فغال فی الرفض وان اعتقد الرجعة الی الدنيا فأ شد فی الغلو“ (فتح الباری جلد اول ص ۴۵۹)

یعنی شیعیت حضرت علیؑ کی محبت اور صحابہ پر ان کو فوقیت دینے کا نام ہے لہذا جس نے ان کو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ پر فوقیت دی تو وہ شیعیت میں غالی ہے اور اس پر رافضی کا بھی اطلاق ہوتا ہے اور اگر ایسا نہیں یعنی حضرت علیؑ کو ان پر فوقیت نہیں دیتا تو وہ بس شیعہ ہے۔ لیکن اگر وہ حضرت علیؑ کی محبت کے ساتھ دوسروں کو سب و شتم کرتا ہے یا کھل کر بغض کا اظہار کرتا ہے تو وہ رخص میں غالی ہے اور اس کے ساتھ دنیا میں ان کی رجعت کا بھی قائل ہے تو یہ غلو میں اور نیا وہ سخت ہے۔

موصوف اپنی ایک دوسری کتاب میں اس مسئلہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”فالتشیع فی عرف المتقدمین هو اعتقاد تفصیل علی علی عثمان وان علیا کان مصیبا فی حروبه و ان مخالفه مخطی مع تقدیم الشیخین و تفضیلہما۔

و أما التشیع فی عرف المتأخرین فهو الرفض المحض فلا تقبل رواية الرافضی الغالی ولا کرامة“ (تہذیب التہذیب جلد اول ص ۹۴)

متقدمین کے عرف و اصطلاح میں تشیع کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت علیؑ کو حضرت عثمانؓ پر فضیلت دی جائے اور یہ کہ حضرت علیؑ ان جنگوں میں حق بجانب تھے اور ان کے مخالف خطاء پر تھے اور وہ حضرات شیخینؑ کی تقدیم و تفصیل کے قائل تھے۔

جبکہ متأخرین کے نزدیک شیعیت خالص رخص کا نام ہے لہذا نہ تو اس غالی رافضی کی روایت قبول کی جاسکتی ہے اور نہ اس کی عزت کی جاسکتی ہے۔

تقریباً یہی بات علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے تحریر فرمائی ہے کہ:

”والشیعی الغالی فی زمن السلف و عرفهم من تکلم فی عثمان والزبیر و

طلحة و طائفة ممن حارب علیاً و تعرض بسبهم والغالی فی زمتنا و عرفنا هو الذی کفر هؤلاء السادة و تبرأ من الشیخین أیضاً، فهذا ضالّ مفتر“ (فتح الملہم جلد اول ص ۷۷)۔ مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم کراچی تحت ”روایات اہل البدع والاهواء“

سلف کے زمانہ میں غالی شیعہ وہ سمجھا جاتا تھا جو حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ اور اس گروہ کے خلاف جس نے حضرت علیؑ کے خلاف جنگ کی، کلام کرے اور انہیں برا بھلا کہنے کے درپے ہو۔ جبکہ ہمارے عرف اور زمانے میں غالی وہ ہے جو ان سادات (صحابہ) کی تکفیر کرنے اور شیخین سے بھی برأت کرے۔ یہ افتراء پر دا زور گمراہ ہے۔

متقدمین کے نزدیک عام شیعیت یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے ساتھ محبت میں غلو ہو اور انہیں حضرت عثمانؓ پر فضیلت دی جائے۔ اس کے ساتھ اگر اس نے شیخینؑ پر بھی فضیلت دے دی تو وہ غالی شیعہ ہے اور اس پر رافضی کا بھی اطلاق ہوگا۔

نیز تفصیل علیؑ بر عثمانؓ کے ساتھ ساتھ وہ حضرت علیؑ کو اپنی جنگوں میں مصیب اور ان کے مخالفین کو خطی قرار دے کر چہ حضرات شیخینؑ کی حضرت علیؑ پر تقدیم و تفصیل کا قائل ہو پھر بھی وہ شیعہ ہی سمجھا جائے گا۔ اسی طرح متقدمین کے عرف میں ”غالی شیعہ“ وہ سمجھا جاتا تھا جو حضرات عثمانؓ، طلحہؓ، زبیرؓ اور دیگر محاربین علیؑ یعنی حضرت معاویہؓ وغیرہ پر تنقید و اعتراض کرے اور ان پر لعن طعن کرے۔

مذکورہ تفصیل سے متقدمین کے عرف میں ”تشیع“ کا مفہوم بالکل واضح ہو گیا ہے کہ ان کی اصطلاح میں شیعہ وہ سمجھے جاتے تھے جو تمام ”اصول و فروع“ میں اہل سنت والجماعت سے متفق تھے صرف ”تفصیل علیؑ بر عثمانؓ“ کے قائل تھے۔ نیز انہیں جنگوں میں مصیب اور مخالفین کو خطی سمجھتے تھے۔

جبکہ رافضی اور غالی شیعہ وہ سمجھے جاتے تھے جو ”تفصیل علیؑ بر شیخینؑ“ کے قائل ہوں اور محاربین علیؑ پر اعتراض اور تنقید کریں۔ متقدمین، سلف صالحین اور محدثین کی احتیاط کا اندازہ لگائیں کہ جو شخص تمام اصول و فروع میں اہل سنت والجماعت کے ساتھ متفق ہو لیکن مذکورہ بالا امور میں سے کوئی ایک امر بھی اس میں پایا جائے تو وہ حضرات اس چیز کو بھی اجماع

امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے اہل سنت والجماعت کی حدود سے باہر اور اہل تشیع کی حدود میں داخل سمجھتے ہیں۔

محققین و متأخرین محدثین و علماء کی تصریحات کی روشنی میں فیصلہ کر لیں کہ کیا امام طبری پر صرف شیعہ کا اطلاق صحیح ہے یا رافضی کا بھی؟

محققین نے تو اس بات کی تصریح کی ہے کہ ”تشیع“ حضرت علیؑ سے زیادہ محبت رکھنا ہے لیکن روزنامہ اسلام کے ”فاضل“ کالم نگار نے تو حضرت علیؑ کے بجائے ”اہل بیت“ کا لفظ داخل کر کے حضرت علیؑ سمیت ”چارتن“ کو بھی اس میں شامل کر لیا ہے۔ معلوم نہیں کہ انہوں نے محققین کی اصطلاح کے برعکس حضرت علیؑ کے بجائے ”اہل بیت“ کا اضافہ کر کے ”تشیع“ کا دائرہ کیوں وسیع کر دیا؟ حوالہ تو انہوں نے محققین کی اصطلاح کا دیا لیکن ”جامہ“ اسے متأخرین کا پہنا دیا۔ اگر وہ اپنی بات کو اصل ”تعریف“ تک ہی محدود رکھتے تو اس کی رو سے بھی معصوف کے بعد روح حضرت امام طبری میں ”تشیع“ ثابت ہی ثابت تھا مگر انہوں نے ”اہل بیت کی طرف جھکاؤ میں مبالغے“ کا ذکر کر کے امام طبری کو متأخرین کی اصطلاح کے مطابق بھی رافضی اور کثر شیعہ ثابت کر دیا۔

پھر فاضل وکیل صفائی نے یہ لکھ کر ”رہی سہی“ کسر بھی پوری کر دی کہ ”حافظ ذہبی نے شہادت دی ہے کہ معمولی سا جھکاؤ تشیع کی جانب تھا جو نقصان دہ نہ تھا۔ غالباً اس سے مراد یہ ہے کہ سیاسی حمایت کے لحاظ سے طبری کا جھکاؤ علویوں کی طرف تھا“ (روزنامہ اسلام ۳۱ جولائی ۲۰۱۵ء۔ تحت ”علامہ طبری مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز“)

معلوم نہیں کہ امام طبری کو حکومت کی مخالف جماعت علویوں کی سیاسی حمایت کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ طبرستان میں تو پہلے ہی شیعہ حکومت قائم ہو چکی تھی جس نے بغداد میں مرکزی حکومت کے قیام کا ”نامک“ دے کر امام طبری پر بظاہر ”سنیت“ کا الزام عائد کیا پھر انہیں وہاں سے ”غزاز“ کا موقع دے کر دوبارہ بغداد بھجوا دیا۔ اس سیاسی حمایت کا یہ نتیجہ نکلا کہ امام طبری کی وفات کے صرف ۱۰ سال بعد بغداد میں آل بویہ کی حکومت قائم ہو گئی۔

روزنامہ اسلام کے کالم نگار اور امام طبری کے فاضل وکیل صفائی اپنے مضمون میں یہ بات

لکھ آئے ہیں کہ ”اس دور میں معتزلہ کو سرکاری عہدوں سے معزول کر کے علماء اہل سنت کو دوبارہ عزت دی گئی تھی اور حکومتی صفوں میں اہل سنت کا غلبہ ہو گیا جو نو عباس کے آخری دور تک رہا۔“ سخت حیرت ہے کہ اس کے باوجود ایک سنی مفسر، محدث، فقیہ و مجتہد اور مؤرخ (یعنی امام طبری) اہل سنت کے غلبے کی حامل حکومت کو نا کام بنانے کے لئے اس کی مخالف جماعت کی سیاسی حمایت پر کمر بستہ ہو گئے تھے۔

فاضل وکیل صفائی کی یہ بات بھی بالکل ہی خلاف واقع ہے کہ ”مؤلفین صحاح ستہ کے شیوخ میں: امانت دار اور دیانت دار اہل تشیع راوی موجود تھے جو بدعتی و رافضی نہ تھے اور ان کا تشیع عقائد کے لحاظ سے مضرب بھی نہ تھا، اسی طرح ابن جریر کے تشیع سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا“ صحاح ستہ میں سے ”سنن اربعہ“ کا تو ذکر ہی کیا شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے نزدیک خود صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ”شیعہ بدعتی بقدری، ناصبی، خارجی اور مرجی“ بیسیوں راوی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مصوف نے ان راویوں کی ایک فہرست دی ہے اور ساتھ ساتھ ہی ان کا ”ٹریڈ مارک“ بھی بتا دیا ہے کہ:

”هؤلاء رموا بالا رجاء، هؤلاء رموا بالنصب، وهو بغض عليّ وتقديم غيره عليه، هؤلاء رموا بالتشيع، وهو تقديم عليّ على الصحابة (أي عليّ أبي بكر وعمر وعثمان رضي الله عنهم)، هؤلاء رموا بالقدر: بشر بن العسري رمى برأى أبي جهنم، وهو نفى صفات الله تعالى والقول بخلق القرآن وهم الخوارج الذين أنكروا عليّ عليّ التحكيم، وتبرأ منه ومن عثمان و ذويه و قاتلوهم، هؤلاء المبتدعة ممن أخرج لهم الشيخان أحدهما (أي البخاري ومسلم)، وقد عُد بعض منهم من الدعاء إلى بدعته“ ملاحظہ ہو: فتح الملہم المجلد الاول ص ۱۷۹-۱۸۱ تحت ”اسماء من رمی ببدعته ممن أخرج لهم البخاري ومسلم“۔

فاضل وکیل صفائی کا یہ لکھنا کہ: ”صحاح ستہ کے شیوخ میں: امانت دار اور دیانت دار اہل تشیع راوی موجود تھے جو بدعتی و رافضی نہ تھے اور ان کا تشیع عقائد کے لحاظ سے مضرب بھی نہ

تھا، اسی طرح ابن جریر کے تشیع سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا،

اوپر اس کی وضاحت ہو چکی ہے کہ سنن اربعہ ہی نہیں بلکہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بھی خارجی، ماصی، رافضی اور بدعتی راوی موجود تھے۔ اگر امام طبری کے تشیع سے بھی کوئی خاص فرق نہ پڑتا، تو پھر کیا وجہ ہے کہ مؤلفین صحاح ستہ نے امام طبری جیسے تابعی، روزگار مفسر و محدث سے کوئی روایت قبول نہیں کی حالانکہ تمام جامعین صحاح ستہ ان کے ہم عصر تھے۔ بھلا امام طبری کے تشیع پر اس سے زیادہ اور کیا فرق پڑ سکتا تھا؟

شاید یہی وجہ ہے کہ امام طبری نے بھی جواباً شیعوں، رافضیوں اور کذابوں سے تو روایات قبول کر لیں مگر مؤلفین صحاح ستہ کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا۔

علاوہ ازیں کالم نگار اور فاضل وکیل صفائی کا یہ لکھنا کہ ”اس دور میں تشیع اہل بیت کی طرف جھکاؤ (یا محبت) میں مباغہ کا دوسرا نام تھا“

اس ”توضیح“ کی رو سے تو امام طبری میں ”ذیل تشیع“ کا بت ہو گیا ہے۔ ایک تو اہل بیت کے ساتھ محبت (ظاہر ہے کہ یہاں ”قرآنی اہل بیت“ تو ہرگز مراد نہیں لئے جاسکتے جو صرف امہات المؤمنین ہیں) دوسرا اس میں غلو اور مباغہ۔

اگر اس کے معنی حضرت علیؑ یا ان کے اہل بیت کے ساتھ محبت کے لئے جائیں تو پھر شیعہ اور سنی کی تعریف ہی بے معنی ہو جاتی ہے کیونکہ ہر سنی مسلمان جملہ صحابہؓ اور حضرت علیؑ سے دینی محبت و عقیدت اپنے ایمان کا جزء سمجھتا ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ اس مقام پر ائمہ رجال نے صرف امام طبری ہی کو شیعہ کیوں قرار دیا ہے؟ کیا حضرت علیؑ سے دینی محبت و عقیدت کوئی عیب اور نقص ہے؟ جب یہ ایک خوبی اور صفت ہے تو کیا اس سے جملہ اہل سنت والجماعت کے افراد متصف نہیں ہیں؟ تو پھر اس مقام پر شیعہ و سنی کی تفریق کے کیا معنی ہیں؟ ظاہر ہے کہ محبت علیؑ صرف اسی وقت تشیع یا عیب و نقص کہلا سکتی ہے جب وہ افراط کی حد میں داخل ہو جائے۔

امام طبری کے فاضل وکیل صفائی کے اپنے ”اعتزاف“ کے مطابق (تشیع اہل بیت کی

طرف جھکاؤ میں مباغہ کا دوسرا نام ہے) یقیناً یہ محبت افراط کی حد میں داخل ہونے کی بناء پر حد شرعی سے زائد ہے جو شرعاً مستنکر اور مذموم فعل ہے۔

شیعہ مذہب اور شیعی تکنیک سے باخبر اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ شیعیت میں داخلہ کا دروازہ ”حب اہل بیت“ کا نعرہ مستانہ ہے۔ ”شیعی اصطلاح“ میں اس سے مراد: حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت حسنؑ، حضرت حسینؑ اور ان کی اولاد ہے۔ امہات المؤمنین اور ازواج مطہرات جو قرآن کی رو سے اصلاً اور حقیقتاً اہل بیت ہیں، انہیں اس ”شیعی اصطلاح“ سے ہی خارج کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں فاضل وکیل صفائی کے نزدیک بھی ”شیعی اصطلاح“ مراد ہے نہ کہ ”قرآنی اصطلاح“۔ اس موضوع پر تفصیل کے خواہش مند قارئین راقم الحروف کی کتاب، ”اہل بیت رسول کون؟“ کی طرف مراجعت کریں۔

مذکورہ شیعی اصطلاح ”محبت اہل بیت“ کی مزید وضاحت اگلے عنوان ”امام طبری اور عقیدہ موالات“ کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

امام طبری اور عقیدہ موالات

شیعہ مذہب میں ”حب اہل بیت“ کو ”تولّٰی“ اور مخالفین اہل بیت سے اظہار نفرت و بے زاری کو ”تبرّٰی“ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جو شخص بھی ”شیعیت“ میں داخل ہوا وہ ”حب علیؑ“ کے اسی دروازے سے داخل ہوا ہے۔ ایران میں ظالم، سفاک، غالی شیعہ صفوی خاندان (جس نے ۹۰۵ھ تا ۱۱۴۸ھ یعنی ۲۴۴ برس تک حکومت کی) کے سربراہ شیخ صفی الدین کے متعلق یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ وہ اپنی خانقاہ میں تصوف کی تعلیم دیتے رہے۔ ان کے عقائد میں بجز اہل بیت کی محبت کے شیعہ عقائد کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ ملاحظہ ہوا روایت مزہ معارف اسلامیہ جلد دوم ص ۲۶۔

فاضل کالم نگار مولانا اسماعیل رحمان کے مطابق محبت اہل بیت نے ہی رفتہ رفتہ شیعیت کا رنگ اختیار کیا۔ امام ذہبیؒ (م ۴۸۷ھ) اور حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) دونوں نے امام طبری (م ۳۱۰ھ) کے حالات میں ”تشیع“ کے ساتھ ”موالات“ کا بھی ذکر کیا ہے۔ (”قبہ تشیع و موالات“) امام طبری کے ”ترجمہ“ میں ”تشیع و موالات“ کے الفاظ قابل غور اور تشریح طلب ہیں۔ ”تشیع“ کے تحت پیچھے یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت علیؑ اور ان کے اہل بیت سے اہل سنت بھی محبت و عقیدت رکھتے ہیں، اگر یہ محبت حد شرعی کے اندر ہوتی تو پھر شیعہ دینی کی تفریق کا کوئی معنی نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ شیعہ دینی کے مانین یہ محبت ہی حد فاصل ہے۔ لہذا ”تشیع“ کے ساتھ ”موالات“ کا لفظ نہ بھی ہوتا تو ان کے شیعہ ہونے کے لئے پہلا لفظ ہی کافی تھا لیکن یہاں شیعہ اصطلاح کے مطابق ”موالات“ کا لفظ لاکر ائمہ جرح و تعدیل نے امام طبری کے کلمہ شیعہ ہونے پر ہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

”موالات“ کے لغوی معنی تعلق، دوستی اور عقیدت کے ہیں لیکن یہ مذہب شیعہ کی اصطلاح ہے جو ان کے فروغ دین (۱۔ نماز، ۲۔ روزہ، ۳۔ زکوٰۃ، ۴۔ خمس، ۵۔ حج، ۶۔ جہاد،

۷۔ امر بالمعروف، ۸۔ نہی عن المنکر، ۹۔ تولّٰی، ۱۰۔ تبرّٰی) میں شامل ہے۔ (ملاحظہ ہو: تحفۃ العوام حصہ اول ص ۳، ۷۔ جاگیر فدک ص ۵۰۴، مصباح العقائد ص ۹، ۸۷، اصل و اصول الشیعہ ص ۶۹، ۹۲، ادیان عالم اور فرقہ ہائے اسلام ص ۱۷۶، ۱۹۷، اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد ۱۱ ص ۸۹۹، ۹۰۳)

اہل تشیع نے اپنے عقائد کی کتابوں میں ”تولّٰی و تبرّٰی“ کو بھی ”نماز، روزہ، زکوٰۃ، خمس، حج، جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرح فروغ دین میں شامل کیا ہے جبکہ ان کے اصول دین پانچ ہیں۔ ۱۔ توحید، ۲۔ عدل، ۳۔ نبوت، ۴۔ امامت، ۵۔ قیامت۔ ”تولّٰی“ کا معنی ہے کہ ”اہل بیت سے اور ان کے دوستوں سے دوستی رکھے“ جبکہ ”تبرّٰی“ کا معنی ہے کہ ”اہل بیت کے دشمنوں سے اور ان کے دشمنوں کے دوستوں سے بیزاری رکھے“۔

چونکہ یہ اہل تشیع کی اصطلاح ہے اس اعتبار سے اس کے معنی حضرت علیؑ اور جنہیں شیعہ ”اہل بیت“ کہتے ہیں کے ساتھ شیعہ ہی کی طرح خصوصی محبت و عقیدت کے ہیں جو اہل سنت کے نزدیک غلط سمجھی جاتی ہے لفظ ”تشیع“ اس بات کا زبردست قرینہ ہے کہ یہاں امام طبری کے متعلق لفظ ”موالات“ اسی شیعہ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ”تشیع و موالات“ کے اعتراف کے بعد ”التنزیہ“ (کہ طبری کا تشیع و موالات چھوڑیں) کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟

اس شیعہ تحریک کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ایران کی فوجی قوت ختم ہو جانے کے بعد ایرانیوں اور مجوسیوں نے یہ سوچا کہ اب عربوں کی حکومت ختم کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ظاہر میں اسلام قبول کر لیا جائے لہذا انہوں نے ظاہری طور پر اسلام قبول کر کے اپنی ساری قوت اس کے خلاف صرف کر دی اور اس دین حق اور اس کے عقائد میں تحریف اور تعطیل کے ذریعے بگاڑ شروع کر دیا اور اس مقصد کے لئے انہوں نے حب علیؑ کا نعرہ لگا کر شیعہ اصطلاح کے مطابق ”اہل بیت“ کا دامن پکڑ لیا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے مختلف افکار ایجاد کئے کیونکہ ان کا مقصد ہی امت میں فساد اور اختلاف پیدا کرنا تھا۔ یہاں سے اہل بیت

خصوصاً حضرت علیؑ کی محبت میں غلو کی تحریک کھل کر سامنے آگئی جو درحقیقت غیر اسلامی نظریات پر قائم تھی اور جس میں انہوں نے بعض اسلامی افکار بھی تاویل نصوص اور جھوٹی احادیث کے ذریعے شامل کر لئے تھے تاکہ وہ اپنی اس تحریک کو آگے بڑھا سکیں۔

امام طبری کا تعلق بھی اسی سرزمین کے ساتھ ہے جہاں ”حب علیؑ“ کی تحریک کے لپٹن سے طبری کی وفات (۳۱۰ھ) کے صرف ۱۰ سال بعد ۳۲۰ھ میں آل بوہرہ جیسے ظالم اور سفاک شیعہ حکمرانوں نے جنم لیا تھا۔ ان حالات میں ”تشیع“ یا ”موالاۃ“ میں سے کوئی ایک لفظ بھی ان کی اصل حقیقت ظاہر کرنے کے لئے کافی تھا لیکن یہاں ائمہ جرح و تعدیل نے دونوں لفظ (تشیع و موالاۃ) استعمال کر کے واضح کر دیا کہ طبری کے لئے یہ لفظ شیعہ اصطلاح کے طور پر ہی آئے ہیں اور ان میں ”محبت علیؑ“ حد شرعی سے باہر اور حد افراط میں داخل ہو کر مذموم اور شرعاً مستنکر کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اس دور میں ”حب علیؑ اور نعرہ علیؑ“ کے متعلق لکھتے ہیں کہ: ”اسلامی مملکت کا طول اگر اندلس سے کابل تک تھا تو عرض قسطنطنیہ سے عدن تک پھیلا ہوا تھا۔ قاتلین عثمانؓ دس بارہ سال صبر و چین سے اور بیٹھے رہتے تو ان کو ایران و خراسان کی طرح ہندو سندھ، ترک و چین میں بھی ”علی علیؑ“ کے نعرے لگانے کو مل جاتے۔ ان بد بختوں کو یہ سوچنے کی بھی توفیق نہ ہوئی کہ عثمانؓ نے ان کے ہاتھوں سے کام چھین کر کو بنو امیہ کو مسلط کیا مگر نام تو ”محمد و آل محمد“ کا بالا ہو رہا ہے۔ عبداللہ بن عامر کریم کے طفیل ہی یہ مشہد، شیراز، نیشاپور و ہرات میں ”یا علیؑ“ کا نعرہ لگانے کے قابل ہوئے اس لئے کہ خراسان اسی نے فتح کیا تھا اور بنو امیہ کی ترک و چین، ہندو سندھ تک ماری سائی ہی نے اس علاقہ کے لوگوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کے آوازے سے محروم رکھا اور وہاں کوئی بھی نہ جان سکا کہ علیؑ کون تھے“ (تحفہ اثنا عشریہ اردو ص ۶۰۵-۶۰۶، تحت ”مطامن عثمان“ اعتراض ۴۔ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی)

امام طبری اور حدیث غدیر خم

حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام طبری پر شیعیت کے ”الزام“ کی ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ انہوں نے حدیث غدیر خم کو صحیح قرار دیا ہے (انہ صحیح حدیث غلیہ خم) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ ”بعض فقہی مسائل اور حدیث غدیر خم کے معاملے میں شیعہ مسلک سے اتفاق کی بناء پر بعض لوگوں نے انہیں خواہ مخواہ شیعہ قرار دے ڈالا“ (خلافت و ملوکیت ص ۳۱۳)

مولانا اسماعیل ریحان صاحب قد رے وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ: ”طبری کو شیعہ سمجھنے کی غالباً ایک وجہ اور ہے، ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”من كنت مولاه فعلى مولاه“ (جس کا میں دوست اس کا علیؑ بھی دوست) یہ حدیث سند کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے، اور حدیث غدیر خم کے نام سے مشہور ہے۔ شیعوں کی مخالفت میں اس دور کے ایک محدث ابو بکر بن (ابی) داؤد نے اس حدیث کے ثبوت میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ یہ دیکھ کر طبری نے اس حدیث کے ثبوت پر دلائل دیتے ہوئے ایک رسالہ ”کتاب الفہائل“ لکھا جس میں پہلے خلفائے راشدین کے مناقب بیان کیے گئے، پھر حدیث غدیر خم پر اعتراضات کا جواب دیا گیا۔ (سیر اعلام النبلاء ج ۴ ص ۲۷۴)

حافظ ذہبی فرماتے ہیں: ”میں نے حدیث غدیر خم کے بارے میں ان کا رسالہ دیکھا جو چار حصوں میں تھا، میں نے اس کا ایک حصہ دیکھا ہے، ان کی روایات کی وسعت نے مجھے حیران کر دیا۔“ (سیر اعلام النبلاء ج ۴ ص ۲۷۷) کوئی بعید نہیں کہ ماصیوں نے اس حدیث کے دفاع کے باعث انہیں شیعہ مشہور کرنا شروع کر دیا ہو“ (روزنامہ اسلام ۳۱ جولائی ۲۰۱۵ء تحت علامہ طبری۔ مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز قسطنطین ۳)

حافظ ابن حجر عسقلانی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور دیگر وکلاء صفائی کے اس ”اقرار و اعتراف“ (کہ امام طبری حدیث ”غدیر خم“ کے معاملے میں شیعہ مسلک سے متفق تھے) کے بعد موصوف کو ہرگز سنی ثابت نہیں کیا جاسکتا کیونکہ سنی اور شیعہ مسلک میں اختلاف کا بنیادی نکتہ ہی یہ حدیث ہے جو اس کا قائل ہے وہ یقیناً شیعہ ہے جب امام طبری اپنے وکلاء صفائی کے بقول حدیث ”غدیر خم“ کے قائل ثابت ہو گئے ہیں تو پھر ان کا سنی ہونا کیوں کر ممکن ہے؟ یہ ملحوظ رہے کہ اہل تشیع کے نزدیک حدیث غدیر خم کسی فقہی مسئلہ سے نہیں بلکہ عقیدے سے متعلق ہے یہ الگ بحث ہے کہ اس سے ان کا عقیدہ امامت ثابت ہوتا ہے یا نہیں اس مسئلہ کی تفصیل جاننے کے خواہشمند قارئین راقم الحروف کی کتاب ”عقیدہ امامت و خلافت راشدہ“ کی طرف مراجعت فرمائیں:

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر اہل سنت کے نزدیک بھی زیر بحث حدیث بالکل صحیح ہے تو پھر اس حدیث کو ”صحیح“ تسلیم کرنے اور اس کا دفاع کرنے کے ”جرم“ میں اکیلے امام طبری کو ہی خواہ مخواہ شیعہ کیوں قرار دے دیا گیا؟ دوسرے حضرات اس فتویٰ کی زد میں کیوں نہیں آئے؟ یہاں تو مفسرین و محدثین کی ایک پوری قطار ”تہقیر“ میں امام طبری کے ساتھ شریک ”جرم“ ہے۔

امام طبری نے اس حدیث کو صرف تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ اسے مشکوک و مشتبہ قرار دینے والوں کے موقف کو بھی دلائل کے ساتھ ٹھکرایا حتیٰ کہ اس موضوع پر ”کتاب الفصائل“ کے عنوان سے چار اجزاء پر مشتمل ایک مستقل کتاب بھی لکھ ڈالی۔

حضرت مولانا عبد الحمید خان سواتی صاحب سے ایک سائل نے دریافت کیا کہ حضرت علیؑ کو ”مولای“ کہنا کہاں تک درست ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: ”بھائی مولای کا معنی ساتھی، رفیق یا آقا ہوتا ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے ”من كنت مولاه فعلي مولاي“ یعنی جس شخص کا میں ساتھی، رفیق یا آقا ہوں حضرت علیؑ بھی اس کا رفیق، ساتھی یا آقا ہے۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں اور درست ہیں لہذا متذکرہ لفظ (یعنی مولایؑ) کہنے میں کوئی حرج نہیں“ (ماہنامہ نصرۃ العلوم ص ۱۴-۱۹۹۹ء)

اہل تشیع بھی ”مولای“ بمعنی مالک، آقا اور ناصر استعمال کرتے ہیں نیز اس حدیث سے حضرت علیؑ کی امامت و خلافت پر استدلال بھی کرتے ہیں۔

اب حدیث غدیر خم ملاحظہ فرمائیں:

”حدثنا محمد بن بشار نامحمد بن جعفرنا شعبة عن سلمة بن كهيل قال سمعت أبا الطفيل يحدث عن أبي سريحة أو زيد بن أرقم، شك شعبة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من كنت مولاه فعلي مولاه۔

هكذا حديث حسن غريب و روى شعبة لهذا الحديث عن ميمون أبي عبد الله عن زيد بن أرقم عن النبي صلى الله عليه وسلم نحوه“

(جامع ترمذی۔ ابواب المناقب باب مناقب علی بن ابی طالب)

یہ حدیث غریب حسن ہے۔ شعبہ نے یہ روایت ميمون ابو عبد اللہ کے واسطے زید بن ارقم سے روایت کی ہے۔ شعبہ کو اس میں شک واقع ہوا ہے کہ یہ روایت ابو سريحة حذیفہ بن اسید سے مروی ہے یا زید بن ارقم سے۔

دوسرا شک یہ ہے کہ شعبہ نے یہ حدیث سلمہ بن كهيل سے روایت کی ہے یا ميمون ابو عبد اللہ سے۔ اس طرح اس روایت میں اضطراب پایا جاتا ہے اور مضطرب روایت ضعیف اور ناقابل قبول ہوتی ہے اس کے علاوہ ميمون ابو عبد اللہ جس پر اس حدیث کا دار و مدار ہے وہ محدثین کے نزدیک لاشیٰ ہے۔ ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۵۱۔ یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں کہ وہ اپنی شیعیت پر پکا رہا (ثبت علی تشیعہ) ابو داؤد نے کہا: سلمہ میں تشیع پایا جاتا ہے (کان سلمہ بشیع)

اگرچہ اس حدیث کی اسانید زیادہ ہیں لیکن کوئی سند درجہ صحت کو نہیں پہنچتی۔

محدث جلیل حافظ جمال الدین زبیلی ”بسم اللہ“ ہاتھ کی بحث میں لکھتے ہیں کہ:

”نماز میں بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھنے کی روایات اگرچہ بہت ہیں لیکن وہ سب کی سب ضعیف ہیں اور بہت سی روایات ایسی ہیں کہ ان کے راوی بہت ہیں اور ان کے طرق

یعنی اسناد متعدد ہیں مگر پھر بھی وہ حدیثیں ضعیف ہیں۔

”کحلیث الطیر و حلیث الحاجم والمحمجوم و حلیث من کنت مولاه فعلی مولاه، بل قد لا یزید کثرة الطرق الا ضعفاً و انما یرجح بکثرة الرواة اذا کانت الرواة محتجا بهم من الطرفين۔“

جیسے حدیث طیر، حدیث الحاجم والمحمجوم اور حدیث من کنت مولاه... بلکہ ان کے جس قدر طرق بڑھتے جائیں گے ان کا ضعف مزید بڑھتا جائے گا۔ کثرة رواة سے وہاں ترجیح ہوتی ہے جہاں راوی دونوں طرف سے احتجاج کے لائق ٹھہریں۔ (نصب الراية جلد اول ص ۴۳۷۔ طبع جدید ص ۳۶۰ طبع قدیم۔)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

”و اما من کنت مولاه فعلی مولاه۔ فلا یصح من طرق الثقات أصلاً“

(منهاج السنة المجلد الثاني الجزء الرابع ۸۶)

حدیث ”من کنت مولاه... ثقہ راویوں کے طرق سے بالکل ثابت نہیں۔

دیگر اکابر محدثین امام بخاری، ابن ابی حاتم رازی، امیر ایم الحرمی، ابن ابی داؤد اور ابن حزم ظاہری وغیرہ کو زیر بحث حدیث کی صحت میں کلام ہے۔

صد افسوس کہ روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار نے ان جملہ محدثین و علماء کو جنہوں نے اس حدیث پر نقد کیا تھا، ”ناموسی“ قرار دے دیا۔ سبائیوں کی اس سے زیادہ اور کیا خدمت ہو سکتی ہے؟

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نو اصحاب کا شرعی حکم لکھتے ہیں کہ:

”اہل سنت، فرقہ شیعہ خاص جناب امیر کا ہے کہ بہ دل و جان فدا خاندان نبوت کے ہیں اور ہمیشہ نو اصحاب شام و مغرب اور عراق کے ساتھ لڑائیاں تیغ و سنان کی لڑتے رہے اور مناظرہ علمی و زبانی کرتے رہے اور مدد شعائر شریعت اور کھونے بدعات مروانیہ میں سامی و سرگرم ہوئے اور نو اصحاب کو بدترین کلمہ کو یوں بلکہ ہم سرسگ و خوک (کتے اور خنزیر) کا

جانتے رہے“ (ہد یہ مجید یہ اردو ترجمہ ثنائی عشریہ ص ۱۰)

روزنامہ اسلام کے کالم نگار کا یہ لکھنا بھی صحیح نہیں کہ ”یہ حدیث سند کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے“۔

حدیث کی ”سند“ پر تو بحث اوپر ہو چکی ہے سوال یہ ہے کہ اگر کسی حدیث کی سند بالکل صحیح ہو تو کیا صرف اس کی بنیاد پر اس کا ”متن“ بھی قبول کیا جاسکتا ہے؟

ذخیرہ احادیث میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ حدیث ”سنداً“ بالکل صحیح ہے مگر متن کے اعتبار سے علمائے حدیث نے اس کو ”معلول“ بلکہ موضوع تک قرار دیا ہے، ایسی صحیح الاسناد احادیث صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، ابوداؤد، سنن نسائی و ابن ماجہ اور دیگر کتب حدیث میں پائی جاتی ہیں جو ”متن“ معلول، مدخول، شاذ، موضوع یا محل اشکال ہیں جبکہ زیر بحث حدیث غریب، ضعیف، مضطرب ہونے کے علاوہ شیعہ راوی سے مروی ہے اور متن بھی ”معلول“ ہے۔ اس میں سب سے بڑی ”علت“ تو یہی ہے کہ خود کلائے صفائی کے نزدیک اسے صحیح تسلیم کرنے کی بناء پر ہی امام طبری کو رافضی اور شیعہ قرار دیا گیا ہے۔ دوسری ”علت“ یہ ہے کہ اہل تشیع حضرت علیؑ کی امامت اور خلافت بلا فصل پر اسی سے استدلال کرتے ہیں۔ تیسری ”علت“ یہ ہے کہ بعض ”صوفیوں“ نے اس سے ”مولا علیؑ“ کہنے کو درست قرار دیا ہے جس سے شیعیت میں داخلے کا دروازہ کھلتا ہے۔ چوتھی ”علت“ یہ ہے کہ یہ ”صوفی“ بھی حضرت علیؑ کے لئے لفظ ”مولیٰ“، بمعنی ”آقا“ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ تصور بھی اہل تشیع کا ہے۔

حضرت علیؑ کے لئے لفظ ”مولیٰ“، بمعنی آقا اور مالک استعمال کرنا واضح شرک ہے۔ ہر مسلمان بخوبی جانتا ہے کہ کائنات یعنی عالم کا حاکم اور آقا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اور اگر ”مولیٰ“ کا لقب بمعنی ماصر استعمال کیا جائے تو بھی اس کا شرک اور ضلال ہونا واضح ہے۔

امام طبری حدیث ”غدیر خم“ کے دفاع میں انتہائی غالی تھے جنہوں نے اس موضوع پر چار اجزاء پر مشتمل ایک مستقل کتاب تصنیف کر کے شیعیت کا مقدمہ مضبوط کر دیا۔ تعجب

بالائے تعجب یہ کہ روزنامہ اسلام کے ”فاضل“ کالم نگار نے امام طبری کو اس شیعہ عقیدے سے وابستگی کی بناء پر شیعیت کی طرف منسوب کرنے والوں اور حدیث ”غدیر خم“ کے مانتہ محدثین کو ہی ”ناصبی“ قرار دے ڈالا۔ فیہ اسفا

پانچویں ”علمت“ یہ ہے کہ بقول شیعہ جس امر کی تبلیغ کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکیدِ حکم دیا گیا تھا اور بار بار تنبیہ بھی کی گئی تھی تو آپ نے افصح العرب ہوتے ہوئے صریح اور واضح ترافاظ میں امامت کا اعلان کیوں نہیں فرمایا؟ اور اس کے لئے ایک مبہم اور کئی معانی میں مشترک لفظ کیوں استعمال فرمایا؟

چھٹی ”علمت“ یہ ہے کہ زیر بحث حدیث کا ”نفس مسئلہ“ سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا کیونکہ یمن کے صرف چند افراد کی طرف سے یہ اعتراض سامنے آیا تھا کہ حضرت علیؑ نے خمس کے مال میں سے اپنے لئے ایک (لوٹری) جاری کیوں مخصوص کی؟ اس کے جواب میں آپ نے اس وفد کو مطمئن کر دیا تھا کہ یہ ان کے لئے جائز و حلال ہے۔ لہذا تمام شرکائے حجۃ الوداع کے سامنے اس حوالے سے ”غدیر خم“ کے مقام پر خطبہ ارشاد فرمانے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ”من کنت مولاء فعلی“ مولاء جس میں حضرت علیؑ پر اہل یمن کے اعتراض کا جواب ہے۔ اس حدیث میں (بشرط صحت روایت) یہ بتایا جا رہا ہے کہ میں جس کا دوست ہوں علیؑ بھی اس کے دوست ہیں۔ اس کا صاف مطلب تو یہ ہے کہ میں تمام صحابہؓ کا دوست ہوں علیؑ بھی ان کے دوست ہیں۔

رفض طبری بہ شہادت خوارزمی

ابو بکر محمد بن عباس خوارزمی (م ۳۸۲ھ) امام طبری کے رشتے میں بھانجے تھے۔ یہ اپنے وقت کے بلند پایہ ادیب، رافضی اور بھوکو شاعر تھے۔ یاقوت بن عبد اللہ حموی (م ۶۲۶ھ) نے طبرستان کے شہر ”آمل“ کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ ”تخرج منها کثیر من العلماء يقال فی نسبتهم: الطبري“ اس شہر سے کثیر تعداد میں علماء پیدا ہوئے ان کی نسبت میں ”الطبري“ کہا جاتا ہے۔ (معجم البلدان جلد ۱ ص ۵۷)

خوارزمی نے اپنے ماموں طبری کا مسلک درج ذیل دو شعروں میں بیان کیا ہے کہ:
بأمل مَوْلَدِي وَبَنُو جَرِيرٍ فَاخْوَالِي وَبِحُكِّي الْمَرْءِ خَالِهِ
فَهَا أَنَا رَافِضِيٌّ عَنْ تَرَاثٍ وَغَيْرِي رَافِضِيٌّ عَنْ كِلَالِهِ
(الکلی والالقاب جلد اول ص ۲۲ مطبوعہ تہران۔ بحوالہ میزان الکتاب ص ۳۰۵ مؤلفہ شیخ الحدیث مولانا محمد علی صاحب لاہور)

آمل شہر میرا مولد (جائے پیدائش) ہے اور جریر کے بیٹے میرے ماموں ہیں اور آدمی اپنے ماموں کے نقش قدم پر ہوتا ہے، تو سن رکھ میں جدی پشتی رافضی ہوں۔ اور میرے علاوہ شیعہ کہلانے والا کالالہ یعنی دور کے تعلق سے رافضی ہے۔

ان اشعار میں گھر کے ایک فرد نے امام طبری (م ۳۱۰ھ) کا اصل مسلک واضح کر دیا ہے اس سے بڑھ کر اور کس کی شہادت معتبر ہو سکتی ہے؟ یاقوت حموی (م ۶۲۶ھ) نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ خوارزمی جھوٹا شخص تھا طبری ہرگز رافضی نہ تھے لیکن رشتہ اور قرب زمانہ کی وجہ سے یاقوت حموی (جن کی وفات طبری کی وفات کے ۳۱۶ سال بعد واقع ہوئی) کی بہ نسبت خوارزمی کی شہادت زیادہ معتبر ہے کیونکہ وہ اپنے ماموں کے عقیدہ و مذہب سے زیادہ واقف ہے۔

رفض طبری بہ شہادت سلیمانی

امام ذہبی (م ۴۸۰ھ) امام طبری (م ۳۱۰ھ) کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ:

”ثقة صادق فيه تشييع و موالاته لا تضره - أفذع احمد بن علي السليماني الحافظ فقال: كان يضع للروافض، كذا قال السليماني: وهذا رجم بالظن الكاذب بل ابن جرير من كبار ائمة الاسلام المعتمدين... ففعل السليماني أراد الاتي“ (ميزان الاعتدال في نقد الرجال الجزء الثالث ص ۴۹۹ - تحت رقم ۷۳۰۶)

ابن جریر، ثقہ اور صادق شخص ہیں مگر ان میں کچھ شیعیت اور موالات ہے جو مضرت نہیں ہے۔ حافظ احمد بن علی سلیمانی نے کہا کہ: طبری روافض کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔ یہ جھوٹی بدگمانی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر اسلام کے معتد اماموں میں سے ایک بڑے امام ہیں۔ شاید حافظ سلیمانی کی مراد دوسرے طبری (محمد بن جریر بن رستم) ہوں جن کا ذکر اس کے بعد آ رہا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی، حافظ ذہبی کے قول پر یہ اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”ولو حلفت أن السليماني ما أراد ألا الاتي (محمد بن جرير بن رستم) لبررت والسليماني حافظ متقن كان يلوي ما يخرج من رأسه فلا اعتقد أنه يقطع في مثل هذا الامام بهذا الباطل والله أعلم“ (لسان الميزان في اسماء الرجال الجزء الخامس ص ۱۰۰)

اگر میں حلف/قسم اٹھاؤں کہ سلیمانی نے اس (محمد بن جریر بن یزید) مفسر و مؤرخ طبری کے بارے میں ”کان يضع للروافض“ نہیں کہا بلکہ دوسرے طبری (محمد بن جریر بن رستم) کے بارے میں کہا ہے تو میری قسم غلط نہ ہوگی۔ کیونکہ حافظ سلیمانی ”حافظ و متقی تھے وہ

جانتے تھے کہ ان کے دماغ سے کیا بات نکل رہی ہے پس میں اس پر اعتقاد نہیں رکھ سکتا کہ انہوں نے ایسے عظیم امام پر ایسا باطل حملہ کیا ہوگا۔ واللہ اعلم

امام ذہبی (م ۴۸۰ھ) ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) امام طبری پر ”رفض“ کے الزام کے دفاع میں قوی تو کیا کوئی ضعیف دلیل بھی پیش نہیں کر سکے بلکہ مسلکی تعصب کا شکار ہو گئے۔ یہ دونوں حضرات بھی شافعی المسلک ہیں اور امام طبری بھی پہلے شافعی رہے ہیں اور اسی فقہ کے مطابق ایک طویل عرصے تک بغداد میں ”فتویٰ“ بھی دیتے رہے۔ بلکہ علامہ تاج الدین سبکی (م ۷۶۱ھ) نے انہیں شافعی علماء میں محسوب کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: طبقات الشافعیۃ الکبریٰ جلد ۳ ص ۱۲۵۔

روزنامہ اسلام کے کالم نگار مولانا اسماعیل ربیعان نے بھی امام طبری کو اصولاً شافعی ہی قرار دیا ہے: ”رہا فروعی مسائل میں اختلاف تو وہ اصولاً شافعی اور اپنے علم کی وسعت کی بناء پر مجتہد تھے اس لے امام احمد کی پیروی ان پر لازم نہیں تھی“ (”روزنامہ اسلام ۲۹ جولائی ۲۰۱۵ء تحت علامہ طبری۔ مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز“)

مولانا سید احمد رضا بجنوری صاحب امام ذہبی کے تعصب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ”یہاں ہم نے حافظ ذہبی کا ذکر اس لئے کر دیا ہے کہ حافظ ابن تیمیہ سے متعلق ان کے فروعی و اصولی اختلافات اور آخری تاثرات علم میں آ جائیں ورنہ ”جہت واستواء علی العرش“ کے بارے میں وہ بھی بڑی حد تک ان کے ہم نوا تھے اور جن حضرات اہل علم نے اس بارے میں ان کی نقول پر اعتماد کیا ہے وہ مغالطہ کا شکار ہو گئے ہیں۔۔۔

علامہ ذہبی کا فضل و تبحر اور گراں قدر علمی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں مگر وہ باوجود فروع میں شافعی المذہب ہونے کے بعض اشعری عقائد سے برگشتہ ہو گئے اس لئے انہوں نے اپنی کتابوں میں اشعری خیال کے شافعیہ و حنفیہ سے تعصب برتا ہے۔ اس سلسلہ میں علامہ کوثری کی تصریحات السیف الصغیر کے تکرار ص ۷۶ سے نقل کی جاتی ہیں:

حافظ ذہبی باوجود اپنے وسعت علم حدیث و رجال اور دعوائے انصاف و بعد عن

امام طبری --- کون؟

رفض طبری پشہادت سلیمانی

التعصب کے اپنے رشد و صواب کے راستے سے الگ ہو جاتے ہیں، جب وہ احادیث صفات یا فضائل نبوی و اہل بیت میں کلام کرتے ہیں یا جب وہ کسی اشعری شافعی یا حنفی کا ترجمہ لکھتے ہیں اسے لئے وہ ایسی احادیث کی تصحیح کر دیتے ہیں جن کا بطلان اظہر من الشمس ہوتا ہے۔“ (انوار الباری اردو شرح صحیح بخاری جلد ۱۳ ص ۱۸۲-۱۸۳)

انوار الباری میں امام ذہبیؒ و ابن حجر عسقلانی کے تسامحات کی مختلف مقامات پر نشاندہی کی گئی ہے محولہ بالا عبارت سے پہلے حافظ ابن حجر عسقلانی کے تعصب سے متعلق سید احمد رضا بجنوری لکھتے ہیں کہ:

”حافظ ابن حجر کا فضل و تبحر اور علمی گراں قدر خدمات ناقابل انکار ہیں لیکن حنفی شافعی کا تعصب ہمیں کیا خود ان کے شافعی المذہب انصاف پسند حضرات کو بھی ناپسند رہا ہے اور جیسا کہ ہم نے مقدمہ انوار الباری جلد دوم ص ۱۳۶ میں لکھا ہے کہ ان کے تلمیذ رشید علامہ محقق حافظ سخاوی اور علامہ محبت بن شحہ نے بھی ان کے اس نظریہ اور رویہ پر سخت تنقید کی ہے (حوالہ مذکور ص ۱۸۳)

علامہ محمد انور شاہ کا شمیری فرماتے ہیں کہ:

حافظ (ابن حجر) نے دونوں واقعات کو ایک ہی سال میں قرار دے دیا ہے جو قطعاً غلط ہے اور تعجب ہے کہ حافظ ایسے متیقظ سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہو گئی؟ یہ غلطی ان کو بعض روایہ کی تعبیر کے سبب ہوئی ہے کہ انہوں نے قصہ سقوط (سقوط عن فرسہ) وقصہ ایلاء کو ایک ساتھ ذکر کر دیا۔ روایہ کی تعبیری غلطی کی طرف حافظ زیلعی نے بھی متنبہ کیا ہے۔

سید احمد رضا بجنوری حضرت شاہ صاحب کی گرفت کی مدلل تائید کر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

”ان سب میں ایلاء کا بھی ذکر شامل کر دیا گیا ہے اور یہ شامل کرنے کی وجہ راوی کے ذہن میں صرف یہ اشتراک ہے کہ واقعہ سقوط ۵ھ اور واقعہ ایلاء ۹ھ دونوں میں حضور علیہ السلام نے بالا خانہ میں قیام فرمایا تھا، اس امر کا خیال نہیں کیا کہ دونوں الگ الگ واقعات ہیں جن میں کئی سال کا فاصلہ ہے لیکن حافظ ایسے محقق، مدقق سے یا مر بہت ہی مستبعد ہے کہ انہوں نے

امام طبری --- کون؟

رفض طبری پشہادت سلیمانی

صرف ایک راوی کی اس تعبیر مذکور کے باعث یہ فیصلہ کر دیا کہ ایلاء کے دوران ہی میں سقوط کا واقعہ بھی پیش آیا ہے اور اسی پر حضرت شاہ صاحب نے بھی تعجب و حیرت کا اظہار فرمایا ہے“ (انوار الباری جلد ۱۱ ص ۱۸۸-۱۸۹)

حضرت علامہ محمد انور شاہ کا شمیریؒ اور سید احمد رضا بجنوریؒ نے نہ صرف امام ذہبیؒ اور ابن حجر عسقلانیؒ کے علمی تسامحات پر گرفت کی بلکہ انہیں متعصب اور بعض اشعری عقائد سے برگشتہ بھی قرار دیا۔

امام ذہبیؒ اور ابن حجر عسقلانیؒ دونوں امام طبری کو ”سنی“ ثابت کرنے کی کوشش کے باوجود بلا آخر خود انہیں شیعہ تسلیم کر گئے کہ ”فیہ تشیع و موالاتہ“ ظاہر ہے کہ یہ الفاظ سنی طبری (محمد بن جریر بن یزید) کے لئے ہی استعمال کئے گئے ہیں کیونکہ محمد بن جریر بن رستم (اگر فی الواقع اس کا کوئی وجود تھا) تو بالاتفاق شیعہ و سنی رافضی تھا۔ اسے تو کسی نے کبھی ”سنی“ قرار ہی نہیں دیا۔ اس پر بحث پیچھے زیر عنوان طبری دو ہیں گزر چکی ہے لہذا شبہی و رافضی طبری کے بارے میں کسی کو مغالطہ لگ ہی نہیں سکتا کہ یہ سنی ہے۔ مغالطہ تو صرف تفتیہ کی بناء پر سنی طبری (محمد بن جریر بن یزید) کے بارے میں ہی لگ سکتا ہے، جن کے بارے میں بعض شبہی افکار و مسائل میں اتفاق و موافقت کی وجہ سے ظاہری طور پر بھی گراں قدر ریمارکس دیئے گئے ہیں ”فیہ تشیع و موالاتہ، کان یضع للروافض، هو إمام من أئمة الإمامیة“۔

مبہی وجہ ہے کہ امام ذہبیؒ اور ابن حجرؒ نے سنی طبری کے بارے میں تفتیہ کے باوجود بعض نظریات و مسائل میں شیعہ کے ساتھ ہم آہنگی و موافقت کی بناء پر امام طبری کو شیعہ تسلیم کر لیا کہ ان میں ”شیعیت و موالاتہ“ ہے لیکن معترض نہیں ہے۔ جہاں تک ”لا تھرز“ کا تعلق ہے تو اس پر بحث پیچھے گزر چکی ہے البتہ انہوں نے ان کے ”رافضی“ ہونے کا انکار کیا ہے۔

سخت حیرت ہے کہ جب آٹھویں صدی ہجری اور نویں صدی ہجری والے امام ذہبیؒ و ابن حجر کو محمد بن جریر بن یزید کے بارے میں کوئی مغالطہ نہیں لگ سکا اور یہ اقرار کر گئے کہ ”فیہ تشیع و موالاتہ“ تو حافظ سلیمانی (جو امام طبری کی وفات کے ۱۱ سال بعد ۳۳۱ھ میں پیدا

ہوئے اور ۱۰۳ سال بعد ۴۱۳ھ میں فوت ہوئے تھے) کو کیوں کر مغالطہ لگ سکتا ہے؟
امام طبری کے ”شیعہ“ ہونے میں تو کسی انکار کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ ان کے وکلاء صفائی امام ذہبیؒ و ابن حجر عسقلانیؒ خود ”لائضر“ کی قید کے ساتھ ان میں شیعیت و موالات تسلیم کر چکے ہیں۔ بحث تو موصوف کے ”رافضی“ ہونے میں ہے جس کی تردید میں سوائے اس کے وہ کوئی دلیل پیش نہیں کر سکے کہ: ”هَذَا رَجْمٌ بِالْظَنِّ الْكَاذِبِ، وَلَوْ حَلَفْتُ أَنِ الْمُسْلِمَانِي أَرَادَ إِلَّا الْآتِي لِبُرْهَانٍ“ یہ جھوٹی بدگمانی ہے اور اگر میں قسم اٹھاؤں کہ ”کان يضع للروافض“ سے سلیمانی کی مراد شیعہ طبری ہے تو میری قسم غلط نہ ہوگی۔
علمی دنیا میں ان ”دلائل“ کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے؟ حضرات ابن حجر عسقلانی نے صرف اپنے تبحر علمی کے زور پر اپنی بات منوانے کی ”کوشش“ کی۔ شکر ہے کہ انہوں نے ”حَلَفْتُ“ کے ساتھ ”لَوْ“ حرف شرطیہ لگا کر آخر میں ”وَاللّٰهُ اَعْلَمُ“ لکھ دیا۔ اگر وہ ”لَوْ حَلَفْتُ“ نہ لکھتے تو ”لِبُرْهَانٍ“ کا ”ناکا“ اس جملہ کے ساتھ بالکل صحیح نہ لگتا اور سیدھے سیدھے ”حانث“ قرار دے دیئے جاتے۔ یہاں علامہ سلیمانی صرف ”سنی طبری“ کے حوالے سے گفتگو کر رہے ہیں ان کے دور میں معلوم نہیں کہ ”شیعہ طبری“ کی تخلیق بھی ہوئی تھی یا نہیں۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کسی سنی یا شیعہ عالم نے محمد بن جریر بن رستم یعنی شیعہ طبری کی تصانیف میں تفسیر ”جامع البیان فی تائیل القرآن یا تاریخ الامم والملوک“ کا ذکر ہی نہیں کیا۔ میزان الاعتدال اور لسان المیزان دونوں میں شیعہ طبری کے حالات میں صرف ایک کتاب ”الرواہ عن اهل بیت“ کا ذکر ملتا ہے جبکہ امام ذہبیؒ نے اپنی ایک دوسری کتاب میں ”الرواہ عن اهل بیت“ کے علاوہ ”المستدرشد فی الامامة“ کا بھی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: سیر اعلام النبلاء جلد ۱۴ ص ۲۸۲ اس طرح شیعہ طبری کی صرف دو کتابیں ”منظر عام“ پر آئی ہیں جن کا اہل سنت کے نظریات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ امام ذہبیؒ نے میزان الاعتدال میں سنی طبری کے حالات ۹ سطروں میں اور ”سیر اعلام النبلاء“ میں ۱۶ صفحات میں بیان کئے ہیں جبکہ شیعہ طبری کے حالات کے

لئے دونوں کتابوں میں صرف دو سطریں وقف کی ہیں۔ ملاحظہ ہو: میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۴۹۹، سیر اعلام النبلاء جلد ۱۴ ص ۲۶۷-۲۸۲۔
علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے سنی طبری کے لئے ۳ صفحات جبکہ شیعہ طبری کے لئے صرف ۱۰ سطریں مختص کی ہیں۔ ملاحظہ ہو: ”لسان المیزان“ جلد ۵ ص ۱۰۰-۱۰۳ تحت نمبر ۳۴۴-۳۴۵۔
بہر حال امام ذہبیؒ اور علامہ ابن حجرؒ کی علامہ سلیمانی کے بارے میں یہ رائے صحیح نہیں ہے کہ انہوں نے امام طبری کے ساتھ جھوٹی بدگمانی کا اظہار کیا ہے یا انہوں نے یہ بات (کان يضع للروافض) شیعہ طبری کے بارے میں کہی ہے۔ اس کا صاف مطلب تو یہ ہے کہ ان کے نزدیک اگر یہ بات شیعہ طبری سے متعلق ہے تو بالکل صحیح ہے اور اگر اس سے مراد ان کا مدوح سنی طبری ہے تو پھر یہ جھوٹی بدگمانی ہے۔ کوپا آٹھویں اور نویں صدی ہجری تک اس بات کا فیصلہ ہی نہیں ہو سکا کہ علامہ سلیمانی نے کس طبری کے متعلق یہ بات (کان يضع للروافض) کہی تھی؟

آئیے علامہ سلیمانی کے قول سے ہی ان کی اصل مراد اور ”مشارالیه“ کا تعین کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ پیچھے زیر عنوان ”کیا طبری دو ہیں؟“ میں بالتفصیل یہ بتایا جا چکا ہے کہ اول تو علامہ سلیمانی (م ۴۱۳ھ) کی زندگی میں شیعہ طبری کی ”تخلیق“ ہی نہیں ہوئی تھی اور اگر فی الواقع اس وقت ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم نامی کوئی شیعہ طبری موجود تھا بھی تو اسے سنی و شیعہ علماء بالاتفاق ”شیعہ“ ہی سمجھتے تھے اور وہ خود بھی واضح طور پر اپنے شیعہ ہونے کا ہی اقرار کرتا تھا۔ امام ذہبیؒ اور ابن حجرؒ بھی اسے شیعہ و رافضی ہی تسلیم کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس نے رافضی مذہب کی تائید میں رافضی روایات پر مشتمل دو کتابیں ”الرواہ عن اهل البيت“ اور ”المستدرشد فی الامامة“ بھی تصنیف کر رکھی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس شیعہ و رافضی طبری نے روافض کے لئے اپنے مذہب کے مطابق ہی روایات گھڑنی تھیں۔ اس صورت میں ”کان يضع للروافض“ کا قول شیعہ طبری پر کیوں کر صادق آ سکتا ہے؟

لہذا علامہ سلیمانی کے قول سے شیعہ طبری ہرگز مراؤ نہیں لیا جاسکتا۔ اس قول کا اطلاق صرف سنی طبری (ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید) پر ہی ہو سکتا ہے جو اپنے سنی ہونے کا اقرار کرتا ہو (خواہ از روئے تقيہ ہی ہو) اور شیعہ سنی بھی اسے ”سنی“ ہی سمجھتے ہوں تو صرف اسی صورت میں ہی یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ سنی ہو کر بھی یہ شیعہ و رد افض کے لئے روایتیں گھڑتا ہے اور ان کے مذہب کو تقویت پہنچاتا ہے۔ امام طبری کی تفسیر و تاریخ میں اس قسم کی روایات بکثرت پائی جاتی ہیں۔ جس عالم دین نے بھی شیعہ مذہب سے موافقت کی روایات طبری کی تفسیر اور تاریخ میں پچشم خود ملاحظہ کی ہوں تو وہ کبھی بھی بقائمی ہوش و حواس ان کے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔

علامہ سلیمانی (م ۴۱۳ھ) اپنے وقت کے بہترین حافظ، متقی اور محدث تھے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اصول حدیث کی اصطلاح میں ”حافظ“ وہ شخص کہلاتا ہے جسے ایک لاکھ احادیث یاد ہوں۔ امام سمعانی ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ ”لم یکن له نظیر فی زمانہ اسناداً و حفظاً و درایتاً بالحدیث و ضبطاً و ايقاناً“ یہ اپنے وقت میں ہر لحاظ اور ہر حیثیت سے بے نظیر محدث تھے، علامہ ابن حجر عسقلانی نے بھی علامہ سلیمانی کی یہ علمی حیثیت تسلیم کی ہے لہذا انہوں نے علی وجہ البصیرت سنی امام طبری (محمد بن جریر بن یزید) کے بارے میں ”کان یضع للروافض“ لکھ کر جو رائے قائم کی تھی وہ بالکل مبنی بر حقیقت ہے۔ ان سے یہ بعید ہے کہ وہ کسی عام مسلمان کے بارے میں بھی بلا ثبوت و تحقیق اس قسم کی کوئی رائے قائم کریں۔ جہاں تک امام ذہبیؒ اور علامہ عسقلانیؒ کے علامہ سلیمانی کے بارے میں ”رجم بالظن الکاذب“ کے قول کا تعلق ہے تو وہ قول علامہ سلیمانی کے بجائے خود ان پر ہی لوٹ آئے گا۔

رفض طبری بہ شہادت امام ابو حیانؒ (م ۴۵۷ھ)

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ (۸۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ: ”وقد اغتر شیخ شیوخنا أبو حیان بکلام السليمانی فقال فی الکلام علی الصراط فی اوائل تفسیره وقال أبو جعفر الطبری وهو امام من ائمة الامامية...“ (لسان المیزان فی اسماء الرجال جلد ۵۔ ص ۱۰۰) ہمارے شیخ الشیوخ ابو حیان کو بھی علامہ سلیمانی کے قول نے دھوکہ دیا کہ انہوں نے اپنی تفسیر کے اوائل میں لفظ صراط پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ابو جعفر طبری فرقہ امامیہ کے اماموں میں سے ایک امام ہیں۔

مولانا مودودی صاحب نے بھی ابو حیان کا نام لئے بغیر یہ لکھ دیا کہ: ”بعض فقہی مسائل اور حدیث غدیر خم کے معاملہ میں شیعہ مسلک سے اتفاق کی بناء پر بعض لوگوں نے خواہ مخواہ انہیں شیعہ قرار دے ڈالا اور ایک بزرگ نے تو ان کو امام من ائمة الامامية“ تک قرار دے دیا“ خلافت و لوکیت ص ۳۱۳ علامہ ابن حجر عسقلانی نے اپنے شیخ الشیوخ ابو حیان پر بھی ”رجماً بالغیب“ یہ الزام لگا دیا کہ انہوں نے علامہ سلیمانی کے قول سے دھوکہ کھا کر امام طبری کو ”امام من ائمة الامامية“ قرار دے دیا حالانکہ ابو حیان کے قول میں ”دھوکہ“ کھانے کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے مگر علامہ عسقلانی نے امام طبری کے دفاع میں ایک اور کمزور دلیل پیش کر دی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تفسیر حدیث تراجم و لغات کے مسلمہ امام ابو حیان اندلسی (م ۴۵۷ھ) نہ تو علامہ سلیمانی (م ۴۱۳ھ) کے قول کی بناء پر کسی مغالطے کا شکار ہوئے اور نہ ہی وہ حنابلہ کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بلکہ امام طبری کی تفسیر و تاریخ کا پتھر عمیق مطالعہ اور پوری تحقیق کے بعد علی وجہ البصیرت انہیں ”امام من ائمة الامامية“ قرار دیا ہے۔ پروفیسر غلام احمد حریری، صاحب تفسیر ”البحر المحیط“ ابو حیان کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”اسم گرامی محمد بن یوسف بن علی کنیت ابو عبد اللہ لقب اشیر الدین اور نسبت اندلسی غرناطی ہے۔ آپ ابو حنیان کے نام سے معروف تھے ۶۵۴ھ میں پیدا ہوئے (اور ۴۵۷ھ میں فوت ہوئے) آپ علم القراءات میں مہارت رکھتے تھے اور قرأت صحیحہ و شاذہ سے بخوبی آشنا تھے۔ اندلس اور افریقہ کے اکثر علماء سے استفادہ کیا۔ ابو حنیان کا قول ہے کہ میں نے چار سو پچاس اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ جن لوگوں نے مجھے اجازت دی ان کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ صفدی کا بیان ہے کہ میں نے ہمیشہ ابو حنیان کو لکھتے پڑھتے یا روایت سنتے دیکھا اس کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔

ابو حنیان ایک عظیم شاعر اور لغوی تھے۔ جہاں تک صرف دُعا کا تعلق ہے ان میں آپ یگانہ روزگار امام تھے۔ عمر بھر ان دونوں علوم کی خدمت کرتے رہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ ان کے عصر و عہد میں صرف دُعا نحو میں ان کے سوا کسی اور کا ذکر تک نہیں کیا جاتا تھا۔ مزید برآں آپ کو تفسیر وحد بیٹ، تراجم رجال اور معرفت طبقات میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی۔ ابو حنیان کے تلامذہ میں بڑے بڑے عالم و مشائخ شامل ہیں۔ ابو حنیان کی تصانیف (تفسیر المحرر المحیط، غریب القرآن، شرح التبیان، نہایت الاعراب، خلاصۃ البیان) ان کی زندگی ہی میں ادھر ادھر پھیل گئیں۔ (تاریخ تفسیر و تفسیرین ص ۹۷-۲۸۰)

علامہ ابن حجر عسقلانی نے علامہ سلیمانی کے قول (کان یضع للرواقض) کے بارے میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ سلیمانی ایسا حافظ و متقن و محدث سنی طبری کے بارے میں یہ ریمارکس نہیں دے سکتا لا محالہ انہوں نے شیعہ طبری کے بارے میں ایسا کچھ کہا ہوگا اور اگر میں اس پر حلف بھی اٹھاؤں تو غلط نہیں ہوگا۔ مگر اپنے شیخ الشیوخ علامہ ابو حنیان کے قول ”هو امام من ائمة الامامية“ کے بارے میں ”نہ“ کے ساتھ حلف اٹھا کر یا بغیر حلف کے بھی یہ نہیں فرما سکے کہ اس سے ابو حنیان کی مراد شیعہ طبری ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ جب لوگوں نے ضرورتاً شیعہ طبری (محمد بن جریر بن رستم) کی تخلیق کی تھی انہوں نے بھی اس طبری کو ”امام من ائمة الامامية“ کا مقام و درجہ عطا نہیں کیا تھا۔ اس ”اعزاز“ کے مستحق سنی طبری ہی ہو سکتے ہیں جنہوں نے اپنی تفسیر و تاریخ میں ہر باطل فرقہ بالخصوص اہل تشیع کو اپنے مذہب کی تدوین کے لئے اچھا خاصا مواد فراہم کر دیا ہے۔ قبل ان کہ قلیفر حوالہ بطور نمونہ اس کی چند مثالیں مندرجہ ذیل میں کی جا رہی ہیں۔

امام طبری اور آیت وضوء

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ (سورة المائدة - آیت ۶)
اے ایمان والو! جب تم اٹھو نماز ادا کرنے کے لئے تو (پہلے) دھو لو اپنے چہرے اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک اور مسح کرو اپنے سروں پر اور دھو لو اپنے پاؤں ٹخنوں تک۔

پیر محمد کرم شاہ زہری ”وَأَرْجُلَكُمْ“ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

اس کا عطف ”أَيْدِيَكُمْ“ پر ہے اور اس کا معنی ہے کہ اپنے پاؤں کو بھی دھوؤ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو پاؤں اچھی طرح دھونے کا حکم فرمایا کرتے۔ حضور نے ایک قوم کو دیکھا کہ ان کی ایڑیاں خشک ہیں تو حضور نے بلند آواز سے فرمایا: ”تَوَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ، أَسْبِغُوا الْوُضُوءَ“ خشک رہ جانے والی ایڑیوں کو آگ جلانے گی۔ وضوء عمدہ طریقے سے کیا کرو تا کہ کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے۔ سید شریف رضی نے امیر المومنین سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وضوء کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے بھی پاؤں کا دھونا ثابت ہے (نسخ البلاغ) اس کے بعد جھگڑے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ (ضیاء القرآن جلد اول ص ۴۴۵)

شیعہ مفسر سید امداد حسین صاحب کاظمی لکھتے ہیں کہ:

امام محمد باقر سے منقول ہے کہ آپ سے آنحضرت کا وضوء کرنا پوچھا گیا۔ آپ نے پانی سے بھرا ہوا ایک طشت یا بڑا پیالہ منگایا۔ پھر اپنا داہنا ہاتھ ڈال کر اس میں سے ایک چلو پانی لیا اس کو اپنے چہرہ پر ڈال کر اپنا منہ دھویا۔ پھر بائیں ہاتھ ڈال کر ایک چلو پانی لیا اور اس کو دہنی کہنی پر ڈالا اور کہنی سے انگلیوں تک ہاتھ کو دھویا مگر اس طرح کہ بائیں ہاتھ اوپر سے نیچے کی طرف کھینچتے ہوئے لائے۔ نیچے سے اوپر کو نہیں لے گئے۔ پھر داہنا ہاتھ طشت میں

ڈال کر ایک چلو پانی لیا اور اس کو بائیں کہنی پر ڈالا اور اس کہنی کو انگلیوں کے سرے تک اسی طرح دھو ڈالا جس طرح داہنا ہاتھ دھویا تھا۔ پھر اپنے ہاتھوں کی تری سے سر اور دونوں پاؤں کا مسح کیا اور مسح کے لئے نیا پانی نہیں لیا۔ (القرآن المبین - تفسیر المبین ص ۱۴۱ - مطبوعہ حمایت اہل بیت قف، ریلوے روڈ - لاہور)

مشہور شیعہ مفسر سید فرمان علی لکھتے ہیں کہ:

امام فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ پاؤں کا مسح کرنا چاہئے یا دھونا۔ فقال نے اپنی تفسیر میں ابن عباس، انس بن مالک، عکرمہ، شعبی اور ابو جعفر محمد علی باقر سے روایت کی ہے کہ مسح واجب ہے۔ واضح ہو کہ پاؤں کے مسح کا وجوب اس بناء پر ثابت ہے کہ جملہ نماز اہل بیت اور اصحاب میں سے ابن عباس، انس، عکرمہ، شعبی نے ”أَرْجُلُكُمْ“ کو بکسر لام پڑھا ہے۔ ان کے علاوہ دو قاریوں حمزہ اور کسائی نے بھی بکسر لام پڑھا ہے اور اس کے بکسر لام پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ تحقیق شدہ ہے کہ ”أَرْجُلُكُمْ“ معطوف ہے، ”بِرءُ وَبِسُكْمُ“ کا..... غالباً اسی بناء پر علامہ شاہ عبدالقادر دہلوی نے اپنے مترجمہ قرآن مجید میں ”وَأَمْسَحُوا بِرءُ وَبِسُكْمُ وَ أَرْجُلُكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ“ کا ترجمہ یہ کیا ہے: بل لو اپنے سر کو اور پاؤں کو ٹخنوں تک۔ (القرآن الکریم ترجمہ تفسیر ص ۱۲۸)

شیخ محسن علی نجفی لکھتے ہیں کہ:

”وَأَمْسَحُوا بِرءُ وَبِسُكْمُ“ یعنی پورے سر کا نہیں ایک حصہ کا مسح کرو۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا: ایک حصہ کہاں سے سمجھا جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ”لَمَكَانِ الْبَاءِ“ یعنی ”باء“ سے جو ”رء و سکم“ میں ہے۔ آیت کا ذمہ وار ترجمہ یہ بنتا ہے: مسح کرو اپنے سروں کا اور اپنے پاؤں کا بھی ٹخنوں تک۔

اس جملہ کی دو قرأتیں ہیں: ”أَرْجُلُكُمْ“ میں لام پر زیر اور زیر کے ساتھ دونوں قرأتوں کی بناء پر ”رء و سکم“ کے محل یا لفظ پر عطف ہے لہذا دو قرأتوں کی بناء پر ”مسح برجلین“ ثابت ہے۔ (القرآن الکریم ص ۱۱۱ - مطبوعہ امامیہ پبلی کیشنز لاہور)

امام طبری (۳۱۰ھ) نے بھی ”وَأَرْجُلُكُمْ“ میں ”لام“ پر زیر اور زیر کے ساتھ دونوں قرأتوں کے علاوہ پاؤں پر مسح کرنے کی روایات بیان کی ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

”وَقَدْ ذَلِكْ آخِرُونَ مِنْ قَرْنِهِ الْحِجَازَ وَالْعِرَاقَ“ ”وَأَمْسَحُوا بِرءُ وَبِسُكْمُ وَ أَرْجُلُكُمْ“ ... ان الله إنما أمر عباده بمسح الأرجل في الوضوء دون غسلها وجعلوا ”الأرجل“ عطفاً على ”الرأس“ (تفسیر الطبری المجلد الرابع ص ۲۸۹ - سورة المائدة آیت ۶ - تحت رقم ۱۱۳۷)،

”... عن عكرمة عن ابن عباس قال: الوضوء غسلتان ومسحتان“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۱۳۷)،

”... ان الحجاج خطبنا بالأهواز ونحن معه فذكرنا الطهور فقال: ”وَأَغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ وَأَمْسَحُوا بِرءُ وَبِسُكْمُ وَ أَرْجُلُكُمْ...“ فقال انس:

صدق الله وكذب الحجاج - قال الله ”وَأَمْسَحُوا بِرءُ وَبِسُكْمُ وَ أَرْجُلُكُمْ“، قال: كان انس إذا مسح قدميه بلهما“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۱۳۷، ۱۱۳۸)

”... عن عكرمة قال: ليس على الرجلين غسل إنما نزل فيهما المسح“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۱۳۸)

”... عن أبي جعفر قال: امسح على رأسك وقد ميك“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۱۳۸)

”... عن الشعبي قال: نزل جبريل بالمسح - قال: ثم قال الشعبي: ألا ترى أن التيمم أن يمسح ما كان غسلاً، ويلقى ما كان مسحاً“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۱۳۸)

”... عن الشعبي قال: أمر بالتيمم فيما أمر به بالغسل“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۱۳۸)

”... عن الشعبي أنه قال: إنما هو المسح على الرجلين، ألا ترى أنه ما كان عليه

الغسل، جعل عليه المسح وما كان عليه المسح أهمل -“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۱۳۸)

”... عن عامر أنه قال: أمر أن يمسح في التيمم ما أمر أن يغسل في الوضوء و

أبطل ما أمر أن يمسح في الوضوء: الرأس والرجلان“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۱۳۸)

”... حدثنا اسماعيل قال: قلت لعامر: إن ناساً يقولون إن جبريل نزل

بغسل الرجلين - فقال: نزل جبريل بالمسح“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۱۳۸)

”... عن يونس قال حدثني من صحب عكرمة الى واسط قال: قما رأيته غسل رجله، اما يمسح عليهما حتى خرج منها“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۱۴۸۹)

”... عن قتاده قوله: ”يا ايها اللين امنوا اذا قمتم الى الصلوة فاغسلوا وجوهكم... الخ“ افترض الله غسليتين و مسحيتين“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۱۴۹۰)

”... عن علقمة: أنه قرأ: ”وَأَرْجُلَيْكُم“، مخفوضة ”اللام“، حدثنا جرير، عن الاعمش، مثله۔ (حوالہ مذکور ۱۱۴۹۱، ۱۱۴۹۲)

... عن مجاهد: أنه كان يقرأ: ”وَأَرْجُلَيْكُم“۔

... كان الشعبي يقرأ: ”وَأَرْجُلَيْكُم“ بالخفض۔

... عن أبي جعفر: أنه قرأ ”وَأَرْجُلَيْكُم“ بالخفض۔

... عن الضحاك أنه قرأ: ”وَأَرْجُلَيْكُم“ بالخفض۔

... عن سلمة، عن الضحاك: أنه قرأ: ”وَأَرْجُلَيْكُم“ بالكسر۔

قال أبو جعفر: والصواب من القول عندنا في ذلك، أن الله عز ذكره أمر بعموم مسح الرجلين بالماء في الوضوء، كما أمر بعموم مسح الوجه بالتراب في التيمم، وإذا فعل ذلك بهما المتوضي، كان مستحقاً اسم ”ما سح غاسل“ لأن غسلهما إمرار الماء عليهما أو إصابتهم بالماء و ”مسحهما“ إمرار اليد أو ما قام مقام اليد عليهما فإذا فعل ذلك بهما فاعل فهو ”غاسل ماسح“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۱۴۹۳، ۱۱۴۹۴)

اس بحث کے آخر میں امام طبری تمام روایات کا تجزیہ کرتے ہوئے بطور نتیجہ فرماتے ہیں کہ:

فإذا كان ”المسح“ المعنيان اللذان وصفنا: من عموم الرجلين بالماء وخصوص بعضهما به، وكان صحيحاً بالأدلة الدالة التي سنذكرها بعد، أن مراد الله من مسحهما العموم، وكان لعمومهما بذلك معنى [الغسل] و ”المسح“، فبين صواب قراءة القراءتين جميعاً، أعني النصب في ”الارجل“ و ”الخفض“ لأن في عموم الرجلين بمسحهما بالماء غسلهما و في إمرار اليد و ما قام مقام اليد عليهما مسحهما۔

فوجه صواب قراءة من قرأ ذلك تصباً، لما في ذلك من معنى عمومهما بإمرار الماء عليهما۔ ووجه صواب قراءة من قرأه خفضاً، لما في ذلك من إمرار اليد عليهما، أو ما قام مقام اليد، مسحاً بهما۔

غير أن ذلك وإن كان كذلك، وكانت القراءتان كلتاهما حسناً صواباً، فأعجب القراءتين إلى أن اقراها قراءة من قرأ ذلك خفضاً، لما وصفت من جمع ”المسح“ المعنيين اللذين وصفت، ولأنه بعد قوله: ”وَأَمْسَحُوا بِرءُوسِكُمْ“ فالعطف به على الرءوس، مع قرينه منه، أولى من العطف به على ”الأيدي“ وقد حيل بينه وبينها بقوله ”وَأَمْسَحُوا بِرءُوسِكُمْ“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۱۴۹۹)

امام طبری نے آیت وضوء کی تفسیر میں متعدد روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وضوء میں دو اعضاء (ہاتھ اور منہ) کو دھونا اور دو اعضاء (سر اور پاؤں) کا مسح کرنا ہی مشروع ہے۔

اسی طرح متعدد روایات میں یہ بتایا گیا ہے کہ ”وَأَمْسَحُوا بِرءُوسِكُمْ وَارْجُلَيْكُم“ میں ”وَأَمْسَحُوا بِرءُوسِكُمْ“ کا عطف ”رءُوس“ پر ہے جس طرح سر کا مسح ہے اسی طرح پاؤں کا بھی مسح ہے۔ نیز ”وَأَمْسَحُوا بِرءُوسِكُمْ“ کے ”لام“ پر ”زید“ کے بجائے ”زیر“ ہے یعنی ”وَأَمْسَحُوا بِرءُوسِكُمْ“

حجاج بن یوسف نے ایک خطبہ میں آیت وضوء کی تلاوت کے بعد بتایا کہ وضوء میں چہروں، ہاتھوں کا دھونا، سر کا مسح کرنا پھر پاؤں کے دھونے کا حکم نازل ہوا ہے۔ اس کی تردید حضرت انسؓ سے کرائی گئی کہ آیت وضوء میں اللہ نے سچ فرمایا ہے جبکہ اس کی تشریح کرنے میں حجاج نے جھوٹ کہا ہے ”وَأَرْجُلَيْكُم“ میں ”لام“ کے نیچے زیر ہے جس کا مطلب ہے کہ پاؤں پر بھی مسح کرو اور وہ خود بھی اس پر عمل کرتے تھے۔

حضرت عکرمہ کا بھی دو ٹوک انداز میں یہ موقف پیش کیا گیا کہ پاؤں کا دوران وضوء دھونے کا حکم نہیں آیا بلکہ ان کا مسح کرنا ہی نازل ہوا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے عکرمہ کو پاؤں دھوتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ وہ ان پر مسح ہی کرتے رہے۔ امام ابو جعفر نے کہا کہ

اپنے سر اور دونوں پاؤں کا مسح کیا کرو۔

امام شعیبی سے بتکرا نقل کیا گیا کہ جبریل پاؤں کے مسح کا حکم لے کر اترے۔ کیا تو اس بات پر غور نہیں کرتا کہ وضوء میں جن اعضاء (منہ اور ہاتھ) کا دھونا تھا، تیمم میں ان کے مسح کا حکم دیا اور وضوء میں جن اعضاء (سر اور پاؤں) کے مسح کا حکم تھا تو تیمم میں انہیں سرے سے ہی لغو اور مہمل چھوڑ دیا گیا؟

اسماعیل راوی کہتے ہیں کہ میں نے عامر سے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ جبریل پاؤں کے دھونے کا حکم لے کر آئے۔ عامر نے کہا کہ نہیں بلکہ وہ پاؤں کے مسح کا حکم لے کر نازل ہوئے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں (چہرہ اور ہاتھ) کا دھونا اور دو چیزوں (سر اور پاؤں) کا مسح کرنا فرض قرار دیا ہے۔

عکرمہ، انس، علقمہ، اعمش، مجاہد، ضحاک، شعبہ وغیرہم ”وَأَرْجَلُكُمْ“ میں ”لام“ کے نیچے زیری پڑھتے تھے۔

امام ابو جعفر نے کہا کہ ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ پاؤں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے عام مسح کرنے کا حکم دیا ہے جس طرح تیمم میں چہرہ کے عموم کا مسح کرنا فرمایا ہے۔ اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین پاؤں کا دھونا یا مسح کرنا ایک اہم اختلافی مسئلہ ہے۔ اول الذکر پاؤں کے دھونے کا قائل ہے جبکہ مؤخر الذکر مسح کرنا اپنا مسلکی شعار سمجھتا ہے۔ لیکن اس روایت میں پاؤں پر مسح کو ”صواب“، یعنی صحیح قرار دے دیا گیا ہے۔

یہی نہیں کہ صرف پاؤں کے مسح کو ہی صحیح اور صواب قرار دیا گیا ہے بلکہ ”وَأَرْجَلُكُمْ“ دونوں قرأتوں کو ”حسن و صواب“ قرار دینے کے باوجود ”وَأَرْجَلُكُمْ“ کی قرأت کو ”حسن، صواب و راجح“ قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس کا عطف ”إِلَى“ پر نہیں بلکہ ”رءوس“ پر ہے جو ”أرجل“ کے قریب ہے۔

صرف وضوء کے مسئلہ پر اور شیعہ مذہب کی تائید میں امام طبری نے ایک آیت کی تفسیر میں ۲۲ روایات نہ صرف نقل کی ہیں بلکہ ان کی ”تصویب“ بھی کی ہے مگر اس کے باوجود امام طبری

کے کوکیل صفائی علامہ ابن حجر عسقلانی مجدد سلیمانی کے قول ”كان يضع للرواقض“ (کہ وہ رواقض کے لئے احادیث گھڑتا تھا) کی تردید کرتے ہوئے پہلے فرماتے ہیں کہ یہ جھوٹی بدگمانی ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ سلیمانی ایسا ”حافظ، محدث، متقن“ سنی طبری کے لئے یہ الفاظ استعمال نہیں فرما سکتے بلکہ اس سے ان کی مراد شیعہ طبری (ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم) تھے اور اگر میں اس پر قسم بھی اٹھاؤں تو وہ صحیح ہوگی۔ سنی طبری کے بعد موصوف شیعہ طبری کا ذکر فرماتے ہیں تو اس کی ”شیعیت“ پر یہ دلیل قائم کرتے ہیں کہ:

”ولعل ماسا حكي عن محمد بن جرير الطبري من الاكتفاء في الوضوء بمسح الرجلين إنما هو لهذا الرافضي فاته منه بهم“ (لسان الميزان جلد ۵ ص ۱۰۳ تحت محمد بن جریر بن رستم ابو جعفر الطبری)

اور محمد بن جریر طبری کے بارے میں جو یہ واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ وہ وضوء میں پاؤں کے مسح پر اکتفاء کرتے تھے وہ شاید اس رافضی طبری (محمد بن جریر بن رستم) کے بارے میں ہو کیونکہ پاؤں پر مسح کرنا ان کا مذہب ہے۔

یہاں علامہ عسقلانی نے اس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ پاؤں پر مسح کرنا شیعہ و رواقض کا مذہب ہے اور اس رافضی طبری کے عمل کو سنی طبری کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ علامہ عسقلانی کے اس موقف سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تفسیر طبری کا مطالعہ نہیں کیا تھا ورنہ وہ اس طرح کا بے بنیاد دعویٰ نہ کرتے اور نہ ہی وہ مجدد سلیمانی کے قول کی تردید کے لئے قسم اٹھانے کو تیار ہوتے۔ علاوہ ازیں حضرت عسقلانی کے موقف سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی ہے کہ امام طبری علاوہ دیگر شیعہ افکار کے پاؤں پر مسح کے قائل ہونے کی بناء پر بھی نہ صرف شیعہ بلکہ ”رافضی“ بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ علامہ سلیمانی کے اس قول کی بھی تصدیق ہوگئی ہے کہ: ”كان يضع للرواقض“ وہ رواقض کے لئے احادیث گھڑتے رہتے تھے۔

امام طبری اور آیت مباہلہ

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا
وَ أَبْنَاءَكُمْ وَ نِسَاءَنَا وَ نِسَاءَكُمْ وَ أَنْفُسَنَا وَ أَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ
اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ۝ (سورة آل عمران آیت ۶۱)

پھر جو شخص جھگڑا کرے آپ سے اس (عربی) کے بارے میں اس کے بعد کہا گیا
آپ کے پاس علم تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو، اور
اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے نفسوں کو اور تمہارے نفسوں کو۔ پھر بڑی عاجزی
سے (اللہ کے حضور) التجا کریں پھر بھیجیں اللہ تعالیٰ کی لعنت جھوٹوں پر۔

سید امداد حسین کاظمی لکھتے ہیں کہ:

یہ آیت ”فَمَنْ حَاجَّكَ“ سے لے کر ”عَلَى الْكَاذِبِينَ“ تک آیت مباہلہ کہلاتی
ہے جو نصاریٰ نجران اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ہونا تجویز ہوا تھا۔ واقعات
یوں ہیں کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد حضرت عیسیٰ علیہ
السلام کے بارے میں بحث و مناظرہ کرنے کے لئے آیا۔ آپ نے انہیں بہت سمجھایا لیکن
وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آیا، آخر جب ان کی ضد بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ کی طرف
سے یہ آیت نازل ہوئی جس میں ان کے ساتھ اہتال کرنے کا حکم ہوا۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس حکم خداوندی سے آگاہ کیا تو وہ لوگ
مشورہ کرنے کے لئے اپنی اقامت گاہ پر چلے گئے وہاں ان کے سرداروں نے کہا کہ اگر محمد
(صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم کو لا کر ہم سے مباہلہ کریں تو ہم ضرور مباہلہ کریں گے کیونکہ یہ

اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ سچا نبی نہیں ہے اور اگر وہ مباہلہ کے لئے اپنے اہل بیت کو ساتھ
لایا تو ہم ہرگز مباہلہ نہیں کریں گے کیونکہ اس صورت میں وہ یقیناً سچا نبی ہوگا۔

پس جب صبح ہوئی تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے درآن حالے کہ
آپ کے ساتھ جناب امیر المؤمنین، فاطمہ الزہراء، حسن اور حسین تھے۔ نصاریٰ نے پوچھا
یہ کون لوگ ہیں جو آپ کے ساتھ ہیں؟ کہا گیا کہ ایک تو ان کے چچا زاد بھائی، ان کے وصی
اور داماد علی بن ابی طالب اور یہ ان کی دختر فاطمہ الزہراء ہیں اور یہ دونوں ان کے بیٹے حسن
اور حسین ہیں۔ پس وہ الگ ہو گئے اور آنحضرت سے کہا کہ ہمیں مباہلہ سے معاف کریں ہم
آپ سے صلح چاہتے ہیں۔ پس آنحضرت نے ان سے دو ہزار حلقے اور تیس لوہے کی زرہیں
جزیہ لے کر مصالحت کر لی۔

جب نصاریٰ نے دیکھا کہ میدان مباہلہ میں آنحضرت اس شان سے آرہے ہیں کہ آپ
کی کوہ میں حسین ہیں، حسن کو انگلی لگائے ہیں، پیچھے فاطمہ ہیں اور ان کے پیچھے حضرت علی۔ کو یا
مطابق ترتیب آیت کے چل رہے ہیں اور رسول اللہ انہیں کہتے ہیں کہ جب میں دعا کروں تو تم
آمین کہنا۔

ان کے اسقف نے کہا کہ اے گرد و نصاریٰ! میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر وہ
پہاڑ کو کہیں تو وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائے۔ اگر ان سے مباہلہ کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ پس
انہوں نے دو ہزار حلقے اور تیس زرہیں لوہے کی بطور جزیہ دیں اور مصالحت کر لی۔

آنحضرت نے فرمایا خدا کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ اگر تم
مباہلہ کرتے تو بند راو رخنہ کی شکلوں میں مخ ہو جاتے اور یہ سارا میدان آگ بن جاتا اور
نجران کے سب رہنے والوں حتیٰ کہ پرندوں کو بھی جلا دیا جاتا۔

اور عبید بن الاخبار الرضا میں جناب امام موسیٰ کاظم سے منقول ہے کہ:

سوائے علی بن ابی طالب اور فاطمہ الزہراء اور حسین کے کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا
کہ نصاریٰ سے مباہلہ کرنے کے دن جناب رسول خدا نے اس کو اپنی چادر کے نیچے داخل کیا

امام طبری --- کون؟

امام طبری اور آیت مباہلہ

ہو۔ پس خدا تعالیٰ کے قول ”ابناء“ کی تاویل جناب حسنین اور ”نساء نا“ کی جناب فاطمہ الزہراء اور ”انفسنا“ کی جناب علی مرتضیٰ ہیں۔“ (القرآن الحسین - تفسیر المتقین ص ۴۷۔ حمایت اہل بیت وقف ریلوے روڈ لاہور)

سید فرمان دہلوی یہی واقعہ نقل کر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

”یہ حضرت علی کی اعلیٰ فضیلت ہے کہ نفس رسول، خدا کے حکم سے قرار پائے اور تمام انبیاء سے افضل ٹھہرے۔“ (القرآن الحکیم ص ۶۸۔ مطبوعہ چاند کمپنی کشمیری بازار۔ لاہور) شیخ محسن علی نجفی لکھتے ہیں کہ:

”علامہ دُشدری نے اس جگہ ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ ”نساء نا“ اور ”انفسنا“ میں ایک ایک ہستی حضرت فاطمہ اور حضرت علی پر اکتفا کیا گیا لیکن ”ابناء نا“ میں ایک ہستی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ چونکہ فاطمہ اور علی کی کوئی نظیر نہیں تھی لہذا ان کے ساتھ کسی اور کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ لیکن ”ابناء نا“ میں دو ہستیاں ایک دوسرے کی نظیر تھیں اس لئے یہاں دونوں کو بلایا۔“ (القرآن الکریم۔ ترجمہ و حاشی ج۱۱ اسلام والمسلمین مولانا شیخ محسن علی نجفی۔ مطبوعہ امامیہ پبلی کیشنز اسلام پورہ لاہور) امام طبری نے بھی آیت مباہلہ کے تحت اہل تشیع کی موافقت میں دس احادیث بیان کی ہیں جن کے سلسلہ اسناد میں خیر سے کچھ شیعہ راوی بھی تشریف فرما ہیں:

”... کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم و علی و فاطمة والحسن والحسین“،

”... فأخذ یعنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بیہما الحسن والحسین و فاطمة، وقال لعلیٰ اتباعنا، فخرج معهم، فلم یخرج یومئذ انصاری وقالوا: انا نخاف ان یکون هذا هو النبی، ولیس دعوة النبی کغیرہا، فتخلفوا عنه یومئذ، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لو خرجوا لا حترقوا، قصا لحوہ علی صلح...“

”... لما أراد النبی صلی اللہ علیہ وسلم اهل نجران، أخذ بیہما حسن و حسین وقال لفاطمة: اتبعینا، فلما رأى ذلك أعداء اللہ رجعوا۔“

”لو خرج الذین یأهلون النبی صلی اللہ علیہ وسلم لرجعوا لا یجلون أهلا ولا مالا۔“

امام طبری --- کون؟

امام طبری اور آیت مباہلہ

”قیل لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لولا عنت القوم بمن کنت تأتی حین قلت: ”ابناء نا و ابناء کم“؟ قال: حسن و حسین۔“

”لمأزلت هذه الآية: ”فقيل تعالوا... الخ“ أرسل رسول الله إلى علي و فاطمة وابنيهما الحسن والحسين“ ودعا اليهود ليلا عنهم، فقال شاب من اليهود: ويحكم! أليس عهدكم بالأمس إخوانكم الذين مسخوا قرده و خنازير؟ لا تلا عنوا، فانتبهوا“ (تفسير الطبري: المسمى ”جامع البيان في تاويل القرآن“ المجلد الثالث ص ۲۹۸-۲۹۹۔ الطبعة الثالثة: ۱۹۹۹/۱۴۲۰۔ بيروت۔ لبنان تحت رقم- ۷۱۷۸، ۷۱۷۹، ۷۱۸۱، ۷۱۸۲، ۷۱۸۵، ۷۱۸۶، ۷۱۸۷)۔

یعنی آیت مباہلہ میں ”ابناء نا، نساء نا، انفسنا“ سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ تھے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسنؑ، حضرت حسینؑ اور حضرت فاطمہؑ کا ہاتھ پکڑا جبکہ حضرت علیؑ سے فرمایا: ہمارے پیچھے آؤ تو حضرت علیؑ ان کے ساتھ نکلے۔ لیکن نصاریٰ اس دن نہ نکلے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں یہودی نبی نہ ہوں اور نبی کی دعا غیر نبی کی دعا کی طرح نہیں ہوتی۔ پس انہوں نے مباہلہ سے تخلف کیا تو آپؐ نے فرمایا: اگر وہ نکلے تو جل کر جھسم ہو جاتے۔ پھر انہوں نے مصالحت کر لی۔

جب نبی اکرمؐ نے اہل نجران کے ساتھ مباہلہ کا ارادہ فرمایا تو حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کا ہاتھ پکڑا اور حضرت فاطمہؑ سے فرمایا ہمارے پیچھے آؤ۔ جب اللہ کے دشمنوں نے یہ دیکھا تو واپس لوٹ گئے، اگر وہ نبی اکرمؐ کے ساتھ مباہلہ کے لئے نکلتے تو اس حال میں واپس لوٹنے کے وہ نہ اہل کو پاتے اور نہ ہی مال کو۔

نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ اگر قوم ملاحظت کے لئے تیار ہو جاتی تو آپؐ کن کو لاتے؟ تو فرمایا: حسنؑ اور حسینؑ کو۔

جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو آپؐ نے علیؑ، فاطمہؑ، اور ان کے دونوں بیٹوں حسنؑ و

امام طبری --- کون؟

امام طبری اور آیت مباہلہ

حسینؑ کی طرف ایک آدمی کو بھیجا اور یہود کو بھی بلایا تا کہ ملاصحت کریں تو ایک یہودی نوجوان نے کہا: تم پر افسوس ہے کیا تم اس تاریخی حقیقت سے بے خبر ہو کہ تمہارے بھائی بندر اور خزیر کی شکل میں مسخ ہو گئے تھے تو ملاصحت مت کرو پھر وہ اس سے رک گئے۔

آیت مباہلہ کی تفسیر میں امام طبری کے راویوں میں دیگر ضعیف اور کذاب راویوں کے علاوہ ابن حمید، عبد الرحمن بن زید بن اسلم اور جناب سدی بھی ہیں جن کا ذکر آگے زیر عنوان ”رواۃ طبری“ آ رہا ہے۔

امام طبری نے اپنی تفسیر تاریخ میں ”سدی“ اور کلبی وغیرہم سے بکثرت روایات نقل کی ہیں۔ شاید کوئی وکیل صفائی یہاں یہ دلیل پیش کر دے کہ اس سے مراد ”سدی کبیر“ بھی ہو سکتے ہیں۔ اول تو امام طبری نے زیر بحث آیت کی تفسیری سند میں اس کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ صرف یہ لکھا ہے کہ:

”حدثنا محمد بن الحسين قال، حدثنا احمد بن المفضل قال، حدثنا أسباط، عن السدي“ ملاحظہ ہو: تفسیر الطبری المجلد الثالث ص ۲۹۸۔ تحت رقم ۷۱۷۹۔

اور اگر بالفرض یہاں ”سدی کبیر“ ہی مراد لے لیا جائے تو پھر بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دونوں حضرات طبری کے ہم مسلک ہیں، دونوں شیعہ ہیں، دونوں کوفی ہیں، دونوں کذاب ہیں اور دونوں ”سدی“ ہیں۔ عربی میں ”سدہ“ چھوڑے کو کہتے ہیں۔ یہ دونوں ہم مسلک بھائی کوفہ کی جامع مسجد کے دروازے پر بیٹھ کر اوڑھنیوں کی تجارت کیا کرتے تھے۔ اس لئے ان کو ”سدی“ کہا جانے لگا خواہ ”کبیر“ ہو یا ”غیر“۔ بڑے میاں بڑے میاں۔ چھوٹے میاں سجان اللہ۔

اس بڑے میاں ”سدی کبیر“ کو امام جوزجانی نے ”کذاب کھام“ (یعنی وہ جھوٹے اور تیرا باز ہیں) کا تحفہ عطا کیا ہے۔ (تہذیب الہند ص ۱۳۳)

یہ ملحوظ رہے کہ تفسیر طبری ”ام القاسم“ اور علم تفسیر میں بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے استفادہ کرتے ہوئے بعد کے مفسرین نے بھی اپنی تفاسیر میں اس طرح کی روایات بکثرت نقل کی ہیں۔

امام طبری --- کون؟

امام طبری اور آیت مباہلہ

امام طبری سے ہی ”فیض“ حاصل کر کے اہل تشیع نے ”ابناء نا“ سے حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ ”نساء نا“ سے حضرت فاطمہؑ اور ”انفسنا“ سے حضرت نبی اکرمؐ اور حضرت علیؑ مراد لئے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؑ کا شمار ”ابناء نا“ میں تو ہو سکتا ہے (بشرط صحت روایت) مگر ”انفسنا“ میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔

آیت مباہلہ کے نزول کا پس منظر یہ ہے کہ:

۹ھ کو ”عام الوفود“ کہا جاتا ہے جب اہل نجران کو اسلام کی دعوت پہنچی تو انہوں نے ۹ھ میں اکابر عیسائیوں کا ایک وفد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا جس نے دوران گفتگو ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران کی آیات نازل فرمائیں جن میں ایک آیت مباہلہ تھی جس میں عیسائیوں کو مباہلہ کا چیلنج دیا گیا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو فریق بنائے ہیں:

فریق اول: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ

فریق ثانی: وفد نجران کے عیسائی

فریق اول کے لئے الفاظ قرآنی فریق ثانی کے لئے الفاظ قرآنی

ابناء نا	و	ابناء کم
ونساء نا	و	ونساء کم
وانفسنا	و	وانفسکم

ثم نبتهل فجععل لعنت الله على الكاذبين“

دونوں فریقوں کے لئے الفاظ قرآنی ”ابناء، نساء، انفس“ ایک ہی طرح کے استعمال کئے گئے ہیں۔ جو حضرات فریق اول کے لئے مذکورہ الفاظ کی تعمیل میں حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کو میدان مباہلہ میں لائے ہیں تو انہوں نے فریق ثانی (جسے مباہلہ کی دعوت اور چیلنج دیا جا رہا ہے) کے لئے استعمال کئے گئے الفاظ قرآنی ”ابناء کم، نساء کم، انفسکم“ کے تحت افراد کیوں متعین نہیں کئے؟

انصاف اور دیانت کا تقاضا تو یہ ہے کہ فریق مخالف کے لئے بھی ان الفاظ کا کوئی مدلول متعین ہونا چاہئے کہ ”ابناء کم“ سے کس کس کے بیٹے، ”نساء کم“ سے کون کون سی عورتیں اور ”انفسکم“ سے کون کون سے نجرانی مرد میدان میں اترے۔

فریق ثانی نے نہ تو چیلنج قبول کیا اور نہ ہی ان کے بیٹے اور عورتیں وہاں موجود تھیں تو پھر فریق اول کے لئے اس تکلف کی ضرورت کن مقاصد کی خاطر محسوس کی گئی؟

قرآن کریم کی معنوی تحریف کا ارتکاب کر کے اسے اپنے بے بنیاد اور من گھڑت عقیدے کی بھینٹ چڑھانا کون سی دانشمندی ہے؟

فریق اول کے لئے تو اس حکم الہی کی تعمیل آسان تھی کیونکہ ان کے ”ابناء، نساء، و انفس“ سب ہی وہیں موجود تھے جبکہ فریق ثانی کو یہ سہولت سرے سے حاصل ہی نہیں تھی۔

تاریخ میں ”نجران“ نام کے متعدد دھربا مقامات پائے جاتے ہیں۔ ایک نجران بحرین میں ہے۔ دوسرا دمشق کے قریب حودان میں ہے۔ تیسرا عراق میں کوفہ اور واسطہ کے درمیان ہے اور چوتھا یمن کا ایک بڑا شہر ہے جو عیسائیت کا مرکز ہے۔ یمن کا نجران مکہ مکرمہ سے بیس دن کی مسافت پر واقع ہے۔ امام اہل سنت مولانا عبد الشکور لکھنویؒ سے یہاں سہوا ہے کہ انہوں نے نجران کا وقوع مدینہ منورہ کے نواح میں بتایا ہے۔ ملاحظہ ہو: تحفہ خلافت ص ۴۴۱۔ مطبوعہ تحریک خدام اہل سنت جہلم۔

آیت مباہلہ کے مخالف فریق ثانی کا تعلق یمن کے نجران سے تھا اگر وہ دعوت مباہلہ قبول کر لیتے تو پھر بھی یقیناً وہ مہلت طلب کرتے تاکہ یمن جا کر ”ابناء کم، نساء کم، انفسکم“ کا مدلول متعین کر سکیں جس کے بعد ”فنجعل لعنت اللہ علی الکذبین“ کا تقاضا پورا کریں۔

نزول آیت کے بعد انہوں نے صرف باہمی مشاورت کے لئے مہلت طلب کی پھر خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم مباہلہ نہیں کرتے۔ ان کی باہمی مشاورت کے دوران ان کی گفتگو سے ہی یہ صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ مباہلہ کے مہلک اور

خوفناک نتائج کے تصور سے ہی گھبرا گئے تھے۔ اس لئے ”مباہلہ“ تو سرے سے ہوا ہی نہیں تھا پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ جانتے ہوئے کہ فریق مخالف کے ”ابناء و نساء“ تو یہاں موجود ہی نہیں ہیں، حضرت حسنؑ، حضرت حسینؑ کا ہاتھ پکڑ کر کبھی حضرت فاطمہؑ کو پیچھے چلنے اور کبھی حضرت علیؑ کو پیچھے چلنے کا حکم کیوں کر دے سکتے ہیں؟

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ”ابناء جمع کا لفظ ہے اس لفظ کے تحت حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کس طرح آ سکتے ہیں؟ اگر حضرت علیؑ کو بھی شامل کر لیا جائے تو پھر ان حضرات پر ”ابناء“ کا اطلاق صحیح ہو سکتا ہے لیکن اہل تشیع تو حضرت علیؑ کو ”انفسنا“ میں شامل کرتے ہیں۔ اسی طرح ”نساء، نسا“ کے معاملے میں صرف حضرت فاطمہؑ کے اسم گرامی پر سوالیہ نشان برقرار رہتا ہے۔

اہل تشیع نے تو یہاں ایک اہم ”نکتہ“ بیان کیا ہے کہ:

”نساء نا“ اور ”انفسنا“ میں ایک ایک ہستی حضرت فاطمہؑ اور حضرت علیؑ پر اکتفا کیا گیا لیکن ”ابناء نا“ میں ایک ہستی پر اکتفاء نہیں کیا گیا۔ چونکہ فاطمہؑ اور علیؑ کی کوئی نظیر نہیں تھی لہذا ان کے ساتھ کسی اور کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی لیکن ”ابناء نا“ میں دو ہستیاں ایک دوسرے کی نظیر تھیں اس لئے یہاں دونوں کو بلایا۔

مگر پھر بھی اصل سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کے لئے ”مثنیہ“ کے بجائے جمع کا لفظ کیوں لایا گیا؟ اور حضرت فاطمہؑ کے لئے ”ہنت“ کے بجائے ”نساء“ کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا؟ اسی طرح حضرت علیؑ پر ”انفس“ کا اطلاق کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟

امام طبری اور آیت ولایت

”إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ.“ (سورۃ المائدہ آیت ۵۵)

تمہارا مددگار تو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور ایمان والے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیا کرتے ہیں اور ہر حال میں جاگڑا والی میں جھکتے والے ہیں۔ حجۃ الاسلام شیخ محسن علی نجفی اس آیت کریمہ کا ترجمہ و تفسیر کبایس الفاظ کرتے ہیں کہ: ”تمہارا ولی تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی جب آپ نے مسجد نبوی میں حالت رکوع میں ایک سائل کو انکشتری عطا فرمائی جس کے راوی یہ ائمہ و اصحاب ہیں:

(۱) بن عباس۔ (۲) عمار یا سر۔ (۳) عبداللہ بن سلام۔ (۴) سلمۃ بن کہیل۔ (۵) انس بن مالک۔ (۶) عتبہ بن حکم۔ (۷) عبداللہ بن ابی۔ (۸) ابوذر غفاری۔ (۹) جابر بن عبداللہ انصاری۔ (۱۰) عبداللہ بن غالب۔ (۱۱) عمرو بن عاص۔ (۱۲) ابو رافع۔ (۱۳) حضرت علی علیہ السلام۔ (۱۴) حضرت امام حسین علیہ السلام۔ (۱۵) حضرت زین العابدین علیہ السلام۔ (۱۶) حضرت امام محمد باقر علیہ السلام۔ (۱۷) امام جعفر صادق علیہ السلام۔

یہاں معنی و مفہوم میں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف یہ دیکھا جانا چاہئے کہ عصر نزول قرآن میں لوگ اس آیت سے کیا سمجھتے تھے۔ چنانچہ شاعر رسول حسان بن ثابت کے اشعار آیت کے مفہوم کو سمجھانے کے لئے کافی ہیں۔

فانت الذى أعطيت اذا كنت راكعا زكوة فلتك النفس يا خير راع

فانزل فيك الله خيرا ولاية و بينها فى محكمات الشرائع

یاد رہے کہ علی ان ہی معنوں میں ولی ہیں جن معنوں میں اللہ اور اس کے رسول ولی ہیں

کیونکہ ایک ہی استعمال میں لفظ کے دو معانی مراد نہیں لئے جاسکتے۔ یہاں ولایت سے حاکمیت مراد ہے جو اللہ، رسول اور رکوع میں زکوٰۃ دینے والے سے مختص ہے۔ یہاں ولایت سے مراد دوستی اور نصرت و محبت نہیں کیونکہ یہ تو تمام مومنین میں موجود ہوتی ہیں۔ نماز اور زکوٰۃ دونوں پر بیک وقت عمل صرف یہاں ہوا ہے۔ (القرآن الکریم مع ترجمہ و حواشی ص ۱۱۹۔ مطبوعہ امامیہ پبلی کیشنز لاہور۔)

شیعہ مفسر و مترجم سید امداد حسین کاظمی لکھتے ہیں کہ:

تفسیر صافی ص ۱۳۷ پر اس آیت کی تفسیر میں مختلف روایات درج ہیں۔ ایک روایت کافی کے حوالے سے جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایک دن حضرت علی ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ کے بدن پر ایک حلقہ تھا جس کی قیمت ایک ہزار دینار تھی وہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے آنحضرت کو بطور ہدیہ دیا ہوا تھا اور آپ نے اسے حضرت علیؑ کو عطا فرما دیا تھا۔ آپ دو رکعت پڑھ کر حالت رکوع میں تھے کہ ایک سوا لی نے آ کر کہا:

”السلام عليك يا ولي الله و اولي بالمؤمنين من انفسهم“

مجھ مسکین کو کچھ صدقہ دیجئے پس آپ نے وہ حلقہ اتار پھینکا اور انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا کہ اسے اٹھا لو۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وہ سائل اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ تھا۔

اور تفسیر قمی میں امام محمد باقر سے منقول ہے کہ ایک دن آنحضرت تشریف فرما تھے اور آپ کے پاس یہودیوں کے کچھ لوگ تھے جن میں عبداللہ بن سلام بھی تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ پس آنحضرت اٹھ کر مسجد کی طرف گئے سامنے سائل آگیا۔ آپ نے پوچھا کہ کیا کسی نے تمہیں کچھ دیا ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں اس نماز پڑھنے والے نے دیا ہے، آنحضرت نے دیکھا تو وہ حضرت امیر المؤمنین تھے۔ نیز علامہ اور خاصہ اور جمہور مفسرین نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی کی شان میں نازل ہوئی جبکہ آپ نے حالت رکوع میں ایک سائل کو انگوٹھی عطا فرمائی۔ بعض روایات میں حلقہ کا عطا کرنا آیا ہے اور بعض میں انگوٹھی۔

صاحب تفسیر صافی فرماتے ہیں کہ ان روایات میں منافات نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ حضرت علی نے ایک دفعہ حالت رکوع میں حلقہ دیا ہو اور دوسری بار انگوٹھی اور آیت ولایت دوسری بار (یعنی انگوٹھی)

عطا کرنے پر نازل ہوئی ہو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؑ کی ولایت اور خلافت کا اعلان فرمایا ہے۔ (القرآن المبین - تفسیر المبین ص ۱۵۱ - حمایت اہل بیت وقف ریلوے روڈ - لاہور۔)

شیعہ مترجم سید فرمان علی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

یہ آیت باتفاق مفسرین شیعہ، سنی، موافق، مخالف حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور اس سے تصریحی طور پر حضرت علیؑ کا خلیفہ بلا فصل ہونا ثابت و واضح ہوتا ہے جب آپؑ نے حالت رکوع میں سائل کو انکسری دی۔ (القرآن الکریم ص ۱۳۹ - ترجمہ تفسیر از سید فرمان علی مطبوعہ چاند کنٹی کشمیری بازار لاہور۔)

امام طبری (م ۳۱۰ھ) اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

فلان أهل التأويل اختلفوا في المعنى به: فقال بعضهم: غيبي به علي بن أبي طالب - وقال بعضهم: عني به جميع المؤمنين - (تفسير الطبري المجلد الرابع ص ۶۲۸ - تحت رقم ۱۲۲۱۳ - الطبعة الثالثة ۱۳۲۰ھ / ۱۹۹۹ء)

... عن السبكي قال: ثم أخبرهم بمن يتولاه فقال: "إنما وليكم الله ورسوله..." هؤلاء جميع المؤمنين، ولكن علي بن أبي طالب مربي سائل وهورا كع في المسجد، فأعطاه خاتمة... (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۲۲۱۵)

حدثنا هناد بن السري... عن أبي جعفر قال: سألت عن هذه الآية... قلت: من الذين آمنوا؟ قال: الذين آمنوا - قلنا: بلغنا أنها نزلت في علي بن أبي طالب - قال: علي من الذين آمنوا - (حوالہ مذکور ص ۶۲۹ - تحت رقم ۱۲۲۱۶ - ۱۲۲۱۷)

... حدثنا عتيبة بن أبي حكيم في هذه الآية... قال: علي بن أبي طالب - (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۲۲۱۸)

... حدثنا غالب بن عبيد الله قال: سمعت مجاهدًا يقول في قوله: نزلت في علي بن أبي طالب، تصديق وهو راکع - (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۲۲۱۹)

امام طبری نے اس آیت کی تفسیر میں آٹھ روایات بیان کی ہیں جن میں سے پہلی دو روایتوں (۱۲۲۱۲ - ۱۲۲۱۳) میں بتایا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت عبادہ بن صامتؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جبکہ چھ روایات میں اس کا نزول اہل تشیع کے موقف کی تائید میں حضرت علیؑ سے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علیؑ نے رکوع کی حالت میں زکوٰۃ و صدقہ کی

نیت سے سائل کو اپنی انگوٹھی عطا کر دی تھی۔ یہ ملحوظ رہے کہ ان کے سلسلہ اسناد میں دیگر ضعیف و کذاب راویوں کے علاوہ ایک راوی جناب ”سدی“ بھی تشریف فرما ہیں جن کے حالات آگے ”روایہ طبری“ کے عنوان کے تحت آ رہے ہیں۔

اہل تشیع اور امام طبری کی تفسیر سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے مسجد میں اور حالت رکوع میں ایک سائل کو بیت زکوٰۃ و صدقہ اپنا حلقہ یا انگوٹھی عطا کی تھی۔

اہل تشیع کا یہ دعویٰ ہی سرے سے باطل ہے کیونکہ نماز بالخصوص رکوع کی حالت میں حلقہ اتارنا یا انگوٹھی اتار کر کسی کو دینا یقیناً عمل کثیر میں شمار ہوتا ہے جس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ عمل خشوع و خضوع کے بھی منافی ہے جو نماز کی روح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

قد افلح المؤمنون O الذين هم في صلاتهم خاشعون O (المؤمنون آیت ۲۱)

یقیناً وہ مومن فلاح پائے گئے ہیں جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں۔

تفسیر صافی ص ۳۴۱ پر بحوالہ تفسیر قتی لکھا ہے کہ حالت نماز میں ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف نماز ہی کی طرف توجہ رہے۔ اور کافی میں امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ تم پر نماز میں خشوع و خضوع لازم ہے۔ تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ آنحضرتؐ نے ایک شخص کو حالت نماز میں اپنی داڑھی سے کھیلے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ: اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضاء پر بھی خشوع کا اثر ہوتا۔ (القرآن الہدای - تفسیر المبین ص ۴۴۳ - حمایت اہل بیت وقف ریلوے روڈ - لاہور)

امام خمینی نماز میں خشوع و خضوع کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

نماز کی حالت میں انسان خشوع و خضوع اور وقار اختیار کرے اور یہ سوچے کہ میں کس سے گفتگو کر رہا ہوں اور اپنے آپ کو انتہائی پست اور ناچیز جانے۔ اگر انسان نماز کی حالت میں پوری طرح اس تصور کو قائم رکھے تو وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد موصوف حضرت علیؑ کے خشوع و خضوع کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

لوگوں نے حضرت امیر المؤمنین کے مبارک پاؤں سے تیر کھینچ کر باہر نکالا جبکہ آپ نماز پڑھ رہے تھے لیکن آپ کو توجہ نہ ہوئی۔ (توضیح المسائل - مسائل نماز)

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی ”سائل“ اپنی صدا سے حضرت علیؑ کی نماز میں خلل نہیں ڈال سکتا اور نہ ہی ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا سکتا تھا لہذا نماز کی حالت میں حلقہ اُتار کر یا انگوٹھی انگلی میں سے نکال کر سائل کو بطور زکوٰۃ ادا کرنے کی روایات من گھڑت اور جھوٹی ہیں۔ اگر بفرض محال صحیح بھی ہوں تو پھر بھی ایسی روایات ”حاذ“ ہونے کی وجہ سے یقین کا فائدہ نہیں دیتیں۔ ایسی روایات کو آیت ولایت کے ضمن میں نقل کرنے سے آیت کا پورا مفہوم ہی ”ظنی“ ہو جائے گا حالانکہ عقائد کے باب میں یقین معتبر ہوتا ہے۔ جبکہ اہل تشیع کی مستدل روایت ضعیف ہی نہیں بلکہ موضوع ہے۔

امام ابن کثیر زیر بحث آیت کی تفسیر میں ان روایات کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

ولیس یصح شئى منها بالكلية لضعف أسانيدھا وجھالة رجالھا (تفسیر القرآن العظیم المجلد الثانی ص ۷۷۔ طبع بیروت۔ لبنان) یعنی ان روایات کی اسناد کے ضعف اور راویوں کے مجہول الحال ہونے کی وجہ سے کوئی روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ اگر بقول شیعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؑ کے اس عمل کی توثیق و تحسین فرمائی ہے تو پھر بحالت نماز بالخصوص رکوع، زکوٰۃ کی ادائیگی ہمیشہ کے لئے مستحسن اور قابل تعریف ہونی چاہئے تھی لیکن خود اہل تشیع بھی حضرت علیؑ کی اس سنت پر عمل پیرا نہیں ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ نہ یہ روایات صحیح ہیں اور نہ ہی قرآنی آیت کا یہ مفہوم صحیح ہے کہ حضرت علیؑ یا کسی دوسرے شخص نے بحالت رکوع زکوٰۃ ادا کی تھی ورنہ امت زکوٰۃ کی ادائیگی کے اس طریقے پر تواتر سے عمل کرتی چلی آتی۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کیا حضرت علیؑ نزول آیت کے وقت صاحب نصاب تھے؟ کیونکہ زکوٰۃ تو صاحب نصاب پر ہی ایک سال مکمل ہونے پر فرض ہوتی ہے۔

پھر یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ کیا سال عین دوسری رکعت کے رکوع میں پہنچتے ہی پورا ہو گیا تھا؟ پھر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ نے زکوٰۃ کی ادائیگی میں اس قدر تاخیر کیوں فرمائی تھی کہ زکوٰۃ ادا کئے بغیر ہی نماز میں شامل ہو گئے تھے؟

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت علیؑ کا فقر وفاقہ ضرب المثل ہے وہ اس وقت صاحب نصاب ہی نہیں تھے کہ ان پر زکوٰۃ فرض ہوتی تو پھر ایسی صورت میں مجازاً زکوٰۃ سے ”صدقہ نافلہ“ مراد لیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ بغیر کسی قوی قرینے کے زکوٰۃ سے نفلی صدقہ مراد نہیں لیا جاسکتا۔

اہل تشیع نے ”وہم راکعون“ میں واؤ کو حالیہ قرار دے کر یہ معنی کئے ہیں کہ (وہ زکوٰۃ دیتے ہیں) درآن حالے کہ وہ رکوع کرنے والے ہیں۔ یہاں انہوں نے ”وہم راکعون“ کو صرف ”یؤتون الزکوٰۃ“ کی ضمیر سے حال قرار دیا ہے جبکہ انہیں قاعدے کے مطابق دونوں جملوں ”یقیمون الصلوٰۃ و یؤتون الزکوٰۃ“ کی ضمیر سے حال بنانا چاہئے تھا۔

یہاں واؤ ”حالیہ“ نہیں ہے بلکہ واؤ عاطفہ ہے۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد باری ہے کہ ”واقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ ولرکعوا مع الراکعین“ (البقرہ آیت ۴۳) نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔

اس آیت میں بھی رکوع کا ذکر نماز سے الگ کیا گیا ہے۔ اسی طرح آیت ولایت میں ”وہم راکعون“ میں واؤ عاطفہ لا کر رکوع کا ذکر نماز سے الگ کیا گیا ہے۔ نیز رکوع یہاں اپنے اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ عالم لغوی مفہوم میں آیا ہے۔ نیاز مندی اور عاجزی اس لفظ کی اصل روح ہے۔

اہل تشیع کے موقف کے مطابق اگر امامت و خلافت کے لئے ”یؤتون الزکوٰۃ و ہم راکعون“ کی صفت اور وصف تسلیم کر لیا جائے اور آیت کے آغاز میں ”بَیِّنًا“ کو حصر قرار دے دیا جائے تو باقی گیارہ اماموں کی امامت ثابت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان میں سے نہ تو کسی نے حالت رکوع میں زکوٰۃ دی تھی اور نہ ہی وہ حضرت علیؑ کے لئے کلمہ حصر ”بَیِّنًا“ آ جانے کے بعد امامت کی دوڑ میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اہل تشیع کی تصریح کے مطابق حضرت علیؑ نے حالت رکوع میں جس سائل کو بطور زکوٰۃ حلقہ یا انگوٹھی دی تھی وہ ایک فرشتہ تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علیؑ نے اپنی زکوٰۃ بھی ایک ایسے سائل کو دی جو از روئے قرآن وحدیث و شریعت سرے سے مصارف زکوٰۃ و صدقات نافلہ میں شامل ہی نہیں تھا۔ دیگر اہل ایمان کی زکوٰۃ و صدقات سے تو مسلمان ہی فائدہ اٹھاتے تھے لیکن حضرت علیؑ کی زکوٰۃ ایک غیر مستحق ”فرشتہ“ کے کرغائب ہو گیا۔

امام طبری اور آیت مودّۃ قربی

قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى... (سورة الشوریٰ آیت ۲۳)
اے رسول کہہ دو کہ میں اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا مگر دوستی سچ قرابت کے۔
سید امداد حسین کاظمی لکھتے ہیں کہ:

تفسیر صافی ص ۴۵۱ پر ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے قریبیوں اور میری عترت سے محبت رکھو اور ان کے بارے میں میرے احکام کا تحفظ کرو۔

اور ص ۴۵۲ پر بحوالہ الحاشیہ لکھا ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں پر آنحضرتؐ کے لئے ان کے اہل بیت کے بارے میں ایک فریضہ ہے۔

اور کافی میں ہے ان ہی حضرات سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اہل بصرہ آیت مجیدہ ”قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا...“ کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ عرض کیا گیا کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ آیت آنحضرتؐ کے رشتہ داروں کے متعلق مازل ہوئی۔

آپؐ نے فرمایا کہ انہوں نے جھوٹ کہا۔ ماسوا اس کے نہیں کہ یہ آیت ہم اہل بیت رسولؐ، فاطمہ، حسن، حسین علیہم السلام، اصحاب کساء کے بارے میں خاص طور پر مازل ہوئی ہے۔ (القرآن المبین، تفسیر المصطفیٰ ۶۳۰۔ مطبوعہ جامعہ اہل بیت وقف لاہور)
امام طبری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

... عن سعید بن جبیر فی قوله: (قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى) قال: ہی قریبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
... عن أبی إسحاق قال سألت عمرو بن شعیب، عن قول اللہ عزوجل (قُلْ

لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى) قال: قریبی انبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
... عن السدی عن أبی السلیم قال: لما حی بعلی بن الحسین رضی اللہ عنہما أسیراً، فأقیم علی درج دمشق، قام رجل من اهل الشام فقال: الحمد لله الذی قتلکم واستأصلکم وقطع قریبی الفتنة فقال له علی بن الحسین رضی اللہ عنہ: أقرأت القرآن؟ قال: نعم، قال: أقرأت آل حم؟ قال: قرأت القرآن ولم أقرأ آل حم؛ قال: ما قرأت (قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى) قال: وإنکم لأنتم هم؟ قال نعم۔ (تفسیر ”جامع البیان فی تأویل القرآن“ المجلد الحادی عشر ص ۱۴۴)
امام طبری سدی ہی کی روایت سے اسی طرح کی ایک روایت آیت تطہیر کے تحت بھی ذکر کر چکے ہیں کہ:

... عن السدی عن أبی السلیم قال: قال علی بن الحسین لرجل من أهل الشام: أما قرأت فی الاحزاب (أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَ كُتُبَكُمْ تُطَهَّرُونَ) قال: ولأنتم هم؟ قال نعم۔ (تفسیر ”جامع البیان فی تأویل القرآن“ المجلد العاشر ص ۲۹۸۔ تحت رقم ۲۸۵۰۰)

سدی خود بھی کذاب، شیعہ اور وہابیات راوی ہے جبکہ اس کا استاذ کلبی بھی انتہائی کذاب اور غالی شیعہ ہے۔ اس ”بزرگ“ کے حالات آگے زیر عنوان ”رواۃ طبری“ ملاحظہ فرمائیں۔

سخت حیرت ہے کہ علی بن حسینؑ واقعہ کربلا (۶۱ھ) کے بعد یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ آیت ”مودّۃ“ سے ہم لوگ مراد ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نزولِ آیت کے وقت ان کے والد گرامی حضرت حسینؑ بھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔

علاوہ ازیں سورة الشوریٰ کی آیت ۲۳ کے صرف درمیانی حصے سے اپنے مزعوم عقیدے پر استدلال کرنا نہ صرف یہ کہ باطل محض ہے بلکہ قرآن مجید کی معنوی تحریف اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر بھی ناپاک حملہ ہے۔ مکمل آیت ملاحظہ فرمائیں:

امام طبری۔۔۔ کون؟

امام طبری اور آیت مودۃ قرنی

ذَلِكَ الْبَيْتُ يُبَشِّرُ اللَّهَ عِبَادَهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ ۚ وَمَن يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا حُسْنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ شَكُورٌ (الشورى آیت ۲۳)

یہی ہے وہ جس کی بشارت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دے رہا ہے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے تو کہہ دیجئے کہ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبت رشتہ داری کی۔ جو شخص کوئی نیک کام کرے ہم اس کے لئے اس کی نیکی میں اور نیکی بڑھا دیں گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بہت قدر دان ہے۔

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ”الا مودۃ فی القرین“ کا مطلب پوچھا گیا تو سعید بن جبیر نے کہا آل محمد کی قرابت مراد ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا: تم نے (جواب دینے میں) غلت کی۔ قریش کے سب ہی خاندان کی آپ سے قرابت ہے۔ آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان جو رشتہ داری و قرابت ہے تم اس کا لحاظ کرو۔ (صحیح بخاری۔ کتاب التفسیر۔ سورۃ الشوری) یہ ملحوظ رہے کہ سورۃ شوریٰ کی ہے۔ نزول آیت کے وقت حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی ولادت تو دو رکی بات ہے خود حضرت علیؓ کے سیدہ فاطمہؓ سے نکاح کی بات تک نہ ہوئی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی آیت کی تفسیر میں ان لوگوں کی محبت و اطاعت کو کیوں کر واجب قرار دے سکتے تھے جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے؟

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آیت کے الفاظ میں ”الا مودۃ فی القرین“ ہے یوں نہیں فرمایا گیا کہ ”الا مودۃ للقرین“ یا ”الا مودۃ لنوی القرین“۔ ”قرین“ کے معنی کسی عربی لغت میں رشتہ داریا قرابت مند کے طور پر نہیں آئے۔ قرابت مند یا رشتہ دار کے لئے قرآن مجید اور عربی لغت میں ”نوی القرین“ (واحد) ”نوی القرین“، لولوا القرین“ جمع ہے لہذا ”قرین“ کے معنی صرف قرابت اور رشتہ داری ہے علاوہ ازیں آیت میں ”المودۃ“ کا لفظ مصدر استعمال کیا گیا ہے، ام نہیں اس سے بھی معلوم ہوا کہ ”القرین“ سے اقارب مراد نہیں۔ اگر اقارب مراد ہوتے تو الفاظ یوں ہوتے

امام طبری۔۔۔ کون؟

امام طبری اور آیت مودۃ قرنی

”المودۃ لنوی القرین“ آیت میں ”نوی“ کا لفظ بھی بتا رہا ہے کہ یہاں اقارب مراد نہیں ہیں کیونکہ عربی محاورہ میں یوں نہیں کہا جاتا کہ: ”اسئلك المودۃ فی فلان“ بلکہ ”فلان“ بولا جاتا ہے۔

مزید برآں ”آیت مودت“ میں ”الا“ حرف استثناء بھی قابل غور ہے۔ استثناء کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) استثناء متصل۔ (۲) استثناء منقطع۔

اگر ”متشقی“، ”متشقی“ منہ میں داخل ہو اور اس کا ہم جنس ہو تو متصل ہے بصورت دیگر منقطع ہے۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ ”جاء العلماء الا زیلاً“ (علماء آگئے بجز زید کے) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زید بھی علماء میں داخل ہے اسے استثناء متصل کہا جاتا ہے۔

اور اگر اگریوں کہا جائے کہ ”جاء العلماء الا سحاباً“ (علماء آگئے بجز خط کے) تو اس مثال کا مطلب یہ ہوگا کہ خط علماء میں شامل نہیں بلکہ خط نہ آنے کا ذکر ایک الگ بات ہے۔ اسے استثناء منقطع کہا جاتا ہے۔

سورۃ الفرقان کی آیت ۷۷ میں بھی اجر رسالت کے حوالے سے استثناء منقطع آیا ہے: ”قل ما أسئلكم عليه من أجر الا من شاء ان يتخذ الىٰ ربہ سبیلاً“

یہاں ظاہر ہے کہ استثناء منقطع ہے۔ ”من شاء ان يتخذ الىٰ ربہ سبیلاً“ کوئی معاوضہ نہیں جس کو عام معاوضے سے متشقی کیا گیا ہو۔ یہ دو الگ باتیں ہیں اور اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ میں تم سے کسی قسم کا کوئی اجر بھی نہیں چاہتا ہاں یہ چاہتا ہوں کہ تم ٹھیک ہو جاؤ اور راجح اختیار کرلو۔

بالکل یہی صورت ”آیت مودت“ میں بھی ہے۔ ”قل لا أسئلكم عليه أجراً الا المودۃ فی القرین“ اس آیت میں ”مودت فی القرین“ متشقی ہے اور ”اجر“ متشقی منہ ہے اور متشقی، متشقی منہ میں نہ تو داخل ہے اور نہ ہی اس کا ہم جنس۔

”مودت فی القرین“ قرابت کی وجہ سے ثابت ہوئی ہے نہ کہ تبلیغ رسالت کی وجہ سے۔ لہذا ”مودت فی القرین“ کو تبلیغ رسالت کا صلہ ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ جب میں تم سے تبلیغ پر کوئی اجر نہیں مانگتا اور اس تبلیغ سے بھی

تمہاری خیر خواہی، ہی مقصود ہے تم اگر میرے پیغام کو قبول نہیں کرتے تو مجھے تکلیف تو نہ پہنچاؤ اور قرابت ہی کا کچھ لحاظ کرو۔ میرا تعلق بھی قریش کی شاخ بنو ہاشم سے ہے تمہیں تو عرب معاشرے و درواج اور عام انسانی و اخلاقی تقاضے کے تحت بھی باہمی طور پر خیر خواہی، ہمدردی، امداد باہمی، رواداری اور مودت کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔

آیت کا یہ مضمون محض وعظ و تذکیر ہے یہ کوئی جرم کی درخواست نہیں ہے اور نہ ہی اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ کفار سے (معاذ اللہ) خوف زدہ تھے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو کفار سے ہر قسم کے اجر کی مکمل نفی کرتے ہوئے انہیں ایک دوسری بات کی تلقین فرما رہے ہیں کہ تم قرابت داری کے مسلمہ انسانی اصولوں کو ملحوظ رکھو۔ یہ کوئی اجر نہیں جسے دوسرے تمام اجروں سے مستثنیٰ کیا گیا ہو۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دو الگ الگ باتیں بتائی جا رہی ہیں۔ کلام ادب اور اصول زبان کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی استثنیٰ کی اس قسم سے آگاہ ہے۔

قرآن مجید کی متعدد آیات میں بتایا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سمیت جملہ انبیاء کرام علیہم السلام نے فریضہ رسالت و تبلیغ کے عوض ہر قسم کے اجر و معاوضہ کی کامل نفی کی ہے اور کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ ”میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا مگر اتنا اجر مانگتا ہوں کہ میرے قرابت داروں سے محبت کرتے رہو“ یہ الزام صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر ہی لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے فریضہ رسالت ادا کرنے میں جس قدر صعوبتیں جھیلی تھیں اور تکالیف اٹھائی تھیں وہ صرف اس مقصد کے لئے تھیں کہ ان کے رشتہ داروں اور بالخصوص آلِ کساء سے محبت کی جائے اور مخصوص افراد کو خلافت و امامت کے منصب پر فائز کر دیا جائے۔ کیا اس ”تخریفی“ تفسیر کو قبول کر کے مخصوص حضرات سے محبت کو اجرت رسالت قرار دیا جاسکتا ہے؟

یہ خود ساختہ اور تخریفی تفسیر غلط ہی نہیں بلکہ تمام انبیاء کی تعلیمی و تبلیغی روح کے بھی خلاف ہے۔ کسی پیغمبر نے بھی امت سے اس قسم کا اجر نہیں مانگا بلکہ ہر قسم کے اجر کی نفی فرمائی ہے۔

امام طبری اور آیت تطہیر

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا O
(سورۃ الاحزاب آیت ۳۳)

”ما سو اس کے نہیں کہ اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ اہل بیت (نبوت) وہ تم سے ہر قسم کی ناپاکی کو دور رکھے اور تمہیں ایسا پاک رکھے جیسا کہ پاک رکھنے کا حق ہے۔“
یہ مکمل آیت نہیں ہے بلکہ اس کا آخری حصہ ہے جو ”آیت تطہیر“ کے نام سے معروف و مشہور ہے۔
مولانا شیخ محسن علی خانی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

”کیک ہی آیت میں ازواج رسول کے لئے تنبیہ (وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ ...) کا لہجہ ہے لیکن اہل بیت اطہار کے لئے تطہیر کا مژدہ۔ مانداڑی مخاطب میں یہ واضح فرق اہل خرد کے لئے دعوت فکر ہے۔“

اہل بیت سے مراد کون ہیں؟ جواب یہ ہے کہ یہاں ہم قرآن کی تشریح کے لئے سنت رسول کا سہارا لیں گے مگر نہ بقول بعض قرآن اس کشتی کے مانند رہ جاتا ہے جس کا ناخدا نہ ہو۔ چنانچہ یہاں ائمہ اہل بیت کے اجماع کے علاوہ صحیح مسلم، صحیح ترمذی، مسند احمد بن حنبل، مستدرک حاکم، اور دیگر شیعہ و سنی کتب میں مذکور بہت ساری احادیث میں رسول اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اس آیت میں اہل بیت سے مراد علی، فاطمہ، حسن اور حسین ہیں۔“ (اقرآن الکریم ص ۴۱۳-۴۱۴ مطبوعہ لامیہ پبلی کیشنز لاہور)

سید امداد حسین کاظمی لکھتے ہیں کہ:

”تفسیر صافی میں ۴۰۵ پر بحوالہ تفسیر قمی امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ آیت آنحضرت، علی بن ابی طالب، فاطمہ، حسن، حسین علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی اور یہ واقعہ جناب ام سلمہؓ آنحضرت کی زوجہ محترمہ کے گھر میں ہوا۔ آنحضرت نے حضرت علی و فاطمہ و حسن و حسین علیہم السلام کو بلایا اور ان پر اپنی چادر اوڑھادی اور آپ خود بھی اس

میں داخل ہو گئے پھر فرمایا: اے میرے اللہ یہ ہیں میرے اہل بیت۔۔۔

اس پر ام سلمہؓ بولیں یا رسول اللہ! کیا میں بھی ان میں شامل ہو سکتی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: اے ام سلمہ! نہیں۔ خوش خبری ہو کہ تو نیکی پر ہے۔“ (القرآن الہدیٰ تفسیر المصنف ص ۴۷۵) اہل بیت وقف لاہور) سید فرمان علی دہلوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

اس پر تو تمام علماء کا اتفاق ہے اور سنیوں، شیعوں میں سے کوئی اس کا مخالف نہیں کہ اہل بیت رسول، حضرت علیؓ، جناب فاطمہؓ الزہراءؓ، امام حسنؓ اور امام حسینؓ ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ یہ آیت ان ہی بزرگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔۔۔ اگر ازواج بھی شامل ہوتیں تو جس وقت حضرت ام سلمہؓ نے جن کے گھر میں یہ آیت نازل ہوئی اور وہ خود نہایت ممدوح اور پکی ایمان دار بیوی تھیں جب چادر کا کونہ اٹھا کر ان میں داخل ہونا چاہا تو حضرت رسولؐ نے کونہ ہاتھ سے چھین لیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ تم نیکی پر ہو مگر اہل بیت میں شامل نہیں بلکہ ازواج میں ہو۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی اس کے بعد مدتوں ہر نماز کے وقت حضرت رسولؐ، حضرت علیؓ کے مکان کے پاس آتے تو چوکھٹ تھام کر فرماتے ”السلام علیکم اہل البیت“۔“ (القرآن الکریم ص ۵۰۵۔ مطبوعہ چاند کھنٹی کشمیری بازار لاہور)

امام طبری (۳۱۰ھ) نے زیر بحث آیت کی تفسیر میں اہل تشیع کے موقف کی تائید میں یا ان کی ”راہنمائی“ کے لئے ۱۷ روایات درج کی ہیں جن میں آیت تطہیر کے سیاق و سباق کے بالکل برعکس ”اہل بیت“ سے حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ مراد لئے گئے ہیں۔ اس خلاف قرآن توضیح سے یقیناً اہل تشیع کو اپنے ”مذہب“ کی تشکیل و تدوین میں کافی مدد ملی ہے۔ ملاحظہ ہو: تفسیر الطبری: المسمی ”جامع البیان فی تائید و دل القرآن“، المجلد العاشر ص ۲۹۶ تا ۲۹۸۔ طبع بیروت۔ لبنان)

امام طبری نے آیت تطہیر کے زیر بحث حصے میں شیعہ مذہب کی موافقت میں متعدد روایات کے تحت جا بجا یہ لکھا ہے کہ:

”عننی بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و علی و فاطمہ والحسن والحسین

رضوان اللہ علیہم، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزلت هذه الآية فی خمسة: فیّ، و فی علیّ و حسن و حسین و فاطمہ، أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یمر بیت فاطمہ ستة أشهر کلما خرج لی الصلوۃ فیقول: الصلوۃ لعل البیت، (اتما یرید اللہ لینهب عنکم الرجس اهل البیت و يطهرکم تطہیراً)، رابطت المدينة سبعة أشهر علی عهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم إذا طلع الفجر جاء إلی باب علی و فاطمہ فقال: الصلوۃ، الصلوۃ (اتما یرید اللہ لینهب عنکم الرجس اهل البیت و يطهرکم تطہیراً)

عن أم سلمة زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم: أن هذه الآية نزلت فی بیتها (اتما یرید اللہ لینهب عنکم الرجس اهل البیت و يطهرکم تطہیراً) قالت: و أنا جالس علی باب البیت فقلت: أنا یا رسول اللہ ألسنت من اهل البیت؟ قال: إناک علی خیر، أنت من أزواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت و فی البیت رسول اللہ و علی و فاطمہ والحسن والحسین رضی اللہ عنہم۔

امام طبری نے آیت تطہیر کی تفسیر میں سترہ روایات میں مذکورہ افراد کو ”اہل بیت رسول“ قرار دیا ہے ان میں سے قطع نظر سنی کمزوریوں کے زیادہ سے زیادہ چار پانچ روایات دوسری کتب میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن تقریباً بارہ روایتیں ایسی ہیں جن میں امام طبری متغرد ہیں۔

یہ ملحوظ رہے کہ زیر بحث عنوان میں ”کساء“ سے متعلق روایات کا ذکر نہیں کیا گیا ان کا ذکر آگے مستقل عنوان ”امام طبری اور حدیث کساء“ کے تحت آ رہا ہے۔ یہاں صرف ”اہل بیت“ کے مدلول اور تعین سے متعلق مختصر چند روایات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے حافظ احمد بن علی سلیمانی کے اس قول کی بھی پوری تصدیق ہو جاتی ہے کہ ”کان یضع للروافض امام طبری روافض کے لئے روایتیں گھڑا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ احزاب کا چوتھا رکوع (آیت ۲۸ تا ۳۳) ازواج مطہرات کے بارے میں نازل فرمایا ہے۔ آیت نمبر ۳۳ میں ”اہل بیت“ اور ”تطہیر“ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جس

امام طبری --- کون؟

امام طبری اور آیت تطہیر

کی بناء پر اسے آیت تطہیر کا نام دے دیا گیا ہے حالانکہ یہ پوری آیت نہیں ہے۔ آیت کے آخری حصے کو علیحدہ فرض کر کے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس کا ازواج النبی سے کوئی تعلق نہیں۔

سات آیات پر مشتمل اس پورے رکوع میں ازواج مطہرات کے لئے ستائیس مرتبہ مؤنث کے صیغے اور ضمیریں استعمال ہوئیں، دوسرے مرتبہ ”بِئْسَاءَ النَّبِیِّ“ اور ایک مرتبہ ”قُلْ لَا زَوَاجَ لَکَ“ کہا گیا اس طرح اس رکوع میں کل تیس مرتبہ بکرا مؤنث کے صیغے استعمال ہوئے۔ جبکہ آیت نمبر ۳۳ کے دوسرے حصے میں صرف دو مرتبہ مذکر کی ضمیریں ”عَنْکُمْ، بِطَهَرِکُمْ“ استعمال ہوئیں۔

اہل تشیع نے غلط اور باطل استدلال کرتے ہوئے مذکر کی ان دو ضمیروں سے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو اہل بیت کا مصداق قرار دیا ہے۔

کلام عرب میں اگر مخاطب صرف عورتیں ہوں تو اظہار عظمت یا اظہار محبت کے طور پر مذکر کے صیغے استعمال ہوتے ہیں لیکن یہاں ”عَنْکُمْ، بِطَهَرِکُمْ“ میں جو مذکر کی ضمیریں آئی ہیں تو وہ محض لفظ ”اہل“ کی رعایت سے آئی ہیں، لفظ ”اہل“ چونکہ مذکر ہے اس لئے اس کی رعایت سے ہمیشہ مذکر کا صیغہ ہی لانا پڑے گا۔

چنانچہ قرآن مجید حدیث اور کلام عرب میں جہاں بھی لفظ ”لَعَلَّ“ استعمال ہوا ہے تو وہاں جمع مذکر ہی کی ضمیریں یا صیغہ لایا گیا ہے خواہ مخاطب واحد ہو، مشبیہ ہو، جمع ہو، مذکر ہو یا مؤنث ہو۔ سخت تعجب ہے کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی آیت تطہیر میں مذکر کی ضمیروں کی وجہ سے ازواج مطہرات کے ساتھ حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو بھی اس کا مصداق ٹھہرا دیا کہ:

”اس آیت سے پہلے اور بعد میں دونوں جگہ ”بِئْسَاءَ النَّبِیِّ“ کے عنوان سے خطاب اور ان کے لئے صیغے مؤنث کے استعمال فرمائے گئے ہیں۔ سابقہ آیات میں ”فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ“ سے آخر تک سب صیغے مؤنث کے استعمال ہوئے ہیں اور آگے پھر ”وَإِذْ تُكْرِمْنَ مَائِیْنِی“ میں بصیغہ تانیث خطاب ہوا ہے۔ اس درمیانی آیت کو سیاق و سباق سے کاٹ کر بصیغہ مذکر ”عَنْکُمْ“ اور ”بِطَهَرِکُمْ“ فرمانا بھی اس پر شاہد قوی ہے کہ

امام طبری --- کون؟

امام طبری اور آیت تطہیر

اس میں صرف ازواج ہی داخل نہیں، کچھ رجال بھی ہیں۔“ (معارف القرآن جلد ۷۔ ص ۱۴۰۔ تحت الآیۃ)

لفظ ”اہل“ کے علاوہ ”اہل البیت“ کے الفاظ پورے قرآن مجید میں تین مرتبہ آئے ہیں اور تینوں مقامات (سورہ ہود آیت ۷۳، سورہ القصص آیت ۱۲، سورہ احزاب آیت ۳۳) پر مخاطب عورتیں ہی ہیں اور ان مواقع پر بھی لفظ ”اہل“ کی رعایت سے جمع مذکر کے صیغے آئے ہیں۔ اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی ہے کہ اصطلاح اہل بیت کی حقیقی مصداق از روئے قرآن مجید صرف ازواج مطہرات ہی ہیں۔ جبکہ حضرت مفتی شفیع صاحب اور امام طبری کی منقولہ روایات سے مذہب شیعہ کی تائید ثابت ہوتی ہے۔

آیت تطہیر کی مکمل و مدلل تفصیل جاننے کے خواہش مند قارئین راقم الحروف کی کتاب ”اہل بیت رسول کون؟“ کی طرف مراجعت کریں۔

طهرهم تطهیراً، فنزلت هذه الآية حين اجتماعوا على البساط...

(تفسیر جامع البیان فی تآویل القرآن - المجلد العاشر ص ۲۹۶-۲۹۸ طبع بیروت تحت رقم ۲۸۲۸۸، ۲۸۲۹۰، ۲۸۲۹۳، ۲۸۲۹۴، ۲۸۲۹۵، ۲۸۲۹۶، ۲۸۲۹۸، ۲۸۲۹۹، ۲۸۳۰۱، ۲۸۳۰۲، ۲۸۳۰۵، ۲۸۳۰۸)

”کساء“ سے متعلق مذکورہ دس ”احادیث“ ان سات احادیث کے علاوہ ہیں جن کا ذکر پیچھے ”آیت تطہیر“ کے تحت گزر چکا ہے۔ اس تعداد سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امام طبری نے اہل تشیع پر کس قدر احسان کرتے ہوئے ان کے مذہب کی تکلیل و تدوین کے لئے اچھا خاصا مواد جمع کر دیا ہے۔

ان ”احادیث“ کے راویوں یا ان کے متون پر تفصیلی بحث کی یہاں قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ان پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ہی ان کا وضعی ہونا از خود ہی ثابت ہو جاتا ہے اور اگر بالفرض مذکورہ ”احادیث سنداً و متناً ہر اعتبار سے بالکل صحیح بھی ہوں تو پھر بھی وہ قرآن مجید کے مفہوم کی ناسخ نہیں ہو سکتیں اور نہ ہی ان روایات کی بناء پر قرآن مجید کی نص قطعی میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ احادیث جہاں سنداً و متناً غلط ہیں وہیں درایتاً بھی غلط ہیں۔ کیا اہل بیت کافر و ہونے کے لئے چادر میں آنا ضروری ہے؟ کیا چادر میں لئے بغیر یہ نہیں کہا جاسکتا ۴ اللہم ھؤلاء اھل بیتی“؟

بچوں کو تو چادر میں لیا جاسکتا ہے، کاندھوں پر اٹھایا جاسکتا ہے لیکن کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا اکمل الحیاء باپ ایک بالغ بیٹی ہی نہیں بلکہ شادی شدہ اور صاحب اولاد بیٹی کو اس کے شوہر کے ہمراہ چادر میں لے کر یہ اعلان کر سکتا ہے ”یہ ہیں میرے اہل بیت“؟

کیا جو چادر سے باہر رہ گئے وہ اہل بیت نہیں ہیں؟ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر بیٹیاں سیدہ نعبہ، سیدہ رقیہ اور سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہن اہل بیت میں شامل نہیں ہیں؟ کیا انہیں بھی ان کے شوہروں اور اولادوں سمیت چادر اوڑھائی گئی ہے؟ کیا سیدہ فاطمہؓ کی بیٹیاں ام کلثوم اور سیدہ نعبہ رضی اللہ عنہما اہل بیت میں داخل نہیں ہیں؟ اگر داخل ہیں تو کیا انہیں بھی چادر میں داخل کیا گیا ہے؟

اگر اس چادر سے (روائے نبوت کی بناء پر) فضیلت ثابت کی جائے تو جو چند لمحات کے

لئے اس چادر میں آجائے تو وہ اصلی اہل بیت ہو جائے اور جو ساری زندگی ”بیوت النبی“ میں قیام پذیر رہیں، ہمیشہ نبی کی چادر اوڑھے رہیں، جو نبی کے ساتھ ایک چادر میں رہیں (اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم قسم اٹھا کر کہیں کہ ”واللہ ما نزل علیّ الوحی و أنا فی لحاف امرأۃ منکن غیرہا“ (صحیح بخاری) اللہ کی قسم عائشہؓ کے علاوہ کسی کے ساتھ بھی چادر (لحاف) میں ہوتے وقت وحی نازل نہیں ہوئی) انہیں اہل بیت سے خارج کر دیا جائے۔ فیا أسفا۔

علاوہ ازیں اسی قسم کی ایک روایت حضرت عباسؓ اور ان کے فرزندوں کے لئے بھی منقول ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے فرمایا: کہ سوموار کے دن صبح کے وقت آپ اپنی اولاد کو لے کر میرے پاس آئیں، میں آپ کے لئے دعا کروں جو آپ اور آپ کی اولاد کو نفع دے۔ پھر سوموار کے دن صبح کے وقت ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ نے ہمیں چادر اوڑھائی اور پھر فرمایا: اے اللہ عباسؓ کو اور اس کی اولاد کو بخش دے۔ ظاہر اور باطن دونوں حالتوں میں ان کو پاک کر دے اور ان دونوں کا کوئی گناہ نہ چھوڑ۔ اے اللہ! عباسؓ کو اس کی اولاد میں قائم و محفوظ رکھ۔ (ترمذی) اور رزین کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ آپ نے دعا میں یہ بھی فرمایا کہ: خلافت اور امارت کو اس کی اولاد میں باقی رکھ۔ (مشکوٰۃ المصابیح - باب مناقب اہل بیت النبی)

ابن بلجہ اور بیہقی میں بھی اس طرح کی روایت موجود ہے۔ امام بیہقی نے ابوسعید ساعدی سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس بن عبدالمطلب سے فرمایا کہ آپ اور آپ کے بیٹے میرے آنے تک گھر سے نہ نکلیں، مجھے آپ سے کام ہے، سب نے حضورؐ کا انتظار کیا۔ دوسرے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ سلام دعا کے بعد فرمایا:

میرے قریب ہو جاؤ، وہ سب سرک کر قریب ہو گئے تو آپؐ نے ان سب کو اپنی چادر میں لے لیا اور دعا کی کہ: الہی یہ میرا چچا اور میرے والد کی جگہ ہے ”وھؤلاء اھل بیتی استرھم من النار کمستری ایاھم بملاھجی ھذا“ اور یہ میرے اہل بیت ہیں انہیں آگ سے یوں محفوظ

رکھنا جیسے میں نے انہیں اپنی چادر میں چھپا لیا ہے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد سوم ص ۵۷۶ پر بھی اسی طرح کی ایک روایت موجود ہے)

اس حدیث میں ”حدیث کساء“ کی نسبت زیادہ اہتمام کے ساتھ حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد پر چادر ڈال کر دعا فرمائی گئی اور صاحب مشکوٰۃ نے اس کو باب ”مناقب اہل بیت“ میں نقل کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ حضرات ایک مخصوص گروہ کے نزدیک اہل بیت نہ کہلا سکے۔ بہر حال حدیث کساء جتنے بھی طریقوں سے مروی ہے اس کے ہر سلسلہ سند میں کوئی نہ کوئی راوی مجروح، غیر ثقہ، غیر معتبر، کذاب اور رفس سے ہم ہے۔

اہل تشیع حدیث ”کساء“ کے ذریعے سے ائمہ کے معصوم ہونے کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ عقیدہ آیت تطہیر کے الفاظ ”لنذهب عنکم الرجس اهل البيت ويطهرکم تطهیراً“ سے کشید کیا ہے۔ امام طبری نے آیت تطہیر میں صرف ”چارتن“ کے اہل بیت ہونے پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ متعدد روایات میں بطور خاص ان الفاظ پر زور دیا جن سے اہل تشیع عقیدہ ”عصمت“ اخذ کرتے ہیں کہ:

اللهم هؤلاء اهل بيتي، اذهب عنهم الرجس وطهرهم تطهیراً، اللهم اذهب عنهم الرجس وطهرهم تطهیراً، فاذهب عنهم الرجس وطهرهم تطهیراً...“ امام طبری یا اہل تشیع کی متدل روایات سے ائمہ کی عصمت کا عقیدہ ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن نے یہی الفاظ صحابہ کرامؓ کے لئے بھی استعمال کئے ہیں بالخصوص اصحاب بدر کے لئے:

”لِيُطَهِّرَ كُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ“ (انفال آیت ۱۱)

اور ”وَلَيَكُنْ يُرِيدُ لِيطَهِّرَ كُمْ وَلِيَبَيِّنَ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ“ (المائدہ نبراۓ) صحابہ کے حق میں محض اذہاب رجز اور تطہیری کا اعلان نہیں ہوا بلکہ اتمام نعمت کا ذکر بھی ہے جو ایک جامع کلمہ ہے اور تمام انعام باری کو شامل ہے مگر اس کے باوجود ان کی عصمت کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

بہر حال امام طبری نے آیت تطہیر کے تحت موضوع و منکر روایات کے انبار لگا کر مذہب شیعہ کو خوب تقویت دی ہے۔

تاریخ طبری

زیر نظر کتاب کے آغاز میں مختلف عنوانات کے تحت امام طبری کا تعارف قارئین کی نظر سے گزر چکا ہے کہ موصوف کا دامن وسعت علم کے باوجود ”تشیع“ سے آلودہ تھا جبکہ امام ابو حیان اندلسی نے انہیں ”امام من ائمة الامامية“ یعنی فرقہ امامیہ کے ائمہ میں سے ایک امام قرار دیا۔ اس لئے صحابہ کرامؓ بالخصوص محاربین حضرت علیؓ کے خلاف امام طبری خود بھی قابل اعتبار نہیں ہیں جبکہ ان کے ”شیوخ“ کا حال ان سے بھی بدتر ہے۔

امام طبری نے تفسیر ”جامع البیان فی تائیل القرآن“ اور ”تاریخ الامم والملوک“ یا ”تاریخ الرسل والانبیاء والملوک والخلفاء“ (مجموع الادب الجوز السادس ص ۵۱۷) جیسی بلند پایہ تالیفات سے شہرت حاصل کی۔

تاریخ طبری کو اسلامی تاریخ کے سلسلہ میں ”امہات الکتاب“ کا درجہ حاصل ہے اگرچہ اس سے پہلے ایک شیعہ عالم احمد بن یعقوب (م ۲۸۴ھ) نے اپنی کتاب تاریخ یعقوبی لکھی تھی (یعقوبی کی وفات کے وقت خود طبری بھی ۶۰ برس کے تھے) مگر وہ بہت مختصر اور تشنہ ہے۔ اسی طرح ابو حنیفہ الدینوری (م ۲۸۲ھ) صاحب ”الاخبار الطوال“ بھی ان کے ہم عصر تھے۔ امام طبری نے ابو حنیفہ دینوری اور یعقوبی سمیت اپنے پیشرو دیگر ارباب تاریخ و سیر کے بیان کردہ واقعات، روایات اور اقتباسات بھی اپنی تاریخ میں درج کر لئے جبکہ ان کے اصل مآخذ اور کتب زمانے کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکیں اور تاریخ طبری کی بدولت ہی ان کے نام اور کام سے آج اہل علم آگاہ ہیں۔

موصوف نے یہ تاریخ اپنی عمر کے آخری دور میں لکھنا شروع کی، انہوں نے ہر سن کے واقعات اس ”سن“ میں مختلف عنوانات کے تحت درج کئے۔ یہ تاریخ ۳۰۲ھ کے واقعات پر مشتمل

ہے۔ تاریخ طبری مطبوعہ بیروت کی آٹھویں جلد کے بالکل آخر میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ:

”ثم الجزء الثامن وبه تم الكتاب وهو آخر تاريخ ابن جرير الطبري بحمد الله وبعونه“

طبری کے بعد دیگر مؤرخین نے اس سلسلہ کو جاری رکھا، بعض نے اس پر ضمیمہ و تکملہ بھی لکھے اور واقعات کے تسلسل کو ۶۱۶ھ تک لے گئے۔ ابن اثیر جزری (م ۶۳۰ھ) نے تاریخ طبری کے ضمیمہ و تکملہ کی مدد سے اپنی کتاب ”الکامل فی التاريخ“ میں ۶۲۷ھ تک کے واقعات قلمبند کئے۔

مسلمہ حقیقت یہ ہے کہ بعد کے تمام مؤرخین تاریخ طبری کے خوشہ چین رہے اور اپنی کتب میں اس دور سے متعلق تمام مواد اسی سے اخذ کیا۔

امام ابن کثیر (م ۷۴۷ھ) جیسے مفسر، محدث اور مؤرخ نے متعدد مقامات پر طبری کی روایات پر نقد کر کے ان کو رد کیا ہے مگر اس کے باوجود بعض واقعات کے بارے میں یہاں تک لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کی صحت میرے نزدیک مشکوک و مشتبہ ہے لیکن چونکہ میرے پیشرو ابن جریر وغیرہ ان کو ذکر کرتے آئے ہیں اس لئے میں نے بھی ان کی متابعت میں ان واقعات کو ذکر کر دیا ہے۔ اگر وہ انہیں ذکر نہ کرتے تو میں بھی انہیں ہرگز کتاب میں درج نہ کرتا۔ ملاحظہ ہو: البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۲۰۲۔

علامہ شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) لکھتے ہیں کہ:

”تاریخی سلسلہ میں سب سے جامع اور مفصل کتاب امام طبری کی تاریخ کبیر ہے۔ طبری اس درجے کے شخص ہیں کہ تمام محدثین ان کے فضل و کمال، وثوق اور وسعت علم کے معترف ہیں۔ ان کی تفسیر احسن التفاسیر خیال کی جاتی ہے۔ محدث ابن خزیمہ کا قول ہے کہ دنیا میں کسی کو ان سے بڑھ کر عالم نہیں جانتا ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

بعض محدثین (سلیمانی) نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ یہ شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے لیکن علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے:

یہ چھوٹی بدگمانی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر اسلام کے معتد اماموں میں سے ایک بڑے امام ہیں۔

علامہ ذہبی نے اسی موقع پر لکھا ہے کہ: ان میں فی الجملہ تشیع تھا لیکن مضمر نہیں۔ تمام مستند اور مفصل تاریخیں مثلاً تاریخ کامل، ابن اثیر، ابن خلدون، ابوالفداء وغیرہ ان ہی کی کتاب سے ماخوذ اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں۔ یہ کتاب بھی ماہیتھی اور یورپ کی بدولت شائع ہوئی۔“

(سیرت النبی ص ۵۴ تحت مقدمہ مطبوعہ دینی کتب خانہ اردو بازار لاہور ۱۹۷۵ء)

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی (م ۱۹۷۴ء) لکھتے ہیں کہ:

”اسی زمانہ میں تاریخ نویسی کا آغاز ہوا۔ اس لئے بہت سی غلط روایتیں جو عرصہ سے زبانوں پر چڑھی چلی آ رہی تھیں، تاریخوں میں داخل ہو گئیں کیونکہ ایسے ابتدائی دور میں جبکہ تاریخ نویسی کا آغاز ہوا تھا روایات کی اتنی تحقیق و تنقید جس سے افسانہ و حقائق میں پورا پورا امتیاز ہو سکے، مشکل تھی، کو بہت سی بے سرو پا روایتیں جن کا لغو ہونا بالکل عیاں تھا تنقید سے مسترد ہو گئیں۔ پھر بھی بہت سے غلط واقعات تاریخ کا جزو بن گئے حتیٰ کہ مؤرخ ابن جریر اپنی محدثانہ تنقید کے باوجود اپنی کتاب کو غلط روایات سے محفوظ نہ رکھ سکے اور آغاز تاریخ اسلام میں جو واقعات پولیٹیکل مقاصد کے لئے تراشے گئے تھے اس میں داخل ہو گئے۔ (سیر الصحابہ حصہ ششم ص ۹۸-۹۹۔ مطبوعہ ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور)

مناظر اسلام علامہ عبدالستار تونسوی (م ۲۰۱۲ء) لکھتے ہیں کہ:

”نیز طبری کے متعلق لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۰۰ پر علامہ ابن حجر نے ایک بزرگ (امام ابو حیان اندلسی) کا قول نقل کیا ہے: ابو جعفر طبری شیعوں کا ایک امام ہے، اسی صفحے پر محدث احمد بن علی سلیمانی کا یہ قول منقول ہے: یہ طبری روافض کے لئے حدیثیں گھڑتا تھا۔

خود طبری کی کتاب ”تاریخ الامم والملوک“ جلد ۱ ص ۲۴، ۲۹ پر موجود ہے ”فسی

وسط خلافة معاوية لعنه الله، في خلافة يزيد بن معاوية لعنهما الله“

یعنی اس طبری نے حضرت معاویہؓ جلیل القدر صحابی پر دو دفعہ لعنت کی ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ طبری رافضی تھا ورنہ حضورؐ کے کاتب الوحی صحابی پر ہرگز لعنت کرنے کی جسارت نہ کرتا اور اس طبری کے یقیناً رافضی ہونے پر یہ بات بھی بخوبی دلالت کرتی ہے

کہ اس کے ہم عصر وہم وطن مسلمانوں نے اس کی وفات کے بعد اس کے رافضی ہونے کے باعث عام مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کرنے دیا بلکہ اپنے گھر میں دفن کیا گیا۔ (مودودی صاحب کے صحابہ کرامؓ پر بے بنیاد و رکیک الزامات کے مدلل جواب ص ۹۴، ۹۵)

مولانا محمد نافع صاحب (م ۸ ربیع الاول ۱۴۳۶ھ ۳۱ دسمبر ۲۰۱۴ء) لکھتے ہیں کہ:

”التاریخ لابن جریر الطبری مرویات کا ایک کشتول ہے جس میں ہر طرح کا مال و متیاب ہو جاتا ہے صحیح و سقیم، ضعیف و قوی، رطب و یابس، راست و دروغ سب قسم کا مواد اس تاریخ میں فراہم ہے اور طبری مکمل یا نامکمل سند پیش کر کے ناظرین کے سامنے روایات کا ایک انبار لگا دیتا ہے۔ اب اس سے صحیح چیزیں اخذ کرنا اور بے کار اور رزی مواد کو متروک قرار دینا قارئین و ناظرین کی صوابدید پر ہے۔ پھر اس فن کے قواعد کی روشنی میں مواد حاصل کرنا ایک متیقظ اور بیدار مغز اہل علم کا کام ہے۔ عام آدمی کو سوائے حیرت و استعجاب کے کچھ حاصل نہیں ہوتا“ (سیرت حضرت امیر معاویہؓ جلد دوم ص ۳۸۵۔ مطبوعہ تحقیقات ۱۹۹۵ء)

مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری لکھتے ہیں کہ:

”حقیقت یہ ہے کہ تاریخ طبری تک ہماری تاریخ نہیں البتہ صحیح و سقیم روایات کا ڈھیر اور رطب و یابس معلومات کا ذخیرہ اور کھری کھوٹی باتوں کا طومار و انبار ہے، اسے تاریخ اسلام سے تعبیر کرنا اسلام پر ظلم ہے۔ اس قسم کے مجموعہ رطب و یابس سے تاریخ اسلام کو اخذ تو کیا جاسکتا ہے اسے تاریخ اسلام کہا نہیں جاسکتا۔“ (عادلا ندفاع۔ حصہ اول ص ۲۰۔ طبع ۱۳۸۵ھ)

امام طبری اپنے ”رفض“ یا علیٰ سبیل التزول ”تشیع“ کی وجہ سے کلی طور پر قابل اعتماد نہیں ہیں بالخصوص صحابہ کرامؓ کے خلاف ان کی مرویات بالکل ہی مردود ہیں۔

پھر یہ بات بھی ضروری نہیں ہے کہ کسی کتاب کا مؤلف اگر ثقہ و صادق ہے تو اس کی منقولہ روایات بھی بہر صورت صحیح ہی سمجھی جائیں گی۔ ان روایات کو بھی اصول روایت و درایت کی چھلنی سے گزرنا ہوگا۔ تاریخی روایات تو رہیں ایک طرف حدیثی، روایات کے بارے میں بھی امام نوویؒ (م ۶۷۲ھ) فرماتے ہیں:

فلما مأمورون بحسن الظن بالصحابۃ و نفی کل رذیلة عنهم، و إذا تسلمت الطرق نسبتا الكذب الى الرواة... قال العلماء: الأحادیث الواردة التي في ظاهرها دخل علی صحابی يجب تلویها، قالوا ولا يقع فی الروایات الثقات الا ما يمكنه تلویه... (شرح صحیح مسلم جلد ۲ ص ۸۰، ۸۱)

ہم صحابہ کے بارے میں حسن ظن اور ان سے ہر برائی کی نفی کرنے کے مکلف ہیں اور جب کسی سند سے اس کی راہ نہ ملے تو ہم اس الزام کو کذب راوی پر محمول کریں گے۔ علماء کا قول ہے کہ جن احادیث میں بظاہر کسی صحابی پر حرف آتا ہو تو اس کی تاویل واجب اور ضروری ہے اور انہوں نے کہا کہ صحیح روایات میں کوئی ایسی بات موجود نہیں جس کی تاویل نہ ہو سکتی ہو۔

علامہ شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) ”تاریخی کتب“ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

سیرت پر اگرچہ آج بھی سینکڑوں تصنیفیں موجود ہیں لیکن سب کا سلسلہ جا کر صرف تین چار کتابوں پر منتہی ہوتا ہے۔ سیرت ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد طبری، ان کے علاوہ جو کتابیں ہیں وہ ان سے متاخر ہیں اور ان میں جو واقعات مذکور ہیں زیادہ تر ان کتابوں ہی سے لئے گئے ہیں۔ ان میں واقدی تو بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہے محدثین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے۔

ابن سعد اور طبری میں کسی کو کلام نہیں لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا، ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چند اس اثر نہیں ڈالتا۔ یہ لوگ خود شریک واقعہ نہیں، اس لئے جو کچھ بیان کرتے ہیں اور راویوں کے ذریعہ سے بیان کرتے ہیں لیکن ان کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایت اور غیر مستند ہیں... طبری کے بڑے بڑے شیوخ روایت مثلاً سلمۃ اللامرش، ابن سلمۃ وغیرہ ضعیف الروایت ہیں۔

اس بناء پر مجموعی حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ، کتب حدیث کا ہم پلہ نہیں البتہ ان میں سے تحقیق و تنقید کے معیار پر جواز جائے وہ حجت اور استناد کے قابل ہے، (سیرت النبیؐ جلد اول تحت مقدمہ ص ۷۲-۷۳۔ مطبوعہ مدنی کتب خانہ لاہور)

علامہ موصوف نے امام طبری کے ”شیوخ“ میں صرف ”سلمۃ ایش اور ابن سلمۃ“ کو

”ضعیف الروایت“ قرار دے کر باقی کذاب، وضاع، رافضی اور شیعہ راویوں کو ”وغیرہ“ کے پس پردہ رکھا ہے۔

کتب حدیث میں بھی بکثرت ضعیف و موضوع روایات پائی جاتی ہیں جب سیرت کی کتابیں کتب حدیث کی ہم پلہ نہیں ہو سکتیں تو پھر کتب تاریخ کیوں کر ہم پلہ قرار دی جاسکتی ہیں؟ امام طبری نے نہ صرف رافضی و کذاب راویوں سے روایات قبول کی ہیں بلکہ واعدی وغیرہ کے رسائل کو بھی اپنی کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔

موصوف نے اپنی تاریخ میں واقعات کی اگرچہ ”اسناد“ بیان کی ہیں مگر اس کے آخری حصوں میں انہوں نے راویوں کے نام ظاہر کرنے سے گریز کیا ہے حالانکہ یہ واقعات خود ان کے زمانے کے یا اس سے کچھ پہلے کے ہیں اور ان واقعات کی اسناد زیادہ موثق اور معتبر ہوتیں۔ بہت ممکن ہے کہ سیاسی حالات مانع ہوں یا پھر علامہ طبری نے راویوں کی خواہش پر ان کے نام ظاہر کرنے سے گریز کیا ہو۔ ملاحظہ ہوتا تاریخ طبری حصہ اول تحت دیباچہ از شبیر حسین قریشی ص ۲۲۔ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی۔

علامہ طبری نے جن نزاعی و اختلافی امور میں علماء کے مابین شدید اختلاف تھا انہیں اپنی ”غیر جانب داری“ ظاہر کرنے کی خاطر یا پھر ہر فرقہ کو دلائل فراہم کرنے کے لئے ان تمام روایتوں کو یک جا کر کے اس طرح تدوین کی کہ خود راوی ہی اس واقعہ کی صحت کے ذمہ دار ہوں۔ موصوف کی نیت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ خود بھی کذابوں، جھوٹوں، رافضی اور شیعہ راویوں سے مروی واقعات کو نقل کر کے بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے کیونکہ اس طرز عمل نے ہر فرقہ کے لئے موا فراہم کر دیا ہے۔ اگر وہ چاہتے تو وہ خود راویوں کی چھان پھٹک کر کے اپنی کتاب کو صحیح واقعات تک ہی محدود رکھ سکتے تھے۔ مگر افسوس وہ ایسا نہیں کر سکے اور تحقیق، تنقید و تبصرہ کا کام مودودی صاحب جیسے حضرات کے لئے چھوڑ دیا تا کہ وہ صحابہ کرام کے خلاف زہر بھری روایتوں سے اپنی کتابوں کو زینت بنشتے رہیں۔

امام طبری اپنی کتاب کے آغاز میں اپنی ”صفائی“ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”اور ہماری اس کتاب میں ناظرین دیکھیں گے کہ میں نے جو کچھ یہاں تحریر کیا ہے اس پر اعتماد کیا ہے۔ اور یہ وہی اخبار ہیں جو مجھ سے روایت کئے گئے اور میں ان کا بیان کرنے والا ہوں یا وہ آثار جن کے راویوں کی اسناد میں نے جمع کی ہیں، غیر اس سے کہ عقلی دلیلوں سے ان کو سمجھا جائے یا غور و فکر سے استنباط کیا گیا ہو سوائے چند مقامات کے جبکہ اخبار ماضیین کا علم یا اپنے زمانے کی خبریں ان لوگوں سے پہنچی ہیں جنہوں نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا، نہ ان کے زمانے میں وقوع پایا بلکہ خبروں اور ناقولوں کے ذریعہ سے آئی ہیں اور ان میں عقلی استخراج یا فکری استنباط سے کام نہیں لیا گیا۔ اس لئے اگر میری اس کتاب میں کوئی ایسی خبر آئے جسے ہم نے اگلے لوگوں سے نقل کیا ہے اور جن کے تسلیم کرنے سے آج کا قاری باہر کرے یا وہ سامع کو چنبھے میں ڈال دے اس لئے کہ ان کی صحت معروف نہیں یا معنی میں حقیقت نہیں تو جان لینا چاہئے کہ اس میں (صحت یا صداقت) ہم سے پہلے سے ہی نہیں ہے اور بعض ناقولوں نے اسے ہم تک پہنچایا ہے اور ہم تک جس شکل میں یہ روایت پہنچی تھی ہم نے جوں کی توں بیان کر دی ہے۔“ (حوالہ مذکور ص ۲۴)

ممتاز کالم نگار جناب اوریا مقبول جان صاحب رقم طراز ہیں کہ:

”لیکن اگر تاریخ طبری کو ہی دیکھا جائے، جو زیر بحث ہے تو ڈاکٹر خالد طلال کبیر نے طبری کے اہم راویوں کا جائزہ لیا ہے جو ان کے نزدیک بارہ ہیں۔ یہ طبری کی تاریخ کا بنیادی ماخذ ہیں۔ ان بارہ میں سات وہ ہیں جن پر ائمہ جرح و تعدیل جھوٹے یا مہم بالکذب ہونے کا الزام لگاتے ہیں اور پانچ ثقہ راوی ہیں۔ اب یہ دروغ کو راویوں یعنی وہ جن پر جھوٹے ہونے کا الزام ہے ان کی روایتوں کی تعداد ملاحظہ کریں۔

محمد بن سائب کلبی (۱۲)، ہشام بن محمد بن سائب کلبی (۵۵)، محمد بن عمر واقدی (۴۴۰)، سیف بن عمر تمیمی (۷۰۰)، ابو جعفر لوط بن یحییٰ (۶۱۲)، بشام بن عدی (۱۶)، محمد بن اسحاق بن یسار کی (۱۶۴)، ان تمام کو ملا کر ۹۹۹ روایات بنتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں طبری نے سچے اور ثقہ راویوں کی صرف ۴۹ روایات کو تاریخ کا حصہ بنایا ہے۔

زبیر بن بکار (۸)، محمد بن سعد (۱۶۴)، موسیٰ بن عقبہ (۷)، خلیفہ بن خیاط (۱)، وہب بن منبہ (۴۶)، تاریخ طبری میں یہ ہے جھوٹے اور ثقہ راویوں کی روایتوں کا تناسب۔ حالت یہ ہے کہ عباسی حاکم معتضد باللہ کا رسالہ بغیر کسی چھان بینک کے تاریخ کا حصہ بنایا گیا جو خالصتاً ہوامیہ سے بغض و عناد اور قبائلی دشمنی کی بنیاد پر تحریر کیا گیا تھا۔

مہتمم بالکذب اور جھوٹے راویوں کی روایتیں طبری نے بلامد و کاست تحریر کر دیں اور کئی تو ایسی ہیں جن میں معمولی سی عقل بھی استعمال کی جاتی تو قصہ جھوٹا محسوس ہوتا۔ جیسے سیدہ زینبؓ والے واقعہ میں ایسے لگتا ہے جیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پہلی دفعہ دیکھا ہے جب کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بھینس ہیں۔ یہیں سے مؤرخ کی نیت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اس تاریخ میں اپنی مرضی کے افسانے جمع کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس تاریخ طبری کا جو نسخہ ہے وہ خوش قسمتی سے عربی میں ہے اور قاہرہ سے چھپا ہے اور جسے میں اپنی کمزور عربی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اور ترجمہ بھی دیکھتا ہوں۔ آپ حیران ہوں گے کہ طبری کی تفسیر کے رجال کا کام تو مصر کے محمود شا کرنے کیا ہے لیکن کسی نے آج تک تاریخ طبری کے رجال اور راویوں پر مفصل کام نہیں کیا۔ اس لئے اگر مسلمانوں کی تاریخ کے راویوں کی تحقیق کی جائے کہ ان میں کردار کے اعتبار سے جھوٹا کون تھا تو پھر آدھی سے زیادہ تاریخ جھوٹ کا پلندہ ثابت ہوگی۔

میرا معاملہ نہ طبری سے پر خاش کا ہے اور نہ ہی بلاذری اور ابن سعد سے۔ میرا دکھ یہ ہے کہ جس کسی نے میرے سلاف پر انگی اٹھائی ہو، میرے دین کے نقص بیان کرنا ہوں وہ ان مؤرخین کے جمع کئے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیتا ہے۔ الحاد کا دروازہ انہی کے جمع کئے گئے جھوٹ سے کھلتا ہے۔ آپ اسلام کے خلاف لکھی جانے والی تمام کتابوں کو اٹھالیں، تو بین رسالت پر مبنی کتب کا مطالعہ کریں اور ان میں کہیں نہ کہیں طبری اور اس کے قبیل کے مؤرخین جھانکتے نظر آئیں گے۔ وہ لوگ انہی کی روایات کو بنیاد بناتے ہیں۔ حیرت ہے وہ تمام ”شامیین رسول اللہ“ تو ایسی باتیں تحریر کرنے پر واجب القتل قرار دیئے جاتے ہیں اور جس مؤرخ نے یہ جھوٹ اکٹھا کر کے تاریخ کا حصہ بنایا وہ محترم۔ پتہ نہیں کیوں میرے ان صاحبانِ علم کرام کو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث یا نہیں آتی کہ ”کسی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے آگے سنا تا پھرے۔ کیا ہمارے مؤرخین نے ایسا نہیں کیا۔“ (روزنامہ ایکسپریس ۲/ ستمبر ۲۰۱۵ء زیر عنوان ”خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے“)

اور یا مقبول جان صاحب نے یہ لکھا ہے کہ: ”اگر تاریخ کے راویوں کی تحقیق کی جائے تو پھر آدھی سے زیادہ تاریخ جھوٹ کا پلندہ ثابت ہوگی“

جبکہ مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ ۹/۱۰ حصہ غیر معتبر ہوگا:

”بعض حضرات تاریخی روایات کو جانچنے کے لئے اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں فلاں راویوں کو عمرہ رجال نے مجروح قرار دیا ہے،... یہ باتیں کرتے وقت یہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ محدثین نے روایات کی جانچ پڑتال کے لئے یہ طریقے دراصل احکامی احادیث کے لئے اختیار کئے ہیں کیونکہ ان پر حلال و حرام فرض و واجب اور مکرمہ و مستحب جیسے اہم شرعی امور کا فیصلہ ہوتا ہے اور یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ دین میں کیا چیز سنت ہے اور کیا چیز سنت نہیں ہے۔ یہ شرائط اگر تاریخی واقعات کے معاملہ میں لگائی جائیں تو اسلامی تاریخی کے دو رباعہ کا تو سوال ہی کیا، قرن اول کی تاریخ کا بھی کم از کم ۹/۱۰ حصہ غیر معتبر قرار پا جائے گا۔“ (خلافت و ملوکیت ۳۱۷-۳۱۸)

جس تاریخ میں صحابہ کرامؓ کی توہین، تنقیص، تفسیق اور تکفیر تک پائی جاتی ہو اس تاریخ کے راویوں کی جانچ پڑتال، تحقیق و تدقیق اور اسماء الرجال کی کتابیں کھولنے سے آدھی (بقول اور یا صاحب) کیا نوے فیصد (بقول سید مودودی صاحب) کیا سو فیصد تاریخ کو بھی اگر، غیر معتبر قرار دے دیا جائے تو اس سے دین اسلام یا امت مسلمہ کو ذرہ برابر بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ تاریخ اسلام، سیرت النبیؐ اور حیات و مناقب صحابہ کرامؓ کو کتاب و سنت کی روشنی میں دنیا کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے اور بعض سکارلز نے بجا طور پر اس کا حق ادا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو حیات طیبہ۔ مسند احمد بن حنبل کی روشنی میں (۷۲۸-۷۲۹ صفحات)، سیرت طیبہ صحاح ستہ کی روشنی میں مؤلفہ مولانا محمد ابراہیم فیض، السیرۃ العالمیہ ششماہی جنوری، جون ۲۰۱۵ء ذوالاکیڈمی کراچی)

علاوہ ازیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور صحابہ کرامؓ کے مناقب کو صرف قرآن مجید کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ یہاں بات ساری تاریخ کے حوالے سے نہیں ہو رہی ہے بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے خلاف کذاب اور ضامین کی روایات کی تحقیق کے بارے میں ہو رہی ہے، پھر ایسی ضعیف اور موضوع روایات کو تاریخ کی کتابوں میں سے نکالنے کی بناء پر بھی نصف سے زیادہ حصہ یقیناً محفوظ رہے گا۔

مگر صد افسوس کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ایسی روایات کی تحقیق کی بھی اجازت نہیں دیتے اور اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ امت مسلمہ انہیں جوں کا توں قبول کر لے۔ ان کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمائیں:

”اگر یہ (طبری وغیرہ تاریخی کتابیں) قابل اعتماد نہیں ہیں تو ان کی بیان کی ہوئی خلافت راشدہ کی تاریخ اور ائمہ اسلام کی سیرتیں اور ان کے کارنامے سب اکاذیب کے دفتر ہیں جنہیں ہم کسی کے سامنے بھی وثوق کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے۔ دنیا کبھی اس اصول کو نہیں مان سکتی اور دنیا کیا، خود مسلمانوں کی موجودہ نسلیں بھی اس بات کو ہرگز قبول نہ کریں گی کہ ہمارے بزرگوں کی جو خوبیاں یہ تاریخیں بیان کرتی ہیں وہ سب صحیح ہیں مگر جو کمزوریاں یہی کتابیں پیش کرتی ہیں وہ سب غلط ہیں۔“ (خلافت و ملوکیت ص ۳۱۶-۳۱۷)

موصوف اس سے پہلے یہ لکھ آئے ہیں کہ:

”اگر کوئی شخص روایات کے ثبوت کے لئے وہ شرائط لگائے جو احکام شرعی کے معاملہ میں محدثین نے لگائی ہیں تو اسلامی تاریخ کا ۹۰ فیصد بلکہ اس سے بھی زیادہ دریا برد کر دینا ہوگا۔ (خلافت و ملوکیت ص ۱۰۷-۱۰۸ بحاشیہ)

خلافت راشدہ کی تاریخ، صحابہ کرامؓ و ائمہ اسلام کی سیرتیں اور ان کے کارناموں کو اکاذیب کے دفتر کسی نے نہیں کہا۔ اکاذیب کے دفتر تو وہ موضوع اور سہائی روایات و خرافات ہیں جنہیں امام طبری وغیرہ نے اپنی کتب کی ”زینت“ بنالیا ہے۔ موضوع روایات و اکاذیب کا تعلق صرف کتب تاریخ سے ہی نہیں، کتب حدیث بھی اس سے پاک نہیں ہیں

لیکن آج تک کسی محدث نے یہ تلقین نہیں کی کہ صحیح احادیث کے ساتھ ساتھ موضوع و ضعیف احادیث بھی قبول کر لی جائیں، بصورت دیگر کتب حدیث میں فضائل و مناقب صحابہ سے متعلق صحیح احادیث کو بھی رد کرنا ہوگا۔ یہ سب اکاذیب کے دفتر ہیں جنہیں ہم کسی کے سامنے بھی وثوق کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے۔ دنیا کبھی اس اصول کو نہیں مان سکتی اور دنیا کیا، خود مسلمانوں کی موجودہ نسلیں بھی اس بات کو ہرگز قبول نہ کریں گی کہ ہمارے بزرگوں کی جو خوبیاں یہ تاریخیں بیان کرتی ہیں وہ سب صحیح ہیں مگر جو کمزوریاں یہی کتابیں پیش کرتی ہیں وہ سب غلط ہیں۔ مگر اس کے برعکس خود محدثین کرام نے اسماء الرجال، موضوعات اور احادیث ضعیفہ پر مشتمل کتابیں تصنیف کر کے امت کی راہنمائی فرمائی ہے تاکہ صحیح اور غلط میں ہمیشہ امتیاز قائم رہے۔

امام ابن کثیر (۷۴۷ھ) اشکاف الفاظ میں اہل سنت کا موقف پیش فرماتے ہیں کہ:

”بہت سے مؤرخین مثلاً ابن جریر وغیرہ نے مجہول راویوں سے ایسی روایات بیان کی ہیں جو صحاح سے ثابت شدہ حقائق کے مخالف ہیں:

”قہی مردودة علی قائلہا و ناقلہا والہ اعلم والمظنون بالصحابہ خلاف ما یتوہم کثیر من الرافضة و اغبیاء القصاص، الذین لا تمیز عنہم بین صحیح الأخبار و ضعیفہا و مستقیمہا و سقیمہا و مبادی ہا و قویمہا“

یہ سب اپنے کہنے والوں اور نقل کرنے والوں کے منہ پر مار دی جائیں گی۔ واللہ اعلم۔ اور صحابہ کرامؓ سے حسن ظن بہت سے روافض اور احمق قصہ گو یوں کے ادہام باطلہ کے خلاف کا مقتضی ہے ان داستان کو یوں کو صحیح و ضعیف مضبوط و کمزور اور درست و نادرست روایتوں میں کوئی تمیز نہیں۔ (البدایہ والنہایہ ص ۷/۱۲۷)

مولانا مودودی صاحب صحابہ کرامؓ کے بجائے کذابوں، رافضیوں اور سہائیوں سے حسن ظن رکھتے ہوئے ان کی روایات کو سینے سے لگانے کی تلقین فرما رہے ہیں کہ جن کتب سے صحابہ کرامؓ کے کارنامے اور فضائل و مناقب بیان کئے جاتے ہیں تو ان ہی کتب میں

بیان کردہ ان کے مثالب و مناقب بھی تسلیم کرنا ہوں گے۔

حالانکہ موصوف اس سے پہلے یہ بھی لکھ آئے ہیں کہ:

”اس میں شک نہیں کہ تاریخ کے معاملے میں چھان بین، اسناد اور تحقیق کا وہ اہتمام نہیں ہوا ہے جو احادیث کے معاملے میں پایا جاتا ہے، لیکن یہ کہنا بھی تو مشکل ہے کہ ابن سعد، ابن عبد البر، ابن جریر، ابن حجر، ابن کثیر اور ابن اثیر جیسے لوگوں نے دو خلافت کے حالات نقل کرنے میں اتنی سہل انگاری اور بے احتیاطی برتی ہے کہ بالکل بے اصل باتیں اپنی کتابوں میں صحابہ کی طرف منسوب کر دیں۔

کیا وہ ان باتوں کو بیان کرتے وقت اس بات سے بے خبر تھے کہ ہم کن بزرگوں کی طرف یہ واقعات منسوب کر رہے ہیں؟“ (خلافت و لوکیٹ ص ۳۰۲)

یہی بات تو باعث صدمہ ہے کہ ان بزرگوں نے دو خلافت کے حالات بیان کرنے میں اتنی غفلت، بے احتیاطی اور سہل انگاری کا مظاہرہ کیوں کیا؟ انہوں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ ہم کذابوں اور سبائیوں و مجذوموں کی روایات اپنی کتابوں میں کیوں محفوظ کر رہے ہیں؟ مودودی صاحب اس عبارت میں اس حقیقت کو تسلیم کر رہے ہیں کہ ”اس میں شک نہیں کہ تاریخ کے معاملے میں چھان بین، اسناد اور تحقیق کا وہ اہتمام نہیں ہوا جو احادیث کے معاملے میں پایا جاتا ہے“ پھر انہیں معافیہ خیال آگیا کہ کہیں کوئی محقق ”چھان بین اور تحقیق“ کا کام شروع ہی نہ کر دے، اس لئے یہ باور کرادیا کہ تمہیں رحمت اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ اکابر اس بات سے بے خبر نہیں تھے کہ ہم یہ واقعات کن بزرگوں کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے خلاف موضوعات اور اکاذیب کے دفتر لگانے والے ابن جریر طبری وغیرہ کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہوئے مولانا مودودی صاحب یہاں صحابہ کرامؓ کے بارے میں اللہ تعالیٰ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور علماء امت کے واضح ارشادات کو نظر انداز کر کے مؤرخین کے اکاذیب قارئین سے منوارہے ہیں۔ فیا أسفا

موصوف نے یہاں ابن کثیر کا بھی حوالہ دیا ہے جبکہ ان کا قول اوپر نقل ہو چکا ہے کہ

ایسی روایات نقلین و قائلین کے منہ پر ماری جائیں گی اور یہی اہل سنت کا موقف اور صحیح اصول ہے کہ جو ”روایت“ صحابہ کرام کے بلند مقام کے مطابق ہوگی وہی قبول کی جائے گی اور جس میں ان کی توہین و تنقیص اور تحقیر و مذمت ہوگی وہ مردود ہوگی اور اس بات کا قطعاً لحاظ نہ کیا جائے گا کہ ان ”اکاذیب“ کو نقل کرنے والے ابن سعد (م ۲۳۶)، ابن جریر طبری (۳۱۰ھ)، ابن عبد البر (۴۶۳ھ)، ابن اثیر (۶۳۰ھ)، ابن کثیر (۷۴۴ھ)، ابن حجر (۸۵۲ھ) اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (م ۱۹۷۹ء) جیسے اکابر علماء ہیں۔

قاضی ابوبکر ابن العربی (م ۵۴۳ھ) نے کیا خوب فرمایا ہے کہ:

”فأقبلوا الوصية، ولا تلتفتوا إلا إلى ما صح من الأخبار، واجتنبوا أهل التاريخ فإنهم ذكروا عن السلف أخباراً صحيحةً يسيرةً يتوسلوا بذلك إلى رواية الأباطيل، ومن نظر إلى أفعال الصحابة تبين منها بطلان هذه الهتوك التي يختلقها أهل التاريخ فيلسونها في قلوب الضعفاء...“ (العصا ص ۲۵۹)

پس میری وصیت قبول کرو، اور صحیح روایات کے علاوہ کسی کی طرف توجہ مت کرو، اور اہل تاریخ سے بچو اور دور رہو کیونکہ انہوں نے سلف سے چند روایات اس مقصد کے لئے نقل کی ہیں تاکہ باطل اور موضوع روایات پھیلانے میں وسیلہ اور مدد مل سکے، اور جس کسی نے بھی صحابہ کرام کے خلاف مؤرخین کے وضع کردہ الزامات پر نظر دوڑائی ہے تو اس پر ان کا بطلان واضح ہو گیا اور جس کسی نے بھی صحابہ کرام کی طرف منسوب نامناسب اعمال و افعال کی طرف نظر دوڑائی ہے اس پر ان واقعات کا بطلان واضح ہو گیا ہے جنہیں مؤرخین نے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو گمراہ کرنے کی خاطر گھڑا ہے۔

علامہ موصوف مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”وقد بينت لكم انكم لا تقبلون على أنفسكم في دينار بل في درهم إلا عدلاً برئاً من التهم، سليمان من الشهوة، فكيف تقبلون في أحوال السلف و ماجرى بين الأوائل ممن ليس له مرتبة في الدين، فكيف في العدالة“ (العواصم من القواصم ص ۲۵۹)

میں تم سے بر ملا کہتا ہوں کہ جب تم اپنے خلاف دینا ر بلکہ درہم تک کا دعویٰ تسلیم نہیں کرتے جب تک کہ مدعی سچا اور تہمتوں سے بری اور خواہشات نفسانی سے محفوظ نہ ہو۔ تو تم احوال سلف اور مشاجرات صحابہؓ کے بارے میں ایسے آدمی کی بات کیسے مان لیتے ہو جس کا عدالت تو کجا دین میں بھی کوئی مقام نہیں۔

بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اگر بالفرض ان راویوں اور مؤرخوں کا دین و عدالت میں بلند مقام ہو، خواہشات نفسانی سے محفوظ ہوں، تہمتوں سے بری ہوں اور ثقہ و صادق ہوں تو پھر بھی صحابہ کرامؓ کی توہین و تنقیص پر مبنی ان کی منقولہ روایات ان کے منہ پر مادی جائیں گی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک ”امساك و كف لسان“ پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) صحابہ کرامؓ بالخصوص حضرت حکم بن ابی العاصؓ پر مؤرخین کے عائد کردہ الزامات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وَأَمَّا قِصَّةُ الْحَكَمِ فَعَامَةٌ مِنْ ذِكْرِهَا أَمَّا ذِكْرُهَا مَرْسَلَةٌ، وَقَدْ ذَكَرَهَا الْمُؤَرِّخُونَ الَّذِينَ يَكْثُرُ الْكَذِبُ فِيمَا يَرَوْنَهُ، وَقُلْ أَنْ يَسْلَمَ لَهُمْ تَقْلِيلُهُمْ مِنَ الزِّيَادَةِ وَالنَّقْصَانِ...“ (منہاج السنۃ الجزء الثالث ص ۱۹۶ - طبع بیروت)

جہاں تک حضرت حکمؓ کے قصے کا تعلق ہے تو عام مؤرخین نے اسے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔ اور یہ ناقل مؤرخین اپنی روایات میں بکثرت جھوٹ بولتے ہیں اور ان کی منقولہ روایات کمی بیشی سے کم ہی محفوظ ہوتی ہیں۔

موصوف ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ:

”وَأَمَّا هُوَ مِنْ جَنْسِ نَقْلَةِ التَّوَارِيخِ الَّتِي لَا يَعْتَمِدُ عَلَيْهَا قَوْلُوا الْأَبْصَارِ“ (حوالہ مذکور ص ۳۲۲)

یہ قصہ محض تاریخی منقولات میں سے ہے جس پر ارباب بصیرت اعتماد نہیں کرتے۔

امام ابن کثیرؒ (م ۷۴۴ھ) اسی طرح کی ایک روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”فَكَذِبٌ وَبُهْتَانٌ وَافْتِرَاءٌ عَظِيمٌ يَلْزَمُ مِنْهُ خَطَأٌ كَبِيرٌ مِنْ تَخْوِينِ الصَّحَابَةِ... وَكُلُّ مُؤْمِنٍ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ يَتَحَقَّقُ أَنَّ دِينَ الْإِسْلَامِ هُوَ الْحَقُّ، يَعْلَمُ بَطْلَانُ هَذَا الْاِفتِرَاءِ لِأَنَّ الصَّحَابَةَ كَانُوا

خَيْرُ الْخَلْقِ بَعْدَ الْأَنْبِيَاءِ، وَهُمْ خَيْرُ قُرُونٍ هَذِهِ الْأُمَّةِ الَّتِي هِيَ أَشْرَفُ الْأُمَمِ بِنَصِّ الْقُرْآنِ وَاجْتِمَاعِ السَّلَفِ وَالْخَلْفِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلِلَّهِ الْحَمْدُ۔ (الہدایہ و النہایہ جلد ۱ ص ۲۲۲-۲۲۵)

یہ صریح جھوٹ، بہتان اور افتراء عظیم ہے۔ اس سے ایک بہت بڑی خطا یعنی صحابہ کرامؓ کی خیانت لازم آتی ہے اور اللہ اور رسول اور دین اسلام کی حقانیت پر ہر ایمان لانے والا بخوبی جانتا ہے کہ یہ افتراء باطل ہے۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ، حضرات انبیاءؑ کے بعد ساری مخلوق سے افضل ہیں، وہ اس امت کے خیر القرون ہیں جو نص قرآنی اور باجماع سلف و خلف دنیا و آخرت میں تمام امتوں سے اشرف ہیں۔ والحمد للہ۔

علامہ سید محبت الدین الخطیب (م ۱۳۹۰ھ) ”تاریخی ورثہ“ سے متعلق اپنی تحقیق کا نچوڑ یوں پیش کرتے ہیں کہ:

”وقد وصلت إلينا هذه التركة لا على أنها هي تاريخنا بل على أنها مادة غزيرة للدرس والبحث يستخرج منها تاريخنا“ (العصا ص ۱۷۷)

تحقیق ہم تک جو یہ ”تاریخی“ ورثہ و ترکہ پہنچا ہے وہ اس لئے نہیں کہ ہماری تاریخ ہے بلکہ بحث و تدقیق کے لئے صحیح و سقیم اور رطب و یابس روایات کا ایک ڈھیر ہے جس سے ہماری تاریخ کا استخراج کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں تاریخی ہفوات و مکند بات کے برعکس جب کتاب و سنت کی قطعی نصوص سے صحابہ کرامؓ کی صداقت و عدالت اور عظمت و انصافیت ثابت ہوگئی تو کسی مؤرخ یا مصنف، فلسفی و متکلم، شاعر و ادیب، واعظ و ذاکر اور مولوی و صوفی کی افتراء پر دازی سے ان کی عظمت و جلالت پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ مولانا مودودی صاحب کو ایک طرف یہ فکر لاحق تھی کہ اگر کتب تاریخ میں بھی تحقیق اور چھان بین سے کام لیا گیا تو اس کا ۹۰ فیصد سے زائد حصہ دریا برد کر دینا پڑے گا۔ اور کہتے ہیں کہ اس تحقیق اور چھان بین کی زحمت کی بھلا ضرورت بھی کیا ہے کیونکہ مؤرخین نے دو خلافت کے حالات نقل کرنے میں بے احتیاطی و بھل نگاری سے کام نہیں لیا کہ انہوں نے بے اصل باتیں صحابہؓ کی طرف منسوب کر دیں اور نہ ہی وہ ان باتوں کے بیان

کرتے وقت اس بات سے بے خبر تھے کہ ہم کن بزرگوں کی طرف یہ واقعات منسوب کر رہے ہیں۔

جبکہ دوسری طرف موصوف ”کنز الدقائق“ ہدایہ و عالم گیری“ جیسی کتابوں کو بھی بار خاطر میں نہیں لاتے چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

”تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو۔ اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق، ہدایہ اور عالم گیری کے مصنفین کے دامنوں میں پناہ مل سکے گی“ (حقوق الزوجین ص ۹۶) مناظر اسلام علامہ عبدالستار تونسوی (م ۱۴۱۲ھ) ان ”ریمارکس“ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ”اس شخص نے صحابہ کرامؓ کے خلاف و اقدی، طبری وغیرہ انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کیوں کافی سمجھا اور کیسے یہ امید کی کہ قیامت میں طبری اور و اقدی وغیرہ کے دامن میں پناہ مل سکے گی؟ علاوہ ازیں جو لوگ مودودی صاحب کی کتابوں اور بالخصوص خلافت و ملکیت کو کافی سمجھ رہے ہیں ان کو قیامت میں مودودی صاحب کے دامن میں کیسے پناہ مل سکے گی۔“

سوچنے کی بات ہے جو شخص ہدایہ، کنز الدقائق و عالم گیری جیسی دینی، قرآن و حدیث کی ترجمان کتابوں کے متعلق تو لکھ دیتا ہے کہ ان کو ہاتھ لگانا قرآن کو ہاتھ نہ لگانا ہے جس کے باعث قیامت میں ان کے مصنفین کے دامنوں میں پناہ نہ مل سکے گی۔ اب معلوم نہیں کہ اس کو صحابہ کرامؓ کے خلاف طبری، و اقدی، ابن سعد، ابوالحداد، ابن ابی الحدید، المسعودی وغیرہ کی مخالف کتاب و سنت سہائی روایات کی تصحیح و توثیق کرنے کے بعد ان کے مصنفین کے دامنوں میں کیسے پناہ مل سکے گی؟ و ایلٰی اللہ العلیٰ۔ (مودودی صاحب کے صحابہ کرام پر بے بنیاد و رکیک الزامات کا مدلل جواب ص ۱۰۵، ۱۲۱)

صد افسوس کہ مولانا مودودی صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات نے طبری کی بے اصل و بے بنیاد اور کذب و افتراء پر مبنی روایات پر اعتماد کر کے صحابہ کرامؓ بالخصوص حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی کردار کشی تو قبول کر لی مگر ان سہائی، رافضی، دروغ گو اور کذاب راویوں پر ”حرف“ نہ آنے دیا۔

مولانا مودودی صاحب کے ترجمان ملک غلام علی صاحب ان کذاب راویوں کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”عجیب بات ہے کہ جب سے خلافت و ملکیت لکھی گئی ہے ہر شخص کتب رجال کے فتر لے کر بیٹھ گیا ہے اور ایک ایک روایت کے راویوں کے حالات بنا رہا ہے کہ وہ ایسا تھا اور ایسا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کتب تواریخ کا مطالعہ کرنا چاہے وہ پہلے اپنے پاس لسان المیزان، تہذیب الہند، کتاب الجرح والتعديل وغیرہ کی ضخیم مجلدات رکھے اور پھر ہر روایت کے رجال کی چھان بین ان کتابوں میں کرتا رہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتب رجال تحقیق حدیث کے لئے مدون کی گئی ہیں اور ان کی تجریحات کو تاریخی روایات اور ان کے راویوں پر چسپاں کرنا اصولاً صحیح نہیں۔ (خلافت و ملکیت پر اعتراضات کا تجزیہ ص ۱۱۲-۱۱۶)

مولانا مودودی صاحب کو تو یہ خدشہ لاحق تھا کہ اگر روایات حدیث کی طرح تاریخی واقعات کی بھی چھان بین کی گئی تو پھر کتب تاریخ کا ۹۰ فیصد سے زائد حصہ دریا برد ہو جائے گا جبکہ ان کے ترجمان جناب ملک صاحب نے کتب رجال کی روشنی میں تاریخی واقعات اور ان کے راویوں کے حالات کی چھان بین اور تحقیق کو اصولاً غلط ٹھہرا دیا کیونکہ کتب رجال تحقیق حدیث کے لئے مدون کی گئی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ جھوٹوں، افتراء پر دازوں اور کذابوں کا اس سے بہتر دفاع نہیں کیا جاسکتا۔

یہ کیسا اصول ہے کہ حدیث کے معاملے میں تو ایک کذاب کی روایت رد کر دی جائے لیکن صحابہ کرامؓ کی توہین پر مشتمل اس کی تاریخی روایات قبول کر لی جائیں؟ یعنی حدیث کے معاملے میں تو وہ راوی جھوٹا ہے لیکن صحابہؓ کے معاملے میں وہ ”کذاب“، ثقہ و صادق بن گیا ہے۔ یہ ہے بغضِ صحابہ کا کرشمہ۔

رُواة طبری

امام طبری کا اپنا ”مسلک“ بالتفصیل پیچھے گزر چکا ہے کہ انہوں نے اپنے ”تشیع، رفض اور عقیدہ موالا“ کی بناء پر ”مخاربین حضرت علیؑ“ بالخصوص ”حضرت معاویہؓ“ کے خلاف بغض و عناد کو ”تقیہ“ کے پردے میں چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ رافضیوں اور کذابوں کی جھوٹی روایات کو اپنی تفسیر اور تاریخ میں جانچا نقل کر کیا علانیہ طور پر بھی اپنا رفض و تشیع ظاہر کر دیا۔ یہاں امام طبری کے حسب ذیل چند راویوں اور ”شیوخ“ کا مختصر ذکر ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے۔

- | | |
|------------------------------|------------------------|
| ۱۔ شعیب بن ابراہیم الکوفی | ۲۔ سیف بن عمر |
| ۳۔ سلمۃ اللامرش | ۴۔ محمد بن اسحاق |
| ۵۔ عبد الرحمن بن زید بن اسلم | ۶۔ مقاتل بن سلیمان |
| ۷۔ سدی کبیر | ۸۔ سدی صغیر |
| ۹۔ محمد بن السائب کلبی | ۱۰۔ عطیہ العوفی الکوفی |
| ۱۱۔ ابو جعفر لوط بن یحییٰ | ۱۲۔ ہشام کلبی |
| ۱۳۔ محمد بن عمرو اقدی | ۱۴۔ محمد بن حمید رازی |

۱۔ شعیب بن ابراہیم الکوفی

حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۴م) لکھتے ہیں کہ:

”شعیب بن ابراہیم الکوفی: راویہ کتب سیف عنہ، فیہ جہالۃ۔ ذکرہ ابن عدی: وقال لیس بالمعروف، وله أحادیث و أخبار، و فیہ بعض النکرۃ، و فیہا ما فیہ تحامل علی السلف۔“

وفی ثقات ابن حبان: شعیب بن ابراہیم من أهل الکوفۃ، یروی عن محمد بن أبان البلخی، روی عنہ یعقوب بن سفیان، فیحتمل أن یکن هو والظاهر أنه غیرہ۔“ (لسان المیزان فی اسماء الرجال الجزء الثالث ص ۱۴۵۔ تحت ۵۱۷)

امام ذہبی (م ۴۸۸ھ) نے ”میزان الاعتدال“ میں شعیب بن ابراہیم کو فی کا مختصر ترجمہ لکھا ہے کہ: یہ سیف (جن کا تعارف آگے آ رہا ہے) کی کتابوں کے راوی تھے۔ ان میں جہالت ہے یعنی بھول الحال شخص ہیں۔

اس کے بعد علامہ ابن حجر عسقلانی ابن عدی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

یہ غیر معروف راوی ہیں البتہ کچھ تاریخی روایتیں اور احادیث ان سے مروی ہیں جن میں نکارت اور نا باتیں پائی جاتی ہیں۔ نکارت اور نا باتوں کے علاوہ ان کی حدیثی اور تاریخی روایات میں سلف اور صحابہ کرامؓ پر انتہائی رکیک حملے بھی ہیں۔

اس ”اشارے“ سے شعیب بن ابراہیم کا مسلک و نظر یہ بھی بخوبی معلوم ہو جاتا ہے اور ”کوفی“ ہونا اس پر مستزاد ہے۔

علاوہ ازیں یہ الفاظ بھی غور طلب ہیں کہ: ”وفیہا ما فیہ“۔ ”فیہا“ میں مؤنث کی ضمیر تاریخی روایات اور واقعات کی طرف راجع ہے جبکہ ”فیہ“ میں مذکر کی ضمیر خود شعیب بن

امراہیم کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی اس کی روایات میں بھی سلف (صحابہ کرامؓ) کی توہین پائی جاتی ہے اور وہ خود بھی صحابہ کرامؓ کے ساتھ تعصب کی بناء پر حملے کرتا رہتا ہے۔

علامہ ابن حجر اسی ”ترجمہ“ میں ابن حبان کی کتاب ”الثقات“ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شعیب بن ابراہیم اہل کوفہ میں سے ہیں۔ وہ محمد ابان بخنی سے روایت کرتے ہیں۔ اور ان سے یعقوب بن سفیان نے روایت کی ہے۔ پس اس بات کا احتمال ہے کہ یہ شعیب بن ابراہیم وہی ہوں مگر حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ یہ ان (ابن حبان والے شعیب بن ابراہیم) کے سوا کوئی دوسرے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ سیف سے روایت کرنے والے شعیب بن ابراہیم اور ابن حبان کے شعیب دونوں کوفی ہیں۔ امام ابن حبان نے تو یہ احتمال ظاہر کر دیا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ شعیب بھی وہی ہو جو سیف سے روایت کرتا ہے۔ جبکہ علامہ ابن حجر نے واضح طور پر کہا ہے کہ یہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا ہے۔

لیکن یہاں تاریخ طبری کے ”رواۃ“ میں زیر بحث راوی تو وہی ہے جو غیر معروف اور مجہول الحال ہے اور سیف سے روایت کرتا ہے جس کی روایات میں نکارت اور نا روا باتوں کے علاوہ صحابہ کرامؓ پر رکیک حملے بھی پائے جاتے ہیں۔ شعیب بن ابراہیم کوفی کے اس سے زیادہ حالات سے ائمہ رجال بے خبر ہیں۔

۲۔ سیف بن عمر

سری بن مکی (یا سری بن اسماعیل الکوفی) اور شعیب بن ابراہیم الکوفی کے بعد امام طبری کی ”سند“ میں ایک راوی ”سیف بن عمر“ بھی تشریف فرما ہیں۔ علامہ ابن حجر عسقلانی ان کی شان میں ائمہ رجال وحدیث کے بیان کردہ تعارفی کلمات یوں بیان کرتے ہیں کہ:

”ساقط، ضعیف الحدیث، متروک الحدیث، ذاہب، لیس بشتی، غیر ثقہ، منکر الحدیث، روی الموضوعات، یضع الحدیث، اتهم بالزندقة“ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ ”هو كالواقدي و روی عن جابر الجعفی و خلق كثير من المجہولین“ (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۵۵)

امام ذہبی نے ”سیف بن عمر“ کا کس قدر مختصر مگر جامع تعارف کرایا ہے کہ وہ واقدی کی مثل ہے اور جابر جہمی اور بہت سے مجہول راویوں سے روایت کرتا ہے۔ واقدی کے حالات آگے آ رہے ہیں۔

امام ابو حاتم نے کہا: ”متروک الحدیث، یشبه حلیثہ حدیث الواقدی“ سیف بن عمر متروک الحدیث ہے اس کی روایت واقدی کی روایت کے مشابہ ہے۔ مکی بن معین کہتے ہیں: ”قلس خیر منه“ وہ ایک پیسہ میں بھی ”کھوٹا“ ہے۔ امام ابو داؤد نے کہا: ”لیس بشتی“ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ابن نمیر اور دوسرے محدثین کہتے ہیں: ”یضع الحدیث و اتهم بالزندقة“ وہ احادیث وضع کرتا تھا اور اس پر ”زندقی“ ہونے کی تہمت بھی لگائی جاتی تھی۔ نیز اسے کلبی سے بھی شرف تلمذ حاصل ہے۔ علا حظہ میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۵۵، تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۹۵-۲۹۶

امام ابن حبان (۳۵۴ھ) فرماتے ہیں کہ: سیف بن عمر ثقہ راویوں کی سند سے

موضوع اور من گھڑت روایات نقل کرنے کے علاوہ ”زندقہ“ سے بھی متہم تھے۔ (ملاحظہ ہو: البحر وحین من الحدیث جلد اول ص ۴۳۹۔ تحت ترجمہ نمبر ۴۳۸۔ مطبوعہ حلب مصر ۱۹۵۳ء) امام حاکم سیف بن عمر کے متعلق لکھتے ہیں کہ: زندقہ سے متہم اور ساقط الاعتبار ہے۔ (المدخل الی الصحیح ص ۱۴۵۔ مطبوعہ مؤسسة الرسالة۔ بیروت ۱۹۸۴ء)

سخت تعجب ہے کہ مولانا مودودی صاحب واقدی اور سیف بن عمر کے اس ”کردار“ سے آگاہ ہونے کے باوجود اس بات پر مصر ہیں کہ مغازی اور تاریخ میں ان کی روایات قابل قبول ہیں چنانچہ موصوف فرماتے ہیں کہ:

”خاص طور پر واقدی اور سیف بن عمر اور ان جیسے دوسرے راویوں کے متعلق ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال نقل کر کے بڑے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حدیث ہی نہیں، تاریخ میں بھی ان لوگوں کا کوئی بیان قابل قبول نہیں ہے لیکن جن علماء کی کتابوں سے ائمہ جرح و تعدیل کے یہ اقوال نقل کئے جاتے ہیں انہوں نے صرف حدیث کے معاملے میں ان لوگوں کی روایات کو رد کیا ہے۔ رہی تاریخ، مغازی اور میر تو ان ہی علماء نے اپنی کتابوں میں جہاں کہیں ان موضوعات پر کچھ لکھا ہے وہاں وہ بکثرت واقعات ان ہی لوگوں (واقدی اور سیف بن عمر) کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔“ (خلافت و ملوکیت ص ۳۱۸)

موصوف نے یہاں جن علماء (امام ابن کثیر اور علامہ ابن حجر) کا حوالہ دیا ہے کہ وہ ”غزوات اور تاریخی واقعات کی تشریح کرتے ہوئے واقدی اور سیف بن عمر اور ایسے ہی دوسرے محروح راویوں کے بیانات بے تکلف نقل کرتے جاتے ہیں“ اگر موصوف کذاب اور محروح راویوں سے صحابہ کرام کی کردار کشی پر مبنی خرافات اور غزوات اور تاریخی واقعات نقل کرنے میں کوئی فرق و امتیاز محسوس کر لیتے تو انہیں اس کردار کے حامل راویوں کی ”صفائی“ پیش کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ ہوتی۔

سیدنا عثمان اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما کے قاتلین کی معنوی ذریت نے صحابہ کرامؓ کے خلاف روایات اور قصے گھڑ گھڑ کر خوب پھیلائے جنہیں بنو امیہ کے خلاف تعصب میں بری طرح بتلا امام طبری نے بلا تحقیق اپنی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔

۳۔ سلمۃ الابرش

امام طبری کے ایک راوی سلمہ بن فضل الابرش ہیں جو ”رے“ کے قاضی رہے ہیں۔ امام بخاری (۲۵۶ھ) فرماتے ہیں کہ ”عندہ مناکیر“ ان کے پاس منکر احادیث ہیں۔ امام علی بن المدینی فرماتے ہیں:

”زمینا بحديثه قبل أن نخرج من رى“

ہم نے ”ری“ سے نکلنے سے پہلے ہی ان کی حدیثیں پھینک دی تھیں۔

امام ابن معین نے ان کے ”تشیع“ کی بھی تصریح فرمائی ہے۔

(ملاحظہ ہو: التاريخ الكبير۔ الجزء الرابع ص ۸۴، میزان الاعتدال۔ الجزء الثاني ص ۱۹۲)

حافظ ابن عدی فرماتے ہیں کہ:

”فی حدیثه بعض المناکیر... وله إفرادات و غرائب“

سلمہ کی احادیث، منکر، افرادات اور غرائب ہوتی ہیں۔

(الکامل فی ضعفاء الرجال۔ الجزء الرابع ص ۳۶۹)

۴۔ محمد بن اسحاق

امام المغازی محمد بن اسحاق کو بعض ائمہ رجال نے ”صدوق وثقة“ قرار دیا ہے لیکن اکثر محدثین نے انہیں مجروح قرار دیا ہے کہ یہ ”بزرگ“ مدلس و شیعہ تھے۔ ہشام بن عروہ بن زبیرؓ نے ان کی تکذیب کی ہے۔ امام یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں ”میں نے اللہ کے لئے ان سے روایت لیا ترک کر دیا ہے“ (الکامل فی ضعف الرجال - الجزء السابع ص ۲۵۶) امام جوزجانی لکھتے ہیں کہ:

لوگ اس کی روایات پر فریفتہ ہیں حالانکہ یہ کئی قسم کی بدعات سے متہم تھا۔

(احوال الرجال - ص ۱۳۲ - ترجمہ ۲۳)

امام دارقطنی فرماتے ہیں: قابل احتجاج و استدلال تو نہیں البتہ اس کی روایت شاذ و اعتبار کے طور پر لکھی جاسکتی ہے۔ (سوالات البرقانی: ص ۵۸ - ترجمہ ۴۲۲) امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدر نے محمد بن اسحاق پر خوب جرح کرتے ہوئے اسے ”دجال من الدجاجلة“ تکس قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: احسن الکلام جلد ۲ ص ۷۸-۷۹) مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ:

”امام زہری کے دروازہ پر دربان مقرر تھا کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے نہ آئے لیکن محمد بن اسحاق کو عام اجازت تھی کہ جب چاہیں چلے آئیں۔ ان کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی نسبت محدثین میں اختلاف ہے۔ امام مالک ان کے سخت مخالف ہیں لیکن محدثین کا فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایتیں استناد کے قابل ہیں... علامہ ذہبی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق، یہود و نصاریٰ سے روایت کرتے تھے اور ان کو ثقہ سمجھتے تھے ۱۵۱ھ میں وفات پائی۔“ (سیرت النبی جلد اول ص ۵۱)

۵۔ عبدالرحمن بن زید بن اسلم

عبدالرحمن بن زید بن اسلم العدوی المدنی (م ۱۸۲ھ) کے متعلق امام ابن جوزی نے کہا ہے کہ: ”أجمعوا علی ضعفه“ ان کے ضعف پر اجماع ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ: ”ضعفه علیٰ جلد“ علی بن المدینی نے ان کو سخت ضعیف کہا ہے۔ امام نسائی، امام احمد اور امام ابو زرعد نے بھی ان کی تضعیف کی ہے۔ امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ زید بن اسلم کے تمام بیٹے ضعیف ہیں۔

امام ابن خزمیہ فرماتے ہیں: ”لیس هو ممن یحتج أهل العلم بحديثه، لسوء حفظه، وهو رجل صناعته العبادة والتقشف“ وہ ان لوگوں میں سے نہیں جن کی حدیث سے اہل علم استدلال کر سکیں کیونکہ ان کا حافظہ کمزور تھا۔ ان کا اصل کام عبادت و زہد ہے۔ امام ابن حبان فرماتے ہیں: ”كان یقلب الاخبار وهو لا یعلم، حتی کثر ذلک فی روايته من رفع المراسیل و بإسناد الموقوف فاستحق الترك“ وہ روایت کو لاشعوری طور پر پلٹ دیتے تھے یہاں تک کہ ان کی مراسیل میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ مرسل کو مرفوع بنا دیا اور موقوف کو مسند کر دیا لہذا وہ چھوڑ دینے کے قابل ہیں۔

امام طحاوی فرماتے ہیں: ”حدیثہ عند أهل العلم بالحديث فی النہایۃ من الضعف“ علمائے حدیث کے نزدیک ان کی احادیث انتہائی ضعیف ہیں۔ امام حاکم ابن زید بن اسلم کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

”روی عن أبيه أحادیث موضوعة، لا یخفی علی من تأملها من أهل الصنعة أن الحمل فیها علیہ“ (المدخل إلی الصحیح ص ۱۵۴)

”اس نے اپنے والد (کے نام) سے موضوع احادیث روایت کی ہیں اور اس فن سے شغف رکھنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں کہ اس کی تمام ترمذی داری خود اس پر ہی پڑتی ہے۔“ امام شافعی فرماتے ہیں کہ: ایک شخص نے عبدالرحمن بن زید بن اسلم سے پوچھا: کیا تم نے اپنے والد سے یہ روایت سنی ہے کہ حضرت نوح کی کشتی نے بیت اللہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھی؟ اس نے جواب دیا: ہاں میں نے یہ روایت سنی ہے۔ اس کے علاوہ امام مالک، امام ابن معین، امام ابن سعد، ابو نعیم اور جوزجانی سے بھی عبدالرحمن بن زید بن اسلم پر سخت جرح منقول ہے۔ ملاحظہ ہو: التاريخ الکبیر جلد ۳ ص ۲۸۴، تہذیب العہد یب جلد ۶ ص ۱۷۹ تا ۱۸۰، میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۵۱۴۔

۶۔ مقاتل بن سلیمان

ابوالحسن مقاتل بن سلیمان بن بشیر ازدی خراسانی بلخی (م ۱۵۰ھ) ایک تفسیر لکھنے کی وجہ سے مفسر کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کی تفسیری روایات اور اقوال تفسیر طبری کی وساطت سے کتب تفسیر میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اکثر محدثین اور ائمہ رجال نے انہیں مجروح اور ناقابل اعتبار بتایا ہے۔ امام وکیع فرماتے ہیں: ہمارا ارادہ ہوا کہ ہم سفر کر کے مقاتل کے پاس جائیں لیکن وہ خود ہی ہمارے شہر میں آ گئے۔ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر ہم نے انہیں کذاب پایا، اس لئے ان سے کچھ نہیں لکھا۔ امام جوزجانی ان کے بارے میں کہتے ہیں: ”کان کذابا جمورا“، یعنی بڑا ہی ڈھیٹ کذاب ہے، ”دجال جمور“ یعنی دیر دجال کہا ہے۔ امام ابن معین فرماتے ہیں: ”لیس بشی، لیس بشفہ، وہ کچھ بھی نہیں عمرو بن علی فلاں، امام ابو حاتم اور امام علی فرماتے ہیں: ”متروک الحدیث“ وہ متروک الحدیث ہے۔ امام ابن سعد کہتے ہیں: ”اصحاب الحدیث یثقون حدیثہ و ینکرونہ“ علمائے حدیث اس کی حدیث سے اجتناب کرتے ہیں اور اسے منکر سمجھتے ہیں۔

عبدالرحمن بن حکم کہتے ہیں: وہ قصہ کو تھا، لوگوں نے اس کی حدیثیں ترک کر دی ہیں۔ امام نسائی نے اسے کذاب قرار دیا ہے اور ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی حدیثیں گھڑ کر منسوب کرنے والے چار آدمی بہت مشہور ہیں ان میں سے ایک مقاتل بھی ہیں۔ امام دارقطنی لکھتے ہیں ”وہ جھوٹ بولتے ہیں“۔ امام حاکم لکھتے ہیں ”لیس بالقوی عندهم“ وہ علماء کے نزدیک قوی نہیں ہیں۔

عبدالصمد بن عبدالوارث کہتے ہیں کہ: مقاتل ہمارے پاس آئے اور ہمیں عطاء کے واسطے سے کچھ حدیثیں سنانے لگے۔ پھر وہی حدیثیں ضحاک کے واسطے سنائیں پھر وہی حدیثیں عمر بن

شعیب کے واسطے سنائیں۔ ہم نے ان سے کہا: یہ روایات آپ نے کس سے سنی ہیں؟ تو پہلے تو انہوں نے کہا ان سب سے سنی ہیں مگر پھر کہنے لگے: نہیں اللہ کی قسم مجھے یا انہیں کس سے سنی ہیں؟ امام بخاری فرماتے ہیں: ”لا شیئ البتہ“ وہ ہرگز کوئی شئی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں مقاتل بن سلیمان عقائد کے اعتبار سے فرقہ مجسمہ میں سے تھے یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار دیتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے لئے اعضاء وغیرہ کے قائل تھے۔ عباس بن مصعب مروزی کہتے ہیں: مقاتل ابن سلیمان اصلاً ”بلخ“ کے باشندے تھے پھر ”مرد“ میں آگئے یہاں انہوں نے جامع مسجد میں قصہ کوئی شروع کر دی۔ یہیں پر ان کے اور جہم بن صفوان (بانی فرقہ جہمیہ) کے درمیان مباحثے شروع ہو گئے چنانچہ انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف کتابیں لکھیں۔

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں:

ہمارے یہاں مشرق کی جانب سے دو بڑے ضعیف نظریات گھس آئے ہیں ایک جہم کا نظریہ جو معتزلہ میں سے تھا اور ایک مقاتل کا نظریہ جو مشبہ میں سے تھا۔ نیز جہم نے نفی صفات میں غلو سے کام لیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو کالعدم بنا دیا اور مقاتل نے اثبات صفات میں غلو کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق کے مشابہ قرار دے دیا۔

امام ذہبی لکھتے ہیں کہ: ”مقاتل بن سلیمان البلخی، المفسر: ہالک کذبہ و کعب والنسائی“ مقاتل بن سلیمان بلخی مفسر تباہ حال ہے، کعب اور نسائی نے اسے کذاب کہا ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ”کذبہ و ہجر وہ و رمی بالتجسیم“ علماء نے ان کی تکذیب کی ہے، ان کی روایات کو چھوڑ دیا ہے اور ان پر فرقہ مجسمہ میں سے ہونے کا الزام بھی ہے۔

مقاتل بن سلیمان کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو: التاريخ الكبير للبخاري جلد ۲ ص ۱۴۰ تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۸۲ تا ۲۸۵ - تقریب التہذیب جلد ۲ ص ۲۷۲ - میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۱۷۳، المغنی فی الصغفاء للذہبی جلد ۲ ص ۶۷۵ - احوال الرجال، جوزجانی ترجمہ ۲۰۲ - علوم القرآن مؤلفہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی ص ۲۸۹ تا ۲۹۳۔

۷۔ سہی کبیر

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ:

ابو محمد اسماعیل بن عبد الرحمن بن ابی کریم السہی الکوفی (م ۱۲۷ھ) کو ”السہی الکبیر“ کہا جاتا ہے اور تفسیر کی کتابوں میں جب صرف ”سہی“ لکھا جاتا ہے تو عموماً یہی مراد ہوتے ہیں۔ ان کو ”سہی“ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کوفہ کی جامع مسجد کے دروازے پر ایک چبوترہ سا تھا یہ اس پر بیٹھ کر اونٹنیوں کی تجارت کیا کرتے تھے۔ دروازے کے ایسے چبوترے کو عربی میں ”سہی“ کہتے ہیں اس لئے ان کو ”سہی“ کہا جانے لگا۔

ان کو تفسیر قرآن کی درس و تدریس کا خاص ذوق تھا چنانچہ تفسیر کی کتابیں ان کے اقوال اور روایات سے بھری ہوئی ہیں البتہ علم تفسیر اور روایات کے معاملہ میں یہ کس حد تک قابل اعتماد ہیں، اس مسئلہ میں محققین کی آراء مختلف ہیں۔ بعض حضرات نے ان کی توثیق کی ہے مثلاً حضرت یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں: ”لا بأس بہ، ما سمعت أحداً یذکرہ الا بخیر“ ان کی روایات میں کوئی حرج نہیں، میں نے جس کسی کو ان کا ذکر کرتے ہوئے سنا، ذکر خیر کرتے ہوئے سنا۔ پھر موصوف امام احمد، امام ابن عدی، امام عجل، امام نسائی، امام بخاری کی توثیق نقل کر کے لکھتے ہیں کہ:

اس کے برخلاف دوسرے بہت سے علماء نے ان پر جرح بھی فرمائی ہے مثلاً امام شعبیؒ سے کسی نے کہا کہ ”ان السہی قد اعطی حظاً من علم القرآن“ سہی کو قرآن کریم کے علم کا بڑا حصہ ملا ہے اس کے جواب میں امام شعبیؒ نے فرمایا: ”اعطی حظاً من جہل بالقرآن“ ان کو قرآن کریم سے جا ملے ہوئے کا بڑا حصہ ملا ہے۔

حضرت یحییٰ بن معین انہیں ضعیف قرار دیتے تھے اور فرماتے تھے ”فی حلیۃ ضعف“ ان

کی احادیث میں ضعف ہے، امام ابو زرعا نہیں ”لین مزم، کہتے تھے جو ادنیٰ وجہ کی توثیق ہے۔
امام ابو حاتم فرماتے ہیں ”یکتب حلیہ ولا یحتج بہ“ ان کی حدیثیں لکھ لی
جائیں مگر ان سے استدلال درست نہیں۔ ساجی فرماتے ہیں: ”صلوق فیہ نظر“ سچے
ہیں مگر کل نظر ہیں۔ امام عقیلی کا قول ہے: ”ضعیف و کان یتناول الشیخین“ ضعیف ہیں
اور شیخین یعنی حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کی بد کوئی کرتے تھے۔ امام طبری کہتے ہیں ”لا یحتج
بحلیہ“ ان کی حدیث سے استدلال درست نہیں ہے۔ (مگر اس کے باوجود خود ان کی
احادیث بکثرت نقل کرتے ہیں)

امام جوزجانی فرماتے ہیں ”کذاب عظام“ وہ جھوٹے اور تمہارے ہیں۔ (تہذیب
العہد ص ۳۱۳-۳۱۴ جلد ۱)

امام فلاس نے حضرت عبدالرحمن بن مہدی کا قول نقل کیا ہے کہ: وہ ضعیف ہیں۔ اور
حسین بن وافد المروزی کہتے ہیں کہ: ”سمعت من السلی فما قمت حتی سمعته یستم
أبا بکر و عمر فلم أجد الیہ“ میں نے سہی سے احادیث سنی ہیں اور ان کو اس وقت چھوڑا،
جب میں نے ان کو سنا کہ وہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کے خلاف بدزبانی کر رہے ہیں اس کے بعد
میں ان کے پاس نہیں گیا۔ (میزان الاعتدال للذہبی ص ۲۳۶-۲۳۷ ج ۱ نمبر ۹۰۷)

ان (سہی کبیر) کے بارے میں ساری بحث کا خلاصہ حافظ ابن حجر نے یہ نکالا ہے کہ
”صلوق، یہم و رمی بالتشیع“ وہ سچے ہیں مگر ان کو روایت میں وہم ہو جاتا ہے، اور ان پر تشیع کا
بھی الزام ہے۔ (تقریب العہد ص ۴۲-جلد ۱-ترجمہ نمبر ۵۳۲ طبع المدینۃ المعورۃ)

لفظ ”صدوق“ محدثین کی اصطلاح میں اس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو جھوٹا تو نہ ہو
لیکن اس کا حافظہ بھی معیاری نہ ہو لہذا ان کی صحیح حیثیت یہ ہے کہ قوتِ حافظہ کے اعتبار سے
یہ محدثین کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ دوسرے ان پر شیعہ ہونے کا بھی الزام ہے لیکن
ان کو ”کذاب“ مصنف امام جوزجانی نے کہا ہے۔ (علوم القرآن ص ۲۸۵-۲۸۸ مطبوعہ:
مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۳۹۶ھ)

۸۔ سہی صغیر

محمد بن مروان بن عبداللہ بن اسماعیل المعروف بہ ”سہی صغیر“ امام یحییٰ بن معین کے
نزدیک ثقہ نہیں ہے اور محدث صالح بن محمد نے فرمایا ہے: یہ موضوع روایات نقل کرتا ہے۔
(تاریخ بغداد جلد ۳ ص ۲۹۲-۲۹۳)

سہی صغیر ”لیس بشی متروک الحدیث اور جھوٹ بولنے سے مہتم تھا“
(تقریب العہد ص ۵۳۵-ترجمہ ۶۲۸)

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ:

دوسرے صاحب جو ”سہی“ کے نام سے محمد بن مروان السدی ہیں جو عبدالرحمن ابن
زید بن الخطابؓ کے آزاد کردہ غلام تھے (تاریخ بغداد للخطیب ص ۲۹۱-جلد ۳) ان کی
روایات ”سہی کبیر“ کے مقابلے میں کم ہیں اور ان کو ”سہی کبیر“ سے ممتاز کرنے کے لئے
”السہی الصغیر“ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی کوفہ کے باشندے ہیں اور ان کے ضعیف ہونے پر تمام
محدثین کا اتفاق ہے۔ یہ مشہور مؤرخ کلی کے شاگرد ہیں۔

امام بخاری فرماتے ہیں: ”لا یکتب حلیہ البتہ“ ان کی احادیث ہرگز نہ لکھی جائیں۔

امام ابن معین کا ارشاد ہے: ”لیس بثقة“ وہ ثقہ نہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں: ”أدر کتہ و قد کبر فتر کتہ“

میں نے ان کو اس وقت پایا جب وہ بوڑھے ہو چکے تھے لہذا میں نے انہیں چھوڑ دیا۔

حافظ ذہبی ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

”ترکوه واتهمہ بعضهم بالکذب“ محدثین نے انہیں چھوڑ دیا ہے اور بعض لوگوں
نے ان پر جھوٹ کا بھی الزام لگایا ہے۔ (میزان الاعتدال ص ۳۳، ۳۴-جلد ۴-والغنی فی

اور ایک دوسرے مقام پر ان کے بارے میں لکھتے ہیں ”واہ بصرۃ“ انتہائی واہیات راوی ہیں۔ (میزان الاعتدال ص ۲۳۷۔ جلد ۱۔ بذیل ترجمہ اسماعیل بن عبد الرحمن السدی الکبیر)

امام نسائی فرماتے ہیں ”متروک الحدیث“

(کتاب الضعفاء والمتروکین للنسائی مع تاریخ الصغیر للبخاری ص ۳۴۳۔ مطبوعہ شیخوپورہ)

ابوعلی صالح بن محمد کہتے ہیں: ”کان ضعیفا وکان یضع الحدیث ایضا“

ضعیف تھے اور حدیثیں گھڑا بھی کرتے تھے (تاریخ بغداد للخطیب ص ۲۹۳۔ جلد ۳۔ طبع بیروت)

”تنویر المقتباس فی تفسیر ابن عباسؓ“ کا مروجہ نسخہ ان ہی سے مروی ہے اور علامہ سیوطی

نے اس کی سند کو ”سلسلۃ الکذب“ قرار دیا ہے۔ اس لئے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

(الاتقان ص ۱۸۹۔ جلد ۲۔ بحوالہ علوم القرآن ص ۴۸۸۔ ۴۸۹)

۹۔ محمد بن السائب کلبی

محمد بن السائب کلبی کذاب اور ساقط الاعتبار ہے۔ یہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ (احوال الرجال ص ۵۴۔ سعدی الجوزجانی۔ المکتبۃ الاشریۃ سانگلہ ہل۔ شیخوپورہ)

امام نسائی فرماتے ہیں: متروک تھا۔ (الضعفاء والمتروکین ترجمہ نمبر ۲۱۱)

امام بخاری نے امام یحییٰ بن معین اور امام ابن مہدی کے حوالے سے لکھا ہے کہ متروک تھا اور سفیان کے حوالے سے لکھا ہے کہ مجھے کلبی نے کہا کہ میں نے ابو صالح کے نام سے جتنی تفسیر تجھے سنائی ہے وہ مرپا جھوٹی ہے۔ محمد بن سائب کلبی سہائی تھا اور کہا کرتا تھا کہ حضرت علیؓ مرے نہیں ہیں واپس دنیا میں آئیں گے اور اسے عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۵۵۷۔ ۵۵۸)

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ:

ان کا پورا نام ابوالمضر محمد بن السائب بن بشر بن عمرو بن عبد الحارث بن عبد العزیٰ الکلبی (م ۱۴۶ھ) ہے۔ یہ قبیلہ ”بنو کلب“ کی طرف منسوب ہیں۔ کوفہ کے باشندے تھے اور تاریخ و انساب اور تفسیر میں مشہور ہیں۔ علماء ان کے ضعیف اور ناقابل اعتبار ہونے پر متفق ہیں۔۔۔

ان پر سب سے سنگین الزام جھوٹی روایتیں بیان کرنے کا ہے۔ معتمر بن سلیمان اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ: ”کوفہ میں دو کذاب تھے ان میں سے ایک کلبی ہیں“ تفسیر میں ان کی بیشتر روایات ابو صالح سے مروی ہیں۔ لیکن ابو جناب کلبی بیان کرتے ہیں کہ ابو صالح نے قسم کھا کر کہا ہے کہ میں نے کلبی کو کوئی بات تفسیر کی نہیں سنائی اور سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ کلبی نے ایک

امام طبری۔۔۔ کون؟

محمد بن السائب کلبی

مرتبہ خود اعتراف کیا کہ میں نے ابو صالح سے ابن عباسؓ کی جو روایتیں بیان کی ہیں وہ جھوٹ ہیں تم انہیں روایت نہ کرو۔۔۔

ان پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ انتہائی غالی شیعہ تھے۔ حضرت ابو جریج کہتے ہیں کہ میں نے اس کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک مرتبہ حضرت جبریلؑ آنحضرتؐ پر وحی لے کر آئے تھے۔ آنحضرتؐ کسی کام سے اٹھ کر چلے گئے۔ حضرت علیؑ وہاں بیٹھے تھے تو جبریلؑ نے وہ وحی حضرت علیؑ پر نازل کر دی۔

ابو جریج کا قول مشہور محدث یزید بن زریج کے سامنے نقل کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ: ”میں نے کلبی سے یہ بات تو نہیں سنی لیکن یہ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ سینہ پیٹ پیٹ کر کہہ رہے تھے کہ میں سہائی ہوں میں سہائی ہوں۔“

اور امام ابن حبان فرماتے ہیں: ”کلبی سہائی تھا اور ان لوگوں میں سے تھا جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی وفات نہیں ہوئی وہ دوبارہ دنیا میں آئیں گے اور اس کو ایسے وقت میں عدل و انصاف سے بھر دیں گے جب وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔ یہ لوگ جب کوئی بادل دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں ’امیر المؤمنین اس میں ہیں‘ (میزان الاعتدال ص ۵۵۸۔ جلد ۳) خلاصہ یہ کہ کلبی قرونِ اولیٰ کے مفسرین میں ضعیف ترین مفسر ہیں۔ امام احمد سے پوچھا گیا کہ: ”کیا کلبی کی تفسیر کو دیکھنا جائز ہے؟“ تو انہوں نے فرمایا: ”نہیں“۔ حافظ ذہبی ان کا طویل تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ”لا یحل ذکرہ فی الكتب فکیف الاحتجاج بہ“ کتابوں میں ان کا ذکر ہی حلال نہیں تو ان سے استدلال کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟ (میزان الاعتدال ص ۵۵۹۔ جلد ۳)

کلبی خود کہتے ہیں کہ میں نے یادداشت کا مظاہرہ بھی ایسا کیا ہے کہ کسی نے نہ کیا ہوگا۔ یادداشت کا واقعہ تو یہ ہے کہ میں نے پورا قرآن چھ یا سات دن میں یاد کر لیا تھا۔ اور بھول کا عالم یہ ہے کہ ایک روز میں نے اپنا خط بنانے کے لئے داڑھی کو مٹھی میں پکڑا۔ چاہتا یہ تھا کہ مٹھی سے نیچے کے بالوں کو کاٹ دوں لیکن بھول کر مٹھی کے اوپر سے پوری داڑھی کاٹ ڈالی۔

امام طبری۔۔۔ کون؟

محمد بن السائب کلبی

(الواقی بالوقایات للصفدی ص ۸۳ جلد ۳۔ مطبع ہاشمیہ دمشق ۱۹۵۳ء۔ میزان الاعتدال ص ۵۵۶ جلد ۳۔ لیکن خطیب بغدادی نے یہ قصہ ان کے بجائے ان کے بیٹے ہشام ابن کلبی کی طرف منسوب کر کے بیان کیا ہے۔ ”تاریخ بغداد ص ۴۶۔ جلد ۱۲۔ ترجمہ ہشام ابن کلبی“ بحوالہ علوم القرآن ص ۴۹۷۔ ۴۹۹)

اعمش کا قول ہے: ”اتقی هذه السبائیة“ ان سہائیوں سے بچو۔

علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ: ابن مہدی نے کہا: ابو جریج کہتے تھے ”اشہد انہ کافر“ میں گواہی دیتا ہوں وہ کلبی کافر ہے۔ وہ کہتا ہے جبریلؑ نبی علیہ السلام پر وحی نازل کرتے تھے۔ آپؐ حاجت کے لئے اٹھتے تو جبریلؑ علیؑ پر وحی نازل کر دیتے۔

یزید بن زریج کہتے ہیں: میں نے کلبی سے یہ تو نہیں سنا لیکن میں نے اسے دیکھا ”یضرب صدره و یقول انا سبائی انا سبائی“ اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہتا میں سہائی ہوں میں سہائی ہوں۔ عقلمندی نے کہا: ”سہائی“ روافض کی ایک قسم ہے یعنی عبداللہ بن سبا کے اصحاب۔

ساجی نے کہا: متروک الحدیث ہے بہت زیادہ ضعیف ہے ”لغرض فی التشیع تشیع میں افراط کی وجہ سے“ ”وقد اتفق ثقات اهل النقل علی ذمه و ترك الروایة عنه فی الاحکام والفروع“ اور ثقہ محدثین اس کی مذمت پر اور احکام و فروع سب میں اس کی روایت ترک کرنے پر متفق ہیں۔ (تہذیب المعتمد جلد ۹ ص ۱۸۱ تا ۱۷۸۔ ملخصاً بلفظہ تحت ترجمہ محمد بن السائب الکلبی)

۱۰۔ عطیہ العوفی الکوفی

ابوالحسن عطیہ بن سعد بن جناد العوفی الجبلی الکوفی (م ۱۱۱ھ) کے متعلق مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ:

حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہم سے روایت نقل کرتے ہیں۔ ان کو امام نسائی نے ضعیف کہا ہے۔ نیز امام احمد، یحییٰ بن سعید القطان، یحییٰ بن عمار، ابو حاتم، ابن عدی، جوزجانی، ابن حبان، امام ابوداؤد اور ساجی وغیرہ نے بھی ان کی تضعیف کی ہے۔

صرف ابن سعد نے اتنا لکھا ہے کہ ”لہ احادیث صالحة و من الناس من لا یحتج بہ“ وہ ٹھیک حدیثیں روایت کرتے ہیں اور بعض لوگ ان سے استدلال نہیں کرتے۔ اور امام ابو زرعد نے انہیں ”طین“ کہا ہے جو ادنیٰ درجہ کی توثیق ہے۔ اور یحییٰ بن معین ان کو ”صالح“ کہتے ہیں یہ بھی ملکی قسم کی توثیق ہے۔ دراصل ان پر چار قسم کے اعتراضات ہیں:-

پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ انہوں نے روایات کی سند میں مغالطہ انگیزی کا ارتکاب کیا ہے۔ امام احمد اور ابن حبان نے اس کی تفصیل یہ بتائی ہے کہ یہ کلبی کے پاس جا کر ان سے تفسیر کے بارے میں سوالات کیا کرتے تھے اور ان سے روایات لیتے تھے لیکن چونکہ کلبی ضعیف اور بدنام ہیں اس لئے انہوں نے ان کی کثیت اپنی طرف سے ابوسعید خدری کی تھی اور جو روایات یہ کلبی سے سنتے ان کو کلبی کا نام لینے کے بجائے ابوسعید کی کثیت سے روایت کر دیتے اور چونکہ عطیہ العوفی نے مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدری سے بعض احادیث سنی تھیں اس لئے ناواقف لوگ یہ سمجھتے کہ یہ روایت بھی حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہوگی حالانکہ درحقیقت وہ کلبی کی روایت ہوتی تھی (تہذیب الہند ص ۲۲۵-۲۲۶ جلد ۷)

ان پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ شیعہ تھے اور تیسرا اعتراض یہ ہے کہ روایات نقل کرنے میں غلطیاں کرتے تھے اور چوتھا اعتراض یہ ہے کہ مدلس تھے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر ان کے بارے میں لکھتے ہیں: ”صَلَوَقٌ بِخَطِيئَةٍ كَثِيرَةٍ، كَانَ شَيْعِيًّا مَدْلَسًا“ سچ بولنے والے ہیں مگر غلطیاں بہت کرتے ہیں، شیعہ تھے اور مدلس تھے (تقریب الہند ص ۲۲ جلد ۲) اور حافظ شمس الدین ذہبی الضعفاء میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”تابعی مشہور مجمع علیٰ ضعفہ“ مشہور تابعی ہیں ان کے ضعف پر اجماع ہے۔ البتہ امام ترمذی نے ان کی بعض روایات کو حسن قرار دیا ہے۔ (المغنی فی الضعفاء ص ۴۳۶ جلد ۲ ترجمہ نمبر ۴۱۳۹) لیکن امام ترمذی کی اصطلاح میں ”حسن“ سے مراد ہر وہ حدیث ہوتی ہے جس کی سند میں کوئی راوی مہم بالکذب (جھوٹ کا ملزم) نہ ہو اور وہ ایک سے زائد طریقوں سے مروی ہو۔ (کتاب العلل للترمذی) اس لئے ان کی تحسین سے ان اعتراضات کا دفعیہ نہیں ہوتا جو عطیہ العوفی پر وارد کئے گئے ہیں (علوم القرآن ص ۴۹۲-۴۹۵)

امام طبری کے راوی عطیہ العوفی الکوفی کا یہ کردار کہ کلبی کذاب کی روایات کو ”ابوسعید“ کی کثیت سے عوام میں پھیلائے تاکہ لوگ اس سے حضرت ابوسعید خدریؓ مراد لے لیں (یقیناً خیانت کے زمرے میں آتا ہے جبکہ اصول حدیث کی اصطلاح میں اس قسم کی تدلیس کو ”تدلیس الشیوخ“ کا نام دیا گیا ہے جو قطعاً حرام ہے۔ ملاحظہ ہو: (الباعث الحثیث شرح باختصار علوم الحدیث ص ۶۴۔ مؤلفہ احمد محمد شاہ کریم طبع کویت)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ”تدلیس الشیوخ“ کو خیانت کا مرتکب قرار دیا ہے: ”وہو خیانة ممن تعمدہ“ کہ جان بوجھ کر اس طرح کی تدلیس کرنے والا خیانت کا مرتکب ہے۔ (تعریف اہل التہذیب بمراتب الموصوفین بالتدلیس ص ۲۶۔ طبع بیروت)

مذکورہ اوصاف (ضعف، تشیع و تدلیس) کے صرف عطیہ عوفی خود ہی تنہا حامل نہیں ہیں بلکہ اس ”کارخیز“ میں پوتے کے پوتے تک سب ہی شریک ہو کر ”اسی خانہ ہمد آفتاب است“ کے کامل مصداق بن گئے ہیں۔

امام ابن جریر طبری اپنی تفسیر و تاریخ میں بکثرت یہ ”سند“ بیان کرتے ہیں کہ ”محمد بن سعد از والدہ، از عم، از والد، از والدہ، از ابن عباس“ (ابن جریر: ۱: ۱۷۹)۔
 پروفیسر ڈاکٹر سراج الاسلام حنیف اس ”سند“ کی ”نقاب کشائی“ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ: اس سند کے پہلے راوی محمد بن سعد بن محمد بن الحسن بن عطیہ بن سعد بن جنادہ ابو جعفر عوفی ہیں۔ جس کے بارے میں خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

”كان ليثا في الحديث“ حدیث کے معاملے میں ضعیف تھا؛ (تاریخ بغداد: ۵: ۳۲۲)۔
 دوسرے راوی (شمی ابی) سعد بن محمد بن الحسن بن عطیہ العوفی ہیں۔ خطیب لکھتے ہیں:
 ”جهمی، ولو لم يكن هذا أيضا لم يكن ممن يستأهل أن يكتب عنه ولا كان موضعاً لذلك“، ”جہمی ہیں اور اگر جہمی نہ بھی ہوتے پھر بھی اس کے اہل نہیں تھے کہ ان کی روایت لکھی جائے۔“
 تیسرے راوی (شمی عیسیٰ) حسین بن حسن بن عطیہ عوفی ہیں۔ (تاریخ بغداد: ۹: ۱۲۷) امام ابن حبان لکھتے ہیں: ”منكر الحديث روى عن الأعمش وغيره أشياء لا يتابع عليها، كأنه كان يقلبها، وربما رقع المراسيل وأسند الموقوفات، لا يجوز الاحتجاج بخبره“، ”منکر الحدیث روایت عن الأعمش وغيرہ اشیاء لا يتابع علیہا، کأنہ کان یقلبہا، وربما رقع المراسیل وأسند الموقوفات، لا يجوز النقل کرتا ہے۔ اکثر و بیش مراسیل و موقوفات کو مرفوع و منند بنا کر بیان کرتا ہے۔ اس کی روایات ناقابل احتجاج ہوتی ہے۔ (المجروحین: ۱: ۲۹۸۔ ترجمہ ۲۲۹)

چوتھے راوی (شمی ابی) حسن بن عطیہ عوفی ہیں۔ امام ابن ابی حاتم لکھتے ہیں:
 احادیث کے معاملے میں ضعیف تھا۔ (الجرح والتعديل ۳: ۲۶۔ ترجمہ ۱۱۲)۔
 امام بخاری فرماتے ہیں: ”ليس بذلك“ (تاریخ کبیر ۲: ۳۰۱۔ ترجمہ ۲۵۴۲)۔
 پانچویں راوی (شمی ابی) ابو الحسن عطیہ عوفی ہیں جو ضعیف اور ”ليس بشئ“ تھے۔ کلبی کے پاس جا کر اس سے تفسیر سنتے اور لوگوں کے سامنے کلبی کی غیر معروف کنیت ”ابو سعید“ کی نسبت سے اسے بیان کرتے جس سے لوگ یہ سمجھ لیتے کہ ان کی مراد سیدنا ابو سعید خدریؓ ہیں۔
 (میزان الاعتدال ۹: ۷۹۔ ۸: ۳۰ بحوالہ منتخب علمی مکاتیب ص ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ طبع ششم ۲۰۱۲ء)

۱۱۔ ابو مخنف لوط بن یحییٰ

مات قبل السبعین و مائة

امام ذہبی لکھتے ہیں کہ: ”لوط بن یحییٰ أبو مخنف، أخباری تالف، لا يوثق به، تركه أبو حاتم وغيره، وقال الدارقطني: ضعيف، وقال يحيى بن معين: ليس بثقة، وقال مرة: ليس بشئ، وقال ابن عدي: شيعي محترق صاحب أخبارهم“
 (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۴۰۔ ترجمہ لوط بن یحییٰ ابو مخنف)
 لوط بن یحییٰ ابو مخنف اخباری (یعنی داستان کو قصہ گو) اور متروک ہے۔ یہ قابل اعتماد نہیں ہے۔ ابو حاتم اور ان کے علاوہ دوسرے حضرات نے اس کی احادیث کو چھوڑ دیا ہے۔ دارقطنی نے کہا: ضعیف ہے۔ یحییٰ بن معین نے کہا: ثقہ نہیں اور کبھی کہا: یہ کچھ بھی نہیں اور ابن عدی نے کہا: یہ جلابھنا شیعہ ہے اور شیعوں ہی کا ذکر و قصہ گو ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) اس پر اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:
 ”وقال ابو عبيد الأجرى: سألت أبا حاتم عنه فنفض يده- وقال أحمد: يسأل عن هذا، وذكره العقيلي في الضعفاء-“ (لسان المیزان جلد ۲ ص ۴۹۲۔ ۴۹۳)
 ابو عبیدہ لا جری کہتے ہیں: میں نے ابو حاتم سے ابو مخنف کے متعلق پوچھا تو انہوں نے اپنے ہاتھ کو جھاڑ دیا (یعنی حقارت و نفرت کا اظہار کیا) اور امام احمد نے فرمایا: اس کے متعلق پوچھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ اور عقیلی نے اسے ضعفاء میں ذکر کیا ہے۔
 مذکورہ ”اوصاف و کمالات“ کے علاوہ ابو مخنف جابر الجعفی الکذاب کا تلمیذ ”رشید“ اور ہشام کلبی کذاب کا استاذ ”مرشد“ ہے۔ جابر جعفی رافضی و سہائی ہے۔ ”رافضی یشتبہ أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ صحابہ کرامؓ کو گالیاں بکتا تھا۔
 امام ابن حبان کا قول ہے کہ سہائی تھا۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں: میں نے جابر جعفی

سے زیادہ جھوٹا کوئی نہیں دیکھا۔ امام شافعی سفیان بن عیینہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے جابرؓ سے کوئی بات سنی پھر میں نے (نکٹے میں) جلدی کی ”خفت أن، يقع علينا السقف“ اور اس بات سے ڈرا کہ کہیں چھت ہمارے اوپر نہ گر پڑے۔ (میزان الاعتدال جلد اول و تہذیب المعتمد جلد ۲۔ ترجمہ جابر بن زید بن الحارث ج ۱)

امام ابو حاتم الرازی (۳۲۷ھ) نے ابو جعفر کو ”متروک الحدیث“ کہا۔ (المخرج والتعديل جلد ۷ ص ۱۸۲) امام ابن معین (م ۲۴۳ھ) نے کہا: ”ابو مخنف و ابو مریم و عمرو بن شمر ليسوا هم بشئ“ ابو جعفر، ابو مریم اور عمرو بن شمر کی کوئی حیثیت نہیں۔ (تاریخ ابن معین روایۃ الدوری جلد ۳ ص ۴۳۹) امام ابن عدی (م ۳۶۵ھ) نے کہا: ”شيعي محترق صاحب أخبارهم“ یہ کٹر شیعہ اور شیعوں کا مورخ ہے (اکال فی ضعفاء الرجال جلد ۷ ص ۲۳۱) امام اسماعیل الاصمہانی الملقب ”بقوام السنة“ (م ۵۳۵ھ) نے کہا: ”فأما ما رواه أبو مخنف وغيره من الروايات فلا اعتماد بروايتهم“ ابو جعفر وغیرہ روایات نے جو روایت کیا ہے تو ان کی مریات پر کوئی اعتماد نہیں ہے۔ (الحجة في بيان المحجة بقوام السنة ص ۶۸/۲) امام ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) نے کہا: ”وفى حديث ابن عباس رضى الله عنه: أبو صالح الكلبي و أبو مخنف وكلهم كذابون“ ابن عباسؓ والی روایت میں ابو صالحؓ اور ابو جعفرؓ ہے اور یہ سب کے سب کذاب ہیں۔ (المؤوضعات جلد ۱ ص ۴۰۶) شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) نے فرمایا: ”ابو مخنف لوط بن یحییٰ (یحییٰ) و هشام بن محمد بن السائب و أمثالهما من المعروفين بالكذب عند أهل العلم“ (منہاج السنة النبویۃ الجزء الاول ص ۱۳۔ طبع بیروت) ابو جعفر لوط بن یحییٰ اور هشام بن محمد بن سائب اور ان دونوں جیسے لوگ جو اہل علم کے نزدیک جھوٹے ہونے میں معروف ہیں۔ امام ابن العراق الکنتانی (م ۹۲۳ھ) نے کہا: ”لوط بن یحییٰ أبو مخنف كذاب تالف“ لوط بن یحییٰ ابو جعفر یہ کذاب اور متروک ہے۔ (تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ جلد ۱ ص ۹۸) شیعہ علماء بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ”انه لا ينبغي التأمل في كونه (لوط بن یحییٰ) شيعياً إمامياً“ لوط بن یحییٰ کے شیعہ امامی ہونے میں کسی کو شک نہ کرنا چاہئے۔ (ایمان الشیعۃ جلد ۱ ص ۱۵۳)

۱۲۔ ہشام کلبی

ابو المنذر ہشام مشہور کذاب و دجال محمد بن سائب کلبی کے بیٹے ہیں جنہیں اپنے والد کی خلافت کے علاوہ ابو جعفر لوط بن یحییٰ سے شرف تلمذ بھی حاصل ہے اور ائمہ رجال کے نزدیک یہ خود بھی غیر ثقہ، کذاب اور ضعیف رافضی تھے۔

امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) فرماتے ہیں:

”أما كان صاحب سمر و نسب، ما ظننت أن أحدا يحدث عنه“

(لسان المیزان جلد ۶ ص ۱۹۶۔ میزان الاعتدال جلد ۴ ص ۳۰۴)

وہ صرف قصہ گو اور نسب بیان کرنے والا ہے مجھے تو خیال نہ تھا کہ کوئی اس سے روایت کرے گا۔

موصوف کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ ان کے انتقال کے بعد امام طبری (م ۳۱۰ھ) جیسی شخصیت اس (و امثالہ) ”مقصاص اور نساب“ سے نہ یہ کہ مطلق روایت لے گی بلکہ صحابہ کرامؓ کی توہین، تنقیص اور تفسیق پر مبنی روایات بھی اگلی نسلوں کو منتقل کرے گی۔

امام دارقطنی (م ۳۸۵ھ) وغیرہ نے اسے ”متروک“ کہا۔

امام ابن حبان (م ۳۵۴ھ) نے فرمایا:

”وكان غالباً في التشيع“ یہ شیعیت میں غلو کرتا تھا۔

حافظ ابن عساکر دمشقی (م ۵۷۱ھ) نے فرمایا:

”رافضی ليس بثقة“ (میزان الاعتدال ص ۳۰۴، جلد ۴، لسان المیزان ص ۱۹۶، جلد ۶)

ابن کلبی رافضی ہے اور قابل اعتبار و استناد نہیں ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) فرماتے ہیں:

”قلبان الرافضة في الأصل ليسوا أهل العلم... كما أنهم من أجهل الناس“

بمعرفۃ المنقولات والأحادیث والأثر والتمییز بین صحیحها وضعیفها، وإتما عملتهم فی المنقولات علی تواریخ منقطعة الاسناد، و کثیر منها من وضع المعروفین بالکذب و بالاحاد، و علماؤهم یعملون علی نقل مثل أبی مخنف لوط بن یحیی و مثل هشام بن محمد بن السائب (الکلبی) و أمثالهما من المعروفین بالکذب عند أهل العلم۔ (منہاج السنۃ النبویۃ الجزء الاول ص ۱۳)

رافضی اصل میں اہل علم ہیں ہی نہیں... جیسا کہ وہ احادیث و آثار کے نقل کی معرفت اور صحیح و ضعیف کے درمیان فرق و امتیاز کرنے میں تمام لوگوں سے بڑے جاہل ہیں انہوں نے منقولات میں منقطع الاسناد تاریخی روایات پر اعتماد کیا ہے اور ان میں سے اکثر واقعات و روایات ان لوگوں کی وضع کردہ ہیں جو الجاد اور جھوٹ میں مشہور ہیں اور ان رافضیوں کے علماء ان واقعات کے نقل کرنے میں اسی قسم کے راویوں پر اعتماد کرتے ہیں جیسے ابو مخنف لوط بن یحیی، ہشام بن محمد بن السائب الکلبی اور ان دونوں جیسے لوگ جو اہل علم کے نزدیک جھوٹے ہونے میں خوب معروف ہیں۔

امام ذہبی (۴۸۷ھ) نے ہشام کلبی کے بارے میں فرمایا ہے:

”وہ، لم یکن بثقة و فیہ رفق“ (المعین فی طبقات المحللین ص ۱۸، تاریخ الاسلام جلد ۵ ص ۲۱۱)

یہ سخت ضعیف ہیں اور قابل اعتماد و استناد نہیں ہے۔ نیز اس میں رافضیت بھی پائی جاتی ہے جبکہ امام موصوف نے امام احمد بن حنبل، دارقطنی اور ابن عساکر کے اقوال بھی نقل کئے ہیں کہ ابن کلبی قصہ کو مناسب ہے اس کے کردار و اوصاف کو دیکھ کر کوئی بھی اس سے روایت نقل کرنے کی جسارت نہیں کرے گا۔ یہ رافضی، قابل ترک اور ناقابل اعتبار و استناد ہے۔ ملاحظہ ہو میزان الاعتدال جلد ۴ ص ۳۰۴۔

علامہ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) مزید لکھتے ہیں کہ:

”ذکرہ ابن أبی طی فی الإمامیة... و نقل أبو الفرج الأصبهانی عن أبی

یعقوب الحریمی قال كان هشام بن الكلبي علامة نسابة و راوية للمثالب غاية... وقال یحیی بن معین غیر ثقہ و لیس عن مثله یروی الحدیث... قلت: اتهمه الأصمعی و ذکرہ العقیلی وابن الجارود و ابن السکن و غیرہم فی الضعفاء (لسان المیزان الجزء السادس ص ۱۹۷)

ابن ابی طی نے ابن کلبی کو ”امامیہ“ (شیعہ و رافضی) میں ذکر کیا ہے... اور ابو الفرج الاصبہانی نے ابو یعقوب الحریمی سے نقل کیا ہے کہ ہشام ابن الکلبی عالم، نساب تھا اور (صحابہ کرامؓ کے) مثالب بدرجہ غایت روایت کرتا تھا... اور یحیی بن معین کا قول ہے کہ ہشام قابل اعتبار و استناد نہیں ہے اور اس قماش کے انسان سے حدیث کی روایت جائز نہیں... میں (ابن حجر) کہتا ہوں کہ اصمعی نے اسے جھوٹ کے ساتھ متهم قرار دیا ہے اور عقیلی، ابن الجارود و ابن سکین اور ان کے علاوہ دیگر محدثین نے اسے ”ضعفاء“ میں ذکر کیا ہے۔

شیعہ علماء نے بھی ابن کلبی کا شیعہ و امامی ہونا تسلیم کیا ہے:

”هشام بن محمد بن السائب الکلبی... أمامیة لا شبهة فیہ“

ہشام بن محمد کلبی کے امامی شیعہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ (تنقیح المقال جلد ۳ ص

۳۰۳، اعیان الشیعہ جلد ۱ ص ۱۵۴)

۱۳۔ محمد بن عمرو اقدی

ان کا پورا نام محمد بن عمرو بن واقد الاسلمی المدنی ہے۔ ان کے دادا واقد عبداللہ بن بیدہ بن الحصیب کے غلام تھے۔ واقدی ۱۳۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۷ھ یا ۲۰۹ھ میں فوت ہوئے۔ یہ بغداد کے قاضی بھی رہے۔

امام شافعی (م ۲۰۴ھ) فرماتے ہیں کہ: ”کتاب الواقعی کلھا کذب“ امام واقدی کی کتابیں جھوٹ کا پلندہ ہیں بلکہ سمعانی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ واقدی کی جانب جتنی کتابیں منسوب ہیں یہ ان کی اپنی تصانیف نہیں بلکہ ابراہیم بن محمد المدنی رافضی کی تصانیف ہیں چونکہ وہ بہت بدنام ہو چکا تھا اس لئے واقدی نے اس کی کتابوں کو اپنے نام سے پھیلایا۔ یہی بات نواب مہدی علی خان نے اپنی کتاب ”آیات بیات“ میں تحریر کی ہے۔

امام اسحاق بن راہویہ (م ۲۳۷ھ) نے کہا:

”عندی ممن یضع الحدیث“ میرے نزدیک یہ حدیث گھڑنے والوں میں سے تھا۔

امام بخاری (م ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں:

”سکتوا عنه، ما عندی له حرف“ محدثین نے واقدی سے اعراض کیا ہے میرے پاس اس کا ایک حرف بھی نہیں۔

امام ابو داؤد فرماتے ہیں: واقدی نے فتح یمین اور غنسی کے بارے میں زہری سے احادیث روایت کی ہیں ”لیست من حلیث الزہری“ حالانکہ وہ زہری کی احادیث نہیں۔

امام نسائی (م ۳۰۳ھ) فرماتے ہیں: والکذابون المعروفون بوضع الحدیث علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أربعة: ابن ابی یحییٰ بالمدينة والواقعی ببغداد ومقاتل بن سلیمان بخراسان ومحمد بن سعید بالشام۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حدیثیں گھڑنے والے مشہور و معروف جھوٹے راوی چار ہیں: مدینے میں ابن ابی یحییٰ، بغداد میں واقدی، خراسان میں مقاتل بن سلیمان اور شام میں محمد بن سعید۔

امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) فرماتے ہیں:

”کان یکذب ویضع الحدیث“ یہ جھوٹ بولتا تھا اور حدیث گھڑتا تھا۔

امام ابن عدی فرماتے ہیں:

”وہو فی جملة من یضع الحدیث“ یہ ان لوگوں میں سے تھا جو حدیث گھڑتے تھے۔

امام ابو حاتم فرماتے ہیں: واقدی حدیث گھڑتا تھا۔ یہ متروک الحدیث ہے۔

امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں: ”لیس بشی“ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔

امام علی بن المدینی فرماتے ہیں: ”لا أرضاء فی الحدیث ولا فی الأنساب ولا فی شئی“

میں واقدی کو نہ حدیث میں نہ علم انساب میں اور نہ ہی کسی اور شئی میں پسند کرتا ہوں۔

مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴ء) لکھتے ہیں: ”سیرت نبوی کے متعلق ان کی دو کتابیں ہیں۔

کتاب السیرت اور کتاب التاریخ المغازی والمبعث، امام شافعی فرماتے ہیں کہ واقدی کی

تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہے۔ ایک ظریف محدث نے خوب کہا ہے کہ ”اگر واقدی سچا

ہے تو دنیا میں کوئی اس کا کافی نہیں اور اگر جھوٹا ہے، تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں... ان

میں سے واقدی تو بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہے۔ محدثین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ وہ خود

اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت

ہے... (سیرت النبی جلد اول ص ۷۵، ۷۶۔ مطبوعہ مدنی کتب خانہ اردو بازار لاہور)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ واقدی واضح الحدیث، متروک الحدیث، کذاب اور فقیہ باز

شخص تھا اور شیعہ مذہب کفر و غیبت میں امام طبری کی طرح اس کا بھی اہم کردار ہے۔ ابن ندیم

نے اقرار کیا ہے کہ ”وکان یثبیت، حسن المذہب یلزم التقیۃ للہنی و التقیۃ باز اور اچھے

مذہب“ کا حامل شیعہ تھا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۴۶۵۔ تہذیب

اعجاز جلد ۹ ص ۳۶۷، الضعفاء الصغیر للبخاری ص ۱۰۴۔ تحت ترجمہ محمد بن عمرو اقدی۔

۱۴۔ محمد بن حمید رازی

امام طبری کے استاد محمد بن حمید رازی کے متعلق امام جوزجانی فرماتے ہیں:

”کان ردی المذهب، غیر ثقہ“ (احوال الرجال ترجمہ ۳۸۲)

یہ بد مذہب اور ناقابل اعتماد استناد ہے۔

محدث اسحاق بن منصور فرماتے ہیں: میں اللہ تعالیٰ کے سامنے گواہی دوں گا کہ محمد بن

حمید جھوٹا تھا۔ (تاریخ بغداد جلد ۲ ص ۲۶۳، تہذیب الکمال جلد ۲۵ ص ۱۰۳)

یعقوب ابن شیبہ فرماتے ہیں: کثرت سے منکر روایتیں بیان کرتا ہے۔ امام ابو زرعد فرماتے ہیں: جھوٹا ہے۔ امام اسحاق کو سج فرماتے ہیں: میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد بن حمید جھوٹا ہے۔ امام ابن خراش فرماتے ہیں: ہم سے محمد بن حمید نے حدیث بیان کی اور اللہ کی قسم! وہ جھوٹ بولتا تھا اور بہت سے علماء سے منقول ہے کہ ابن حمید احادیث چوری کرتا تھا۔ امام نسائی فرماتے ہیں ثقہ نہیں اور امام صالح جزرہ فرماتے ہیں: میں نے جھوٹ بولنے میں ابن حمید سے بڑھ کر کوئی تجربہ کار نہیں دیکھا۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۵۳۰)

امام ابن حبان فرماتے ہیں: ابن حمید ثقہ راویوں کے نام لے کر مقلوب روایات بیان کرنے میں منفرد ہوتا ہے خصوصاً جب اپنے گاؤں کے ساتھ سے روایت لیتا ہے ”کان ممن ینفرد عن الثقات بالأشیاء المقلوبات ولا سیما اذا حدث عن شیوخ بلده“ (المجروحین من المحدثین جلد ۲ ص ۳۲۱ ترجمہ ۱۰۰۵)

زیر نظر عنوان ”رواۃ طبری“ کے تحت صرف ”۱۴“ راویوں (شعیب بن ابراہیم، سیف بن عمر، سلمہ بن فضل، امش، محمد بن اسحاق، عبدالرحمن بن زید بن اسلم، مقاتل بن سلیمان، السدی الکبیر، محمد بن مروان سدی صغیر، محمد بن سائب کلبی، عطیہ العوفی، ابو جعفر

لوط بن تنگی، ہشام بن محمد بن سائب کلبی، محمد بن عمرو اقدی اور محمد بن حمید رازی) کے مختصر حالات پیش کئے گئے ہیں جن کی مرویات تفسیر الطبری: ”جامع البیان فی تاویل القرآن“ اور تاریخ طبری، تاریخ الامم والملوک“ میں پائی جاتی ہیں۔ ائمہ رجال نے مذکورہ راویوں کو حسب ذیل ”عزازات“ سے نوازا ہے:

”قیہ جہالة، وقیہا مافیہ تحامل علی السلف، کان یتناول الشیخین، یشتم أبابکر و عمر، ضعیف الحدیث، منکر الحدیث، سارق الحدیث، متروک الحدیث، ذاہب، واه، لاشئ البتہ، لیسوا ہم بشئ، لیس بثقة، غیر ثقة، لا یوثق بہ، روی الموضوعات، کان یکذب، و عندی ممن یضع الحدیث، یضع الحدیث، اتهم بالزلفۃ، دجال جصور، کذاب جصور، أصحاب الحدیث یتقون حدیثہ و ینکرونہ، کذبہ و ہجروہ، رمی بالتجسیم، لا یحتج بہ، قیہ تشیع، قیہ رفض، قیہ نظر، اعطی حظاً من جہل بالقرآن، کذاب شتام، سلسلۃ الکذب، لا یحل ذکرہ فی الکتب فکیف الاحتجاج بہ، لا یجوز الاحتجاج بخبرہ، اتق هذه السبائیة، یخطی کثیراً، کان شیعياً ملئساً، مجمع علی ضعفہ، کان یقلبها، ردی المذهب، شعی محترق، کلہم کذابون، المعروفین بالکذب عند أهل العلم، لا أرضاء فی الحدیث ولا فی الأنساب ولا فی شئ“

امام طبری ہی کا یہ ”ظرف“ ہے کہ انہوں نے مذکورہ ”اوصاف رذیلہ“ کے حامل راویوں پر اعتماد کر لیا۔ نیز انبیاء کرام علیہم السلام اور صحابہ عظام رضی اللہ عنہم کی توہین و تنقیص پر مبنی ان کی روایات قبول کر کے اپنی تفسیر و تاریخ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیں۔ فیا أسفا۔ اہل تشیع نے تاریخ طبری کی ”مد“ سے نہ صرف صحابہ کرامؓ کی قد حیات جمع کیں بلکہ ”نہج البلاغہ“ بھی مرتب کر ڈالی جس میں حضرت علیؓ کی طرف منسوب ”خطبات“ کی بڑی تعداد تاریخ طبری ہی سے ماخوذ ہے۔ اہل تشیع اس کتاب کو انتہائی مقدس اور بمنزلہ کتاب اللہ گردانتے ہیں۔

یحییٰ بن معین (م ۲۳۳ھ)، ابن المدینی (م ۲۳۴ھ)، امام بخاری (م ۲۵۶ھ) اور امام طبری کی وفات (۳۱۰ھ) کے بعد امام ابو حاتم رازی (م ۳۴۷ھ)، ابن حبان (م ۳۵۴ھ)، ابن عدی (م ۳۶۵ھ)، امام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ)، حافظ مزنی (م ۷۴۲ھ)، ابو حیان اندلسی (م ۷۵۵ھ)، حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ)، ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) وغیرہم متقدمین و متاخرین ائمہ رجال کو تو امام طبری کے مذکورہ راویوں کے حالات سے آگاہی ہوگئی مگر سخت حیرت ہے کہ ”معاصرت“ اور قرب زمانہ کے باوجود خود طبری ہی ان کے بارے میں ”لاعلم“ رہ گئے۔ اگر وہ ان کے حالات سے آگاہ تھے پھر معلوم نہیں کہ کس طبقہ کی خوشنودی کی خاطر انہوں نے اپنی کتب میں انبیاء کرامؑ اور صحابہ عظامؓ کے خلاف روایات کا انبار لگا دیا؟ کیا وہ ایک ”مفسر، محدث، فقیہ اور مجتہد“ ہونے کی حیثیت سے بلا تحقیق جھوٹی اور موضوع روایات کے نقل کرنے سے متعلق ”شرعی حکم“ سے بھی بے خبر تھے؟ بلا تحقیق نقل روایت کے ”شرعی حکم“ پر بحث آگے آرہی ہے۔ یہاں امام طبری کی شخصیت کا دوسرا اور اصلی رخ دکھانے کی خاطر صحابہ کرامؓ کی توہین و تنقیص پر مبنی چند روایات ہدیہ قارئین کی جاتی ہیں۔

روایات طبری اور توہین صحابہؓ

گذشتہ تفصیل سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ امام طبری ”تشیع ورفض“ کے ساتھ آلودہ یا مہم تھے۔ وہ اہل تشیع کے عقیدہ موالاۃ اور واقعہ غدیر خم کے نہ صرف قائل تھے بلکہ تقریر و تحریر اس کے پرچارک بھی تھے۔ ”موالاة اور تشیع“ کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ امام طبری صحابہ کرامؓ بالخصوص معارضین علیؑ کے ساتھ نرم گوشہ نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے انہوں نے کذاب راویوں کے کندھے پر بندوق رکھ کر صحابہ کرامؓ پر خوب چاند ماری کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں اور شاگردوں کا ”تزکیہ نفس“ نہ فرما سکے۔ العیاذ باللہ امام طبری نے صحابہ کرامؓ کا جو ”کردار“ پیش کیا ہے اس کا ایک ہلکا سا نمونہ مذرا قارئین کیاجاتا ہے:

امام طبری نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چھینروں تکلفین و مدفین سے پہلے سقیفہ بنو ساعدہ میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے انعقاد کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

... عن أبي مخنف... فأقبل الناس من كل جانب يباعون أبابكر و كادوا يطيرون سعد بن عبادۃ، فقال ناس من أصحاب سعد: اتقوا سعدا لاتطؤوه، فقال عمر: اقتلوه قتله الله، ثم قام على رأسه فقال: لقد هممت أن أطأك حتى تندر عضوك، فأخذ سعد بلحية عمر، فقال: والله لو حصصت منه شعرة مارجعت وفي فيك واضحة...

لما قام الحباب بن المنذر انتفى سيفه... فحامله عمر، فضرب يده فندر السيف فأخلده، ثم وثب على سعد، ووثبوا على سعد، و تتابع القوم على البيعة، و بايع سعد، وكانت فلتة كفلتات الجاهلية، قام أبوبكر دونها وقال

قائل حین أوطى سعد قتلتم سعدا، فقال عمر: قتله الله إنه منافق...

(تاریخ الامم والملوک الجزء الثانی ص ۴۵۹۔ تحت سہ ۱۱ طبع بیروت)

”اب ہر طرف سے لوگ آ کر ابو بکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ سعدؓ کو روند ڈالتے۔ اس پر حضرت سعدؓ کے اصحاب میں سے کسی نے کہا: سعدؓ بچاؤ، ان کو نہ روندو۔ عمرؓ نے کہا: اللہ اسے ہلاک کرے، اس کو قتل کر دو۔ اور خود ان کے سر پر آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا: میں چاہتا ہوں کہ تم کو روند کر ہلاک کر دوں۔ سعدؓ نے عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی۔ عمرؓ نے کہا: چھوڑ دو اگر اس کا ایک بال بھی بیکار ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت بھی نہ رہے گا۔ عمرؓ نے اس (حباب بن منذرؓ) پر حملہ کیا، اس کے ہاتھ پر دیر لگا کر پڑی تو عمرؓ نے اسے اٹھالیا اور پھر سعدؓ پر چھپے۔“

اس وقت عہد جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تو تو، میں میں ہونے لگی۔ ابو بکرؓ اس جھگڑے سے دور رہے۔ جس وقت سعدؓ پر لوگ چڑھ گئے، کسی نے کہا کہ: تم نے سعدؓ کو مار ڈالا۔ عمرؓ نے کہا: اللہ اسے ہلاک کر دے۔ یقیناً وہ منافق ہے۔“ اعلیٰ ذی اللہ!

امام طبری نے مہاجرین و انصارؓ کا جاہلی حیثیت و عصیبت پر مبنی یہ مکروہ ترین منظر نامہ اس وقت کا پیش کیا ہے کہ ابھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کو نہ غسل دیا گیا تھا اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکفین و تدفین عمل میں آئی تھی۔

موصوف نے مہاجرین و انصار کے اس ”تصادم“ کو اس عہد جاہلیت کی ”حیثیت و عصیبت“ کے ساتھ تشبیہ دی جو کفار کا طرزِ امتیاز تھی۔ سخت تعجب ہے کہ حضرت عمرؓ کی زبانی رئیس انصار اور بدری صحابی حضرت سعد بن عبادہؓ کو ”منافق اور واجب القتل“ قرار دے دیا گیا۔

موصوف مزید لکھتے ہیں کہ:

”تمام لوگوں نے ابو بکرؓ کی بیعت کر لی لیکن حضرت سعد بن عبادہؓ نے بیعت نہیں کی۔ نہ وہ جماعت میں شریک ہوتے تھے، نہ حضرت ابو بکرؓ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔“ (تاریخ طبری حصہ دوم۔ خلافت راشدہ حصہ اول مترجم محمد امجد تیم ص ۳۴)

جبکہ اس موقع کے لحاظ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات تو یہ ہیں کہ: اگر تم پر کوئی حبشی غلام بھی امیر بنا دیا جائے تو اس کا حکم سنو اور اس کی اطاعت کرو، جو ایسی حالت میں مرا کہ اس نے بیعت نہیں کی تو وہ جاہلیت کی موت مرا، جس نے جماعت چھوڑ دی وہ جاہلیت کی موت مرا۔

تاریخ طبری کے بیان کے مطابق کیا حضرت سعدؓ نے مذکورہ احکامات کی تعمیل کی تھی؟ حضرت عمرؓ کو پتہ چلا کہ کچھ لوگ حضرت فاطمہؓ کے گھر پر جمع ہیں اور وہ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کرنے سے انکار کر رہے ہیں تو:

”أتی عمر بن الخطاب منزل علیؓ، و فیہ طلحة والزبیر و رجال من المهاجرین، فقال: واللہ لأحرقن علیکم أوتلخرجن إلی البیعة، فخرج علیہ الزبیر مصلتاً بالسیف، فغتر فسقط السیف من یدہ، فوثبوا علیہ فأخلوه“

(تاریخ الامم والملوک الجزء الثانی ص ۴۴۳۔ طبع بیروت)

عمر بن خطابؓ، حضرت علیؓ کے مکان پر آئے وہاں طلحہ، زبیر اور دوسرے مہاجر صحابہؓ موجود تھے۔ عمرؓ نے کہا: اللہ کی قسم! میں اس گھر میں آگ لگا کر تم سب کو ضرور جلا دوں گا یا تم ضرور بیعت کے لئے باہر نکلو گے۔ تو اس دھمکی پر زبیرؓ تلوار نکال کر عمرؓ کی طرف بڑھتے تو فرش میں پاؤں الجھ جانے کی وجہ سے گر پڑے اور تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ تب اور لوگوں نے زبیرؓ پر یورش کر کے ان کو قابو میں کر لیا۔ (تاریخ طبری اردو جلد اول۔ سیرت النبی مص ۵۲۹۔ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی)

تاریخ طبری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ اقدام بھی حضرت ابو بکرؓ کی مشاورت سے اٹھایا تھا۔ اسی لئے ۱۳ھ میں اپنی مرض موت میں انہوں نے حضرت عبدالرحمن ابن عوفؓ کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اپنی ندامت کا اظہار کیا تھا کہ تین کام ایسے تھے کہ میری خواہش اور چاہت یہ ہے کہ کاش میں نے وہ چھوڑ دیئے ہوتے۔ ان میں سے ایک بیت فاطمہؓ کا معاملہ بھی ہے۔ ”فأما الثلاث ألا تری وددت أنى تركهن:

امام طبری --- کون؟

روایات طبری اور توہین صحابہؓ

قوددت أنى لم أكشف بيت قاطمة عن شئى وإن كانوا قد غلقوه على الحرب... (تاریخ الامم والملوک الجزء الثانى ص ۶۱۹ - طبع بیروت)

امام طبری حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد حضرت ابوسفیانؓ پر بہتان طرازی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”قال أبوسفیان، لعلی ما بال هذا الأمر فی أقل حی من قریش، والله لئن شئت لأملأ نھا علیہ خیلا ورجالا، قال فقال علی: یا أبا سفیان طال ما عادیت الإسلام و أهله فلم تضره بئلك شیئا، إنا وجئنا أبابکر لها أهلا... لما اجتمع الناس علی بیعة أبی بکر أقبل أبوسفیان وهو یقول: والله انی لأرى عجاجة لا یطفئها إلا دم، یا آل عبدمناف فیم أبوبکر من أمورکم؟ أین المستضعفان؟ أین الأذلان علی والعباس؟ وقال: أبا حسن، أبسط یدک حتی أبا یدک فأبى علی علیه...“

قال فزجره علی وقال: إناک والله ما أردت بهذا الا الفتنة و إناک والله طال ما بغیت الإسلام شر الا حاجة لنا فی نصیحتک...“

قال هشام بن محمد وأخبرنی أبو محمد القرشی قال لما بویع أبوبکر قال أبوسفیان لعلی والعباس: أنتم الأذلان...“

(تاریخ الامم والملوک الجزء الثانى ص ۴۳۹ - طبع بیروت)

ابوسفیانؓ نے علیؓ سے کہا: یہ کیا ہوا کہ حکومت قریش کے سب سے کم تعداد قبیلے میں چلی گئی۔ اللہ کی قسم! اگر تم چاہو تو میں ایک زبردست فوج سے اس حکومت کو ابوبکرؓ سے چھین لوں۔ علیؓ نے کہا: اے ابوسفیانؓ! تم ہمیشہ سے اسلام اور مسلمانوں کے دشمن رہے مگر تمہاری دشمنی سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ہم نے ابوبکرؓ کو حکومت کا اہل سمجھا ہے...

جب لوگ ابوبکرؓ کی بیعت کے لئے اکٹھے ہوئے تو ابوسفیانؓ سب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ: مجھے یقین ہے کہ اس کارروائی سے ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا جس میں خون ریزی ہو کر رہے گی۔ اے آل عبدمناف! ابوبکرؓ کو تمہارے معاملات میں مداخلت کرنے کا کیا

امام طبری --- کون؟

روایات طبری اور توہین صحابہؓ

حق ہے؟ وہ دونوں ذلیل کہاں ہیں؟ جن کو کمزور اور حقیر سمجھا گیا ہے یعنی علیؓ اور عباسؓ۔ اے ابو حسن! تم ہاتھ بڑھاؤ میں تمہاری بیعت کرتا ہوں مگر علیؓ نے اس کی بات نہ مانی..... پس علیؓ نے ابوسفیانؓ کو ڈانٹا اور کہا اس تجویز سے تیرا مقصد صرف فتنہ و فساد برپا کرنا ہے۔ تو نے ہمیشہ اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں تیری اس نصیحت کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہشام بن محمد کلبی ابو محمد القرشی سے روایت کرتے ہیں کہ:

ابوبکرؓ کی بیعت کے بعد ابوسفیانؓ نے علیؓ اور عباسؓ سے کہا کہ: تم دونوں ذلیل ہو کہ اس موقع پر خاموش ہو...

(حضرت ابوسفیانؓ سے متعلق امام طبری کے منقولہ کچھ مزید مغالطات آگے زیر عنوان: ”روایات طبری اور توہین سیدنا معاویہؓ“ آرہے ہیں)

حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا: ”مجھے خبر ملی ہے کہ تم یہ کہتے ہو کہ انہوں نے اسے (یعنی خلافت کو) ہم سے حسد اور ظلم کی وجہ سے الگ کر رکھا ہے۔“ حضرت ابن عباسؓ نے کہا: ”آپ نے ظلم کا ذکر کیا ہے تو ہر جاہل اور عقل مند پر ظاہر ہے۔ جہاں تک حسد کا ذکر ہے تو حسد تو ابلیس نے حضرت آدمؑ پر بھی کیا تھا۔ ان ہی کی اولاد ہم ہیں جن پر حسد کیا جا رہا ہے“ (تاریخ طبری اردو حصہ سوم خلافت راشدہ حصہ دوم ص ۲۸۲)

اس روایت میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی زبانی حضرت عمرؓ کو ”ظالم اور حاسد“ قرار دیا گیا ہے۔ کیا ظلم و حسد سے ان کے مابین باہمی محبت پیدا ہو سکتی ہے؟ امام طبری حضرت عثمانؓ کی بیعت کے موقع پر حضرت علیؓ کا احتجاج بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ”حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ کی خلافت کا اعلان کیا تو لوگ حضرت عثمانؓ کے چاروں طرف چھا گئے سب نے بیعت کی مگر حضرت علیؓ پیچھے رہ گئے۔ حضرت عبدالرحمنؓ نے کہا: ”جو عہد شکنی کرے گا اس کی عہد شکنی اس کی ذات کے لئے نقصان دہ ہوگی۔“

یہ سن کر حضرت علیؓ نے بیعت کی اور فرمایا: ”دھوکا اور فریب! کس قدر فریب دیا گیا ہے۔“ (تاریخ طبری حصہ سوم، خلافت راشدہ حصہ دوم ص ۳۱۰ - مترجمہ رشید احمد)

امام طبری خود اپنی سند (اپنے حوالے، قال ابو جعفر) سے لکھتے ہیں کہ:

”وقد كان الناس اتهموا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم... وقد عثمان بن عفان وعقبة بن عثمان وسعد بن عثمان رجلا من الأنصار حتى بلغوا الجلب جبالا بناحية المدينة مما يلي الأعوص، فأقاموا به ثلاثا ثم رجعوا إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم... (تاريخ الامم والملوك الجزء الثاني ص ۳۳۰ طبع بيروت)

اس روایت میں امام طبری (۳۱۰ھ) خود حضرت عثمانؓ کی توہین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ غزوہ احد سے فرار ہو کر مدینہ کے کنارے میں واقع ایک پہاڑی ”جلب“ کے قریب چلے گئے جہاں وہ تین دن روپوش رہنے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آئے۔

امام طبری نے ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی حضرت عثمان کو کافر اور یہودی کہہ کر واجب القتل قرار دیا۔ ملاحظہ فرمائیں:

”أقتلو نعتلاً فقد كفر قالت إنهم استأبوهم ثم قتلوه...“

(تاريخ الامم والملوك الجزء الثالث ص ۴۷۷ - تحت سنة ۳۶ھ)

اس طرح امام طبری نے خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب ایک قول سے قتیلین عثمانؓ کو قتل عثمانؓ کے جواز کی ایک ”دلیل“ فراہم کر دی۔ موصوف نے محاربین علیؓ ہی کو نہیں بلکہ جابہ جا حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی، زبیر، سعد بن عبادہ، ابو موسیٰ اشعری، عمرو بن العاص، ابوسفیان، عباس بن عبدالمطلب اور حسین رضی اللہ عنہم کو بھی ہدف تنقید بنا ڈالا۔

جنگ صفین کے موقع پر ایک کذاب راوی کی روایت کی بنیاد پر تمام محاربین علیؓ کو فاسق اور باطل پر قرار دے دیا۔

”قال أبو مخنف... أن عمار بن ياسر خرج إلى الناس فقال: اللهم إني أعلم أن رضاك في أن أذنب نفسي في هذا البحر لفعلة - اللهم إني أعلم أن رضاك في أن أضع ظبة سيفي في صدري ثم أتحني عليها حتى تخرج من ظهري لفعلة، وإني لا أعلم اليوم عملاً هو أَرْضَى لك من جهاد هؤلاء

لفاسقين، ولو أعلم أن عملاً من الأعمال هو أَرْضَى لك منه لفعلة...“

والله إني لأرى قوماً ليضربنكم ضرباً يرتاب منه المبطلون و أيم الله لو ضربونا حتى يبلغوا بنا سعات هجر لعلنا أنا على الحق وإنيهم على الباطل“

(تاريخ الامم والملوك الجزء الرابع ص ۲۶-۲۷ تحت سنة ۳۷ھ طبع بيروت)

ابو مخنف (کذاب) سے روایت ہے کہ حضرت عمار بن یاسرؓ نے لوگوں کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا: اے اللہ! آپ جانتے ہیں: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کی رضا اس میں ہے کہ میں اپنے آپ کو اس سمندر میں غرق کروں تو میں یہ بھی کر گزرتا۔ اے اللہ! آپ جانتے ہیں کہ مجھے اس کا علم ہوتا کہ آپ کی رضا اس میں ہے کہ میں اپنے سینے پر تلوار کی نوک رکھ کر اس پر گر جاؤں اور وہ میری پشت سے نکل جائے تو میں یہ بھی کر گزرتا۔ آج کے روز مجھے کسی ایسے عمل کا علم نہیں جو ان فاسقوں کے ساتھ جہاد کرنے سے بہتر ہو اور اگر مجھے کسی ایسے عمل کا علم ہوتا جو اس عمل سے زیادہ آپ کی رضا کا باعث ہوتا تو میں اسے ضرور انجام دیتا... اللہ کی قسم میں ایک ایسی قوم کو دیکھ رہا ہوں جو تمہیں خوب مارے گی اور جس کی مار سے باطل پرست روگردانی کرتے ہیں۔ اللہ کی قسم! اگر وہ میں مارتے مارتے ہجر کے کھجوروں کے باغوں تک بھی پہنچا دیں گے تب بھی ہم یہی یقین رکھیں گے کہ ہم حق پر ہیں اور یہ لوگ باطل پر۔

صفین کے مقام پر جنگ کے خاتمے کے لئے اہل شام کی طرف سے جب مصاحف بلند کئے گئے تو بقول امام طبری حضرت علیؓ نے فرمایا کہ:

”عباد الله امضوا على حاكمكم وصدقكم قتال علوكم فان معاوية وعمر بن العاص وابن أبي معيط وحيب بن مسلمة وابن أبي سرحه والضحاك بن قيس ليسوا بأصحاب دين ولا قرآن، انا أعرف بهم منكم وقد صحبتهم أطفالاً وصحبهم رجالاً فكانوا شر أطفال و شر رجال...“

(تاريخ الامم والملوك الجزء الرابع ص ۳۲-۳۳ تحت سنة ۳۷ھ طبع بيروت)

اے اللہ کے بندو! تم اپنے حق و صداقت اور اپنے دشمنوں سے جنگ پر قائم رہو۔

امام طبری --- کون؟

روایات طبری اور توہین صحابہؓ

کیونکہ معاویہ، عمرو بن العاص، عقبہ بن ابی معیط، حبیب بن مسلمہ، عبداللہ بن ابی سرح اور ضحاک بن قیس نہ دین والے ہیں اور نہ قرآن والے۔ (یعنی نہ ان کا دین ہے اور نہ ہی ان کا ایمان) میں تم سے زیادہ ان لوگوں سے واقف ہوں۔ میں تو بچپن میں بھی ان لوگوں کے ساتھ رہا اور بڑے ہو کر بھی ان کے ساتھ رہا۔ یہ بچپن میں نہایت شریہ سچے تھے اور بڑے ہو کر بھی نہایت شریہ آدمی نکلے۔

امام طبری نے صحابہ کرامؓ کا کس قدر مکروہ نقشہ پیش کیا ہے۔ کیا بے دین، بے ایمان اور شریہ لوگ ”رضی اللہ عنہم و رضو عنہ“ کا مصداق ہو سکتے ہیں؟
امام طبری اپنے ”مشارح“ حضرت ابوحنیفہ اور محمد بن السائب کلبی کی روایت سے حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا ”تحکیم“ کے موقع پر ایک یہ کردار پیش کرتے ہیں کہ:

”فقال أبو موسى: مالك لا وفقك الله غدرت و فجرت إنما مثلك كمثل الكلب إن تحمل عليه يلهث أو تتركه يلهث۔“

قال عمرو: إنما مثلك كمثل الحمار يحمل أسفارا.....

(تاریخ الامم والملوک الجزء الرابع ص ۵۲۔ تحت سنة ۳۷ھ طبع بیروت)
ابوموسیٰ نے کہا: اے عمرو: تجھے کیا ہو گیا۔ اللہ تجھے نیک کام کی توفیق نہ دے تو نے غداری کی اور دھوکا دیا۔ تیری مثال کتے کی مثال کی طرح ہے کہ اگر اسے کچھ ڈالو تب بھی زبان نکالے رہتا ہے اور اگر چھوڑ دو تب بھی زبان نکالے رہتا۔ اس پر عمرو بن عاصؓ نے جواب دیا کہ: اے ابوموسیٰ! تیری مثال گدھے کی مثال کی طرح ہے جس پر کتابوں کا بوجھلدا ہو۔

پھر شریح بن ہانی نے فاتح مصر حضرت عمرو بن عاصؓ کو کوڑے مارنے شروع کر دیئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ نے شریح کو مارا خوب مار پیٹ ہوئی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما دونوں جلیل القدر صحابی ہیں۔ انہوں نے حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی طرف سے جنگ صفین

امام طبری --- کون؟

روایات طبری اور توہین صحابہؓ

میں ”ثالثی“ کا کردار ادا کیا تھا جس کی بناء پر امام طبری نے ”کان یضع للرواقض“ کے تحت خود یہ روایت گھڑ لی یا پھر کسی دشمن صحابہ کے الفاظ نقل کر دیئے۔ دونوں صورتوں میں حضرت موصوف خود ہی مجرم ہیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ: ”اے اللہ اس کو باعزت مقام میں داخل کرو۔ مجھ سے ہیں، میں ان سے ہوں“ (صحیح مسلم ابواب الفصائل)
اور عمرو بن العاص کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”لوگ اسلام لائے اور عمرو بن العاص ایمان لائے اور اپنی وفات تک ان سے محبت کرتے رہے“ (مسند احمد)

امام طبری نے ان عظیم لوگوں کا کردار جس مکروہ اور بھونڈے طریقے سے پیش کیا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: نبوت (ویز کہیں) ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

حضرت علیؓ کو جب اس فیصلے سے آگاہ کیا گیا تو انہوں نے صبح کی نماز میں ”قنوت“ میں ”دعا“ پڑھنا شروع کر دی کہ: ”کان إذا صلی الغدلة یقنت فیقول: اللہم العن معاویة و عمرا، وأبا الاعور السلمي و حبیباً و عبدالرحمن بن خالد (بن ولید) والضحاک بن قیس و الولید... قبلغ ذلك معاویة فکان إذا قنت: لعن علیاً وابن عباس والأشتر و حسناً و حسیناً...“ (حوالہ مذکور ص ۵۲)

اے اللہ معاویہ، عمرو بن عاص، ابوالاعور سلمی، حبیب بن مسلمہ، عبدالرحمن بن خالد (بن ولید) ضحاک بن قیس اور ولید بن عقبہ پر لعنت مازل فرما۔ پھر جب حضرت معاویہ کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے بھی قنوت میں حضرت علیؓ، ابن عباس، اشتر، حسن اور حسین پر لعنت بھیجی شروع کر دی۔ لا حول ولا قوة الا بالله العلی العظیم۔ فلعنة الله على الكذابين

روایات طبری اور توہین سیدنا معاویہؓ

گذشتہ عنوان کے تحت یہ بتایا جا چکا ہے کہ امام طبری نے متعدد کبار صحابہ کرامؓ کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے مگر حضرت معاویہؓ پر انہوں نے جو ستم ڈھایا ہے وہ کم از کم کسی کلمہ کو مسلمان کے شایان شان ہرگز نہیں ہے۔ تاریخ طبری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ”رافضیہ، مجوسیت اور سہانیت“ کے گٹھ جوڑیا تگڈم نے ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید طبری کا روپ دھار لیا ہے یا پھر امام طبری نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں اس ”تگڈم“ کی تحقیق پر اندھا اعتماد کر کے اسے اپنی تاریخ کا حصہ بنا دیا ہے۔

اگر امام طبری بالفرض حضرت معاویہؓ ہی کو ہدف تنقید بناتے تو پھر بھی اس کا یہی مطلب لیا جاتا کہ وہ جملہ صحابہ کرامؓ کی توہین کے مرتکب ہوئے ہیں کیونکہ جس طرح ایک نبی یا رسول کا انکار سب انبیاء و رسل کے انکار کو مستلزم ہے۔ اسی طرح ایک صحابی کی توہین بھی جملہ صحابہ کی توہین سمجھی جائے گی۔ قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط اور قوم نوح نے اگرچہ اپنے اپنے رسول ہی کی تکذیب کی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اسے سب رسولوں کی تکذیب قرار دیا۔ ملاحظہ ہو:

وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحَجَرِ الْمُرْسَلِينَ ۝ (الحجر آیت ۸۰)

اور حجر والوں (یعنی قوم ثمود) نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ۝ (الشعراء آیت ۱۰۵)

نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔

كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ ۝ (الشعراء آیت ۱۲۳)

قوم عاد نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ۝ (الشعراء آیت ۱۴۱)

قوم ثمود نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ۝ (الشعراء آیت ۱۶۰)

قوم لوط نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔

كَذَّبَ أَصْحَابُ لَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ ۝ (الشعراء آیت ۱۷۶)

ایکہ والوں (قوم شعیب) نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔

امام طبری نے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سمیت متعدد صحابہ کے خلاف بد تصریح نام مبنی بر توہین روایات نقل کی ہیں؛ جن میں جا بہ جا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اسم گرامی کے ساتھ ”لعنہ اللہ“ کے الفاظ اور جوار لعنت کے دلائل تحریر کئے گئے جو صدیوں سے مسلسل نقل ہوتے چلے آ رہے ہیں جنہیں براہِ لکھا اور پڑھا بھی جا رہا ہے۔ حضرت معاویہؓ کو بد تصریح نام ”ضال و مضل“ لکھا گیا، پھر امام طبری نے وہ کارنامہ سرانجام دیا جس کا کوئی شریف انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ امام طبری کے چہرے پر سے نقابِ تقیہ اتارنے اور قارئین کو ان کی اصل تصویر دکھانے کی خاطر بکثرت توہید استغفار کرتے ہوئے، ”فقل کفر، کفر نباشد“ کے اصول کے تحت انتہائی دل آزار اور ناقابلِ برداشت عبارات نذر قارئین کی جا رہی ہیں تاکہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ: کیا امام طبری مذکورہ آیات کریمات کی روشنی میں جملہ صحابہ کرامؓ کی توہین کے مرتکب نہیں ہوئے؟ کیا اس موقع پر یہ جواب کسی بھی لحاظ سے اطمینان بخش ہو سکتا ہے کہ وہ سند لکھ کر بری الذمہ ہو گئے ہیں؟

اگر بالفرض کسی مفسر، محدث، فقیہ، مؤرخ، عالم اور صوفی کے والد محترم کو کوئی راوی ”ضال و مضل، فرعون و ملعون“ کے ”اعزاز“ سے نوازنا تو کیا وہ انہیں اپنی کتب میں ”باسند“ نقل کر کے راوی کی چھان پھٹک کی ذمہ داری آنے والے علماء پر چھوڑ سکتا تھا؟

کیا اس ”نظریہ فکر“ کے حامی علماء کرام اپنے اکابر کے بارے میں اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے پر محض روایت کی سند دیکھ کر مطمئن یا خاموش رہ سکتے تھے؟ کیا وہ تب بھی یہ بودی دلیل دے سکتے تھے کہ مؤرخ ”سند“ لکھ کر بری الذمہ ہو گیا ہے اور یہ مستقبل کے محققین کی ذمہ داری ہے کہ وہ ”سند“ کی چھان پھٹک کریں؟ کیا جس سے اللہ راضی ہو جائے وہ لعنت

امام طبری --- کون؟

روایات طبری اور توہین سیدنا معاویہؓ

کا مستحق ہو سکتا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اعزاز ”رضی اللہ عنہم“ کو کوئی مؤرخ یا راوی ”لعنہم اللہ“ میں تبدیل کر سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص فی الواقع لعنت کا مستحق نہ ہو تو کیا از روئے شریعت اس پر لعنت کرنے والا یا لعنت کے الفاظ نقل کرنے والا یا ان کی تصدیق کرنے والا یا اس ناقل کی وکالت کرنے والا خود لعنت کا مستحق نہیں ہو جاتا؟ حضرت معاویہؓ سمیت جملہ صحابہ کرام کو اللہ تعالیٰ نے بے بیغہ ماضی، ابدلاً با دتک ”رضی اللہ عنہم“ کے اعزاز سے نوازا ہے لہذا وہ اس ”الہی اعزاز“ سے کبھی بھی محروم نہیں کئے جاسکتے۔

بہر حال امام طبری کے وکلاء صفائی کا یہ جواب کہ وہ ”سند“ بیان کر کے بری الذمہ ہو گئے ہیں قرآن وحدیث کے حکم کے صریح خلاف ہے اس کی تفصیل آگے مستقل عنوان کے تحت آ رہی ہے۔ اس تمہید کے بعد حضرت معاویہؓ کے بارے میں امام طبری کی منقولہ چند توہین آمیز عبارات ملاحظہ فرمائیں:

”وإنهم على الباطل“ حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھی باطل پر ہیں، ”هؤلاء الفاسقين“ یہ لوگ فاسق ہیں۔ ”قال علي: فإن معاوية... ليسوا بأصحاب دين ولا قرآن، أنا اعرف بهم منكم... فكانوا شرّ أطفال و شرّ رجال“۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھی دین والے اور قرآن والے نہیں ہیں (یعنی بے دین اور بے ایمان ہیں) میں تم سے زیادہ ان لوگوں سے واقف ہوں۔ وہ بچپن میں بھی شریر تھے اور بڑے ہو کر بھی شریر ہی رہے۔

”كان إذا صلى الغداة بقنت فيقول: اللهم العن معاوية...“ حضرت علیؓ صبح کی نماز میں قنوت پڑھتے اور فرماتے اے اللہ معاویہؓ (اور ان کے ساتھیوں) پر لعنت کر۔ (تاریخ الامم والملوک، الجزء الرابع ص ۲۷، ۲۸، ۲۹)

”أقر معاوية سمرة بن (جندب) بعد زياد ستة أشهر، ثم عزله، فقال سمرة لعن الله معاوية، والله لو أطعت الله كما أطعت معاوية ما عذبني أبداً“۔ (حوالہ مذکور ص ۲۱۷)

زیاد کی وفات کے بعد حضرت معاویہؓ نے سرہ بن جندبؓ کو بصرہ پر چھ ماہ تک حاکم رکھا پھر انہیں معزول کر دیا، سرہؓ کہتے تھے کہ اللہ لعنت کرے معاویہؓ پر۔ جتنی اطاعت اس کی

امام طبری --- کون؟

روایات طبری اور توہین سیدنا معاویہؓ

میں نے کی اگر اللہ کی کرنا تو عذاب ابدی سے نجات پاتا۔

”وكان جعفر بن أبي سفيان ممن ثبت يوم حنين مع رسول الله صلى الله عليه وسلم من أصحابه، ولم يزل مع أبيه ملازماً لرسول الله حتى قبض، وتوفي جعفر في وسط خلافة معاوية لعنه الله (تاريخ الرسل والملوڪ، القسم الرابع جلد ۱۳ ص ۲۳-۲۴)

جعفر بن ابی سفیانؓ ان صحابہ کرامؓ میں سے ایک ہیں جو غزوہ حنین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے اور زندگی بھر اپنے والد (ابو سفیانؓ) کے ساتھ آپؐ کی بارگاہ میں حاضر رہے۔ حضرت جعفرؓ، معاویہؓ ”لعنه الله“ (اللہ اس پر لعنت کرے) کی خلافت کے درمیان میں فوت ہوئے۔

”وقد روى نوفل بن معاوية عن النبي صلى الله عليه وسلم، و توفي نوفل في خلافة يزيد بن معاوية لعنهما الله“۔ (المنتخب من كتاب ذيل المزيل من تاريخ الصحابة والتابعين۔ الملحق بالجزء الثامن ص ۳۷۔ طبع بيروت تحت ”ذكر من مات لوقتل سنة ۸۰ھ)

نوفل بن معاویہؓ نے نبیؐ سے حدیث روایت کی ہے اور نوفلؓ مدینہ منورہ میں یزید بن معاویہؓ ”لعنہما اللہ“ (ان دونوں پر اللہ کی لعنت ہو) کی خلافت میں فوت ہوئے۔

امام طبری نے حضرت معاویہؓ کو مرض الموت میں بھی نہیں بخشا حالانکہ اس بازک وقت میں تو بڑے سے بڑے گناہگار کو بھی فکر آخرت دامن گیر ہو جاتی ہے مگر ان کی طرف ایک من گھڑت وصیت نامہ کو منسوب کر دیا۔ چنانچہ موصوف نے حضرت معاویہؓ کے آخری لمحات کے موقع پر بھی سقیفہ بنی ساعدہ والا نقشہ کھینچ دیا جس میں حضرت معاویہؓ، حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم تینوں کی شدید ترین توہین پائی جاتی ہے چنانچہ امام طبری لکھتے ہیں کہ:

”معاوية لوجب مرض موت لالحق هو اتوا اپنے بیٹے یزید کو بلایا اور کہا: اے میرے بیٹے! میں نے تجھے زحمت ومشقت سفر سے بچالیا۔ تیرے ہر امر کو آسان کر دیا، تیرے لئے دشمنوں کو میں نے رام کر دیا، تیرے لئے عرب کی گردنوں کو میں نے جھکا دیا۔ تیرے لئے جو کچھ میں نے جمع کیا ہے وہ کسی نے نہ کیا ہوگا۔ مجھے اس بات کا اندیشہ نہیں ہے کہ امر خلافت جو تیرے لئے یقینی ہو چکا

امام طبری --- کون؟

روایات طبری اور توہین سیدنا معاویہؓ

ہے قریش میں سے چار شخصوں کے سوا کوئی تجھ سے اس باب میں نزاع کرے گا: حسین بن علی، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمن بن ابی بکر (رضی اللہ عنہم)۔

فأما عبدالله بن عمر فرجل قد وقلته العبادة، واذلم يبق أحد غيره بايعك واما الحسين بن عليّ فإن أهل العراق لن يدعوه حتى يخرجه، فإن خرج عليك فظفرت به فاصفح عنه، فإن له رحماً ماسة وحقاً عظيماً، واما ابن أبي بكر فرجل لن رأي أصحابه صنعوا شيئاً صنع مثلهم ليس له همة إلا في النساء واللّهو واما الذي يچشم لك جنوم الأسد و يروغك مرواغة الثعلب فاذا أمكنته فرصة و ثب فذاك ابن الزبير فإن هو فعلها بك فقلرت عليه فقطعه لرباً إرباً۔ (تاریخ الامم والملوک - الجزء الرابع ص ۲۳۸ - تحت سنة ۵۶۰)

”ان میں سے عبداللہ بن عمرؓ کا عبادت نے کام تمام کر دیا ہے اور جب وہ دیکھیں گے کہ ان کے سوا کوئی باقی نہیں رہا تو وہ بھی تجھ سے بیعت کر لیں گے۔ اور حسینؓ بن علیؓ کو عراق کے لوگ جب تک خروج پر آمادہ نہ کر لیں گے، ہرگز نہ چھوڑیں گے۔ اگر وہ تجھ پر خروج کریں اور تو ان پر قابو پا جائے تو درگزر کرنا۔ ان کو قرابت قریبہ حاصل ہے اور بہت بڑا حق رکھتے ہیں۔ اور عبدالرحمن بن ابی بکرؓ وہ شخص ہے کہ اپنے ساتھیوں کو جو کام کرتے دیکھو ویسا ہی خود بھی کرے گا۔ اسے عورتوں اور لہو ولعب کے سوا کسی بات کا خیال نہیں۔

ہاں جو شخص شیر کی طرح تیری گھات میں بیٹھے گا اور لومڑی کی طرح تجھے دھوکہ دے گا جب اسے موقع ملے گا حملہ کر دے گا وہ ابن زبیرؓ ہے۔ اگر ایسی حرکتیں وہ تیرے ساتھ کرے اور تیرے قابو میں آ جائے تو اس کے ٹکڑے اڑا دینا۔“

امام طبری نے حضرت معاویہؓ کا یہ وصیت نامہ اپنے ”مشارح“ جناب ہشام بن محمد بن سائب کلبی اور حضرت ابو جعفر لوط بن یحییٰ کی سند سے نقل کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ امام طبری نے اپنی تاریخ کا اکثر حصہ انہی راویوں اور ان کے ہم خیال و ہم مسلک حضرات کے ”تعاون“ سے ہی مرتب کیا ہے۔ نہ رجال نے کلبی اور ابو جعفر پر شدید قسم کی جرح کی ہے کہ یہ غیر معتبر، ضعیف و متروک، قصہ کو، اخباری، کذاب، دجال، رافضی اور آگ لگانے

امام طبری --- کون؟

روایات طبری اور توہین سیدنا معاویہؓ

والے شیعہ ہیں۔ ان کے مفصل حالات پیچھے زیر عنوان ”روایات طبری“ گذر چکے ہیں۔ صد افسوس کہ امام طبری نے ابن کلبی اور ابو جعفر جیسے غیر معتبر، ضعیف، متروک، قصہ کو، اخباری، کذاب، دجال، رافضی اور آگ لگانے والے شیعہ راویوں پر اعتماد کر کے حضرت معاویہؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ پر الزامات عائد کر کے صحابہ کرامؓ کے بارے میں قرآن و حدیث کے واضح احکامات کو پیش پشت ڈال دیا۔

اگر بفرض محال یہ سارے راوی اور ناقل رافضی اور کذاب نہ بھی ہوتے تو پھر بھی اس ”وصیت نامے“ کے جھوٹے اور جعلی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کا اسم گرامی ہے۔ حضرت معاویہؓ کی یہ وصیت رجب ۶۰ ہجری میں ان کے مرض الموت میں تحریر کی جارہی ہے مگر آں محترم جیسے صاحب بصیرت، ملکی اور عالمی حالات، شخصیات اور واقعات پر گہری نظر رکھنے والے عظیم مدبر اور سیاست دان کی زبان سے حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کا نام نکلوا یا جا رہا ہے جو وصیت نامہ تحریر ہونے سے سات سال پہلے ۵۳ھ میں وفات پا چکے تھے۔ اگر کسی شخص کو ان کے سن وفات سے اختلاف ہو تو پھر بھی یہ بات قطعی ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ وصیت نامہ کی تحریر یا املاء سے پہلے وفات پا چکے تھے۔

علاوہ ازیں ان پر یہ بدترین الزام بھی لگایا گیا ہے کہ انہیں ”عورتوں اور لہو ولعب“ کے سوا کسی بات کا خیال نہیں جبکہ ان کی ساری زندگی جہاد اور اللہ کا کلمہ سر بلند کرنے میں گذری۔ اول تو وہ مذکورہ وصیت کے وقت دنیا میں موجود ہی نہیں تھے اور اگر بالفرض وہ اس وقت زندہ بھی ہوتے تو اس وقت ان کی عمر ۷۰ سال سے کچھ زائد ہوتی۔ کیا یہ عمر امام طبری کے نزدیک کھیل کود لہو ولعب اور عورتوں سے دلچسپی کی ہوتی ہے؟

امام طبری نے حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد حضرت حسینؓ کی زبانی حضرت معاویہؓ کو ”طاغیة و فرعون“ کا لقب بھی دلایا ہے۔ حالانکہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے حضرت معاویہؓ کے ساتھ آخر وقت تک مثالی تعلقات قائم رہے اور ان حضرات نے باہمی ادب و احترام میں بھی کبھی کوئی فرق نہ آنے دیا۔ چنانچہ امام ابن کثیر (۷۴۷ھ) فرماتے ہیں کہ:

”فیکرمہما معاویۃ إکراماً ما زائدًا و یقول لهما مرحبا و أهلا، و یعطیہما عطاء جزیلا، و قد أطلق لهما فی یوم واحد ماثنی ألف...“ (البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۱۵۱)

تو حضرت معاویہؓ ان دونوں کی بہت زیادہ نگریم کرتے، مرحبا و اهلا کے الفاظ سے ان کا استقبال کرتے، عطیات کثیرہ سے نوازتے اور بعض اوقات ایک دن میں دو، دو لاکھ درہم بھی پیش کر دیتے تھے۔ حضرت حسنؓ کی وفات (۵۰ھ) کے بعد بھی حضرت حسینؓ باقاعدہ ہر سال شام تشریف لے جاتے رہے۔

اگر بالفرض حضرت معاویہؓ منصب خلافت پر فائز نہ بھی ہوتے تو پھر بھی بحیثیت صحابی اور عمر میں بڑے ہونے کی بناء پر حضرت حسینؓ پر ان کا ادب و احترام فرض تھا لیکن امام طبری نے (اپنے راوی کے ذریعے) حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد حضرت حسینؓ کی زبان مبارک سے جو الفاظ نکلوائے وہ کسی عام مسلمان کے بھی شایان شان نہیں ہیں تو پھر حضرت حسینؓ جیسی شخصیت کی طرف ان کو کیوں کر منسوب کیا جاسکتا ہے؟ مگر امام طبری کو اس سے کیا غرض؟ ان کا مقصد تو محض حضرت معاویہؓ کو کسی نہ کسی طرح مطعون کرنا ہے۔

حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد گورز مدینہ ولید بن عتبہ نے اپنے قاصد کے ذریعے حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو طلب کیا:

”فوجلہما فی المسجد و ہما جالسان فاتاہما فی ساعة لم یکن الولید یجلس فیہا للناس ولا یأتیانہ فی مثلہا، فقال: أجبیا الأمير بدعو کما۔ فقال له: انصرف الآن نأتیہ، ثم أقبل أحدهما علی الآخر، فقال عبداللہ بن الزبیر للحسین: ظنَ فیما تراه بعث إلینا فی هذه الساعة التي لم یکن یجلس فیہا، فقال حسین: قد ظننت أری ”طاغیتہم“ قد هلك فبعث إلینا لیاخذنا بالبیعة قبل أن یفتو فی الناس الخیر فقال و أنا ما أظنَ غیرہ... قددخل فسلم علیہ بالإمرۃ، و مروان جالس عنده، فقال حسین: كأنہ لا یظن ما یظن من موت معاویۃ، الصلة خیر من القطعۃ، أصلح اللہ ذات ینکما قلم یجیبہا فی ہذا بشئ، و جاء حتی جلسہ فأقرأہ الولید الکتاب و نعیٰ له معاویۃ و دعاه الی البیعة۔ فقال

حسین: إنا لله و إنا الیہ راجعون و رحم اللہ معاویۃ و عظم لك الأجر... (تاریخ الامم والملوک الجزء الرابع ص ۲۵۱ تحت سنة ۶۰ھ بطع بیروت)

اس (قاصد) نے ان دونوں (حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ) کو مسجد میں پایادہ بیٹھے ہوئے تھے کہ اس نے آ کر کہا: امیر نے تم دونوں کو طلب کیا ہے۔ یہ وقت ایسا تھا کہ ولید اس وقت لوگوں سے نہیں ملتا تھا، نہ ہی یہ دونوں حضرات کبھی ایسے وقت میں اس سے ملنے کو جاتے تھے۔ دونوں نے یہ جواب دیا: اس وقت تم جاؤ، ہم ابھی آتے ہیں۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے اب حسینؓ سے پوچھا اس وقت تو ولید کسی سے ملتا نہیں۔ بتاؤ کیوں ہم لوگوں کو بلایا ہے؟ حسینؓ نے کہا: میں سمجھتا ہوں ان لوگوں کا ”فرعون“ ہلاک ہو گیا ہے ہم کو اس لئے بلا بھیجا ہے کہ اس خبر کے فاش ہونے سے پہلے ہی بیعت کے لئے ہم پر مواخذہ کرے۔

ابن زبیرؓ نے کہا: میں بھی یہی سمجھتا ہوں (پھر پوچھا تمہارا کیا ارادہ ہے؟) کہا اسی وقت اپنے جوانوں کے ساتھ ولید کے پاس جاتا ہوں۔ دروازے پر ان لوگوں کو روک دوں گا اور خود اس کے پاس جاؤں گا۔ ابن زبیرؓ نے کہا: اگر تم اس کے پاس گئے تو مجھے تمہاری جان کا اندیشہ ہے۔ حسینؓ نے کہا: میں اس طرح جاؤں گا کہ نکل بھی سکوں)

حضرت حسینؓ داخل ہوئے اور السلام علیک یا امیر کہا۔ مروان اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ حسینؓ نے موت معاویہؓ سے انجان ہو کر کہا: نیل رکھنا ترک ملاقات سے بہتر ہے۔ خدا نے تم دونوں آدمیوں میں صلح کرا دی، دونوں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ حسینؓ آ کر بیٹھ گئے تو ولید نے خط پڑھ کر سنایا، معاویہؓ کے مرنے کی خبر دی اور بیعت کا طالب ہوا۔ حسینؓ نے یہ سن کہ ”اللہ وانا الیہ راجعون“ کہا اور کہا کہ خدا معاویہؓ پر رحم کرے (اور بیعت کا جو تم نے مجھ سے سوال کیا تو میں پوشیدہ طور پر بیعت کرنے والا نہیں...) (تاریخ طبری جلد چہارم ص ۱۶۴۔ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی)

امام طبری نے ایک ہی صفحہ پر حضرت حسینؓ کا متضاد کردار پیش کیا ہے کہ پہلے مسجد نبوی میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے سامنے حضرت معاویہؓ کے بارے میں تو یہ کہتے ہیں کہ ’ان کا

امام طبری --- کون؟

روایات طبری اور توہین سیدنا معاویہؓ

فرعون ہلاک ہو چکا ہے“ (یہ کردار کسی بھی مسلمان کے شایان شان نہیں) پھر کورز کے سامنے تعزیت کرتے ہوئے کلمہ ”استرجاع“ پڑھتے ہیں۔

امام طبری (م ۳۱۰ھ) اپنی تاریخ میں ۶۱ھ کے واقعات کے تحت بروایت ابو جعفر لکھتے ہیں کہ یزید بن معقل نے مدیر سے کہا کہ تم کو یاد ہوگا کہ میں بنی لوزان میں تمہارے ساتھ چل رہا تھا اور تم یہ کہتے جاتے تھے کہ:

”إن عثمان بن عفان كان على نفسه مسرفاً، و ان معاوية بن أبي سفيان ضال مضل و ان امام الهدي والحق على بن أبي طالب۔

فقال له بريرة: اشهد أن هذا رأي و قولی ...

عثمان بن عفان نے اپنے نفس کے ساتھ اسراف کیا اور معاویہ گمراہ و گمراہ کنندہ ہے۔ اور امام ہدی و برحق علی بن ابی طالب ہیں۔ مدیر نے کہا ہاں ہاں یہی میرا عقیدہ ہے اور یہی میرا قول ہے۔ (تاریخ الامم والملوک الجزء الرابع ص ۳۲۸ تحت سید ۶۱ھ طبع بیروت۔ لبنان)

امام طبری، حضرت علیؓ (م ۴۰ھ) اور حضرت معاویہؓ (م ۶۰ھ) دونوں کی وفات کے بعد کاملاً مکالمہ لکھ رہے ہیں۔ حضرت علیؓ کے خلیفہ برحق و راشد ہونے میں تو کوئی مومن شک نہیں کر سکتا مگر کیا اس کے ساتھ ساتھ حضرت معاویہؓ کو ”ضال و مضل“ کہنا بھی ضروری ہے۔

امام طبری نے ایک بدترین ظلم یہ کیا ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کے خلاف خلیفہ ”المأمون“ (م ۲۱۸ھ) عباسی کی تیار کردہ ”خفیہ دستاویز“ (جو المعتمد باللہ (م ۲۷۹ھ) کے برسر اقتدار آنے تک ”خفیہ“ رہی) کو اپنی تاریخ میں محفوظ کر کے حضرت معاویہؓ پر لعن و طعن اور سب و شتم کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھول دیا جس سے ہر دور میں خود ”اہل سنت“ کا ایک طبقہ متاثر ہوتا رہا اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ (اس کی ایک جھلک زیر نظر کتاب میں پیش کی گئی ہے)

مذکورہ ”خفیہ دستاویز“ کے متعلق امام طبری لکھتے ہیں کہ:

اسی سال (یعنی ۲۸۴ھ میں) المعتمد باللہ نے منبروں پر حضرت معاویہ بن ابی سفیان پر لعنت کرنے کا پختہ ارادہ کیا اور اس کے متعلق ایک فرمان لکھنے کا حکم دیا کہ لوگوں کو

امام طبری --- کون؟

روایات طبری اور توہین سیدنا معاویہؓ

پڑھ کر سنایا جائے۔ عبید اللہ بن سلیمان بن وہب نے عوام کے اضطراب کا خوف دلایا کہ اندیشہ ہے کہ فتنہ ہوگا مگر اس نے اس کی پروا نہ کی۔

”وقی هذه السنة عزم المعتضد بالله على لعن معاوية بن أبي سفيان على المنابر وأمر بإنشاء كتاب بذلك يقرأ على الناس فحقوه... فلم يلتفت إلى ذلك...“
پھر المعتمد نے یہ فرمان جاری کیا کہ جو لوگ مناظرہ یا بحث کے لئے جمع ہوں گے سلطنت ان سے بری الذمہ ہے جو شخص یہ کرے گا وہ اپنے لئے زد و کوب کو حلال کر دے گا... پھر سب کو یہ حکم دیا گیا کہ معاویہ پر رحمت نہ بھیجیں (یعنی رحمۃ اللہ علیہ نہ کہیں) اور نہ بھلائی کے ساتھ ان کا ذکر کریں۔ (”... الا يترحموا على معاوية ولا يذكروه بخير“)

بعد ازاں المعتمد نے اس کتاب کے نکالنے کا حکم دیا جو لعن معاویہ میں المأمون کے حکم سے لکھی گئی تھی یہ کتاب اس کے حکم سے دفتر سے نکالی گئی اس کے جمع کرنے والوں سے اس کتاب کی نقل لے لی گئی۔

اس کتاب میں قرآن اور حدیث کی رو سے ثابت کیا گیا کہ بنی امیہ ”شجر ملعونہ“ ہے۔ (والشجرة الملعونة في القرآن) یہ خاندان نبوت کے دشمن ہیں۔ آپ کا سب سے بڑا مخالف بنو امیہ کا ابو سفیان بن حرب اور اس کا گروہ ہے جن پر کتاب اللہ میں لعنت کی گئی، جن پر لسان نبوت سے لعنت کی گئی، یہ لوگ اسلام کے غلبہ کی وجہ سے منافقانہ اسلام لائے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گدھے پر سوار ابو سفیان اور اسے کھینچنے والے معاویہ اور ہانکنے والے یزید بن ابی سفیان کے متعلق فرمایا کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ کے لئے فرمایا:

”يطلع من هذا الفج رجل من أمتي يحشر على غير ملتي فطلع معاوية ___ اذا رأيتم معاوية على منبري فاقتلوه ___

”اُس پہاڑی راستے سے میری امت میں سے ایک شخص نکلے گا جس کا حشر میرے دین کے خلاف ہوگا۔ اس کے بعد اس راستے سے معاویہ نمودار ہوا۔ ایک دوسری حدیث میں آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب تم لوگ معاویہ کو میرے منبر پر دیکھنا تو اسے قتل کر دینا“
مجملہ ان کے وہ حدیث مرفوعہ مشہور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:
معاویہ آگ کے ایک صندوق میں ہے جو اس کے سب سے نیچے کے درجے میں ہے
جو یا حنان یا منان کی صدا لگاتا ہے کہ یا اللہ اس وقت مجھ پر رحم کر، حالانکہ اس کے قبل میں
نے مافرمائی کی تھی اور میں مفسدین میں سے تھا، معاویہ نے حضرت علیؓ سے ناحق جنگ کی،
ان ہی افعال کا ارتکاب کیا جس کا ارتکاب اس کے باپ دادا کرتے رہے جو اللہ کے نور کا
گل کرنا اور اس کے دین کا انکار کرنا تھا حالانکہ اللہ کو سوائے اپنے نور کے پورا کرنے کے اور
سب چیزوں سے انکار رہے جو اپنے اس مکرو بغاوت سے بے وقوفوں کو مائل کرتا تھا نادانوں
کو فریب دیتا تھا جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے خبر دے دی ہے۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمارؓ سے فرمایا کہ: تجھے ایک باغی جماعت قتل کرے گی، تو انہیں
جنت کی طرف بلائے گا اور وہ تجھے دو زخ کی طرف بلائیں گے۔

جس نے دنیا کو اختیار کیا تھا، آخرت سے اسے انکار تھا، جو اسلام کے حلقے سے خارج
تھا، جو رام خون کو حلال سمجھتا تھا یہاں تک کہ اس نے اپنے فتنے میں اور اپنی گمراہی کے راستے
میں ان مسلمانوں کے اتنے خون بہائے جن کا شمار نہیں ہو سکتا، ایسے مسلمانوں کے خون
بہائے جو برگزیدہ تھے، اللہ کے دین کے محافظ تھے، اس کے حق کے مددگار تھے، یہ (معاویہ)
اللہ سے جہاد کرنے والا، اس امر کی کوشش کرنے والا تھا کہ اللہ کی مافرمائی کی جائے، اس کی
اطاعت نہ کی جائے، اس کے احکام اس طرح باطل ہو جائیں کہ پھر نہ قائم ہوں، اس طرح
اس کے دین کی مخالفت ہو کہ پھر دین ہی باقی نہ رہے، مگر ابی کا بول بالا ہو، باطل کی دعوت بلند
ہو، حالانکہ اللہ ہی کا بول بالا ہے، اسی کا دین منصور ہے، اسی کا حکم مانا جاتا ہے اور نافذ ہے اور
اسی کا حکم غالب ہے اس شخص کا مکر مغلوب اور باطل ہے جو اللہ سے عداوت کرے۔

یہاں تک کہ اس (معاویہ) نے ان تمام جنگوں کے اور جوان کے بعد ہوئیں سب کے
بوجھ برداشت کئے، ان خونوں کا طوق اور جوان کے بعد ہوئے اپنی گردن میں ڈالا، ایسے فساد کے

طریقے ایجاد کئے کہ ان کا بھی گناہ اس پر ہا درقیا مت تک اس کا بھی گناہ اس پر ہے جو اس پر عمل
کرے گا۔ ان امور میں سے جن کی وجہ سے اللہ نے اس پر لعنت واجب کر دی اور اس (معاویہ)
کا ان اہل فضیلت و دیانت نیک صحابہ تابعین کا قتل کرنا جو جبر کے ساتھ قتل کئے گئے مثلاً:
عمرو بن الحمق اور حجر بن عدی۔ ان کو محض اس لئے قتل کیا کہ عزت اور ملک اور غلبہ اسی
کا ہو۔ حالانکہ اللہ ہی کے لئے ملک و قدرت ہے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے: ”جو مومن کو عدا
قتل کرے گا اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب ہے اور
لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لئے عذاب دردناک تیار کیا ہے“
ومما استحق به اللعنة من الله ورسوله“

مجملہ ان امور کے جن کی وجہ سے وہ (معاویہ) اللہ و رسول کی لعنت کا مستحق ہے، اس
کا زیا دا بن سمیہ کا، اللہ پر جرات کر کے، استلحاق ہے۔ حالانکہ اللہ فرماتا ہے کہ انہیں ان کے
باپ کے نام سے پکارو، یہی اللہ کے نزدیک زیادہ درست ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فرماتے ہیں: وہ شخص ملعون ہے جس نے اپنے باپ کے علاوہ کسی کو باپ بنایا اور اپنے آقا
کے سوا اپنے کو کسی اور سے منسوب کیا اور فرماتے ہیں کہ: بیٹا (جو زنا سے ہو) ماں کا ہے اور
زانی کی سزا یہ ہے کہ اس پر سنگ باری ہو۔ اس (معاویہ) نے اللہ عزوجل کے حکم کی اور اس
کے نبی کی سنت کی علانیہ مخالفت کی، اولاد کو غیر صاحب الفرائض کے لئے کر دیا۔

مجملہ ان کے اللہ کے دین کے لئے اس کا اپنے بیٹے یزید کو اختیار کرنا ہے اور اللہ کے
بندوں کو اس کی طرف دعوت دینا ہے جو بکثرت شراب خوار، متکبر، مرغ والا، بندر والا، چیتے
والا تھا۔ اس (معاویہ) کا بہترین مسلمانوں سے قہر و غلبہ و دہشت و خوف و جبر و اکراہ سے
اس کی بیعت لینا ہے حالانکہ وہ اس کی مادانی کو جانتا تھا۔ یزید کے جرائم میں اہل حرہ کے
علاوہ سب سے بڑا جرم، عظیم ترین قتل حضرت حسین بن علیؓ و فاطمہؓ کا قتل ہے۔ اللہ تعالیٰ پر
جرات کے باعث، اللہ کے دین پر کفر کے سبب، اللہ کے رسول کی عداوت رکھنے کی بناء پر،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کو مشقت میں ڈالنے اور ان کے احترام میں کوتاہی کرنے

امام طبری --- کون؟

روایات طبری اور توہین سیدنا معاویہؓ

کی وجہ سے یہ حرکتیں اس سے ہوئیں۔ اہل بیت نبوت کو اس طرح تنبیہ کر رہا تھا کہ کویا کفار ترک و دہام کی جماعت کو قتل کرتا تھا۔۔۔

”والعنوا من لعنة الله ورسوله، و فارقوا من لا تنالون القرية من الله ورسوله إلا بمغفرته اللهم العن أباسفیان بن حرب و معاوية ابنه و يزيد بن معاوية و مروان بن الحكم و ولده، اللهم العن أئمة الكفر وقادة الضلالة وأعداء الدين و مجاهلدى الرسول و مغیری الأحكام و مبلى الكتاب و سفاکی الدم الحرام۔
اللهم إنا ننبأ اليك من موالاة أعدائك و من الإغماض لأهل معصيتك كما قلت: ”لا تجد قوماً يؤمنون بالله واليوم الآخر يوادون من حاد الله ورسوله“۔

اور اس پر لعنت کرو جس پر اللہ و رسول نے لعنت کی، اس سے مفارقت اختیار کرو جس کی مفارقت کے بغیر تم اللہ کی قربت نہیں حاصل کر سکتے۔ اے اللہ! لعنت کر ابو سفیان بن حرب اور اس کے بیٹے معاویہ پر، یزید ابن معاویہ پر، مروان بن الحکم پر اور اس کی اولاد پر۔ اے اللہ! لعنت کر کفر کے ماموں، مگر اہی کے پیشواؤں، دین کے دشمنوں، رسول سے لڑنے والوں، احکام میں تغیر کرنے والوں، کتاب کے بدلنے والوں اور محترم خون بہانے والوں پر۔ اے اللہ! ہم تیرے دشمنوں کی دوستی سے، تیرے گناہ گاروں سے چشم پوشی کرنے سے، تیرے سامنے اپنی بے زاری ظاہر کرتے ہیں جیسا کہ تو نے کہا ہے کہ: ”تو کسی جماعت کو جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان لاتے ہیں ایسا نہ پائے گا کہ وہ ان لوگوں سے محبت کریں جو اللہ اور رسول کے دشمن ہیں“۔۔۔

کتب أبو القاسم عبيد الله بن سليمان في سنة ٢٨٤ هـ / بقلم أبو القاسم عبيد الله بن سليمان ٢٨٤ هـ

اس کتاب کو ملک میں نافذ کرنے سے پہلے عبيد الله بن سليمان (وزیر) نے قاضی یوسف بن یعقوب سے کہا کہ کسی تدبیر سے خلیفہ المعتمد کو اس کتاب کے نفاذ سے روک دے۔ چنانچہ قاضی موصوف نے خلیفہ سے گفتگو کی۔ ’’اے امیر المومنین! مجھے یہ خوف ہے کہ عوام میں اضطراب پھیل جائے گا اور اس کتاب کے سننے کے وقت ان میں ایک حرکت پیدا

امام طبری --- کون؟

روایات طبری اور توہین سیدنا معاویہؓ

ہو جائے گی۔ خلیفہ نے جواب دیا کہ: اگر عوام متحرک ہوئے یا کلام کیا تو میں شمشیر زنی کروں گا (ان تحرکت العامة أو نطقت و ضعت سيفي فيها) قاضی نے کہا: امیر المومنین! ان طالین (اولاد علیؓ بن ابی طالب) کے بارے میں کیا کیا جائے گا جو علاقے میں بغاوت کرتے رہتے ہیں اور لوگ ان کی قرابت رسول اور ان کے اعمال حسنہ کی وجہ سے ان کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اس کتاب میں ان ہی کو پیش کیا گیا ہے، جب لوگ یہ سنیں گے تو ان کی طرف اور زیادہ مائل ہو جائیں گے، ان کی زبانیں بھی اور زیادہ کشادہ ہو جائیں گی اور آج سے زیادہ ان کی صحبت قوی ہو جائے گی، ”مفتاً معك المعتضد قلم یرد عليه جواباً و لم یأمر فی الكتاب بعده بشئ“ المعتمد رک گیا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی اس کتاب کے متعلق کوئی حکم دیا۔ (تاریخ الامم والملوک - الجزء الثامن طبع بیروت لبنان ص ۱۸۲ تا ۱۹۰، تاریخ طبری حصہ دوم، خلافت بغداد کا دور انحطاط حصہ دوم ۲۵۷ھ تا ۳۰۲ھ مترجم علامہ عبد اللہ العما دی ص ۲۵۳ تا ۲۶۶۔ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی)

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کیا سنی اور کیا شیعہ؟ حضرت معاویہؓ کے جملہ معاندین و ناقدین کا اصل مآخذ امام طبری کا تصنیف کردہ یہی رسالہ یا کتاب ہے جسے موصوف نے اپنی تاریخ الامم والملوک میں محفوظ کر دیا ہے۔

امام طبری (۳۱۰ھ) کی ”تحقیق“ کے مطابق مذکورہ ”کتاب“ مامون الرشید نے اپنی خلافت (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ) کے دوران میں لکھوائی تھی جامعین اور مؤلفین کا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے کہ یہ کون لوگ تھے؟ اس ”کتاب“ کو پڑھنے اور نافذ کرنے کے بجائے دفتر میں محفوظ کر دیا گیا۔ مامون کی وفات کے بعد معتضد کی خلافت سے پہلے آٹھ عباسی خلفاء معتصم باللہ، واثق باللہ، متوکل علی اللہ، منصر باللہ، مستعین باللہ، معتز باللہ، ہتدی باللہ، معتمد علی اللہ (۲۱۸ھ تا ۲۴۹ھ) گزرے ہیں مگر یہ کتاب ”دیوان“ میں ہی محفوظ رہی جسے معتضد باللہ نے ۲۸۲ھ میں نکلویا اور بزور شمشیر نافذ کرنے کا اعلان کیا مگر قاضی کے مشورے کے مطابق اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

مؤرخین نے مامون اور معتضد کے شیعہ ہونے کی تصریح کی ہے اور ان دونوں کے

درمیان آٹھ ”سنی“ خلفاء گزرے ہیں مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی اس کتاب کو تلف نہیں کرایا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مامون کی طرف اس کتاب کی ”نسبت“ مشکوک ہے۔ سوال یہ ہے کہ خلیفہ کے دفتر میں محفوظ یہ کتاب امام طبری تک کیسے پہنچی جو موصوف کی ولادت (۲۲۴ھ) سے پہلے لکھی گئی تھی اور جب معتضد نے اسے ۲۸۴ھ میں نکلوایا اس وقت طبری کی عمر ۶۰ سال تھی اور ماشاء اللہ تفسیر لکھنے میں مصروف تھے۔ پھر تاریخ پر کام شروع کیا جسے اپنی وفات سے آٹھ سال پہلے ۳۰۲ھ تک مکمل کر لیا۔ معتضد باللہ کی خلافت ۲۷۹ھ سے ۲۸۹ھ تک قائم رہی پھر امام طبری کی وفات (۳۱۰ھ) تک دو خلفاء ملکہمی باللہ (۲۸۹ تا ۲۹۵ھ) اور مقتدر باللہ (۲۹۵ تا ۳۲۰ھ) گزرے ہیں۔ مؤثر الذکر دونوں خلفاء معتضد باللہ کے بیٹے ہیں اور یہ تینوں اس کے نفاذ میں کام رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اموی صحابہ کی شدید ترین توہین پر مبنی زیر تبصرہ کتاب امام طبری تک پہنچانے میں ان تینوں خلفاء میں سے کسی ایک ہی خلیفہ کا کردار ہو سکتا ہے لیکن یہ کیوں کر ممکن ہے کہ سرکاری دستاویز سرکاری دفتر سے نکلوا کر اسے امام طبری تک پہنچا دیا جائے اور کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی ہو۔

معتضد جیسا ظالم اور شیعہ خلیفہ شدید خواہش کے باوجود محض اس خوف سے کتاب کے نفاذ سے باز آ گیا تھا کہ کہیں خلافت عباسیوں سے نکل کر ”اہل بیت“ میں نہ پہنچ جائے، لہذا وہ تو اسے طبری کے حوالے کر کے اپنی خلافت کو غیر مستحکم نہیں کر سکتا تھا جبکہ کتاب لکھنے والا اس کا وزیر عبید اللہ بن سلیمان اور قاضی یوسف بن یعقوب تو ابتداء ہی سے اس کے نفاذ کے حق میں نہیں تھے۔

یہ بات یقیناً باعث حیرت ہے کہ امام طبری نے اتنی اہم ”کتاب“ کی کوئی سند نہیں دی اور نہ ہی ان ”جامعین“ کے نام بتائے جنہوں نے یہ نسخہ نقل کر کے معتضد کو دیا تھا۔ پھر آخر میں ”ذکر“ (یعنی مذکور ہے) کے صیغہ سے اس کتاب کا ”ذراپ سین“ بتایا گیا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کتاب کے ”مصنف“ دراصل امام طبری خود ہی ہیں جنہیں بنو امیہ بالخصوص حضرت معاویہؓ کے ساتھ شدید بغض تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ طبرستان حضرت معاویہؓ کے دور میں فتح ہوا تھا۔ انہوں نے ۲۸۴ھ میں اس کتاب کے ”وجود“ میں آنے

سے بہت پہلے حضرت معاویہؓ کے نام کے ساتھ متعدد مقامات پر ”لعنہ اللہ“ کے الفاظ لکھے تھے جبکہ اس کتاب میں بھی قرآن وحدیث کی روشنی میں موجبات لعن ہی بتائے گئے ہیں۔ طبری کی اس ناپاک جسارت پر ترجمان اہل سنت مولانا محمد نافع صاحبؒ جیسے معتدل مفکر بھی یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ:

غور طلب یہ بات ہے کہ صاحب التاریخ محمد ابن جریر الطبری کے لئے عباسیوں کے اس فراہم کردہ غلیظ مواد کو من وعن نقل کر کے اپنی تصنیف میں شامل کرنے کا کون سا داعیہ تھا؟ اور اس نے کون سی مجبوری کی بنا پر یہ کار خیر پورا کیا؟ گویا الطبری نے اس مواد کو اپنی تاریخ میں درج کر کے آنے والے لوگوں کو اس پر آگاہ کیا اور سب دشتم اور لعن طعن کے جو دلائل عباسیوں نے مرتب کروائے تھے ان پر آئندہ نسلوں کو مطلع کرنے کا ثواب کمایا۔ چنانچہ شیعہ اور روافض رسالہ مذکورہ میں مندرجہ مواد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی کتب میں ابوسفیانؓ اور حضرت امیر معاویہؓ پر مطاعن قائم کرتے ہیں اور شدید اعتراضات پیدا کرتے ہیں۔

درحقیقت الطبری نے اہل اسلام میں انتشار پھیلانے اور افتراق ڈالنے کے لئے بڑی عجیب تدبیر اور حکمت عملی اختیار کی، جس سے مخالفین صحابہ کو ایک کونہ رہنمائی حاصل ہوئی اور ان کو عداوت پوری کرنے کے لئے ایک تیار شدہ مواد دستیاب ہو گیا۔

کئی لوگ ان دلائل پر نظر کرنے سے متذبذب ہوں گے کئی ناظرین صحابہ کرام سے متعذر ہوں گے اور بعض قارئین دل برداشتہ ہو کر اموی صحابہ سے منحرف ہو جائیں گے۔ الطبری کو اس باطل مواد کا اس تفصیل سے ذکر ہی نہیں کرنا چاہئے تھا بلکہ صرف ایک واقعہ تاریخی حیثیت سے اجمالاً ذکر کر دینا کافی تھا جیسا کہ باقی مؤرخین نے واقعہ ہذا کو اجمالاً درج کیا ہے اور دلائل کی تفصیل کی طرف نہیں گئے۔ اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے ذکر کیا تھا تو پھر اس مواد کے بطلان پر کچھ کلام کرنا لازم تھا تا کہ لوگ اس سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں لیکن الطبری نے ایسا نہیں کیا۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب التاریخ الطبری کی نیت بخیر نہ تھی بلکہ فاسد تھی اور ان صحابہ کرامؓ کے حق میں ”الطبری“ خود سو فظن کا مریض تھا۔“ (فوائد نافعہ جلد اول ص ۵۸۰-۵۸۱۔ طبع اگست ۲۰۰۵)

یہ ملحوظ رہے کہ جن مؤرخین نے اس واقعہ کو اجمالاً ذکر کیا ہے تو ان کا مآخذ بھی تاریخ

طبری ہی ہے لہذا اس من گھڑت، باطل اور سراسر کذب و افتراء پر مبنی واقعہ کو اجمالاً بھی ذکر نہیں کرنا چاہئے تھا۔

بہر حال تاریخ طبری میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی کردار کشی اور جواز لعن پر مبنی روایات کا ہی یہ نتیجہ نکلا کہ امام طبری کی وفات کے صرف ۱۰ سال بعد یعنی ۳۲۰ھ میں آل بوہرہ جیسے ظالم اور سفاک شیعہ اقتدار میں آگئے جنہوں نے امام طبری کی پیروی میں جامع مسجد بغداد کے دروازے پر ”لعن اللہ معاویہ بن ابی سفیان“ کے الفاظ لکھوا دیئے۔ جس کتاب میں حضرت معاویہؓ کے اسم گرامی کے ساتھ نہ صرف ”لعنہ اللہ“ کے الفاظ لکھے ہوں بلکہ ان پر لعنت کے جواز کو بہ دلائل بھی ثابت کیا گیا ہو تو اس کتاب اور مؤلف کا دفاع کرنے والے بھی یقیناً توہین صحابہؓ کے جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ امام طبری کی سیدنا معاویہؓ کے خلاف یلغار کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا مقام نذوقاً رقیماً کر دیا جائے۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت

”صحابی“ کا لفظ باتفاق اہل لغت ”صحبت“ سے مشتق ہے؛ یعنی صحابی ہونا، دوستی کرنا اور ساتھ زندگی گزارنا۔ ”صَحْبٌ“ کا اسم فاعل ”الصاحب“ ہے، یعنی ساتھی اور ساتھ زندگی گزارنے والا۔ اس کی جمع ”اصحاب، صحابہ“ ہے۔

”الصحابی“ صحابہ کا اسم نسبت ہے۔ صحابہ کی طرف منسوب ایک صحابی یعنی وہ ایک شخص جس نے صحبت حاصل کی مگر صحبت کی کسی مخصوص مقدار سے مشتق نہیں بلکہ اس کا اطلاق ہر اس شخص پر ہو سکتا ہے جس نے کم یا زیادہ کسی کی صحبت اٹھائی ہو۔ لہذا صحبت کی تھوڑی یا زیادہ مقدار دونوں حالتوں پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

اصطلاح شریعت میں ”صحابی“ اس شخص کو کہا جاتا ہے جس نے حالت ایمان و اسلام میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی ہو اور اسلام ہی پر اس کی موت بھی واقع ہوئی ہو۔

امام بخاری (م ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں:

”من صحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم اوراہ من المسلمین فہو من اصحابہ“ (صحیح بخاری۔ کتاب فضائل اصحاب النبی)

جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حالت ایمان و اسلام میں دیکھ لیا تو وہ زمرہ صحابہ میں شامل ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

”وأصح ما وقفت علیہ من ذلك أن الصحابي من لقي النبي صلی اللہ علیہ وسلم مؤمناً ومات على الإسلام۔“ (إصابة جلد اول ص ۷ تحت الفصل الأول فی تعریف الصحابی)

”صحابی“ کی سب سے زیادہ صحیح تعریف جس سے میں آگاہ ہوں وہ یہ ہے کہ:

امام طبری --- کون؟

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت

صحابی وہ ہے جس نے حالت ایمان و اسلام میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی ہو اور اسلام ہی پر اس کی موت بھی واقع ہوئی ہو۔

علامہ عبد العزیز فرہاروی (م ۲۳۹ھ) فرماتے ہیں:

”من صحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولو ساعة من الايمان ومات مؤمنا“ (البر اس شرح لشرح العوائد ص ۵۴۶)

جس نے حالت ایمان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی ہو تو وہ صحابی ہے۔ اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ کسی شخص کے ”صحابی“ ہونے کے لیے تین شرائط کا پایا جانا ضروری ہے

۱۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان

۲۔ اسی ایمان کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات

۳۔ اور اسلام و ایمان ہی کی حالت میں وفات

علامہ ابن حجر عسقلانی نے ”صحابی“ کی مذکورہ تعریف ہی کو سب سے زیادہ جامع اور صحیح قرار دیا ہے۔ اگرچہ بعض حضرات نے دیگر شرائط کا ذکر بھی کیا ہے مثلاً:

اس نے ایک طویل عرصہ (کم از کم ایک سال) تک شرف صحبت حاصل کیا ہو، یا حدیث کی روایت کی ہو، یا کسی غزوہ میں شرکت کی ہو، یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حصول علم و عمل کے لیے اختیار کی ہو، یا حالت شعور یا حالت بلوغ میں ملاقات کی ہو۔

صحابی کی معرفت:

محدثین کرام اور ائمہ اساءہ الرجال نے صحابی کی معرفت کے لیے حسب ذیل طریقے یا اصول متعین کیے ہیں:

- ۱۔ ایسا شخص جس کا صحابی ہونا تو اتر سے ثابت ہو جیسے حضرات عشرہ مبشرہ اور اہل بیت کرامؑ۔
- ۲۔ ایسا شخص جس کا صحابی ہونا مشہور ہو یا مشہور روایات سے ثابت ہو اگرچہ تو اتر کے درجے تک نہ پہنچا ہو۔ مثلاً عنام بن ثعلبہ اور عکاشہ بن محسن۔

امام طبری --- کون؟

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت

۳۔ کوئی مشہور صحابی کسی شخص کے صحابی ہونے کی شہادت دے جیسے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے کہا تھا کہ حمحمہ بن ابی حمحمہ دو ہی صحابی ہیں۔

۴۔ کسی صحابی کا یہ کہنا کہ میں فلاں شخص کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سامنے فلاں شخص سے گفتگو فرمائی۔

۵۔ اس کا صحابی ہونا تابعی کے قول سے ثابت ہو اور وہ شخص ایسے زمانے تک بقید حیات رہا ہو جس سے اس کے صحابی ہونے کا امکان پایا جاتا ہو۔ علماء نے یہ زمانہ ۱۱۰ھ تک مقرر کیا ہے، اس کے بعد کوئی شخص صحابی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بلا شک و شبہ اور بالیقین ان سعادت مند حضرات میں شامل ہیں جن پر مفسرین، محدثین، اصولیین، متکلمین اور جمہور کی بیان کردہ صحابی کی ہر تعریف صادق آتی ہے۔ اسی لیے مآخذین سمیت اہل سنت کے تمام طبقات بالاتفاق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو صحابی تسلیم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بھی تمام تر نقد و جرح کے باوجود یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ:

”صحابی کی تعریف میں اگرچہ سلف میں اختلاف ہے مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ہر تعریف کے لحاظ سے شرف صحابیت حاصل ہے۔

(سیرت اصحاب رسول ص ۱۵۳۔ مطبوعہ مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار لاہور)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت اگر صحابی کی معرفت کے مذکورہ اصولوں میں سے کسی ایک اصول یا طریقے کے مطابق بھی ثابت ہو جاتی تو وہ بلاشبہ جماعت صحابہ میں ہی شامل سمجھے جاتے لیکن موصوف تو ایک ایسے صاحب فضیلت و منقبت اور عظیم المرتبت صحابی ہیں کہ ان کی صحابیت مذکورہ تمام اصولوں اور طریقوں سے ثابت ہے اور ان کا صحابی ہونا اس قدر تو اتر اور شہرت سے ثابت ہے کہ کم از کم کسی ”سنی“ مسلمان عالم یا صوفی مآخذ کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ ان کی صحابیت کے انکار کی جرأت کر سکے۔

”فمن ادعی خلافة فعليه البيان ولا يمكنه ان شاء الله الى يوم البعث والميزان“۔

امام طبری --- کون؟

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت

صحابہ کرامؓ کے حالات سے متعلق ہر کتاب میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا بحیثیت صحابی تذکرہ موجود ہے۔ چند حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ طبقات ابن سعد مؤلفہ علامہ محمد بن سعد (م ۲۴۰ھ) جلد ہفتم ص ۴۱۲ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی تحت ”شام میں آنے والے صحابہ کرامؓ“۔

۲۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب مؤلفہ حافظ ابن عبد البر اندلسی قرطبی مالکی (م ۴۶۳ھ) جلد سوم از ص ۳۹۵ تا ۴۰۶۔ طبع بیروت۔

۳۔ سد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ مؤلفہ ابن اثیر الجزری (م ۶۳۰ھ) تحت تذکرہ معاویہ بن ابی سفیانؓ۔

۴۔ الاکمال فی اسماء الرجال مع مشکوٰۃ المصابیح مؤلفہ شیخ ولی الدین الخطیب (م ۷۴۳ھ) ص ۶۱۷۔ تحت معاویہ بن ابی سفیانؓ۔

۵۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ مؤلفہ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) جلد سوم ص ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ تحت معاویہ بن ابی سفیانؓ۔

علاوہ ازیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بلا واسطہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد احادیث روایت کی ہیں۔ صحاح ستہ سمیت تقریباً حدیث کی ہر کتاب میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مرویات پائی جاتی ہیں جن کی تعداد تقریباً ۱۶۳ ہے۔

کتب اسماء الرجال، طبقات الصحابہ اور سیر الصحابہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے تذکرہ کے علاوہ کتب حدیث میں ان کی مرویات کا پلایا جانا ان کی صحابیت کی روشنی اور واضح دلیل ہے۔

مزید برآں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بار بار رطلب کرنا اور بلانا بھی ان کی صحابیت پر دال ہے:

”ادعوا معاویہ... کان معاویہ رد ف النبیؐ فقال یامعاویہ...“ معاویہ بن ابی سفیان احلم امتی واجودھا... یامعاویہ ان ولیت امرأ فاتق اللہ واعدل، انه صلی اللہ علیہ وسلم قال لمعاویہ اللہم اجعلہ ہادیا مہدیا واهدہ۔“ ملاحظہ ہو جامع ترمذی، مشکوٰۃ، تاریخ الکبیر للبخاری، تطہیر الیمان۔ محدثین کرام نے اپنی کتابوں میں جہاں دیگر صحابہ کرامؓ کے فضائل و مناقب سے متعلق ابواب قائم

امام طبری --- کون؟

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت

کیے ہیں وہیں انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب کے لیے بھی ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: جامع ترمذی جلد دوم ص ۲۴۷۔ ”مناقب معاویہ بن ابی سفیان“

امام بخاری نے اپنی صحیح بخاری میں کتاب المناقب کے تحت ”ذکر معاویہ“ کے نام سے ایک مستقل باب باندھا ہے۔ اس عنوان سے بعض ناقدین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل میں کوئی صحیح حدیث وارد نہیں ہوئی اسی لیے امام بخاری نے ”مناقب معاویہ“ کے بجائے ”ذکر معاویہ“ کا باب قائم کیا ہے۔

امام موصوف نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی یہ ”قابل اعتراض“ رویہ اختیار نہیں کیا بلکہ دیگر اکابر صحابہؓ کے لیے بھی یہی عنوان اختیار کیا ہے۔ مثلاً:

باب ذکر عباس بن عبدالمطلب، باب ذکر عبداللہ بن عباس، باب ذکر طلحہ بن عبیداللہ، باب ذکر اسامہ بن زید، باب ذکر عبداللہ البجلی، باب ذکر حذیفہ بن یمان،

باب ذکر اصہل النبیؐ منہم ابوالعاص بن الربیع، باب ذکر ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہم۔

کیا ان جلیل القدر صحابہؓ کے بارے میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی کوئی فضیلت ثابت نہیں کیونکہ امام بخاری نے ان کے اسماء کے ساتھ بھی ”مناقب“ کے بجائے ”ذکر“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ دراصل یہ عبارت کا تقض ہے کہ کہیں مناقب اور فضائل فرمایا اور کہیں ”ذکر“ فرمایا جس سے مراد ”ذکر بالخیر“ ہی ہے اور ”ذکر بالخیر“ بھی فضیلت ہی ہوتی ہے۔

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حدیث میں ”صحیح“ ایک اصطلاحی لفظ ہے جس سے حدیث کی ایک خاص قسم اور درجہ مراد ہے۔ یہ لفظ اردو زبان کا صحیح نہیں جو ”غلط“ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر بالفرض کوئی صحیح حدیث وارد نہ بھی ہو تو یہ کیونکر تصور کر لیا گیا کہ ”صحیح حدیث“ کی نفی سے اس سے نیچے کے درجہ کی حدیث (یعنی حسن وغیرہ) کی بھی نفی ہو جاتی ہے؟

پھر اگر بالفرض اس ”دعویٰ“ کو کسی حد تک درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس سے بھلا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ”صحابیت“ پر کیا اثر پڑتا ہے؟ کیونکہ ہزاروں صحابہ کرامؓ ایسے ہیں جن کے انفرادی و خصوصی فضائل کتب حدیث میں مروی ہی نہیں ہیں اور ہزاروں صحابہ کرامؓ

ایسے ہیں جن کے حالات سے ائمہ اسما عالم رجال اور اباب ماریخ و سیر بھی نا آشنا ہیں۔

کیا ان تمام صحابہ کرام کی فضیلت کا انکار کیا جاسکتا ہے؟ کیا ان صحابہ کرام کے قرآن وحدیث میں مذکور مجموعی اور عمومی فضائل کسی صحابی کی فضیلت و منفعت کے لیے کم حیثیت کے حامل ہیں؟ جو لوگ حضرت معاویہؓ کو کسی بھی حوالے سے ہدف طعن و تنقید بناتے ہیں وہ اہل سنت میں سے ہرگز نہیں ہیں بلکہ ”سنیت“ کے لباوے میں وہ دراصل ”سبائیت“ کے ایجنٹ ہیں۔

”صحابی کی معرفت“ کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ کوئی دوسرا صحابی کسی شخص کے صحابی ہونے کی کواہی دے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت اس معیار پر بھی پورا اترتی ہے۔

اصحاب عشرہ مبشرہ سمیت تمام اکابر و اصغر صحابہؓ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت کی شہادت دیتے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے انہیں ایک عسکری لشکر کا امیر مقرر کر کے شام کے محاذ پر بھیجا، حضرت عمرؓ نے انہیں ترقی دے کر شام کا گورنر مقرر کیا، حضرت عثمانؓ نے ان کی حدود امارت میں کچھ دیگر علاقے شامل کر کے انہیں اس منصب پر برقرار رکھا، حضرت علیؓ نے بھی بعد میں ان کے ساتھ مصالحت کر کے انہیں سابقہ پوزیشن پر بحال رکھا، حضرت حسنؓ نے نہ صرف ان کے حق میں خلافت سے دست برداری اختیار کی بلکہ امور خلافت انہیں سونپ کر احباب سمیت ان کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت بھی کی۔

حضرت معاویہؓ کی صحابیت پر مذکورہ شواہد کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور جلیل القدر صحابی ابن صحابی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ ”صریح قول“ بھی موجود ہے کہ:

”قَوَانَهُ قَدْ صَحَّبَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.... أَصَابَ إِيَّاهُ فَقِيهٌ“

(صحیح بخاری۔ کتاب فضائل اصحاب النبیؐ۔ باب ذکر معاویہ رقم الحدیث ۳۷۶۲۔ ۳۷۶۵)

یقیناً انہوں (یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ) نے رسول اللہ کی صحبت کا شرف اٹھایا ہے... انہوں نے درست عمل کیا ہے یقیناً وہ دینی مسائل میں فقیہ و مجتہد ہیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ احادیث روایت کی ہیں وہیں خود ان سے بھی بہت سے صحابہ (حضرت ابو ذر، ابن عباس،

ابو سعید خدری، جریر بن عبداللہ الجلی، معاویہ بن خدیج، سائب بن یزید کندی، عبداللہ بن زبیر اور نعمان بن بشیر وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین) نے احادیث روایت کی ہیں جن میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے ”سماع عن النبی“ کی تصریح کرتے ہیں کہ:

”سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ.....، أَيْنَ عُلَمَاءُ كُمْ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“

ملاحظہ ہو صحیح بخاری۔ کتاب العلم باب من یرد اللہ بہ خیرا، کتاب اللباس بالوصل فی الشعر، کتاب الانبیاء باب مناقب قریش۔

صحابہؓ کے علاوہ اکابر تابعین نے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے حدیث کی روایت کی ہے مثلاً: ابو اور لیس خولانی، سعید بن مسیب، خالد بن معدان، ہمام بن منہ، قیس بن ابی حازم، عبداللہ بن الحرث، بن نوفل، علی بن طلحہ، محمد بن جبیر بن مطعم، حمید بن عبدالرحمن بن عوف، ابو جابر، علقمہ بن وقاص، عمیر بن ہانی، مطرف بن عبداللہ، محمد بن سیرین، عکرمہ مولیٰ ابن عباس وغیرہم۔ (ملاحظہ ہو الناہیة عن طعن معاویہ ص ۱۷۱، الاصابہ جلد ۳ ص ۴۳۲.....)

صحابی کی معرفت کا چوتھا طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنا صحابی ہونا خود ظاہر کرے۔ اس طریقے کے مطابق بھی حضرت معاویہؓ کی صحابیت ثابت ہے۔ موصوف ایک مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”إِنَّكُمْ لَتَعْلَمُونَ صَلَوةَ لَقَدْ صَحَبَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَا رَأَيْنَاهُ يُصَلِّيهِمَا وَلَقَدْ نَهَى عَنْهُمَا يَغْنِي الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعَصْرِ“

(صحیح بخاری کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب ذکر معاویہ رقم الحدیث ۳۷۶۱۔ ۳۷۶۲)

اس حدیث میں ”صَحَبْنَا النَّبِيَّ“ کے الفاظ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت خود ان کے اپنے ”صریح قول“ سے ثابت ہو رہی ہے۔

صحابی کی معرفت کا پانچواں طریقہ یہ ہے کہ کسی شخص کا صحابی ہونا کسی تابعی کے قول سے ثابت ہو تو اس طریقے کے مطابق بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا صحابی ہونا ایک

مسلمہ حقیقت ہے۔ پیچھے تابعین کی ایک فہرست گزر چکی ہے جنہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث روایت کی ہیں جن سے ان کی صحابیت پرنا تابعین کی طرف سے بھی ہر تقدیق ثابت ہو گئی ہے۔

علاوہ ازیں مشہور محدث اور فقیہ عبد اللہ بن مبارک سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا عمر بن عبد العزیز؟ تو انہوں نے فرمایا:

واللہ ان الغبار الذی دخل فی أنف فرس معاویہ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أفضل من عمر بألف مرۃ... (تظہیر الجنان ص ۱۰)

اللہ کی قسم وہ مٹی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کے نتھنوں میں داخل ہوئی وہ بھی عمر بن عبد العزیز سے ہزار درجے افضل ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نمازیں ادا کیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ”سمع اللہ لمن حمده“ کہا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جواب میں ”ربنا لك الحمد“ کہتے تھے اس کے بعد اس سے بڑا شرف اور کیا ہو سکتا ہے؟

مشہور تابعی حضرت معافی بن عمران سے ایک آدمی نے پوچھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبد العزیز میں سے کس کا مقام بلند ہے؟ ”مغضب غضباً شديداً وقال لا يقاس بأصحاب النبى أحد معاویہ صاحبہ و صهره و كاتبه و أمينه على وحي اللہ۔“ (تظہیر الجنان ص ۱۰)

تو معافی بن عمران غضبناک ہوئے اور کہا، اصحاب پیغمبر کے مقابلے میں کسی اور کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی، برادر بستی، اللہ کی وحی کے کاتب اور امین ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ائمہ اسلام اہل رجال نے ”صحابی کی معرفت“ کے جتنے طریقے وضع کیے ہیں ان میں سے اگرچہ کسی ایک طریقے سے بھی کسی کا صحابی ہونا ثابت ہو سکتا ہے لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تو وہ خوش نصیب صحابی ہیں کہ جن کی صحابیت ہر طریقے کے ذریعے ثابت ہے جس کے انکار کی کم از کم کوئی مسلمان یا کوئی با شعور انسان جسارت نہیں کر سکتا۔

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

گذشتہ بحث سے امام طبری کا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ انتہائی بغض واضح ہو چکا ہے۔ امام طبری نے حضرت معاویہؓ کی بغاوت کو جاگر کرتے ہوئے اس بنیاد پر بھی انہیں مستحق لعنت قرار دیا کہ انہوں نے حضرت علیؓ سے ناحق جنگ کی، ان ہی افعال کا ارتکاب کیا جو اس کے باپ دادا کرتے رہے جو اللہ کے نور کا گل کرنا اور اس کے دین کا انکار کرنا تھا... جو اپنی اس مکروہ بغاوت سے بے خوفوں کو مائل کرنا تھا، نادانوں کو فریب دیتا تھا جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے خبر دے دی ہے آپ نے عمارؓ سے فرمایا کہ: ”تجھے ایک باغی جماعت قتل کرے گی تو انہیں جنت کی طرف بلائے گا اور وہ تجھے دوزخ کی طرف بلائیں گے۔“

روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار مولانا اسماعیل ریحان صاحب نے اپنے مضامین (”تاریخ صحابہ اور راہ اعتدال“، ۵ قسطیں، ”علامہ طبری... مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز“، ۵ قسطیں، ”احتیاط لازم ہے“، ۴ قسطیں، ”ایک خط اور اس کا جواب“، ۲ قسطیں) میں امام طبری کے وکیل صفائی کا کردار خوب نبھایا ہے۔ یہاں زیر بحث عنوان میں اگرچہ وہ اپنے ”ممدوح“ کی سطح تک تو نہیں پہنچ سکے البتہ ”نفس تنقیص“ کی سرحد میں ضرور داخل ہو گئے ہیں۔ موصوف بھی بالکل غیر ضروری طور پر حضرت معاویہؓ کی ”مزعومہ و مفروضہ بغاوت“ کو اس کثرت اور تکرار سے زیر بحث لائے جو کسی محب صحابہ کا فعل ہرگز نہیں ہو سکتا اور ستم بالائے ستم یہ کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کے خلاف اس زہریلے پروپیگنڈے میں مسلمانان پاکستان کے ترجمان ”اخبار“ روزنامہ اسلام کو بھی شریک ”جرم“ بنا دیا۔ فی افسا!

موصوف نے جس کثرت و تکرار سے اکابر کے اقوال کی آڑ میں ”بغاوت، بغاوت“ کی جوڑ لگائی ہے یا گردان پڑھی ہے اس کا تعلق ہرگز کسی ”شرعی مقصد“ کے ساتھ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے ان کا مقصد صرف اور صرف تنقید و تنقیص ہی ہے۔ مشاجرات کا شرعی حکم تو اس بحث کے آخر میں آ رہا ہے یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ ”اگر کسی وقت کسی ضرورت شرعیہ و

امام طبری۔۔۔ کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

شدیدہ کی وجہ سے یہ موضوع زیر بحث آ بھی جائے تو (بغاوت، بغاوت کی رٹ لگانے کے بجائے) اجتہادی خطا و صواب سے زیادہ کوئی لفظ ہرگز استعمال نہ کیا جائے۔“

فاضل کالم نگار نے اس سلسلے میں جو ”عذر“ پیش کیا ہے وہ ہرگز ہرگز ”کسی ضرورت شرعیہ و شدیدہ“ کے ذیل میں نہیں آتا جس کی بناء پر انہیں سات قسطوں پر مشتمل (”تاریخ صحابہ اور راہ اعتدال“ اور ”ایک خط اور اس کا جواب“) مضامین شائع کرنے پڑے ہوں۔

پھر اس کے لئے موصوف نے جو عنوان اختیار کیا ہے کہ ”تاریخ صحابہ اور راہ اعتدال“ اس کا مواد خود اس عنوان کی نفی کر رہا ہے۔ اگر اسی کا نام ”راہ اعتدال“ ہے تو موصوف اور اخبار کی ”انتظامیہ“ بالخصوص ”ایڈیٹر“ صاحب کو تسلی رکھنی چاہئے کہ پھر حضرت معاویہؓ کے حق میں بے اعتدالی و بے انصافی نامی کوئی چیز دنیا میں نہیں پائی جاتی۔

ظاہر ہے کہ ”بغاوت“ اوصاف حمیدہ میں شامل نہیں ہے بلکہ ایک ”کبیرہ گناہ“ عیب اور نقص“ ہے۔ شرعی طور پر تو کسی عام مسلمان کے عیب کو بھی اس انداز سے نہیں بیان کیا جاسکتا چہ جائیکہ ایک جلیل القدر صحابی کے مرمومہ نقص کا اظہار اس انداز سے کیا جائے۔ ”تعمیت“ یہ ہے کہ کسی کی عدم موجودگی میں اس کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جس کو وہ سنتا تو اس کو ایذا ہوتی، اگرچہ وہ سچی بات ہی ہو، کیونکہ جو غلط ازام لگائے وہ تہمت ہے جس کی حرمت الگ قرآن کریم سے ثابت ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس تکرار کے ساتھ جس فعل کی نسبت حضرت معاویہؓ کی طرف کی جارہی ہے کیا حضرت معاویہؓ کو اس سے ”ایذا“ نہیں ہوگی؟ پھر اس سلسلے میں کوئی ضرورت شرعیہ و شدیدہ تو کیا ”ضرورت خفیہ“ بھی نہیں پائی جاتی مگر انہوں نے جس انداز سے اس کی رٹ لگائی ہے اسے حضرت معاویہؓ کی تحقیر و تنقیص کے علاوہ کوئی نام دیا ہی نہیں جاسکتا۔

مولانا عتیق الرحمن سنہجلی ابن مولانا منظور احمد نعمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ایک جملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”اہل سنت کا بے شک اب تک اتفاق ہی رہا ہے کہ خلافت راشدہ کا دور حضرت علیؓ پر ختم ہو گیا۔ لیکن کیا اس موقف کو بیان کرنے میں اہل سنت نے یہ کہنا بھی ضروری یا صحیح سمجھا ہے کہ ”حضرت معاویہؓ کی حکومت خلافت راشدہ نہیں تھی“ اس راقم کے اور حضرت مولانا کے

امام طبری۔۔۔ کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

علم کا کیا مقابلہ وہ ان کے خوشہ چینوں کی صف میں ہے۔ لیکن جب یہ کہنے سے کہ خلافت راشدہ کا دور حضرت علیؓ پر ختم ہو گیا، حضرت معاویہؓ کا دور خلافت آپ سے آپ خلافت راشدہ کے زمرے سے نکل جاتا ہے پھر صراحتاً یہ بھی کہنا کہ ”ان کی حکومت خلافت راشدہ نہیں تھی“ کیوں کر ایک صحابی کی محض تنقیص نہ سمجھی جائے گی؟ اور کیوں کر اس پیرایہ بیان کو مذاق اہل سنت کے مطابق سمجھا جاسکے گا؟ (واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر ص ۵۰۱)

جب حضرت سنہجلی کے نزدیک بہ تصریح نام یہ کہنا کہ ”حضرت معاویہؓ خلیفہ راشد نہیں تھے“ حضرت معاویہؓ کی تنقیص ہے تو پھر بالکل بلا ضرورت شرعی ایک عام ”اخبار“ اور فیس بک پر ”مدلل“ انداز سے اور بہ تصریح نام بار بار ”باغی، باغی اور بغاوت، بغاوت“ کی رٹ لگانا کیونکر حضرت معاویہؓ کی توہین و تنقیص شمار نہ ہوگا؟

روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار نے یہ ساری خامہ فرسائی جناب یونس قاسمی صاحب کے ایک مضمون کے ”یک سٹری“ اس جملے پر فرمائی ہے جو روزنامہ اسلام میں ۱۸ رمضان ۱۴۳۶ھ/۶ جولائی ۲۰۱۵ء کو شائع ہوا:

”... اس کے بعد جب باغیوں نے شام پر حملہ کیا تو اس وقت بھی حضرت علیؓ نے انہیں کنٹرول کرنے کی آخری حد تک کوشش کی۔ آپ کا ارادہ یہ تھا کہ اہل شام سے اتحاد کر لیا جائے اور پھر باغیوں کی سرکوبی کی جائے۔“

یونس قاسمی صاحب نے اگرچہ حضرت علیؓ اور باغیوں (یعنی قاتلین عثمانؓ) میں فرق و امتیاز ظاہر کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان کی اس بات کے ساتھ ہرگز اتفاق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ روایات کے مطابق شام پر حملہ حضرت علیؓ ہی کی قیادت میں کیا گیا تھا۔ تاہم یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ قاسمی صاحب دفاع صحابہؓ کے جس محاذ پر سرگرم ہیں وہ حضرت علیؓ کی تنقیص کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور خود ان کے مضمون سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔ مگر الفاظ کے چناؤ میں ان سے غلطی ہو گئی ہے۔

اس کا ازالہ جس طرح روزنامہ اسلام کے مستقل فاضل کالم نگار ”ریحان“ صاحب نے کیا ہے اسے کسی طور پر بھی صحیح نہیں کہا جاسکتا۔ انہوں نے حضرت معاویہؓ کو شدید ترین تنقید

امام طبری۔۔۔ کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

کا نشانہ بنایا ہے جو یقیناً مشاجرات صحابہؓ کے شرعی حکم سے انحراف کے زمرے میں آتا ہے (مشاجرات صحابہؓ کا شرعی حکم آگے آ رہا ہے)۔ موصوف حضرت علیؓ کی فضیلت و منقبت اور عظمت بیان کرنے میں حضرت معاویہؓ کی توہین و تنقیص کے مرتکب ہوئے ہیں جبکہ حضرت معاویہؓ کی توہین و تنقیص کے بغیر بھی حضرت علیؓ کا مقام و مرتبہ بیان کیا جاسکتا تھا۔

پھر مولانا اسماعیل ریحان صاحب پر ”جواب دینے“ کا فریضہ بھی عائد نہیں ہوتا تھا یہ ذمہ داری روزنامہ اسلام کی ”انتظامیہ“ پر عائد ہوتی تھی کہ وہ صحیح کے ساتھ ساتھ ایک ”اعتذار“ بھی شائع کر دیتے مگر اس کے برعکس موصوف نے روزنامہ اسلام اور سوشل میڈیا (فیس بک) پر حضرت معاویہؓ کے خلاف جس بدترین جارحیت کا مظاہرہ کیا ان کے انداز و نگہ اور الفاظ سے ”بغض معاویہ“ صرف چمکتا ہی نہیں بلکہ پھٹکتا بھی ہے۔ جہاں تک دلوں کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں اللہ عظیم بذات الصدور ہی بہتر جانتے ہیں۔

روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار مولانا اسماعیل ریحان صاحب نے جس طرح جناب یونس قاسمی صاحب کے ”یک سٹری“ جیلے کے جواب میں بالکل غیر ضروری طور پر پانچ قسطوں پر مشتمل ایک مضمون بعنوان ”تاریخ صحابہ اور راہِ اعتدال“ شائع کیا۔ اسی طرح بعد میں عبداللہ کور رحمانی صاحب کے ”بے پنا“ خط کے جواب میں ”ایک خط اور اس کا جواب“ کے نام سے بھی دو قسطیں تحریر کر دیں۔

چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

”آخر میں قارئین سے عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بخدا! مشاجرات صحابہؓ کی بحث میں پڑنا ہر مسلمان کی طرح میرے لیے بھی سخت بارِ خاطر ہے، مگر بعض اوقات دوسروں کو مغالطے سے بچانا اور اس صحیح نقطہ نظر کو جو دلائل سے ثابت ہے اور اسلاف سے منقول چلا آیا ہے، واضح کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود کسی کو راقم کے مضامین ان اسلامی تعلیمات کے خلاف محسوس ہوں جن میں صحابہؓ کے مشاجرات اور اختلافات کے متعلق سکوت کا حکم دیا گیا ہے تو اس کے متعلق میں خود کچھ نہیں کہتا۔ ممتاز شارح حدیث ملا علی قاری نے جو فرمایا ہے وہ راقم کا عذر پیش کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے صحابہؓ کا ذکر ہو تو رک جاؤ۔ اس سے مراد ہے کہ ان پر طعن سے رک جاؤ، کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا انہیں نصیب ہونا کئی جگہ وارد

امام طبری۔۔۔ کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

ہے۔ یقیناً ان کا مقام تقویٰ، اللہ کی رضا اور جنت ہے۔ امت پر ان کے بڑے حقوق ہیں۔ اس لیے ان کا ذکر تعریف و توصیف اور دعائے خیر کے ساتھ ہی ہونا چاہیے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مختصر طور پر یا معین طور پر یوں بھی نہ کہا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو کر جنگ کرنے والے غلط نہ تھے یا یہ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت والے باغی تھے جس پر حدیث عمار تفسیر لک الفتۃ الباغیۃ دلیل ہے، کیونکہ دل میں تمام صحابہؓ کی توقیر و تعظیم اور رضامندی کے باوجود یہاں مقصد صحیح اور غلط، مجتہد مصیب اور مجتہد خطی میں فرق بتانا ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح: ج ۸، حدیث ۵۴۰۱، کتاب الفتن)“

یہی راقم ماجیز کلمہ عاتھا۔ مقصد اسی دین کی حفاظت تھا جس کے لیے صحابہ کرام نے عمر بھر قربانیاں دیں۔ بہر کیف اس عرض داشت میں سہو و دانستہ کسی صحابی کے حق میں سرزد ہوجانے والی ادنیٰ تقصیر پر بھی اللہ سے معافی کا خواست گار ہوں۔ اپنی کوتاہیوں پر شرمندہ اور انہی مقدس ہستیوں کے طفیل آخرت میں نجات کی امید رکھتا ہوں۔ کوئی اس قسم کی علمی اباحت پڑھ کر ہرگز حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب سے نفرت اور بغض کے مرض میں مبتلا نہ ہو۔ علمی بحث میں کچھ کہنا ناگزیر ہو جاتا ہے، مگر اس سے ہٹ کر ان کے بارے میں رکیک تبصرے کرنا اپنی ہی آخرت خراب کرنے کے مترادف ہے۔ (روزنامہ اسلام: ۱۵ ستمبر ۲۰۱۵ء)

موصوف کا ”فکری تعلق“ جس طبقے کے ساتھ بھی ہے انہیں اس کا پورا پورا حق حاصل ہے لیکن صحابہ کرام بالخصوص حضرت معاویہؓ کے خلاف اس مسموم فضا میں عام قارئین تک ”شوگر کوڈ“ زہر کو اور وہ بھی ”روزنامہ اسلام“ کے ذریعے پہنچانا کسی عظیم ایمانی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ موصوف نے اپنے مضمون ”تاریخ صحابہ اور راہِ اعتدال“ میں حضرت معاویہؓ پر مرکزی الزام بھی بغاوت کا لگایا تھا اور ”ایک خط کا جواب“ کا اختتام بھی ملا علی قاریؒ کے اس قول پر کیا ہے کہ جس سے حضرت معاویہؓ ”باغی“ ہوا کم از کم ”یقینی“ طور پر ”ثابت“ ہو گیا ہے۔ جب یہ بات ”ثابت“ ہے تو پھر اس سے موصوف کے مدوح مفسر، محدث و مؤرخ امام طبری نے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان کے تصور سے بھی رو ٹکٹے کھڑے ہو جاتے ہیں (کچھ اشارے پیچھے گزر چکے ہیں)

حضرت معاویہؓ کو العیاذ باللہ یہ کچھ ”ثابت“ کرنے کے بعد ”قارئین“ پر موصوف کی اس ”نصیحت“ کا بھلا کیا اثر ہو سکتا ہے کہ:

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

”کوئی اس قسم کی علمی اباحت پڑھ کر ہرگز ہرگز حضرت معاویہؓ اور ان کے اصحاب سے نفرت اور بغض کے مرض میں مبتلا نہ ہو اور علمی بحث میں پڑ کر یہ کچھ کرنا گزیر ہو جاتا ہے۔“ روزنامہ اسلام کی ”انتظامیہ“ اور ”فاضل کالم نگار“ سے کون پوچھے کہ حضرت!! اس قسم کی ”علمی بحثوں“ کا مقام کیا ایک عام اخبار ہو سکتا ہے جو ہر مخالف و موافق اور ہر سطح کے قارئین تک صرف دس روپے میں پہنچ جاتا ہے؟؟؟

موصوف نے کس ”چالاک“ کے ساتھ زیر بحث کالم کے آخر میں اپنے مرمومہ و مفروضہ دعویٰ کی توثیق ملا علی قاری سے کرادی کہ میں ”مشاجرات اور اختلافات“ سے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر علماء کے ”سکوت“ اختیار کرنے کے حکم کو نہیں مانتا اور جو حضرات ایسا مشورہ دے رہے ہیں وہ ملا علی قاری کا مذکورہ اقتباس پڑھ لیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ فاضل کالم نگار جس ”شخصیت“ سے ”حجت“ پکڑ رہے ہیں وہ خود بھی ان کی طرح مشاجرات صحابہ کے شرعی حکم سے تجاوز کر کے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر شدید ترین تنقید کے مرتکب ہو چکے ہیں۔

ملا علی قاری کی چند عبارات ملاحظہ فرمائیں:

حضرت شیخ نور الدین علی بن سلطان محمد ہروی الشہر بہ ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں زیر عنوان ”اختلف اهل السنة في تسمية للمعاوية باغيا“ لکھتے ہیں کہ:

ثم كان معاوية مخطيا الا انه فعل ما فعل عن تاويل فلم يصريه قاسقا واختلف اهل السنة والجماعة في تسميته باغيا فمنهم من امتنع من ذلك والصحيح من اطلاقه بلفظ الباغي اي على معاوية لقوله لعمار تقتلك الفئة الباغيه وكان علي مصيبا في التحكيم وزعمت الخوارج انه كان مخطيا فيه وقد كفر اذ الواجب في اهل البغي المحاربة لقوله سبحانه وتعالى: ”فان بغت احدهما على الاخرى فقاتلوا التي تبغي حتى تفيء الى امر الله“ ولكننا نقول المقصود ايراد دفع الشر وتاليف القلوب وذا فيما فعل علي۔ (شرح فقہ اکبر ص ۸۲)

”پھر حضرت معاویہ خطی تھے مگر انہوں نے جو کچھ کیا تاویل کے ساتھ کیا۔ پس وہ اس فعل کی وجہ سے فاسق نہیں ہو گئے۔ اور اہل سنت والجماعت نے انہیں ”باغی“ کا نام دینے میں اختلاف کیا ہے۔ پس بعض نے اس سے منع کیا ہے اور صحیح یہ ہے کہ معاویہ پر باغی کا

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

اطلاق درست ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت عمارؓ کے لئے اس قول کی بناء پر کہ تجھے ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تحکیم میں مصیب تھے اور خوارج نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ اس میں خطی تھے اور انہوں نے کفر کا ارتکاب کیا۔ ان پر باغیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی بناء پر لڑنا فرض تھا کہ ”اگر ان دونوں گروہوں میں سے ایک دوسرے گروہ پر بغاوت کرے تو تم اس کے ساتھ قتال کرو جس نے بغاوت کی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔“ لیکن ہم کہتے ہیں مقصود دفع شر اور تالیف قلوب ہے، اور یہ بات حضرت علیؓ کے عمل میں موجود ہے۔

اس عبارت سے درج ذیل امور ثابت ہوئے:

- ۱۔ حضرت معاویہ خطی تھے۔ ۲۔ اس فعل کی وجہ سے وہ فاسق نہیں ہوئے۔
- ۳۔ جو اہل سنت ان پر باغی کا اطلاق نہیں کرتے وہ غلط ہے۔
- ۴۔ انہیں باغی کہنا صحیح ہے۔ ۵۔ حضرت علیؓ بھی انہیں باغی سمجھتے تھے مگر انہوں نے باغیوں سے متعلق حکم الہی: ”فقاتلوا التي تبغي“ یعنی قتال کی خلاف ورزی بصورت ”دفع شر اور تالیف قلوب“ کی خاطر کی تھی۔

موصوف اپنی ایک دوسری کتاب میں حدیث عمارؓ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

”اعلم ان عمارا قتله معاوية وقتله فكانوا طاعين باغين بهذا الحديث“ جانتا چاہیے کہ حضرت عمارؓ کو معاویہ اور اس کے گروہ نے قتل کیا تو وہ اس حدیث کی رو سے طاعی (سرکش) اور باغی ہو گئے۔

جن حضرات نے لفظ (باغی) کی تاویل طالب دم عثمانؓ سے کی ہے انہیں جواب دیتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں کہ:

قلت فاذا كان الواجب عليه ان يرجع عن بغيه باطاعته الخليفة ويترك المخالفة و طلب الخلافة المنفية فبين هذا ان كان في الباطن باغيا وفي الظاهر مستترا بدم عثمان مراعيًا مرائيا فحاء هذا الحديث عليه ناعيا وعن عمله ناهيا لكن كان ذلك في الكتاب مسطورا قصار عنده كل من القرآن والحديث مهجورا فرحم الله من انصف ولم يعصب ولم يعسف وتولى الاقتصاد في الاعتقاد لئلا يقع في

جانبی سبیل الرشاد من الرقض والنصب بان یحب جمیع الآل والصحب۔

(المرقاة المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح جلد ۱ ص ۱۷۱ مطبوعہ مکتبہ المدینہ بلاتان)

میں کہتا ہوں کہ جب معاویہ پر واجب تھا کہ وہ خلیفہ کی اطاعت کر کے اپنی باغیانہ سرگرمیوں سے رجوع کرنا اور خلیفہ کی مخالفت اور منافی خلافت کی طلب و خواہش ترک کر دیتا (مگر اس نے یہ کام نہیں کیا) تو ظاہر ہو گیا کہ وہ باطن (حقیقت) میں باغی تھا اور ظاہری طور پر اس نے قصاص عثمانؓ کا لبادہ اپنی حفاظت کے لئے بیا کارانہ طور پر اوڑھ رکھا تھا سو یہ حدیث اس کے گناہ کو ظاہر کرنے اور اس کے عیب کا اعلان کرنے اور اس کے عمل بغاوت سے روکنے کے لئے آگئی۔ لیکن یہ سب کچھ قدر ہو چکا تھا۔ پس قرآن وحدیث دونوں معاویہ کے نزدیک مٹروک ہو گئے۔ سو اللہ رحم کرے اس شخص پر جس نے تعصب نہ کیا اور نہ ہی ظلم کیا اور اعتقاد میں میانہ روی اختیار کی تا کہ صراط مستقیم سے ہٹ کر رافضیت اور نصیبت میں نہ جا پڑے اور تمام آل واصحاب سے محبت رکھے۔

ملا علی قاری کی مذکورہ تشریح سے حسب ذیل امور ثابت ہوئے:

- ۱۔ معاویہؓ کو چاہیے تھا کہ بغاوت سے رجوع کرنا۔
 - ۲۔ معاویہؓ کو خلیفہ کی اطاعت کرنی چاہیے تھی۔
 - ۳۔ معاویہؓ کو چاہیے تھا کہ وہ خلیفہ کی مخالفت اور ناجائز خلافت کی طلب ترک کر دیتا۔
 - ۴۔ معاویہؓ حقیقت (باطن) میں باغی تھے۔
 - ۵۔ معاویہؓ نے دکھلا دے اور ریا کارانہ طور پر دم عثمانؓ کی آڑ لے رکھی تھی۔
 - ۶۔ حدیث عمارؓ معاویہؓ کے باغی ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہے۔
 - ۷۔ معاویہؓ نے قرآن وحدیث کے واضح احکام کی خلاف ورزی کی۔
 - ۸۔ انصاف اور اعتدال یہ ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو مذکورہ بالا امور کا مرتکب سمجھا جائے۔
- حضرت ملا علی قاری کے نزدیک محاربین اہل بیت کی مذمت کرنا امت کا ”اجماعی“ مسئلہ ہے چنانچہ وہ ایک دوسرے مقام پر اس ”اجماعی عقیدے“ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:
- ففضل اهل البيت و ذم من حاربهم امر مجمع عليه عند علماء أهل السنة و اکابر أئمة الامة“ (مرقاۃ المفاتیح۔ کتاب المناقب والفہام کل جلد ۱۰ ص ۵۳۳)
- پس اہل بیت کی فضیلت بیان کرنا اور جن حضرات نے ان کے ساتھ جنگ کی ہے ان کی

مذمت بیان کرنا ایسا مسئلہ ہے جس پر اہل سنت کے علماء اور امت کے ماموں کا اجماع ہے۔

سخت حیرت ہے کہ ملا علی قاری ”محاربین اہل بیت“ کے تخطیہ ہی کو نہیں بلکہ ان کی مذمت کو امت کا اجماعی مسئلہ قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ محدثین کرام کے نزدیک ایسا رجحان تشیع کے زمرے میں آتا ہے۔

”فالتشیع فی عرف المتقدمین هو اعتقاد تفضیل علیّ علی عثمان وان علیاً

کان مصیباً فی حروبه وان مخالفه مخطی مع تقدیم الشیخین وتفضیلہما“

(تہذیب المعانی جلد اول ص ۹۴، فتح الملہم جلد اول ص ۶۵)

منتقدین کی اصطلاح میں تشیع کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو صرف حضرت عثمانؓ پر فضیلت دی جائے اور یہ کہ حضرت علیؓ اپنی جنگوں میں حق بجانب اور ان کے مخالف خطا پر تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ شیخین کی تفضیل کا بھی قائل ہو۔

حضرت ملا علی قاریؒ کی مذکورہ توضیحات کے برعکس اہل سنت کے عقیدے کی وضاحت کرتے ہوئے امام ربانی مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ:

یہ ضروری نہیں ہے کہ حضرت امیر (یعنی علیؓ) تمام اجتہادی و اختلافی امور میں حق پر ہوں اور ان کے مخالف خطا پر۔ (مکتوبات جلد دوم ص ۵۵۔ مکتوب نمبر ۲۶)

حضرت موصوف ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ:

اے برادر! اس امر میں بہتر طریق یہ ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصحابؓ کے لڑائی جھگڑوں سے خاموش رہیں۔ ان کی خطا کو بھی زبان پر نہ لانا چاہئے۔ ان کے ذکر خیر کے سوا اور کچھ نہ بیان کرنا چاہئے۔ (مکتوبات امام ربانی جلد دوم ص ۵۸۲)

مولانا رشید احمد گنگوہی فرماتے ہیں کہ: ”زکات انبیاء سے بھی ہوئی، حضرت علیؓ بھی

خطا سے مامون نہ تھے۔“ (ملاحظہ ہوتا لیفات رشید یہ حلیۃ الشیعہ ص ۵۸۲)

بہر حال یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ صحابہ کرامؓ کے مشاجراتی اختلافات میں اصل مذہب سکوت و توقف ہے۔ مشاجرات میں وہی قوی ترین، مقبول ترین، رائج ترین اور صریح نصوص کے عین مطابق ہے۔ائمہ اربعہ کے مذاہب سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ اس معاملہ میں سکوت و توقف ہی کے قائل تھے۔

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

ملا علی قاری کا یہ جارحانہ انداز (میں کہتا ہوں کہ جب معاویہ پر واجب تھا کہ وہ خلیفہ کی اطاعت کر کے اپنی باغیانہ سرگرمیوں سے رجوع کرنا...) تو سر اسر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی توہین پر مبنی ہے جس میں یقینی طور پر مطلق صحابیت کی رعایت بھی ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ پھر ان کی یہ بات بھی ناقابل فہم ہے کہ انہوں نے ”شرح فقہ اکبر“ میں ”فلسفہ بصریہ فلسفہ“ کے جملے کے ذریعے ”فسق“ کی نفی کس طرح کر دی؟ موصوف نے معاویہ رضی اللہ عنہ پر جو ”فرد جرم“ عائد کی ہے کیا وہ امور ”فسق“ کی تعریف میں نہیں آتے؟

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ:

”فسق کے لفظی معنی خروج اور ہر نکل جانے کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل جانے کو ”فسق“ کہتے ہیں اور اطاعت الہیہ سے نکل جانا کفر و انکار کے ذریعہ بھی ہوتا ہے اور عملی نافرمانی کے ذریعہ بھی۔ اس لیے لفظ ”فسق“ کافر کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں بیشتر لفظ ”فاسقین“ کافروں ہی کے لیے استعمال ہوا ہے اور مومن گناہ گار کو بھی فاسق کہا جاتا ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں عموماً لفظ فاسق اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان کی اصطلاح میں فاسق کو کافر کے بالمقابل اس کی قسم قرار دیا گیا ہے۔ جو شخص کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے اور پھر اس سے توبہ بھی نہ کرے یا صغیرہ گناہ پر اصرار کرے، اس کی عادت بنالے وہ فقہاء کی اصطلاح میں فاسق کہلاتا ہے اور جو شخص یہ فسق کے کام اور گناہ اعلانیہ جہرات کے ساتھ کرتا پھر اس کو فاجر کہا جاتا ہے۔“

(معارف القرآن جلد اول ص ۱۶۸ تحت آیت ”وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ“)

حضرت ملا علی قاری کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ”خطی کہنا، باغی طغیانا، خلیفہ راشد حضرت علیؓ کا نافرمان اور حکم عدول ثابت کرنا، اس بغاوت سے رجوع نہ کرنا، منفی خلافت کی طلب کرنا، قصاص عثمانؓ کا لبادہ محض اپنی حفاظت کے لیے ریاکارانہ طور پر اوڑھنا اور قرآن وحدیث دونوں (کے احکام کو) ترک کر دینا“ جیسے امور کا مرتکب قرار دینا۔ یقیناً یہ جملہ امور لفظ ”فسق“ کی لغوی، لفظی، اصطلاحی اور فقہی تعریف میں داخل ہیں۔

مذکورہ جملہ امور کے ارتکاب کی صورت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ”فسق کی نفی کس طرح ممکن ہے؟ پس ملا علی قاری کے اس قول کہ ”فلم یصرہ فلسفاً“ میں فسق کی نفی کو صرف

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

”کفر و انکار“ کی نفی پر ہی محمول کیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ دوسری کوئی صورت ممکن ہی نہیں۔ محقق اہل سنت مولانا ابوریحان عبدالغفور سیالکوٹی ملا علی قاری کے مذکورہ ”منصفانہ“ اور ”معتدلانہ“ نظریہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

کیا خوب! اگر یہ بھی اعتدال و انصاف، تعصب و تعسف سے پاک سمیل الرشاد اور حب آل و اصحاب ہے تو ملا علی قاری کو تسلی رکھنی چاہیے کہ پھر آل و اصحاب کے حق میں بے اعتدالی و بے انصافی، تعصب و تعسف اور بغض آل و اصحاب نامی کوئی چیز دنیا میں نہیں، پھر رافضی و ماصی اور خارجی و سبائی دنیا میں کوئی نہیں۔ (سبائی فتیہ جلد ۱ ص ۲۹۹ طبع اول، جلد ۱ ص ۲۳۸ طبع دوم)

”تاریخ صحابہ اور راہ اعتدال“ اور ”ایک خط اور اس کا جواب“ میں مولانا اسماعیل ریحان صاحب کے حضرت معاویہؓ کے بارے میں ”تحقیقی موقف“ کی روزنامہ اسلام میں اشاعت کے بعد علمائے حق کے لئے ”سکوت و خاموشی“ شرعاً جائز نہیں تھی انہیں موصوف کے موقف کی باقاعدہ تردید کرنی چاہئے تھی، جبکہ کالم نگار کو اسی پر اکتفاء کر لینا چاہئے تھا مگر صدافسوس کہ موصوف نے اس کے بعد بھی اپنا سفر جاری رکھا۔ کاش! وہ اپنے اس اعلان پر ہی عمل پیرا ہو کر ”سکوت“ اختیار کر لیتے کہ: ”بہر کیف اس عرض داشت میں سہوانا دانستہ کسی صحابی کے حق میں سرزد ہوجانے والی ادنیٰ تقصیر پر بھی اللہ سے معافی کا خواست گار ہوں“ (روزنامہ اسلام ۵ ستمبر ۲۰۱۵ء)

موصوف اپنے ”کالموں“ میں تو، بہ تصریح نام ”باغی، باغی“ کی رٹ لگاتے رہے اور جب از خود معافی کی درخواست اللہ کی بارگاہ میں پیش کی تو حضرت معاویہؓ کا اسم گرامی لکھنے کے بجائے ”کسی بھی صحابی“ کے الفاظ پر اکتفاء کر لیا حالانکہ وہ اپنی عرض داشت میں تو بہ تصریح نام حضرت معاویہؓ کی توہین و تنقیص کے مرتکب ہوئے تھے۔

موصوف کے ”معافی نامہ“ کے الفاظ سے ”بہ تصریح نام“ معافی نہ مانگنے کی وجہ یہ سمجھا آتی ہے کہ انہوں نے معافی مانگتے ہوئے یہ الفاظ لکھے تھے کہ: ”بہر کیف اس عرض داشت میں سہوانا دانستہ کسی صحابی کے حق میں سرزد ہوجانے والی ادنیٰ تقصیر پر۔“

یعنی اگر انہوں نے ”سہوانا دانستہ“ کسی صحابی کی تنقیص کی ہو تو۔۔۔

لیکن اس ”عرض داشت“ میں موصوف نے ”قصداً اور دانستہ“ طور پر حضرت معاویہؓ کی تنقیص کی ہے اس لئے وہ ”بہ تصریح نام“ معافی نہیں مانگ سکے۔ البتہ انہوں نے

قارئین کو یہ نصیحت ضرور فرمائی ہے کہ:

”کوئی اس قسم کی علمی اباحت پڑھ کر ہرگز ہرگز حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب سے نفرت اور بغض کے مرض میں مبتلا نہ ہو۔ علمی بحث میں کچھ کہنا ناگزیر ہو جاتا ہے، مگر اس سے ہٹ کر ان کے بارے میں رکیک تبصرے کرنا اپنی ہی آخرت خراب کرنے کے مترادف ہے۔“ (روزنامہ اسلام: ۵ ستمبر ۲۰۱۵ء)

اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کے اپنے اعتراف کے مطابق ان کی ”عرض داشت“ سے حضرت معاویہؓ اور ان کے اصحاب سے ”نفرت اور بغض“ کے مرض میں مبتلا ہونے کے خدشات پیدا ہو سکتے ہیں جس کا انجام بھی انہوں نے خود ہی بتا دیا۔

”تنقیصات“ پر تو بہ تو ”نزعی کیفیت“ طاری ہونے سے پہلے کسی وقت بھی ہو سکتی ہے۔ روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار مولانا محمد اسماعیل ریحان صاحب نے ”کسی بھی صحابی“ کی شان میں ادنیٰ تنقیص پر معافی مانگنے کے بعد بھی حضرت معاویہؓ کے خلاف اور ان کی مرمومہ ”بغادت“ کو ثابت کرنے کے لئے انتہائی جارحانہ انداز ”فیس بک“ پر جاری رکھا۔ ایک جلیل القدر صحابی، خال المؤمنین اور کاتب وحی کے بارے میں موصوف کی نگارشات کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں:

”ماہ رمضان میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے یوم شہادت کے موقع پر روزنامہ اسلام میں اس موضوع پر شائع ہونے والے مضامین، مجموعی لحاظ سے خوب تھے، مگر ایک کالم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین برپا ہونے والی جنگ صلیب کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ شام پر فوج کشی کرنے والوں پر ”باغیوں“ کا اطلاق کر دیا گیا اور ساتھ ہی یہ تاثر دیا گیا کہ شام پر فوج کشی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوئی کردار نہ تھا، بلکہ یہ ان کے گرد گھیرا ڈالنے والے بلکہ ان پر مسلط ہو جانے والے سبائیوں کا کیا دھرا تھا۔ اسی لیے فاضل کالم نگار نے لکھ دیا کہ جب باغیوں نے شام پر حملہ کیا تو اس وقت بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں کنٹرول کرنے کی پوری کوشش کی۔

یہ مندرجات اہل سنت والجماعت کے مسلک سے ہم آہنگ نہیں۔ جمہور اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ مشاجرات صحابہ کے اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف برحق تھا۔ وہ ایک بغاوت فرو کرنے کے لیے شام پر حملہ آور ہوئے اور اس اجتہادی فیصلے میں وہ

حق بجانب تھے۔ باغیوں کا اطلاق علوی فوج پر نہیں، بلکہ اہل شام پر ہوتا تھا۔ ہم اہل شام بھی نیک نیت اور مجتہد تھے اور ان کی توہین و تنقیص جائز نہیں۔۔۔

... اس مقدس جماعت کی فوج کشی کو ”باغیوں کے حملے“ سے تعبیر کرنا حقیقت کے بالکل برعکس دعویٰ ہے، جو حدیثی و تاریخی روایات سے متصادم اور قیاس کی پیداوار ہے۔ مشاجرات میں سبائیوں کی شرانگیزی سے چشم پوشی بھی غلط ہے اور ہر بات ان کی طرف منسوب کر دینا بھی خلاف تحقیق ہے۔۔۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی نیک نیتی، حسن کردار اور اعلیٰ صلاحیتوں میں کوئی شبہ نہیں تھا، مگر ان کے بیعت نہ کرنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھیجا گیا گورنری سے معز دلی کا حکم مسترد کر دینے سے خلافت اسلامیہ انتظامی طور پر دو لخت ہو گئی تھی۔ اس طرح عالم اسلام کا دو ٹکڑوں میں بٹ جانا، امت کے لیے قاتلین عثمان کے آزاد پھرنے سے زیادہ بڑی آزمائش بن رہا تھا۔ کسی بھی مملکت کے ایک حصے کا اس طرح مرکز کی تابع داری سے آزاد رہنا، اصولاً بغاوت کے زمرے میں آتا تھا، ایسے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں سے اپنی دلی محبت، ان کے مقام صحابیت کے اعتراف اور ان کے خلوص پر یقین کے باوجود ایک حکمران کی حیثیت سے مملکت اسلامیہ کو دو ٹکڑوں میں بٹنے سے بچانے اور حکومتی بالادستی کو قائم رکھنے کے سب سے زیادہ ذمہ دار تھے۔ قرآن مجید نے مسلم حکمرانوں کے خلاف خروج کرنے والی جماعت کو بزدل و ریشمیر زبیر کرنے کی اجازت دی ہے۔ ارشاد باری ہے: ”پس قتال کرو اس جماعت سے جو بغاوت کرے۔“ (الحجرات: ۹)

... لہذا اہل شام کا موقف تبدیل کرنے کی کوششوں کے رائیگاں جانے کے بعد آخر کار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سوچ سمجھ کر ایک بڑا لشکر ترتیب دینا شروع کیا اور لوگوں کو اس میں شرکت کی خود ترغیب دی۔۔۔۔۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اصل مقصد اتحاد و اتفاق تھا۔ بڑی فوج جمع کرنے کا مطلب اہل شام کی طاقت ملیا میٹ کرنا نہیں تھا، بلکہ اس میں یہ حکمت کا فرما تھی کہ حریف پر جنگ سے پہلے ہی دباؤ پڑ جائے اور جنگ کے بغیر یا معمولی جھڑپ سے معاملہ حل ہو جائے۔۔۔۔۔ اسی کش مکش کے دوران حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے قتل کا سانحہ پیش آیا، جو لشکر حضرت علی کے اکابر میں اور اسلام لانے والے

اولین چند صحابہ میں سے تھے، اپنے موقف کی سچائی پر انہیں اتنا یقین تھا کہ کفر مارہے تھے: ”اللہ کی قسم! اگر اہل شام ہمیں مار مار کر کوہ بھری چوٹیوں تک بھی دھکیل دیں، تب بھی مجھے اپنے حق پر ہونے اور مخالفین کی گمراہی کا یقین رہے گا۔“ (مسند امام احمد بن حنبل، ج 41، ص: 97) مگر اس سے مخالف کی تکفیر مراد نہیں تھی۔ وہ حریف کو اپنے جیسا مسلمان ہی تصور کرتے تھے، چنانچہ جب کسی شخص نے کہا ”شام والے کافر ہو گئے ہیں“ تو تردید کرتے ہوئے فرمایا: ”ہمارا اور ان کا نبی ایک ہے اور قبلہ بھی ایک ہے، مگر وہ لوگ فتنے کا شکار ہیں۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج: 15، ص: 290)۔ {تخت تعجب ہے کہ فتویٰ حضرت عمارؓ کا اور تاویل حضرت علیؓ کی پیش ہو رہی ہے؟ از مؤلف کتاب خدا}

... حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مشہور تھا: ”تقتله الفئة الباغية“ انہیں باغی گروہ قتل کرے گا۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایک مامور فخر ابو الغادیہ جنہی نے قتل کیا تھا۔ ابو الغادیہ جنہی کا اپنا بیان ہے کہ میرا صلیب میں اچانک حضرت عمار سے آمننا سامنا ہو گیا۔ ان کی زرہ میں شگاف تھا، میں نے وہیں نیزہ گھونپ دیا، جب وہ گرے تو پتا چلا کہ وہ عمار بن یاسر ہیں۔ (مسند احمد، ج: 27، ص: 250، ش) ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمارؓ اس وقت آگے بڑھتے ہوئے دونوں صفوں کے درمیان آگئے تھے اور خود (ہیلٹ) کی بجہ سے ان کی پہچان نہیں ہو سکتی تھی، جب نیزے کی چوٹ کھا کر گرے اور خود کھولا گیا تو پتا چلا کہ حضرت عمارؓ بن یاسر شہید ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ حضرت علیؓ کا اصل مقصد اتحاد ملت تھا اور فوج کشی کے باوجود پہلا ہدف حریف پر دباؤ ڈال کر اسے رام کرنا تھا۔ یہ کوشش کامیاب نہ ہونے پر جنگ کا فیصلہ کیا گیا۔ اندازہ یہ تھا کہ اہل شام معمولی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دیں گے، مگر جنگ کی شدت دیکھنے کے بعد حضرت علیؓ نے فرمایا: ”مگر مجھے معلوم ہوتا کہ معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا تو میں کوفہ سے ہرگز نہ نکلتا۔“... چنانچہ حضرت علیؓ نے اہل شام کو فوری طور پر عارضی طور پر جنگ بندی کی پیش کش کر دی۔ آپ نے شامی فوج کے سپہ سالار حضرت عمرو بن العاصؓ کو پیغام بھیجا: مقتولین بکثرت ہو چکے ہیں، جنگ روک دیں تاکہ انہیں دفن کیا جاسکے۔ عمرو بن العاصؓ نے مثبت جواب دیا۔ اس کے بعد دونوں فریق

باہم گھل مل گئے۔۔۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں اس سکتے پر متفق تھے، تاہم اس پیشکش کی سعادت حضرت معاویہؓ کو ملی۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے سیدنا حضرت معاویہؓ کو شورہ دیتے ہوئے کہا: ”قرآن مجید کا نسخہ حضرت علیؓ کے پاس بھیج کر انہیں کتاب اللہ کی طرف دعوت دیں، وہ اس پیشکش کو مسترد نہیں کریں گے۔ (اور ظاہر ہے حضرت علیؓ جیسے پابند شریعت انسان کے یہی شایان شان تھا) چنانچہ ایک صاحب یہ پیشکش لے کر حضرت علی المرتضیٰؓ کے پاس گئے اور کہا: ”ہمارے اور آپ کے درمیان یہ اللہ کی کتاب (مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے) موجود ہے۔ پھر ان صاحب نے سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۲۳ تلاوت کی: ”(بھلا تو نے دیکھا ان لوگوں کو جنہیں کتاب کا ایک حصہ عطا کیا گیا، انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے پھر بھی ان میں سے ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور توجہ نہیں دیتا) آیت سنلے کا مقصد یہ تھا کہ ہم میں سے کسی کو اس وعید کا مصداق نہیں بننا چاہیے۔ حضرت علیؓ نے توقع کے عین مطابق مثبت جواب دیتے ہوئے فرمایا: ”ہاں، میں تو اس پیشکش کو سب سے پہلے قبول کرنے والا ہوں۔ ہمارے درمیان اللہ کی کتاب (فیصلے کے لیے موجود) ہے۔“۔۔۔

... یہ تھا معتبر روایات کی روشنی میں جنگ صلیب کا تذکرہ، جسے ماگزین طور پر اس لیے ذکر کرنا پڑا کہ اس وقت ہمارے نوجوان علماء و فضلاء میں سے بھی ایک اچھی خاصی تعداد، ذخیرہ حدیث پر وسعت نگاہ نہ ہونے کے باعث، مشاجرات کا یا تو ٹکسرا نکار کرنے لگی ہے یا اس بارے میں ایسی تاویلات کو قبول کر چکی ہے جو ذخیرہ حدیث سے بھی متضاد ہیں۔ اچھی تاویل ضرور ہونی چاہیے مگر اس کے بھی اصول مقرر ہیں جن میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ قیاس کی بناء پر صحیح روایت کو مسترد نہیں کیا جائے گا۔ یہ اصول احکام کی احادیث کی طرح دو رتبہ اور ایام صحابہ کے واقعات میں بھی جاری ہوتا ہے۔۔۔

... تاہم جنگ صلیب اور دیگر مشاجرات کے بارے میں صاف و شفاف روایات بھی محفوظ ہیں جن پر محدثین اور فقہاء نے اعتماد کیا ہے۔ انہیں ٹھکرانا، محدثین، کتب حدیث اور فقہاء سے بد اعتمادی کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی فقہ میں باغیوں سے لڑائیوں کے جو شرعی احکامات تفصیل سے موجود ہیں، ان کا استنباط مشاجرات کی معتبر روایات ہی سے کیا گیا ہے اور اس بارے میں سب سے پہلے حضرت علی المرتضیٰؓ کے قول

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

و فعل کو مدد دینا یا گناہ ہے۔ پس مشاجرات کا ذکر کر کے صحابہ کو ہدف تنقید بنانا بھی گمراہی ہے اور ان کا انکار کر کے، حدیث و تاریخ کے مستند ذخیرے کی نفی بھی اپنی علمی میراث سے دست کش ہونے کے مترادف ہے۔ ائمہ مجتہدین نے مشاجرات کو اسی نگاہ سے دیکھا کہ ان میں ہمارے لیے راوی عمل کیا نکلتی ہے۔۔۔ (روزنامہ اسلام ۲۱، ۲۲، ۲۶، ۲۷، ۲۸ جولائی ۲۰۱۵ء زیر عنوان: ”تاریخ صحابہ اور راوی اعتدال“)

قارئین کرام! اب آپ مولانا اسماعیل ریحان صاحب کا سیدنا معاویہؓ کے بارے میں جارحانہ انداز ان کی طرف سے فیس بک پر پوسٹ کی جانے والی چند عبارت اور مکالمات میں ملاحظہ فرمائیں:

Muhammad Irfan Ul Haq

جب نبیؐ نے صحابہؓ نے سیدنا علیؓ اور سیدنا معاویہؓ کے اختلاف پر فریقین میں سے کسی کو جتنا مصیبت و غلطی نہیں قرار دیا تو بعد والے کسی فرد کو اس معاملہ میں جج بننے کا کیا اختیار ہے؟ نبیؐ نے سیدنا حسنؓ کے لیے فرمایا کہ یہ مسلمانوں کی دویزی جماعتوں میں صلح کا باعث بنے گا۔ آپؐ نے مسلمانوں کی دویزی جماعتوں کا فرمایا، کسی کو باغی، خاطی، مصیبت، غلطی نہیں فرمایا، بلکہ دونوں کو برابر قرار دیا تو آپؐ جیسے کسی گماشتے کو مشاجرات پر جج بننے کی کیا تک ہے؟؟

Ismail Rehan

یہ فیصلہ میں نے نہیں اہل سنت کے ائمہ نے کیا ہے۔ نمونے کے طور پر چند حوالے دے رہا ہوں مطالعہ خود کر لیں امام نوویؒ کی شرح مسلم کتاب الفتن باب اشرار الساعۃ، حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب الفتن باب کذا۔ حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج 6 ص 220 مطبوعہ دار الجرح علامہ عینی عمدة القاری ج 24 ص 192 ابن ہام خفی فتح القدیر شرح ہدایہ ج 7 ص 263 مطبوعہ دار الفکر علامہ آلوسی الا جوبۃ العراقیہ ص 38 حتی کہ علامہ عبد العزیز فرہاری رحمہ اللہ نے الناہیہ عن طعن امیر المؤمنین معاویہؓ جو ہے ہی حضرت معاویہؓ کے دفاع میں اس میں اہل سنت کا یہی عقیدہ نقل کیا ہے ص 74 حوالے اور بھی ہیں مگر اس کے لیے جسے علم سے کچھ واسطہ ہو۔

Muhammad Irfan Ul Haq

سیدنا علیؓ کی فوج میں قاتلان عثمان شامل تھے، انہی بد بختوں کو باغی کہا گیا، پوری فوج کو نہیں بلکہ جناب نے اپنی عقل کل کی وجہ سے پوری فوج کو اس کا مصداق بنا کر تبرے بکجا اور اسلام کے نام پر کفر پھیلایا۔

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

Ismail Rehan

یہ وضاحت آپس قاضی صاحب خود کر سکتے ہیں آپ کو ان کی نیت کا علم کیسے ہوا جب کہ ان کی عبارت ہے جب باغیوں نے شام پر حملہ کیا.....! اگر مطلب وہ ہے جو آپ سمجھنا چاہتے ہیں تو عبارت کچھ اس طرح ہوتی جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قاتلین عثمان کو بھی ساتھ لے کر شام پر حملہ کیا یا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج شام گئی تو اس میں باغی سبائی بھی شامل تھے باغیوں نے شام پر حملہ کیا سے تو ہر وہ شخص جو جانتا ہے کہ حضرت علی کی فوج صحابہ اور تابعین کی قیادت میں اہل شام سے لڑنے گئی تھی (جیسا صحیح احادیث سے بھی ثابت ہے) وہ ساری باغی تھی، کیونکہ حملے میں سبھی شامل تھے۔

Ismail Rehan

اس عبارت میں یہ کہاں ہے کہ حضرت معاویہؓ کی طرف خروج کی نسبت جھوٹ ہے، عقل پر ہاتھ ماریں المضموعات الکبیر ہے ہی جھوٹی روایات کی نشاندہی کے لیے یہاں ملا علی قاری کی مراد وہ روایات ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عمرو بن العاص، بنو امیہ اور یزید وغیرہ کی مذمت منقول ہے۔ یہ ہرگز مراد نہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف خروج کی نسبت بھی غلط ہے۔ خود ملا علی قاری اس بات کو پوری طرح واضح فرما رہے ہیں ان کی عبارت ملاحظہ ہو وہ صحابہ کے بارے میں اچھی رائے رکھنے کے فرامین نبوی نقل کر کے فرماتے ہیں ہذا مما لا ینافی ان یدکر احد مجملا او معینا بان المحاربین مع علی (رضی اللہ عنہ) ما کانوا من المخالفین، او بان معاویۃ و حزیہ کانوا باغین علی ما دل علیہ حدیث عمار تقتلک الفئۃ الباغیۃ لان المقصود منه بیان الحکم المميز بین الحق والباطل والفاصل بین المجتہد المصیب والمجتہد المخطی (مرقاۃ شرح المہکلوۃ ج ۸ ص ۳۳۹) یعنی یہ ارشاد است نبویہ اس بات کے منافی نہیں کہ کوئی مختصراً متعین طور پر یہ ذکر کرے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو کر جنگ کرنے والے مخالف (شریعت) نہ تھے یا یہ کہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت والے باغی تھے جیسا کہ اس پر حدیث عمار تقتلک الفئۃ الباغیۃ دلیل ہے، کیونکہ یہاں مقصد اس حکم کو بیان کرنا مقصود ہے جو صحیح اور غلط میں تمیز کر دے اور مجتہد مصیب اور مجتہد مخطی میں فرق واضح کر دے۔ اب ملا علی قاری پر بھی سبائیت کا فتویٰ لگے گا یا نہیں؟

Ismail Rehan

حافظ ابن حجر کی عبارت جمہور اہل سنت کی بہترین ترجمانی کر رہی ہے فتح الباری اٹھا کر دیکھ لیں فرماتے ہیں وفی قوله صلی اللہ علیہ وسلم تقتل عمارا الفئۃ الباغیۃ دلالة واضحة علی ان علیا ومن معه کانوا

امام طبری۔۔۔ کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

علی الحق وان من قاتلهم کانوا مخطئین فی ذلویہم (ج ۶ ص ۶۱۹) ودل حدیث تقتل عمارا الفئۃ الباغیۃ علی ان علیا کان المصیب فی تلک الحرب لان اصحاب معلویۃ قتلوه (فتح الباری ج ۳ ص ۸۵) یعنی حدیث کہ عمارؓ کو باغی گروہ قتل کرے گا دلالت کرتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس جنگ میں درست تھے کیونکہ حضرت معاویہؓ کے اصحاب نے حضرت عمارؓ کو قتل کیا تھا۔ اب حافظ ابن حجر پر بھی سہانیت زدگی کا الزام لگا دیجیے

Ismail Rehan

مشاجرات صحابہ کے بارے میں شرح عقائد نسفی کی عبارت

و ما وقع بینہم من المنازعات والمجاریات قلہ محامل و تاویلات فسیہم والظعن قیہم ان کان مما یخالف الادلۃ القطعیۃ فکفر کتذوف عائشۃ و الا قبدعۃ و فسق و بالجملة لم ینقل عن المذہب المجتہدین والعلماء الصالحین جواز اللعن علی معاویۃ رضی اللہ عنہ و احزابہ لان غایۃ امرہم البغی والخروج علی الامام وهو لا یوجب اللعن (صحابہ کے مابین جو تنازعات اور جنگیں واقع ہوئیں ان کے لیے محمل اور تاویلیں موجود ہیں پس انہیں برا بھلا کہنا اور ان پر طعن زنی کرنا اگر ایسا ہو جو دلائل قطعیہ کے مخالف ہے تو ایسا ظعن کفر ہوگا جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت ورنہ بدعت اور فسق ہوگا اور بہر کیف اسلاف مجتہدین اور علمائے صالحین سے حضرت معاویہؓ اور ان کے اصحاب پر لعنت کا جواز منقول نہیں ہے اس لیے کہ ان کا معاملہ زیادہ سے زیادہ بغاوت اور امام کے خلاف خروج تھا اور اس سے لعنت واجب نہیں ہوتی) شرح عقائد نسفی ص 373

Ismail Rehan

السلام علیکم ورحمۃ اللہ بہت خوشی ہوئی آپ سے فیس بک پر ملاقات کر کے، یہ بات بالکل درست ہے چاہے کسی نے بھی کہی ہو۔ اس مسئلے پر سعودی عرب میں کوئی اختلاف نہیں، وہاں کے علماء کثر جنہی ہیں، اور کمزور روایات کو منہ نہیں لگاتے، صحیح حدیث پر عمل کرتے ہیں، وہاں تھوڑا سا اختلاف ہوا تو سرکاری سطح پر سابق مفتی اعظم کے منصب پر فائز شیخ عبدالعزیز ابن باز سے فتوے لیا گیا، ان کا جواب تھا

قال صلی اللہ علیہ وسلم تقتل عمارا الفئۃ الباغیۃ فقتلہ معاویۃ واصحابہ فی صفین فمعاویۃ واصحابہ بغاۃ لکن مجتہدین (مجموعہ فتاویٰ ابن باز ج 6 ص 89) بس فیصلہ ہو گیا، یہ مجموعہ فتاویٰ خود سعودی حکومت کا سرکاری مذہب ہے وہاں کوئی جھگڑا نہیں۔

Shafaqat Zareen

امام طبری۔۔۔ کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

آپ کے نزدیک مفتی اعظم سعودیہ کے فتویٰ کی کیا حیثیت ہے؟ کمزور روایات کو منہ نہیں لگاتے اور پھر حدیث اور فتویٰ نقل کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس روایت سے مفتی اعظم نے استدلال کیا ہے وہ کوئی کمزور روایت نہیں بلکہ صحیح روایت ہے اور اس کی بنیاد پر انہوں نے جو حضرت امیر معاویہؓ کو صریحا باغی کہا وہ بھی درست ہے؟؟ کیا ایک شخص ہادی، مہدی، راشد، متقی اور باغی ایک وقت میں یا مختلف اوقات میں ہو سکتا ہے؟ یا اگر پہلے متقی، ہادی ہو پھر باغی بن جائے؟ قرآن کا ارشاد صحابہ کرام کے بارے میں کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک تھلپا قیامت تک کے لیے ہے کہ وہ سب کے سب راشد، یکے مومن، متقی و پرہیزگار، مغفور ہیں، اور بالخصوص حضرت امیر معاویہؓ کے بارے میں فرمایا اللہم اجعلہ ہادیا مہدیا و اھدیا، رواہ البخاری فی تاریخہ، والترمذی، اور ایک موقع پر جب حضرت امیر معاویہؓ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سواری پر سوار تھے تو ان کا پیٹ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمر مبارک سے لگا تو آپ نے دعا فرمائی، اے اللہ معاویہ کے پیٹ کو ظلم سے بھر دے۔ ان ارشادات کے بعد حضرت امیر معاویہؓ کی کہنیا کہنے والے کی حمایت کرنا یا تردید نہ کرنا کیا ہے؟؟

Ismail Rehan

اصل مسئلہ آپ حضرات کے ساتھ یہ ہے کہ آپ باغی کو اردو محاورے والا باغی سمجھ کر مفتی معنی میں لیتے ہیں۔۔۔

Muhammad Irfan Ul Haq

خدا کا خوف کریں آپ بھی تشیع کی طرح صحابہ کے میدان جہاد سے فرار ہونے پر یقین کرتے ہیں؟ نبی علیہ السلام نے سیدنا علیؓ و سیدنا معاویہؓ کے گروہوں کو فقہ عظیمہ فرمایا ہے۔ بین فئتن عظیمین من المسلمین او کما قال۔ فقہ باغیہ والے مسئلہ کا جواب خود حضرت معاویہؓ سے منقول ہے دیکھ لیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔

Muhammad Zahid

یہی تعبیر کتب اہل السنۃ میں اتنی کثرت سے بیان ہوئی ہے کہ اگر حوالہ جات جمع کئے جائیں تو پوری کتاب بن جائے۔ سوال یہ نہیں کہ یہ تعبیر درست ہے یا غلط سوال یہ ہے کہ اگر یہ تعبیر گستاخی کے ضمن میں آتی ہے تو ہمت کر کے نام لے کر تمام ان لوگوں پر گستاخ ہونے کا فتویٰ لگائیں جنہوں نے یہ تعبیر اختیار کی ہے۔

Zaheer Uddin Babar

حضرت بہت ادب کے ساتھ صرف تعبیریں نہیں بلکہ نفس مسائل میں کتنے ہی مقامات ہیں جہاں ہم اختلاف کو روا رکھتے ہیں۔ ادب بھی باقی رہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر یہاں ان کی

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

تعبیر ”نفس“ کی حیثیت کیوں اختیار کر گئی ہے جس سے اختلاف ممکن نہیں۔

Muhammad Zahid

میں زبردستی نہ کوئی تعبیر منوانا چاہتا ہوں نہ کوئی موقف، اختلاف شوق سے کریں تاہم اگر کسی تعبیر کو گستاخی قرار دینا ہے تو یہ فتویٰ سب پر لگائیں۔ وگرنہ گستاخ ہونے کا فتویٰ لگائے بغیر بھی اختلاف کیا جاسکتا ہے یہی بات میں نے کمنٹ میں واضح لکھی ہے کہ اس تعبیر کے صحیح یا غلط ہونے کا سوال نہیں گستاخی کے فتوے کا ہے۔

Muhammad Ejaz

اگر ان مفتیان کرام کی ”توضیح“ کے مطابق ”حدیث عمار“ کی رو سے حضرت معاویہ کو یقینی طور پر ”باغی، خطاکار اور دنیا میں ہی قابل گرفت“ قرار دے دیا جائے تو _____ حدیث عمارؓ کے چار صحابی راویوں سمیت کثیر صحابہؓ ”قتل عمار“ کے بعد بھی کیوں غیر جانبدار رہے؟ نیز صحابی راویوں سمیت دیگر ہزاروں صحابہؓ یقیناً نے حضرت معاویہؓ کی حمایت کیوں جاری رکھی؟ بلکہ خود حضرت علیؓ نے اس ”نفس صریح“ کے باوجود جنگ بندی و تحکیم کیوں قبول فرمائی؟ غلو عقیدت، مسلکی مصلحت اور شخصیت پرستی کے خول سے نکل کر کتاب و سنت کی روشنی میں قرآنی شخصیات یعنی صحابہؓ کرامؓ بالخصوص حضرت معاویہؓ کے بارے میں فیصلہ کیا جائے کہ کیا کسی بھی غیر صحابی بزرگ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان کی توہین، تنقیص اور تخطیہ کرنا پھرے؟ بحوالہ: سیدنا معاویہ کے قائدین ص 16 مؤلف پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی

Ismail Rehan

بھائی مدثر جمال آپ کی صرف اس بات سے اختلاف ہے کہ قتل کرنے والا کوئی الگ گروہ تھا خود شامی قیادت کو اس کا اعتراف تھا۔ طبقات ابن سعد میں صحیح سند کی دو روایات ہیں جن میں حضرت عمرو بن العاصؓ نے خود اقرار کیا ہے کہ عمار کو ہم نے قتل کیا۔ ”انا واللہ قتلناه“... ”واللہ لقد قتلناه“ (طبقات ابن سعد: ۲۶۳/۳) حضرت عمرو بن العاصؓ کا یہ فرمانا جو بطور یندا مت اور افسوس کے تھا، جمہور کے مسلک کو پوری طرح ثابت کر رہا ہے۔ صحیح روایات میں ہے کہ قاتل حضرت معاویہؓ فوج کے مشہور سپاہی جناب ابو الغادیہ تھے، اعتراف قتل پر مشتمل بیان خود احادیث کی کتب میں منقول ہی۔ روایات ملاحظہ فرمائیں: (۱) ابو الغادیہ نے حضرت عمارؓ کے قتل کا یوں قصہ سنایا: جب صفین کی جنگ ہوئی تو اچانک عمار میرے سامنے آ گئے، انہوں نے زہ پہنچی تھی، میں نے ان کی زہ کی کڑیوں میں شکاف ساد کچھ کرو ہیں نیزہ گھونپ کر انہیں قتل کر دیا۔ پس دیکھا تو وہ عمار بن یاسر تھے۔ (مسند احمد: روایت

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

نمبر ۱۶۹۸ (۲) ابو الغادیہ کہتے ہیں، کسان بعد عمار بن یاسر من خیارنا فلما کان یوم صفین اقبل یمشی اول الکلبۃ راجلاً، حتی اذا کان من الصفین طعن رجل فی ركبته بالرمح فعضر فانکفأ المعفر عنه فضر به فاذا هورأس عمار... بالرمح

عمار بن یاسر کو ہم اپنے اچھے لوگوں میں شمار کرتے تھے۔ صفین کے دن وہ پہلے دستے میں پیدل آگے بڑھتے ہوئے دونوں صفوں کے بیچ میں آئے تو ایک شخص نے ان کے گھٹنے پر نیزہ مارا، وہ گرے تو ان کا خود ڈھلک گیا، میں نے وار کیا تو دیکھا وہ عمار کا سر تھا۔ » معجم کبیر طبرانی: ۱۸۷۶ ج ۲، ۳۶۳۲۲ ج ۲۔ رجالہ، کلم ثقات »

(۳) یہی صحیح روایت مجمع الزوائد میں بھی ہے۔ (روایت نمبر ۸۲۲۲، قال ابوشامہ و رجالہ رجال الصحیح)

(۴) یہی صحیح روایت مستدرک حاکم میں بھی ہے۔ (روایت: ۵۶۵۸ ج ۳، ۳۶۳۲۲ ج ۲ رجالہ ثقات)

ان روایات کو دیکھتے ہوئے اساماء الرجال کے کسی ماہر نے ابو الغادیہ کی صحبت کا انکار کیا ہے نہ ان کے قاتل عمار ہونے میں کسی کو شک رہا ہے۔ وہ حضرت معاویہؓ اور امراء بنو امیہ کے مقرب تھے۔ ابو الغادیہ کے بارے میں علمائے امت کے اقوال درج ذیل ہیں۔

☆ امام احمد بن حنبل نقل کرتے ہیں: ابو الغادیہ، حبیب بن الجارث اور ام ابو العالیہ ہجرت کر گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور اسلام قبول کیا۔ » (مسند احمد: ۱۶۷۰۱)

☆ امام دارقطنی ابو الغادیہ کو صحابی تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ابو الغادیہ بن یسار بن سبیح، انہیں شرف صحابیت نصیب ہوا، انہی نے صفین میں حضرت عمارؓ کو قتل کیا۔ » (سؤالات السلی لد دارقطنی: ۴۳۱۔ المؤلفات: ج ۴ ص ۱۷۹۳)

☆ ابن عبد البر نے الاستیعاب میں یہی لکھا ہے کہ وہ صحابی تھے، قاتل عمار انہی کے ہاتھوں ہوا۔ » ج ۴ ص ۲۵۵، تحت ابو الغادیہ » ☆ یہی ابن اثیر نے اسد الغابہ میں لکھا ہے: » ج ۶ ص ۲۳۱ لکھا ہے: » ج ۱۵ ص ۱۵ » ☆ یہی ابن اثیر نے سیر اعلام النبلا میں بیان کیا ہے » ج ۲ ص ۵۴۴ »

☆ یہی حافظ ابن حجر نے، الاصابہ میں نقل کیا ہے » ج ۷ ص ۲۵۸ » ☆ ابو الغادیہ بنی کے علاوہ حضرت عمارؓ کے قتل میں شریک » سرے فرکانام حوی بن ماتع السکسی ہے۔ وہ بھی جبک صفین میں حضرت معاویہؓ کے لشکر میں تھے۔ ابن عساکر میں ہے کہ حوی السکسی اور ابو الغادیہ نے مل کر حضرت عمارؓ کو قتل کیا تھا۔ » (ابن عساکر: ج ۱ ص ۳۶۷)

☆ یہی طبقات ابن سعد میں ہے: » وحمل علی عمار حوی السکسی و

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

ابوالغادیہ المزنی و قتلاہ «ج ۳ ص ۱۹۸

پس قتل عمار کا کسی تیسرے گروہ کے ہاتھوں ارتکاب ایسا قیاس ہے جو صحیح آثار سے متعارض ہے

Ismail Rehan

میرے اوقات بہت زیادہ صرف ہوتے ہیں، اس لیے میں نے اپنی پوسٹوں پر آنے والی ایسی کمنٹس کو نظر انداز کرنے کا اصول طے کیا ہے جن میں محض جذباتیت ہو۔ البتہ ایک دوست نے ایک اصولی سوال کیا تھا۔ وہ یہ ہے کہ الفیہ الباغیہ والی حدیث روایت کرنے والے بعض راویوں نے حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ ان میں سے بعض حضرات حضرت معاویہؓ کے لشکر میں بھی شامل تھے۔ اگر الفیہ الباغیہ والی حدیث کا وہ مطلب ہوتا جو جمہور اہل سنت نے مراد لیا ہے تو یہ حضرات، حضرت علیؓ کے لشکر میں کیوں شامل نہ ہو گئے حالانکہ انہیں حدیث عمار اچھی طرح معلوم تھی

اس کا اصولی جواب تو یہ ہے کہ ہمیں جانب راجح کی دلیل معلوم ہونا ضروری ہے اور وہ سب پر عیاں ہے۔ جانب مرجوح کی دلیل یا تاویل معلوم نہ بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہم اس کے قائل ہی نہیں۔ جہاں صحابہ کا معاملہ ہو وہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ فریق ثانی بھی مجتہد اور ماجور تھا چاہے ہمیں ان کی تاویل معلوم نہ ہو۔ ہم میرا خیال ہے کہ اتنی بات سے سائل کو اطمینان نہیں ہوگا اس لیے ایک دوبار تیں عرض کرنا چاہتا ہوں

(1) جن راویوں نے یہ روایت پیش کی ہے، ان میں سے کچھ وہ تھے جو جنگ میں نہیں گئے تھے۔ اس لیے ان کے عمل پر کوئی اشکال نہیں۔ ظاہر ہے جب تک حضرت عمارؓ قتل نہیں ہوئے تھے تب تک ان پر اس حقیقت کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔ اس روایت کو نقل کرنے والے جو حضرات اپنے گھروں میں تھے انہیں اتنا موقع ہی کہاں ملا کہ ان تک عمار کی خبر پہنچتی اور وہ میدان جنگ میں پہنچ کر حضرت علیؓ کا ساتھ دیتے کیونکہ شہادت عمارؓ ان کے تیسرے دن مغرب سے عشاء کے درمیان ہوئی تھی اور پھر اسی نصف شب کے بعد جنگ بندی ہو گئی تھی

(2) دوسرے اس روایت کے جو راوی لشکر شام میں شامل تھے (جیسا کہ خود حضرت معاویہؓ اس کے راوی ہیں) انہوں نے حضرت عمارؓ کے قتل کے بعد اس واقعے میں یہ تاویل کی تھی کہ الفیہ الباغیہ یا حضرت عمار کا قاتل گروہ خود حضرت علیؓ کا لشکر ہے کیونکہ وہی حضرت عمارؓ کو لے کر آئے تھے۔ حضرت معاویہؓ کے الفاظ صیح الاسانید روایت کے مطابق یہ ہیں

انما قتلہ علی و اصحابہ جاء وایہ حتی القوہ بین رماحنا (مسند احمد، مسند صحیح 1777، مستدرک حاکم 2663 قال الذہبی علی شرط البخاری و مسلم)

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

انہیں تو حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں نے قتل کیا ہے کہ وہی انہیں لائے اور ہمارے نیزوں کی زو میں ڈال دیا۔ پس اہل شام میں سے جو حدیث عمار سے واقف تھے وہ اس تاویل کو صحیح سمجھ کر لڑتے رہے۔

Muhammad Hamza Mehboob

بہت سوچنے سمجھنے کے بعد اور بہت غور و فکر کے بعد آخر جا کہ عافیت اور سلامتی اسی میں نظر آتی ہے کہ اس آیت کو اپنا رہنما اور ہیر بنا لیا جائے... تلك امة قد خلت... لها ما كسبت ولكم ما كسبتم... ولا تستغلون عما كانوا يعملون... اللہ کا وعدہ سب صحابہ کے ساتھ ہے..... اور ہمارا کچھ پتہ نہیں..... دعا یہی ہے کہ حب جمع صحابہ کے ساتھ اللہ ہمیں پاس بلائے..... اور ہمارا حشر سیدنا علیؓ... سیدنا عمارؓ... سیدنا طلحہؓ وزیر اور سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ کرے..... اللہم آمین اللہم تقبل.....

Ismail Rehan

یہی احوط ہے اسی لیے ہمارے اکابر کا موقف ہے کہ اسلاف کی رائے کو نہ چھیڑا جائے، نئی تحقیقات نہ کی جائیں ورنہ بحث کا دروازہ کھلتا ہے، اہل علم کے سامنے کوئی ناگزیر سوال آئے تو جواب دیں عام لوگ سکوت ہی اختیار کریں

Muhammad Ejaz

حضرت بہت خوب فرمایا آپ نے!! لیکن آپ کے سامنے کون سا ایسا علمی سوال اور مسئلہ پیش آگیا تھا، کہ آپ بھرپور تیاری کے ساتھ فیس بک جیسے پبلک فورم پر جہاں عالم وغیر عالم کی تمیز بھی نہیں کی جاسکتی کہ کون عالم پوسٹ کر رہا ہے اور کون کون جاہل آپ جیسے اہل علم کے دامن تحقیق سے الجھنے کی جسارت کر رہے ہیں، مشاجرات کے اس مازک مسئلے کو زیر بحث لائے ہیں۔ عوام کے سامنے اس قدر گردا گردانے کے بعد آپ کا یہ کہنا کہ عوام سکوت اختیار کریں کس قدر دانشمندانہ ہے، ہر ایک اندازہ لگا سکتا ہے۔ گزارش ہے کہ آپ جیسے محققین اگر ”سکون“ اختیار کر لیں تو عوام پر خود ہی ”سکوت“ طاری ہو جائے گا۔

Ismail Rehan

بلسلسہ دفاع علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ۔

صرف ان ساتھیوں کے لیے جو اس بحث میں شبہات کا شکار ہیں۔

ایک دوست نے پورے خلاص سے یہ رائے پیش کی ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا قاتل وہ گروہ تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں چھپا ہوا تھا، اس لیے الفیہ الباغیہ کا اطلاق ہی پر ہوگا

امام طبری۔۔۔ کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

یہ بہت اچھی رائے ہے بشرطیکہ قیاس کے سوا اس کی کوئی بنیاد نہ ہو۔ یہ طے ہے کہ صحیح روایت کے مقابلے میں قیاس کارآمد نہیں ہوتا۔ اس نئی رائے کو ہم ضرور اختیار کر لیتے مگر درج ذیل پختہ دلائل اس کے خلاف ہیں۔ (1) خود شامی قیادت کو اس کا اعتراف تھا۔ طبقات ابن سعد میں صحیح سند کی دو روایات ہیں جن میں حضرت عمرو بن العاصؓ نے اقرار کیا کہ عمار کو ہم نے قتل کیا ہے۔... ”اننا والله قتلناه“... ”والله لقد قتلناه“ (طبقات ابن سعد: ۳/۲۶۳) حضرت عمرو بن العاصؓ کا یہ فرمانا جو بطور ید امت اور افسوس کے تھا، جمہور کے مسلک کو پوری طرح ثابت کر رہا ہے۔

(2) صحیح روایات میں ہے کہ قاتل حضرت معاویہؓ کی فوج کے مشہور سپاہی جناب ابوالغادیہ تھے، ان کا اپنا بیان احادیث کی کتب میں صحیح سند سے منقول ہے

(۱) ابوالغادیہ نے حضرت عمارؓ کے قتل کا یوں قصہ سنایا: جب صفین کی جنگ ہوئی تو اچانک عمار میرے سامنے آ گئے، انہوں نے زہ پہنچی تھی، میں نے ان کی زہ کی کڑیوں میں شکاف سا دیکھ کر وہیں نیزہ گھونپ کر انہیں قتل کر دیا۔ پس دیکھا تو وہ عمارؓ بن یا سر تھے۔ (مسند احمد: روایت نمبر ۱۶۹۸)

(۲) ابوالغادیہ کہتے ہیں، کنا ساعد عمار بن یاسر من خبارنا فلما کان یوم صفین اقبل یمشی اول الکئیبة راجلا، حتی اذا کان من الصفین طعن رجل فی رکتہ بالرمح فعثر فانکفا المغفر عنه فضر به فاذا هو رأس عمار...

عمار بن یاسر کو ہم اپنے اچھے لوگوں میں شمار کرتے تھے۔ صفین کے دن وہ پہلے دستے میں پیدل آگے بڑھتے ہوئے دونوں صفوں کے بیچ میں آئے تو ایک شخص نے ان کے گھٹنے پر نیزہ مارا، وہ گرے تو ان کا خود ڈھلک گیا، میں نے وار کیا تو دیکھا وہ عمار کا سر تھا۔ «مجم کبیر طبرانی: ۱۸۷۶۴، ج ۳۶۳۲۲۔ رجالہ کلہم ثقات»

(۳) ایسی صحیح روایت مجمع الزوائد میں بھی ہے۔ «روایت نمبر ۸۲۲۲، قال البیہقی ورجالہ رجال الصحیح»

(۴) ایسی صحیح روایت مستدرک حاکم میں بھی ہے۔ «روایت: ۵۶۵۸، ج ۳۶۳۲۳۔ رجالہ ثقات»

ان ابوالغادیہ جہنی کو سہائی یا خارجی بھی قرار نہیں دیا جاسکتا کیوں کہ تمام محدثین، سیرت نگار اور اسماء الرجال کے ماہرین اس شخصیت سے واقف ہیں۔ جلیل القدر ائمہ کے نزدیک انہیں شریف صحبت نصیب ہے۔ اسماء الرجال کے کسی ماہر نے ابوالغادیہ کی صحبت کا انکار کیا ہے نہ ان کے قاتل عمار ہونے میں کسی کو شک رہا ہے۔ وہ حضرت معاویہؓ اور امراءؓ بنو امیہ کے مقرب تھے۔ ابوالغادیہ کے بارے میں علمائے امت کے اقوال درج ذیل ہیں۔

جلال امام احمد بن حنبل نقل کرتے ہیں: ابوالغادیہ، حبیب بن الحارث اور ام ابوالعالیہ ہجرت کر گئے

امام طبری۔۔۔ کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور اسلام قبول کیا۔» «مسند احمد: ۱۶۷۰۱»
جلال امام دارقطنی ابوالغادیہ کو صحابی تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ابوالغادیہ بن یسار بن سبیح، انہیں شرف صحابیت نصیب ہوا، انہی نے صفین میں حضرت عمارؓ کو قتل کیا۔ «سؤالات السلی لددارقطنی: ۴۳۱۔ المؤلف والمختلص: ج ۴ ص ۱۷۹۳»

جلال ابن عبد البر نے الاستیعاب میں یہی لکھا ہے کہ وہ صحابی تھے، قبل عمار انہی کے ہاتھوں ہوا۔ «ج ۴ ص ۲۵۷، تحت ابوالغادیہ» جیسا کہ ابن ماکولانے الارتياب میں جیسا کہ ابن اثیر نے اسد الغابہ میں جیسا کہ حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلا میں جیسا کہ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں نقل کیا ہے۔ صحابہ کے مقام و مرتبے اور تمام فضائل و مناقب حرف بحرف ایمان کا حصہ ہیں مگر ان کے دفاع کے لیے حقائق کا انکار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ہوتی تو جمہور سب سے پہلے ان کی تردید کرتے۔ ان واقعات کے ہوتے ہوئے بھی صحابہ افضل الامۃ، ہادی، راشد، اور نجوم ہدایت ہیں۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین

Asif Maqbool

ابوالغادیہ صحابی ہیں اور حضرت عمارؓ کے قاتل اور حضرت عمارؓ کے قاتل کے بارے میں جہنم کی بشارت ہے... تطبیق کیسے دی جائے گی یا ابوالغادیہ کو جہنمی کہا جائے گا؟؟؟؟

Ismail Rehan

قاتل عمار کے جہنمی ہونے کی روایت سند کمزور اور متنازع مضطرب ہے لہذا صحابہ کے جنتی اور مغفور ہونے کی روایات قطعیہ کے سامنے وہ قابل استدلال نہیں

{بحوالہ فیس بک مولانا اسماعیل ریحان آئی ڈی Ismail Rehan}

قارئین کرام! مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ فاضل کالم نگار مولانا اسماعیل ریحان صاحب نے روزنامہ اسلام اور سوشل میڈیا جیسے غیر علمی فورم پر بالکل ہی غیر ضروری طور پر مشاجرات صحابہ جیسے مازک اور انتہائی حساس مسئلہ میں ’اکابر‘ کی عبارات کی آڑ میں جس حکمران کے ساتھ حضرت معاویہؓ اور ان کے گروہ میں شامل صحابہ کرامؓ کو باغی و قاتل ”ثابت“ کیا ہے وہ ہر منصف مزاج مسلمان کے نزدیک ”تنقیص صحابہ“ کے زمرے میں ہی شامل ہوگا۔

مولانا اسماعیل ریحان صاحب نے اپنی عرض داشت میں حضرت معاویہؓ کی ”تاویل“ نقل کی ہے جس سے ان کا مقصد قارئین کو یہ باور کرانا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے قتل عمارؓ کا اعتراف کر لیا ہے اور اس طرح وہ ”الفئة الباغية“ میں شامل ہو گئے ہیں۔

امام طبری۔۔۔ کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

موصوف نے بحوالہ ذہبی، امام حاکم کی روایت کو ”علی شرط البخاری“ قرار دے کر اس روایت کا دوجہ بھی متعین کر دیا ہے۔ امام حاکم کی روایت سے حضرت معاویہؓ کے خلاف استدلال وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں ان ہی کی طرح کا ”بغض معاویہ“ کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔ علامہ ابن طاہر مقدسی، امام حاکم کے بارے میں فرماتے ہیں:

”رافضی خبیث... کان منحرفاً عن معاویة وآله متظاهراً بذلك ولا يعتذر منه“ (تذکرۃ الحفاظ للذہبی تحت ابو عبد اللہ الحاکم) تفصیل کے لئے راقم الحروف کی کتب ”حدیث کلاب حوالب کا تاریخی، تحقیقی، اور علمی محاکمہ، سیدنا معاویہؓ پر اعتراضات کا علمی تجزیہ اور سیدنا معاویہؓ کے نقادین“ کی طرف مراجعت کی جائے۔

جس روایت کو ”ریحان“ صاحب ”علی شرط البخاری“ قرار دے کر قارئین سے تسلیم کرانا چاہتے ہیں اس کا مکمل متن مذکور قارئین کیا جاتا ہے تا کہ وہ خود ہی کوئی رائے قائم کر لیں۔

”أخبرنا أبو عبد الله محمد بن علي الصنعاني، ثنا اسحاق بن ابراهيم بن عباد، اتبنا عبد الرزاق، اتبنا معمر، عن عبد الله بن طاوس، عن أبي بكر بن محمد بن عمر بن حزم، عن أبيه، قال: لما قتل عمار بن ياسر رضي الله عنه، دخل عمرو بن حزم على عمرو بن العاص، فقال: قتل عمار، وقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: تقتله الفئة الباغية فقام عمرو بن العاص فزعا حتى دخل على معاوية، فقال له معاوية: ما شأنك؟ قال: قتل عمار، فقال معاوية: قتل عمار فماذا؟ فقال عمرو: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: تقتله الفئة الباغية فقال له معاوية: دحضت في بولك، أوتحن قتلناه، إنما قتله علي وأصحابه، جاءوا به حتى ألقوه بين رماحنا۔ أوقال: بين سيوفنا۔ هذا حديث صحيح على شرط الشيخين، ولم يخرجاه بهذا الساق۔ (متدرک حاکم: ۲۶۶۳)

حضرت محمد بن عمر بن حزم فرماتے ہیں: جب عمارؓ بن یاسر کو شہید کر دیا گیا تو حضرت عمرو بن حزم حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس آ کر کہنے لگے: عمار کو قتل کر دیا گیا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا: ”مجھے باغی گروہ قتل کرے گا“ تو عمرو بن العاصؓ گھبرا کر اٹھے اور فوراً حضرت معاویہؓ کے پاس گئے اور ان کو بتایا کہ عمار کو شہید کر دیا گیا ہے۔

امام طبری۔۔۔ کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

معاویہ یوں لے: عمار کو قتل کر دیا گیا ہے تو کیا ہوا؟ عمرو یوں لے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ”اس کو باغی گروہ قتل کرے گا“ تو معاویہؓ نے ان سے کہا: تو خود اپنے ہی پیشاب میں پھسلا ہے ہم نے اس کو تھوڑا ہی قتل کیا ہے۔ اس کے قتل کے ذمہ دار ”علی“ اور اس کے ساتھی ہیں جو ان کو لا کر ہمارے نیزوں میں ڈال گئے یا (شاید یہ فرمایا) ہماری تلواروں میں ڈال گئے۔ یہ حدیث امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے معیار کے مطابق صحیح ہے لیکن شیخین نے اسے ان الفاظ کے ہمراہ نقل نہیں کیا۔

اس روایت کے راویوں میں امام حاکم کے علاوہ ایک دوسرے ”بزرگ“ عبد الرزاق بھی ہیں۔ یہ بھی ”بغض معاویہ“ کے مرض میں بری طرح مبتلا ہیں۔ ان کے حالات جاننے کے لئے راقم الحروف کی کتاب ”سیدنا معاویہؓ کے نقادین“ کی طرف مراجعت کریں۔ مولانا اسماعیل ریحان نے ”پختہ دلائل“ سے فاتح مصر حضرت عمرو بن عاصؓ اور ابوالغادیہ کو ”قاتل عمار“ قرار دیا ہے۔ مؤخر الذکر کو موصوف نے نہ صرف قاتل بلکہ صحابی رسول بھی ثابت کیا ہے۔

اس پر ایک بھائی نے فیس بک پر اپنے اس اشکال کا اظہار کیا کہ: ”ابوالغادیہ صحابی ہیں اور حضرت عمارؓ کے قاتل (بھی) اور حضرت عمارؓ کے قاتل کے بارے میں جہنم کی بشارت ہے... تطبیق کیسے دی جائے گی یا ابوالغادیہ کو جہنمی کہا جائے گا؟

مولانا اسماعیل ریحان صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں: ”قاتل عمارؓ کے جہنمی ہونے کی روایت سنداً کمزور اور متناً مضطرب ہے لہذا صحابہ کے جنتی اور مغفور ہونے کی روایات قطعہ کے سامنے وہ قابل استدلال نہیں۔“

نخت حیرت ہے کہ موصوف ایک طرف حضرت معاویہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت ابوالغادیہ کو ”قاتل“ اور اسی بناء پر ان کے پورے گروہ پر ”الفئة الباغية“ کا اطلاق کرتے ہوئے ان روایات اور راویوں کے بارے میں یہ اعلان کر رہے ہیں کہ:

”معجم الكبير لطبراني... رجاله كالم ثقاة، مجمع الزوائد... قال الهيثمي و رجاله رجال الصحيح، مستدرک حاکم، رجاله ثقاة...“ لیکن دوسری طرف ان ہی راویوں سے مروی روایات کو ”سنداً و متناً“ کمزور و مضطرب قرار دے کر قابل استدلال ٹھہرا رہے ہیں۔ کاش! وہ اسی ”جذبے“ سے کام لیتے

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

ہوئے ”اعترا ف قتل“ کی روایات کو بھی سنداً و متناً مضطرب قرار دے کر ان سے استدلال نہ کرتے مگر اس کے برعکس ”اشکال“ پیش کرنے والوں کو یوں تسلی دیتے ہیں کہ:

”صحابہ کا مقام و مرتبہ اور تمام فضائل و مناقب حرف بہ حرف ایمان کا حصہ ہے مگر ان کے دفاع کے لئے حقائق کا انکار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ہوتی تو جمہور سب سے پہلے ان کی تردید کرتے“

اب وہ روایات ملاحظہ فرمائیں جن میں قاتل عمارؓ کو ”وعدید“ سنائی گئی ہے:

الف: حضرت انسؓ کی روایت سے قاتل عمارؓ کے لئے یہ الفاظ آئے ہیں:

”ابن سمیۃ تقتله الفئۃ الباغیۃ قاتله و سالبه فی النار“

(کنز العمال جلد ۱۱ ص ۲۵، سیر اعلام النبلاء جلد ۱ ص ۴۲۵)

ابن سمیہ (حضرت عمارؓ) کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔ ان کو قتل کرنے والا اور

ان کا مال اسباب لوٹنے والا جہنم میں جائے گا۔

ب: حضرت ام سلمہؓ اور حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ:

”تقتلک الفئۃ الباغیۃ، قاتلک فی النار“

(کنز العمال جلد ۱۱ ص ۲۵)

تجھے ایک باغی گروہ قتل کرے گا اور تیرا قاتل (یعنی باغی گروہ) جہنم میں ہے۔

ج: حضرت عمرو بن العاصؓ نے حدیث کے الفاظ یوں نقل کئے ہیں:

”قاتل عمار و سالبه فی النار“ (کنز العمال جلد ۱۱ ص ۲۱، ۲۲)

عمارؓ کا قاتل اور اس کا مال لوٹنے والا جہنم میں ہے۔

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

”یدخل سالبک و قاتلک فی النار“ (کنز العمال جلد ۱۱ ص ۲۷)

تیرا مال، اسباب لوٹنے والا اور تجھے قتل کرنے والا جہنم میں داخل ہوگا۔

د: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے حدیث کے الفاظ یوں بیان کئے ہیں:

”مآلہم ولعمار؟ عمار یدعوہم إلی الجنة و یدعوہ الی النار، قاتله و

سالبه فی النار“۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۷ ص ۲۶۹)

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

ان (یعنی مخالفین عمارؓ) کا اور عمارؓ کا عجیب حال ہے۔ عمارؓ تو انہیں جنت کی طرف دعوت دے رہے ہوں گے جبکہ وہ گروہ ان کو جہنم کی طرف بلا رہا ہوگا۔ ان کا قاتل اور ان کا مال لوٹنے والا جہنم میں ہے۔

مولانا اسماعیل ریحان صاحب حضرت معاویہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ اور ابوالغادیہؓ کو صحابی تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں باغی اور قاتل عمارؓ بھی قرار دیتے ہیں جبکہ دوسری طرف مذکورۃ الصدر روایات کو سنداً و متناً کمزور اور مضطرب بھی سمجھتے ہیں حالانکہ جس درجے کی روایات اور جن راویوں کی وثاقت کے زور پر انہوں نے حضرت معاویہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت ابوالغادیہؓ کو قاتل عمارؓ قرار دیا ہے ان ہی راویوں (حضرت انسؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اور حضرت ام سلمہؓ) کی مرویات کو سنداً و متناً کمزور اور ناقابل استدلال قرار دے رہے ہیں۔

اگر بالفرض ان روایات کو ناقابل استدلال قرار دے بھی دیا جائے تو پھر بھی اشکال باقی رہتا ہے کیونکہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بھی موجود ہے جس کی بناء پر حضرت معاویہؓ کے گروہ کو باغی اور قاتل قرار دیا گیا ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ملاحظہ فرمائیں:

”تقتله الفئۃ الباغیۃ یدعوہم إلی الجنة و یدعوہ الی النار...“

اور ایک دوسری روایت میں ”یدعوہم إلی الجنة“ کے بجائے ”یدعوہم إلی

اللہ“ کے الفاظ آئے ہیں۔ (صحیح بخاری کتاب الصلوۃ باب التعاون فی بناء

المسجد۔ کتاب الجہاد والسمیر۔ باب مسح الغبار عن الرأس فی سبیل اللہ)

اس حدیث میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ

حضرت عمارؓ کو باغی گروہ قتل کرے گا۔ حضرت عمارؓ اور ان کے قاتل گروہ کی دعوت ایک

نہ ہوگی بلکہ ایک دوسرے سے مختلف اور آپس میں متضاد ہوگی۔

حضرت عمارؓ اس گروہ کو جنت اور اللہ کی طرف بلا رہے ہوں گے جبکہ باغی اور قاتل

گروہ ان کو جہنم کی طرف بلا رہا ہوگا۔

کیا حضرت معاویہؓ اور ان کے اصحاب حضرت عمارؓ کو جہنم کی طرف دعوت دے رہے تھے؟

اگر انہیں باغی اور قاتل عمارؓ قرار دیا جائے تو کیا مذکورہ احادیث و روایات کی بناء پر ان کا

مولانا اسماعیل ریحان صاحب نے حضرت معاویہؓ کو حدیث عمارؓ کی رو سے ”باغی ثابت“ کرنے کے لئے دلائل کے جو ”انبار“ لگائے ہیں ان کا مفصل و مدلل جائزہ تو مستقل کتاب کا متقاضی ہے۔ یہاں مقصود قارئین کو ایک جلیل القدر صحابی کے خلاف ان کے جارحانہ ”اسلوب“ سے صرف آگاہ کرنا ہے۔ اس ”اسلوب“ میں حضرت معاویہؓ کی واضح طور پر توہین و تنقیص پائی جاتی ہے کیونکہ موصوف نے ”اکابر“ کی عبارات کی آڑ میں حضرت معاویہؓ کو ”باغی“ ثابت کرنے کی کثرت اور بتدرار جو کوشش کی ہے اس سے ”سراسر“ بے ادبی ظاہر ہوتی ہے جبکہ ”اکابر“ نے حضرت معاویہؓ کی طرف جس ”تخطیہ“ کی نسبت کی ہے، وہ تخطیہ برائے تخطیہ نہیں بلکہ تخطیہ برائے ”تعمیر“ تھا اور اس تخطیہ میں اپنی ذات کا اعتبار سے بے ادبی اور تنقیص کی شان نہیں پائی جاتی۔

جبکہ مولانا اسماعیل ریحان صاحب کا مقصد ”تخطیہ برائے تخطیہ“ ثابت کرنا ہے۔ جو اپنی ذات، اپنے مقصد اور انداز بیان کے اعتبار سے حضرت معاویہؓ کی توہین و تنقیص ہے۔ موصوف حضرت معاویہؓ کو باغی ”ثابت“ کرنے کے بعد اس بحث کے آخر میں یہ عذر رنگ پیش کرتے ہیں کہ: ”ایک طبقہ جمہور کی رائے چھوڑ کر ایسا نیا موقف مشہر کر رہا ہے جو بظاہر صحابہ کا دفاع لگتا ہے مگر اس کا انجام حضرت علیؓ پر اعتراضات، ان کی خلافت راشدہ کی حیثیت کا انکار اور آخر میں ذخیرہ حدیث سے سخت بد اعتمادی کی شکل میں نکلتا ہے اس لئے اس موضوع پر بات کرنا پڑی۔ باقی جن حضرات کو اس طبقہ سے واسطہ نہیں پڑا وہ اس موضوع پر بحث کو تفسیح اوقات سمجھنے میں معذور ہیں۔“ موصوف کا حضرت علیؓ کے بارے میں یہ نتیجہ اخذ کر کے حضرت معاویہؓ کے خلاف جارحیت کا مظاہرہ کرنا بجائے خود ایک جلیل القدر صحابی کی توہین و تنقیص ہے جبکہ ان کا غیر مناسب طرز استدلال ہتھکڑا انداز بیان اور تمقیر صانہ لب و لہجہ اس پر مستزاد ہے۔

موصوف نے اس پوری بحث میں جس انداز سے حضرت معاویہؓ کو باغی ”ثابت“ کیا ہے اسے ظاہری شکل و صورت کا اعتبار سے حضرت معاویہؓ کی بے ادبی اور تنقیص کی شان کے سوا اور کوئی نام دیا ہی نہیں جاسکتا۔

موصوف ”شرح عقائد“ کے حوالے سے حضرت معاویہؓ کی بغاوت ”ثابت“ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”غایۃ امر ہم البغی“ (ص ۳۷۳) اس کا مطلب کیا ہے؟ اگر سمجھ نہ آئے تو

علماء سے پوچھ لیں۔ آٹھ صدیوں سے اہل سنت کے دینی مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ کاش موصوف خود علماء سے پوچھ کر مذکورہ جواب دیتے تو غلط فہمی کا شکار تو نہ ہوتے۔ ظاہر ہے کہ یہاں ”شرح عقائد نمشی“ سے موصوف کی مراد علامہ تفتازانی کی ”شرح عقائد“ ہے۔ علامہ تفتازانی کی وفات ۷۹۲ھ میں ہوئی ہے۔ ان کی کتاب دینی مدارس کے نصاب میں تو بہت بعد میں شامل کی گئی ہے اگر بالفرض ان کی وفات کے سال ہی شامل ہوئی ہو تو پھر بھی ۱۴۳۷ھ میں ”آٹھ صدیاں“ تو کیا ساڑھے چھ صدیاں بھی پوری نہیں ہوتیں۔

موصوف نے یہاں علامہ تفتازانی کی وہ عبارت (”غایۃ امر ہم البغی“) نقل کی جس سے حضرت معاویہؓ کی ”بغاوت“ ثابت ہوتی تھی لیکن اس بحث میں ایک جگہ انہیں نے پوری عبارت نقل کی ہے کہ: ”وبالجملة لم ينقل عن السلف المجتهدين والعلماء الصالحين جواز اللعن على معاوية و احزابه لأن غاية امرهم البغی والخروج على الامام وهولا يوجب اللعن“ (شرح العقائد ص ۱۱۶ طبع دہلی)

بہر حال سلف مجتہدین اور علماء صالحین سے معاویہؓ اور ان کے گروہ پر لعن کرنے کا جواز منقول نہیں ہے اس لئے کہ ان پر زیادہ سے زیادہ الزام امام کے خلاف خروج اور بغاوت کا ہے اور یہ چیز لعن کو واجب نہیں کرتی۔

علامہ تفتازانی نے اگرچہ یہاں حضرت معاویہؓ اور ان کے گروہ کو لعنت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے لیکن اس اسلوب سے بھی امانت معاویہؓ کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ علامہ عبدالعزیز فرہارویؒ نے بھی علامہ تفتازانی کے اس تبصرہ کو ”تقصیر“ پر مبنی قرار دیتے ہوئے صاف طور پر لکھا ہے کہ:

”لایخفی أن الشارح قصر ما فی حق هذا الصحابی حیث اکتفی بعدم جواز اللعن، وأقول قلصرح علماء الحديث بأن معاوية رضی اللہ عنہ من کبار الصحابة ونجبائهم ومجتہدہم ولوسلم آتہ من صغارهم فلا شک فی أنه داخل فی عموم الأحادیث الصحیحة الواردة فی تشریف الصحابة رضی اللہ عنہم بل قدورد فیہ بخصوصه أحادیث...“ (النبراس شرح لشرح العقائد ص ۵۵۰)

”اور یہ بات مخفی نہیں کہ شارح (علامہ تفتازانی) نے اس صحابی (یعنی حضرت معاویہؓ) کے حق میں تفصیر کی ہے، بایں طور کہ اس نے عدم جواز لعنت پر اکتفاء کیا ہے اور میں کہتا ہوں کہ

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

علمائے حدیث نے صراحت کی ہے کہ حضرت معاویہؓ کا یہ صحابہ نیز اشراف اور مجتہدین صحابہ میں سے ہیں۔ اور اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ وہ اصغر صحابہ میں سے تھے تب بھی اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ ان صحیح احادیث کے عموم میں داخل ہیں جو صحابہؓ کے شرف و فضیلت میں وارد ہوئی ہیں بلکہ خاص حضرت معاویہؓ کے حق میں بھی احادیث وارد ہوئی ہیں۔۔۔“

مولانا اسماعیل ریحان صاحب کا یہ فرمانا بھی محل نظر ہے کہ ”دوسرے اس روایت کے جو راوی لشکر شام میں شامل تھے (جیسا کہ) خود حضرت معاویہؓ اس کے راوی ہیں“

جبکہ حضرت معاویہؓ حدیث عمارؓ کے راویوں میں شامل نہیں ہیں یہ حدیث جن صحابہ کرام سے مروی ہے ان میں سے چار حضرات عثمانؓ، حذیفہؓ ابن مسعودؓ اور ابو رافعؓ تو جنگ صفین سے پہلے وفات پا چکے تھے، چار حضرات ابو ایوب انصاریؓ، ابو ہریرہؓ، ابو سعید خدریؓ اور ام سلمہؓ غیر جانب دار رہے۔ اب حضرت عمارؓ کے علاوہ باقی پانچ حضرات میں سے تین ابو قتادہؓ، خزیمہ بن ثابتؓ اور ابوالیسرؓ جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے اور دو عمر بن عاصؓ اور عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھے۔

اب قابل غور بات یہ ہے کہ جن تین حضرات نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا تھا تو کسی صحیح با سند روایت سے یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے محض اس حدیث کی بناء پر حق و باطل کا اندازہ لگا کر ان کا ساتھ دیا ہو اور نہ ان سے یہ ثابت ہے کہ حضرت عمارؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے حدیث کو مدار استدلال بنا کر دوسرے فریق کو باغی کہا ہو حالانکہ ان تین حضرات میں سے حضرت خزیمہؓ کے علاوہ دو ۵۵ھ اور ۵۴ھ تک زندہ رہے۔ اگر بقول مودودی صاحب قتل عمارؓ ”حق و باطل“ کے لئے نص صریح تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان غیر جانب دار صحابہ نے حق کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ اور غیر جانب داری رہ کر باطل کو کیوں تقویت پہنچاتے رہے؟ اور نہ ہی ان دو حضرات عمرؓ و بن عاصؓ اور عبداللہ بن عمروؓ نے باطل (حضرت معاویہؓ) سے علیحدگی اختیار کر کے حق کا ساتھ دیا۔ پھر سب سے زیادہ خود حضرت علیؓ کا اپنا طرز عمل با عث الجھن ہے جب ”نص صریح“ کے ذریعے سے ”حق و باطل“ واضح ہو گیا تھا تو:

اولاً:- انہوں نے جنگ بندی کیوں قبول کی؟ اور قرآن کا بھی یہ حکم ہے کہ باغی گروہ جب تک اپنی بغاوت سے باز نہ آجائے اس وقت تک اس سے قتال جاری رکھا جائے۔

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

ثانیاً:- جب شہادت عمارؓ نے حق و باطل واضح کر دیا تھا تو پھر حضرت علیؓ نے حکیم (ثالثی) کیوں قبول کی؟

ثالثاً:- جب حضرت معاویہؓ کا باغی ہونا ثابت ہو گیا تھا تو پھر حضرت علیؓ نے ان کے ساتھ مصالحت کر کے ان کے زیر قبضہ علاقوں پر ان کی امانت کو کیوں تسلیم کیا تھا؟

سخت حیرت ہے کہ ”روزنامہ اسلام“ کے فاضل کالم نگار مولانا اسماعیل ریحان صاحب نے حضرت علیؓ کے حضرت معاویہؓ کے خلاف اقدام کی وجہ یہ بتائی کہ

”خلافت اسلامیہ اور عالم اسلام کا دو ٹکڑوں میں بٹ جانا، امت کے لئے قاتلین عثمانؓ کے آزار پھرنے سے زیادہ بڑی آزمائش بن رہا تھا“ (روزنامہ اسلام ۲۱ جولائی ۲۰۱۵ء)

سوال یہ ہے کہ اس تمام تر خون خرابے کا نتیجہ کیا نکلا؟ جب صرف صوبہ شام مرکز سے علیحدہ ہوا تو تلوار اٹھالی گئی پھر بعد میں صوبہ شام کے علاوہ مصر اور عراق و حجاز کے بعض علاقے بھی ان کی اطاعت سے نکل گئے تو حضرت علیؓ نے حضرت عمارؓ کے قاتلوں اور باغیوں کے ساتھ صلح کر کے ان کو امارت پر بحال کر دیا۔

رابعاً:- جب حضرت معاویہؓ کا باغی اور باطل پر ہونا نص صریح سے ثابت ہو گیا تھا تو ان سے قتال کرنے کے بجائے حضرت حسنؓ ان کے حق میں دستبردار کیوں ہوئے؟

خامساً:- اگر نص صریح سے حضرت معاویہؓ کا باغی ہونا واضح ہو گیا تھا تو تمام مسلمانوں کو ان سے علیحدگی اختیار کر لینا چاہئے تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ سب نے حضرت حسنؓ کے اس فیصلے کی تائید و تصدیق کی اور اس سال کا نام ہی ”عام الجمانہ“ پڑ گیا۔ یعنی قبل ازیں حکومت میں جو انتشار اور خلفشار پیدا ہو گیا تھا وہ حضرت معاویہؓ کے خلیفہ بنتے ہی نظم و ضبط اور اتحاد و اتفاق میں تبدیل ہو گیا۔ کیا باغی اور باطل ایسے ہی سلوک کا مستحق ہوا کرتا ہے؟

سادساً:- رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے بھی حضرت حسنؓ کے اس فیصلے کی تحسین و تصویب ثابت ہوتی ہے:

”ان ابنی هذا لعل الله ان يصلح به بین فئتين عظیمین من المسلمین“ (صحیح بخاری کتاب الصلح)

میرا یہ بیٹا سر دار ہے شاید اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں میں صلح

کراوے اس حدیث میں آپ حضرت معاویہؓ کے گروہ کو مسلمانوں کا ایک عظیم گروہ قرار دے رہے ہیں۔
حضرت عمارؓ ۳۷ھ میں شہید ہوئے حدیث میں ان کے قاتل کو ”فئة باغیہ“ کہا گیا ہے اور صلح حسن ۴۱ھ میں ہوئی۔ ”فئتين عظیمتين من المسلمين“ سے بالاتفاق حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کے گروہ مراد ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے گروہ پر ”فئة باغیہ“ کا اطلاق نص صریح ”فئة عظیمہ“ کے خلاف ہے۔
سابقاً: صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں یہ روایت آئی ہے کہ:

”لا تقوم الساعة حتى تقتل فئتان دعواهما واحدة“

(صحیح بخاری، کتاب استتابة المرتدين والمعاندين وقتالهم، باب قول

النبي لا تقوم الساعة حتى تقتل فئتان دعواهما واحدة)

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں قتال نہ کریں۔ ان دونوں جماعتوں کی دعوت ایک ہوگی۔

شاریح کے نزدیک دو عظیم جماعتوں سے مراد حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی جماعتیں ہیں اور آپ نے ان دونوں کی دعوت کو ایک قرار دیا ہے۔ (نووی شرح مسلم ص ۳۹۰ ج ۱)

اس حدیث سے بھی واضح ہوا کہ دونوں جماعتیں حق پر تھیں۔

تادمنا: صحیح مسلم میں ابوسعید خدریؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ:

”تمرق مارقة عند فرقة من المسلمين يقتلها اولى الطائفتين بالحق“

(صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب اعطاء المولقة ومن يخاف عليٰ ايمانه ص ۳۴۲ ج ۱)

مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے وقت ایک گروہ امت سے نکل جائے گا اور اس کو وہ گروہ قتل کرے گا جو مسلمانوں کے دونوں گروہوں میں حق سے زیادہ قریب ہوگا۔

اس حدیث میں امت سے نکل جانے والے فرقے سے مراد بالاتفاق خوارج ہیں۔ آپ کے اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا اختلاف حق اور باطل کا نہیں تھا بلکہ حضرت معاویہؓ بھی برحق تھے۔

محقق اہل سنت سابق شیخ الحدیث دارالعلوم فاروقیہ راولپنڈی مولانا ابوریحان عبدالغفور سیالکوٹی صاحب حدیث عمارؓ پر اصول روایت و درایت کی روشنی میں طویل بحث

کے آخر میں فرماتے ہیں:

”قاتل عمارؓ یہ سات نشانیاں ہیں جو کسی اور نے نہیں بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہیں اور ارشاد بھی اس حدیث میں فرمائی ہیں جس کے حوالے سے حضرت معاویہؓ کو قاتل عمار اور پھر باغی بنایا جاتا ہے۔ ان نشانیوں کی روشنی میں حضرت عمارؓ کا قاتل وہ گروہ بنتا ہے جو:

(۱) غیر صحابی ہو (۲) باغی ہو (۳) داعی الی النار ہو

(۴) فی النار ہو (۵) بد بخت ہو (۶) شریہ ہو (۷) مانہ ہمار ہو

اور یہ سب نشانیاں بعینہ سبائی مفسدوں میں پائی جاتی ہیں، حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں میں ان میں سے کوئی ایک نشانی بھی نہیں پائی جاتی۔ لہذا حدیث قاتل عمارؓ کے حوالے سے ہی اگر کوئی قاتل عمارؓ ”الفئة الباغیہ“ کا مصداق بنتا ہے تو وہ سبائیوں مفسدوں کا گروہ ہی بنتا ہے حضرت معاویہؓ نہ قاتل عمارؓ بنتے ہیں اور نہ ”الفئة الباغیہ“ کا مصداق ہی۔ کیونکہ ان کو یہ کچھ بنانے کے لئے اسی حدیث کی رو سے ہی ضروری ہے کہ پہلے:

(۱) ان کی صحابیت کا انکار کیا جائے۔ (۲) ان کا باغی ہونا ثابت کیا جائے۔

(۳) ان کو زبیا دہ نہیں تو کم از کم ان کے صفی موقوف کی حد تک ضروری داعی الی النار کہا جائے۔

(۴) ان کو فی النار مانا جائے۔ (۵) ان کو یکے از اشتیاء و اشرار۔

(۶) اور یکے از فجار قرار دیا جائے۔ اور اس کی جرأت کوئی سبائی تہرائی تو کر سکتا ہے کسی صحیح العقیدہ سنی سے اس کی توقع ہرگز نہیں رکھی جاسکتی۔ کیونکہ اہل سنت کے عقیدے کے مطابق حضرت معاویہؓ:

(۱) صحابی ہیں نہ کہ غیر صحابی۔ (۲) عادل ہیں نہ کہ باغی (ورنہ ان کو باغی کہنے والے ہی پھر ان کی بغاوت کی تاویل میں کرنے پر مجبور نہ ہوتے)

(۳) داعی الی الجہد ہیں نہ کہ داعی الی النار۔ (۴) فی الجہد ہیں نہ کہ فی النار۔

(۵) یکے از سعداء ہیں نہ کہ یکے از اشتیاء (۶) یکے از شرفاء ہیں نہ کہ یکے از اشرار

(۷) یکے از امراء ہیں نہ کہ یکے از فجار

لہذا حدیث قاتل عمارؓ کی رو سے ہی وہ قاتل عمارؓ نہ ہوئے اور باغی ان کو اسی بناء پر بتایا جا رہا تھا۔ جب وہ بنیاد ہی بے بنیاد ثابت ہوئی اور ثابت بھی اسی حدیث سے ہوئی تو ان کا باغی طافی ہونا خود بخود بے بنیاد ہو گیا۔

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

الغرض جس حدیث کے حوالے سے حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کو قاتل عمار بنا کر ”الفئة الباغية“ کا مصداق بنایا جا رہا ہے اسی حدیث سے علیؓ کو قاتل عمار کا ثابت ہو گیا کہ وہ حضرات نہ حضرت عمارؓ کے قاتل تھے اور نہ ”الفئة الباغية“ کے ہی مصداق۔ بلکہ حضرت عثمانؓ کے قاتل اور باغی سبائی مفسد ہی حضرت عمارؓ کے قاتل بھی تھے اور ”الفئة الباغية“ کا مصداق بھی۔ (ماہنامہ نعت نبوت ملتان، نومبر ۱۹۹۴ء)

مولانا اسماعیل ریحان صاحب نے بحوالہ مسند احمد اور مستدرک حاکم حضرت معاویہؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ”حضرت عمارؓ کا قاتل وہ گروہ ہے جو انہیں میدان میں لے کر آئے تھے“ حضرت معاویہؓ کی طرف منسوب اس تاویل پر ناقدین کی طرف سے یہ طعن کیا جاتا ہے کہ ”پھر اس طرح تو شہدائے بدر واحد کے قاتل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرے جو انہیں ساتھ لائے تھے۔“ حضرت معاویہؓ کا یہ قول اگر سبائیوں کا وضع کردہ نہیں ہے تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ فعل کی نسبت کبھی سبب فعل کی طرف کی جاتی ہے۔ جیسے ”لَمْ يَكُنْ لَهُ قُوَّةٌ يُلَاقِيهِمْ مِنَ الْإِنْسَانِ“ (امراہیم: ۳۶) ظاہر ہے کہ بے جان پتھر کسی کو کیا گمراہ کر سکتے ہیں مگر چونکہ یہ بت انسانوں کی گمراہی کا سبب بنے اس لئے گمراہی کی نسبت ان کی طرف کر دی گئی، حضرت معاویہؓ کے اس قول سے ان کی بصیرت کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ مختصر ترین تہرہ میں اصل قاتلوں کی نشاندہی کر دی کہ نہ حضرت عثمانؓ کو قتل کیا جاتا، نہ جمل و صہین میں مصالحت کی فضا پیدا ہونے کے بعد جنگ چھڑتی اور نہ بے وجہ مسلمانوں کا کشت و خون ہوتا۔ لہذا ان تمام واقعات، تنازعات، اختلافات اور سانحات کا سبب ”الفئة الباغية“ یعنی قاتلین عثمان ہیں۔

شہدائے بدر واحد کے قتل کے ذمہ دار بھی وہ کفار تھے جو ان جنگوں کا سبب بنے نہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو صلح جو، امن اور عدل کے قیام کے لئے تشریف لائے تھے۔ لہذا حضرت معاویہؓ کی یہ تاویل (بشرط صحت روایت) درست ہے کہ حضرت عمارؓ کے قتل کا سبب یہی گروہ تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاویل بعد میں سبائیوں نے اپنی سیاسی اغراض کے تحت حضرت معاویہؓ کو باغی ثابت کرنے کے لئے ان کی طرف منسوب کی۔

مستدرک حاکم اور امام حاکم کی وثاقت معلوم کرنے کے لئے راقم الحروف کی کتاب ”حدیث کلاب حوالب کا تاریخی، تحقیقی اور علمی محاکمہ“ کی طرف مراجعت فرمائیں۔

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی قتل عمارؓ کے متعلق سید مودودی صاحب کی اس عبارت ”قتل عمار کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا“ پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ”مگر یہ بات صحابہؓ پر واضح نہیں ہوئی۔ اگر ان پر بھی واضح ہو گئی ہوتی تو پھر تحکیم کی ضرورت کیا تھی؟ اور تحکیم کے بعد بقول ناقد کے حضرت علیؓ کے نمائندے ابو موسیٰ اشعریؓ نے یہ کیوں کہا کہ ”میری رائے یہ ہے کہ ہم دونوں حضرات (علیؓ و معاویہؓ) کو الگ کر کے خلافت کے مسئلہ کو مسلمانوں کے باہمی مشورہ پر چھوڑ دیں، وہ جسے چاہیں منتخب کر لیں؟“ نص صریح کے بعد اس قسم کی تحکیم کے کچھ معنی نہیں تھے، نہ کسی کو اس میں رائے زنی کا حق تھا۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ قتل عمارؓ حضرت علیؓ کے حق پر ہونے اور حضرت معاویہؓ کے باغی ہونے پر صحابہؓ کے نزدیک نص صریح نہیں تھا۔ بات یہ ہے کہ جس طرح حضرت علیؓ کی فوج میں بلوائی قاتلان عثمانؓ حیلہ و تدبیر سے شامل ہو گئے تھے۔ ممکن ہے اسی طرح کچھ بلوائی فوج معاویہؓ میں بھی شامل ہو گئے ہوں۔ اور انہوں نے حضرت معاویہؓ کو بدنام کرنے کے لئے حضرت عمارؓ کو قتل کر دیا ہو، جس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ قتل عمارؓ کے بعد بھی بات جہاں کی تہاں رہی اور کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ یہاں تک کہ تحکیم پر فریقین راضی ہو گئے۔ حضرت علیؓ نے بھی اس وقت یہ نہیں کہا کہ قتل عمارؓ میرا حق پر ہونا واضح ہو چکا ہے۔ اب کسی تحکیم کی ضرورت نہیں رہی۔

دوسرے ”وفاء الوفاء“ میں اس حدیث کو بزار وغیرہ کے حوالے سے یوں بیان کیا گیا ہے۔

”یا عمار! لا یقتلک اصحابی، تقتلک الفئة الباغية“

اے عمار! تم کو میرے صحابی قتل نہ کریں گے، بلکہ باغی گروہ قتل کرے گا۔

اس حدیث میں جماعت باغیہ کو صحابہؓ کے مقابلے میں لایا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ جماعت باغیہ صحابہؓ کے علاوہ کوئی (اور) جماعت تھی۔ اور حضرت معاویہؓ کا صحابی ہونا قطعی ہے۔ پس ان کو قاتل عمارؓ کہنا ایسا ہی غلط ہے جیسا حضرت علیؓ کو قاتل عثمانؓ کہنا غلط ہے۔ اور بالاتفاق وہ بلوائی تھے جو حضرت عثمانؓ کے قاتل تھے۔ پس وہی گروہ قاتل عمارؓ تھا جو خفیہ طریقہ سے فوج معاویہؓ میں شامل ہو گیا تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حضرت امیر معاویہؓ نے قتل عمارؓ کی خبر سن کر صاف فرمایا تھا کہ ”میری فوج میں سے کسی نے بھی حضرت عمارؓ کو قتل نہیں کیا۔ میری فوج میری تابعدار ہے۔ اور میں نے اسے سخت تاکید کر رکھی

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

تھی کہ حضرت عمارؓ پر کوئی ضرب نہ آنے پائے۔ نہ ان پر کوئی جھٹھیا راٹھائے، ہاں فوج علیؓ ان کی تابعدار نہیں ہے۔ یہ ان ہی کا فعل معلوم ہوتا ہے۔ وہ قاتل عمارؓ ہیں۔“ (براق عثمانؓ ص ۶۱ تا ۶۳ تحت حضرت عمارؓ کی شہادت طبع اول ۱۹۶۶ء، مجلس خدام صحابہ پاکستان ملتان)

بہر حال حضرت معاویہؓ باغی نہ تھے۔ وہ طالب قصاص دم (خون) عثمانؓ تھے۔

امام اہل سنت مولانا سید نور الحسن بخاریؒ حدیث عمارؓ کے متعلق فرماتے ہیں:

”حقیقت یہ ہے کہ سیدنا عمارؓ کی قاتل سبائی باغی پارٹی ہے۔ ملعون سبائی پارٹی اللہ العزیز الباغیہ!! بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ صرف حضرت عمارؓ کے نہیں، حضرت طلحہ و زبیر اور جمیع شہداء جمل و صہین رضی اللہ عنہم کے قاتل بھی یہی خارجی ملعون ہیں۔ حتیٰ کہ سیدنا حضرت علیؓ کے قاتل بھی یہی سبائی مردود ہیں کیونکہ فتنہ کا دروازہ انہی ملعونوں مردودوں نے کھولا تھا۔ مسلمانوں میں اختلاف و انشقاق انہوں نے پیدا کیا تھا۔ پھر جنگ کی آگ بھی انہی غنڈوں نے بھڑکائی تو درحقیقت یہ نہ صرف قاتلین عثمانؓ ہیں بلکہ آپ کے بعد اس دور فتنہ میں جو بھی شہید ہوا سب کے قاتل یہی ہیں، حضرت عمار ہوں یا حضرت طلحہ و زبیر حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہم سب کے قاتل یہی سبائی مردود ہیں۔ یہی باغی ٹولی ہے فتنہ باغیہ!

امام ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: (۱) الذین قاموا علی عثمان و اتکروا علیہ اشیاء اعتلوا عن فعلها ثم کانوا مع علی ثم خرجوا بعد ذلك علی علی (فتح الباری کتاب التوحید باب قال اللہ یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک)

(سبائیہ) حضرت عثمانؓ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور آپ کے سرنا کردہ گناہ تھوپ کر جھوٹا پروپیگنڈا کیا۔ (اور آخر آپ کو شہید کر کے رہے) اس کے بعد حضرت علیؓ کے ساتھ ہو گئے۔ پھر حضرت علیؓ کے خلاف بھی خروج کیا (اور مال کا رآپ کو بھی جام شہادت پلایا)

(۲) سیدنا حضرت علیؓ خود بھی اس حقیقت کا اظہار فرماتے ہیں، امام ابن کثیر نقل کرتے ہیں: ”آپ نے خطبہ شروع کیا، خوارج نے آپ کو خطبہ میں روک دیا۔ آپ منبر سے اتر آئے۔ اور فرمایا: میری اور عثمانؓ کی مثال سرخ، سفید اور سیاہ تین بیلوں کی سی ہے۔ جنہیں مختلف اوقات میں یکے بعد دیگرے ایک شیر نے پھاڑ کھایا۔ (البدایہ جلد ۷ ص ۱۹۴) سیدنا حضرت علیؓ نے یہ حقیقت بے نقاب فرمادی کہ حضرت عثمانؓ اور آپ کے مخالف

امام طبری --- کون؟

اسماعیل ریحان اور تنقیص سیدنا معاویہؓ

قاتل ایک ہی ہیں۔ اس چالاک و عیار سبائی پارٹی نے نہایت عیاری و مکاری سے باری باری ہر دو افراد کو ہدف ماک و کید بنا دیا۔

درحقیقت ابن سبہ کی خارجی ٹولی کسی کی بھی حامی نہ تھی، یہ ملعون لوگ نہ حضرت عثمانؓ کی ذات کے دشمن تھے نہ حضرت علیؓ کی ذات کے دوست، دراصل یہ اسلام کے دشمن تھے۔ اور اسلام سے یہودیت کا انتقام لینے کے لئے مسلمانوں میں خلاف و شقاق کا یہ سارا منصوبہ بنایا۔ پہلے امام مظلومؓ کو گھر میں شہید کیا۔ پھر جنگ جمل میں حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور دس ہزار مسلمانوں کا خون پیا۔ پھر صفین میں حضرت عمار اور ہزاروں مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔ اور گھر میں حضرت علیؓ کو شہید کر کے ان کے لبو سے اپنی پیاس بجھائی۔ رضی اللہ عنہم۔ تو یہ سارے کڑوت اسی سازشی ٹولی، اسی سبائی پارٹی، فتنہ باغیہ کے ہیں، نعم اللہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ انہی سبائی ملعونوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ: ”ہر فتنہ اور ہر بلا کی اصل و اساس یہی ہیں اور اسلام میں جو شمشیریں عریاں ہوئی ہیں، ان میں سے اکثر انہی کی طرف سے چلی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اصل اور مادہ کے اعتبار سے یہ منافق ہیں۔

”اختلفوا اکاذیب و ابتدعوا آراء فاسدة لفسلوا بها دین الاسلام و یسترلوا بها من لبسوا بولای الاحلام فسعوا فی قتل عثمان و هو لول الفتن ثم انزوا الی علی لاحبا قیہ ولا فی اهل البیت لکن لبقیموا سوق الفتن بین المسلمین ثم هؤلا الذین سعوا معہ منهم من کفر بعد ذلك و قالہ کما فعلت الخوارج و سیفہم اول سیف سل علی الجماعة و منهم من اظهر الطعن علی الخلفاء الثلاثة کما فعلت الرافضہ (منہاج السنہ جلد ۳ ص ۲۴۳) انہوں نے جھوٹی روایات گھڑیں اور فاسد خیالات ایجاد کئے تاکہ اس طرح دین اسلام کو فاسد کریں اور جن کی مت ماری گئی ہے انہیں راہ حق سے بھٹکائیں۔ انہوں نے قتل عثمان کی بھرپور کوشش کی اور یہ اولین فتنہ ہے۔ پھر یہ حضرت علیؓ کے پاس جمع ہو گئے۔ اس لئے نہیں کہ انہیں آپ سے یا اہل بیت سے محبت تھی۔ بلکہ محض اس لئے کہ مسلمانوں میں فتنہ برپا کریں۔ پھر انہوں نے آپ کے ساتھ ہو کر جنگیں لڑیں، بعد میں انہی میں سے بعض نے آپ کی تکفیر کی اور آپ کے ساتھ جنگ کی اور خوارج کہلائے۔ اور جماعت اسلام پر سب سے پہلے انہی کی تلوار بے نیام ہوئی۔ اور انہی میں سے بعض نے حضرات خلفاء ثلاثہؓ پر طعن کیا۔ اور روافض کہلائے۔

مشاجرات صحابہؓ کا شرعی حکم

گذشتہ بحث سے یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہو گئی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یقیناً زمرہ صحابہؓ میں شامل ہیں اور مقام صحابیت کی عظمت اور جلالت کے ثبوت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سچا گواہ اور کون ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس پورے طبقہ کو ”من حیث الطبقة“، مقدس، پاک باطن، صالح القلب، عدول، متقن، محفوظ، راضی و مرضی، خیر البریہ اور معیار حق و ہدایت قرار دیا ہے، انہیں سچا مومن کہا ہے، ان کی بشری خطائیں معاف کر دی ہیں، ان کی سابقہ باہمی عداوت کو محبت و مودت میں تبدیل کر دیا ہے، ایمان کو ان کے دلوں میں مزین کر دیا ہے، انہیں کفر، فسق اور عصیان سے نفرت دلا دی ہے اور ان کی اتباع کو لازمی قرار دیتے ہوئے ان سے غیظ رکھنے والوں کو کفار کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان پر غیظ کے ساتھ اپنی انگلیاں چبانے والوں کے خلاف خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعائے ضرر کرنے کا حکم دیا ہے:

”وَإِذَا لَقَوْكُمْ قُلُوبًا مِّنَ الْأَعْرَابِ لَقُوا غَضَبًا عَظِيمًا مِّنَ الْغَضَبِ قُلُوبًا مِّنَ الْأَعْرَابِ لَقُوا غَضَبًا عَظِيمًا“ (آل عمران ۱۱۹)

اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں اور جب وہ تنہا ہوتے ہیں تو چباتے ہیں تم پر انگلیاں غصہ سے (اے حبیب) آپ فرمائیے! مرجاؤ اپنے غصہ (کی آگ میں جل کر) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کی تعظیم و تکریم کا حکم دیا ہے، انہیں جنت کی بشارتوں سے نوازا ہے، انہیں نجوم ہدایت کہا ہے، انہیں اللہ کا انتخاب قرار دیا ہے، ان کے باہمی اختلافات و تنازعات کو چھیڑنے سے منع کیا ہے، انہیں برا بھلا کہنے سے سختی کے ساتھ روکا ہے، ان کے بارے میں یہ کلمہ اللہ کا خوف یاد دلایا ہے، ان سے محبت کو اپنے ساتھ محبت، ان کے ساتھ بغض کو اپنے ساتھ بغض، ان کی ایذا دہی کو اپنی ایذا دہی قرار دیا ہے، ان کی تنقیص کرنے والوں کے ساتھ

مناکحت، مجالست، مشاربت و ملاکت سے منع فرمایا ہے اور ایسے تہرائی ماحول میں اپنا علم ظاہر نہ کرنے والے علماء کو اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے۔

امام طحاوی (م ۳۲۱ھ) نے یہ اعلان فرمایا ہے کہ:

”ونحب أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، ولا نفرط في حب أحد منهم ولا نتبرء من أحد منهم ونبغض من يبغضهم وبغير الحق يذکرهم، ولا نذکرهم إلا بالخير، وحبهم دين وإيمان وإحسان وبغضهم كفر ونفاق وطغيان“
(عقیدہ الطحاوی ص ۶۶۔ مطبوعہ نصرت العلوم کوہرانوالہ)

اور ہم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب صحابہؓ سے محبت کرتے ہیں اور کسی ایک کی محبت میں غلو اور زیادتی نہیں کرتے اور نہ ان میں سے کسی سے بیزاری کرتے ہیں۔ اور جو ان سے بغض رکھتا ہے اور خیر کے سوا ان کا ذکر کرتا ہے، ہم اس سے بغض رکھتے ہیں۔ اور ہم صحابہ کرامؓ کا سوائے نیکی کے ذکر نہیں کرتے۔ حضرات صحابہؓ سے محبت دین، ایمان اور احسان (اعلیٰ درجے کی نیکی) ہے اور حضرات صحابہؓ کے کلام سے بغض کفر، نفاق اور سرکشی ہے۔

موصوف نے اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی تصریح فرمائی ہے کہ

”وَمَنْ أَحْسَنَ الْقَوْلِ فِي أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَزْوَاجِهِ وَذُرِّيَّتِهِ فَقَدْ بَرَّئَ مِنَ النِّفَاقِ“ (عقیدہ طحاوی ص ۸ طبع دیوبند)

جو شخص رسول اللہ کے اصحاب، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریات کے بارے میں اچھی رائے رکھے وہ نفاق سے بری ہے۔

امام ابوالحسن الاشعری (م ۳۲۴ھ) فرماتے ہیں کہ:

”ونتولّى سائر اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم ونكف عما شجر بينهم“ (الابانة من اصول الديانة ص ۵۱ اصل: ۵۱)

ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہؓ سے محبت کرتے ہیں اور ان کے درمیان باہمی اختلافات و تنازعات میں اپنی زبانوں کو روکتے ہیں۔

امام طبری --- کون؟

مشاجرات صحابہ کا شرعی حکم

امام نجم الدین نسفی (م ۵۷۳ھ) اور علامہ سعد الدین تفتازانی (م ۹۲۴ھ) فرماتے ہیں:
”وَيُكْفَى عَنْ ذِكْرِ الصَّحَابَةِ إِلَّا بِخَيْرٍ لِمَا وَرَدَ مِنَ الْأَحَادِيثِ الصَّحِيحَةِ فِي مَنَاقِبِهِمْ
وَوُجُوبِ الْكَفِّ عَنِ الطَّعْنِ فِيهِمْ كَقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي فَلَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْ
أُتِفِقَ مِثْلَ أَحَدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مَدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفَهُ، وَكَقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَكْرَمُوا أَصْحَابِي
فَلَيْسَ مِنْهُمْ خِيَارٌ كَمْ... وَكَقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ اللَّهُ اللَّهُ فِي أَصْحَابِي لَا تَتَخَنَوْهُمْ غَرَضًا مِنْ
بَعْدِي فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَبَحَنِي أَحَبَّهُمْ وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِغْضِي أَبْغَضَهُمْ وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِي
وَمَنْ آذَانِي فَقَدْ آذَى اللَّهَ وَمَنْ آذَى اللَّهَ تَعَالَى فَيُوشِكُ أَنْ يَأْخُذَهُ“ (شرح عقائد ص ۱۱۶)

اور خیر کے سوا کسی طریقہ پر صحابہ کے ذکر سے کف لسان کیا جائے ان احادیث صحیحہ کی
وجہ سے جو ان کے مناقب میں وارد ہیں۔ ان پر طعن کرنے سے زبان روکنے کے بارے
میں وارد ہوئی ہیں جیسے نبی علیہ السلام کا فرمان کہ: میرے صحابہ کو برا نہ کہو اس لیے کہ تم میں سے
کوئی اگر احد پہاڑ کے برابر سونا (اللہ کے راستہ میں) خرچ کر ڈالے تو وہ ان میں سے کسی کے
خرچ کیے ہوئے ایک مد کو بھی نہ پہنچے گا اور نہ نصف مد کو۔ اور جیسے نبی علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ
میرے صحابہ کی تعظیم کرو اس لیے کہ وہ تم سب سے بہتر ہیں۔ اور جیسے نبی علیہ السلام کا یہ
ارشاد کہ: میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ میرے بعد تم انہیں نشانہ نہ بنانا۔ پس جو
شخص ان سے محبت کرے گا تو وہ مجھ سے محبت رکھنے کی وجہ سے ہی ان سے محبت رکھے
گا اور جو ان سے بغض رکھے گا وہ مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ہی ان سے بغض رکھے
گا۔ اور جو ان کو تکلیف پہنچائے گا وہ مجھے تکلیف پہنچائے گا اور جس نے مجھے تکلیف پہنچائی اس
نے اللہ کو ناراض کیا اور جس نے اللہ کو ناراض کیا غنقریب اللہ اس کا مواخذہ کرے گا۔

امام نووی (م ۶۷۶ھ) فرماتے ہیں:

فَإِنَّمَا مَا مَوْرُونَ بِحَسَنِ الظَّنِّ بِالصَّحَابَةِ وَنَفْيِ كُلِّ رَذِيلَةٍ عَنْهُمْ. (شرح صحیح مسلم جلد ۲ ص ۲۷۸)

ہم صحابہ کے بارے میں حسن ظن اور ان سے ہر برائی کی نفی کرنے کے مکلف ہیں۔

موصوف اسی سلسلہ میں ایک دوسرے مقام پر یہ فرماتے ہیں:

امام طبری --- کون؟

مشاجرات صحابہ کا شرعی حکم

واذا اتسلت طرق تأويلها نسبنا الكذب إلى روايتها۔ (حوالہ مذکور ص ۹۰)
اور جب اس روایت کی تاویل کے راستے محدود ہو جائیں تو اس کے راویوں کی
طرف جھوٹ کی نسبت کریں گے۔

موصوف ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ:

”وَأَعْلَمُ أَنَّ سَبَّ الصَّحَابَةِ حَرَامٌ مِنْ قَوَاحِشِ الْمُحَرَّمَاتِ، سِوَا لَا بَسِ
الْفِتْنَةِ مِنْهُمْ أَوْ غَيْرِهِ“ (شرح مسلم جلد ۲ ص ۲۱۰)

اچھی طرح سمجھ لو کہ صحابہ کا نازیبا الفاظ سے ذکر کرنا حرام ہے اور بڑے حراموں میں
ہے۔ خواہ وہ صحابی یا ہی جنگ کے فتنہ میں مبتلا ہوئے ہوں یا اس سے بری ہوں۔

حضرت امام مالک (م ۱۷۹ھ) کا قول مشہور شارح حدیث ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں کہ:

”مَنْ شَتَمَ أَحَدًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ أَبَا بَكْرٍ أَوْ عُمَرَ أَوْ عُثْمَانَ أَوْ عَلِيًّا أَوْ مَعَاوِيَةَ
أَوْ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ فَإِنَّ قَالِ شَتَمَهُمْ كَانُوا عَلَى ضَلَالٍ أَوْ كَفَرُوا قَتْلًا وَأَنْ شَتَمَ بَعِيرٍ
هَذَا نَكَلٌ نَكَالًا شَدِيدًا“ (شرح الشفاء جلد ۲ ص ۷۵۵)

جس نے اصحاب رسول میں سے کسی کو (مثلاً) ابو بکر، عمر، عثمان، علی، معاویہ، عمرو بن
العاص، کو گالی دی اگر انہیں گالی دینے والا یہ کہتا ہے کہ وہ کفر و ضلالت پر تھے تو اسے قتل
کیا جائے گا اگر اس کے علاوہ کچھ کہتا ہے تو اسے سخت عبرت ناک سزا دی جائے گی۔

عظیم المرتبت محدث امام ابو زرعہ الرازی فرماتے ہیں کہ:

”إِذَا رَأَيْتَ الرَّجُلَ يَنْتَقِصُ أَحَدًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ فَاعْلَمْ إِنَّهُ زَنْدِيقٌ وَذَلِكَ أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَالْقُرْآنَ حَقٌّ وَمَا جَاءَ بِهِ حَقٌّ
وَلِنَّمَا أَدَى إِلَيْنَا ذَلِكَ كُلُّهُ الصَّحَابَةُ وَهَؤُلَاءِ يَرِيدُونَ أَنْ يَجْرَحُوا شُهُودَنَا لِيَبْطُلُوا
الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ وَالْجَرَحُ بِهِمْ أَوْلَى وَهُمْ زَنَادِقَةٌ“ (الاصابہ جلد اول ص ۱۰۔ بیروت)

جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ صحابہ میں سے کسی کی تنقیص کر رہا ہے تو سمجھ لو یہ زندیق
ہے اور یہ اس لیے ہے کہ رسول حق ہیں قرآن حق ہے، قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے حق ہے

اور ان سب کو ہم تک پہنچانے والے صحابہؓ ہیں۔ مقلدین صحابہؓ چاہتے ہیں کہ ہمارے گواہوں اور واسطہ کو مجروح کر دیں تاکہ وہ کتاب و سنت کو باطل اور بے اصل ٹھہرا دیں۔ لہذا یہی بد کو مقلدین مجروح ہونے کے زیادہ مستحق ہیں، یہ لوگ تو زندیق ہیں۔

امام ذہبی (م ۷۴۸ھ) اپنی مشہور کتاب ”الکبائر“ میں لکھتے ہیں:

”وذكر عيبا وأضاقه إليهم كان مناققا... الخ“ (۲۳۹)

جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی کسی نوع کی مذمت کی اور ان کے عیوب اور لغزشوں کے پیچھے لگا رہا کسی عیب کا ذکر کر کے اس کی نسبت صحابہؓ کی طرف کر دی تو وہ منافق ہے۔ امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) کا قول ان کے تقلید المیمونین ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

سمعت أحمد يقول مالمهم ولمعوية، نسأل الله العاقبة وقال لي يا أبا الحسن! إذا رأيت أحدا يذكر أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم بسوء فاتهمه على الاسلام“ (ذکرہ ابن تیمیہ فی الصارم المسلول بحوالہ مقام صحابہؓ ص ۷۷ مؤلفہ مفتی محمد شفیع صاحب) میں نے امام احمد کو فرماتے ہوئے سنا: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ حضرات معاذیہ رضی اللہ عنہ کی برائی کرتے ہیں، ہم اللہ سے عافیت کے طلب گار ہیں۔ پھر مجھ سے فرمایا: کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ صحابہؓ کا ذکر برائی سے کر رہا ہے تو اس کے اسلام کو مشکوک سمجھو۔ مشہور محقق علامہ کمال الدین ابن ہمام (م ۸۶۱ھ) کہتے ہیں:

”واعتقاد أهل السنة والجماعة تزكية جميع الصحابة وجوبا، بإثبات العدالة لكل منهم والكف عن الطعن منهم ولثناء عليهم كما أثنى الله سبحانه وتعالى عليهم..... وأثنى عليهم رسول الله صلى الله عليه وسلم“ (الصارم بشرح السائر جلد ۶ ص ۱۳۲)

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ تمام صحابہؓ کی لازمی طور پر پاکی بیان کرنا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی عدالت ثابت کرنے، ان پر کسی قسم کا طعن نہ کرنے اور ان کی مدح و تعریف بیان کرنا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی ہے..... اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی تعریف فرمائی ہے۔

علامہ ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) اس عقیدہ کی تصریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”ومن أصول أهل السنة سلامة قلوبهم وألسنتهم لأصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم“ (شرح عقیدہ واسطیہ ص ۲۰۳ بحوالہ مقام صحابہؓ ص ۷۹)

اہل سنت کے اصول عقائد میں سے ہے کہ وہ اپنے دلوں اور زبانوں کو صحابہؓ کے معاملے میں صاف رکھتے ہیں۔

امام المفترین قرطبی (م ۶۱۱ھ) فرماتے ہیں:

یہ جائز نہیں کہ کسی بھی صحابی کی طرف قطعی اور یقینی طور پر غلطی منسوب کی جائے۔ اس لیے کہ ان سب حضرات نے اپنے اپنے طرز عمل میں اجتہاد سے کام لیا تھا اور ان سب کا مقصد اللہ کی خوشنودی تھی۔ یہ سب حضرات ہمارے پیشوا ہیں اور ہمیں حکم ہے کہ ان کے باہمی اختلافات میں کف لسان کریں اور ہمیشہ ان کا ذکر بہترین طریقہ پر کریں کیونکہ صحابیت بڑی حرمت کی چیز ہے اور نبیؐ نے ان کو برا کہنے سے منع فرمایا ہے اور یہ خبر دی ہے کہ اللہ نے انہیں معاف کر رکھا ہے اور وہ ان سے راضی ہے۔ (تفسیر قرطبی جلد ۱ ص ۱۲۲)

امام ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) فرماتے ہیں:

”فهي مردودة على قائلها وناقليها والمظنون بالصحابة خلاف ما يتوهم كثير من الرافضة وأغبياء القصاص الذين لا يميزون عندهم بين صحيح الأخبار وضعيفها وسقيمها“ (البدایة والنهاية الجزء السابع ص ۱۳۹)

(صحابہ کے خلاف اور ان کے مطاعن پر مشتمل) روایات کو ان کے قائلین اور ناقلین کے منہ پر بھینک دینا چاہیے اور صحابہؓ سے رافضیوں اور بے وقوف قصہ گو حضرات کے ادہام کے خلاف حسن ظن رکھنا چاہیے جنہیں صحیح وضعیف اور درست و نادرست میں تمیز نہیں۔

علامہ عبد الوہاب شعرانی حنفی (م ۹۷۳ھ) فرماتے ہیں کہ:

”فمن طعن في الصحابة فقد طعن في نفس دينه“ (البیواقیت الجواہر جلد ۲ ص ۳۲۳)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) فرماتے ہیں کہ: ونكف الاستنعا عن ذكر

الصحابۃ إلاً بخیر وھم أئمتنا وقادتنا۔ (العقیدۃ الحسنۃ مع عقیدۃ الطحاوی ص ۹۷)
اور تمام صحابہ کے بارے میں ہم اپنی زبانوں کو روکتے ہیں اور سوائے بھلائی اور خیر کے ان کا ذکر نہیں کرتے۔ وہ دین میں ہمارے پیشوا اور مقتداء ہیں۔

علامہ عبدالعزیز فرہاروی (م ۱۲۳۹ھ) فرماتے ہیں کہ:

”بہت سے محققین نے ذکر کیا ہے کہ مشاجرات صحابہ کا تذکرہ حرام ہے کیونکہ اندیشہ ہے کہ اس سے بعض صحابہ کرام سے بدگمانی ہو جائے۔ اس کی تائید اس حدیث مرفوعہ سے ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

میرے صحابہ میں سے کوئی شخص کسی کی شکایت نہ پہنچائے کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ میں تمہاری طرف نکلوں تو سب کی طرف سے میرا سینہ صاف ہو۔“ (ابوداؤد و ابن مسعود)
امام ابوليث کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم نخعی سے صحابہ کرام کی باہمی خانہ جنگی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

”یہ وہ خون ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہاتھوں کو پاک رکھا۔ کیا اب ہم ان سے اپنی زبانوں کو آلودہ کریں؟...“

اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ ان میں سے جو واقعات ثابت ہیں، ان کی مناسب تاویل کی جائے گی تاکہ عوام کو سادس و شبہات سے بچایا جائے اور جو لائق تاویل نہ ہوں وہ مردود ہیں اس لیے کہ صحابہ کرام کی بزرگی، ان کی حسن سیرت اور ان کا قبیح حق ہونا نصوص قاطعہ اور اجماع اہل حق سے ثابت ہے، پس یہ احادیث روایات خصوصاً متعصب اور کذاب رافضیوں کی ان (قطعی نصوص اور اہل حق کے اجماع) کا کس طرح معارضہ کر سکتی ہیں؟...

جاننا چاہیے کہ ہم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا کسی اور صحابی کے بارے میں عصمت کا دعویٰ نہیں کرتے۔ عصمت ملائکہ اور انبیائے کرام کی خصوصیت ہے جیسا کہ علم الکلام میں ان کی تحقیق کی گئی ہے۔ اس کے باوجود انبیائے کرام سے بہت سی باتیں جو ہوں یا بطور بشریت ثابت ہوئی ہیں انہیں ”غرض“ کہا جاتا ہے مگر ان کا نام ”ترک فضل“ رکھنا افضل ہے۔

اور اگر کسی صحابی سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو ان کے مقام کے لائق نہیں تو یہ بعید از امکان نہیں اور جب صحابہ کرام کے درمیان مشاجرات رونما ہوئے تو ان کی آپس میں جنگیں بھی ہوئیں سخت کلامی بھی ہوئی اور ایسے امور بھی سرزد ہوئے جن میں تامل کرنے والے کو وحش ہوتا ہے۔

لیکن ہمارا اہل سنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ ایسے امور میں حتی الوسع تاویل کی جائے اور جہاں تاویل ممکن نہ ہو، وہاں روایت کا رد کر دینا واجب ہے اور سکوت اختیار کرنا اور طعن سے گریز کرنا لازم ہے۔ کیونکہ یہ بات قطعی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان اکابر سے مغفرت اور بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے اور حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ آگ ان کو نہیں چھوئے گی۔ اور جو شخص ان پر زبان طعن دراز کرے اس کے بارے میں سخت وعید آئی ہے۔

پس تمام صحابہ کرام سے حسن ظن رکھنا اور ادب و احترام بجالانا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ سلف صالحین، اہل حدیث و اصول کا یہی مذہب ہے۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں اسی پر ثابت قدم رکھے۔

اور اکثر لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر نکلتے چینی کرتے ہیں شاید اس میں یہ حکمت ہے کہ ان سے کوئی چیز صادر ہوئی اس لیے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ رہتی دنیا تک ان کے لیے اعمال صالحہ کا سلسلہ جاری رہے (کیونکہ جو لوگ ان کی ہدائی کرتے ہیں وہ غیبت کے مرتکب ہیں اس کی پاداش میں ان کی نیکیاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ملتی ہیں۔ اس لیے یہ لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر تنقید نہیں کرتے بلکہ درحقیقت اپنی نیکیوں کا تحفہ ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں) اور بہت ممکن ہے کہ ایک چیز کو تمنا کو اور سمجھو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔

(الناہیۃ عن طعن امیر المؤمنین معاویۃ رضی اللہ عنہ ص ۵۔ تحت ”فصل فی النهی عن ذکر التماجر“ ص ۳۳۔ تحت ”فصل الاجوبۃ عن مطاعنہ“)

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد دہلوی (م ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء) فرماتے ہیں کہ:
... صحابہ کے متعلق ان قطعی اور متواتر نصوص اور دلائل عقلیہ و نقلیہ کی موجودگی میں اگر روایات صحیحہ، احادیث کی بھی موجود ہوں تو مردود و مآول قرار دی جاتیں چہ جائیکہ

امام طبری --- کون؟

امام طبری --- کون؟

روایات تاریخ؟ (مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول ص ۲۶۶)

اہل سنت والجماعت کا اعتقاد ہے کہ صحابہ کرامؓ معصوم نہ ہونے کے باوجود خطاؤں سے محفوظ تھے اور جن بعض صحابہؓ سے بشری تقاضے کے تحت بعض اوقات اگر لغزشیں صادر بھی ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کی معافی کا اعلان کر دیا:

وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ، وَلَقَدْ عَفَا عَنْهُمْ۔ (آل عمران ۱۵۲، ۱۵۵)

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران ۱۵۹)

تمام صحابہ کرامؓ جلتی ہیں ”وَكُنَّا وَعَدَ اللَّهُ الْحَسَنَى“ (الحمدید ۱۰)

جب اللہ تعالیٰ نے اسلام قبول کرنے کی بدولت صحابہؓ کے ساتھ حالت کفر میں شدید ترین عداوت کو بھی باہمی مودت سے بدل دیا ہے (عَمَسَى اللَّهُ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الْبَيْنِ عَادِيَتُمْ مِنْهُمْ مَوْدَّةً۔ الممتحنہ ۷) تو پھر وہ ذات صحابہ کرامؓ کے باہمی نزاعات و مشاجرات (جو حالت اسلام میں پیش آئے) میں پیدا ہونے والی کمورت کو مودت میں کیوں تبدیل نہیں کرے گی؟ اگر بالفرض یہ کمورت دنیا میں ان کی وفات تک دو روز زائل نہ بھی ہوئی ہو تو اللہ تعالیٰ کا اہل جنت کے متعلق یہ اعلان ہے کہ:

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ ۝ (الحجر ۴۷)

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ۔ (الاعراف ۴۳)

ہم ان کمورتوں کو ان کے دلوں سے نکال دیں گے اور وہ جنت میں تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کو یہ خوش خبریاں دیں کہ وہ ان کے ”سیئات کو“ حسنات“ میں بدل دے گا۔ ”إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُكَفِّرْنَ السَّيِّئَاتِ“ (سورہ ہود ۱۱۴)

یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

”وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَكْفِرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ“ (الطلاق ۵)

جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے گناہ مٹا دے گا۔

امام طبری --- کون؟

امام طبری --- کون؟

”فَقَاوَلَيْكَ يَذَلُّ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتِ“ (الفرقان ۷۰)

ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دے گا۔

تو کیا وہ صحابہ کرامؓ کی لغزشوں اور خطاؤں کو ”حسنات“ میں تبدیل نہیں کرے گا؟

اللہ تعالیٰ نے تو خصوصیت اور تاکید دینا کید کے ساتھ ان کے ”سیئات کو“ ان کے ساتھ مٹا دینے کا اعلان کیا ہے کہ گویا وہ خطائیں وجود ہی میں نہیں آئی تھیں:

فَمَا الْبَيْنَ هَاخِرُؤُا وَأَخِرُؤُا مِنْ دِيَارِهِمْ وَلَوْ ذُوَاقِي سَبِيلِي وَقَطَلُوا وَقُتِلُوا لَا تُكْفِرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَا تَذَلُّهُمْ جَنَّتْ تَجَرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ۔ (آل عمران ۱۹۵)

اس آیت میں دو کلمات خاص طور پر قابل غور ہیں، ایک ”لَا تُكْفِرَنَّ عَنْهُمْ“ اور دوسرا ”وَلَا تَذَلُّهُمْ“ ان دونوں کلمات میں ہر صیغہ فعل مضارع واحد متکلم کا ہے۔ یہ دونوں صیغہ دراصل ”كُفِّرَ“ اور ”تَذَلَّ“ ہیں۔ دونوں صیغوں کی ابتداء میں قاعدہ صریحہ کے مطابق ”لام تاکید“ لایا گیا ہے اور دونوں کے اجزاء میں نون ثقلیہ یعنی مشدودہ بھی تاکید ہی کے لیے آیا ہے۔ اس طرح ہر کلمے میں دو تاکیدیں ذکر کی گئی ہیں جس سے آیت میں کل چار تاکیدیں جمع ہو گئیں۔ اس لیے ہر کلمے کے ترجمہ میں دو تاکیدوں کا لحاظ رکھنا چاہیے مثلاً:

”لَا تُكْفِرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ“ کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے کہ:

میں ضرور باضروران (یعنی صحابہؓ) کی سیئات کو مٹا دوں گا۔ اور

”وَلَا تَذَلُّهُمْ“ کا ترجمہ یوں ہوگا کہ:

اور میں ضرور باضروران (یعنی صحابہ کرامؓ) کو جنت میں داخل کروں گا۔

گویا زیر نظر آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار تاکیدات کے ساتھ وعدہ فرمایا کہ میں صحابہؓ کے سیئات کو ضرور باضروران مٹا دوں گا اور ضرور باضروران جنت میں داخل کروں گا۔ اس کے بعد فرمایا:

”ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ“ یہ اللہ کی طرف سے ان کے اعمال صالحہ کا نیک بدلہ ہے جس سے وہ ہر فراز ہوں گے۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ آیت میں تاکیدات کے ساتھ ”لَا تُكْفِرَنَّ“ استعمال

امام طبری۔۔۔ کون؟

مشاجرات صحابہ کا شرعی حکم

کیا گیا ہے جس کا مادہ اور مصدر ”تکفیر“ ہے۔ امام راغب اصفہانی ”تکفیر“ کی لغوی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ”تکفیر کا معنی کسی چیز کا چھپانا اور ڈھانک لینا ہے اس طور پر کہ وہ چیز یا عمل کو یاد و جود میں ہی نہیں آیا۔“

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ صحابہ کرام کے سیات کی اس طرح پردہ پوشی فرمائیں گے کہ کو یا ان سے وہ گناہ سرزد ہی نہیں ہوئے۔ پھر ان کے دخول جنت کا وعدہ بھی تا کیدات کے ساتھ کیا گیا ہے اور اگر تا کیدات نہ بھی ہوتیں اور صرف وعدہ ہی ہوتا تب بھی وہ کافی ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے قول اور وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

اس تفصیل سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی ہے کہ صحابہ کرام کی خطاؤں کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر کے ان سے اپنی دائمی رضا اور جنت کا وعدہ کر دیا ہے اس لیے اب کسی بھی فرد کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ان کی خطاؤں کو زبان پر لائے اور ان کا ہدائی کے ساتھ تذکرہ کرے۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہ ان خطاؤں کا معاملہ ہے جو ”فی الواقع“ خطائیں سمجھی جاتی ہیں جیسے حضرت ماعزؓ، امراء غامدیہؓ، حضرت حسانؓ، حضرت مسطحؓ، سیدہ حنہؓ، حضرت حاطبؓ کے واقعات لیکن ان حقائق کے باوجود ان خطاؤں کے بارے میں ”کف لسان“ اور ذکر بالخیر کا ہی حکم دیا گیا ہے۔

ان خطاؤں کے برعکس ”مشاجرات“ اور ”اجتہادی اختلافات“ پر تو حقیقت نفس الامری میں بھی گناہ یا خطاء کا اطلاق ہرگز نہیں ہو سکتا۔ خلفائے راشدین، ان کے امراء و کوزوں اور دیگر صحابہ و ائمہ مجتہدین میں سے کس کس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ان سے کبھی ”خطائے اجتہادی“ سرزد نہیں ہوئی؟ کیا ان کی خطائیں بھی زیر بحث لائی جاتی ہیں؟

پھر معلوم نہیں کہ تمام صحابہ و ائمہ مجتہدین کی اجتہادی خطاؤں کو ”نظر انداز“ کر کے تنہا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہی کو ہدف تنقید کیوں بنایا جاتا ہے؟ کیا باقی سب حضرات اپنے اجتہاد میں ہمیشہ ”مصيب“ ہی تھے۔ پھر یہ بھی کوئی قطعی بات نہیں کہ جسے ”مجتہد مصيب“ کہا جائے وہ حقیقت میں بھی مصيب ہو اور جسے ”مجتہد غلطی“ کہا جائے وہ حقیقت میں بھی غلطی ہو۔ کیونکہ ”مصيب“ قرار دیے جانے کے باوجود ”خطاء“ کا احتمال باقی

امام طبری۔۔۔ کون؟

مشاجرات صحابہ کا شرعی حکم

رہتا ہے اور ”غلطی“ کہنے کے باوجود ”صواب“ کا احتمال ہو سکتا ہے یعنی ”صواب محتمل الخطاء“ اور ”خطاء محتمل الصواب“۔ لہذا ایسی صورت میں صحابہ و ائمہ مجتہدین میں سے کسی ایک فریق یا فرد کو پورے تحقیق کے ساتھ غلطی کہنا، کہلوانا اور دوسروں سے جبراً منوانا ”ذکر بالخیر“ اور ”کف لسان“ کے حکم کی صریح خلاف ورزی ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشاجرات صحابہ کے بارے میں امت کو واضح حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

”إذا ذکر أصحابی فأمسکوا“ (طبرانی بحوالہ مکتوبات امام ربانی جلد دوم ص ۵۸۱)

جب میرے صحابہ کا ذکر کر لو اپنی زبانوں کو بند رکھو، ”إمسکوا“ و ”ما شجر بین أصحابی“ (حوالہ مذکور) میرے صحابہ کے درمیان جو جھگڑے ہوئے ہیں ان سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ سخت تعجب ہے کہ ہمارے علماء کرام، ائمہ مجتہدین کو ”غلطی“ کہنے میں توان کی بے ادبی و توہین سمجھتے ہیں لیکن دوسری طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو موقع بے موقع ”غلطی“ کہنے، کہلوانے کو ”حب علی“ کا تقاضا خیال کرتے ہیں۔

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ:

”چاروں امام وحدت حق کے قائل ہیں اور ”المجتہد یخطئ ویصیب“ کے مدلول کو صحیح جانتے ہیں لیکن تاہم کسی مجتہد کا جھٹ پٹ غلطی کا لفظ استعمال کرنے کو نا زیبا اور خلاف احتیاط سمجھتے ہیں۔۔۔

امام احمد کے اس کلام سے اندازہ کرو کہ ایسے بڑے بڑے جلیل القدر اور رفیع المراتل ائمہ پر یقین رکھنے کے باوجود کہ ہر مسئلہ میں حق صرف ایک ہی ہو سکتا ہے پھر بھی اپنے مخالف کے تخطیہ میں کس قدر محتاط تھے چنانچہ جو کچھ بھی حسن ظن ائمہ کرام کی نسبت آج باقی ہے وہ ان ہی پاک نفس بزرگوں کی احتیاط اور بے تعصبی اور فراخ دلی اور حسن تدبیر کا نتیجہ ہے۔“ (ہدایہ سنیہ ص ۴۰، ۴۱)

اگر امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور دیگر ائمہ مجتہدین کے تخطیہ کے بارے میں یہ احتیاط ملحوظ رکھی جاسکتی ہے تو کیا حضرت معاویہؓ کے ساتھ کم از کم یہ سلوک روا نہیں رکھا جاسکتا؟

کاش کہ بسلسلہ ”مشاجرات“ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی حسن ظن اور ادب

و احتیاط کا ”کم از کم“ وہی سلوک ملحوظ رکھ لیا جاتا جو ائمہ مجتہدین کے ساتھ روا رکھا گیا ہے۔ لیکن یہاں تو اس سلوک کے بالکل ہی برعکس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ”خاطی“ ثابت کرنے کے لیے ”خارجی فتنہ“ جیسی بڑی بڑی ضخیم کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔

مذکورہ تفصیل سے ”مشاجرات صحابہ“ کا شرعی حکم واضح ہو گیا ہے کہ اصحاب پیغمبر کا ذکر ہمیشہ ”بالخیر“ ہی کرنا چاہیے اور ان کے باہمی اختلافات و مشاجرات کے بارے میں ”امساک، توقف اور سکوت اختیار کرنا چاہیے کیونکہ اسی صورت میں ایمان کی سلامتی اور صحابہ کے بارے میں ہر طرح کی بدظنی سے حفاظت ہے۔

جب کہ اس کے بالمقابل صحابہ کا تخطیہ اہل سنت والجماعت کا اصل مذہب نہیں ہے بلکہ ایک رخصت اور ”تم خلص“ ہے۔ یعنی اصل تو یہی ہے کہ صحابہ کرام کی مشاجراتی اور اجتہادی خطا کو بھی زبان پر نہ لایا جائے لیکن اگر کسی وقت کسی ضرورت شرعیہ و شدیدہ کی وجہ سے یہ موضوع زیر بحث آج بھی جائے تو اجتہادی خطا و صواب سے زیادہ کوئی لفظ ہرگز استعمال نہ کیا جائے۔

محقق اہل سنت، سابق شیخ الحدیث جامعہ فاروقیہ مولانا ابوریحان عبدالغفور سیالکوٹی صاحب اپنے شاگرد رشید مولانا ظہور الہی صاحب کے نام ایک خط میں ارشاد فرماتے ہیں کہ: ”سیدنا مولانا حضرت علیؑ سے متعلق بالکل میرا وہی عقیدہ ہے جو اصولی طور پر اہل السنۃ والجماعت کا ہے اس مسئلہ میں میری کوئی الگ رائے ہرگز نہیں ہے البتہ اپنے دوسرے اور چھوٹے سردار اور مولیٰ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو ادھر ادھر کی باتیں جاتی ہیں ان سے میں ضرور بیزار ہوں۔ ان کو جائز، عادل عن الحق، ظالم، تارک القرآن والحدیث اور باغی طاغی کہنا تو بہت دور کی بات ہے میں تو ان کو ”جھٹی“ کہنے کے لیے بھی تیار نہیں بلکہ حضرت علیؑ کی طرح ان کو بھی مصیب ہی سمجھتا اور کہتا ہوں۔ اگر یہ ”جرم“ ہے تو اس ”جرم“ سے میں باز نہیں آ سکتا۔“

باری تعالیٰ امت مسلمہ کو جملہ صحابہ کرامؓ بالخصوص حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں سوء ظن اور بدگمانی سے بچا کر کامل حسن ظن نصیب فرمائے۔ آمین

بلا تحقیق نقل روایت کا شرعی حکم

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنِ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا...“ (الحجرات: ٦٠)

”اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو“ اس آیت مجیدہ میں نہایت ہی اہم اصول بیان کیا گیا ہے جس کی انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر نہایت اہمیت ہے۔ یہاں ”نباء“ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی اہم خبر کے ہیں جس سے دور رس نتائج نکل سکتے ہوں۔

امام ابو بکر حصص اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

و مقتضى الآية ايجاب التثبت في خبر الفاسق والنهي عن الإقدام على قبوله إلا بعد التبين“ اس آیت کا مقتضی یہ ہے کہ فاسق کی خبر کی تحقیق کرنا واجب ہے جب تک حقیقت حال پوری طرح واضح نہ ہو جائے اس پر عمل کرنا (یعنی اسے صحیح سمجھنا، آگے نقل کرنا یا بیان کرنا) ممنوع ہے۔ پھر ہر خبر کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ جتنی خبر اہم ہوگی اتنی ہی اس کی تحقیق بھی ضروری ہوگی خواہ اس خبر کا تعلق انفرادی معاملات کے ساتھ ہو یا اجتماعی معاملات کے ساتھ اگرچہ اجتماعی معاملات سے متعلق خبر کی تحقیق کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

اسی طرح خبر کا منجر پر بھی بہت انحصار ہوتا ہے وہ لفظ ہے یا غیر لفظ لیکن خبر کی اہمیت کے پیش نظر ہر پہلو کے اعتبار سے اس کی تحقیق ضروری ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ایک لفظ راوی بھی غلط فہمی کا شکار ہو کر ایک فاسق کی خبر بلا تحقیق آگے بیان کر دیتا ہے اس لئے حکم دیا گیا کہ کوئی خبر سننے ہی اسے آگے مت پہنچاؤ بلکہ توقف کرو یہاں تک کہ اس کے صحیح یا غلط ہونے کی تصدیق ہو جائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ہر سنی سنائی بات کو بلا تحقیق آگے نقل کرنے والے کو

امام طبری --- کون؟

بلا تحقیق نقل روایت کا شرعی حکم

”جھوٹ“ قرار دیا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

”كُفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ“ (صحیح مسلم - باب النہی

عن الحديث بكل ما سمع - جلد ۱ - ص ۸)

کسی شخص کے جھوٹ ہونے کے لئے بس اتنی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کرتا پھرے (اور اس کی تحقیق نہ کرے)۔

اسی طرح اگر ”نہی“ کا تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ ہو یا ان کی طرف منسوب کر دی گئی ہو تو پھر تحقیق کا معیار مزید سخت ہو جائے گا کیونکہ آپ نے فرمایا ہے کہ:

”لَا تَكْذِبُوا عَلَيَّ فَمَنْ يُكْذِبْ عَلَيَّ يَلِجِ النَّارَ، لَا تَكْذِبُوا عَلَيَّ فَإِنَّهُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَلِجِ النَّارَ“ (صحیح بخاری کتاب العلم باب اثم من كذب على النبي - رقم الحديث ۱۰۶)

مجھ پر جھوٹ نہ بولو اس لئے کہ جو مجھ پر جھوٹ بولے گا وہ جہنم میں داخل ہوگا

”مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَبْئِثْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ“ (حوالہ مذکور - رقم الحدیث ۱۰۷)

جو مجھ پر جھوٹ بولے گا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنا لے۔

”مَنْ يَكْذِبْ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَبْئِثْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ“ (حوالہ مذکور - رقم الحدیث ۱۰۹)

جس نے میری طرف ایسی بات کی نسبت کی جو میں نے نہیں کہی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنا لے۔

مذکورہ احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا حرام ہے اور جو شخص جانتا ہو یا اس کا گمان ہو کہ جو روایت وہ بیان کرتا ہے وہ جھوٹی ہے تو تنبیہ کئے بغیر اسے بیان کرنا حرام ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ:

”جس کو کسی روایت کا موضوع ہونا معلوم ہو یا اس کے ظن غالب میں وہ موضوع ہو تو اس

کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ اس حدیث کو بیان کرے۔ اور جو یہ علم رکھنے کے باوجود کہ فلاں روایت

موضوع ہے اس کو بیان کرتا پھرے اور اس کا موضوع ہونا بیان نہ کرے تو وہ اس شدید وعید میں

داخل اور ان لوگوں میں شامل ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ اور افتراء باندھتے ہیں۔“

امام ابن صلاح فرماتے ہیں کہ:

امام طبری --- کون؟

بلا تحقیق نقل روایت کا شرعی حکم

”جس کو کسی روایت کا موضوع ہونا معلوم ہو جائے تو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ

اسے موضوع کہے بغیر بیان کرے“ (مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۳۱-۱۳۰)

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ: ”وَاتَّفَقُوا عَلَى تَحْرِيمِ رَوَايَةِ الْمَوْضُوعِ إِلَّا

مَقْرُونًا بَيَانٍ وَضَعَهُ“ (شرح منہج الفکر ص ۸۱)

محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ موضوع روایت کا بیان کرنا حرام ہے مگر اس وقت

اس کی اجازت ہوگی جب اس کا موضوع ہونا بھی بیان کر دیا جائے۔

وکیل احتاف مشہور محدث اور فقیہ علامہ ابو الحسنات محمد عبدالحی لکھنوی (متوفی ۱۳۰۴ھ)

ایک منقولہ ”عبارت“ کے جواب میں فرماتے ہیں:

وَمَنْهَم مَنْ قَالَ: إِنْ الشَّيْخُ لَمْ يَذْكُرْ ذَلِكَ مِنْ عِنْدِ نَفْسِهِ، بَلْ نَقَلَهُ عَنْ غَيْرِهِ، وَانْقَالَ لِبِسِ

عَلَيْهِ إِلَّا تَصَحَّحَ النُّقْلُ، وَإِنَّمَا الْعَهْدَةُ عَلَى مَنْ مَنَعَ النُّقْلَ - وَفِيهِ سَخَافَةٌ ظَاهِرَةٌ عِنْدَ أَهْلِ

الْفَضْلِ، فَإِنَّ الْعَالَمَ الْمَتَّبِعَ وَالصُّوْفِيَّ الْمُبْتَصِرَ، لَا يَعْنُرُ فِي نَقْلِ مِثْلِ هَذَا الْبَاطِلِ، بَلْ لَا يَحِلُّ

نَقْلُهُ إِلَّا لِلرَّدِّ عَلَيْهِ وَالْقَدْحِ فِيهِ عَلَى الْوَجْهِ الْكَافِلِ - (الرفع والتكميل في الجرح والتعديل ص ۳۷۹)

بعض نے کہا کہ شیخ نے یہ بات اپنی طرف سے نہیں لکھی، بلکہ دوسرے سے نقل کی ہے،

اور نقل کے ذمے تو صرف صحیح طور پر نقل کرنا ہے، باقی ساری ذمہ داری تو اس پر ہے جس سے

نقل کیا گیا ہے۔ (علامہ لکھنوی کہتے ہیں) اس جواب کی کمزوری ظاہر ہے، کیونکہ ایک تبحر

عالم اور صاحب بصیرت صوفی کو اس جیسی باطل بات کے نقل میں معذور نہیں رکھا جاسکتا، بلکہ

اس کو تو صرف رد کرنے اور کمال طور پر اس پر طعن کرنے کے لیے ہی نقل کرنا حلال ہے۔“

اگر بالفرض روایت موضوع نہیں بلکہ ضعیف ہے تو اس کے بارے میں بھی یہ احتیاط ملحوظ رکھی

جائے کہ اسے ”جزأ“ آپ کا قول نہ قرار دیا جائے اور نہ ہی اس پر عمل کو ”سنت“ قرار دیا جائے۔

فقیر العصر مولانا مفتی رشید احمد صاحب فرماتے ہیں کہ:

ضعیف حدیث پر عمل کرنے میں مندرجہ ذیل مفاسد ہیں:

۱۔ اس میں یہ شرط ہے کہ اس عمل کو سنت نہ سمجھا جائے۔ اور حال یہ ہے کہ عوام تو

امام طبری --- کون؟

بلا تحقیق نقل روایت کا شرعی حکم

درکنار، خواص بلکہ مشہور علماء اور مقتدی حضرات بھی ایسے اعمال کو سنت سمجھتے ہیں بالخصوص شیخ عبدالحق دہلوی کی کتاب ”مناہت بالمسنۃ“ کا نام دیکھ کر اس میں مذکورہ سب اعمال کو مسنون سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس میں اکثر روایات اسی قسم کی ہیں۔

۲۔ یہ شرط بھی ہے کہ روایت ضعیفہ سے کوئی حکم شرعی ثابت نہ کیا جائے اور ”اعتقاد فضیلت“ حکم شرعی ہے البتہ ”خیال فضیلت“ حکم شرعی نہیں۔

۳۔ یہ شرط بھی ہے کہ روایت میں ضعف شدید نہ ہو اور فضائل سے متعلق اکثر روایات کا حال یہ ہے کہ صرف ضعیفہ شدید ہی نہیں بلکہ موضوعہ ہیں۔ بیشتر کے موضوع ہونے کی تو اصحاب فن نے تصریح فرمائی ہے اور بقیہ کے بارے میں بھی بوجہ ذیل یہی ظن غالب ہے:

ان کے رواۃ وضاع، روافض اور صوفیہ ہیں۔ وضع احادیث میں روافض کا کردار اتنا واضح اور اس قدر مشہور ہے کہ مزید وضاحت کی حاجت نہیں۔ علاوہ ازیں اس کی تفصیل تحریر میں لانے کے لئے مختصر مضمون کافی نہیں، دفاتر کے دفاتر درکار ہیں۔ وضع احادیث کے فن میں ”صوفیہ“ کے کارناموں سے بھی کتب حدیث و رجال بھری پڑی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ روایات ضعیفہ کے تعدد سے قوت آ جاتی ہے مگر کتب مذکورہ (غنیۃ الطالبین، قوت القلوب، إحياء العلوم، مکاشفۃ القلوب، کیسائے سعادت، تصانیف سیوطی، ماہیت بالسنۃ) کے بیشتر رواۃ ایسے ہیں کہ ان جیسوں کا عدد ہزار سے بھی بڑھ جائے تو بھی ان پر اعتماد کرنا جائز نہیں: ”الخبیث لا یزید الا خبیثا“ (حسن الفتاویٰ جلد دوم ص ۱۲۳-۱۲۵۔ مطبوعہ المجاز پبلشرز کراچی)

مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری فرماتے ہیں کہ:

”مودودی صاحب تیسرا مغالطہ یہ دیتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، تاریخ کی مستند کتابوں ہی سے لکھا ہے۔“ میں پوچھتا ہوں کہ کسی بھی دشمن اسلام نے اسلام، پیغمبر اسلام اور تعلیمات اسلام کو ہدف طعن و تشکیک بناتے وقت کوئی بات بلا حوالہ کی ہے؟ سب اپنی خرافات کے پورے حوالے درج کرتے ہیں۔ پھر دشمنان صحابہ نے حضرات صحابہؓ پر حملہ کرتے ہوئے جو واقعات نقل کئے ہیں سب تاریخ اسلام کی ”مستند ترین کتابوں“ ہی سے ماخوذ ہیں۔ حقیقت یہ

امام طبری --- کون؟

بلا تحقیق نقل روایت کا شرعی حکم

ہے کہ دشمنان دین کا، دین کے خلاف سب سے بڑا اور کارگر حربہ یہی تاریخ اسلام اور تاریخ اسلام کی مستند ترین کتابیں ہی ہوتی ہیں۔ مودودی صاحب کے فریب خوردہ فریب کار قیوعین بھی یہی کہتے ہیں کہ اس میں مودودی صاحب کا کیا قصور ہے؟ انہوں نے تو صرف تاریخ پیش کی ہے اور مؤرخین کی روایات نقل کر دی ہیں کیا یہ بھی گناہ ہے؟ ہاں یہ گناہ ہے اور بے شک معصیت۔ اس کے گناہ معصیت اور فتن و فحور ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ جھوٹے راویوں کی جھوٹی روایات نقل کر کے یہ عذر پیش کرے کہ میں نے تو صرف یہ روایات نقل کی ہیں۔

اگر اسے ان روایات کے موضوع مکذوبہ ہونے کا علم نہیں تو اس جاہل کو یہ کس حکیم نے بتلایا ہے کہ وہ ضرور یہ روایات نقل کرے ورنہ اس کے دماغ میں فتور و خلل پیدا ہو جائے گا۔ اور اگر وہ جانتا ہے کہ یہ روایات جھوٹی ہیں اور پھر بھی انہیں نقل کرتا چلا جاتا ہے تو اب اس کے خود جھوٹا ہونے میں کوئی شک نہیں اور یہ قیامت میں اپنے اس جھوٹ کے لئے اسی طرح پکڑا جائے گا جس طرح وہ جھوٹی روایات وضع کرنے والا پکڑا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”کفی بالمرء کذباً أن یحدث بکل ماسمع“ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ہر بات جو سنے روایت کر دے۔ امام مسلم نے یہ حدیث دو سندوں کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت حصہؓ سے روایت کی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے:

”بحسب المرء من الکذب أن یحدث بکل ماسمع“

آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ہر بات جو سنے روایت کر دے۔

امام مالک نے اپنے شاگرد ابن وہب سے فرمایا: ”اعلم انه لیس یسلم رجل حدث بکل ماسمع ولا یكون اماماً أبداً وهو یحدث بکل ماسمع“ یاد رکھو وہ آدمی نہیں بچ سکتا جو ہر سنی سنائی بات بیان کر دے ورنہ ہی وہ شخص کبھی امام بن سکتا ہے جو ہر سنی بات کو روایت کر دے۔ (یہ تمام روایات صحیح مسلم مقدمہ باب ”النهی عن الحلیث بکل ماسمع“ سے منقول ہیں)

امید ہے حضور کریمؐ، حضرات صحابہؓ اور امام الائمہ امام مالک کے ان ارشادات و تصریحات کے بعد نہ یہ فریب کھایا جائے گا اور نہ ہی دیا جائے گا کہ کسی تاریخی روایت کو صرف نقل کروینا تو کوئی گناہ نہیں۔ گناہ تو اب تو راوی پر ہے۔ مودودی صاحب (اور طبری صاحب) نے تو صرف روایات نقل کر دی ہیں۔ (عادلا ندفاع جلد ثانی ص ۸۷-۸۰۔ مطبوعہ دارالتصنیف والاشراف دہلی آباد ملتان)

امام طبری کی تاریخ منکر، ضعیف، سقیم، رطب و یابس اور موضوع روایات کا ملغوبہ ہے جو انہوں نے نہ صرف کذاب راویوں ((سیف بن عمر، سلمہ بن فضل، محمد بن اسحاق، ابن زید بن اسلم، متاع بن سلیمان، سعدی کبیر، سعدی صغیر، محمد بن سائب کلبی، ہشام بن محمد بن سائب کلبی، عطیہ عوفی، ابو جعفر لوط بن یحییٰ محمد بن عمرو اقدی و امثالہم) سے روایت کی ہیں بلکہ وہ خود بھی ان کذاب راویوں کی اتباع میں روایات گھڑنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں محدث و حافظ سلیمانی (۴۱۳ھ) کی یہ شہادت کافی ہے کہ ”کان یضع للروافض امام طبری رافضیوں کے لئے روایات گھڑتے تھے۔

علاوہ ازیں صحابہ کرام بالخصوص حضرت معاویہؓ کی توہین اور لعن طعن پر مبنی جن روایات کا ذکر پیچھے گذرا ہے وہ بھی اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ موصوف دیگر کذاب راویوں کے ”جرم“ میں خود بھی برابر کے شریک ہیں۔

یہی نہیں بلکہ امام طبری حضرت معاویہؓ کی دشمنی بغض (جو بلا شک و شبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بغض و عناد ہے) میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی بہتان و جھوٹ باندھنے میں کوئی ”حیاء“ نہ آئی اور کس ناپاک جسارت کے ساتھ یہ روایات نقل کر گئے:

ومنه قول الرسول عليه السلام وقد آه مقبلا على حمار و معاوية يقود به و يزيد ابنه يسوق به لعن الله القائد والراكب والسائق...

ومنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: يطلع من هذا الفج رجل من امتي يحشدر على غير ملتي فطلع معاوية،

ومنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا رأيتم معاوية على منبري فاقتلوه۔
ومنه الحديث المرفوع المشهور أنه قال ان معاوية في تابوت من نار في أسفل درك منها ينادي يا حنّان يا منّان، الآن وقد عصيت قبل و كنت من المفسدين۔

مذکورہ روایات کو صاف طور پر نہایت ہی ڈھٹائی کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ کیا ان روایات کے ”مجهول“ راوی اور معروف مقل جناب ”سنی“ طبری ان فرامین نبویہ کے مصداق نہیں بن گئے؟ کہ:

”لَا تَكْذِبُوا عَلَيَّ فَمَنْ يَكْذِبْ عَلَيَّ يَلِجِ النَّارَ، لَا تَكْذِبُوا عَلَيَّ فَإِنَّهُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَلِجِ النَّارَ“

”مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَبْئُؤْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ“

”مَنْ يَقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَبْئُؤْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ“

حضرت معاویہؓ کے بارے میں مذکورہ موضوع روایات نقل کرنے کے باوجود امام طبری کا ”کلیجہ“ ٹھنڈا نہیں ہوا چنانچہ وہ اسی سلسلہ کلام کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

”والعنوا من لعنه الله ورسوله و فارقوا من لا تالون القرية من الله و رسوله الا بمفارقة۔“

اللهم العن أبا سفيان بن حرب و معاوية ابنه و يزيد بن معاوية و مروان بن الحكم و ولده، اللهم العن أئمة الكفر و قادة الضلالة و أعداء الدين و مجاهدي الرسول و مغيري الأحكام و مبغلي الكتاب و سفاكي الدم الحرام۔

اللهم اتنا تبرأ اليك من موالاة أعدائك و من الاغماض لأهل معصيتك كما قلت: ”لا تجد قوماً يؤمنون بالله و اليوم الآخر يوادون من حاد الله و رسوله“۔

(تاريخ الامم والملوك الجزء الثامن ص ۱۸۹، ۱۸۶، ۱۸۵۔ طبع بيروت)

اور اس پر لعنت کرو جس پر اللہ و رسول نے لعنت کی، اس سے مفارقت اختیار کرو جس کی مفارقت کے بغیر تم اللہ کی قربت نہیں حاصل کر سکتے۔

اے اللہ! لعنت کر ابو سفیان بن حرب اور اس کے بیٹے معاویہ پر، یزید ابن معاویہ پر، مروان بن الحکم پر اور اس کی اولاد پر۔

اے اللہ! لعنت کر کفر کے ماموں، مگرابی کے پیشواؤں، دین کے دشمنوں، رسول سے لڑنے والوں، احکام میں تغیر کرنے والوں، کتاب کے بدلنے والوں اور محترم خون بہانے والوں پر۔

اے اللہ! ہم تیرے دشمنوں کی دوستی سے، تیرے گناہ گاروں سے چشم پوشی کرنے سے، تیرے سامنے اپنی بے زاری ظاہر کرتے ہیں جیسا کہ تو نے کہا ہے کہ: ”تو کسی جماعت کو جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان لاتے ہیں ایسا نہ پائے گا کہ وہ ان لوگوں سے محبت کریں جو اللہ اور رسولؐ کے دشمن ہیں“۔

قارئین کرام! یہ ”کفریات و مغالطات“ اس معاویہ بن ابی سفیانؓ کے بارے میں کئے گئے ہیں جو ”فتح عرب و عجم، مدبر اسلام، کاتب وحی، بانی اسلامی بحریہ، خلیفہ راشد امیر المؤمنین اور دنیائے اسلام کی ان چند مقتدر، با عظمت اور بلند پایہ شخصیتوں میں سے ایک ہیں جن کے احسانات سے ملت اسلامیہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

یہ وہ عظیم شخصیت ہیں جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب وحی بنایا (صحیح مسلم) جن کے بارے میں فرمایا: ”اللہم اجعلہ ہادیاً مہدیاً و اھدیہ“ (ترمذی) جنہیں جنت کی بشارت سے نوازا: ”اول حبش من امتی یغزون البحر قد اوجبوا“ (صحیح بخاری) یہ وہ عظیم شخصیت ہیں جنہوں نے ۲۲ برس تک بحیثیت امیر حبش اور گورنر شام حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے دور خلافت راشدہ میں اپنی قائدانہ اور مدبرانہ صلاحیتوں سے اشاعت اسلام اور تسخیر فتوحات میں نمایاں کردار ادا کیا، جنہوں نے ۲۰ برس تک حجاز مقدس سے افریقہ اور بحر روم سے بحر اوقیانوس تک ۶۵ لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی وسیع اسلامی ریاست کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت فرمائی۔

بڑے شفیق، بد بخت، روسیہ اور ملعون ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے معاف کرنے کے باوجود انہیں معاف نہ کیا اور ”رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ“ کی قرآنی سند کی موجودگی

میں بھی ان کے ساتھ بغض روا رکھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو ان کے لئے مغفرت و بلندی درجات کی دعائیں مانگیں، انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اعزاز عطا فرمائیں مگر آپ کے نام نہاد نام لیوا انہیں نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھیں۔ حضرت علیؓ جن کے بارے میں فرمائیں: وہ ہمارے بھائی ہیں، ہمارا رب ایک ہے، نبی ایک ہے، ہماری دعوت اسلامی ایک ہے، ہم اللہ و رسول پر ایمان و یقین میں ان سے زیادہ نہیں ہیں اور وہ ہم سے زیادہ نہیں ہیں۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ جن کے ہاتھ پر بیعت کریں، ان کے دورِ مسعود میں اپنی ساری زندگی عزت و سکون کے ساتھ گزاریں اور ان سے ہدایا و تحائف وصول کریں مگر آپ کے نام نہاد عقیدت مند لغو، باطل و موضوع روایات اور دشمنان اسلام کے اقوال کا سہارا لے کر ان محترم پر تیزا کریں۔

تجب بالائے تجب یہ کہ بقول طبری، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو اس بات کی تلقین کریں کہ: إذا رأیتم معاویۃ علی منبری فاقبلوہ۔، جب تم معاویہ کو میرے منبر پر دیکھو تو قتل کرو۔ مگر صحابہ کرامؓ ان کے ساتھ اس حکم نبویؐ کے برعکس سلوک کریں۔ یہی معاویہ مسجد نبویؐ میں منبر نبویؐ پر خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ: ”یا اھل المدینۃ! این علماء کم“ اے اہل مدینہ! تمہارے علماء کہاں ہیں؟ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ یہ یوم عاشوراء ہے۔ اللہ نے اس کا روزہ تم پر فرض نہیں کیا ہے۔ البتہ میں روزہ سے ہوں لہذا جو شخص چاہے روزہ رکھ لے اور جو نہ چاہے، نہ رکھے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم۔ کتاب الصوم)

اس کے بعد بھی حضرت معاویہؓ نے منبر نبویؐ پر خطبہ ارشاد فرمایا۔ (ملاحظہ ہو صحیح بخاری۔ کتاب اللباس باب الوصل فی الشہر۔ صحابہ کرام نے حضرت معاویہؓ کو منبر پر خطبہ دیتے ہوئے دیکھا بھی اور سنا بھی مگر اس کے باوجود وہ آپ کے فرمان پر عمل نہ کر سکے۔ اس کا اس کے علاوہ آخر کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ امام طبری کی بیان کردہ روایت من گھڑت اور موضوع ہے۔

تفسیر الطبری

امام طبری کی تصانیف میں سے ایک اہم تصنیف تفسیر طبری: المسمی ”جامع البیان فی تادیل القرآن، طبع بیروت ۱۹۹۷ء“ یا ”جامع البیان عن تادیل آی القرآن“ ہے دونوں ناموں کا مفہوم ایک ہی ہے اور ”تاریخ الامم والملوک“ یا ”تاریخ الرسل والملوک“ کی طرح یہ تفسیر بھی دونوں ناموں سے شائع ہو رہی ہے۔ مؤخر الذکر نام سے یہ تفسیر صدیقی جمیل العطار کی توثیق و تخریج کے ساتھ ۱۹۹۵ء میں بیروت سے شائع ہوئی ہے۔

تفسیر طبری کی طباعت کے متعلق پروفیسر غلام احمد حریری لکھتے ہیں کہ:

”تفسیر ابن جریر تیس کبیر و ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے۔ تھوڑا عرصہ پہلے یہ تفسیر بالکل نادرا و نایاب تھی۔ با رگ و خداوندی میں مقدر تھا کہ ایک روز یہ منصہ شہود پر جلو گر ہوگی۔ چنانچہ تمام بلاد و دیار کے علماء یہ سن کر بے حد خوش ہوئے کہ امرائے نجد میں سے امیر حمود بن امیر عبدالرشید کی ملکیت میں تفسیر ابن جریر کا ایک کامل مخطوطہ موجود تھا۔ تھوڑی ہی مدت گزری کہ اس نسخہ سے منقول ہو کر یہ تفسیر زیور طبع سے آراستہ ہو گئی اور اس طرح ہم تفسیر کے اس انسائیکلو پیڈیا سے بہرہ یاب ہو گئے“ (تاریخ تفسیر و مفسرین ص ۱۹۲)

حلب کی کلیہ شریعہ کے شعبہ حدیث و تاریخ کے مشہور استاذ علامہ محمد راغب الطباخ (م ۱۳۷۰) لکھتے ہیں کہ:

”یہ تفسیر جلیل مطبع میمیریہ مصر میں ۱۳۲۱ھ میں اس نسخہ سے مطابقت کر کے طبع ہوئی ہے جو امرائے نجد آل رشید کے خزانہ سے لایا گیا اور اس کا مقابلہ ایک دوسرے نسخہ سے کرایا گیا جو دارالکتب سلطانیہ مصر میں دس ضخیم جلدوں میں تھا اور اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ احمدیہ حلب میں بھی ہے جو آٹھ جلدوں میں بڑی تقطیع پر ہے۔ آخری جلد سورۃ القدر کے پاس

سے کرم خوردہ ہے اور جس کا نمبر ۹۳ ہے۔ اس مطبوعہ تفسیر کے حاشیہ پر تفسیر غرائب القرآن و رعائب الفرقان ہے جو تفسیر نیشاپوری کے نام سے مشہور ہے“۔ (تاریخ افکار و علوم اسلامی جلد اول ص ۲۴۹۔ مترجمہ مولانا افتخار احمد ملکی)

تفسیر طبری کے بارے میں معتبر علماء کا اتفاق ہے کہ تفسیر کے شعبے میں اس کے مثل کوئی کتاب تالیف نہیں ہوئی۔ نیز اس تفسیر کو زمانی سبقت و تقدم بھی حاصل ہے کیونکہ اس سے پہلے کی تفسیری کاوشیں مرد و زمانہ کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں۔

ابن خالویہ النخوی الہمدانی (۳۷۱ھ) کہتے ہیں کہ:

مجھ سے ابن خزیمہ نے کہا کہ: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ نے تفسیر ابن جریر لکھی ہے تو میں نے کہا کہ میں نے ان سے بطرز املاء لکھی ہے یعنی وہ بتاتے گئے اور میں لکھتا گیا۔ ابن خزیمہ نے کہا کہ کیا پوری تفسیر لکھی ہے؟ میں نے کہا جی ہاں، سات سال میں اس کی تکمیل کی۔ ”من سنة ثلاث و ثمانین إلى سنة تسعين“ ۸۳ھ سے ۹۰ھ یعنی ۲۸۳ھ سے ۲۹۰ھ تک۔

ابن خالویہ کہتے ہیں کہ: ابن خزیمہ نے وہ تفسیر مجھ سے مستعار لے لی پھر چند سالوں کے بعد اسے واپس کرتے ہوئے کہا:

”تظنرت فیه من أوله إلى آخره فما أعلم علی أديم الارض أعلم من ابن جریر و لقد ظلمته الحنابلة“ (لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۰۲)

میں نے اول سے آخر تک یہ تفسیر دیکھی ہے پس میں اس وقت روئے زمین پر ان سے بڑے کسی عالم کو نہیں جانتا۔ حنابلہ نے ان پر بڑا ظلم کیا ہے۔

ابو حامد اسفرائینی (م ۴۰۶ھ) نے کہا کہ:

”لو سافر رجل إلى أقصى الصين حتى يحصل تفسير ابن جریر لم یکن ذلك كثيراً“ اگر کوئی شخص تفسیر ابن جریر حاصل کرنے کے لئے چین تک سفر کرے تو یہ کچھ بڑی بات نہ ہوگی۔ (حوالہ مذکور)

امام طبری نے ایک دفعہ اپنے شاگردوں سے پوچھا کہ:

أنشطون لتفسير القرآن؟ قالوا: كم يكون قدره؟ قال: ثلاثون ألف ورقة۔ قالو: هذا مما يفنى الا عمار قبل تمامه۔ فاختصره في نحو ثلاثة آلاف ورقة۔

ثم قال: تنشطون لتاريخ العالم من آدم إلى وقتنا هذا؟ قالوا: كم قدره؟ فذكر نحواً مما ذكره في التفسير۔ فأجابوه بمثل ذلك۔ فقال: إن الله، مانت الهمم فاختصر في نحو مما اختصر التفسير۔ (معجم الادباء المجلد السادس ص ۵۱۵۔ طبع بيروت)

کیا تم تفسیر قرآن (پڑھنے) کے لئے مستعد ہو؟ تو انہوں نے کہا وہ تفسیر کتنی ہوگی؟ ابن جریر نے جواب دیا کہ ۳۰ ہزار اوراق۔ تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو تمام ہونے سے پہلے ہماری عمروں کو ختم کر دے گی۔ تب ابن جریر نے اس تفسیر کو تقریباً ۳ ہزار اوراق میں مختصر کیا۔

پھر ابن جریر نے کہا کہ کیا تم آدم سے لے کر اس وقت تک کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہو؟ شاگردوں نے کہا: وہ کتنی بڑی ہوگی؟ آپ نے تفسیر جتنی ضخامت بتلائی۔ تلامذہ نے جواب دہرایا تو طبری کہنے لگے کہ ”انما للذ“ آج کل لوگوں کی ہمت پست ہونے لگی۔ چنانچہ انہوں نے تاریخ کو بھی تفسیر کی طرح مختصر کر دیا۔

حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسنی صاحب (م ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۷ء) فرماتے ہیں کہ:

محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب طبری، طبرستان کی بستی آمل میں ۲۲۲ھ یا ۲۲۵ھ کو ولادت ہوئی۔ طلب علم کے لئے مصر، شام، عراق تک کا سفر کیا۔ سلیمان بن عبد الرحمن سے قرآن عزیز پڑھا۔ باقی علوم اسحاق بن ابی اسرائیل جیسے جلیل القدر علماء مصر سے حاصل کئے۔ دیگر مفید تصانیف کے علاوہ قرآن عزیز کی تفسیر مرتب فرمائی جس میں احادیث، آثار صحابہ سے قرآن عزیز کی تفسیر کی گئی ہے جس کا نام ”جامع البیان فی تفسیر القرآن“ ہے مگر مشہور ابن جریر اور طبری ہے۔ ابن جریر کا زیادہ وقت تالیف و تصنیف میں گذرا، اس لئے امرا و سلاطین سے لائق رہے۔ جب خاقانی وزیر ہوا تو اس نے آپ کی خدمت میں مال بھیجا مگر آپ نے قبول کرنے سے انکار کیا پھر اس نے آپ کو قاضی بنانا چاہا مگر آپ نے اس کو بھی قبول نہ کیا۔ مفسر ۳۱۰ھ کو فوت ہوئے۔

یہ ساری تفسیر بالماثور ہے جیسا کہ مفسر نے اپنی تفسیر کی سند بیان کرتے ہوئے فرمایا:

حدثنا أبو كريب قال حدثنا طلق بن غنم عن عثمان المكي عن ابن أبي مليكة قال رأيت مجاهداً يسأل ابن عباس عن تفسير القرآن و معه ألواح فيقول

له ابن عباس اكتب حتى سأله عن التفسير كله۔ (ابن جریر جلد ۱ ص ۳۰)

طباعت سے قبل اس تفسیر کے صرف تین نسخے معلوم تھے۔ ایک قلمی نسخہ مفسر کی رحلت سے چار سال قبل یعنی ۳۰۶ھ کا لکھا ہوا مفسر کا صدقہ، سمو ہے۔ یہ نسخہ امرا نجد آل رشید کے کتب خانہ میں محفوظ تھا۔ اسی سے نقل کر کے مصر کے مطبع میں منہ سے پہلی مرتبہ ۱۳۲۱ھ/ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔

دوسرا نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ تیسرا نسخہ کتب خانہ مولانا مولوی رفیع الدین مرحوم نے مدینہ منورہ سے نقل کیا تھا۔ مولانا رفیع الدین کا کتب خانہ شکرانوالہ ضلع پٹنہ صوبہ بہار بھارت میں ہے۔

اس طویل ترین تفسیر کا اختصار ابوبکی بن محمد صمداح (م ۴۱۹ھ) نے کیا۔ جو صرف ۲۴۲ اوراق میں ہے۔ اس طرح ابوبکر بن الأشید نے بھی اس کا اختصار کیا ہے۔ اس تفسیر کا فارسی زبان میں ترجمہ منصور بن نوح سامانی (م ۳۵۰ھ) کے لئے کیا گیا تھا جس کا نام تفسیر منصور یہ تھا۔ بقول بروکن کے اس کا ترجمہ ترکی زبان میں بھی ہوا۔ دارالعلوم دیوبند کا ایک تجارتی کتب خانہ اس کا اردو میں بھی ترجمہ کر رہا ہے۔ منصور بن نوح کا فارسی ترجمہ ۷ جلدوں میں ۱۳۳۲ھ میں تہران سے شائع ہو چکا ہے۔ اس تفسیر کو جو عظیم قبولیت حاصل ہوئی اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ محدث کبیر امام حاکم نے کہا ہے کہ مجھ سے ابوبکر بن بابویہ نے بیان کیا کہ محدث کبیر ابن خزیمہ نے یہ تفسیر سات سالوں (۲۸۳ تا ۲۹۰ھ) میں نقل کی۔

۲۔ امام نووی نے کہا ہے کہ سب امت کا اس پر اتفاق ہے کہ آج تک ایسی جامع تفسیر نہیں لکھی گئی۔

۳۔ امام ابن تیمیہ نے کہا ہے کہ ابن جریر کی تفسیر سند کے اعتبار سے بھی دوسری تفاسیر سے افضل ہے۔

۴۔ ابو حامد اسفرائینی نے کہا ہے کہ اگر اس تفسیر کو حاصل کرنے کے لئے چین تک سفر کرنا پڑے تب بھی یہ سودا مہنگا نہیں۔

۵۔ دور حاضر کے جلیل القدر مفتی عبدہ نے کہا ہے کہ ابن جریر اپنی تفسیر میں صرف حدیث مرفوعہ ہی نقل کرتے ہیں۔

۶۔ دور حاضر کے مستشرقوں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ یہ تفسیر دوسری تفاسیر سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ (تذکرۃ المفسرین ص ۶۲-۶۳۔ مطبوعہ دارالارشاد۔ ٹک ۱۴۰۱ھ)

زیر نظر کتاب ”امام طبری --- کون...؟“ کے مکمل مطالعہ کے بعد قارئین امام طبری کی حیات و خدمات سے بخوبی آگاہ ہو جائیں گے۔ تاہم یہاں حضرت موصوف نے نمبر ایک کے تحت جو معلومات فراہم کی ہیں وہ بالکل ہی خلاف واقع ہیں۔ جس کی تفصیل اسی بحث میں آگے آرہی ہے۔ امام حاکم بھی شیعہ ہے اور ابو بکر بن بابویہ بھی شیعہ ہے جبکہ ابن خزیمہ محدث نے تو (۲۸۳ھ تا ۲۹۰ھ میں) یہ تفسیر ہرگز نقل نہیں کی۔

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب رقم طراز ہیں کہ:

”علامہ طبری اور منچے درجے کے مفسر، محدث اور مؤرخ ہیں۔ بعض حضرات نے ان پر شیعہ ہونے کا الزام عائد کیا لیکن محققین نے اس الزام کی تردید کی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اہل سنت کے جلیل القدر عالم ہیں بلکہ ان کا شمار ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے۔

ان کی تفسیر ۳۰ جلدوں میں ہے اور بعد کی تفاسیر کے لئے بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال نقل کرتے ہیں اور پھر جو قول ان کے نزدیک راجح ہوتا ہے اسے دلائل کے ذریعے ثابت کرتے ہیں۔ البتہ ان کی تفسیر میں صحیح و سقیم ہر طرح کی روایات جمع ہو گئی ہیں اس لئے ان کی بیان کی ہوئی ہر روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

دراصل اس تفسیر سے ان کا مقصد یہ تھا کہ تفسیر قرآن کے بارے میں جس قدر روایات انہیں دستیاب ہوئیں ان سب کو جمع کر دیا جائے تاکہ اس جمع شدہ مواد سے کام لیا جاسکے۔ البتہ انہوں نے ہر روایت کے ساتھ اس کی سند بھی ذکر کی ہے تاکہ جو شخص چاہے راویوں کی تحقیق کر کے روایت کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکے۔“ (معارف القرآن جلد اول ص ۵۶، تحت ”مقدمہ“)

موصوف نے یہاں جمہور علماء کی ”تقلید“ میں امام طبری کی قابل اعتراض باتوں کے

بارے میں یہ موقف اپنایا ہے کہ طبری روایت کے ساتھ سند لکھ کر اس کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے ہیں اور انہوں نے نقد و جرح کی تمام تر ذمہ داری قارئین پر ڈال دی ہے اگر وہ چاہیں تو خود راوی کی چھان پھٹک کر کے روایت کے صحیح یا ضعیف یا موضوع ہونے کا فیصلہ کر دیں۔

یہ موقف قرآن و حدیث کے خلاف ہونے کی بناء پر کسی طور پر بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا اس کی تفصیل پیچھے زیر عنوان ”بلا تحقیق نقل روایت کا شرعی حکم“ گذر چکی ہے۔ قرآن مجید تو ”خبر“ کی تحقیق کا حکم دیتا ہے چاہے وہ انفرادی معاملات سے متعلق ہو یا اجتماعی معاملات سے مگر جب خبر کلام الہی کی غلط تفسیر یا انبیائے کرام اور صحابہ عظام کی توہین و تنقیص سے متعلق ہو تو روایت کی تحقیق میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور اس موقع پر محض سند کے لکھ دینے سے مؤلف کو عند اللہ بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا؟

دوسری بات یہ ہے کہ امام طبری نے خود بھی اپنے آپ کو محض ”سند“ تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنی تفسیر سے بعض اسناد پر نقد و تبصرہ کر کے قابل اعتبار روایات کو رد بھی کیا ہے۔ کیا انبیائے عظام اور صحابہ کرام اس قابل نہ تھے کہ ان سے متعلق توہین آمیز واقعات کو اول تو نقل ہی نہ کیا جاتا اور اگر کوئی ایسی ضرورت یا مجبوری لاحق ہو بھی گئی تھی تو پھر ان اسناد پر بھی بحث کر کے قارئین کو گمراہی اور غلط فہمی کا شکار ہونے سے بچالیا جاتا۔ اس سے کم از کم یہ فائدہ ضرور حاصل ہوتا کہ گستاخان رسول اور دشمنان صحابہ طبری کی تفسیر و تاریخ سے انبیائے کرام اور صحابہ عظام کے خلاف توہین آمیز مواد حاصل کر کے ان کی شان میں مزید گستاخی اور توہین کا ارتکاب تو نہ کرتے۔

علاوہ ازیں امام طبری آیات کی تفسیر میں سند خود کعب الاحبار، وہب بن منبہ، ابن جریج، سدی، محمد بن اسحاق، مقاتل بن سلیمان، عطیہ بن عوفی، عبد الرحمن بن زید بن اسلم، محمد بن حمید رازی، سلمہ بن فضل الابرش اور وائدی و امثالہم سے بکثرت روایات اور واقعات نقل کرتے ہیں جنہیں ائمہ رجال نے وضاع، کذاب، شیعہ اور ساقط الاعتبار قرار دیا ہے۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب بعض ضعیف راویوں کے حالات بیان کر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

”یہ وہ حضرات ہیں جن کے حوالے تفسیر میں انتہائی کثرت سے آئے ہیں اور اگر یہ کہا

جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ بعد کی تمام تفاسیر کا بنیادی مآخذ یہی حضرات ہیں اور بیشتر تفاسیر ان ہی کی روایات اور اقوال کے گرد گھومتی ہیں۔ اس لئے ان حضرات کے احوال معلوم ہونے سے ان شاء اللہ ان تمام تفاسیر کے مطالعے میں بصیرت پیدا ہوگی جنہوں نے تفسیر بالروایت کا اہتمام کیا ہے مثلاً تفسیر ابن جریر، تفسیر الدر المنثور، تفسیر ابن کثیر وغیرہ۔“ (علوم القرآن ص ۵۰۰) اس طرح تفسیر طبری سے براہ راست استفادہ عام ”قاری“ کے بس کی بات تو بالکل نہیں رہی بلکہ کتب اسماء الرجال سے محروم ایک عالم دین کے لئے بھی راویوں کی چھان پھٹک کے بغیر اس سے ”خذواستنباط“ مشکل ہو گیا ہے۔

تفسیر طبری اور الدر المنثور میں تو پھر بھی اسناد کا ذکر پایا جاتا ہے لیکن جن مفسرین و مؤرخین نے اسناد حذف کر کے طبری کی ”تفسیر و تاریخ“ سے اسرائیلیات اور ضعیف و موضوع روایات کو اپنی کتب میں سمو دیا ہے ان سے استفادے کی آخر کیا صورت ہوگی؟

پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد غازی رقم طراز ہیں کہ:

”ان جامع تفسیروں میں سب سے قابل ذکر اور قدیم ترین جامع تفسیر... امام طبری کی جامع البیان فی تفسیر القرآن ہے۔ پہلے انہوں نے ایک بہت جامع اور مبسوط تفسیر لکھی تھی جس کے بارے میں مؤرخین کا بیان ہے کہ وہ تیس ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔ جب امام طبری اس طویل اور مبسوط تفسیر کو لکھ کر مکمل کر چکے تو انہیں خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ لوگوں کے لئے اتنی مفصل تفسیر پڑھنا مشکل ہو جائے اس لئے ضروری ہے کہ میں ایک مختصر تفسیر تیار کروں چنانچہ انہوں نے ایک نسبتاً مختصر تفسیر تیار کی جو آج تفسیر طبری کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ تفسیر ۳۰ جلدوں میں ہے اور تقریباً ایک پارہ ایک جلد میں...“

مفسر و مؤرخ ہونے کے ساتھ ساتھ امام طبری ایک بہت بڑے فقیہ بھی تھے اور ایک بہت بڑے فقہی مسلک کے بانی بھی جیسے امام مالک، امام احمد وغیرہ۔ امام شافعی کے تلامذہ سے ان کا تعلق تھا۔

امام طبری اس اعتبار سے بہت نمایاں ہیں کہ وہ علم قانون کی ایک خاص شاخ یا شعبہ یعنی ”دنیا کے قوانین اور اصول ہائے قوانین کا تقابلی مطالعہ“ کے موجد اور مدون اول ہیں...

امام طبری کی یہ تفسیر بہت جامع ہے اور ۳۰ جلدوں میں ہے۔ اس کی ایک خاص بات جس نے اس تفسیر کو بقیہ تمام تفاسیر کے لئے ایک مرجع اور مآخذ کی شکل دے دی ہے یہ ہے کہ صحابہؓ اور تابعینؒ کے ذریعہ سے جتنا مواد بھی آیا تھا اور امام طبری تک پہنچا تھا اس سارے مواد کو انہوں نے اس کتاب میں سمو دیا... اس اعتبار سے یہ کتاب بہت منفرد ہے کہ اگر ہمارے پاس صرف یہی ایک کتاب ہوتی تو صدر اول کے تفسیری سرمایہ کے لئے کسی اور کتاب کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ پڑتی اس لئے کہ صحابہؓ اور تابعینؒ کی تمام اہم تفسیری روایات اس کتاب سے مل سکتی ہیں۔

دوسرا کام انہوں نے یہ کیا ہے کہ ہر روایت کی پوری سند بیان کی ہے اور شروع میں ہی یہ واضح کر دیا ہے کہ:

میں نے ہر روایت کی سند نقل کر دی۔ اب یہ پڑھنے والوں کا کام ہے کہ وہ جانچ کر دیکھیں کہ کون سی سند کس درجہ کی ہے؟... یہ بات میں نے اس لئے بیان کرنی ضروری سمجھی کہ محض تفسیر طبری میں لکھی دیکھ کر کسی چیز کو سو فی صد رسول خدا کی طرف منسوب کرنا مناسب نہیں ہے جب تک ہر روایت کا الگ سے فی طور پر داخلی اور خارجی شواہد کی بناء پر جائزہ نہ لے لیا جائے اور محدثین کے اصولوں کی روشنی میں اس کو پرکھ نہ لیا جائے اس وقت تک کسی چیز کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے نہ کی جائے...

امام ابن جریر طبری کی یہ تفسیر اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ انہوں نے اس میں جہاں تفسیری روایات جمع کی ہیں وہاں لغت اور کلام کے مباحث بھی بیان کئے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود علم قرأت کے امام بھی تھے لہذا جہاں جہاں قرأت میں فرق ہے وہ بھی انہوں نے بیان کیا ہے۔ ابن جریر طبری کی اس تفسیر کے بعد بہت سی تفاسیر لکھی گئیں ان تفاسیر کی تدوین میں اہل علم اور مفسرین نے علامہ ابن جریر کی تفسیر میں بیان کردہ مواد سے خوب کام لیا اور ان کے اسلوب کی پیروی کی۔ (محاضرات قرآنی ص ۲۰۶-۲۰۸)

موصوف آگے چل کر ”مفسرین قرآن کے تفسیری مناج“ کے تحت لکھتے ہیں کہ:

تفسیر بالماثور کا سب سے بڑا مآخذ قدیم ترین تفاسیر میں تفسیر طبری ہے۔ اس میں صحابہ کرامؓ سے آئی ہوئی تمام روایات کو جمع کیا گیا اور محفوظ کر دیا گیا۔ تفسیر طبری میں اسرائیلیات بھی اچھی خاصی تعداد میں شامل ہیں لیکن یہ وہ اسرائیلیات ہیں جن کے بارے میں امام طبری کا خیال تھا کہ وہ قابل قبول ہیں اور ان روایات میں کوئی چیز قابل اعتراض نہیں ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ امام طبری کی ذاتی رائے تھی جس سے بعد میں آنے والے بہت سے لوگوں نے اتفاق بھی کیا اور بہت سوں نے اختلاف بھی کیا۔ جس طرح امام طبری کو اسرائیلیات کے بارے میں ایک رائے قائم کرنے کا حق تھا۔ اسی طرح بعد والوں کو بھی حق تھا کہ اپنی تحقیق کے مطابق رائے قائم کریں (حوالہ مذکور ص ۲۳۳-۲۳۴)

مفکر اسلام ڈاکٹر علامہ خالد محمود پٹی ایچ ڈی فرماتے ہیں کہ:

”... قدماء میں سب سے پرانی تفسیر کون سی ہے؟ تفسیر طبری، ابن جریر تو یہ سب سے پہلی تفسیروں میں سے ہے، جس نے قرآن کی مکمل تفسیر لکھی، باقی اس کے بعد آنے والے اس سے مستفید ہوتے رہے، اس کا کام کیا ہے؟ کہ یہ تفسیر نہیں، بلکہ یہ حدیث کی کتاب ہے، کس طرح حدیث کی کتاب ہے؟ ہے تو قرآن کی تفسیر کے متعلق، لیکن حدیث کی کتاب یوں ہے کہ یہ بیان کرتے ہیں... حدیثی فلان، قال ابنی فلان... یہ کہہ کر جو صحابہ کرامؓ ہیں، یا صحابہ کرامؓ کے شاگرد ہیں، ان سے تفسیریں لاتے ہیں، تو یہ اصل میں امام حدیث ہوا، جب اس نے کہا کہ... حدیثی فلان... تو امام حدیث ہوا اور موضوع چونکہ اس کا تفسیر ہے، تو یہ تفسیر کا امام ہوا، اب یہ تفسیر کبیر، تفسیر رازی، جلالین کو یہ اعزاز کسی اور کو حاصل نہیں، کیوں؟ یہ محدث ہے، اور سند لاتا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال نقل کرتا ہے تو ابن جریر معتبر آئندہ حدیث میں سے ہے۔“ (مناظرے اور مباحثے ص ۳۵۴-۳۵۵۔ مرتبہ ابن یونس، مکتبہ سید احمد شہید۔ شاعت مئی ۲۰۱۰ء)

اس تفصیل سے امام طبری اور ان کی تفسیر کا بلند علمی مقام خوب واضح ہو گیا ہے لیکن یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امام طبری اگر فی الواقع اتنے ہی بڑے مؤرخ، فقیہ، مفسر اور محدث

تھے تو پھر انہوں نے لوگوں کے احتجاج کی بناء پر ”خلوت نشینی“ کیوں اختیار کر لی تھی؟ نیز اس وقت کے مسلمانوں نے انہیں عام مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیوں نہ ہونے دیا تھا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ ان کے ہم عصر جامعین صحاح ستہ اور دیگر محدثین نے ان سے روایات کیوں قبول نہیں کیں؟ حالانکہ امام بخاری کی وفات (۲۵۶ھ) کے وقت امام طبری ۳۲ برس، امام مسلم کی وفات (۲۶۱ھ) کے وقت ۳۷ برس، امام ابن ماجہ کی وفات (۲۴۳ھ) کے وقت ۴۹ برس، امام ابوداؤد کی وفات (۲۴۵ھ) کے وقت ۵۱ برس، امام ابوعبسیٰ ترمذی کی وفات (۲۷۹ھ) کے وقت ۵۵ برس، امام نسائی کی وفات (۳۰۳ھ) کے وقت ۷۹ برس کے تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ صحاح ستہ کی کسی کتاب میں طبری کی کوئی روایت نہیں ہے۔ اسی طرح دیگر محدثین امام دارمی، امام دارقطنی وغیرہ نے بھی ان کے ساتھ یہی ”سلوک“ کیا۔

امام ذہبی اور حافظ ابن حجر عسقلانی اور دیگر علماء نے امام طبری کی علمیت اور ثقافت پر امام ابن خزیمہ کے اس قول سے استدلال کیا ہے کہ ”ما اعلم علی اذیم الأرض اعلم من ابن جریر“ میں اس وقت روئے زمین پر ان سے بڑے کسی عالم کو نہیں جانتا۔ یہ ”بات“ ابن خزیمہ سے کس نے سنی یا نقل کی تھی؟ تمام علماء نے اس سلسلہ میں ابن خالویہ کا حوالہ دیا ہے۔ خود حافظ ابن حجر ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

”كان إمامياً عالمياً بالمنهج... وقد قرأ أبو الحسين النصيبی و هم من الامامية عليه كتابه في الامامة... مات بحلب سنة إحدى و سبعين و ثلاث مائة و قيل في التي قبلها۔“ (لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۶۷)

”حسین بن احمد خالویہ انجو ی اہمدانی۔ شیعہ امامیہ تھے، اس مذہب کے عالم تھے اور ابو الحسن النصیبی نے جو شیعہ امامیہ تھے ان سے ان کی وہ کتاب پر بھی تھی جس کو انہوں نے مسئلہ امامت پر لکھا تھا۔ ان کی وفات حلب میں ۳۷۱ھ میں ہوئی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے کچھ پہلے واقع ہوئی“ اس سے معلوم ہوا کہ ایک شیعہ امامی ابن خالویہ (م ۳۷۱ھ) نے اس قول کو حضرت ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ) جو امام طبری کے صرف ایک سال بعد فوت ہوئے تھے کی طرف منسوب کیا تھا۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ابن خزیمہ خود بھی ایک فقیہ، مجتہد، محدث اور نیشاپور کے امام تھے۔ امام طبری سے ایک سال پہلے ۲۲۳ھ میں پیدا ہوئے اور ان سے ایک سال بعد ۳۱۱ھ میں فوت ہوئے۔ انہوں نے طلب علم کے لئے شام، مصر، جزیرہ اور عراق کا بھی سفر کیا وہ ابن خالویہ (م ۳۷۱) کی بہ نسبت زیادہ امام طبری کو جانتے تھے اور بغداد کے ایک سفر میں ان کے ہم سفر بھی رہے تھے۔ یہاں ایک اہم سوال یہ بھی قابل غور ہے کہ امام ابن خزیمہ نے ابن خالویہ سے کس دور میں تفسیر طبری مستعار لی تھی؟

حافظ ابن حجر کی تصریح کے مطابق ابن خالویہ نے امام طبری سے یہ تفسیر سات سال کے عرصہ میں ۲۸۳ھ سے ۲۹۰ھ تک املا لکھی ہے۔ یعنی انہوں نے تفسیر لکھنے کا آغاز ۲۸۳ھ میں کیا تھا لیکن اس وقت ابن خالویہ کی اپنی عمر کتنی تھی؟ ائمہ رجال نے ابن خالویہ کا سال ولادت نہیں لکھا جب کہ سال وفات ۳۷۱ھ بتایا ہے۔ اس طرح تفسیر لکھنے کے وقت سے وفات تک ان کی عمر ۸۸/۸۹ سال بنتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ پیدائش کے سال ہی انہوں نے لکھنا شروع نہیں کیا ہوگا۔ اگر ابن خالویہ نے ۲۰ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا ہو تو ان کا سال ولادت ۲۶۳ھ متعین ہوتا ہے۔ اس حساب سے ۳۷۱ھ میں ان کی عمر ۱۰۸ سال بن جاتی ہے معلوم نہیں ابن خالویہ ۲۸۳ھ میں یعنی تفسیر لکھنے کے وقت پیدا بھی ہوئے تھے یا نہیں؟ اگر پیدا ہو بھی گئے ہوں تو کیا اس وقت ان میں تفسیر لکھنے یا سمجھنے کی استعداد بھی پیدا ہوئی تھی یا نہیں؟ ابن خالویہ نے بقول حافظ ابن حجر ۲۸۳ھ تا ۲۹۰ھ سات سال کے عرصہ میں امام طبری سے یہ تفسیر لکھی تھی۔ ظاہر ہے کہ ابن خزیمہ نے ابن خالویہ سے یہ تفسیر ۲۹۰ھ کے بعد امام طبری کی زندگی میں ہی مستعار لی ہوگی اور کئی سال کے مطالعہ کے بعد اپنی وفات ۳۱۱ھ سے پہلے انہیں واپس لوٹائی ہوگی۔ اس طرح ابن خالویہ سے ابن خزیمہ کا تفسیر مستعار لینا پھر کئی سال کے مطالعہ کے بعد اس تبصرہ کے ساتھ واپس کرنا کہ ”روئے زمین پر میں نے ان سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا“ ایک ”معمر“ بن جاتا ہے جو نہ سمجھنے کا ہے اور نہ سمجھانے کا۔ زیادہ سے زیادہ اسے ایک ”قیاسی قول“ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

حافظ ابن حجر کی تصریح سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ابن خالویہ نے ۲۸۳ھ میں بغداد میں تفسیر لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ اس پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ تحصیل علم کے لئے اس سال بغداد آئے تھے۔ ابن خالویہ کے حالات میں اس بات کا تذکرہ نہیں ملتا کہ وہ ۲۸۳ھ میں بغداد آئے تھے۔ البتہ امام سیوطی نے لکھا ہے کہ ابن خالویہ (امام طبری کی وفات کے چار سال بعد) ۳۱۲ھ میں طلب علم کے لئے بغداد آئے تھے۔ ملاحظہ ہو ”بغیۃ الوعاة فی طبقات اللغویین والنحاة“ جلد نمبر ۱ ص ۳۲۷۔ جمعہ نمبر ۱۰۹۹۔ محقق مصطفیٰ عبدالقادر عطا مصری نے اس کے ذیل میں دو مزید حوالے دیئے ہیں: ”انباء الرواة“ جلد نمبر ۱ ص ۳۲۵، ”مجموع الادب“ جلد ۸ ص ۲۰۰۔

امام سیوطی کے قول کے مطابق ابن خالویہ ۳۱۲ھ میں تحصیل علم کے لئے بغداد آئے تھے۔ اگر اس وقت ان کی عمر ۲۰ سال بھی فرض کر لی جائے (جو اپنے وطن سے باہر جانے کے لئے مناسب عمر ہے) تو اس وقت سن ولادت ۲۹۲ھ متعین ہوتا ہے جبکہ حافظ ابن حجر کے قول کے مطابق انہوں نے اس سے بھی چار سال پہلے ۲۹۰ھ میں تفسیر مکمل طور پر لکھ لی تھی۔ اس سے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابن خالویہ نے اپنی پیدائش سے بھی چار سال پہلے تفسیر مکمل طور پر لکھ لی تھی جبکہ لکھنے کا آغاز اس سے بھی سات سال قبل کیا تھا۔

اس تفصیل سے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شیعہ امامی ابن خالویہ (م ۳۷۱ھ) نے اپنے ”ہم مسلک“ امام ابن جریر طبری (۳۱۰ھ) کی حمایت میں ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ) کی طرف یہ جھوٹا قول منسوب کر دیا تھا۔ اور یہ بات چنداں باعث تعجب نہیں ہے کہ شیعہ راویوں کا ہمیشہ سے یہ معمول چلا آ رہا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی، امام طبری کی مہارت قرأت کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ: ”وقال أبو علی الطوماری: کنت مع أبي بكر بن مجاهد في رمضان، فسمع قراءة ابن جرير، فقال: ما ظننت أن الله تعالى خلق بشرا أحسن منه يقرأ هذه القراءة“ (لسان أمير ان جلد ۵ ص ۱۰۲) ابو علی طوماری نے کہا کہ میں ایک رمضان میں ابو بکر بن مجاہد کے ساتھ تھا کہ انہوں نے ابن جریر طبری کی ایک قرأت سنی تو انہوں نے کہا کہ میرا نہیں گمان کہ اس قرأت میں

ابن جریر سے زیادہ اچھا پڑھنے والا کوئی انسان اللہ نے پیدا کیا ہو۔

حالانکہ ابوعلی طوماری کے متعلق خود ابن جریر یہ فرما چکے ہیں کہ:

”تکلم فیہ لکونہ روی من غیر اصل، وقال ابن ماکولا: لم یکنوا یرتضونہ“

اگر بالفرض طوماری کا یہ قول صحیح بھی ہو تو جس قرأت کے موجد امام طبری خود ہوں تو بھلا اس خاص قرأت میں ان سے بہتر پڑھنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

حافظ ابن حجر کے بقول ابوعلی طوماری ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے جو ایک ”کارنامہ“ یہ سرانجام دے چکے ہیں کہ اپنی پیدائش سے بھی ۳۲ سال پہلے وفات پا جانے والے ”بشار بن موسیٰ/بشر بن موسیٰ (م ۲۲۸ھ) سے ((عالم ارواح میں) بلا واسطہ روایت کر چکے ہیں۔

ابوعلی طوماری کا یہ قول کہ ”اللہ نے اس قرأت میں طبری سے اچھا پڑھنے والا کوئی انسان پیدا ہی نہیں کیا“ یقیناً چونکا دینے والا ہے۔ اگر یہ قول کسی حد تک بھی صحیح ہوتا تو یقیناً طبری کا نام مشہور قراء میں سرفہرست ہوتا مگر اس کے برعکس وہ علم قرأت میں نہ تو مشہور سات قراء میں شامل ہیں، نہ ان کا نام دس قراء میں ملتا ہے اور نہ ہی شاذ قرأتوں سمیت چودہ قراء میں کہیں نظر آتا ہے جبکہ چودہویں نمبر پر بغدادی کے رہنے والے ایک قاری ابو الفرج محمد بن احمد ہنبوزی (م ۳۸۸ھ) کو شامل کیا گیا ہے۔

حالانکہ امام طبری نے ”علم القراءت“ پر ۸ جلدوں میں ایک مستقل اور ضخیم کتاب بھی مرتب کی تھی جس میں تمام مشہور اور شاذ قرأتیں جمع کر دی گئیں۔ یہ کتاب آج اگرچہ ان کی دیگر بعض کتب کی طرح ”ناہود“ ہے تاہم انہوں نے اپنی تفسیر میں مختلف مقامات پر مشہور اور شاذ قرأتوں کو سمودیا ہے۔ جس کی وجہ سے امت اس حوالہ سے بھی اختلاف کا شکار ہو گئی۔

امام طبری کے نظریہ کے مطابق ”سبعہ احرف“ سے مراد قبائل عرب کی سات لغات ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک قرآن کریم ان ساتوں حروف پر پڑھا جاتا تھا لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب اسلام دور دراز ممالک تک پھیلا تو ان حروف سبعہ کی حقیقت نہ جاننے کی وجہ سے لوگوں میں جھگڑے ہونے لگے۔ مختلف لوگ مختلف حروف پر قرآن کریم کی تلاوت کرتے اور

ایک دوسرے کی تلاوت کو غلط ٹھہراتے تھے اس فتنہ کے انسداد کے لئے حضرت عثمانؓ نے صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے پوری امت کو صرف ایک حرف یعنی لغت قریش کے مطابق سات مصاحف مرتب فرما کر مختلف صوبوں میں بھیج دیئے اور باقی تمام مصاحف کو نذر آتش کر دیا تا کہ کوئی اختلاف پیدا نہ ہو سکے لہذا اب صرف لغت قریش کا ”حرف“ باقی رہ گیا ہے اور باقی چھ حروف محفوظ نہیں رہے اور قرأتوں کا جو اختلاف آج تک باقی چلا آتا ہے وہ اسی ایک حرف قریش کی ادائیگی کے مختلف طریقے ہیں۔ ملاحظہ ہو: تفسیر جامع البیان فی تویل القرآن جلد ۱ ص ۱۵۔ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ابن جریر کے مذکورہ نظریہ ”سبعہ احرف“ کا مدلل رد پیش کر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

”حقیقت یہ ہے کہ حافظ ابن جریر کے قول پر ”حروف سبعہ“ اور ”قراءت“ کے بارے میں صحابہ کرام کی طرف ایسی حیرت انگیز دو عملی منسوب کرنی پڑتی ہے جس کی کوئی معقول توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔

پھر حضرت عثمانؓ اور دوسرے صحابہ کرام کی طرف اتنے بڑے اقدام کی نسبت کسی صریح اور صحیح روایت کی بنا پر نہیں بلکہ بعض مجمل الفاظ کی قیاسی تخریج کے ذریعہ کی گئی ہے۔ جن روایات میں حضرت عثمانؓ کے جمع قرآن کا واقعہ بیان ہوا ہے اس میں اس بات کی کوئی صراحت نہیں ہے کہ انہوں نے چھ حروف کو ختم فرما دیا تھا بلکہ اس کے خلاف دلیلیں موجود ہیں جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

اب کسی صحیح اور صریح روایت کے بغیر یہ کہنا کیسے ممکن ہے کہ صحابہ کرامؓ نے ان چھ حروف کو بالکل بے نشان کر دینا کوارا کر لیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار فرمائش پر بذریعہ وحی نازل ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن صحابہ کرامؓ کو جمع وترتیب قرآن کے نیک کام میں محض اس لئے شامل رہا ہو کہ یہ کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، جنہوں نے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو محفوظ رکھنے میں اپنی عمریں کھپائی ہوں اور جنہوں نے منسوخ التلاوت آیات تک کو محفوظ کر کے امت تک پہنچایا ہو، ان سے یہ بات بے انتہاء بعید ہے کہ وہ سب کے سب چھ حروف کو ختم کرنے پر اس طرح متفق ہو جائیں کہ آج ان حروف کا کوئی نام و نشان تک باقی نہ

رہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر محقق علماء نے حافظ ابن جریر طبری کے اس قول کی تردید فرمائی ہے۔“
(علوم القرآن ص ۱۲۲ تحت ”حافظ ابن جریر کا نظریہ اور اس کی قباحیتیں“)

”سبعہ احرف سے متعلق امام طبری کے جس نظریہ کو موصوف نے صحابہ کرامؓ کی توہین و تنقیص“ قرار دیا ہے خود امام طبری اپنے اس نظریہ و موقف پر نہ صرف قائم رہے بلکہ انہوں نے اپنی اسی تفسیر میں معترضین کے اعتراضات کا مدلل رد بھی کیا ہے۔

کاش! حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب امام طبری کی تفسیر و تاریخ میں موجود ان روایات کو بھی زیر بحث لے آتے جن سے انبیاء کرام کی عصمت داغ دار ہوتی ہے یا جن میں صحابہ کرامؓ کی صریح توہین پائی جاتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ طبری کے تشبیح سے متعلق اپنے نقطہ نظر پر دوبارہ غور فرما کر ”رجوع“ کی سعادت حاصل کر لیتے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ امام طبری اپنے سیاسی و مذہبی رجحانات کی بناء پر اس قابل نہیں ہیں کہ دوسری شہادتوں کے بغیر ان کی بات کو جھٹ بٹایا جاسکے۔ وہ اپنے تمام فضل و کمال کے باوجود ”تشبیح“ میں مبتلا تھے اور بعض مقامات پر ”خلو“ کر کے ”رفض“ کی حدود میں بھی داخل ہو گئے ہیں، یہ تشبیح و رفض ان کی ”تاریخ الامم والملوک“ ہی میں نہیں بلکہ ان کی تفسیر ”جامع البیان فی تاویل القرآن“ میں بھی جگہ جگہ پھلتا ہے۔

تاریخ طبری کے حوالے سے صحابہ کرامؓ کی توہین و تنقیص پر مبنی روایات کی ایک جھلک پیچھے دکھائی جا چکی ہے اب تفسیر طبری کی منافی عصمت انبیاء چند روایات نذر قارئین کی جارہی ہیں مگر اس سے پہلے عقیدہ عصمت انبیاء پر ایک اجمالی بحث نظر قارئین کی جاتی ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں مدد ملے گی کہ امام طبری نے حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت یوسف، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور سید الانبیاء محمد مصطفیٰ علیہم السلام کے بارے میں جو روایات نقل کی ہیں وہ سراسر عقیدہ عصمت انبیاء کے منافی اور انبیاء کرام علیہم السلام کی توہین و تنقیص پر مبنی ہیں۔ *فلذا ما عندی واللہ أعلم بالصواب*۔

عقیدہ عصمت انبیاء علیہم السلام

لغت میں ”الْعِصْمَةُ وَالْعِصْمَةُ“ کے معنی ”محفوظ رکھنے، بچانے اور روکنے“ کے ہیں۔ قرآن مجید میں اسم فاعل کے طور پر ”عاصم“ کا لفظ آیا ہے:

”لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَجِمَ“ (سورہ ہود: ۴۳)

آج اللہ کے حکم (یعنی قہر و عذاب) سے بچانے والا کوئی نہیں لیکن جس پر وہی رحم کرے۔ اسی سے اس کا اسم مفعول ”معصوم“ ہے۔ جس کے معنی ہیں: روکا ہوا، بچایا ہوا، محفوظ رکھا ہوا۔ جبکہ اصطلاح شریعت میں ”عِصْمَةُ“ کے معنی: گناہوں سے بچانے کے ہیں اور ”معصوم“ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچاتا ہے اور اس سے کوئی گناہ صادر نہیں ہو سکتا۔ ”معصومیت“ کا اعزاز تمام انسانوں میں سے صرف انبیاء کرام کو حاصل ہے۔

بشریت و انسانیت کے اوصاف و کمالات کی سرحد ”معصومیت“ ہے جو بشریت کے کمال کی آخری ”حد“ بھی ہے اور بشریت کا یہ کمال صرف انبیاء کرام کو نصیب ہوتا ہے کہ وہ معصوم اور گناہوں سے پاک اور بے داغ ہوتے ہیں۔ نبی و رسول کے سوا کسی بھی انسان کو عصمت و بے گناہی کا یہ اعلیٰ ترین رتبہ اور درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

اہل سنت والجماعت کا اجماعی اور متفقہ عقیدہ ہے کہ انبیاء و رسل قبل از نبوت و رسالت بھی معصوم ہوتے ہیں یعنی وہ اپنی پہلی زندگی میں بھی گناہ نہیں کرتے اور بعد از نبوت و رسالت تو ان کی معصومیت مزید نمایاں ہے جس میں گناہ کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ وہ دنیا میں لوگوں کے لئے مقتدی، پیشوا اور نمونہ بنا کر بھیجے جاتے ہیں اگر نبی کی زندگی میں گناہ کا کوئی تصور ہو تو پھر اس کی زندگی نمونہ نہیں بن سکتی۔

مسئلہ عصمت قرآن کریم کی متعدد آیات سے ثابت ہے اور یہ انبیاء کرام کی ایسی مخصوص

صفت ہے جس میں کوئی فرد بشر شریک نہیں ہو سکتا۔ متحقق علماء، متکلمین، مجتہدین اور مفسرین نے اپنی تفاسیر اور کتب عقائد میں اس عقیدے کا واضح الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ انبیاء کرام نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد کبیرہ و صغیرہ گناہوں اور عیبوں بالخصوص صفات حبسیہ سے بھی ”عماہ ہوا، سر او جہرا“ پاک اور معصوم ہوتے ہیں۔ علامہ قرطبی نے تو جمہور علمائے امت کے جماعی عقیدہ عصمت انبیاء عن الکبائر والصغائر عماہ ہوا کو ائمہ مجتہدین کا مختار مذہب نقل فرمایا ہے:

”وقال جمهور من الفقهاء من أصحاب مالك و أبي حنيفة والشافعي: إنهم معصومون من الصغائر كلها كعصمتهم من الكبائر إجماعاً“ (تفسیر قرطبی جلد اول ص ۳۰۸)

تمام فقہاء مالکیہ، حنفیہ اور شافعیہ نے فرمایا ہے کہ انبیاء تمام صغیرہ گناہوں سے اس طرح معصوم ہیں جس طرح کبیرہ گناہوں سے پاک ہیں۔

اس مسئلہ پر امام رازی، علامہ سید محمد آلوسی، علامہ خازن، قاضی عیاض، امام خفاجی، حافظ ابن قیم، ملا علی قاری اور علامہ ابن حجر کی کتب تفاسیر اور تصانیف میں نہایت نفیس و لطیف محققانہ بحثیں موجود ہیں۔

حافظ ابن حزم اندلسی (م ۴۵۶ھ) منکرین عصمت کا مدلل رد کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں کہ:

انبیاء سے قطعاً کوئی گناہ بھی سرزد نہیں ہوتا۔ ابن ابی سرح کے واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک انصاری نے کہا تھا: ”هلا أو مات إلى“ آپ نے مجھے اشارہ کیوں نہ فرمادیا: تو نبی علیہ السلام نے فرمایا: ”کسی نبی کو یہ سزاوار نہیں کہ اس کی آنکھ خیانت کرے“ پس نبی علیہ السلام نے جملہ انبیاء سے دزدیدہ نگاہی کو مستبعد سمجھا حالانکہ دزدیدہ نگاہی نہایت خفیف گناہ اور ایک معمولی سا ظاہر کا باطن کے خلاف ہونا ہے۔ جب ایسا خفیف گناہ نبی کو سزاوار نہیں تو دیگر گناہوں سے نبی بالادلی پاک ہوگا۔ ہم مسلمان انبیاء کے جملہ افعال و کردار میں ان کی اتباع و اقتداء کے لئے مامور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ“ (الاحزاب: ۲۱)

”تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بہترین نمونہ ہے“

”أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهِدْهُمْ أَقْبَلَهُ“ (الانعام: ۹۰)

”یہ ہدایت یافتہ ہیں ان ہی کی ہدایت کی پیروی کیجئے“

لہذا واضح ہو گیا کہ اگر ”بفرض محال“ کسی نبی سے ارادۃ کوئی صغیرہ کبیرہ گناہ صادر ہونا ممکن ہو تو کو یا اللہ تعالیٰ نے ہمیں معاصی کی ترغیب و تحریض کی اور گناہ کی پیش کش کی۔ انبیاء سے ارادۃ گناہ کے سرزد ہونے کا اعتقاد صریح کفر ہے کیونکہ انبیاء کے جملہ ارادی افعال ”سرتا سر خیر اور حق ہی ہوتے ہیں۔ ذوالنور ہونے نے جب نبی علیہ السلام کو کہا اے محمد! عدل و انصاف سے کام لیجئے کیونکہ اس تقسیم سے اللہ کی رضا جوئی مقصود نہیں ہوتی تو آپ نے سخت تنبیہ اور سرزنش کی کہ میں خائن نہیں امین ہوں اور ارادۃ کوئی گناہ نہیں کر سکتا اور فرمایا: افسوس میں عدل نہ کروں تو اور کون کرے گا؟ اللہ تعالیٰ تو مجھے امین اور قابل اعتماد سمجھتا ہے اور تم مجھ پر اعتماد نہیں کر رہے۔

کاش مجھے معلوم ہوتا کہ منکرین عصمت کو انبیاء کے متعلق تبلیغ رسالت میں جھوٹ نہ بولنے سے کیوں کراطمینان ہوا؟ شاید انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نام پر جھوٹ کی تبلیغ کی ہو لہذا ممکن ہے انبیاء کے وہ افعال و کردار جن کو ہم اسوہ حسنہ سمجھتے ہیں وہ دراصل بے دینی، زندہ اور اللہ تعالیٰ کی معصیت ہوں۔ ہم نے رافضیوں اور منکرین عصمت سے بڑھ کر کسی کو دین کا دشمن اور اسلام کی بیخ میں کوشاں نہیں پایا۔ یہ دونوں ملعون فرقے دین میں تحریف کے قائل ہیں۔

(رسالہ عصمت انبیاء ص ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۶۔ مترجم مولانا ہدایت اللہ ندوی)

انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہیں:

”اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ (سورة الحج ۷۵)

اللہ چھانت لیتا ہے فرشتوں میں پیغام پہنچانے والے اور آدمیوں میں۔

جس طرح فرشتے معصوم ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم میں نافرمانی نہیں کرتے تو اسی طرح انبیاء بھی (جو فرشتوں سے افضل ہیں) اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے پیغمبروں کے دل اتنے پاک صاف ہوتے ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی

امام طبری --- کون؟

عقیدہ عصمت انبیاء علیہم السلام

نافرمانی اور گناہ کی طرف ادنیٰ سے ادنیٰ میلان بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

انبیائے کرام مستقل مطاع ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے، ان کی پیروی میں جنت اور مخالفت میں جہنم ملتی ہے۔ اس لئے انبیاء کرام اپنے افعال و اعمال میں بھی مطلقاً معصوم ہوتے ہیں۔ ان سے نہ کبیرہ گناہ سرزد ہوتا ہے اور نہ ہی صغیرہ۔ ان سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سرزد نہیں ہو سکتی اور ان کا مستقل اور مطلق مطاع ہونا ہی ان کی عصمت کی دلیل ہے۔

کیونکہ بالفرض اگر ان سے گناہ اور نافرمانی کا صدور ہو جائے تو پھر اس سے یہ لازم آئے گا کہ دوسرے انسان اس گناہ اور نافرمانی میں بھی ان کی اطاعت کریں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بہر حال ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے، ان کی زندگی کو دوسروں کے لئے اسوہ حسنہ قرار دیا ہے لیکن معصیت اور گناہ کی پیروی کا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں ہو سکتا لہذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انبیائے کرام ہر گناہ اور ہر معصیت سے بالکل معصوم ہوتے ہیں۔ معصیت و نافرمانی کا کوئی داغ ان کے دامن عصمت کو چھو بھی نہیں سکتا۔ جبکہ ”زالت“ (جس کا صدور انبیاء سے ممکن ہے) پر صغیرہ گناہ کا اطلاق بھی نہیں ہوتا اور جو محض ”ترک اولیٰ اور ترک افضل“ کے معنی میں مستعمل ہے۔

”زالت“ کے لغوی معنی ”پھسلنا“ یعنی لغزش ہے اور شرعی اصطلاح میں ”زالت“ اس لغزش کو کہتے ہیں جو بلا ارادہ سرزد ہو جائے جیسے کوئی مسافر چلتے ہوئے کچھڑ کی پیچھے سے پھسل جائے۔

علامہ تفتازانی انبیاء کرام سے صفائے صدور کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

”أما الصغائر فيجوز عمدا عند الجمهور خلافا للجبالي و اتباعه و يجوز سهواً بالاتفاق ألا ما يدل على الخسة كسرقة لقمة والتطليف بحبة لكن المحققين اشترطوا أن ينهوا عليه فينتهوا عنه لهذا كله بعد الوحي... (شرح العقائد ص ۱۰۲)

جہاں تک صفائے کمال کا تعلق ہے تو عمداً ان کا ارتکاب جمہور کے نزدیک جائز ہے برخلاف جہائی اور ان کے تابعین کے اور صفائے کمال کا ارتکاب سہواً تو بالاتفاق جائز ہے بجز ایسے صغیرہ کے جو

امام طبری --- کون؟

عقیدہ عصمت انبیاء علیہم السلام

خست اور گھٹیا پن پر دلالت کرے۔ جیسے ایک لقمہ چوری اور ایک دانہ پتول میں کمی کرنا لیکن محققین نے شرط لگائی ہے کہ وہ متنبہ کئے جائیں تو اس سے باز آجائیں اور یہ سب تفصیل و جی کے بعد۔۔۔

موصوف یہاں یہ فرما رہے ہیں کہ انبیائے کرام سے قبل از نبوت اور بعد از نبوت صفائے کمال کا صدور بالاتفاق جائز ہے مگر ایسے صفائے کمال کا صدور سہواً بھی نہ ہوگا جو کہ ذلت، رسوائی اور کمینہ پن پر دلالت کرتے ہوں۔ جبکہ محققین کا کہنا ہے کہ اس قسم کی صورت حال میں نبی کو اللہ کی طرف سے اطلاع ملتی ہے کہ یہ کام آپ کی شان کے لائق نہیں لہذا اس اطلاع سے نبی اس کام سے رک جاتا ہے۔

علامہ تفتازانی اس بحث کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

”فما نقل عن الأنبياء عليهم السلام مما يشعر بكذب أو معصية فما كان منقولاً بطريق الأحاد فمردود، وما كان بطريق التواتر فمضروب عن ظاهره إن أمكن، و إلا فمحمول على ترك الأولى أو كونه قبل البعثة“ (شرح العقائد ص ۱۰۲)

”انبیاء سے جو ایسی باتیں منقول ہیں جو کذب اور معصیت پر دلالت کرتی ہیں تو جو خبر واحد کے ذریعے منقول ہو وہ مردود ہے اور جو تواتر کے طریقے سے منقول ہو، اگر ممکن ہو تو اس کی تاویل کی جائے گی ورنہ ترک اولیٰ پر یا اس کے قبل البعث ہونے پر محمول ہوگا۔“

بہر حال انبیاء کے ارفع و اعلیٰ مقام اور منصب نبوت کے تقاضے کے پیش نظر صحیح بات یہی ہے کہ وہ صفائے کمال سے پاک ہوتے ہیں اور جن حضرات نے ان سے ”سہواً“ صفائے کمال کا صدور تسلیم بھی کیا ہے تو انہوں نے اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی تصریح کر دی ہے کہ ”سہواً“ صفائے کمال کا صدور کے باوجود ایسے صفائے کمال کا ہرگز صدور نہیں ہو سکتا جو ”ذلت، رسوائی، کمینہ پن اور گھٹیا پن“ پر دلالت کرتے ہوں۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہا روی فرماتے ہیں کہ:

عصمت نبی کے معنی:۔ خالق کائنات نے انسان کی تخلیق متناذقوتوں کے ساتھ

امام طبری --- کون؟

عقیدہ عصمت انبیاء علیہم السلام

فرمائی ہے۔ یعنی اس کو نیک و بد دونوں قسم کی قوتیں عطا کی گئی ہیں وہ گناہ بھی کر سکتا ہے اور نیکی بھی۔ وہ ارادہ بد کا بھی حامل ہے اور ارادہ خیر کا بھی اور یہی اس کے انسانی شرف کا طغرائے امتیاز ہے۔ ان متضاد قوتوں کے حامل ”انسان“ میں سے ”حضرت حق“ انسانی رشد و ہدایت اور وصول الی اللہ کے لئے کبھی کبھی کسی شخص کو چن لیتے ہیں اور اس کو اپنا رسول، نبی اور پیغمبر بنا لیتے ہیں اور اس سلسلہ کی آخری کڑی ذات اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اور جب یہ ہستی نبوت کے لئے چن لی جاتی ہے تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ عمل و ارادہ کی زندگی میں ہر قسم کے گناہ سے پاک اور ہمہ قسم کی مافرائیوں سے منزہ ہو۔ تاکہ پیغام الہی کے منصب میں خدا کی صحیح نیابت ادا کر سکے۔

اس طرح وہ ایک انسان اور بشر بھی ہے کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے اور اہل و عیال کی زندگی سے بھی وابستہ ہے اور وہ ہر قسم کے عملی اور ارادی گناہوں سے پاک بھی ہے کیونکہ وہ ہر قسم کی نیکی کے لئے ہادی و مرشد اور خدا کا نائب ہے اور اگرچہ دوسرے انسانوں کی طرح متضاد قوتوں کا حامل ضرور ہے لیکن عمل و ارادہ میں اس سے ہر قسم کی بدی کے ظہور کو ناممکن اور محال کر دیا گیا ہے تاکہ اس کا ہر ایک ارادہ، ہر ایک عمل اور ہر ایک قول غرض ہر ایک حرکت و سکون، کائنات کے لئے اسوہ اور نمونہ بن سکے البتہ بشریت و انسانیت سے متصف ہونے کی بناء پر سہو، نسیان اور لغزش کا امکان باقی رہتا اور کبھی کبھی عملی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے مگر فوراً ہی اس پر متنبہ کر دیا جاتا ہے اور وہ اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔

سہو اور نسیان تو اپنے مفہوم میں ظاہر ہے مگر زلّۃ (لغزش) کیا ہے؟ تو اس کا اطلاق ایسی حقیقت پر ہوتا ہے کہ جہاں نہ عمل اور کردار میں تہر و اور سرکشی کا دخل ہو اور نہ قصد و ارادہ کے ساتھ حکم کی خلاف ورزی کا اور ساتھ ہی وہ عمل اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے قبیح، بد اور شرمز بھی نہ ہو بلکہ ان تمام امور کے پیش نظر وہ اپنی ذات میں اگرچہ باہت اور جواز کا دجہ رکھتا ہو مگر کرنے والی ہستی کے شایان شان نہ ہو بلکہ اس کے عظیم رتبہ کے سامنے سبک اور ہلکا نظر آتا ہو۔ بایں ہمہ اس لئے عمل میں آگیا کہ عمل کرنے والے کی نگاہ میں اس کا اس

امام طبری --- کون؟

عقیدہ عصمت انبیاء علیہم السلام

طرح کرنا خدائے تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ تھا لیکن نبی پر چونکہ خدائے تعالیٰ کی مستقل حفاظت و نگرانی رہتی ہے اس لئے فوراً ہی اس کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ عمل تمہاری جلالت قدر اور عظمت مرتبہ کے شایان شان نہیں ہے اور قطعی غیر مناسب ہے۔ اسی فرق مراتب کو عربی کی اس مثل میں ظاہر کر دیا گیا ہے: ”حسنات الأبرار سیئات المقربین“ نیکوکار انسانوں کی عام خوبیاں مقربین بارگاہ الہی کے حق میں برائیاں ہوتی ہیں۔

مگر اس لئے کہ ایک مقرب بارگاہ الہی کو خدا کی مرضی کے سمجھنے میں بھی یہ لغزش کیوں پیش آئی؟ سہو اللہ یہ جاری ہے کہ وہ انبیاء و مرسلین کی اس قسم کی لغزش پر جب ان کو متنبہ کرتا ہے تو اول نہایت سخت اور بحرمانہ عمل کی حیثیت میں اس لغزش کا ذکر کرتا ہے مگر پھر کسی دوسرے مقام پر اس معاملے کی اصل حقیقت کو ظاہر کر کے نبی و رسول کے عمل کو لغزش ہی کی حد میں لے آتا اور ان کی جانب سے خود ہی معذرت کر دیتا ہے تاکہ کسی ملحد اور زندیق کو کسی بھی نبی و رسول کی جانب گناہ کے الزام کے لگانے کی بے جا جرأت نہ ہو سکے۔ اسی مجموعہ حقیقت کا نام ”عصمت انبیاء“ ہے اور یہی اسلامی عقائد میں سے ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ (قصص القرآن جلد اول ص ۴۴-۴۶)

اس بحث کے آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام کی عصمت سے متعلق اہل تشیع کا نظریہ بھی نذر قارئین کر دیا جائے:

اہل تشیع کا نظریہ عصمت

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں کہ:

”انہم معصومون عن الکفر قبل الوحی و بعدہ بالاجماع و کذا عن تعمد الکبار عند الجمہور خلافاً للحشویہ...“ (شرح العقائد ص ۱۰۲)

انبیائے کرام کفر سے بالاجماع معصوم ہیں وحی سے پہلے بھی اور وحی کے بعد بھی اسی طرح جمہور کے نزدیک کبار کا عہد ارتکاب کرنے سے بھی معصوم ہیں برخلاف حشویہ کے۔ یعنی ”حشویہ“ (جو روافض کی ایک شاخ ہے) فرقہ کے نزدیک انبیائے کرام سے قصداً بھی گناہ کبیرہ کا صدور ہو سکتا ہے۔

”حَشَوِيَّة“ یا ”حَشَوِيَّة“ (بفتح الحاء و سکون الشين و فتحها) اہل بدعت کا ایک فرقہ ہے جو ”تجسیم“ کا قائل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک جسم مانتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے۔ بعض نے اسے خراسان کے ایک گاؤں ”حشوۃ“ کی طرف منسوب کیا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: النبراس شرح لشرح العقائد ص ۴۵۲۔

اسی طرح روافض کی ایک دوسری شاخ ”ہشامیہ“ ہے۔ یہ لوگ ائمہ کی معصومیت کے تو قائل ہیں مگر انبیاء سے گناہوں کا صدور تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ عبدالقادر البغدادی لکھتے ہیں کہ:

”وقالوا بعصمة الأنبياء عن الذنوب و تأولوا ما روى عنهم من زلاتهم على أنها كانت قبل النبوة، على خلاف قول من أجاز عليهم الصغائر، و خلاف قول الهشامية من الروافض الذين أجازوا عليهم الذنوب مع قولهم بعصمة الامام من الذنوب۔“ (الْفَرَقُ بَيْنَ الْفِرَقِ ۳۴۲ دارالباز مكة المكرمة)

علامہ تفتازانی اہل تشیع کا نظریہ عصمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”و منعت الشيعة صدور الصغيرة والكبيرة قبل الوحی و بعده لكنهم جوزوا إظهار الكفر تقيّة“ (شرح العقائد ص ۱۰۲)

اور فرقہ شیعہ نے بھی اہل سنت والجماعت کی طرح بظاہر وحی سے پہلے اور وحی کے بعد انبیاء کرام سے سہوایا عدا صغیرہ و کبیرہ کے صدور کا انکار کیا مگر ازراہ ”تقیّة“ اظہار کفر کو جائز قرار دیا۔

علامہ عبدالعزیز فرہاروی (م ۱۲۳۷ھ) ”لکنہم جوزوا إظهار الكفر تقيّة“ کے تحت لکھتے ہیں کہ:

”إشارة إلى حماقتهم في الإفراط والتفريط حتى لم يجوزوا الصغيرة قبل الوحی ولو سهواً وجوزوا إظهار الكفر قبل النبوة تقيّة أي خوفاً من الأعداء...“ (النبراس شرح لشرح العقائد ص ۴۵۳)

اہل تشیع کی حماقت ملاحظہ ہو کہ ایک طرف تو وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انبیاء کرام سے قبل از نبوت سہوایا بھی صغیرہ گناہ صادر نہیں ہوتا دوسری طرف وہ ان سے قبل از نبوت تقیّة یعنی دشمن کے خوف سے کفر کے اظہار کو بھی درست تسلیم کرتے ہیں۔

حالانکہ یہ امت مسلمہ کا اجماعی اور متفقہ عقیدہ ہے کہ ”وانہم معصومون عن الکفر قبل الوحی و بعده بالاجماع“ (شرح العقائد ص ۱۰۲)

انبیائے کرام وحی سے پہلے بھی اور وحی کے بعد بھی کفر سے بالاجماع معصوم ہیں۔ یعنی امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ کسی بھی نبی سے کسی بھی زمانے میں کفر کا صدور نہیں ہوا، نہ نبوت سے پہلے نہ ہی نبوت کے بعد۔

یقیناً یہ نہ صرف انبیائے کرام پر بدترین الزام ہے کہ ”وہ دشمن کے خوف سے کفر کا اظہار بھی کر سکتے ہیں“ بلکہ اللہ تعالیٰ کے انتخاب پر بھی بے اعتمادی کا اظہار ہے کہ وہ کس کردار کے حامل لوگوں کو مصیبت نبوت پر فائز کرتا ہے؟

جبکہ اللہ تعالیٰ کا اس بارے میں واضح ارشاد ہے کہ:

”كُلُّهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ“ (سورۃ الانعام: ۱۲۴)

اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے (اس دل کو) جہاں وہ رکھتا ہے اپنی رسالت کو۔

اہل تشیع کے نزدیک شیعہ اصول کفر میں سے ایک ”اصل“ حضرت آدمؑ میں موجود تھا، چنانچہ امام جعفر سے نقل کیا گیا ہے کہ:

کفر کے اصول تین ہیں۔

۱: حرص ۲: تکبر ۳: حسد

بہر حال ”حرص“: جب آدمؑ کو درخت سے منع کیا گیا تو حرص نے ہی انہیں اس کے کھانے پر مجبور کیا۔ (اصول کافی کتاب الایمان والکفر - باب فی اصول الکفر وارکانہ)

اس کے بعد دوسرا اصول کفر ”حسد“ بھی ملاحظہ فرمائیں:

امام رضا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے سجدہ کروا کے اور جنت میں رہنے کی اجازت دے کر آدمؑ کو خصوصی اکرام سے نوازا تو ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ: ”کیا اللہ نے مجھ سے افضل کسی بشر کو پیدا کیا ہوگا؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدمؑ! اپنے سر کو اوپر اٹھا اور میرے عرش کے پائے کی طرف دیکھ تو اس پر یہ تحریر تھا کہ:

”لا اله الا الله محمد رسول الله، على بن ابي طالب أمير المؤمنين،

فاطمه سيدة نساء الصالحين، حسن و حسين سيدا شباب أهل الجنة“

آدمؑ نے کہا: اے پروردگار! یہ کون ہیں؟ فرمایا: یہ تیری اولاد میں سے ہیں لیکن تجھ سے اور میری تمام مخلوق سے بہتر اور بلند مرتبہ ہیں۔ اور اگر یہ نہ ہوتے تو میں نہ تجھ کو پیدا کرتا اور نہ جنت و دوزخ کو اور نہ آسمان و زمین کو جو میں لاتا۔ پس تو انہیں ”حسد“ کی نظر سے مت دیکھنا ورنہ اپنے قرب سے تجھے نکال باہر کروں گا۔

مگر آدمؑ نے نظر حسد سے ان کو دیکھا اور ان کے مرتبہ کی تمنا کی تو شیطان ان پر مسلط ہو گیا یہاں تک کہ وہ درخت (کا پھل) کھا گئے جس سے ان کو منع کیا تھا اور وہ اپر بھی

شیطان غالب آیا کیونکہ اس نے فاطمہ کو نگاہ حسد سے دیکھا تھا جس کے نتیجے میں اس نے بھی ”شجرہ ممنوعہ“ کو کھالیا۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو جنت سے نکال دیا اور زمین پر اتار دیا۔ (بخاری الانوار جلد ۱۱ - ص ۱۶۵ - جلد ۲۶ - ص ۳۷۳، حیات القلوب جلد ۱، ص ۵۰ -

معانی الاخبار ص ۱۰۹ - عیون اخبار الرضا جلد ۱، ص ۲۳۹)

مذکورہ شیعہ روایات سے واضح ہوتا ہے کہ شیطان ایک اصل کفر ”تکبر“ کی پاداش میں مردود ہوا جبکہ حضرت آدمؑ دو اصول کفر ”حرص و حسد“ کے مرتکب ہوئے۔ (العیاذ باللہ۔)

یہی نہیں بلکہ اہل تشیع نے دیگر انبیاء کے علاوہ سید الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ”عصمت“ کو بھی داغ دار کیا ہے اور قرار دیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے خوف سے امامت علیؑ کی تبلیغ سے ہال منول سے کام لیتے رہے۔ چنانچہ امام خمینی آیت تبلیغ (المائدہ ۱۶۷) کے تحت لکھتے ہیں کہ:

”یہ آیت غدیر خم کے دن حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؑ کی امامت کی تبلیغ و اعلان میں لوگوں سے خائف تھے اور اگر کوئی شخص کتب تاریخ و روایات کی طرف رجوع کرے تو وہ جان لے گا کہ پیغمبر کا خوف بجا تھا لیکن خدا نے انہیں حکم دیا کہ وہ امامت علیؑ کا اعلان کریں اور لوگوں سے ان کی حفاظت کا وعدہ کیا۔ (کشف الاسرار ص ۱۳۰)

تفسیر طبری اور توہین انبیاء علیہم السلام

پیچھے ”عقیدہ عصمت انبیاء“ کے عنوان کے تحت یہ بتایا جا چکا ہے کہ:

اہل سنت کے محقق علماء، متکلمین، مجتہدین اور مفسرین نے واضح طور پر اس بات کا اعلان کیا کہ: انبیاء کرام نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد کبیرہ و صغیرہ گناہوں اور عیبوں سے ”عمداً، سہواً، سرّاً و جہراً“ پاک اور مضموم ہوتے ہیں اور جن حضرات نے انبیاء کرام سے ”سہواً“ صغائر کا صدور تسلیم بھی کیا ہے تو انہوں نے اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی تصریح کر دی ہے کہ ”سہواً“ صغائر کے صدور کے باوجود ان سے ایسے صغائر کا ہرگز صدور نہیں ہو سکتا جو ”ذلت، رسوائی، کمینہ پن اور گھٹیا پن“ پر دلالت کرتے ہوں۔

جبکہ ”زالت“ (جس کا صدور انبیاء کرام سے ممکن ہے) پر صغیرہ گناہ کا بھی اطلاق نہیں ہوتا۔ خبر واحد کے ذریعے منقول ایسی تمام روایات مردود سمجھی جائیں گی البتہ بطریق تواتر منقول روایات کی ہر ممکن طریقے سے تاویل کی جائے گی بصورت دیگر ”ترك اولیٰ و ترك افضل اور قبل البعثت“ کے حالات پر محمول ہوں گی۔

امام طبری نے ”عصمت انبیاء“ سے متعلق اہل سنت والجماعت کے اجماعی مسلک کے برعکس اپنی تفسیر میں ”اسراہیلیات“ اور ”توہین و تنقیص انبیاء“ پر مبنی روایات کا، فی الواقع ایک ”اتوار“ بازار لگا دیا ہے جن سے استدلال کرتے ہوئے دشمنان اسلام، انبیاء کرام کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ستم بالائے ستم یہ کہ تفسیر طبری میں منقولہ روایات سے انبیاء کرام کی طرف صرف قبل از نبوت ہی نہیں بلکہ بعد از نبوت بھی صرف سہواً ہی نہیں بلکہ عمداً قصداً بھی صرف صغیرہ گناہوں کی ہی نہیں بلکہ کبیرہ گناہوں کی بھی اور صرف ”سہواً“ عام صغائر کی ہی نہیں بلکہ قصداً و عمداً انتہائی

خسیس و گھٹیا صغائر و کبائر کی بھی نسبت کرنا پڑتی ہے۔ جن کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں:

حضرت آدم علیہ السلام:

امام طبری نے سورۃ الاعراف آیت ۱۹۰ کے تحت متعدد روایات ایسی نقل کی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت آدم اور مائے حوا نے شیطان کے حکم پر اپنے بچے کا نام ”عبدالجارث“ رکھا۔ جبکہ ”الجارث“ شیطان کا نام تھا، اس طرح حضرت آدم اور مائے حوا دونوں شرک فی الطاعت کے مرتکب ہو گئے۔ (العیاذ باللہ)

حضرت ابراہیم علیہ السلام:

امام طبری سورۃ البقرہ آیت ۲۶۰: ”وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ ارْنِيْ كَيْفَ تُنْخِطُ الْمَوْئِدَ...“ کے تحت یہ روایت لائے ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ شیطان نے ابراہیم کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اللہ مڑوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ اس شک کی وجہ سے ابراہیم نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کر دیا کہ اے میرے رب! مجھے دکھا دے کہ تو مڑوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟

حضرت یوسف علیہ السلام:

امام طبری نے سورۃ یوسف آیت ۴۲: ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“ کے تحت متعدد روایات نقل کی ہیں جن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ: وہ عورت برائی کی خواہش لئے ہوئے یوسف کے سامنے چت لیٹ گئی اور یوسف بھی اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے اتار دیئے۔ (العیاذ باللہ)

حضرت داؤد علیہ السلام:

امام طبری سورۃ ”صن“ آیت ۲۳ کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ داؤد علیہ السلام نے اپنے محل کی چھت پر ٹپلنے کے دوران ایک خوبصورت ترین خاتون کو غسل کرتے ہوئے دیکھا تو ان کی رغبت بڑھ گئی۔ تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ”اوریا“ کی بیوی ہے چنانچہ اس کے خاوند کو دشمن کے خلاف لڑنے کے لئے اس نیت کے تحت بھیجا کہ وہ مارا جائے مگر وہ فتح مند ہوا۔ دوسری مرتبہ پھر اسی ارادے کے ساتھ کسی اور محاذ پر بھیجا وہاں بھی اسے فتح حاصل

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین انبیاء علیہم السلام

ہو گئی۔ تیسری مرتبہ پھر بھیجا چنانچہ اس معرکہ میں مارا گیا تب اس کی بیوہ سے خود شادی کر لی۔
حضرت سلیمان علیہ السلام:

امام طبری سورۃ ”ص“ آیت ۳۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: شیطان نے سلیمان علیہ السلام کی انگلی حاصل کر کے ان کا روپ دھار لیا تھا اور چالیس دن تک تخت سلطنت پر براجمان ہو کر حکومت کرتا رہا۔

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم:

امام طبری سورۃ الحج آیت ۵۲ کی تفسیر میں زمانہ و ملاحہ کی وضع کردہ روایت لے آئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز میں اپنے الفاظ آیت میں بڑھا دیئے۔ (العیاذ باللہ)

اسی طرح سورۃ الاحزاب آیت ۳۷ کی تفسیر میں ایک انتہائی گھٹیا اور مکروہ واقعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا کہ آپؐ نے سیدہ زینبؓ زوجہ حضرت زید بن حارثہؓ کو ان کے صحن میں دیکھا تو ان کا حسن آپؐ کے دل میں گھر کر گیا۔ جس سے زیدؓ کے دل میں بیوی کی طرف سے کراہت آگئی اور معاملہ طلاق تک پہنچ گیا۔ (العیاذ باللہ)

امام طبری نے ”قصہ غرائق“ اور قصہ ”سیدہ زینبؓ“ اپنی تاریخ میں بھی نقل کیا ہے۔
ملاحظہ ہو: تاریخ الامم والملوک ص ۷۵-۷۸، ۲۳۱، ۲۳۲-۲۳۳۔

تاریخ طبری میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب مذکورہ قصوں کو پڑھ کر پاکستان کے ممتاز صحافی اور عظیم کالم نگار جناب اوریا مقبول جان نے دینی غیرت و حمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ایک کالم میں یہ لکھا تھا کہ: جس کتاب کو باری قصوں کی کتاب ہونا چاہئے تھی اسے مستند ترین تاریخ سمجھ کر یورپ نے پیش کیا۔ طبری عام مسلمانوں کی بات کرتا تو برداشت تھا لیکن اس نے تو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے بارے میں بھی دو عدد من گھڑت قصے اس قدر فضول اور بیہودہ انداز میں تحریر کئے ہیں کہ انہیں درج کرنے کی بھی ہمت نہیں پاتا۔ ان دونوں فضول قصوں کا نہ کہیں قرآن میں ذکر ہے اور نہ ہی احادیث کی کتابوں

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین انبیاء علیہم السلام

میں۔ لیکن طبری نے اپنے ذہن کی غلاظت کو تاریخ کی چاشنی بنا کر پیش کیا ہے۔۔۔
مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے تمام افسانے، من گھڑت قصے جن میں اختلاف کی بو آتی ہو، مسلمانوں کے کردار کی خرابی نظر آئے۔ سب طبری اور اسی قبیل کے مؤرخین کی ایجادات ہیں اور یہ مؤرخین مغرب اور اس کے سیکولر حواریوں کو بہت محبوب ہیں۔
(روزنامہ ایکسپریس ۷ جولائی ۲۰۱۵ء زیر عنوان ”ہمارے افسانہ ساز مؤرخین“)

امام طبری کو ”افسانہ ساز مؤرخین“ میں شامل کرنا اتنی بڑی ”گستاخی“ سمجھا گیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین پر مبنی امام طبری کے منقولہ مذکورہ ”جھوٹے، لغو اور باطل قصوں“ کے دفاع میں روزنامہ اسلام کا ادارتی صفحہ ”وقف“ ہو گیا اور ۹ قسطوں میں (۲۹ جولائی ۲۰۱۵ء تا ۱۲ اگست ۲۰۱۵ء) اس سلسلہ کی تکمیل ہوئی پھر بعد میں ”فیس بک“ پر بھی ۲۴ نومبر ۲۰۱۵ء تک اسی موقف کا اظہار ہوتا رہا۔ سب سے زیادہ تعجب تو روزنامہ اسلام کی انتظامیہ اور ان کے ہم مسلک علماء کی خاموشی پر ہے جنہیں چاند کے مطلع پر نظر آنے سے کئی دن پہلے اس کی ولادت کی تاریخ اور وقت کے متعلق تو علم ہو جاتا ہے مگر انہیں ”روزنامہ اسلام“ کی متعدد قسطوں میں کئی دنوں تک بیک وقت سات شہروں کراچی، لاہور، ملتان، راولپنڈی، پشاور، کوئٹہ اور مظفر آباد سے ادارتی صفحے پر شائع ہونے والے ”مواذ“ میں کوئی توہین محسوس نہیں ہوئی اور نہ ہی کوئی ”قابل غور“ بات نظر آئی کاش! وہ اصل ناخذ کی طرف مراجعت ہی کر لیتے۔

راقم الحروف اس موقع پر جناب اوریا مقبول جان کو ”مخارج عقیدت“ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ”عزیمت و استقامت“ پر انہیں ”سلام عقیدت“ بھی پیش کرتا ہے جو انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ مذکورہ ”جوابی و دفاعی اقساط“ کے مطالعہ کے بعد قرآن وحدیث کے عین مطابق اپنے ”صحیح، سچے اور اصولی“ موقف سے ذرہ برابر بھی پیچھے نہیں ہٹے اور اپنے ”جواب الجواب“ میں اپنے اسی موقف کا اعادہ کرتے ہوئے لکھا کہ: ”طبری پر لکھنا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کیونکہ دو واقعات ایک حضرت زینبؓ اور حضرت زیدؓ کی طلاق اور دوسرا واقعہ غرائق طبری نے جس انداز میں بیان کیا ہے کوئی انہیں کالم میں

لکھنے کی ہمت تو ایک طرف پڑھنے کی برداشت نہیں رکھتا۔ میری حیرت کی اس وقت انتہاء نہ رہی جب میرے سیکولر دوست تو میری اس وضاحت پر خاموش ہو گئے، لیکن چند علمائے امت اپنی تلواریں سونت کر مجھ پر پل پڑے۔ وہ لوگ جن کا دفاع میں صرف اللہ کی رضا کے لئے کرتا رہا ہوں۔ ان علماء نے طبری کا دفاع صرف اس لئے کیا کہ گزشتہ چند سو سالوں سے ان کے مدارس میں ’تفسیر جلالین‘ پڑھائی جاتی ہے اور اس میں اس واقعہ غرائق کا ذکر ہے، جس کا ماخذ طبری کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ میرا معاملہ نہ طبری سے پر خاش کا ہے اور نہ ہی بلاذری اور ابن سعد سے۔ میرا دکھ یہ ہے کہ جس کسی نے میرے اسلاف پر انگلی اٹھائی ہو، میرے دین کے نقص بیان کرنا ہوں وہ ان مؤرخین کے جمع کئے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیتا ہے۔ الحاد کا دروازہ انہی کے جمع کئے گئے جھوٹ سے کھلتا ہے۔ آپ اسلام کے خلاف لکھی جانے والی تمام کتابوں کو اٹھالیں، توہین رسالت پر مبنی کتب کا مطالعہ کریں اور ان میں کہیں نہ کہیں طبری اور اس کے قبیل کے مؤرخین جھانکتے نظر آئیں گے۔ وہ لوگ انہی کی روایات کو بنیاد بناتے ہیں۔ حیرت ہے وہ تمام ’’شامیں رسول اللہ‘‘ تو ایسی باتیں تحریر کرنے پر واجب القتل قرار دیئے جاتے ہیں اور جس مؤرخ نے یہ جھوٹ اکٹھا کر کے تاریخ کا حصہ بنایا وہ محترم؟ پتہ نہیں کیوں میرے ان صاحبان علم علماء کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث یاد نہیں آتی کہ ’’کسی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے آگے سنانا پھرے‘‘۔ کیا ہمارے مؤرخین نے ایسا نہیں کیا؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی تاریخ مرتب کی جائے جو حدیث اور تاریخ کے راویوں کی چھان پھٹک کے بعد لکھی جائے۔ (روزنامہ ایکسپریس ۴ ستمبر ۲۰۱۵ء زیر عنوان ’’خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے‘‘)

زیر نظر عنوان ’’تفسیر طبری اور توہین انبیاء‘‘ کے تحت اوپر اشارتاً جن روایات کا حوالہ آیا ہے وہ یقیناً عقیدہ ’’عصمت انبیاء‘‘ کے منافی ہیں ’’اسرائیلیات‘‘ سے متاثر بعض ’’علماء‘‘ انہیں ’’علمی ورثہ‘‘ اور عقیدہ عصمت انبیاء کے عین مطابق قرار دیتے ہیں لہذا اصل حقیقت واضح کرنے کی خاطر ان روایات کا ایک تنقیدی جائزہ مقرر کیا جاتا ہے:

تفسیر طبری اور توہین آدم علیہ السلام

”هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَ جَعَلَ مِنْهَا رُوحَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّيْهَا حَمَلٌ خَفِيئًا فَهَمَزَتْ بِهِ فَلَمَّا أَتَتْكَ دَعَاكَ اللَّهُ رَبُّهُمَا لِيُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ السَّمَاءِ مَائِدًا وَ يَخْرِجُ مِنْكَ نَجَسًا وَ يَسْخَرُ مِنْكَ اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ“ (سورة الاعراف آیت ۱۸۹-۱۹۰)

”وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف ساحل رہ گیا جسے لئے وہ چلتی پھرتی رہی پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں نے مل کر اپنے پروردگار اللہ سے دعا کی کہ اگر تو نے ہمیں تندرست بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح و سالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی اس بخشش و عنایت میں دوسروں کو اللہ کا شریک ٹھہرانے لگے۔ اللہ بہت بلند و برتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں“

امام طبری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

۱۔... کانت حواء لا يعيش لها ولد، فنزلت لئن عاش لها ولد لتسمينه ”عبدالحارث“، فعاش لها ولد، فسمته ”عبدالحارث“، وانما كان ذلك عن وحى الشيطان۔ (جامع البيان في تاويل القرآن المجلد السادس ص ۱۴۴ تحت رقم ۱۵۵۳۳)

حضرت حوا کے لڑکے زندہ نہیں رہتے تھے تو انہوں نے نذرمانی کہ اگر لڑکا بچ گیا تو اس کا نام ’’عبدالحارث‘‘ رکھوں گی۔ پھر اس کا لڑکا بچ گیا تو اس نے اس کا نام ’’عبدالحارث‘‘ رکھ دیا، اور یہ چیز شیطان کی وحی تھی (یعنی یہ شیطان کے بہکانے سے ہوا)۔

۲۔... إن آدم عليه السلام سمى ابنه ”عبدالحارث“

۳۔... سمى آدم ابنه ”عبدالحارث“۔

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین آدم علیہ السلام

آدم نے اپنے بیٹے کا نام ”عبدالحارث“ رکھا۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۵۵۲۵-۱۵۵۲۶)

۴۔۔۔ کانت حواء تلد لادم، فتعبد هم الله، و تسميه: ”عبدالله“ و ”عبدالله“ و نحو ذلك، فيصيبهم الموت، فاتاه ايليس و ادم فقال: ائتكما لو تسمياتهم بغير الذي تسمياتهم لعاش، فولدت له رجلا قسما ”عبدالحارث“ فقيه انزل الله تبارك و تعالیٰ: ”هو الذي خلقكم من نفس واحدة“، إلى قوله: ”جعل له شركاء فيما اتهم“ إلى آخر الآية۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۵۵۲۷)

حضرت حوا کی جو اولاد ہوتی تھی تو وہ انہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے مخصوص کر دیتی تھیں اور ان کے نام ”عبد اللہ و عبد اللہ“ وغیرہ رکھتی تھیں۔ یہ بچے مرجاتے تھے۔ چنانچہ آدم اور حواء کے پاس ابلیس آیا اور کہنے لگا کہ: اگر آپ اپنے بچے کا ان ناموں کے علاوہ کوئی دوسرا نام رکھیں گے تو وہ زندہ رہے گا۔ پس حواء کا ایک بچہ پیدا ہوا تو ان دونوں نے اس کا نام ”عبدالحارث“ رکھا۔ اسی کے متعلق یہ آیات (الاعراف ۱۸۹-۱۹۰) نازل ہوئی ہیں۔

۵۔۔۔ فأتتهما الشيطان فقال: هل تدريان ما يولد لكما؟ أم هل تدريان ما يكون؟ ألهيمة يكون أم لا؟ وزين لهما الباطل، إنه غوى مبين، وقد كانت قبل ذلك ولدت ولدین فماتتا، فقال لهما الشيطان: ائتكما لن لم تسمياهن، لم يخرج سوأاً، ومات كما مات الأولان، فسمياهن لهما ”عبدالحارث“ فذلك قوله: ”فلما اتهم صالحاً جعل له شركاء فيما اتهم فتعلی الله عما يشركون“ (حوالہ مذکور ص ۱۳۵ تحت رقم ۱۵۵۲۸)

تو شیطان آدم و حوا کے پاس آیا اور کہا: کیا تم دونوں جانتے ہو کہ تمہارے ہاں کیا بچہ پیدا ہوگا؟ (صحت مند یا معذور) کیا تم جانتے ہو کہ وہ کس جنس سے ہوگا؟ کیا وہ کسی جانور کی شکل کا ہوگا یا انسانی شکل والا؟ پس اُس صریح گمراہ شیطان نے انہیں پھسلا کر شروع کر دیا چنانچہ اس نے ان کے سامنے باطل کو خوش نما کر کے پیش کیا، اس سے پہلے ان کے دو بچے پیدا ہو چکے تھے جو دونوں مر گئے۔ پس آدم و حوا سے شیطان نے کہا کہ اگر تم اپنے بچے کا نام میرے نام پر نہیں رکھو گے تو نہ تو وہ صحیح پیدا ہوگا اور نہ ہی وہ زندہ رہے گا اور جس طرح

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین آدم علیہ السلام

پہلے دو مر گئے تھے یہ بھی مرجائے گا جس پر انہوں نے اپنے بیٹے کا نام ”عبدالحارث“ رکھ دیا جس کی بناء پر وہ دونوں یعنی حضرت آدم و حوا اس آیت ”فَلَمَّا اتَّهَمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا اتَّهَمَا“ کا مصداق بن گئے۔

۶۔۔۔ لَمَّا وَلَدَ لَوُلِدَ اَنَاهِ ايليس فقال: ايني سأنصح لك في شأن ولدك هذا تسميه ”عبدالحارث“ فقال آدم: أعوذ بالله من طاعتك: قال ابن عباس: وكان اسمه في السماء ”الحارث“ قال آدم: أعوذ بالله من طاعتك، ايني أعطتك في أكل الشجرة فأخرجتني من الجنة، قلن أعطتك، فمات ولده، ثم ولد له بعد ذلك ولد آخر، فقال: أعطني وإلا مات كما مات الأول، فقصاه، فمات، فقال: لا أزال أقتلهم حتى تسميه ”عبدالحارث“ فلم يزل به حتى سماه ”عبدالحارث“ فذلك قوله: ”جعل له شركاء فيما اتهم“ أشركه في طاعته في غير عبادة، ولم يشرك بالله، ولكن أطاعه (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۵۵۲۹)

”جب حضرت آدم کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو ابلیس ان کے پاس آیا اور کہا: اگر آپ اپنے بچے کا بھلا اور خیر خواہی چاہتے ہیں تو میں آپ کو اس بچے کے بارے میں نصیحت کرتا ہوں کہ اس کا نام ”عبدالحارث“ رکھنا۔ حضرت آدم نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں تیری اطاعت کروں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ: شیطان کا نام آسمان میں حارث تھا۔ حضرت آدم نے کہا: میں تیری اطاعت کرنے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس لئے کہ میں نے درخت کے کھانے میں تیری اطاعت کی تھی تو تو نے مجھے جنت سے نکلوا دیا لہذا میں ہرگز تیری بات نہیں مانوں گا۔ پس حضرت آدم کا یہ بچہ مر گیا۔ شیطان نے کہا: میں تیرے بچوں کو اسی طرح مانتا رہوں گا جب تک اس کا نام عبدالحارث نہ رکھو گے۔ وہ یہی کہتا رہا یہاں تک کہ انہوں نے اپنے بچے کا نام ”عبدالحارث“ رکھ ہی لیا۔ پس اس سلسلے میں یہ آیت ”جعل له شركاء“ نازل ہوئی۔ آدم و حوا نے ”شرك في الطاعة“ کا ارتکاب کیا ہے نہ کہ ”شرك في العبادة“ کا۔ یعنی انہوں نے اللہ کے ساتھ شرک نہیں کیا، البتہ انہوں نے شیطان کی اطاعت کی۔“

۷۔۔۔ عن عكرمة قال: ما أشرك آدم و لا حواء، وكان لا يعيش لهما ولد،

فَأَتَاهُمَا الشَّيْطَانُ فَقَالَ: إِنَّ سَرَكَمَا أَنْ يَعِيشَ لَكُمْ وَلَدٌ فَسَمِيَاهُ "عَبْدُ الْحَارِثِ" فَهَوَ قَوْلُهُ: "جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا" (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۵۵۳۰)

”مکرمہ کہتے ہیں کہ: حضرت آدم وحواء نے شرک نہیں کیا۔ دراصل ان کے بچے زندہ نہیں رہتے تھے تو شیطان نے ان کے پاس آکر کہا: آپ کے بچوں کے زندہ رہنے کا راز اس میں ہے کہ اس کا نام ”عبدالحارث“ رکھو تو اس بارے میں آیت ”جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ...“ مآزل ہوئی۔“

۸۔... کان آدم علیہ السلام لا یولد له ولد إلا مات، فجاء الشیطان فقال: إِنَّ سَرَكَ أَنْ يَعِيشَ وَلَدُكَ هَذَا فَسَمِيَهُ "عَبْدُ الْحَارِثِ" ففعل، قال: فَأَشْرَكَا فِی الْاِسْمِ، وَلَمْ یَشْرُكَا فِی الْعِبَادَةِ۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۵۵۳۱)

”حضرت آدم کے ہاں جو بچہ پیدا ہوتا تھا وہ مر جاتا تھا تو شیطان ان کے پاس آیا اور کہا کہ: آپ کے لڑکے، کے زندہ رہنے کا راز اس میں ہے کہ آپ اس کا نام ”عبدالحارث“ رکھیں۔ پس آپ نے اس کے کہنے کے مطابق عمل کیا۔ راوی (قائد) نے کہا کہ حضرت آدم اور حواء نے نام میں شرک کیا ہے اور انہوں نے عبادت میں شرک نہیں کیا۔“

۹۔... أَنَّهُ كَانَ لَا يَعِيشُ لَهُمَا وَلَدٌ فَأَتَاهُمَا الشَّيْطَانُ فَقَالَ لَهُمَا: سَمِيَاهُ "عَبْدُ الْحَارِثِ" وَكَانَ مِنْ وَحْيِ الشَّيْطَانِ وَأَمْرُهُ، وَكَانَ شُرَكَاءُ فِی طَاعَةٍ، وَلَمْ یَكُنْ شُرَكَاءُ فِی عِبَادَةٍ۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۵۵۳۲)

”قائد کہتے ہیں کہ ہمیں بتایا گیا کہ) آدم وحواء کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی تو ان دونوں کے پاس شیطان آیا اور ان سے کہا کہ: اس کا نام ”عبدالحارث“ رکھو۔ (تو انہوں نے شیطان کا تجویز کردہ یہ نام رکھ لیا) اور یہ شیطان کی وحی اور حکم سے تھا، یہ شرک اطاعت میں ہے، عبادت میں شرک نہیں ہے۔“

امام طبری نے زیر بحث آیت کی تفسیر میں ایسی ”روایات“ کا انبار لگا دیا جن کی رو سے حضرت آدم اور حضرت حواء کو شیطان کا فرماں بردار اور شرک کا مرتکب تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ جو قطعی طور پر عقیدہ عصمت کے منافی ہے۔ (العیاذ باللہ)

تفسیر طبری چونکہ ”ام الثعالبین“ کا درجہ رکھتی ہے اس لئے بعد کے بعض مفسرین نے بھی ان روایات کو صحیح سمجھ کر نقل کر دیا۔ جبکہ بعض حضرات نے ”ناویلات فاسدہ“ کا سہارا لیا۔

امام طبری کی منقولہ روایات پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حواء نے سہواً نہیں بلکہ بچوں کے یکے بعد دیگرے فوت ہو جانے کے بعد خوب سوچ و بچار غور و فکر اور شیطان کے بار بار پھسلانے، ورغلانے حتیٰ کہ دھمکانے کی بناء پر اپنے بچے کا نام شیطان کی طرف منسوب کر کے ”عبدالحارث“ رکھا۔ علاوہ ازیں امام طبری نے اسی واقعہ کو ”جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ“ کا شان نزول بتاتے ہوئے اس آیت کا مصداق حضرت آدم اور حضرت حواء کو قرار دیا۔

مزید برآں اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا گیا کہ: ”أَشْرَكَا فِی طَاعَتِهِ فِی غَيْرِ عِبَادَةٍ، وَلَمْ یَشْرُكَ بِاللَّهِ وَلَكِنْ أَطَاعَهُ، فَأَشْرَكَا فِی الْاِسْمِ وَلَمْ یَشْرُكَا فِی الْعِبَادَةِ، وَكَانَ مِنْ وَحْيِ الشَّيْطَانِ وَأَمْرُهُ، وَكَانَ شُرَكَاءُ فِی طَاعَةٍ وَلَمْ یَكُنْ شُرَكَاءُ فِی الْعِبَادَةِ“

”حضرت آدم وحواء نے شیطان کی وحی اور حکم پر اپنے لڑکے کا نام ”عبدالحارث“ رکھ کر ”شرک فی الطاعت“ کا ارتکاب کیا ہے جو ”شرک فی العبادہ“ کے زمرے میں نہیں آتا۔“ حضرت آدم اور حضرت حواء کو ”جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ“ کا مصداق قرار دے کر اس سے ”شرک فی الطاعت“ مراد لینا انتہائی لغو، فاسد و باطل تاویل ہے کیونکہ اس سے بھی ایک نبی کی طرف شرک کی نسبت لازم آتی ہے۔ جب نبی سے عدا گناہ صغیرہ کے ارتکاب کو بھی منافی عصمت قرار دیا گیا ہے تو پھر ان کی طرف قصد و عدا ”شرک فی الطاعت“ کی نسبت کیوں کر منافی عصمت نہیں ہے؟

یہ ”اکابر“ پرستی اور روایت پرستی ہی کا شاخسانہ ہے کہ بعض نامی گرامی حضرات بھی ”ناویلات فاسدہ“ کی آڑ لینے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ خاتم المفسرین علامہ سید محمود آلوسی بغدادی (م ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء) نے بعض روایات اور آثار صحابہ و تابعین کی بناء پر امام طبری، ثعلبی، بغوی اور سیوطی وغیرہ کی پیروی میں بحوالہ طبری حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت حضرت آدم و حواء کے شیطان کے کہنے پر اپنے لڑکے کا نام ”عبدالحارث“ رکھنے کی وجہ سے مآزل ہوئی ہے انہوں

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین آدم علیہ السلام

نے اس ”خبر“ کو آیت کی تفسیر بتاتے ہوئے اسے ”مشکلات القرآن“ میں شمار کیا ہے۔

علامہ آلوسیؒ نے اگرچہ اس کی تفسیر جمہور علمائے تفسیر کے مطابق کی ہے مگر وہ اس سے خود مطمئن نظر نہیں آتے اور دوسرے مفسرین کی ہر تاویل پر اعتراض کرتے ہوئے اس کے کمزور پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ قاضی بیضاوی اور علامہ نسفی کی تاویل کو ”من عمر قصراً وهدم مصر“ (ایک محل کی تعمیر کے لئے پورے شہر کو کھنڈر بنا دینے سے) تعبیر کیا ہے۔ اور اکثر تاویلوں کو ”وہن من بیت العنکبوت“ کہتے ہوئے ”آخر میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے یہ لکھ دیا ہے کہ ”یہ حدیث صحیح ہے اس لئے میں ”اشہب قلم کو میدان تاویل میں دوڑانے سے روکتا ہوں“۔

اس طرح علامہ آلوسیؒ نے بھی ”جَعَلُوا“ کی تفسیر کو حضرت آدمؑ کی طرف لوٹا دیا ہے۔

”لَعَلَّه الْآيَةُ عَنِى مِنَ الْمَشْكَلَاتِ وَالْعُلَمَاءُ فِيهَا كَلَامٌ طَوِيلٌ وَنَزَاعٌ عَرِضٌ... لِنِ الْآيَةِ نَزَلَتْ فِي تَسْمِيَةِ آدَمَ وَحَوَاءَ وَلَدَيْهِمَا بَعْدَ الْحَارِثِ، وَ مِثْلُ ذَلِكَ لَا يَكَادُ يُقَالُ مِنْ قَبْلِ الرَّأْيِ وَهُوَ ظَاهِرٌ فِي كَوْنِ الْخَيْرِ تَفْسِيرَ الْآيَةِ... وَأَنْتَ قَدْ عَلِمْتَ مَنِ أَنْهُ إِذَا صَحَّ الْحَدِيثُ فَهُوَ مُلْهِبٌ وَأَرَاهُ قَدْ صَحَّ، وَلِلذَلِكَ أَحْجَمُ كَمِيَّةٍ قَلَمِي عَنْ الْجَرَى فِي مِثْلَانِ التَّوِيلِ كَمَا جَرَى غَيْرُهُ۔ (روح المعاني جلد ۹ ص ۱۳۹-۱۴۳)

یہ آیت میرے نزدیک قرآن کریم کے انتہائی مشکل مقامات میں سے ہے اور علمائے تفسیر نے اس مقام پر طویل و عریض کلام کیا ہے۔۔۔ بے شک یہ آیت آدمؑ و حواؑ کے اپنے بچے کا نام ”عبدالحارث“ رکھنے کی بناء پر نازل ہوئی ہے اور ایسی بات محض اپنی رائے سے نہیں کہی جاسکتی لہذا ظاہر ہے کہ یہ ”روایت“ اس آیت کی تفسیر ہی ہے۔ اور آپ میرے بارے میں یہ بات تو جانتے ہی ہیں کہ جب کوئی صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہوتا ہے اور میں اسے صحیح سمجھتا ہوں اس لئے میں تاویل کے میدان میں اپنے ”اشہب قلم“ کو دوڑانے سے روکتا ہوں جیسا کہ دوسروں نے اپنے قلم کے گھوڑے کو اس میدان میں دوڑایا ہے۔

علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس سلسلہ میں ایک حدیث مرفوعہ نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ابلیس نے آدمؑ و حواؑ کو دوبارہ دھوکہ دیا، ایک بار جنت میں اور ایک بار زمین

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین آدم علیہ السلام

پر۔ ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی ”الجامع لاحکام القرآن“ جلد ۷-۲۳۸ تفسیر خازن جلد ۲ ص ۲۶۷۔

صاحب تفسیر الخازن علی بن محمد علاء الدین المعروف بالخازن (م ۷۴۱ھ) نے بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ:

جب حضرت آدمؑ کے یہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو ابلیس ان کے پاس آیا اور کہا کہ اگر اپنے بچے کا بھلا چاہتے ہو تو اس کا نام ”عبدالحارث“ رکھ دو۔ ابلیس کا نام آسمان میں حارث تھا۔ حضرت آدمؑ نے کہا: تم سے خدا کی پناہ۔ میں نے جنت میں تمہاری بات مان لی، اس لئے جنت سے نکالا گیا، اب میں تمہاری بات کبھی نہیں مانوں گا۔ اتفاق سے بچہ مر گیا۔ دوسرا بچہ پیدا ہوا تو پھر ابلیس آیا، پھر وہی بات کی، حضرت آدمؑ نے اس مرتبہ بھی انکار کیا، وہ بچہ بھی مر گیا۔ جب تیسرا بچہ پیدا ہوا تو ابلیس نے کہا کہ اگر تم میری بات نہیں مانو گے تو میں تمہارے بچوں کو اسی طرح مارتا رہوں گا۔ آخر حضرت آدمؑ نے اس کا نام عبدالحارث رکھ دیا۔۔۔

آدمؑ و حواؑ کا شرک یہ تھا کہ انہوں نے بچہ کا نام ”عبدالحارث“ رکھ دیا حالانکہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف ”عبد“ کی نسبت مناسب نہیں تھی لیکن ”اشراک فی العبودیۃ“ نہ تھی کیونکہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں اس لئے ان سے شرک کا صدور نہیں ہو سکتا ہے البتہ یہ ”شُرک فی الطاعة“ ہے جو شیطان کی وحی اور حکم سے عمل میں آیا۔ (ملاحظہ ہو: ”الباب الاول فی معالم التنزیل“ المعروف بہ تفسیر خازن جلد ۲ ص ۷۶۷)

امام جلال الدین سیوطی اس آیت کے تحت فرماتے ہیں:

بتسمیۃ عبدالحارث، ولا ینبغی أن یکون عبداً لاله، ولیس باشرک فی العبودیۃ لعصمة آدم، وروی سمرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لما ولدت حواء طاف بها ابلیس، وکان لا یعیش بها ولد، فقال سمیہ عبدالحارث فأتاه یعیش، فسمته فعاش فکان ذلك من وحی الشیطان وأمره... (جلالین ص ۱۸۰-۱۷۹)

تخت حیرت ہے کہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان (م ۱۳۹۶ھ) جمہور مفسرین کے مطابق زیر بحث آیت کی صحیح تفسیر کرنے کے باوجود آخر میں ”اسرائیلی

روایات“ کی بھی توثیق کر بیٹھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

”... اس سے معلوم ہوا کہ شرک اختیار کرنے والوں کے معاملہ کا تعلق حضرت آدم و حوا سے متعلق نہیں جس کے سبب حضرت آدم کی عصمت پر کوئی شبہ ہو، بلکہ اس کا تعلق بعد کی آنے والی نسلوں کے عمل سے ہے۔ اور یہ تفسیر جو ہم نے اختیار کی ہے تفسیر درمنثور میں بروایت ابن المنذر و ابن ابی حاتم، مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے۔

ترمذی اور حاکم کی روایات میں جو ایک قصہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کا اور شیطان کے فریب دینے کا مذکور ہے۔ اس کو بعض نے اسرائیلی روایات قرار دے کر ناقابل اعتماد بتلایا ہے لیکن بہت سے محدثین نے اس کی توثیق بھی کی ہے۔ متذکرہ تفسیر پر اگر اس قصہ کی روایت کو صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی آیت کی تفسیر میں کوئی اشکال و شبہ باقی نہیں رہتا“ (معارف القرآن جلد چہارم ص ۱۴۹۔ مطبوعہ دارالعارف کراچی)

موصوف نے زیر بحث آیت کی تفسیر میں حضرت آدم و حوا کی تنقیص پر مبنی روایات کے متعلق واضح طور پر یہ کہا ہے کہ ”بعض“ نے انہیں ”اسرائیلی روایات“ قرار دیا ہے لیکن بہت سے محدثین نے ان روایات کی توثیق بھی کی ہے۔ پھر اس سے بھی عجیب تر بات یہ فرمائی کہ: ”اگر ان ”اسرائیلی روایات“ کو صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی اس آیت کی تفسیر میں کوئی اشکال و شبہ باقی نہیں رہتا“

قارئین کرام! زیر بحث آیت کی تفسیر میں امام طبری کی منقولہ روایت پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں پھر ان کا مفتی اعظم صاحب کی مؤخر الذکر بات سے تقابل کریں تو ”اشکالات و شبہات“ کبھی بھی ختم نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان روایات کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں حضرت آدم کی ”عصمت“ پر شدید ترین حرف آتا ہے اور وہ کسی صورت میں بھی محفوظ نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں حضرت آدم اور حضرت حواء دونوں کی طرف ”شرک“ کی نسبت قائم ہوتی ہے خواہ وہ ”شرک فی الطاعت“ ہی کیوں نہ ہو۔ منقولہ ”اسرائیلی“ روایات سے حضرت آدم اور حضرت حواء کا یہی شرک ”ثابت“ ہوتا ہے کہ انہوں نے قصداً شیطان کی اطاعت کر کے اس کا تجویز کردہ نام ”عبداللہ الحارث“ رکھ لیا تھا۔ اور ان روایات کے مطابق قرآن نے اسی بات کو ”جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ“ قرار دیا تھا۔

قطع نظر منقولہ اسرائیلی روایات کے، اس موقع پر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر بالفرض ”جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ“ سے حضرت آدم و حوا امراندہ لئے جائیں اور اس سے آگے ان کی اولاد میں کوئی ”میاں بیوی“ مراد لئے جائیں تو قرآن نے ان کی کس بات کو شرک قرار دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا شرک یہی تھا کہ انہوں نے بتوں اور غیر اللہ کے نام پر اپنے بچوں کے نام (عبدالعزی، عبدالمناف وغیرہ) رکھ لئے تھے اور اسی چیز کو قرآن نے شرک قرار دیا۔

خود حضرت مفتی صاحب نے بھی زیر بحث آیت کی تفسیر کے آخر میں اس کے احکام اور فوائد بتاتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے کہ:

”... تیسرے یہ کہ بچوں کے ایسے نام رکھنا جن سے مشرکانہ مفہوم لیا جاسکتا ہو چاہے نام رکھنے والوں کی یہ نیت نہ ہو، وہ بھی ایک مشرکانہ رسم ہونے کے سبب گناہ عظیم ہے جیسے عبدالشمس اور عبدالعزی وغیرہ نام رکھنا۔

چوتھے یہ کہ بچوں کے نام رکھنے میں بھی اداء شکر کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے نام اللہ و رسول کے ناموں پر رکھے جائیں۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمن، عبداللہ وغیرہ کو زیادہ پسند فرمایا ہے۔

فہموس ہے کہ آج مسلمانوں میں سے یہ رہی سہی اسلامی رسم بھی ختم ہوتی جاتی ہے۔ اول تو نام ہی غیر اسلامی رکھے جاتے ہیں اور جو کہیں ماں باپ نے اسلامی نام رکھ بھی دیئے تو ان کو بھی انگریزی کے مخفف حروف میں منتقل کر کے ختم کر دیا جاتا ہے۔ سیرت و صورت سے تو کسی کا مسلمان سمجھنا پہلے ہی مشکل ہو چکا تھا ناموں کے اس نئے طرز نے اسلام کی اس آخری علامت کو بھی رخصت کر دیا، اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا فہم اور اسلام کی محبت عطا فرمائے۔ آمین۔“ (حوالہ مذکور ص ۱۵۰)

حضرت مفتی صاحب نے ”جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ“ کے تحت اس کا حکم اور فائدہ ہی یہ بتایا ہے کہ عبدالشمس اور عبدالعزی وغیرہ نام رکھنا ”مشرکانہ رسم“ ہونے کے سبب گناہ عظیم ہے کیونکہ ان سے ”مشرکانہ مفہوم“ مراد لیا جاسکتا ہے چاہے نام رکھنے والوں کی یہ نیت نہ ہو۔ منقولہ اسرائیلی روایات کی رو سے حضرت آدم اور حضرت حواء نے شیطان کے بار بار ورغلائے، بہکانے، پھسلانے اور دھمکانے کی بناء پر جانتے اور بوجھتے ہوئے، قصداً او عمداً (کیونکہ پہلے

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین آدم علیہ السلام

انہوں نے دو ٹوک الفاظ میں اس کی اطاعت کا انکار کر کے اللہ کی پناہ طلب کی تھی اور شیطان کی وحی و حکم کے عین مطابق اس کے نام ”حارث“ کی طرف اضافت کر کے اپنے بچے کا نام ”عبدالحارث“ رکھ لیا تھا جسے ان ہی روایات کی بناء پر مفسرین نے ”جَعْلًا لَّہٗ شُرَکَآءَ“ کا شان نزول قرار دیا تھا۔ احکام و فوائد مرتب کرنے کے بعد یہ کیوں کر باور کر لیا گیا ہے کہ ”تب بھی آیت کی تفسیر میں کوئی اشکال و شبہ باقی نہیں رہتا“؟

جبکہ دوسری طرف موصوف نے اسی آیت سے یہ حکم اور فائدہ مستنبط کرتے ہوئے ”مشرکانہ رسم“ کے تحت اور بلا نیت بھی ”مشرکانہ مفہوم“ رکھنے والے ”عبدالحارث“ کی طرح کے نام رکھنے والوں کو ”گناہ عظیم“ کا مستحق قرار دیا ہے۔

مفسر اسلام مولانا مفتی محمود صاحب (۱۹۷۹ء) نے تو ”گلی لپٹی“ رکھے بغیر حضرت آدم و حوا کو ”جَعْلًا لَّہٗ شُرَکَآءَ“ کا مصداق قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ زیر بحث آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے ہاں جب لڑکا پیدا ہوا تو انہوں نے حقیقت میں کوئی شرک نہیں کیا تھا بلکہ شیطان نے حضرت حوا کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ ان کا نام ”عبدالحارث“ رکھنا اور شیطان ملائکہ میں حارث کے نام سے پہنچا اور یاد کیا جاتا تھا، اس تسمیہ میں صرف شرک کی ہلکی سی بو تھی مگر اللہ تعالیٰ اپنے خاص اور پسندیدہ و برگزیدہ بندوں کی معمولی غلطی کو بھی سخت الفاظ میں بیان فرماتے ہیں جیسے حضرت یونسؑ کے متعلق ہے:

”وَوَظَنَ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ“ اور دوسری جگہ ارشاد ہے: ”وَنَحْنُ إِذَا تَوَسَّسَ الرُّسُلُ“ وغیرہ۔

بتلانا یہ مقصود ہے کہ دربار الہی کے مقربین کی شان رفیع ہے ان سے چھوٹی سی چھوٹی غلطی بھی خلاف توقع ہے اور قرب کامل کے تقاضوں سے متصادم ہے۔ ”عبد“ کا معنی جیسے بندہ ہے، اسی طرح لفظ ”عبد“ کا دوسرا معنی غلام اور خادم بھی ہے جیسا کہ ایک شاعر کا قول ہے:

وَإِنِّي لَعَبْدٌ لِّلضَّيْفِ مَا دَامَ حَاوِيَا وَمَا قَىٰ إِلَّا فَيْكَ الْعَبْدِ

(تفسیر محمود جلد دوم ص ۱۱۴۔ مطبوعہ جمعیت پبلی کیشنز لاہور۔ جولائی ۲۰۰۶ء)

موصوف کی یہ تفسیر بھی سراسر عقیدہ عصمت انبیاء کے منافی ہے۔ جب انبیاء کرام سے

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین آدم علیہ السلام

قبل از نبوت اور بعد از نبوت بھی قصد اُمداد صغیرہ یا کبیرہ گناہ کا صدور نہیں ہو سکتا تو پھر ان کے فعل میں ”شرک کی ہلکی“ کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے؟

یہ ملحوظ رہے کہ شرک، خفیف سے خفیف بھی کبیرہ گناہ سے بڑھ کر ہے۔ شرک کی جنس کا کروڑوں حصہ بھی کیوں نہ ہو، نبی کی ذات اس سے بھی پاک ہے جبکہ منقولہ اسرائیلی روایات سے شرک کی ”ہلکی بو“ ظاہر نہیں ہوتی۔ سخت تعجب ہے کہ مفتی صاحب نے حضرت آدم کے فعل میں نہ صرف شرک کی ”ہلکی بو“ محسوس کی بلکہ انہوں نے یقینی طور پر حضرت آدم و حضرت حوا کو آیت ”جَعْلًا لَّہٗ شُرَکَآءَ“ کا مصداق قرار دے کر امام طبری وغیرہ کی منقولہ تمام اسرائیلی روایات کی توثیق بھی کر ڈالی۔ فیا اسفا۔

زیر بحث آیت کی تفسیر میں منقولہ اسرائیلی روایات پر روایت و درایت بحث سے پہلے اس بارے میں قادیانی و شیعہ موقف مذکور قرار دینا چاہیے۔

مشہور قادیانی مفسر محمد علی لاہوری (م ۱۹۵۱ء) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

”آدم کی طرف شرک کی نسبت غلط ہے“

یہاں لفظ تو عام ہیں مگر ”نفس واحدہ“ کے لفظ نے بہت لوگوں کو اس طرف مائل کر دیا کہ یہاں آدم و حوا کا ذکر ہے حالانکہ کسی حدیث میں یہ نہیں اور دوسری طرف الفاظ کو عام رکھنے سے کوئی محذور لازم نہیں آتا، کیونکہ جو انسان پیدا ہوتا ہے وہ ایک ہی نفس سے پیدا ہوتا ہے اور بی بی یا جوڑے کا اسی نفس سے پیدا ہوتا صرف حوا کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام انسانوں کو یہی کہا ہے کہ تم سب کی نیبیوں کو تمہارے ہی نفسوں سے پیدا کیا ہے: ”وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا“ (الروم ۲۱) جہاں سارے لفظ وہی ہیں جو یہاں ہیں۔ پس آدم و حوا پر ان کا لگنا اور اس پر یہ قصہ بڑھانا کما آدم و حوا کی اولاد نہ جیتی تھی، تب انہوں نے ایک بچہ کا نام ”عبدالحارث“ رکھا اور حارث شیطان کا نام ہے۔ سب بے بنیاد باتیں ہیں، اور محقق مفسرین نے ان کو رد کیا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان آیات میں بت پرستی کے شرک کا ذکر ہے جیسا کہ آیت ۱۹۵ میں واضح کر دیا ہے اور کم از کم بت پرستی کی ابتدا حضرت آدم کی طرف آج

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین آدم علیہ السلام

تک کسی نے منسوب نہیں کی۔“ (بیان القرآن جلد اول ص ۵۴۷-۵۴۸ تحت حاشیہ نمبر ۱۱۸۸) شیعہ مفسر سید فرمان علی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

اس قصہ کی ابتداء اگرچہ حضرت آدم سے ہے مگر پھر ان کی اولاد کا بیان شروع کر دیا اور یہ حالت بھی ان کی اولاد ہی کی ہے۔ اسی وجہ سے خدا نے ”فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ“ میں جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے اور اس کے قبل متثنیہ (آتھما، جعلہما، آتھما) کے صیغہ میں عام میاں بیوی کی حالت بیان کی ہے، مطلب یہ ہے کہ لوگ ایسا کیا کرتے ہیں اور اسی بناء پر اپنے لڑکوں کا نام پیر بخش، سالار بخش وغیرہ رکھتے ہیں یعنی خدا نے انہیں دیا بلکہ پیر میاں یا مدر میاں نے عطا کیا ہے۔ (القرآن العظیم ص ۲۸۹ تحت آیت)

ایک دوسرے شیعہ مفسر امدا حسین کاظمی ”جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ“ کے تحت لکھتے ہیں کہ: ”تفسیر صافی صفحہ ۱۸۸ پر بحوالہ عیون اخبار الرضا منقول ہے کہ مامون نے جناب امام رضا علیہ السلام سے دریافت کیا کہ یا بن رسول اللہ! کیا آپ یہ نہیں ارشاد فرماتے کہ انبیاء معصوم ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ مامون نے عرض کی کہ پھر اللہ تعالیٰ کی اس آیت کا مطلب کیا ہے؟ ”قُلْ مَا آتَاهُمَا صَلَاحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ“ امام رضا علیہ السلام نے فرمایا کہ حضرت خوا کے پانچ سوم تبار دلا ہوئی اور ہر بار ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوئی اور آدم و حوا نے خدا تعالیٰ سے یہ معاہدہ کیا تھا اور یہ دعا کی تھی کہ اگر ہمارے بچے صحیح و سالم یعنی ہر قسم کے عیب سے بری پیدا ہوں گے تو ہم تیرا شکر ادا کریں گے۔ اب جو اولاد پیدا ہوئی وہ دو قسم کی تھی یعنی مذکر بھی مؤنث بھی (مرد بھی اور عورت بھی)۔ اولاد میں ان دونوں قسموں (مذکر مؤنث) نے جو کچھ خدا تعالیٰ نے بجائے خود ان کو دیا اس میں شرک شروع کر دیا اور جیسا ان کے ماں باپ نے خدا کا شکر ادا کیا تھا، شکر نہ کیا۔ کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ“ مامون نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ فرزند رسول صلی اللہ علیہ وسلم برحق ہیں (اس کے بعد امداد حسین کاظمی لکھتے ہیں کہ:) امام علیہ السلام کے فرمان سے ثابت ہوا کہ آیہ مجیدہ میں جو متثنیہ کا صیغہ آیا ہے یعنی ”جَعَلَا“ اس سے دو یعنی آدم و حوا مراد نہیں بلکہ دونوں قسمیں یعنی مذکر اور مؤنث اولاد مراد ہے۔ جس سے واضح ہو گیا کہ شرک اولاد آدم (علیہ

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین آدم علیہ السلام

السلام) سے شروع ہوا نہ کہ آدم اور حوا سے، (القرآن المبین مع تفسیر المصطفیٰ ص ۲۲۶) جن مفسرین کرام نے سورۃ الاعراف کی آیت ۱۸۹ کے شروع میں: ”... نَفْسٍ وَاحِدَةٍ“ سے حضرت آدم کو مراد لیا ہے انہوں نے بھی آگے ”جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ“ کا رخ اولاد آدم کی طرف موڑ دیا ہے اور متثنیہ کے صیغوں سے اولاد آدم میں سے شرک خاوند بیوی مراد لئے ہیں کہ وہ پہلے تو اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں کہ ان کے ہاں صحیح اور تندرست بیٹا پیدا ہو اور وہ اس کا شکر ادا کریں گے مگر جب اللہ تعالیٰ ان کی دعا کے مطابق انہیں اس نعمت سے نوازتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں کہ یہ بیٹا تو انہیں فلاں ”حضرت اقدس“ کی برکت سے ملا ہے پھر اسی بزرگ کی نذر دنیا زدیتے ہیں اور بعض اس کا نام بھی مشرکانہ ہی تجویز کرتے ہیں مثلاً عبدود، عبد یغوث، عبد المات، عبد مناف، عبد العزیز، عبد الشمس، عبد مناف، عبد الکعبہ، پیراں دتہ، پیر بخش، نبی بخش، علی بخش، حسین بخش وغیرہ۔

مشہور عالم اور لغت کے امام زین الدین محمد بن ابی بکر الرازی (م ۶۲۶ھ) فرماتے ہیں کہ: ”جَعَلَا لَهُ“ سے مراد: ”جَعَلْ أَوْلَادَهُمَا“ یعنی ان (آدم و حوا) کی اولاد اللہ تعالیٰ کے شریک قرار دیے گئی۔ یعنی یہاں مضاف محذوف ہے۔ اسی طرح ”فِيمَا آتَاهُمَا“ میں ان کی اولاد مراد ہے۔ اس کی تائید اس قول باری تعالیٰ سے ہوتی ہے: ”فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ“ کیونکہ یہاں جمع کی ضمیر لائی گئی ہے۔ ”یُشْرِكُونَ“ نہیں فرمایا ہے اور آدم و حوا علیہما السلام کی اولاد کا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیز میں اللہ کے شریک کرنے کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد کا نام عبد العزیز، عبد مناف، عبد شمس وغیرہ رکھا۔ حالانکہ ان کو چاہئے تھا کہ ان ناموں کی جگہ عبد اللہ، عبد الرحمن، عبد الرحیم وغیرہ رکھتے۔ (نکات القرآن - مسائل الرازی و أجوبتها من غرائب آی التنزیل ص ۱۳۲۔ مطبوعہ دارہ اسلامیات لاہور۔ کراچی)

محقق مفسرین کی رائے یہ ہے کہ: ”قُلْ مَا آتَاهُمَا صَلَاحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا“ میں متثنیہ کی تینوں ضمیریں حضرت آدم اور حوا کی طرف راجع نہیں بلکہ ان دونوں کی اولاد کے مردوں اور عورتوں کی طرف راجع ہیں یا یوں کہو کہ ان کی نسل میں سے دو مختلف جنسوں کی طرف راجع ہیں اور تقدیر کلام الہی اس طرح سے ہے: ”قُلْ مَا آتَى اللَّهُ آدَمَ وَ حَوَّاءَ الْوَلَدَ

الصالح الذي تمنيا و طلباء جعل كفار أولادهما ذلك مضاعفاً أي غير الله
یعنی جب اللہ تعالیٰ نے آدم اور حواء کو فرزند صالح عطا فرمایا جس کی ان دونوں نے
خواہش کی تھی تو آئندہ چل کر ان کی کافراولاد نے اس کو غیر خدا کی طرف منسوب کیا۔

اور اس تاویل کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ: ”ففعلى الله عما يشركون“ میں لفظ
”یشركون“ صیغہ جمع کا لایا گیا ہے اور ”یشركون“ صیغہ تشبیہ کا نہیں لایا گیا۔ معلوم ہوا کہ خود
حضرت آدم اور حواء مراد نہیں بلکہ یہ شرک کسی جماعت سے صادر ہوا ہے جو اولاد آدم سے ہے اور
مسلسل شرک میں گرفتار ہیں کیونکہ ”عما يشركون“ میں مضارع کا صیغہ ہے جو استمرار و تکرار کی
کے لئے لایا گیا ہے معاذ اللہ جس کا حضرت آدم اور حواء کے بارے میں تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

معاذ اللہ اگر آیت میں حضرت آدم اور حواء کا شرک مراد ہوتا تو ”فعلى الله عما يشركون“ بصیغہ
تشبیہ آتا معلوم ہوا کہ ”جعل له شركاء“ کی ضمیر تشبیہ ”جنسین یا نعوین مختلفین“ کی
طرف راجع ہے نہ کہ آدم و حواء کی طرف۔ (معارف کا دھلوئی بحوالہ گلدستہ تفسیر جلد ۶ ص ۶۲۹)
مفسرین کرام نے ”نفس واحدة“ سے قصی بن کلاب بھی مراد لیا ہے اور کہا ہے کہ
”وجعل منها اى من جنسها زوجها عريضة قريضة“ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نفس واحدہ
سے اس کی بیوی کو پیدا کیا، اور ان دونوں کا شرک یہ تھا کہ اپنے بیٹوں کا نام عبد مناف، عبد العزیٰ،
عبدالدار اور عبد القصى رکھا تھا جبکہ ”یشركون“ کی ضمیر ان دونوں قصی اور اس کی بیوی اور ان کے
بیروکاروں کی طرف راجع ہے لہذا ”جعل له شركاء“ تشبیہ کی ضمیر آدم و حواء کی طرف راجع نہ ہوئی۔

امام ابن حزم اندلسی (م ۴۵۶ھ) منکرین عصمت انبیاء کو ”جعل له شركاء“ کے
تحت جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

فهذا تكفير لآدم عليه السلام، و من نسب لآدم عليه السلام الشرك والكفر،
كفر مجرداً بلا خلاف من أحد من الامة، ونحن ننكر على من كفر المسلمين
العصاة، العشارين، القتالين، والشرط، الفاسقين، فكيف من كفر الانبياء عليهم
السلام؟ وهذا الذي نسبوه إلى آدم عليه السلام من انه سمى ابنه عبد الحارث،

خرافة، موضوعة، مكتوبة من تأليف من لا دين له ولا حياء، ولم يصح سندها قط،
واتما نزلت في المشركين على ظاهرها... (الفصل في الملل والأهواء والنحل جلد
۴ ص ۵۔ بحوالہ الفوائد التفسيرية السلفية جلد ۲۔ ص ۸۰۳)

اس آیت کا مصداق حضرت آدم کو سمجھنا ان کی تکفیر کا باعث ہے اور جو شخص آدم کی
طرف شرک اور کفر کی نسبت کرے وہ بلا اختلاف اور باتفاق رائے خود شرک اور کافر ہے۔ ہم
تو قائل، گناہگار، بد معاش اور فاسق مسلمان کو کافر کہنے والے پر اعتراض کرتے ہیں تو انبیاء کی
تکفیر کرنے والا قابل اعتراض کیوں نہ ہوگا؟ یہ قصہ جو آدم کی طرف منسوب ہے کہ انہوں نے
شیطان کی انگیزت سے اپنے لڑکے کا نام ”عبد الحارث“ رکھ دیا تھا بالکل اختراعی، من گھڑت،
موضوع اور جھوٹا ہے اور کسی بے حیا و بے دین کا خود ساختہ ہے۔ اس کی سند قطعاً درست نہیں۔
در اصل یہ آیت اپنے ظاہر کے اعتبار سے مشرکوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

امام ابن کثیر دمشقی (م ۷۴۷ھ) نے منقولہ روایتوں پر محمد ثناء نے بحث کر کے ان کا
ضعف ثابت کیا ہے اور واضح طور پر بتایا ہے کہ ان روایتوں کا منبع دوسرے چشمہ ”اسرائیلیات“
ہے (وهذه الآثار يظهر عليها والله أعلم أنها من آثار اهل الكتاب) اہل کتاب کی
روایات کو تین درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور تینوں کے الگ الگ حکم ہیں۔

۱۔ اہل کتاب کے وہ قصے، واقعات اور اخبار روایت ثار جن کے صدق کو ہم جانتے ہیں
کتاب اللہ اور احادیث رسول سے ان کی تائید ہوتی ہے تو ان روایات کو صحیح سمجھا جائے گا۔
اور ان کو بطور تائید اور شہادت زائد کے پیش بھی کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ دوسری قسم میں اہل کتاب کے وہ آثار روایات ہیں جن کے جھوٹے ہونے کو ہم
جانتے ہیں اور وہ قرآن وحدیث کی تصریحات کے خلاف ہیں، کتاب وسنت ان کی تکذیب
کرتے ہیں وہ قطعاً مردود اور ناقابل قبول ہیں اور ان کا بیان کرنا جائز نہیں۔

۳۔ تیسری قسم میں وہ آثار روایات ہیں جن کا صدق و کذب معلوم نہیں۔ نہ ان کا صحیح ہونا
معلوم اور نہ ان کا جھوٹ ہونا ثابت ہے۔ یہ اخبار روایت مسکوت عنہ کے درجے میں ہیں۔ ہم نہ ان کی

تائید کریں گے اور نہ اسے غلط کہیں گے اور ان کے ذکر کرنے کی اجازت ہے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: ”حَكُّوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ“ اور یہ وہ آٹا رہیں جن کی نہ تصدیق کی جاتی ہے اور نہ تکذیب۔ ”وَهُوَ الَّذِي لَا يَصْدُقُ وَلَا يَكْذِبُ لِقَوْلِهِ: ”قُلَا تَصَدَّقُوا هُمْ وَلَا تَكْذِبُوا هُمْ“

زیر بحث آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں اہل کتاب کی ان روایتوں کو ہم دوسری قسم میں شمار کریں گے جن کے جھوٹے ہونے کو ہم جانتے ہیں اور وہ قرآن وحدیث کی تصریحات کے خلاف ہیں۔ کتاب وسنت ان کی تکذیب کرتے ہیں کیونکہ انبیاء کرام معصوم ہوتے ہیں، ان سے شرک کا صدور ممکن ہی نہیں بلکہ یہ روایات دوسری قسم میں داخل ہیں (”وَهَذَا الْأَثَرُ هُوَ مِنَ الْقِسْمِ الثَّانِي أَوْ الثَّالِثِ فِيهِ نَظَرٌ“) ملاحظہ ہو: تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر۔

المجلد الثانی ص ۲۸۴-۲۸۵ طبع بیروت۔ الطبعة الثالثة ۲۰۰۳ء/ ۱۴۲۴ھ

مولانا عبدالمجید دریا آبادی ”جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ“ کے تحت لکھتے ہیں کہ:

قول محقق یہ ہے کہ بنی آدم میں ہر نفس اور زوج نفس مراد ہیں بعض تابعین سے بھی یہی قول ہے۔۔۔ اور محققین نے یہ بھی لکھا ہے کہ آیت میں ضمیر آدم و حواء کی طرف راجع کرنے کی کوئی تائید نہ قرآن سے ملتی ہے اور نہ حدیث صحیح سے اور نہ ایسے قصے پیغمبروں کے لائق ہیں:

”لَمْ تَنْبِتْ فِي الْقُرْآنِ وَلَا حَدِيثٍ صَحِيحٍ فَأُطْرَحَتْ ذِكْرُهُ (البحر المحیط) و أمثال ذلك لا تليق بالأنبياء (بيضاوی) (تفسیر ماجدی مطبوعہ لاہور جلد ۱ ص ۳۷۰)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (م ۱۹۷۹ء) لکھتے ہیں کہ:

اس تقریر کے سمجھنے میں ایک بڑی غلط فہمی واقع ہوئی ہے جسے ضعیف روایات نے اور زیادہ تقویت پہنچا دی۔۔۔ اس غلط فہمی پر روایات کا ایک خول چڑھ گیا اور ایک پورا قصہ تصنیف کر دیا گیا کہ حضرت حواء کے بچے پیدا ہو کر مر جاتے تھے۔ آخر کار ایک بچے کی پیدائش کے موقع پر شیطان نے ان کو بہکا کر اس بات پر آمادہ کر دیا کہ اس کا نام عبدالحارث (بندہ شیطان) رکھ دیں۔ غضب یہ کہ ان روایات میں سے بعض کی سند نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی پہنچا دی گئی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تمام روایات غلط ہیں اور قرآن کی عبارت بھی ان کی تائید نہیں کرتی۔ (تفہیم القرآن جلد ۲ ص ۱۰۷-۱۰۸)

منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

گذشتہ تفصیل سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ امام طبری کی منقولہ روایات کا تعلق ”اسراہیلیات“ سے ہے۔ ان میں سے یہاں صرف تین روایتوں کی استنادی حیثیت نذر قارئین کی جاتی ہے۔

۱۔ حَلَّثَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ حَلَّثَنَا عَبْدُ الصَّمَدِ قَالَ حَلَّثَنَا عُمَرُ بْنُ اِبْرَاهِيمَ عَنْ قَتَادَةَ، عَنِ الْحَسَنِ، عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدَبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ...

یعنی سرہ بن جندبؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ:

حضرت ؑ کے لڑکے زندہ نہیں رہتے تھے تو انہوں نے نذرمانی کہ اگر لڑکا بچ گیا تو اس کا نام ”عبدالحارث“ رکھوں گی پھر ان کا لڑکا بچ گیا تو انہوں نے اس کا نام عبدالحارث رکھ دیا اور یہ نام رکھنا شیطان کی وحی سے تھا۔ (جامع البیان فی تاویل القرآن الجلد السادس ص ۱۴۴ تحت رقم ۱۵۵۲۳)

قطع نظر راویوں کے حالات، اس حدیث کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا حضرت آدم ؑ کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی توہین ہے اور اس حدیث کو گھڑنے والا اور اسے بلا تحقیق آگے نقل کرنے والا ان احادیث کا مصداق ہے:

”مَنْ كَذَّبَ عَلَيَّ فَلْيَبْتَؤْ مُقْعَلَةً مِنَ النَّارِ“

(صحیح بخاری کتاب العلم باب اثم من كذب على النبي - رقم الحديث ۱۰۷)

جو مجھ پر جھوٹ بولے گا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم جان لے۔

”كُفِّي بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُخْلِكَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ“

(صحیح مسلم۔ باب النهی عن الحديث بكل ما سمع۔ جلد ۱۔ ص ۸)

کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لئے بس اتنی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کرتا پھرے (اور اس کی تحقیق نہ کرے)

امام طبری --- کون؟ توہین آدمؑ: منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

زیر نظر عنوان ”تفسیر طبری اور توہین آدمؑ“ کے تحت تفسیر طبری سے پیچھے جو ۹ روایات نقل کی گئی ہیں ان میں سے یہ واحد روایت ہے جس کی سند نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پہنچائی گئی ہے۔ جس کو مودودی صاحب نے ”غضب“ قرار دیا ہے۔

سمرہ بن جندبؓ سے اس حدیث کو حضرت حسن بصری کے واسطے سے بیان کیا گیا ہے، محقق مفسرین نے اس کو حسن بصری کی روایت ماننے سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ امام ابن کثیر فرماتے ہیں:

”یہ حدیث تین وجوہ سے معلول ہے۔ تیسری وجہ کے تحت بتاتے ہیں کہ حضرت حسن نے آیت کی تفسیر اس حدیث کے خلاف کی ہے۔ جب انہوں نے ”شُرک“ کی نسبت اولاد آدمؑ کی طرف کی ہے اگر ان کو علم ہوتا کہ اس کی تفسیر میں حدیث مرفوعہ موجود ہے تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تفسیر کے ہوتے ہوئے اپنے طور پر اس کی تفسیر بیان کریں۔ اس حدیث مرفوعہ میں سمرہ بن جندبؓ سے روایت کرنے والے خود حسنؓ ہیں اگر حسنؓ کو سمرہؓ والی حدیث کا علم ہوتا تو وہ اس کو کیوں کر نظر انداز کر سکتے تھے؟ اس سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ حسنؓ کی سند سے جو مرفوع حدیث بیان کی جاتی ہے وہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔ حضرت حسنؓ سے اس روایت کو آگے ”قنادہ“ بیان کرتے ہیں جب حسنؓ کو یہ حدیث معلوم تک نہ تھی تو وہ اسے ”قنادہ“ کے سامنے کس طرح بیان کر سکتے تھے؟

پھر قنادہ سے اسے روایت کرنے والے ابو حفص العبدی البصری ”عمر بن ابی اییم“ ہیں اور یہی ذات شریف اصل خرابی کی جڑ ہیں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

”وہو یروی عن قتادة أحادیث مناکیر یخالف“

(الضعفاء الکبیر جلد ۳ ص ۱۴۶، تہذیب المعجم جلد ۷ ص ۳۷۳)

عمر بن ابی اییم قنادہ سے ثقافت کے مخالف اور متکرا حدیث بیان کرتا ہے۔

ابو حاتم نے کہا: اس کی حدیث کو دلیل کے طور پر پیش نہ کیا جائے۔

ابن عدی نے کہا: ”وہو حلیثہ عن قتادة خاصة مضطرب“ (الکامل فی ضعفاء الرجال)

امام طبری --- کون؟ توہین آدمؑ: منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

اس کی احادیث مضطرب ہوتی ہیں خاص کر قنادہ سے اور یہ شخص قنادہ سے ایسی روایتیں لاتا ہے جو قنادہ کی دوسری روایتوں کے مخالف ہوتی ہیں۔

ابن حبان نے کہا کہ غلطیاں کرنا اور دوسرے راویوں کی مخالفت کرنا اس کی عادت مستمرہ ہے۔

۲۔ امام طبری دوسری روایت اس ”سند“ سے نقل کرتے ہیں:

حلیثنا ابن حمید قال، حدثنا سلمة، عن ابن اسحاق، عن داود بن الحصین، عن عكرمة عن ابن عباس...

اس روایت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت حواء کی جواو لاد ہوتی تھی وہ انہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے مخصوص کر دیتی تھیں اور ان کے نام ”عبید اللہ، عبد اللہ“ وغیرہ رکھتی تھیں۔ یہ بچے مرجاتے تھے۔ چنانچہ آدمؑ و حواء کے پاس ابلیس آیا اور کہنے لگا کہ: اگر آپ اپنے بچے کا ان ناموں کے علاوہ کوئی دوسرا نام رکھیں گے تو وہ زندہ رہے گا۔ پس حواء کا ایک بچہ پیدا ہوا تو ان دونوں (آدمؑ و حواء) نے اس کا نام ”عبد الحارث“ رکھا۔ اسی کے متعلق سورۃ الاعراف کی یہ آیات مازل ہوئی ہیں۔ (تفسیر الطبری المجلد السادس ص ۱۴۴ تحت رقم ۱۵۵۲۷)

اسے عبد اللہ بن عباسؓ سے عکرمہ کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے جو یریری غلام ہیں اور مولیٰ ابن عباسؓ کے نام سے معروف ہیں۔ ائمہ رجال نے جہاں ان کی ”توثیق“ کی ہے تو وہیں ان پر جرح بھی کی ہے۔ یہ تو خیر پھر بھی ”مجرع“ ہیں اس قسم کی روایات اگر کسی ”رجسڑ“ ولی سے بھی منقول ہوتیں تو قرآن وحدیث اور عقیدہ عصمت انبیاء کے خلاف ہونے کی بناء پر ”راوی“ کے منہ پر ماری جاتیں۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ”عکرمہ“ کی توثیق اور ان پر عائد اعتراضات کا جواب نقل کر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

”اور اگر بالفرض عکرمہ کے جنازے میں واقعہ لوگ کم شریک ہوئے ہوں تب بھی جن حالات میں عکرمہ کی وفات ہوئی ہے ان کے پیش نظر کچھ بعید نہیں کیونکہ تمام تواریخ میں تصریح ہے کہ ایک عرصہ سے حکومت نے ان کے خلاف گرفتاری کے احکام جاری کئے ہوئے تھے جن کی

امام طبری --- کون؟ توہین آدمؑ: منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

بناء پر وہ روپوش ہو گئے تھے اور اسی روپوشی کی حالت میں ان کا انتقال ہوا، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں لوگوں کو ان کی وفات کا پورا علم نہ ہو سکا ہوگا اس لئے ان کے جنازے میں شرکت زیادہ نہ ہو سکی۔ اس سے یہ نتیجہ کون عقل مند نکال سکتا ہے کہ لوگوں کے دل میں ان کا احترام ایک شاعر سے بھی کم تھا؟ (علوم القرآن ص ۶۸۔ مکتبہ دارالعلوم کراچی طبع اول ۱۳۹۶ھ)

موصوف نے اس بات کی وضاحت نہیں فرمائی کہ حکومت نے کن ”اثرات“ کے تحت عکرمہ کی گرفتاری کے احکام جاری کئے تھے اور انہوں نے حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے مفرور ہو کر روپوشی کیوں اختیار کی؟ اس ”غراور روپوشی“ سے تو حکومتی اثرات درست ثابت ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عکرمہ نے ۱۰۶ھ یا ۱۰۷ھ میں ہشام بن عبد الملک کے عہد خلافت میں وفات پائی۔ ظاہر ہے کہ گرفتاری کے احکام بھی اسی دور میں جاری ہوئے ہیں۔ مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہشام ایک نہایت ہی حلیم، عقیف، مدبر، دین دار اور حوصلہ مند فرماں روا تھے۔ ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ خود بڑی سادہ اور بے تکلف زندگی بسر کرتے تھے، بڑے تیز فہم آدمی تھے اور اتنی وسیع حکومت کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ کی براہ راست خود نگرانی کرتے تھے۔ ان کی انتظامی قابلیت کے توان کے دشمن بھی قائل تھے لیکن ان کے حلم اور دین داری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر علویوں اور عباسیوں نے ایک خفیہ مصلحہ کے ذریعے عباسی خلافت کے قیام کے لئے ان ہی کے دور میں باقاعدہ تحریک کا بھی آغاز کیا۔ ملاحظہ ہو: (خلافت اسلامیہ ص ۱۲۵-۱۲۶۔ مؤلفہ مولانا عبدالقدوس ہاشمی)

ہشام بن عبد الملک کو تو ان ”بارہ خلفاء“ میں شمار کیا گیا ہے جن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت دی ہے کہ اسلام بارہ خلفاء کے دور تک ہمیشہ غالب رہے گا، جو سب کے سب قریشی ہوں گے اور ان پر امت کا اجماع و اتفاق بھی ہوگا۔ ملاحظہ ہو: صحیح بخاری رقم الحدیث ۲۲۲۷۔ صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۱۹۔ سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۲۳۹

خود حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب کی تالیف لطیف میں بھی یہ فہرست موجود ہے:-

”... ثم اجتمعوا على تولاه الأربعة الوليد، ثم سليمان، ثم يزيد (بن عبد الملك)

امام طبری --- کون؟ توہین آدمؑ: منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

ثم هشام... (تكملة فتح الملهم المجلد الثالث ص ۲۸۴۔ مکتبہ دارالعلوم کراچی) اس سے تو یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ”عکرمہ“ دیگر مخصوص نظریات و افکار کے حامل ہونے کے علاوہ خلافت کے باغیوں کے ساتھ بھی روابط رکھتے تھے۔

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب عکرمہ پر لگے ”خارجیت“ کے الزام کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ”اسی طرح ان پر خارجی ہونے کا جو الزام لگایا گیا ہے اس کے بارے میں حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں کہ وہ کسی قابل اعتماد ذریعہ سے ثابت نہیں ہوا۔ البتہ ہوا یہ ہے کہ انہوں نے بعض جزوی فقہی مسائل میں ایسا مسلک اختیار کیا تھا جو خارجیوں کے مطابق تھا، اس سے بعض لوگوں نے انہیں خارجییت کی طرف منسوب کر دیا“ (علوم القرآن ص ۶۵-۶۶)

علامہ محمد بن سعد (م ۲۴۰ھ) عکرمہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ:

سعيد بن جبیر سے مروی ہے کہ اگر عکرمہ لوگوں سے اپنی حدیث بیان کرنے سے باز رہیں تو ضرور ان کی جانب سفر کیا جائے... طاؤس سے مروی ہے کہ اگر ابن عباس کے یہ مولیٰ اللہ سے ڈریں اور اپنی حدیث بیان کرنے سے باز رہیں تو ان کی جانب سفر کیا جائے... مصعب بن عبد اللہ بن مصعب بن ثابت الزبیری سے مروی ہے کہ عکرمہ خوارج کی سی رائے رکھتے تھے۔ انہیں مدینے کے کسی والی نے طلب کیا اور داؤد بن الحصین کے پاس پوشیدہ کر دیا، انہیں کے پاس ان کی وفات ہوئی۔ لوگوں نے کہا عکرمہ کثیر العلم و کثیر الحدیث اور دریاؤں میں سے ایک دریا تھے، ان کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جاتا، لوگ ان کے ثقہ ہونے کے بارے میں کلام کرتے تھے۔“ (طبقات ابن سعد اردو۔ جلد پنجم ص ۲۷۶-۲۸۰ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی)

عکرمہ کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے صاحبزادے کی شہادت ملاحظہ فرمائیں:

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

عبد اللہ بن حارث کا قول ہے کہ میں علی بن عبد اللہ بن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہاں عکرمہ باب الحش کے قریب زنجیروں میں بندھا ہوا تھا۔ میں نے ابن عباسؓ کے

امام طبری۔۔۔ کون؟ توہین آدمؑ: منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

صاحبزادے سے عرض کیا ”ألا تتقسی اللہ“ کیا آپ اللہ سے نہیں ڈرتے۔ انہوں نے فرمایا: ”فان هذا الخبيث يكذب علي أبي“ کہ یہ خبیث میرے باپ پر جھوٹ بولتا ہے۔ (تہذیب الہند جلد ۷ ص ۲۶۷ تحت عکرمہ)

امام ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ) نے بھی یہی واقعہ عبداللہ بن حارث کے حوالے سے ہی لکھا ہے کہ عکرمہ کجیوروں کے جھنڈ کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے صاحبزادے نے استفار پر یہی جواب دیا کہ ”ان هذا الخبيث يكذب علي أبي“ ملاحظہ ہو میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۹۴ تحت عکرمہ ترجمہ نمبر ۵۷۱۶)

امام سعید بن مسیب (م ۹۴ھ) اپنے غلام برد کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ”يا برد لا تكذب علي كما كذب عكرمة علي ابن عباس“ اے برد! مجھ پر اس طرح جھوٹ نہ بولنا جس طرح عکرمہ نے عبداللہ بن عباسؓ پر جھوٹ بولا ہے۔ (تہذیب الہند جلد ۷ ص ۲۶۸)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے شاگرد منافع سے کہتے ہیں کہ: ”اتق الله ويحك يا نافع ولا تكذب علي كما كذب عكرمة علي ابن عباس“ اے نافع! اللہ سے ڈرو اور مجھ پر کوئی جھوٹ نہ بولنا جس طرح عکرمہ نے ابن عباسؓ پر بولا ہے۔ امام ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ) بحوالہ یعقوب الحضرمی فرماتے ہیں کہ ایک بار عکرمہ نے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا کہ اس مسجد میں جتنے لوگ ہیں وہ کافر ہیں۔ ”وقال كان يرى رأى الأباضية“ اور راوی نے کہا: عکرمہ اباضیہ (خوارج کا ایک فرقہ) کا ہم خیال تھا۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ تحت عکرمہ)

امام ذہبیؒ نے عکرمہ کی توثیق کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ: ”كذبہ مجاهد و ابن سيرين و مالك... قال أحمد: كان يرى رأى الخوارج الصفرية، وقال ابن المنيب: كان عكرمة يرى رأى نجلة الحرورية“ (المعرفة لرواة المتكلم فيهم ص ۱۴۸، ۲۴۲۔ تحت عکرمہ)

امام طبری۔۔۔ کون؟ توہین آدمؑ: منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

مجاہد (م ۱۰۰ھ) ابن سیرین (م ۱۱۰ھ) اور امام مالک (م ۱۷۹ھ) نے اسے کذاب قرار دیا ہے۔ امام احمد کہتے ہیں کہ یہ خارجیوں کا عقیدہ رکھتا تھا۔ ابن المذہبی کہتے ہیں کہ اس کے عقائد حروریوں کے تھے۔

اس تفصیل سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک عکرمہ جھوٹا بھی تھا اور خارجی، اباضی اور حروری بھی، معلوم نہیں کہ اس کی کتنی ہی جھوٹی روایات کتب تفسیر و حدیث میں جگہ پاگئی ہیں۔ لگے ہاتھوں عکرمہ کا ایک یہ جھوٹ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حضرت معاویہؓ کے خلاف یہ شکایت کی گئی کہ وہ ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں تو انہوں نے جواب فرمایا کہ: ”دعه فانه قد صحب رسول الله صلى الله عليه وسلم... أصاب أنه فقيه“ (صحیح بخاری۔ کتاب فضائل اصحاب النبی باب ذکر معاویہ۔ رقم الحدیث ۴۳۶۴۔ ۴۳۶۵)

اس بات کو رہنے دیں۔ انہوں (یعنی معاویہؓ) نے یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف اٹھایا ہے... انہوں نے درست عمل کیا ہے کیونکہ وہ اپنی مسائل میں فقیہ و مجتہد ہیں۔ جبکہ امام طحاوی نے صحیح بخاری کی مذکورہ روایات کے برعکس اس مسئلہ میں بروایت عکرمہ حضرت ابن عباسؓ کا جو قول نقل کیا ہے اس میں نہ صرف حضرت معاویہؓ بلکہ خود ابن عباسؓ کی شدید توہین پائی جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

”أنه قال: كنت مع ابن عباس عند معاوية يتحدث حتى هزيع من الليل فقام معاوية فركع ركعة واحدة، فقال ابن عباس من أين ترى أخذها الحمار“ (طحاوی جلد ۱ ص ۱۹۹۔ باب الوتر) اس روایت میں لفظ ”الحمار“ کی حضرت معاویہؓ کی طرف نسبت یقیناً حضرت معاویہؓ کے ساتھ عکرمہ کے اپنے بغض و عناد کا ثبوت ہے جسے اس نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بنا کر پیش کیا جسے امام طحاوی نے نہ صرف اپنی کتاب میں محفوظ کیا بلکہ عکرمہ کو سچا اور ثقہ و صدوق سمجھتے ہوئے صحیح بخاری میں موجود حضرت ابن عباسؓ کے قول کو ”تقیہ“ یعنی منافقت پر محمول کیا چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: ”وقد يجوز أن يكون قول ابن عباس أصاب معاوية على التقية له أي“

امام طبری --- کون؟ توہین آدم: منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

أصاب في شئ آخر لأنه كان في زمنه... (طحاوی جلد ۱ ص ۱۹۹۔ باب الوتر)
یعنی ابن عباسؓ چونکہ حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں ان کے ماتحت تھے اس لئے وہ حق بات کے اظہار کی جرأت نہ کر سکے، انہوں نے بطور تقیہ حضرت معاویہؓ کے ایک رکعت وتر پڑھنے کی تائید و تصویب کی، ان کی زبان پر تو ”قلصاحب رسول الله صلى الله عليه وسلم... أصاب إته فقيه“ کے الفاظ تھے لیکن دل میں انہوں نے معاویہؓ کی کسی دوسری بات کی تصویب کا قصد کیا ہوا تھا۔ لا حول ولا قوة إلا بالله العلی العظيم۔

سخت حیرت ہے کہ عصر حاضر کے ایک جلیل القدر محدث اور شارح بخاری علامہ محمد انور شاہ کاثمیری (۱۳۵۲ھ) نے صحیح بخاری کے متن کو ”مستر د“ کرتے ہوئے اس کی تشریح میں طحاوی کی مذکورہ مبنی بر توہین روایت کو ترجیح دے دی۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ: ”... قلت وليس فيه تصويب له، بل إغماض و نحو تسامح عنه، وعند الطحاوي فقام معاوية فركع ركعة واحدة، وقال ابن عباس من أين ترى أخلاها الحمار، فإن الكلمة شديدة“۔ (فيض الباری جلد ۴ ص ۷۰)
”میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباسؓ کے اس قول ”أصاب إته فقيه“ میں حضرت معاویہؓ کے فعل کی تائید و تصویب نہیں ہے بلکہ ”چشم پوشی“ اور ”تسامح“ ہے۔ جبکہ طحاوی کے نزدیک یہ بات ہے کہ معاویہؓ گھڑے ہوئے تو انہوں نے ایک رکعت پڑھی جس پر ابن عباسؓ نے کہا: اس گدھے نے ایک رکعت کہاں سے اخذ کر لی؟“

گویا حضرت شاہ صاحب کے نزدیک حضرت معاویہؓ کی توہین پر مبنی یہ روایت صحیح ہے اور ابن عباسؓ نے نہ صرف تقیہ اور چشم پوشی کی بلکہ ان سے تسامح واقع ہوا ہے کیونکہ یہ ایک سخت کلمہ ہے جس کو ”تصویب“ نہیں کہا جاسکتا۔

سخت تعجب ہے کہ موصوف نے ”أصاب إته فقيه“ کہنے پر حضرت ابن عباسؓ کے قول کی یہ توجیہ کی کہ ”قلت وليس فيه تصويب له بل إغماض و نحو تسامح عنه“ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو (العیاذ باللہ) ”الحمار“ کہنے پر نہ اسے ابن عباسؓ کا ”إغماض و تسامح“

امام طبری --- کون؟ توہین آدم: منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

قراردیا اور مذہبی اسے راوی عکرمہ کی کیفیت ذی سمجھا اور صرف ”فان الكلمة شديدة“ کہہ کر بحث خفیہ کے حق میں سمیٹ دی اور وہ عظیم طلبہ حدیث بھی اس فصیح و بلیغ تبصرے پر مطمئن ہو گئے! افسوس ہے کہ مسلک خفیہ کے اثبات میں حضرت کو اتنی محویت ہوئی کہ اس طرف دھیان نہیں جاسکا کہ اس سے صحابہ کرام کے اخلاق و کردار کی کتنی بھیانک منظر کشی ہو گئی ہے۔

قارئین کرام! امام بخاری تو حضرت معاویہؓ کی فضیلت اور منقبت میں باب ذکر معاویہؓ کے تحت خود حضرت ابن عباسؓ سے مروی ”قد صاحب رسول الله... أصاب أنه فقيه“ کی روایات لا رہے ہیں اور عصر حاضر کے شارح بخاری اس ”تصویب“ کی ”تخلیط“ فرماتے ہوئے طحاوی کی اس مبنی بر توہین روایت سے استدلال فرما رہے ہیں کہ ابن عباسؓ نے حضرت معاویہؓ کی خلافت کے زمانے میں ”تقیہ“، تصویب کی تھی جبکہ ان کا اصل قول وہ ہے جسے امام طحاوی نے نقل کیا: ”من أين ترى أخلاها الحمار“۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ طحاوی کی مذکورہ روایت کی تصویب سے حضرت معاویہؓ اور حضرت ابن عباسؓ دونوں کی توہین ہوتی ہے۔

کاش یہ شارح بخاری راویوں کی جامع تلاشی لیتے اور عکرمہ کے چہرے سے نقاب اٹھاتے اور اصل حقیقت واضح کرتے کہ یہ ساری کارستانی عکرمہ کی ہے حضرت ابن عباسؓ سے اس کا دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔

بالکل سچ فرمایا حضرت ابن عباسؓ کے بیٹے نے کہ: ”إن هذا الخبيث يكلذب على أبي“ یہ (یعنی عکرمہ) خبیث میرے باپ پر جھوٹ بولتا ہے۔

امام طبری نے بھی ”عن عكرمة عن ابن عباس“ کی سند سے حضرت آدمؑ اور حضرت حواءؑ کو آیت ”تَجَعَلَا لَهٗ شُرَكَاءَ...“ کا مصداق قرار دیا ہے اس طرح انہوں نے ”عکرمہ“ کی بدولت انہیں ”شرك في الطاعة“ کا مرتکب قرار دے دیا۔ فی اسفا۔

دوسرے ”اکاذیب“ کی طرح یہ بھی عکرمہ کا ”کذب“ ہے جو اس نے ابن عباسؓ کی طرف منسوب کر دیا۔

امام طبری۔۔۔ کون؟ توہین آدمؑ: منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

امام طبری کی منقولہ توہین آدم و حواء پر مبنی زیر بحث روایت کو ”عکرمہ“ سے بیان کرنے والے جناب داؤد بن الحصین ہیں۔ حافظ ابن حبان (م ۳۵۴ھ) نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ یہ ثقہ واقعہ سے بہت کم روایات لیتا ہے لہذا اس کی روایات سے اجتناب کرنا لازم ہے۔

حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے خصوصیت کے ساتھ اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ داؤد بن الحصین کی عکرمہ سے روایت منکر ہوتی ہے (میزان الاعتدال الجزء الاول ص ۲۷۱) زیر بحث روایت بھی داؤد بن حصین نے عکرمہ سے ہی بیان کی ہے۔

پھر داؤد بن حصین سے اسے آگے بیان کرنے والے جناب ”ابن اسحاق“ ہیں جو امام مغازی کے طور پر معروف ہیں۔ اکثر محدثین نے انہیں مجروح، مدس اور شیعہ قرار دیا ہے جبکہ بعض نے ان پر قدری یعنی منکر تقدیر ہونے کا الزام بھی عائد کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: تقریب العہد ص ۴۹۸۔ ترجمہ ۵۷۲۔

ہشام بن عروہ بن زبیرؓ نے ان کی تکذیب کی ہے۔ امام یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں: میں نے اللہ کے لئے ان سے روایت لیتا ترک کر دیا ہے۔ (الکامل فی ضعفاء الرجال جلد ۷ ص ۲۵۶) امام جوزجانی لکھتے ہیں کہ لوگ اس کی روایات پر فریفتہ ہیں حالانکہ یہ کئی قسم کی بدعات سے متہم تھا۔ (احوال الرجال ص ۱۳۲۔ ترجمہ ۲۳۰) امام دارقطنی فرماتے ہیں: قابل احتجاج و استدلال تو نہیں البتہ اس کی روایت بطور شاہد لکھی جاسکتی ہے۔ (سوالات البرقانی ص ۵۸۔ ترجمہ ۴۲۲) امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدر نے ابن اسحاق پر خوب جرح کرتے ہوئے اسے ”دجال من الدجالۃ“ تک قرار دیا ہے۔ (احسن الکلام جلد ۲ ص ۷۸۔ ۷۹) علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ:

امام زہری کے دروازے پر دربان مقرر تھا کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے نہ آئے لیکن محمد بن اسحاق کو عام اجازت تھی کہ جب چاہیں، چلے آئیں۔ ان کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی نسبت محدثین میں اختلاف ہے۔ امام مالک ان کے سخت مخالف ہیں لیکن محدثین کا عام فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایتیں استناد کے قابل ہیں۔ علامہ ذہبی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق، یہود و نصاریٰ سے روایت کرتے تھے اور ان کو ثقہ سمجھتے

امام طبری۔۔۔ کون؟ توہین آدمؑ: منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

تھے۔ ۵۱ھ میں وفات پائی۔ (سیرت النبی جلد اول ص ۵۱) زیر بحث روایت کو ابن اسحاق سے آگے نقل کرنے والے جناب سلمہ امش ہیں جو ”رے“ کے قاضی رہے ہیں۔ امام بخاری (م ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں کہ ”عندہ مناکیر“ ان کے پاس منکر احادیث ہیں۔ امام علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ: ”رہینا بحلیثہ قبل ان نخرج من الری“ ہم نے ”ری“ سے نکلنے سے پہلے ہی سلمہ بن فضل امش کی حدیثیں پھینک دی تھیں علاوہ ازیں امام ابن معین نے ان کے شیعہ ہونے کی بھی تصریح فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو: میزان الاعتدال الجزء الثاني ص ۱۹۲، التاريخ الكبير الجزء الرابع ص ۸۴۔

حافظ ابن عدی فرماتے ہیں کہ: ”ہی حلیثہ بعض المناکیر... ولہ افرادات و غرائب مسلمہ کی احادیث مناکیر و افرادات اور غرائب ہوتی ہیں۔ (الکامل فی ضعفاء الرجال الجزء الرابع ص ۳۶۹) امام طبری کی زیر بحث روایت کو سلمہ سے روایت کرنے والے موصوف کے استاذ و شیخ جناب محمد بن حُمَید رازی ہیں جن کے متعلق امام جوزجانی فرماتے ہیں کہ:

”کان ردی المذهب غیر ثقہ“ (احوال الرجال ترجمہ ۳۸۲)

ابن حمید بد مذہب اور ناقابل اعتماد و استناد ہے۔

محدث اسحاق بن منصور فرماتے ہیں کہ: میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کواہی دوں گا کہ محمد بن حمید جھوٹا تھا۔ (تاریخ بغداد جلد ۲ ص ۲۶۳۔ تہذیب الکمال جلد ۲۵ ص ۱۰۳) یعقوب ابن شیبہ فرماتے ہیں کہ: یہ کثرت سے منکر روایتیں بیان کرتا ہے۔ امام ابو زرعہ فرماتے ہیں: جھوٹا ہے۔ امام اسحاق کو حج فرماتے ہیں: میں کواہی دیتا ہوں کہ محمد بن حمید جھوٹا ہے۔ امام ابن خراش فرماتے ہیں کہ: ہم سے محمد بن حمید نے حدیث بیان کی اور اللہ کی قسم! وہ جھوٹ بولتا تھا اور بہت سے علماء سے منقول ہے کہ ابن حمید احادیث چوری کرتا تھا۔ امام نسائی فرماتے ہیں کہ: ثقہ نہیں۔ اور امام صالح جزرہ فرماتے ہیں: میں نے جھوٹ بولنے میں ابن حمید سے بڑھ کر کوئی تجربہ کار نہیں دیکھا۔ (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۵۳۰) امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ: ابن حمید ثقہ راویوں کے نام لے کر مقلوب روایات بیان کرنے میں

امام طبری۔۔۔ کون؟ تو بن آدم:۔۔۔ منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

منفرد ہوتا ہے۔ خصوصاً جب اپنے گاؤں کے اساتذہ سے روایت لیتا ہے: ”کان ممن ینفرد عن الثقات بالأشیاء المقلوبات ولا سیما اذا حدث عن شیوخ بلدہ“ (المجروحین من المحدثین جلد ۲ ص ۳۲۱۔ ترجمہ ۱۰۰۵)

پھر ابن حمید سے خود امام طبری یہ روایت صرف نقل ہی نہیں کرتے بلکہ رہتی دنیا تک کے لئے اپنی تفسیر میں محفوظ کر لیتے ہیں جن کے ”حالات و خدمات“ زیر نظر کتاب میں جا بجا پھیلے ہوئے ہیں اور قارئین ان سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہیں۔

اس طرح حضرت آدم و حواء کی تو بن پڑی زیر بحث دوسری روایت کا سلسلہ سند امام طبری کی ذات شریف سے لے کر حضرت عکرمہ تک (ابن جریر، ابن حمید، سلمہ، ابن اسحاق، داؤد بن الحصین، عکرمہ) کا قابل اعتماد اور جھوٹوں کا ”سلسلہ الذہب“ ہے۔

وائے افسوس ایسے کذابوں کی روایت کو صحیح سمجھ کر حضرت آدم و حواء کو ”جَعَلَا لَہُ شُرَکَآءُ“ کا مصداق قرار دے دیا گیا۔

۳۔ تفسیر طبری کی تیسری روایت کی ”عجیب و غریب“ سند ملاحظہ فرمائیں:

”حدثنی محمد بن سعد قال: حدثنی أبی، قال: حدثنی عمی قال:

حدثنی أبی، عن أبیہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما“

اس روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ عبد اللہ بن عباس حضرت آدم کے بارے میں اس آیت کریمہ: ”هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَہَا لِنَسَکُنَ بِہَا فَلَمَّا تَغَشَّہَا حَمَلُکَ حَمَلًا کَفِیْنًا قَمَرَتْ بِہِ فَلَمَّا اتَّقَلَّتْ دَعَا اللّٰہَ رَبَّہُمَا لَئِنْ اٰتٰیْتَنَا صَالِحًا لَنُکُوْنَنَّ مِنَ الشَّاکِرِیْنَ O“ (سورۃ الاعراف آیت ۱۸۹)

”اللہ وہ ذات ہے جس نے پیدا کیا تمہیں ایک نفس سے اور بنایا اس سے اس کا جوڑا تاکہ اطمینان حاصل کرے اس جوڑے سے۔ پھر جب اس نے اس جوڑے کو ڈھانپ لیا تو حاملہ ہو جاتی ہے ہلکے سے حمل سے پھر اس کے ساتھ چلتی پھرتی رہتی ہے۔ پھر جب وہ جو حمل ہو جاتی ہے تو دونوں (یعنی آدم و حواء) دعا مانگتے ہیں اپنے پروردگار اللہ سے کہ اگر تو

امام طبری۔۔۔ کون؟ تو بن آدم:۔۔۔ منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

عنایت فرمائے ہمیں تندرست لڑکا تو ہم ضرور رہو جائیں گے تیرے شکر گزار بندوں سے“ اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے امام طبری فرماتے ہیں کہ:

حضرت حواء کو شک تھا کہ وہ حاملہ ہوئی ہیں یا نہیں۔ جب حواء کو حمل کا یقین ہو گیا تو شیطان ان دونوں کے پاس آیا اور کہا: کیا تم دونوں جانتے ہو کہ تمہارے ہاں کیا بچہ پیدا ہوگا (تندرست یا معذور)؟ کیا تم جانتے ہو کہ وہ کس جنس سے ہوگا؟ کیا وہ کسی جانور کی شکل کا ہوگا یا انسانی شکل والا؟ پس اس کھلے گمراہ شیطان نے انہیں پھسلانا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس نے ان کے سامنے باطل کو خوش نما کر کے پیش کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے ان کے دوشے پیدا ہو چکے تھے جو دونوں مر گئے۔ لہذا شیطان نے آدم و حواء سے کہا کہ: اگر تم اپنے بچے کا نام میرے نام پر نہیں رکھو گے تو نورو تندرست پیدا ہوگا اور نہ ہی وہ زندہ رہے گا اور جس طرح پہلے بچے مر گئے تھے، یہ بھی مر جائے گا۔ جس پر انہوں نے اپنے بیٹے کا نام ”عبدالجارث“ رکھ دیا جس کی بناء پر وہ دونوں (آدم و حواء) اس آیت: ”فَلَمَّا اٰتٰیہَا صَالِحًا جَعَلَا لَہُ شُرَکَآءُ فِیْمَا اٰتٰیہَا فَتَعَلٰی اللّٰہُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ O“ (سورۃ الاعراف آیت ۱۹۰) کے مصداق ہو گئے۔ نعوذ باللہ

(پھر جب اللہ نے ان کی دعاء کے مطابق انہیں تندرست بچہ دیا تو وہ دونوں یعنی آدم و حواء اس یعنی اللہ کے ساتھ ”عبدالجارث“ نام رکھ کر شریک ٹھہرانے لگے اس عنایت میں جس سے اللہ نے ان دونوں کو نوازا پس بلند و برتر ہے اللہ ان سے جنہیں وہ اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ (تفسیر الطبری المجلد السادس ص ۱۳۵۔ تحت رقم ۱۵۵۲۸)

امام طبری نے ”غریب و غریب“ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس روایت کی جو سند بیان کی ہے ان راویوں کی جانچ پڑتال بھی انتہائی دشوار ہے۔ آپ بھی ملاحظہ ہوں:

”حدثنی محمد بن سعد قال: حدثنی أبی، قال: حدثنی عمی قال:

حدثنی أبی، عن أبیہ، عن ابن عباس“

پچھلی دو روایتوں کی ”استنادی“ بحث سند کے آخر سے شروع کی گئی تھی کیونکہ وہاں راویوں کے نام ظاہر کئے گئے تھے جبکہ یہاں پہلے راوی محمد بن سعد اور آخری راوی عبد اللہ

امام طبری --- کون؟ توہین آدمؑ: __ منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

بن عباسؓ کے علاوہ درمیان کے راویوں کے نام ذکر نہیں کئے گئے۔ لہذا شروع سے اس پر بحث کی جاتی ہے۔

امام طبری فرماتے ہیں کہ مجھ سے محمد بن سعد نے یہ روایت بیان کی، محمد (بن سعد) کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے باپ سعد نے یہ روایت بیان کی، محمد کا باپ سعد کہتا ہے کہ مجھ سے یہ روایت میرے چچا نے بیان کی، محمد کے باپ سعد کا چچا کہتا ہے کہ اس سے اس کے باپ نے یہ روایت بیان کی، محمد کے باپ سعد کے چچا کا دا (جو محمد کے باپ سعد کا پڑا دا ہے) کہتا ہے کہ اس سے یہ روایت عبداللہ بن عباسؓ نے بیان کی۔

یہ سند امام طبری نے تفسیر کے علاوہ اپنی تاریخ الامم والملوک میں بھی بیان کی ہے۔ محمد بن سعد کے نام سے بعض لوگوں کو شاید یہ مغالطہ لگ سکتا ہے کہ اس سے مراد کہیں محمد بن سعد ”صاحب طبقات“ نہ ہوں لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ صاحب طبقات ۲۳۰ھ میں فوت ہوئے تھے اور اس وقت جناب طبری کی عمر زیادہ سے زیادہ چھ سال تھی۔

اب اس سند کا تعارف ڈاکٹر سراج الاسلام ضیف صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیں: ابن جریر اپنی تفسیر اور تاریخ میں نیز عبدالرحمن بن ابی حاتم رازی اپنی تفسیر میں بکثرت یہ سند بیان کرتے ہیں۔

۱۔ اس سند کے پہلے راوی محمد بن سعد بن محمد بن الحسن بن عطیہ بن سعد بن جنادہ ابو جعفر عوفی ہیں، جس کے بارے میں خطیب بغدادی لکھتے ہیں: ”کان لیثاً فی الحدیث“ (تاریخ بغداد ۵: ۳۲۲) حدیث کے معاملے میں ضعیف تھا۔

۲۔ دوسرے راوی (ثنی ابی) سعد بن محمد بن الحسن بن عطیہ عوفی ہیں۔ خطیب لکھتے ہیں: ”جہمی ولو لم یکن هذا أيضاً لم یکن ممن یستأهل أن یتکب عنه ولا کان موضعاً لذلك“ (تاریخ بغداد ۹: ۱۲۷)

جہمی ہیں اور اگر جہمی نہ بھی ہوتے، پھر بھی اس کے اہل نہیں تھے کہ ان کی روایت لکھی جائے۔ ۳۔ تیسرے راوی (ثنی عمی) حسین بن حسن بن عطیہ عوفی ہیں۔

امام طبری --- کون؟ توہین آدمؑ: __ منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

امام ابن حبان لکھتے ہیں: ”منکر الحدیث، روی عن الاعمش وغیرہ اشیاء لا یتابع علیہا، کأنه کان یقلبها و ربما رفع المراسیل و أسند الموقوفات، لا یجوز الا احتجاج بخبره“ (المجروحین ۱: ۲۹۸- ترجمہ ۲۲۹)

منکر الحدیث ہیں۔ اعمش کی سند سے غیر متبوع اور مقلوب روایات نقل کرتا ہے۔ اس کی روایت ناقابل احتجاج ہوتی ہے۔

۴۔ چوتھے راوی (ثنی ابی) حسن بن عطیہ عوفی ہیں۔ امام ابن ابی حاتم لکھتے ہیں: احادیث کے معاملے میں ضعیف تھا۔ (الجرح والتعذیل ۳: ۲۶- ترجمہ ۱۱۲) امام بخاری فرماتے ہیں: ”لیس بذلك“ (تاریخ کبیر ۲: ۳۰۱- ترجمہ ۲۵۴)

۵۔ پانچویں راوی (ثنی ابی) ابوالحسن عطیہ عوفی ہیں جو ضعیف اور ”لیس بشی“ تھے۔ کلی کے پاس جا کر اس سے تفسیر سنتے اور لوگوں کے سامنے کلی کی غیر معروف کثیف ”ابوسعید“ کی نسبت سے اسے بیان کرتے جس سے لوگ یہ سمجھ لیتے کہ ان کی مراد سیدنا ابوسعید خدریؓ ہیں۔ (میزان الاعتدال ۳: ۸۰- ۹۷) بحوالہ منتخب علمی کاتب ص ۱۱۵- ۱۱۶ تحت مکتوب ۱۸- طبع ششم ۲۰۱۲ء)

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زیر بحث روایت کے آخری راوی عطیہ العوفی الکوفی (م ۱۱۱ھ) کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہم سے روایت نقل کرتے ہیں۔ ان کو امام نسائی نے ضعیف کہا ہے۔ نیز امام احمد، یحییٰ بن سعید القطان، یحییٰ بن عقیل، ابو حاتم، ابن عدی، جوزجانی، ابن حبان، امام ابوداؤد اور ساجی وغیرہ نے بھی ان کی تہذیب کی ہے۔ صرف ابن سعد نے اتنا لکھا ہے کہ: ”لہ احادیث صالحہ و من الناس من لا یحتج بہ“ وہ ٹھیک حدیثیں روایت کرتے ہیں اور بعض لوگ ان سے استدلال نہیں کرتے۔ اور امام ابوزرعد نے انہیں ”لیثین“ کہا ہے جو ادنیٰ درجہ کی توثیق ہے۔ اور یحییٰ بن معین ان کو ”صالح“ کہتے ہیں یہ بھی ہلکی قسم کی توثیق ہے۔ دراصل ان پر چار قسم کے اعتراضات ہیں۔

امام طبری --- کون؟ توہین آدمؑ: منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ انہوں نے روایات کی سند میں مغالطہ انگیزی کا ارتکاب کیا ہے۔ امام احمد اور ابن حبان نے اس کی تفصیل یہ بتائی ہے کہ یہ کلبی کے پاس جا کر ان سے تفسیر کے بارے میں سوالات کیا کرتے تھے اور ان سے روایات لیتے تھے لیکن چونکہ کلبی ضعیف اور بدنام ہیں اس لئے انہوں نے ان کی کنیت اپنی طرف سے ابوسعید رکھ لی تھی اور جو روایات یہ کلبی سے سنتے ان کو کلبی کا نام لینے کے بجائے ابوسعید کی کنیت سے روایت کر دیتے اور چونکہ عطیہ العوفی نے مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ سے بعض احادیث سنی تھیں اس لئے ماواقف لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ روایت بھی حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہوگی حالانکہ درحقیقت وہ کلبی کی روایت ہوتی تھی۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۲۵-۲۲۶)

ان پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ شیعہ تھے، اور تیسرا اعتراض یہ ہے کہ روایات نقل کرنے میں غلطیاں کرتے تھے، اور چوتھا اعتراض یہ ہے کہ مدلس تھے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

”صدوق یخطی کثیرا، کان شیعياً مدلساً“ سچ بولنے والے ہیں مگر غلطیاں بہت کرتے ہیں، شیعہ تھے اور مدلس تھے۔ (تقریب التہذیب جلد ۲ ص ۲۴)

اور حافظ شمس الدین ذہبی ضعفاء میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”تابعی مشہور مجمع علیٰ ضعفہ“ مشہور تابعی ہیں ان کے ضعف پر اجماع ہے۔ (المغنی فی الضعفاء جلد ۲ ص ۴۳۶-۴۳۷ ترجمہ نمبر ۴۱۳۹)

البتہ امام ترمذی نے ان کی بعض روایات کو حسن قرار دیا ہے۔ لیکن امام ترمذی کی اصطلاح میں ”حسن“ سے مراد ہر وہ حدیث ہوتی ہے جس کی سند میں کوئی راوی مہتمم بالکذب (جھوٹ کا ملزم) نہ ہو اور وہ ایک سے زائد طریقوں سے مروی ہو۔ (کتاب العلل للترمذی) اس لئے ان کی تحسین سے ان اعتراضات کا دفعیہ نہیں ہوتا جو عطیہ العوفی پر وارد کئے گئے ہیں۔ (علوم القرآن ص ۴۹۵-۴۹۶)

امام طبری کی حضرت آدمؑ کے بارے میں منقولہ زیر بحث روایت کے آخری راوی عطیہ

امام طبری --- کون؟ توہین آدمؑ: منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

العوفی الکوفی کا یہ کردار کلبی کذاب کی روایات کو ”ابوسعید“ کی کنیت سے عوام میں پھیلا نا (تا کہ لوگ اس سے ابوسعید خدریؓ مراد لے کر قبول کر لیں) یقیناً خیانت کے زمرے میں آتا ہے جبکہ اصول حدیث کی اصطلاح میں اس قسم کی تدلیس کو ”تدلیس اشیوخ“ کا نام دیا گیا ہے جو قطعاً حرام ہے۔ ملاحظہ ہو: الباعث الحثیث شرح اختصار علوم الحدیث مؤلفہ احمد شاہ طبع کویت۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ”تدلیس اشیوخ“ کو خیانت کا مرتکب قرار دیا ہے۔ ”وہو خیانتہ ممن تعمده“ کہ جان بوجھ کر اس طرح کی تدلیس کرنے والا خیانت کا مرتکب ہے۔ (تعریف اہل التقدیس بمراتب الموصوفین بالتدلیس ص ۲۶-۲۷ طبع بیروت)

مذکورہ اوصاف (تشیع و تدلیس) کے حامل تنہا صرف عطیہ العوفی خود ہی نہیں بلکہ اس ”کارخیز“ میں پوتے کے پوتے سب ہی شریک و حصہ دار ہو کر ”اس خانہ ہمہ آفتاب است“ کے کامل مصداق بن گئے ہیں۔

مذکورہ تفصیل سے حضرت آدمؑ و حواءؑ کی توہین و تنقیص پر مبنی امام طبری کی منقولہ اسرائیلی، جھوٹی مانگو، باطل اور موضوع روایات کی اصل حقیقت واضح ہو گئی ہے۔ معلوم نہیں کہ امام طبری نے کس داعیہ کے تحت نیز کس طبقہ کی خوشنودی اور کس مقصد کی خاطر ”تبعاً لہ شریکاء“ کے تحت کذاب راویوں کی تقریباً درجن بھر روایات کا انبار لگا دیا؟ جن سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور حواءؑ نے سہواً نہیں بلکہ بچوں کے یکے بعد دیگرے نفوت ہو جانے کے بعد خوب غور و فکر اور شیطان کے بار بار پھسلانے، ورغلانے اور دھمکانے کی بناء پر اپنے بچے کا نام شیطان کی طرف منسوب کر کے ”عبدالہارث“ رکھا تھا۔

علاوہ ازیں طبری کی منقولہ روایات میں یہ تصریح بھی پائی جاتی ہے کہ آدمؑ و حواءؑ شرک فی العبودیۃ کے مرتکب نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے شیطان کے حکم پر بچے کا نام ”عبدالہارث“ رکھ کر ”شرک فی الطاعت“ کا ارتکاب کیا ہے۔ اس مانگو اور باطل تاویل کی رو سے بھی ایک نبی کی طرف شرک کی نسبت لازم آتی ہے جو عقیدہ عصمت انبیاء کے سرخلاف ہے۔

امام طبری کی منقولہ روایات قرآن مجید اور احادیث کے خلاف ہونے کے علاوہ حضرت آدمؑ

امام طبری۔۔۔ کون؟ توہین آدمؑ: منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

اور حواء کی شان سے بعید تر ہیں کہ معاذ اللہ! ان جیسی ہستیاں ”شُرک“ جیسے قبیح ترین جرم میں مبتلا ہوں۔ کیا یہ بات باعث حیرت نہیں ہے کہ ”جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ“ کے تحت شیخ ابن حجر مکی، ملا علی قاری اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی وغیرہ کو تو پتہ چل گیا کہ ایسے نام رکھنا شرک فی التسمیہ اور ممنوع و حرام ہیں مگر حضرت آدمؑ و حواء اس مسئلہ سے ”بے خبر“ رہے اور قصد اُرد و عمد اُس کا ارتکاب کر بیٹھے؟ (العیاذ باللہ)

حضرت آدمؑ تو اللہ تعالیٰ کے خاص بندے تھے اور ایسے ہی بندوں کے بارے میں شیطان کو جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا:

”إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ“ (الحجر ۴۲) ”بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا مگر وہ جو تیری پیروی کرتے ہیں گمراہوں میں سے“

کیا حضرت آدمؑ اللہ کے خاص اور ”مُخْلِصٌ“ بندے نہیں تھے؟ کوئی مومن بالقرآن اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ جب ان کا شمار قطعی طور پر اللہ کے ”مُخْلِصٌ“ بندوں میں ہوتا ہے تو خود شیطان بھی ایسے بندوں کے بارے میں اعتراف کر رہا ہے کہ ان پر میرا خود بس نہیں چلتا:

”فَيَعِزُّكَ لَا غَوْفَهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ أَلَا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ ۝ (ص ۸۲-۸۳) ”تیری عزت کی قسم! میں ضرور گمراہ کردوں گا ان سب کو، سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں ان میں سے تو نے چن لیا ہے“

سورۃ الحجرات آیت ۴۰ میں بھی یہی الفاظ آئے ہیں۔ جبکہ سورۃ الصافات میں آیت ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۱۶۸، ۱۶۹ میں ”أَلَا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلِصِينَ“ اور آیت ۱۶۹ میں ”لَكُنَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلِصِينَ“ آیا ہے۔ جب ایسے خاص بندوں پر شیطان کا کوئی بس چل ہی نہیں سکتا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ حضرت آدمؑ نے اس کی اطاعت کر کے اس کے نام پر اپنے بیٹے کا نام ”عبدالجارث“ رکھ لیا تھا؟ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہاں ”مُخْلِصٌ“ کے بجائے ”مُخْلِصٌ“ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

”مُخْلِصٌ“ وہ ہے جو کوشش کر کے اپنے عمل کو اللہ کے لئے خالص کرے اور خود اپنے

امام طبری۔۔۔ کون؟ توہین آدمؑ: منقولہ روایات کی ”استنادی“ حیثیت

ارادہ سے اللہ کی عبادت کرے۔ جبکہ ”مُخْلِصٌ“ وہ ہے جس کو اللہ نے اپنے ارادہ اور اپنی طرف سے خالص بنا دیا ہے وہ چاہے ارادہ کرے یا نہ کرے۔

سخت تعجب ہے کہ امام طبری جیسے ”مفسر مجدد، فقیہ اور مجتہد“ نے ”جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ“ کے تحت تقریباً ۷۰ جن بھر موضوع اور اسرائیلی روایات کے تحت حضرت آدمؑ کو اس آیت کا مصداق ”ثابت“ کر دیا اور ”شُرک فی الطائفة“ کی نسبت ایک معصوم ذات کی طرف کر دی کہ انہوں نے پہلے شیطان کی اطاعت سے انکار کیا پھر بچوں کے محبت میں آکر بالقصد شیطان کی اطاعت کی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے تو ان کے ”ممنوعہ درخت“ کے پاس جانے کے سابقہ عمل کو بھی ”غرض، زَلَّتْ اُورُوسُ شَيْطَانِي“ قرار دیتے ہوئے ان کے ”قصد، ارادہ و عزم“ کی نفی کی ہے اور دو ٹوک انداز میں یہ اعلان کیا ہے کہ:

”وَلَقَدْ عَلِمْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلِ قَتْسِي وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا“ (سورہ طہ - آیت ۱۱۵) ”اور ہم نے حکم دیا تھا آدمؑ کو اس سے پہلے (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائے) سو وہ بھول گیا اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) اس کا کوئی قصد“

”عزم“ کے معنی ”عقد القلب علی إمضاء الأمر“ کسی کام کے کرنے کا تہیہ کر لینے کے ہیں۔ یہاں اس ”عزم“ کی نفی ہو رہی ہے کہ ہم نے آدمؑ کو اقرار کے پورا کرنے میں اس کے ارادہ اور قصد کا دخل نہیں پایا۔

کہاں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اور کہاں امام طبری کی ”جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ“ کے تحت منقولہ موضوع اور اسرائیلی روایات؟ صد افسوس کہ امام طبری نے کذابوں اور جھوٹوں کی روایات کو اپنی تفسیر میں محفوظ کر کے عقیدہ عصمت انبیاء کو محروم کر دیا۔ مشہور شاعر فیض نے کیا خوب کہا ہے

زمانہ اس قدر قائل ہوا ہے فیض جھوٹوں کا
جو سچ کہتے ہیں ان کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

تفسیر طبری اور توہین ابراہیم علیہ السلام

”وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُنْجِي الْمُؤْمِنِينَ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ - قَالَ بَلَىٰ وَلَئِنْ لَيُطْمَثِينَ قُلُوبُهُمْ...“ (سورۃ البقرہ آیت ۲۶۰)

”اور یا دیکرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے پروردگار! دکھا مجھے کہ تو کیسے زندہ فرمائے گا مرنے والوں کو؟ فرمایا: (اے ابراہیم) کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے؟ عرض کی ایمان تو ہے لیکن (یہ سوال اس لئے ہے) تاکہ مطمئن ہو جائے میرا دل“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت طیبہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں تھا کہ اشیاء کی جتنی اور طلب کا طبعی ذوق حاصل تھا جس کی رو سے وہ ہر شئی کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش اپنی زندگی کا خاص مقصد سمجھتے تھے تاکہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرت کاملہ کے متعلق علم الیقین کے بعد عین الیقین اور حق الیقین کا مرتبہ حاصل کر سکیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ”احیائے موقی“ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت سے متعلق کوئی تردید یا شک تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو حکومت و اقتدار کے نشے میں غرق نہ ہو کر اللہ کے ساتھ مکالمے یا مناظرے کے بالکل آغاز میں (جس کا ذکر زیر بحث آیت سے صرف دو آیت پہلے موجود ہے) اس کے سامنے اپنے مالک حقیقی کا تعارف کراتے ہوئے پہلی دلیل ہی یہ پیش کی تھی کہ:

”إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ“ ”اور یا دیکرو جب فرمایا ابراہیم نے (اے) کمیرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے“

بھلا جو شخص مخالف کے سامنے معرض استدلال میں سب سے پہلے دلیل ہی یہ پیش کرے اسے خود اللہ تعالیٰ کی اس قدرت میں شک کیوں کر ہو سکتا ہے؟

شک کے واقع نہ ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں سوال ”کَيْفَ“ کے لفظ سے ہو رہا ہے جو کیفیت معلوم کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

امام ابو عبد اللہ قرطبی مالکی (م ۶۷۱ھ) فرماتے ہیں کہ:

”فالشك يبعد على من ثبت قلبه في الايمان فقط فكيف بمرتبة النبوة والخلة؟ والانباء معصومين من الكبار ومن الصغائر التي فيها رذيلة إجماعاً، وإذا تأملت سؤاله و سائر ألفاظ الآية لم تعط شكاً، وذلك أن الاستفهام بكيف إنما هو سؤال عن حالة شئٍ موجود متقرر الوجود عند المسائل والمسؤل“

(الجامع لاحكام القرآن - المعروف به تفسير القرطبي الجزء الثالث ص ۲۸۴)

”جب کسی ایک مخلص مسلم کے بارے میں یہ گمان کرنا بعید ہے کہ اسے ایمان کے بارے میں کوئی تردید ہوگا تو پھر ایک جلیل القدر نبی اور خلیل کے بارے میں اس کا تصور کیوں کر ممکن ہے؟ اور انبیائے کرام باجماع امت تمام بڑے اور چھوٹے گناہوں بالخصوص رذیل و خسیس اور گھٹیا امور سے پاک صاف ہوتے ہیں۔ اور اسے مخاطب جب تو ابراہیم کے سوال اور آیت کریمہ کے تمام الفاظ پر غور کرے گا تو اسے تسلیم کرنے میں کوئی شک واقع نہیں ہوگا اور یہ اس لئے ہے کہ لفظ ”کَيْفَ“ سے سوال اس چیز کی حالت دریافت کرنے کے لئے کیا جاتا ہے جو مسائل و مسائل کے نزدیک ”متقرر الوجود“ (یعنی جس چیز کے موجود ہونے کا یقین ہو)۔“

زیر بحث آیت میں ہی شک کے واقع نہ ہونے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس سوال کہ ”أَوَلَمْ تُؤْمِنْ“ (کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے؟) کے جواب میں، ابراہیم علیہ السلام کا ”ہلے“ (یعنی اس پر ایمان و یقین تو ہے) فرمانا ہے، یہ جواب بھی تو اللہ تعالیٰ نے ہی انہیں بتلایا و سکھایا تاکہ آئندہ کسی معاند کو اس سوال میں شک کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔

امام ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آیت میں مذکور سوال کے بارے میں فرماتے ہیں: ”فذكر السؤال لإبراهيم عليه السلام، أسباباً، منها أنه لما قال لنمرود ”رَبِّيَ إِلَهٌ بِنِيَاطِيٍّ وَيُؤْمِنُ“ أحب أن يترقى من علم اليقين بذلك، إلى عين اليقين، وأن يرى

ذلك مشاهدته، فقال: "رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُخَيِّ الْمَوْتَى قَالَ أَوْلَمْ تُؤْمِنُ - قَالَ بَلَى وَلَكِنْ لِيُظْهِرَنَّ لِي - (تفسير القرآن العظيم المجلد الاول ص ۳۰۹ - طبع بيروت)

”حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کے بہت سے اسباب ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ چونکہ یہی دلیل انہوں نے نمرود کے سامنے پیش کی تھی اس لئے ان کی خواہش یہ ہوئی کہ ”علم الیقین“ سے ترقی کرتے ہوئے ”عین الیقین“ کا درجہ حاصل ہو جائے کہ ”احیائے موتی“ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ایمان و یقین تو ہے ہی لیکن دیکھ بھی لوں اور علم مشہود بھی حاصل ہو جائے۔“

امام طبری نے جمہور کے متفقہ مذکورہ موقف کے برعکس دوسرے فریق کا موقف پیش کر کے اپنا ”وزن“ بھی اسی فریق کے پلڑے میں ڈال دیا چنانچہ وہ زیر بحث آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ: ”وقال آخرون: قال ذلك لربه لأنه شك في قدرة الله على إحياء الموتى۔“

ذکر من قال ذلك:

اور دوسرے حضرات نے یہ کہا کہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ سوال اس بنا پر کیا تھا کہ انہیں مردوں کے دوبارہ زندہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک تھا۔

اس کے بعد امام طبری نے ان لوگوں کے دلائل پیش کئے ہیں جو مذکورہ موقف رکھتے ہیں۔

۱۔ قال ابن عباس: ما في القرآن آية أرحى عندي منها (أى: وَلَكِنْ لِيُظْهِرَنَّ لِي) (”جامع البيان في تاويل القرآن“ المجلد الثالث: ص ۵۱ تحت رقم: ۵۹۷۰ طبع بیروت)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا: میرے نزدیک اس سے زیادہ امید دلانے والی قرآن کریم میں کوئی آیت نہیں ہے۔

۲۔ اسی طرح کی ایک دوسری روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ

نے عبداللہ بن عمروؓ سے پوچھا کہ: ”أى آية في كتاب الله أرحى لهذه الأمة؟ فقال

عبدالله بن عمرو: ”قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ“ (الزمر ۵۳)

حتى ختم الآية۔ فقال ابن عباس: أما ان كنت تقول: انها وان أرحى

منها لهذه الأمة قول إبراهيم عليه السلام: ”رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُخَيِّ الْمَوْتَى قَالَ أَوْلَمْ تُؤْمِنُ - قَالَ بَلَى وَلَكِنْ لِيُظْهِرَنَّ لِي - (حوالہ مذکور ص ۵۱ تحت رقم ۵۹۷۱)

قرآن مجید میں اس امت کے لئے سب سے زیادہ امید افزا آیت کون سی ہے؟ عبداللہ بن عمروؓ نے کہا: سورۃ زمر کی آیت (۵۳) تو عبداللہ بن عباسؓ نے اس کے جواب میں کہا: میرے نزدیک اس امت کے لئے سب سے زیادہ امید افزا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے رب سے ”احیائے موتی“ کے متعلق سوال ہے۔

۳۔ ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے عطاء بن ابی رباح سے ابراہیم علیہ السلام کے اس

سوال کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ: ”ودخل قلب إبراهيم بعض ما يدخل قلوب

الناس، فقال: رب أرنى كيف تحي الموتى... (حوالہ مذکور ص ۵۱ تحت رقم ۵۹۷۲)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں بھی وہی شک پر مبنی خیال پیدا ہوا جو عام لوگوں

کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے رب سے وہ سوال کر ڈالا۔

۴۔... حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

”نحن أحق بالشك من إبراهيم قال: ”رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُخَيِّ الْمَوْتَى...“

(حوالہ مذکور تحت رقم ۵۹۷۳)

ہم ابراہیم کے بہ نسبت شک کرنے کے زیادہ حق دار ہیں جب انہوں نے کہا تھا:

اے میرے پروردگار تو مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟...

۵۔... عن أبي هريرة: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: فذكر نحوه

(حوالہ مذکور تحت رقم ۵۹۷۴)

ایک دوسری سند سے بھی اسی طرح کی حدیث مروی ہے۔

امام طبری مؤخر الذکر حدیث نقل کر کے قول فیصل (قال أبو جعفر) کے طور پر لکھتے ہیں کہ:

وأولى هذه الأقوال بتأويل الآية ما صح به الخبر عن رسول الله صلى الله

عليه وسلم أنه قال: وهو قوله: نحن أحق بالشك من إبراهيم قال: رَبِّ أَرِنِي

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین ابراہیم علیہ السلام

كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى قَالَ أُولَئِمُ تُؤْمِنُ؟“، و أن تكون سألته ربه ما سألته أن يريه من إحياء الموتى لعارض من الشيطان عرض في قلبه۔

كَأَلْبَنِي ذَكَرْنَا عَنْ ابْنِ زَيْدٍ أَنَّهُ: مَنْ أَنْ إِبْرَاهِيمَ لَمَّا رَأَى الْحَوْتَ الذِي بَعْضُهُ فِي الْبِرِّ وَبَعْضُهُ فِي الْبَحْرِ، قَدْ تَعَاوَرَهُ دَوَابُ الْبِرِّ وَدَوَابُ الْبَحْرِ وَطَيْرُ الْهَوَاءِ، أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي نَفْسِهِ فَقَالَ: مَتَى يَجْمَعُ اللَّهُ هَذَا مِنْ بَطْلُونِ هَؤُلَاءِ؟ فَسَأَلَ إِبْرَاهِيمَ حِينَئِذٍ ربه أَنْ يريه كَيْفَ يَحْيِي الْمَوْتَى، لِيَعْلَمَ ذَلِكَ عَيَانًا، فَلَا يَقْدِرُ بَعْدَ ذَلِكَ الشَّيْطَانُ أَنْ يَلْقَى فِي قَلْبِهِ مِثْلَ الَّذِي أَلْقَى فِيهِ عِنْدَ رُؤْيَاهُ مَارَأَى مِنْ ذَلِكَ۔ فَقَالَ لَهُ ربه: ”أُولَئِمُ تُؤْمِنُ؟“ يَقُولُ: أُولِمُ تَصَدِّقُ يَا إِبْرَاهِيمَ بِأَنْ نِي عَلَى ذَلِكَ قَادِرٌ؟ قَالَ بَلَى يَا رَبِّ! لَكِنْ سَأَلْتُكَ أَنْ تَرِيَنِي ذَلِكَ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي۔ فَلَا يَقْدِرُ الشَّيْطَانُ أَنْ يَلْقَى فِي قَلْبِي مِثْلَ الَّذِي فَعَلَ عِنْدَ رُؤْيَاهُ هَذَا الْحَوْتَ۔

امام طبری روایات نمبر ۵۹۷ تا ۵۹۷ میں مذکور اقوال میں سے زیر بحث آیت کی تفسیر میں سب سے اوّل اس قول کو قرار دیتے ہیں جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول پیش کیا گیا ہے کہ: ”نحن أحق بالشك من إبراهيم“ ہم ابراہیم کے بہ نسبت شک کرنے کے زیادہ حق دار ہیں جب انہوں نے کہا تھا اے میرے پروردگار! مجھے دکھا دے کہ تو مڑ دوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ (امام طبری فرماتے ہیں کہ) یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ”احیائے موتی“ سے متعلق اپنے رب سے سوال عارضہ شیطانی کی وجہ سے کیا ہو جو شیطان نے ابراہیم علیہ السلام کے دل میں ڈال دیا تھا۔

(پھر اس ”عارضہ شیطانی“ کی تائید میں امام طبری ابن زید کی یہ روایت لائے ہیں کہ) ابراہیم علیہ السلام نے جب (دریا کے کنارے پر) ایک بڑی مردہ مچھلی کو دیکھا کہ اس کا بعض حصہ خشکی میں ہے اور کچھ حصہ دریا میں۔ خشکی کے جانور، دریائی جانور اور فضائی پرندے اس کا گوشت کھاتے رہے تو شیطان نے ابراہیم علیہ السلام کے دل میں یہ بات ڈال دی (کہ اس مچھلی کا گوشت دریائی و خشکی کے جانور اور فضاء کے پرندے بھی کھا رہے

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین ابراہیم علیہ السلام

ہیں اس کا گوشت کتنے مختلف پٹوں میں جا رہا ہے) تو انہوں نے کہا کہ ان مختلف جانوروں کے پٹوں سے اللہ تعالیٰ اس کے مختلف اجزاء کس طرح اکٹھے کرے گا؟ تو اس موقع پر ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ سوال کیا کہ وہ اسے دکھا دے کہ وہ کس طرح مردوں کو زندہ کرے گا؟ تا کہ وہ زندہ کرنے کی اس کیفیت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں۔

پھر اس کے بعد شیطان ابراہیمؑ کے دل میں شک ڈالنے پر قادر نہ ہو سکا جس طرح اس نے ان کے دل میں اس مچھلی کو دیکھنے کے وقت ڈالا تھا۔ پس ان سے ان کے رب نے کہا: کیا تجھے یقین نہیں ہے اے ابراہیمؑ! کیا آپ اس بات کی تصدیق نہیں کرتے کہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا: کیوں نہیں لیکن میں نے آپ سے اس لئے سوال کیا کہ آپ مجھے زندہ کرنے کی کیفیت دکھا دیں تا کہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔ ابراہیمؑ کہتے ہیں کہ پھر شیطان کو یہ قدرت حاصل نہ ہوئی کہ وہ میرے دل میں یہ بات ڈال دے جس طرح اس نے مچھلی کو دیکھنے کے وقت ڈالی تھی۔

مذکورہ ”قول فیصل“ میں امام طبری نے واضح طور پر یہ قرار دیا ہے کہ شیطان نے ابراہیم علیہ السلام کے دل میں یہ بات ڈالی تھی اس لئے وہ اپنے رب سے یہ سوال کر بیٹھے۔ پھر اس (یعنی سوال کرنے) کے بعد شیطان ان کے دل میں شک ڈالنے پر قادر نہ ہو سکا۔ امام طبری یہ دلائل اس عنوان کے تحت لائے ہیں کہ:

”قال ذلك لربه، لأنه شك في قدرة الله على إحياء الموتى“
”حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب سے یہ سوال اس بناء پر کیا تھا کہ انہیں مردوں کے دوبارہ زندہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک تھا اور یہ بات شیطان نے ان کے دل میں ڈالی تھی۔“
قارئین کرام آگے بڑھنے سے پہلے امام طبری کے دلائل پر ایک طاہرانہ نگاہ ڈال لیں:
۱۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نزدیک یہ آیت ”رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى“ زیادہ امید افزا ہے کیونکہ عارضہ شیطانی کے باعث جو خیالات دل میں آتے ہیں ان پر مواخذہ نہیں ہے۔
۲۔ دخل قلب إبراهيم بعض ما يدخل قلوب الناس“ یعنی ابراہیمؑ کے دل

میں وہی شک پیدا ہوا جو عام لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔

بعض حضرات نے اگرچہ اس کی یہ تاویل کی ہے کہ اس سے مراد آنکھوں سے دیکھنا ہے (أى من طلب المعاينة) لیکن یہ تاویل اس لئے صحیح نہیں ہے کہ امام طبری اسے ان لوگوں کے موقف کی تائید میں بطور دلیل لائے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ابراہیمؑ نے ”احیاء موتی“ سے متعلق اللہ کی قدرت میں شک کی بناء پر یہ سوال (”زَبَّ أَرْنَى كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى“) کیا تھا۔

۳۔ موصوف نے دو روایتیں پیش کی ہیں جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان پیش کیا گیا ہے کہ ”نحن أحق بالشك من إبراهيم“

۴۔ پھر خود بھی زیر بحث آیت میں اس حدیث کو تمام اقوال اور دلائل میں سے سب سے اولیٰ قرار دیا ہے۔

۵۔ پھر واضح طور پر لکھا ہے کہ: ”وَأَنْ تَكُونَ سَأَلَهُ رَبَّهُ مَا سَأَلَ أَنْ يَرِيَهُ مِنْ أَحْيَاءِ الْمَوْتَى لِعَارِضٍ مِنَ الشَّيْطَانِ عَرَضَ فِي قَلْبِهِ۔“
”اور یہ ہو سکتا ہے کہ ابراہیمؑ نے ”احیائے موتی“ سے متعلق اپنے رب سے سوال عارضہ شیطانی کی وجہ سے کیا ہو جو شیطان نے ابراہیمؑ کے دل میں ڈال دیا تھا۔“

۶۔ پھر امام طبری ”عارضہ شیطانی“ کی وضاحت کرتے ہوئے دریا کے کنارے پر پڑی ہوئی ایک بڑی مردہ مچھلی کا ذکر کرتے ہیں جس کا کوشٹ خشکی و دریائی جانور اور فضائی پرندے بھی کھا رہے ہیں۔ اس موقع پر شیطان نے ابراہیمؑ کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ وہ اپنے رب سے سوال کریں کہ اللہ تعالیٰ مختلف جانوروں کے پیٹوں سے اس مچھلی کے اجزاء کس طرح اکٹھے کر کے اسے زندہ کرے گا۔

”أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي نَفْسِهِ... فَلَا يَقْدِرُ بَعْدَ ذَلِكَ الشَّيْطَانُ أَنْ يَلْقَى فِي قَلْبِهِ مِثْلَ الَّذِي أَلْقَى فِيهِ عِنْدَ رُؤْيَاهُ مِثْلَ ذَلِكَ۔“ فَلَا يَقْدِرُ الشَّيْطَانُ أَنْ يَلْقَى فِي قَلْبِهِ مِثْلَ الَّذِي فَعَلَ عِنْدَ رُؤْيَاهُ هَذَا الْحَوْتَ۔“

مذکورہ ”قول فیصل“ میں امام طبری نے نہ صرف یہ کہا ہے کہ شیطان نے ابراہیمؑ علیہ

السلام کے دل میں یہ شک والی بات ڈالی تھی بلکہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی بھی یہ اقرار کرایا ہے کہ شیطان نے میرے دل میں یہ بات ڈالی تھی پھر اس کے بعد وہ ایسا کرنے پر قدرت حاصل نہ کر سکا۔

امام طبری نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں دو باتیں بیان کی ہیں:

۱۔ شک ۲۔ یہ شک شیطان نے ان کے دل میں ڈالا تھا

موصوف کی دونوں باتیں عقیدہ عصمتِ انبیاء کے منافی ہیں کیونکہ تمام انبیاء کرام صفائے کبار سے معصوم و پاک ہوتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کسی شک یا عارضہ شیطانی اور وسوسہ شیطانی کی بناء پر نہیں بلکہ اپنے اطمینان قلب کے لئے سوال کیا تھا جو ہرگز ”یقین“ کے منافی نہیں ہے جبکہ ”شک“ ”یقین“ اور ایمان کے منافی ہے۔ پھر ”احیاء موتی“ سے متعلق ان کے ایمان و یقین کا اعلان ”بلکی“ کی صورت میں خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ جس کی وجہ سے اسے شک یا عارضہ شیطانی کا نام ہرگز نہیں دیا جاسکتا۔

امام ابن حزم اندلسی (م ۵۵۶ھ) زیر بحث آیت کے تحت عقیدہ عصمتِ انبیاء کا زبردست تحفظ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

آپ کا ”زَبَّ أَرْنَى كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى“ کہنا اور اس پر اللہ تعالیٰ نے جفر ملایا کہ ابراہیمؑ! تجھے یقین نہیں؟ آپ نے کہا: کیوں نہیں۔ یقین تو ہے لیکن مزید اطمینان خاطر کے لئے سوال ہے۔ اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام کے ایمان و یقین کو مشتبہ نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ ایمانی اور روحانی اعتبار سے ان کے علو مرتبت کا ثبوت ملتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے مردہ زندہ ہونے کی کیفیت ابھی ملاحظہ نہیں فرمائی اور خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیان ہے کہ وہ راسخ العقیدہ مومن ہیں صرف کیفیت احیاء مقصود تھی... نبی علیہ السلام نے فرمایا: ”نحن أحق بالشك من إبراهيم“ کہ ہم ابراہیمؑ کی نسبت شک کرنے کے زیادہ مستحق ہیں۔

دریں حالت جو شخص یہ سمجھے کہ نبی علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی صفت ”احیاء“ میں شک تھا

بنیاد ہوتی ہے۔ لہذا یہ حضرات فطری طور پر شک و تردید سے محفوظ و مامون ہوتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر بحث حدیث کا مطلب و مفہوم بالکل واضح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام سے آگاہ کرنے کے لئے یہ اسلوب اختیار فرمایا کہ: دیکھو شک و تردید اگر ابراہیمؑ میں راہ پا سکتا تو یقیناً ہم میں بھی راہ پاتا۔ اور تم یہ جانتے ہی ہو کہ ہم میں شک و تردید کا کسی طرح گز نہیں ہوتا۔

لہذا جان لو! کہ ابراہیمؑ بھی ہماری ہی طرح کمال ایمان و ایقان کے درجہ پر فائز تھے اور ان کے دل و دماغ میں بھی کسی طرح کا کوئی شک و تردید ہرگز راہ پائے ہوئے نہیں تھا۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ”حیاء موتی“ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت سے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف شک کی نسبت کرنا اور پھر یہ کہنا کہ ایسا شک شیطان کے لقاء کی وجہ سے ہوا تھا سراسر عقیدہ عصمت انبیاء کے منافی ہے۔

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

وَرَأَوْدَتُهُ الْيُحْيَىٰ هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۖ
قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنُ مَنَاقِبَ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۝

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِه ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْ لَا أَنْ رَأَاهَا رَبِّي ۖ كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ
السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ ۖ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ ۝ (سورۃ یوسف آیت ۲۳-۲۴)

”اور جس عورت کے گھر میں وہ (یعنی یوسفؑ) تھے، اس نے انہیں اپنے ارادہ سے پھیرنا چاہا، اور اس نے دروازے بند کر لئے اور کہا: بس آ جاؤ۔ یوسفؑ نے کہا: اللہ کی پناہ۔ یقیناً وہ میرا پروردگار ہے اس نے مجھے اچھا مقام عطا کیا ہے۔ بے شک ظالم فلاح نہیں پاتے۔

اور اس عورت نے تو ان کا قصد کر لیا تھا اور وہ بھی اس کا قصد کرتا اگر وہ اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل نہ دیکھ چکا ہوتا۔ یہ اس لئے تاکہ ہم ان سے بدی اور بے حیائی کو پھیر دیں یقیناً وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔“

”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِه ۖ وَهَمَّ بِهَا“ کے تحت امام طبری کے تفسیری اقوال و روایات بیان کرنے سے پہلے مذکور بالا آیات کا مفہوم ملاحظہ فرمائیں:

”رأودت“ کے معنی ہیں: بڑی نرمی اور لطافت الجھل سے کسی چیز کی طلب کرنا، اس کا اصل ”راد“ ہے جس کا مفہوم ”آنا جانا اور آمد و رفت“ رکھنا ہے۔ ”ارادۃ“ اصل میں وہ قوت ہے جو شہوت، حاجت اور اہل سے مرکب ہو۔ یعنی جس میں خواہش، حاجت اور امید یا آرزو پائی جائے۔ انسان میں ”ارادت“ عموماً نفس کا کسی چیز کی طرف کھینچنا ہے اور کبھی اس سے مراد قصد یا طلب کرنا ہوتا ہے۔ ”وَرَأَوْدَتُهُ الْيُحْيَىٰ هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ“ کے معنی ہیں: اس کو اپنی رائے سے یا ارادہ سے پھیرنا چاہا۔

”وَرَأَوْدَتُهُ الْيُحْيَىٰ هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ“ کے الفاظ سے حضرت یوسف علیہ السلام

کے ارادہ و عصمت کی مضبوطی پر کافی شہادت ملتی ہے کیونکہ ”وَرَاوَدَتْهُ“ میں یہ بتایا گیا کہ اس عورت کا ارادہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ارادہ کے خلاف تھا اور ”عَنْ نَفْسِهِ“ میں اسے مزید مؤکد کیا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس عورت کی تمام کوششوں اور ارادوں کا واحد جواب یہ دیا ہے کہ ”مَعَاذَ اللَّهِ“ اللہ کی پناہ۔ اس سے واضح ہو گیا ہے کہ عزیر مصر کی بیوی کے تمام جتن اور جیلوں (دروازے بند کر کے، بالکل تنہائی میں، ”هَيْئَتُكَ لَكَ“ کے اشتعال انگیز الفاظ سے شرم و حیا کا بارڈر کر اس کر کے دعوت گناہ دینا وغیرہ) سے حضرت یوسف علیہ السلام کے ارادہ میں کوئی ادنیٰ سی جنبش بھی نہیں آئی اور فرمایا: ”مَعَاذَ اللَّهِ“ میرا معبود و حق اس فعل قبیح کو ناپسند کرتا ہے، میں ایسے جرم سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

”إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ“ بے شک وہ (یعنی اللہ) میرا پروردگار ہے اس نے مجھے بہت اچھا مقام دیکھا دیا۔ بے شک ظالم فلاح نہیں پاتے۔ اکثر مفسرین نے یہاں ”رَبِّ“ سے اس عورت کا خاوند یعنی عزیر مصر مراد لیا ہے کہ تو میرے ”رَبِّ“ یعنی آقا عزیر مصر کی آمد ہے جس نے اس غریب الوطنی میں مجھ پر احسان کرتے ہوئے اچھا ٹھکانا مہیا کیا ہے میں اسے یوں کیوں کر داغ دار کر سکتا ہوں؟ جو شخص اپنے محسن کے ساتھ برائی کرتا ہے وہ ظالم ہے اور ظلم کرنے والا کبھی فلاح نہیں پاسکتا لہذا یہ سودا بڑا مہنگا ہے، یوسفؑ اس کے لئے ہرگز تیار نہیں، میں اپنے آقا کے حسن سلوک کا بدلہ اس کی آمد اور امانت میں خیانت کر کے نہیں چکا سکتا۔ اگرچہ اس آیت میں لفظ ”رَبِّ“ سے آقا مراد لینے کی گنجائش موجود ہے لیکن حضرت یوسفؑ کے مناسب نہیں ہے اور ان کی شان سے بہت گری ہوئی ہے کہ وہ ایک گناہ سے باز رہنے میں اللہ تعالیٰ کے بجائے کسی بندے کا لحاظ کرے۔ اس لئے بعض مفسرین نے یہاں ”رَبِّ“ سے مراد اللہ کی ذات لی ہے اور اس کی بھی آیت کے ظاہر سے کافی گنجائش معلوم ہوتی ہے جو حضرت یوسفؑ کے شایان شان بھی ہے۔ عزیر مصر نے اگرچہ اچھا ٹھکانا فراہم کیا ہے لیکن اصل مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اسی نے عزیر مصر کے دل میں یہ بات ڈالی تھی اس لئے یہاں بھی زیادہ صحیح مفہوم یہی ہے کہ حضرت

یوسف علیہ السلام نے اچھا ٹھکانا فراہم کرنے پر عزیر مصر کے بجائے حقیقی رب، اللہ تعالیٰ کی ذات جو مسبب الاسباب ہے مراد لی ہے اور گناہ سے باز رہنے کے لئے اسی کی پناہ طلب کرتے ہوئے اسی کا لحاظ پیش نظر رکھا ہے۔ لہذا ایسا مفہوم مراد لینے سے احتراز کرنا چاہئے جس میں قباحت کے پہلو کا بھی امکان ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ قرآن مجید میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے کہ کسی نبی نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو اپنا رب کہا ہو۔ اسی سورہ یوسف میں آگے چل کر حضرت یوسف علیہ السلام نے اہل مصر پر واضح کیا ہے کہ تم نے ”بندوں“ کو اپنا رب قرار دے رکھا ہے جبکہ میرا رب اللہ ہے۔

”فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ...“ (۳۴)، ”يَا صَاحِبِي السِّجْنِ أَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ“ (۳۹)، ”يَا صَاحِبِي السِّجْنِ أَمَّا أَخَذُكَ مَعَا فَيَسْتَقْبِلُ رَبُّهُ خَمْرًا...“ (۴۱)، ”وَقَالَ لِلنَّائِي ظَنُّ أَنْ نَاجٍ مِنْهُمَا لَذُكْرَيْنِ عِنْدَ رَبِّكَ فَاتَّسَلَهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ“ (۴۲)، ”وَقَالَ الْمَلِكُ التَّوْنِي بِهِ قَلَمًا جَاءَهُ الرُّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَى رَبِّكَ فَمَا لَكَ بِأَلِ النِّسْوَةِ الَّتِي قَطَعْنَ أَلَيْهِنَّ مِنْ رَّبِّي بِكَذِبِينَ“ (۵۰)

”پس قبول فرمائی اس کی دعا اس کے رب نے۔ اسے قید خانہ کے میرے در رفیقو! (یہ تو بتاؤ) کیا بہت سے جدا جدا رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے، اور کہا (یوسفؑ نے) اسے جس کے بارے میں آپ کو یقین تھا کہ وہ نجات پا جائے گا ان دونوں میں سے کہ میرا تذکرہ کرنا اپنے رب (آقا) کے پاس۔ لیکن فراموش کرادیا اسے شیطان نے کہ وہ ذکر کرے اپنے رب (آقا) کے پاس۔ پس آپ ٹھہرے رہے قید خانہ میں کئی سال، (یہ تعبیر سنتے ہی) بادشاہ نے کہا (فورا) لے آؤ انہیں میرے پاس۔ پس جب (فرمان شاہی لے کر) ان کے پاس قاصد آیا (تو) آپ نے فرمایا: لوٹ جاؤ اپنے رب (بادشاہ) کے پاس اور اس سے پوچھو حقیقت حال کیا تھی ان عورتوں کی جنہوں نے کاٹ ڈالے تھے اپنے ہاتھ۔ بے شک میرا ”رَبِّ“ تو ان کے مکر (و فریب) سے خوب آگاہ ہے۔“

مذکورہ آیات میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اہل مصر کے رواج کے مطابق لفظ

”رب“ کی نسبت ان کے آقاؤں کی طرف کی مگر اپنا رب اللہ تعالیٰ کی ذات کو قرار دیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ زیر بحث آیت ”مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنُ مَنَئِي“ میں بھی یوسف علیہ السلام کے کلام میں ”رب“ سے مراد اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ واللہ اعلم

”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ“
اور اس عورت نے تو ان کا قصد کر لیا تھا اور وہ بھی اس کا قصد کر لیتا اگر وہ اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل نہ دیکھ چکا ہوتا۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:
”اس آیت کی تفسیر دو طریقے سے ممکن ہے۔ ایک یہ کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل نہ دیکھ لیتے تو ان کے دل میں بھی اس عورت کی طرف جھکاؤ پیدا ہو جاتا، لیکن چونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک دلیل نظر آگئی اس لئے ان کے دل میں بھی تھوڑا سا میلان پیدا ہوا تھا جو ایک بشری تقاضا ہے۔

مگر بقول حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس کی بہترین مثال ایسی ہے جیسے بیاس کی حالت میں روزہ دار کو ٹھنڈا پانی دیکھ کر طبعی طور پر اس کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے لیکن روزہ توڑنے کا بالکل ارادہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح غیر اختیاری طور پر حضرت یوسفؑ کے دل میں بھی میلان پیدا ہوا۔ اور اگر وہ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے تو یہ میلان آگے بھی بڑھ سکتا تھا۔ لیکن اپنے رب کی دلیل دیکھنے کے بعد وہ غیر اختیاری جھکاؤ سے آگے نہیں بڑھا۔

زیادہ تر مفسرین نے اس دوسری تفسیر (بشری تقاضے کے تحت اس عورت کی طرف ان کا بھی تھوڑا سا میلان پیدا ہوا تھا) کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ اول تو یہ عربی زبان کے قواعد کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے۔ دوسرے اس سے حضرت یوسفؑ کے مقام بلند کامزید اندازہ ہوتا ہے۔ اگر ان کے دل میں یہ غیر اختیاری خیال بھی پیدا نہ ہوتا تو گناہ سے بچنا اتنا مشکل نہیں تھا لیکن اس جھکاؤ کے باوجود اپنے آپ کو بچانا زبردست اولوالعزمی کے بغیر ممکن نہیں ہے اور قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کے تقاضے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے خوف

سے اپنے آپ پر قابو رکھنا اور گناہ سے بچنا بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔“ (آسان ترجمہ قرآن۔ تشریحات کے ساتھ جلد دوم ص ۷۱۶)

اس کے برعکس مفکر اسلام مولانا مفتی محمود صاحب فرماتے ہیں کہ:
”ہادی النظر میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کا ارادہ زلیخا نے بھی کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی کیا لیکن دونوں میں وجوہ متعددہ سے فرق ہے:

۱۔ ایک یہ ہے کہ یوسفؑ کا ارادہ اضطراری تھا اور زلیخا کا ارادہ اختیاری تھا۔
۲۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک ہی فعل دو فاعلوں کی طرف منسوب ہوتا ہے تو اختصار کے پیش نظر وہاں تشبیہ کا صیغہ ذکر کیا جاتا ہے جیسے: ”قُلْنَا ذَا قَا الشَّجَرَةَ...“، ”فَمَا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنَهُمَا...“ لیکن یہاں سورہ یوسف میں جو ”هَمَّ“ منسوب الی زلیخا ہے اس کو الگ فعل سے ذکر کیا گیا ہے اور جو ”هَمَّ“ منسوب الی یوسف ہے اس کو الگ فعل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دونوں میں فرق ہے۔

۳۔ زلیخا کے ”هَمَّ“ پر ”ل“ اور ”قد“ دو حروف تحقیق و تاکید داخل کئے گئے ہیں اور یوسفؑ کی طرف مطلق ”هَمَّ“ منسوب ہے۔ ”فكانهما شيطان مختلفان“ کو یاد رکھیں انفعال الگ الگ ہیں۔

۴۔ جو ”هَمَّ“ منسوب الی زلیخا ہے وہ قضیہ موجبہ ہے اور جن الفاظ سے ”هَمَّ“ کی نسبت یوسفؑ کی طرف کی گئی ہے وہ قضیہ شرطیہ ہے۔ ”اثبات هَمَّ يوسف“ مشروط ہے عدم رویت برہان سے۔ اور جب رویت برہان ثابت ہو چکی ہے تو ”هَمَّ يوسف“ کا سلب لازم آتا ہے۔ ”اذا فاق الشرط، فاق المشروط“ لہذا یوسف علیہ السلام کا ارادہ ہوا ہی نہیں۔ مختصر یہ کہ یوسف علیہ السلام کا ارادہ تو برہان نہ دیکھنے سے مشروط ہے۔ برہان دیکھ لیا تو ارادہ بھی نہ رہا۔ (تفسیر محمود جلد دوم ص ۲۵۶-۲۵۷)

زیر بحث آیت کی ترتیب اور الفاظ: ”وَرَاوَدَتْهُ الْيَٰسَىٰ هَوًى فِی بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِیہِ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ...“ ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ“ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ زلیخا

چونکہ برے کام کا پختہ ارادہ کر چکی تھی اس لئے اس کے حیلوں ”فَوَرَاوَدْنَاهُ، غَلَقَتْ
الْأَبْوَابُ، وَقَالَتْ هَيْت لَكَ“ کے بعد اس کے ارادے کو ”لام“ اور ”قد“ تاکید کے دو
حرفوں کے ساتھ بیان کیا گیا لیکن یوسفؑ نے فعل بد کا ارادہ ہی نہیں کیا کیونکہ انہوں نے
عظمت الہی کا نشان دیکھ لیا تھا اسی لئے ان کے ارادے کو ”برہان“ پر معلق فرمایا یعنی عزیز مصر
کی بیوی تو پختہ ارادہ کر چکی تھی اور یوسفؑ بھی اگر ”برہان رب“ نہ دیکھتے تو ارادہ کر لیتے۔
مگر اکبر مفسرین نے اس توجیہ کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

اس صورت میں ”جزاء“ کو مقدم ماننا پڑتا ہے جو شاذ ہے۔ ”لَوْلَا أَنِّي رَأَيْتُهَا
رَبِّي“ شرط مؤخر ہے اور ”هَمَّ بِهَا“ جزا مقدم ہے۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ اس
اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

مفسرین نے آیت ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“ کی مختلف تفسیریں کی ہیں لیکن ہم
نے جو معنی بیان کئے ہیں (کہ: اور البتہ اس عورت نے یوسف سے ارادہ بد کیا اور وہ بھی ارادہ
کرتے اگر اپنے پروردگار کے برہان کو نہ دیکھ لیتے) وہی زیادہ موزوں اور مناسب مقام
ہیں۔ قرآن عزیز نے اول سے آخر تک اس واقعہ میں عزیز مصر کی بیوی کی شاعت کا راز اور
حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت و جلالت قدر کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس لئے یوسف علیہ
السلام کے ”مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ“ فرمانے کے بعد
یہی معنی بر محل ہو سکتے ہیں کہ یوسفؑ کی زبان سے برہان رب کو سن لینے کے بعد بھی جب
عورت اپنی ہٹ سے باز نہ آئی اور اپنے ارادہ پر مصر رہی تو یوسفؑ نے اس کے ارادہ کو قطعاً رد
کر دیا اور برہان رب کے سامنے اس کے ”هَمَّ“ کی مطلق پروا نہ کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ یوسفؑ اس
سے بچنے کے لئے دروازہ کی طرف بھاگے اور عزیز مصر کی بیوی نے ان کا پیچھا کیا۔

بعض مفسرین نے اس تفسیر پر یہ اعتراض کیا ہے کہ عربی گرامر کا تقاضا ہے کہ ”لَوْلَا“
کلام کے شروع میں استعمال ہو، اس لئے وسط کلام میں اس کا استعمال نحوی قاعدہ کے خلاف
ہے۔ مگر اس تفسیر کے مطابق ”لَوْلَا“ وسط کلام میں استعمال ہوگا اور تعبیر یہ ہوگی:

”وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنِّي رَأَيْتُهَا رَبِّي“ اور یوسفؑ بھی گناہ کا قصد کر لیتا اگر اپنے
رب کے برہان کو نہ دیکھ لیتا۔

مگر یہ اعتراض اس لئے درست نہیں کہ اس مقام پر بھی ”لَوْلَا“ کا استعمال شروع کلام
ہی میں ہوا ہے اور نحوی قاعدہ کے مطابق وال علی الجواب مقدم ہے اور ”لَوْلَا“ کا جواب جو بعد
میں مذکور ہوتا ہے اس وال علی الجواب کی وجہ سے مقدر و مخذوف ہے اور یہ اس لئے صحیح ہے کہ
فصاحت و بلاغت کا تقاضا ہے کہ ایک جانب مناسبت کلام کو قائم رکھا جائے یعنی دونوں کے
ارادہ عدم ارادہ کا ایک ہی جگہ ذکر ہو اور دوسری جانب نحوی قاعدہ کے پیش نظر ”لَوْلَا“ کا جواب
اس کے بعد میں آئے اور یہ دونوں باتیں جب ہی ہو سکتی ہیں کہ ”هَمَّ بِهَا لَوْلَا“ کا جواب بنا
کر ”هَمَّتْ بِهٖ“ کے ساتھ ذکر کیا جائے اور ”لَوْلَا“ کا جواب ”هَمَّ بِهَا“ کو قدر تسلیم کیا
جائے لہذا مسطورہ بالا تفسیر ہی شک و شبہ سے بالاتر حقیقت حال کو واضح اور ظاہر کرتی ہے۔
کلام مجید میں اس کی نظیر موسیٰؑ کی والدہ کے تذکرہ سے متعلق یہ آیت ہے:

”إِنِّي كُنَّا نَكْتَلُ لَثْبَدِي بِهٖ لَوْلَا أَنِّي رَأَيْنَا عَلَىٰ قَلْبِهَا“ (القصص نمبر ۱۰)

قریب تھا کہ وہ (یعنی والدہ موسیٰؑ) اس کو ظاہر کر دے اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ بنا دیتے۔
یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل کو مضبوط کر دیا تو وہ موسیٰ علیہ السلام کے راز کو ظاہر نہ
کر سکیں اور اگر ہم ایسا نہ کرتے تو وہ ظاہر کر دیتیں۔ دیکھئے یہاں بھی ”لَوْلَا“ سے وال علی الجواب
مقدم ہے اور ”لَوْلَا“ کا جواب ”لَثْبَدِي بِهٖ“ مقدر و مخذوف ہے۔ اسی طرح اس مقام پر یہ معنی ہیں
کہ اگر یوسف علیہ السلام کو برہان رب حاصل نہ ہوتا تو وہ بھی ارادہ بد کر لیتے لیکن انہوں نے ارادہ
بد نہیں کیا کیونکہ وہ برہان رب دیکھ چکے تھے۔ (قصص القرآن جلد اول ص ۲۹۱-۲۹۲)

”هَمَّ بِهَا“ کا ذکر تو بعد میں ہوا ہے حضرت یوسف علیہ السلام کی اصل آزمائش تو اس وقت ہوئی
جب تمام تر ”سازگار“ ماحول میں ایک عام خوبہ، آزاد عورت ہی نہیں بلکہ مالکہ و ذمہ دار خاتون نے
اپنی خواہش نفس سے بے قابو ہو کر گھر کے تمام دروازے یکے بعد دیگرے بند کرنے شروع کر دیئے
جہاں نہ رقیب کا ڈر، نہ اور کوئی خوف تھا پھر ”هَمَّتْ لَكَ“ کے الفاظ سے دعوت گناہ اس پر مستزاد۔

کیا ایسے ہیجان خیز مرحلے پر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے ”ہَکَمَ بِهَا“ کی کوئی غیر اختیاری حرکت بھی سامنے آئی؟ یا اسی موقع پر بلا تامل اس ”پیکر عصمت، امین نبوت اور مہبط وحی الہی“ نے اس عورت کی آرزوؤں کو پامال کرتے ہوئے ناشگاف الفاظ میں یہ جواب دیا تھا کہ:

”مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ“ مگر اس کے باوجود بعض مفسرین نے ”ہَکَمَ بِهَا“ کے تحت یوسف علیہ السلام کا قصد بھی ”ثابت“ کر کے بشری تقاضے کے تحت اس سے ”میلان طبع“ مراد لے لیا۔

سخت تعجب ہے کہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ”برہان رب“ دیکھنے کے بعد بھی حضرت یوسف علیہ السلام کو اس ”میلان طبع“ پر نہ صرف قائم دکھا رہے ہیں بلکہ جن مفسرین نے یہ تعبیر کی ہے کہ ”اگر وہ برہان رب نہ دیکھ لیتے تو وہ بھی اس عورت کا قصد کر لیتے“ اسے دلائل کے ساتھ رد بھی کر رہے ہیں کہ یہ جھکاؤ اور میلان طبع ان کی ”اولوالعزمی“ کی دلیل ہے۔ چنانچہ موصوف فرماتے ہیں کہ:

”اسی طرح غیر اختیاری طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی میلان پیدا ہوا اور اگر وہ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے تو یہ میلان آگے بھی بڑھ سکتا تھا لیکن اپنے رب کی دلیل دیکھنے کے بعد وہ غیر اختیاری جھکاؤ سے آگے نہیں بڑھا۔ زیادہ تر مفسرین نے اس دوسری تفسیر کو اس لئے اختیار کیا کہ اول تو یہ عربی زبان کے قواعد کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے، دوسرے اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کے مقام بلند کامزید اندازہ ہوتا ہے۔ اگر ان کے دل میں یہ غیر اختیاری خیال بھی پیدا نہ ہوتا تو گناہ سے بچنا اتنا مشکل نہیں تھا لیکن اس جھکاؤ کے باوجود اپنے آپ کو بچانا زبردست اولوالعزمی کے بغیر ممکن نہیں ہے اور قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کے تقاضے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے خوف سے اپنے آپ پر قابو رکھنا اور گناہ سے بچنا بڑے عاجز و ثواب کا کام ہے۔“ (آسان ترجمہ قرآن۔ جلد دوم ص ۷۱۶)

اس بات کی وضاحت موصوف خود ہی بہتر انداز سے کر سکتے ہیں کہ بشری تقاضے کے تحت جو ”غیر اختیاری“ جھکاؤ پیدا ہوا وہ ”برہان رب“ کا مشاہدہ اور اس پر یقین کرنے کے بعد بھی آخر

کیوں ختم نہ ہوا؟ کیا ایسا قائم رہنے والا جھکاؤ یا میلان طبع ”غیر اختیاری“ ہوا کرتا ہے؟ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جو چیز قرآن وحدیث سے ثابت ومعلوم ہو (یعنی دل کے تقاضے کے باوجود) کیا وہ پھر بھی ”غیر اختیاری“ کے درجے میں ہی رہے گا؟ جبکہ حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس مقام پر واضح طور پر لکھا ہے کہ برہان رب دیکھنے کے بعد وہ غیر اختیاری میلان آگے بڑھنے کے بجائے بالکل ختم ہو گیا سلا حفظہ ہو: معارف القرآن جلد ۵ ص ۴۶۔

حضرت موصوف کے مدوح دامام طبری نے ”ہَکَمَ بِهَا“ کے تحت جو نقشہ کھینچا ہے (اس کا ذکر آگے آ رہا ہے) اسے (بفرض محال) تسلیم کر لینے سے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے ”موقف“ کے مطابق کیا حضرت یوسف علیہ السلام کی زیادہ اولوالعزمی ثابت نہیں ہوتی؟ (العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ)

صد افسوس کہ موصوف نے ”عربی قواعد“ کا لحاظ کرتے ہوئے اس تفسیر کو رد کر دیا جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت وعصمت کا زیادہ لحاظ رکھا گیا تھا۔ قارئین کرام مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی تفسیر وتشریح کے تقابلی مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ نے قرآن کریم بالخصوص سورۃ القصص کی آیت ۱۰ کی روشنی میں ہی وہ صاف اور بالکل بے غبار نیز حضرت یوسف علیہ السلام کے شایان شان تفسیر اختیار کی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی تصریح کے مطابق ”قرآن وحدیث اور عربی قواعد کے لحاظ“ سے راجح اور صحیح تفسیر یہی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں بشری تقاضے کے مطابق غیر اختیاری طور پر اس عورت کی طرف جھکاؤ اور طبعی میلان پایا جاتا تھا جو ”برہان رب“ دیکھنے کے بعد بھی بدستور قائم رہا جس کی بناء پر ان کی ”اولوالعزمی“ زیادہ واضح ہوتی ہے۔ (فیاض)

اس موقف کے ساتھ اتفاق ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کا تعلق کسی مفسر محدث اور فقیہ و مجتہد کی ذات کے ساتھ نہیں بلکہ اس نبی معصوم کی ذات کے ساتھ ہے جن کا تعارف نبی

امام طبری --- کون؟ تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

فعل شفع اور حرکت قنح ہے جس کا مرتکب ایک ظالم شخص ہی ہو سکتا ہے۔

۶۔ صاحب تفسیر مظہری بحوالہ حضرت جعفر صادقؑ لکھتے ہیں کہ: ”برہان“ سے مراد نبوت ہے جو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے سینہ میں ودیعت کی ہوئی تھی وہی اس برائی کے درمیان حائل ہوئی۔

۷۔ ”برہان“ سے مراد ”عصمت“ ہے جس کے تحت نبی قبل از نبوت بھی صفات و کبار سے پاک ہوتے ہیں۔

۸۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دعوت گناہ سے پہلے زوجہ عزیز نے ایک بت پر کپڑا ڈال دیا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے استغفار پر اس نے بتایا کہ یہ ہمارا معبود ہے اس کے سامنے گناہ کی جرأت نہیں۔

۹۔ یوسف علیہ السلام کو آواز دی گئی کہ:

”أَنْتَ مَكْتُوبٌ فِي الْأَنْبِيَاءِ وَتَعْمَلُ عَمَلِ السَّافِهَاءِ“ آپ کا نام تو انبیاء میں لکھا ہوا ہے اور یہ کیا جاہلوں اور بے وقوفوں والا عمل کرنے لگے ہو؟ (اسرائیلی روایات ۱۶۶، مؤلفہ مولانا اشیر ادروی)

بعض بزرگ ”خواہ مخواہ“ دور از کار بحثوں میں الجھے رہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس ”برہان“ کو سب سے پہلے خود حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان مبارک سے بیان کر دیا کہ وہ زوجہ عزیز کی طرف سے ”هَيْبَتُكَ“ کے الفاظ سننے ہی پر کاراٹھے کہ ”مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ“

یہی وہ ”برہان رب“ تھی جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ۲۰/۱۸ سال کی نوخیز جوانی کے عالم میں ایسے نازک موقع پر ”قصد“ سے بھی باز رکھا۔ کلام الہی سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے جسے بڑے شدد و مد سے یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

”كَذَلِكَ لِنُضْرِبَ عَنْهُ السُّيُوءَ وَنُلْقِيَهُ فِي سُبْحَانَكَ لِنُظْهِرَ لَكَ لِيُخْلَصَ مِنْ سَبْطِ الْغُلَامِ“ اسی طرح ہوا تاکہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو۔ بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔

امام طبری --- کون؟ تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

حضرت یوسف علیہ السلام کا دامن اس قسم کے ”تھم“ سے اس لئے پاک رہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عصمت و پاکی کا فیصلہ شروع ہی سے کر دیا تھا۔ پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ ان کی عصمت و حفاظت کے بعد اس کے خلاف کوئی شائبہ بھی ان میں پایا جاتا؟ مگر اس کے برعکس حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ایسی ”راہ“ نکالی ہے جس کی رو سے ”برہان“ سے متعلق تمام تفسیری اقوال مراد لینے کی بھی گنجائش نکل آئی ہے۔ چنانچہ موصوف فرماتے ہیں کہ:

”امام تفسیر ابن جریر نے ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد جو بات فرمائی ہے وہ سب اہل تحقیق کے نزدیک نہایت پسندیدہ اور بے غبار ہے وہ یہ ہے کہ جتنی بات قرآن کریم نے بتلا دی ہے صرف اسی پر اکتفاء کیا جائے یعنی یہ کہ یوسفؑ نے کوئی ایسی چیز دیکھی جس سے دوسوہ ان کے دل سے جاتا رہا۔ اس چیز کی تعین میں وہ سب احتمال ہو سکتے ہیں جو حضرات مفسرین نے ذکر کئے ہیں لیکن قطعی طور پر کسی کو متعین نہیں کیا جاسکتا۔“ (معارف القرآن جلد ۵۔ ص ۵۰)

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

”برہان رب“ سے مراد وہ نورین ذاتی ہے جو اللہ تعالیٰ ہر انسان کی فطرت کے اندر ودیعت فرماتا ہے جو خیر و شر میں امتیاز کا ذریعہ بھی ہے اور جو خیر پر ابھارتا بھی ہے اور برائی سے روکتا بھی ہے۔ یہ نور اللہ تعالیٰ بخشا تو ہر ایک کو ہے لیکن سنت الہی یہ ہے کہ جو اس کی قدر کرتے اور اس کی رہنمائی قبول کرتے ہیں ان کے اندر تو یہ برابری سے قوی تر ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ نہایت سخت آزمائش کے مواقع پر بھی وہ انسان کو نفس اور شیطان کے فتنوں میں مبتلا ہونے سے بچالیتا ہے۔۔۔

حضرت یوسف علیہ السلام ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اس نور کی قدر کی۔ اس کا صلہ ان کو یہ ملا کہ اس نازک موقع پر، جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ اس نور نے ان کو نفس اور شیطان کی تاریکی میں گھر جانے سے بچالیا۔ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ جہاں تک عورت کا تعلق ہے وہ تو بالکل اندھی، بہری ہو کر پیچھے پڑ گئی تھی، حضرت یوسفؑ بھی اس وقت آخر جوان تھے غالباً ۲۰/۱۸ سال کی عمر ہو گئی کیا عجب تھا کہ ان

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

کے قدم بھی لڑکھڑا جاتے، لیکن نہیں، ان کے اندر وہ نوریز دانی موجود تھا جس کی رہنمائی کو انہوں نے کبھی ٹھکرایا نہیں تھا۔ وہ اس موقع پر ان کے باطن میں چکا اور دفعۃً آنکھوں کے سامنے سے ساری ظلمت کا فورہ گئی فرمایا: ”كُلِّلَكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ ط إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ“ یعنی چونکہ وہ ہمارے منتخب اور برگزیدہ بندوں میں سے تھا جس کو ہم نے اپنے کار خاص کے لئے منتخب کیا تھا۔ اس وجہ سے ہم نے اس مازک موقع پر اپنی برہان سے اس کی رہنمائی فرمائی تاکہ اس کو برائی اور بے حیائی سے محفوظ رکھیں۔ ”برہان“ واضح دلیل اور مُسَبِّحَتِ حجت کو کہتے ہیں۔ اس دلیل سے زیادہ واضح اور مسکت دلیل اور کون ہو سکتی ہے جو خود اپنے باطن سے اذان دے۔

اس آیت سے عصمت انبیاء کے بعض پہلو بھی روشن ہوتے ہیں مثلاً ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو بعثت سے قبل بھی گناہوں کی آلودگی سے محفوظ رکھتا ہے۔ دوسرا یہ کہ نبی کے معصوم ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے گناہ کرنے کی قوت و صلاحیت سلب کر لی جاتی ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ برابر اپنے نوافطرت کی نگرانی کرتے ہیں اس وجہ سے بالترتیب وہ اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ سخت سے سخت آزمائش کے مواقع میں بھی وہ ان کو راہ سے بے راہ نہیں ہونے دیتا۔ (مذہب قرآن جلد ۲ ص ۲۰۶-۲۰۷) ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“ میں لفظ ”هَمَّ“ (جس کے معنی خیال و فکر اور قصد و ارادہ کے ہیں) کو زوجہ عزیز اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس آیت کے بعد والی آیت: ”وَاسْتَبَقَا الْبَابَ...“ (یوسف ۲۵) میں اس کشمکش کا اختتام اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ عورت کے اصرار سے نجات پانے کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام دوڑے اور دروازے سے باہر ہو گئے۔

اس حقیقت کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام گناہ میں تو کیا مبتلا ہوتے، ارادہ بھی نہیں کیا بلکہ ارادے کے خلاف عمل کیا اور باہر نکل آئے۔ اس سیاق کلام کو پیش نظر رکھ کر ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا...“ کا ترجمہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ: ”اور اس عورت نے ان کا (پورا) ارادہ کر لیا اور (قریب تھا کہ) وہ بھی اس کا ارادہ

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

کرتے اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا“، ”اور اس عورت نے ان کا ارادہ کیا اور (اس کے شدید اصرار پر) یوسف کے دل میں اس کا خیال آتا اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا“، ”اور البتہ اس عورت نے یوسف کا ارادہ کیا اور یوسف بھی اس عورت کا ارادہ کرتے اگر اپنے پروردگار کے برہان کو نہ دیکھے ہوتے۔“

اس ترجمہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسف کو بھی اس کا خیال پیدا ہو جاتا اگر اللہ کی محبت و برہان کو نہ دیکھتے لیکن وہ چونکہ ”برہان رب“ کو دیکھ چکے تھے اس لئے وہ اس عورت کا خیال و قصد کرنے سے بھی بچ گئے۔ اس ترجمہ و تفسیر کی رو سے بشری تقاضے اور غیر ارادی خیال کی بھی نفی ثابت ہو رہی ہے جو حضرت یوسف کے شایان شان اور عقیدہ عصمت انبیاء علیہم السلام کے عین مطابق ہے۔

اس مسئلہ پر سب سے زیادہ مفصل و مدلل بحث امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) نے کی ہے جس میں (جدید و قدیم) تمام اشکالات کے جوابات پائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کے ہم خیال دیگر تمام مفسرین و قمعین کو جزائے خیر عطا فرمائیں جنہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ناموس کا ہر اعتبار سے تحفظ و دفاع کا فریضہ بطریق احسن ادا کیا۔ مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو: التفسیر الکبیر جلد ۶ ص ۴۴۰-۴۴۱۔

”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۖ وَ هَمَّ بِهَا“ اور تفسیر طبری

زیر بحث آیت میں ”هَمَّ“ کا لفظ دومرتبہ آیا ہے ایک (هَمَّتْ) فعل کا فاعل زوجہ عزیز ہے اور دوسرے فعل ”هَمَّ“ کا فاعل حضرت یوسف ہیں۔ دونوں جگہ ”هَمَّ“ ایک ہی معنی میں استعمال نہیں ہوئے جس میں فرق ”لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ“ اور ”هَمَّ بِهَا“ کے الفاظ پر غور کرنے سے آسانی معلوم ہو جاتا ہے۔ ”لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ“ کی بناء پر ایک جماعت نے حضرت یوسف کی طرف سے ”هَمَّ“ کی نفی کی ہے کہ اگر وہ اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتے تو اس کا قصد کر لیتے لیکن چونکہ وہ اسے دیکھ چکے تھے اس لئے اس کا قصد بھی نہیں کیا۔ ایک دوسری بڑی جماعت کا خیال ہے کہ حضرت یوسف کا ”هَمَّ“ بشری تقاضے کے تحت میلان طبع اور غیر اختیاری درجے میں تھا جس کا شاعر کا گناہ میں بھی نہیں ہوتا اور انبیاء کرام علیہم السلام کی عصمت پر بھی اس کا ارتکاب کرنے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ایک قلیل تیسرا گروہ ہے جس کے سرخیل سنی امام المفسرین علامہ ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری ہیں۔ ان کے نزدیک دونوں ”هَمَّ“ ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں یعنی کسی کام کا قصد اور عزم کرنا۔

امام طبری کہتے ہیں کہ ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ زوجہ عزیز نے بھی اس قبیح فعل کا قصد عزم کیا اور ”وَهَمَّ بِهَا“ سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت یوسف بھی اس فعل کے لئے بالکل تیار ہو گئے لیکن اللہ تعالیٰ کی برہان نمودار ہونے کی وجہ سے اس میں ملوث ہونے سے بچ گئے۔ امام طبری نے حضرت یوسف علیہ السلام کی اس بدترین توہین پر مبنی موقف کو تقریباً دو درجن روایات میں پورے ”ہوش و حواس“ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اگر امام طبری کو ہمارے علماء امام المفسرین، محدث، فقیہ، مجتہد اور عظیم سنی مؤرخ کے روپ میں پیش نہ کرتے تو انہیں

یہاں ہرگز نقل نہ کیا جاتا۔ اللہ شاہد ہے کہ عقیدہ عصمت انبیاء کے تحفظ، احقاق حق، ابطال باطل اور مسلمانوں کو موضوع، جھوٹی، یہودی و اسرائیلی روایات سے آگاہ کرنے کی خاطر انتہائی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے بہتی آنکھوں، دھڑکتے دل اور کانپتے ہوئے قلم سے امام المفسرین کی تصنیف ام التفاسیر ”جامع البیان فی تاویل القرآن“ سے چند روایات پوری امت مسلمہ سے معافی کی درخواست کے ساتھ تذکرہ قارئین کی جاتی ہیں۔

امام طبری اس بحث کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

... ان امرأۃ العزیز لما همت بیوسف، و ارادت مرادته، جعلت تذکر له محاسن نفسه، و تشوقه الی نفسہا، کما: ...

... عزیز کی بیوی نے جب یوسف کے ساتھ برائی کا عزم کر لیا تو اس نے انہیں اپنے نفس کی طرف مائل کرنے کی خاطر، ترغیب دیتے ہوئے ان کے حسن و جمال کی تعریف شروع کر دی۔ جیسا کہ:

۱- حدثنا ابن وکیع قال، حدثنا عمرو بن محمد قال، حدثنا أسباط، عن السدی: ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا“ قال: قالت له: یا یوسف، ما أحسن شعرك! قال: هو أول ما ينتشر من جمادی۔ قالت: یا یوسف! ما أحسن وجهك! قال: هو للشراب، یا کله۔ فلم نزل حتی أطمعته فهمت به و هم به، فدخل البيت، و غلقت الأبواب، و ذهب لیحل سراويله، فإذا هو بصورة یعقوب قائما فی البيت وقد عَضَّ علی إصبعه... فربط سراويله... (تفسیر الطبری۔ جلد ۷ ص ۱۸۱۔ تحت رقم ۱۹۰۲۳۔ طبع بیروت ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء)

... سدی سے روایت ہے کہ زوجہ عزیز نے حضرت یوسف سے کہا: اے یوسف! آپ کے بال کتنے ہی اچھے ہیں۔ انہوں نے کہا: (میرے مرنے کے بعد) یہ سب سے پہلے میرے جسم سے الگ ہو جائیں گے۔ پھر اس عورت نے کہا: آپ کا چہرہ کس قدر حسین ہے۔ جواب دیا کہ: یہ مٹی کے لئے ہے جو اسے کھا جائے گی۔ یہ عورت برابر حضرت یوسف

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

اس سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا یہاں تک کہ یوسف نے اس عورت کا قصد کر لیا اور اس عورت نے بھی یوسف کا قصد کر لیا۔ پھر مکان میں علیحدہ چلے گئے۔

(امام طبری لکھتے ہیں کہ) ”ہم یوسف اور ”ہم زوجہ عزیز“ کے بارے میں اہل علم نے جو کہا ہے میں انہیں یہاں ذکر کر رہا ہوں اور وہ یہ ہے:

۳۔ ”حدثنا أبو کریب، وسفیان بن وکیع و سهل بن موسیٰ الرازی قالوا، حدثنا ابن عیینة، عن عثمان بن أبی سلیمان، عن ابن أبی ملیکة، عن ابن عباس:

سئل عن هم یوسف مابلغ؟ قال: حلّ الهمیان، وجلس منها مجلس الخاتن، لفظ الحديث لأبی کریب“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۲۵)

”حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ یوسف کا قصد و خیال کہاں تک پہنچا؟ فرمایا: انہوں نے شلوار یا پاجامہ اتار لیا اور زوجہ عزیز کی اس جگہ پر بیٹھ گئے جہاں بیٹھ کر عورت سے مقاربت کی جاتی ہے۔ یہ ابوکریب کی حدیث کے لفظ ہیں۔“

۴۔ ”حدثنا أبو کریب و ابن وکیع قالا، حدثنا ابن عیینة قال، سمع عبیداللہ بن أبی یزید، ابن عباس فی: ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“، قال جلس منها مجلس الخاتن، و حلّ الهمیان۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۲۶)

”حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے آیت ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: حضرت یوسفؑ زوجہ عزیز کے مقام خاص پر بیٹھ گئے جہاں پر بیٹھ کر عورت سے مقاربت کی جاتی ہے اور شلوار اتار لی۔“

۵۔ ”حدثنا زیاد بن عبدلله الحمصانی، وعمرو بن علی، والحسن بن محمد قالوا، حدثنا سفیان بن عیینة عن عبدلله بن أبی یزید قال، سمعت ابن عباس سئل: مابلغ من هم یوسف؟ قال: حلّ الهمیان، و جلس منها مجلس الخاتن۔“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۲۷)

امام طبری نے یہ روایت ایک دوسری سند سے بیان کی ہے۔ ترجمہ وہی ہے جو اوپر گزرا ہے۔ صرف شلوار اتارنے کے حوالے سے تقدیم و تاخیر کا فرق ہے یعنی بعض روایات

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

کے مطابق پہلے شلوار اتاری پھر مقام خاص پر بیٹھے اور دیگر روایات میں ہے کہ پہلے مقام خاص پر بیٹھے پھر شلوار اتاری۔

۶۔ حدثنی زیاد بن عبدلله قال، حدثنا محمد بن أبی عدی، عن ابن جریج، عن ابن أبی ملیکة قال: سألت ابن عباس: مابلغ من هم یوسف؟ قال استقلت له، و جلس بین رجلیہا۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۲۸)

... ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا کہ: یوسف کا ارادہ و خیال کہاں تک پہنچا؟ فرمایا: زوجہ عزیز یوسف کے سامنے چٹ لیٹ گئی اور وہ اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھ گئے۔

۷۔ حدثنا ابن وکیع قال، حدثنا یحییٰ بن ہمان، عن ابن جریج، عن ابن أبی ملیکة: ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“، قال: استقلت له و حلّ ثیابہ۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۲۹)

ابن ابی ملیکہ نے آیت ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ: زوجہ عزیز یوسف کے لئے سیدھی لیٹ گئی اور انہوں نے اپنے کپڑے اتار لئے۔

۸۔ حدثنی المثنیٰ قال، حدثنا قبیصة بن عقبہ قال، حدثنا سفیان، عن ابن جریج، عن ابن أبی ملیکة، عن ابن عباس: ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“، ما بلغ؟ قال: استقلت له، و جلس بین رجلیہا، و حلّ ثیابہ۔ او: ثیابہا۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۳۰ ص ۱۸۲)

... ابن ابی ملیکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے آیت ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“ کے تحت روایت کرتے ہیں کہ ان کا ”ہم“ (قصد و خیال) کہاں تک پہنچا؟ فرمایا: زوجہ عزیز یوسف کے سامنے چٹ لیٹ گئی اور وہ اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے اتار دیئے۔ یا اس عورت کے کپڑے اتار دیئے۔

”ثیابہ او: ثیابہا“ سے پہلے دونوں کے لئے ”حلّ“ فعل مذکر استعمال ہوا ہے اور اس کا

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

فاضل یوسف ہیں۔ پہلی روایات کے مطابق اپنی شلوار اور کپڑے اتارنے کا ذکر تھا جبکہ مذکورہ روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ”ہم یوسف“ اس سے بھی آگے بڑھ گیا حتیٰ کہ اس عورت کے بھی کپڑے اتار دیئے۔

۹۔ حدثنی المثنی قال، حدثنا إسحاق قال، حدثنا يحيى بن سعيد، عن ابن جريج، عن ابن أبي مليكة قال: سألت ابن عباس: ما بلغ من هم يوسف؟ قال: استلقت على قفاها وقعد بين رجليها لينزع ثيابه۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۳۱)

... ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباسؓ سے پوچھا کہ: یوسفؑ کا قصد و خیال کہاں تک پہنچا؟ فرمایا: وہ عورت اپنی پیٹھ کے بل سیدھی لیٹ گئی اور یوسفؑ اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھ گئے تاکہ وہ اپنے کپڑے اتار دیں۔

۱۰۔ ”حدثنا أبو كريب قال، حدثنا وكيع، و حدثنا ابن وكيع قال، حدثنا أبي، عن نافع بن عمر، عن ابن أبي مليكة قال: سئل ابن عباس عن قوله: ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“ ما بلغ من هم يوسف؟ قال: حل الهميان، یعنی السراويل۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۳۲)

”ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“ کے متعلق پوچھا گیا کہ اس میں حضرت یوسفؑ کا قصد و خیال کہاں تک پہنچا؟ فرمایا: انہوں نے ”ہمیان“ یعنی شلوار (سراويل) اتار دی تھی۔“

۱۱۔ حدثنا أبو كريب وابن وكيع قالا، حدثنا ابن إدريس، قال سمعت الأعمش، عن مجاهد في قوله: ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“، قال: حل السراويل حتى ألبسها، و استلقت له۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۳۳)

امام طبری ایک دوسری سند کے ساتھ آیت کی تفسیر میں امام مجاہد کا یہ قول لائے ہیں کہ یوسفؑ نے اپنی شلوار اتار دی اور زوجہ عزیزان کے سامنے سیدھی لیٹ گئی۔

۱۲۔ حدثنا زياد بن عبدالله الحسائي قال، حدثنا مالك بن سعيد قال،

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

حدثنا الأعمش عن مجاهد في قوله: ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“، قال: حل السراويل حتى وقع على البتية۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۳۴)

اس کا بھی وہی مفہوم ہے جو پہلے بیان ہوا۔

۱۳۔ حدثنا محمد بن عبدالأعلى قال، حدثنا محمد بن ثور، عن معمر، عن ابن أبي نجيح، عن مجاهد: ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“، قال: جلس منها مجلس الرجل من امرأته۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۳۵)

امام تفسیر حضرت مجاہد اس آیت کی تفسیر میں حضرت یوسفؑ کے ”ہم“ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: یوسفؑ زوجہ عزیز کے قریب اس طرح بیٹھ گئے جس طرح ایک آدمی اپنی عورت کے ساتھ مقاربت کے وقت بیٹھتا ہے۔

۱۴۔ حدثني المثنى قال، حدثنا أبو حنيفة قال، حدثنا شبل قال، حدثني القاسم بن أبي بزة: ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“، قال: أفا همها به، فاستلقت له، و أفا همها بها، فأنه قعد بين رجليها ونزع ثيابه۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۳۶)

امام طبری ایک نئی سند کے ساتھ روایت القاسم بن ابی بزہؓ ہیں کہ: زوجہ عزیز کا ”ہم“ یہ تھا کہ وہ ان کے سامنے بالکل چٹ لیٹ گئی۔ جبکہ یوسفؑ کا ”ہم“ یہ تھا کہ وہ اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے اتار دیئے۔

۱۵۔ حدثنا الحسن بن محمد قال، حدثني حجاج بن محمد، عن ابن جريج قال، أخبرني عبدالله بن أبي مليكة قال: قلت لابن عباس: ما بلغ من هم يوسف؟ قال: استلقت له، و جلس بين رجليها ينزع ثيابه۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۳۷)

۱۶۔ حدثني المثنى قال، حدثنا الحماني قال، حدثنا يحيى بن اليمان، عن سفيان، عن علي ابن بنزيمة، عن سعيد بن جبيرة وعكرمة قالا، حل السراويل، و جلس منها مجلس الخاتن۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۳۸)

۱۷۔ حدثنا ابن وكيع قال، حدثنا عمرو بن محمد العنقزي، عن

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

شریک، عن جابر، عن مجاهد: "وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا"، قال: استلقت و حلّ ثيابہ حتی بلغ أليائه۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۳۹)

۱۸۔ حدثني الحارث قال، حدثنا عبد العزيز قال، حدثنا قيس، عن أبي حصين، عن سعيد بن جبیر: "وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا"، قال: أطلق تگة سراويله۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۴۰)

۱۹۔ حدثنا الحسن بن يحيى قال، أخبرنا عبد الرزاق قال، أخبرنا ابن عيينة، عن عثمان بن أبي سليمان، عن ابن أبي مليكة قال: شہلت ابن عباس سئل عن هم يوسف ما بلغ؟ قال: حل الهميان، و جلس منها مجلس الخاتن۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۰۴۱)

نمبر شمارہ ۱۹۵ تا ۱۹۷ اور روایت نمبر ۱۹۰۳۷ تا ۱۹۰۴۱ میں "ہم یوسف" کے بارے میں پہلے والا ہی مفہوم بیان کیا گیا ہے کہ "ہم زینہ عزیز" یہ تھا کہ وہ مکان کے تمام دروازے بند کر کے، محفوظ خلوت گاہ میں یوسف سے بے تکلف ہوتے ہوئے، آپ کے بال کتنے حسین ہیں، آپ کا چہرہ کس قدر خوبصورت ہے، معلّم کے ارادے سے ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے "بسط يدها إليه و قصد المعانقة و غير ذلك (روح المعاني جلد ۱۲۔ ص ۲۱۳)، ان پر جھک گئی پھر ان کے سامنے سیدھی لیٹ گئی پھر کہا: "هيت لك" جبکہ "ہم یوسف" یہ تھا کہ وہ اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان اس طرح بیٹھ گئے جس طرح ایک آدمی اپنی بیوی کے ساتھ مقاربت کرتے وقت بیٹھتا ہے۔

امام طبری نے مذکورہ ۱۹ روایات میں سے ۹ روایات کا سلسلہ سند حضرت عبداللہ بن عباسؓ تک پہنچایا کہ انہوں نے "ہم یوسف" کی مذکورہ وضاحت فرمائی۔ حاشا و کلا۔ ان کی طرف اس مذکورہ قول کی نسبت کسی صورت میں بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ اسے صحیح سمجھنے کی صورت میں یقیناً ایمان سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ امام طبری اور ان کے پیروکار اپنے قول و عمل کے خود ہی ذمہ دار ہیں۔ البتہ ہم تو ہیں انبیاء اور توہین صحابہؓ پر مشتمل تمام روایات اور دیگر خرافات سے علانیہ برأت کا اعلان کرنا اپنے ایمان کا لازمی تقاضا سمجھتے ہیں۔

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

مذکورہ ۱۹ روایات میں جملہ راویوں کی تعداد ۱۰۰ تک پہنچ گئی ہے۔ (ان میں سے بعض نام مکرر بھی آئے ہیں) طبری و امثالہ کے نزدیک "ہم یوسف" کو "تواثر" کا درجہ حاصل ہو گیا ہے مگر دوسری طرف "اکرم الناس" ایک نبی ابن نبی اللہ، ابن نبی اللہ، ابن خلیل اللہ اور الکریم ابن الکریم ابن الکریم حضرت یوسفؑ کی عزت، ماموس اور عصمت کا تعلق ہے جسے ان جیسے کروڑوں راویوں کی "وثاقت" پر گزرقربان نہیں کیا جاسکتا۔

قارئین کرام! مذکورہ روایات میں سے کوئی ایک روایت بھی قابل تحریر اور قابل بیان نہ تھی لیکن یہ "امام طبری" ہی کا حوصلہ تھا جنہوں نے ڈیڑھ درجن سے زائد روایات کو نہ صرف تحریر کیا بلکہ انہیں "اہل علم" کی "تحقیق" کے طور پر پیش کیا:

فإن أهل العلم قالوا في ذلك ما أذاكره، و ذلك ما...

مگر اس کے باوجود امام طبری کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا وہ ان روایات کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

فلان قال قائل: و كيف يجوز أن يوصف يوسف بمثل هذا، و هو لله نبي؟

قيل: إن أهل العلم اختلفوا...

پھر اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ حضرت یوسفؑ کو روایات میں مذکور "ہم" کے ساتھ متصف کرنا کیوں کر جائز ہو سکتا ہے حالانکہ وہ اللہ کے نبی ہیں؟ اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف ہے:

فقال بعضهم: كان من ابتلى من الانبياء بخطيئة، فاما ابتلاه الله بهاء، ليكون من الله عز وجل على وجل إذا ذكرها، فيجد في طاعته إشفافاً منها، ولا يتكل على سعة عفو الله و رحمته۔

وقال آخرون: بل ابتلاه الله بذلك، ليعرفهم موضع نعمته عليهم، بصفحة عنهم، وتركه عقوبته عليه في الآخرة۔

وقال آخرون: بل ابتلاههم بذلك ليجعلهم أئمة لأهل الذنوب في رجاء

رحمة الله، و ترك الإيأس من عفوهم إذا تابوا۔

۱۔ پس ان میں سے بعض نے کہا کہ: انبیاء میں سے بعض کو خطا میں اس لئے مبتلا کیا

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

جاتا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہوئے ڈرے اور اللہ تعالیٰ کی وسعت عفو و رحمت ہی کے بھروسے پر نہ رہے۔

۲۔ اور دوسرے علماء نے کہا کہ انبیاء کو خطا میں اس لئے مبتلا کیا جاتا ہے تاکہ نعمت کے موقع پر اللہ تعالیٰ ان کو یہ جتلائے کہ اس نے اس خطا کو درگزر کر دیا ہے اور آخرت میں اس پر کوئی مواخذہ نہیں کرے گا۔

۳۔ اور بعض دوسرے علماء نے کہا کہ خطا میں انبیاء کی آزمائش اس لئے ہوتی ہے تاکہ گناہ گاروں کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید میں انبیاء کرام پیشوا ثابت ہوں اور تاکہ گناہ گار تو بہ کے وقت مایوسی کا شکار نہ ہوں۔

امام طبری نے پہلے ”۱۹“ روایات پیش کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس فعل قبیح کی ”مبادیات“ کا مرتکب قرار دیا پھر اگر اس پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ یہ افعال عقیدہ عصمت انبیاء کے منافی ہیں تو اس کے سامنے علماء کے اختلافی اقوال رکھ کر اسے خاموش کر دیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو خطا میں مبتلا کر کے انہیں آزماتے رہتے ہیں تاکہ جب وہ اس گھڑی کو یاد کریں تو ان کے دل میں مزید اللہ کا خوف اور اطاعت کا جذبہ پیدا ہو، وہ اللہ کی وسعت عفو و رحمت ہی کے سہارے پر نہ رہیں، تاکہ نعمت کے موقع پر وہ انہیں جتلائے کہ اس نے اس خطا سے درگزر کر لیا ہے اور آخرت میں اس پر کوئی گرفت نہیں کرے گا نیز انبیاء کی آزمائش خطا میں اس لئے بھی ہوتی ہے تاکہ گناہ گاروں کے حق میں انہیں امام و پیشوا بنا دیا جائے جن سے گناہ گار تو بہ کے وقت مایمید ہونے سے بچ جائیں۔

امام طبری کی جارحیت ملاحظہ ہو کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی توہین پر مبنی ۱۹ روایات نقل کرنے کے بعد بھی کوئی ندامت محسوس نہیں کی بلکہ ”علماء“ کے مختلف اقوال بیان کر کے اپنے پیروکاروں کو یہ باور کرا دیا کہ یوسف کو بھی اس خطا میں مبتلا کرنے کا مقصد یہی تھا کہ اللہ نے اس سے درگزر کر لیا ہے، آخرت میں اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی، وہ اللہ سے ڈرتے رہیں اور اس کے عفو و رحمت کے سہارے پر ہی نہ رہیں اور سب سے بڑھ کر

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

انہیں گناہ گاروں کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید میں امام بنا دیا جائے تاکہ وہ تو بہ کے وقت مایوسی کا شکار نہ ہوں۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

امام طبری انبیاء کرام کی آزمائش سے متعلق علماء کے اختلافی اقوال نقل کرنے کے بعد ان لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا“ کے بارے میں ”سلف“ کے اقوال (جو طبری نے پیش کئے ہیں) کے ساتھ اختلاف کرتے ہیں اور اپنی رائے سے قرآن کی تاویل کرتے ہیں (”وَأَمَّا آخِرُون مِمَّنْ خَالَفَ أَقْوَالَ السَّلَفِ، وَ تَأَوَّلُوا الْقُرْآنَ بِأَرْأِئِهِمْ، فَانْهَمُ قَالُوا فِي ذَلِكَ أَقْوَالًا مُّخْتَلِفَةً“)

بعض ”ہم یوسف“ کی یہ توضیح کرتے ہیں کہ: یوسف کا قصد اس عورت کو مارنے کا تھا لیکن اپنے رب کی برہان دیکھنے کے بعد اس کے مارنے سے بچ گئے۔

بعض دوسرے اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ: اگر یوسف اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتے تو وہ بھی اس کا قصد کرتے لیکن چونکہ انہوں نے برہان دیکھ لی تھی اس لئے انہوں نے اس کا قصد و خیال ہی نہیں کیا۔

”... اَنْ يُّوسُفَ لَوْلَا رُؤْيَاهُ بِرَهَانَ رَبِّهِ لَهَمَّ بَهَا، وَلَكِنَّهُ رَأَى بِرَهَانَ رَبِّهِ فَلَمْ يَهَمْ بِهَا۔“
”ہم یوسف“ کے بارے میں مذکورہ دونوں تاویلوں (۱۔ عورت کو مارنے کا قصد، ۲۔ اور برہان دیکھنے کے بعد اس کا قصد ہی نہیں کیا) کو امام طبری فاسد قرار دیتے ہیں کہ عورت کو مارنے کا قصد بھی غلط ہے اور ”لَوْلَا“ کے جواب کو مقدم کرنا بھی قواعد کے اعتبار سے غلط ہے:

”قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ وَ يَفْسُدُ هَذِينَ الْقَوْلِينَ، اَنْ الْعَرَبُ لَا تَقْدِمُ جَوَابَ ”لَوْلَا“ قَبْلَهَا ... هَذَا مَعَ خِلَافِهِمَا جَمِيعَ أَهْلِ الْعِلْمِ بِتَأْوِيلِ الْقُرْآنِ اَلَّذِينَ عَنْهُمْ يُؤْخَذُ تَأْوِيلُهُ“
(تفسیر الطبری المجلد السابع ص ۱۸۳)

”ابو جعفر کہتا ہے کہ یہ دونوں قول فاسد ہیں کیونکہ عرب ”لَوْلَا“ کے جواب کو مقدم نہیں کرتے مزید برآں یہ دونوں قول ان تمام اہل علم کی تاویل کے خلاف ہیں جن سے تفسیر قرآن کی جاتی ہے۔“

امام طبری کے اس اشکال کا جواب آگے آ رہا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ امام طبری اور ان کے راویوں کو حضرت یوسفؑ کے ”ہم“ کے بارے میں کس نے آگاہ کیا ہے، یوسفؑ نے خود یا زوجہ عزیز نے؟ کیونکہ موقع پر تو کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا۔ سخت تعجب ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی تقریباً ۲۴۰۰ سال پہلے رونما ہونے والے ایک واقعہ کے بارے میں یہ حضرات ٹاک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ امام طبری نے منقولہ اسرائیلی روایات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصد و خیال کا جو انتہائی مکروہ اور قبیح نقشہ کھینچا ہے اور جو باتیں ان کی طرف منسوب کی ہیں جو کسی ”فاسق“ کی طرف بھی منسوب نہیں کی جاسکتیں (تفسیر بحر المحيط)۔

موصوف نے مذکورہ تمام روایات میں زوجہ عزیز کا ”ہم“ (جو ”ل“ اور ”قد“ کی تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے) یہی بتایا ہے کہ وہ ان کے سامنے چٹ لیٹ گئی تھی ”استلقت لہ، استلقت علی قفاھا“ اس کے برعکس حضرت یوسف علیہ السلام (جن کا ”ہم“ بغیر تاکید کے بیان ہوا ہے) کا ”ہم“ اور قصد و خیال جس انداز سے بیان کیا ہے وہ اس عورت کے ”ہم“ سے کہیں زیادہ ہے:

”حتى رقی لہا، ولم یسخرّف منها، خلوا فی بعض بیوتہ، حلّ الہمیان، حلّ السرّاویل، نزع ثیابہ، حلّ ثیابہ۔ أو ثیابہا، جلس منها مجلس الخاتن، جلس منها مجلس الرجل من امرأته، جلس بین رجلیہا، قعد بین رجلیہا“

امام طبری تقریباً تمام ہی روایات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق مذکورہ الفاظ کی ”گردان“ پڑھتے اور لکھتے رہے اور تم بالائے تم یہ کہ امام طبری اس ”ہم یوسف“ کو صحیح سمجھ کر نقل کرتے رہے، انہوں نے مدہوشی میں مذکورہ خرافات نقل نہیں کیں بلکہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ ”بکواسات“ ”خرافات“ ان کے قلم سے اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام کے بارے میں لکھے جا رہے ہیں۔ ”فان قال قائل: و کیف یجوز أن یوصف بیوسف بمثل هذا وهو لله نبی؟“ پھر آگے دلائل کے ساتھ

بتایا کہ اللہ تعالیٰ بعض انبیاء کو اس طرح کی خطاؤں میں مبتلا کر کے آزماتے رہتے ہیں۔

تفویر تو اے چرخ گرداں تفوی۔ فلیبک علی الاسلام من کان باکیا۔

امام جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا“ کے تحت فرماتے ہیں:

”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ“، فصلت منه الجماع، ”وَ هَمَّ بِهَا“ قصد ذلك، ”لَوْلَا“

أَنْ رَّأٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ“، قال ابن عباس: مُثِّلَ لَهُ يَعْقُوبُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَضْرَبَ صَدْرَهُ، فخرجت شهوته من أنامله، وجواب ”لَوْلَا“ لَجَا مَعَهَا۔ (تفسیر جلالین ص ۲۲۸)

”یقیناً زوجہ عزیز نے حضرت یوسف علیہ السلام سے جماع کرنے کا ارادہ کیا اور وہ بھی اس کا قصد کرتے اگر اپنے رب کی ”برہان“ نہ دیکھ لیتے۔“ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: انہیں حضرت یعقوب علیہ السلام کی تصویر دکھائی گئی جنہوں نے ان کے سینے پر ہاتھ مارا تو ان کی شہوت ان کی انگلیوں کے پوروں سے خارج ہو گئی اور ”لَوْلَا“ کا جواب ”لجمعہا“ ہے۔ یعنی اگر یوسف علیہ السلام اپنے والد سے اپنے سینے پر ”تھپڑ“ نہ کھاتے تو وہ زوجہ عزیز کے ساتھ ”جماع“ کر لیتے کویا ”تھپڑ“ کی ضرب سے ان کی شہوت ان کی انگلیوں کے پوروں سے نکل گئی تو... العیا ذباللہ، ثم العیا ذباللہ، ثم العیا ذباللہ

صد افسوس! کہ امام طبری و امام سیوطی کو حضرت یعقوب، حضرت یوسف علیہما السلام اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بارے میں اس قدر توہین آمیز روایات نقل کرتے ہوئے ذرا بھی حیا مانع نہ ہوئی۔

امام سیوطی کی روایت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی تصویر دیکھ کر بھی کوئی خوف لاحق نہیں ہوا جس کی بناء پر والد نے ان کے سینے پر تھپڑ مارا حتیٰ کی ان کی انگلیوں کے راستے سے ان کی شہوت نکل گئی۔

حضرت سیوطی ایک دوسری کتاب میں ”وَ هَمَّ بِهَا“ کے تحت فرماتے ہیں کہ ”یوسفؑ نے عزیز مصر کی بیوی کے ساتھ راجا بدکاری کا اقدام کیا تھا اور کپڑے تار کر برائی شروع ہی کرنے والے تھے کہ غیب سے آواز آئی: یوسف خیانت نہ کر۔“ ملاحظہ ہو: الدر المنثور جلد ۳ ص ۴۶۵

”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا“ کی تفسیر میں امام طبری کی منقولہ، مکذوبہ اسرائیلی تمام روایات جہاں قرآن کریم کے سراسر خلاف ہیں وہیں عقیدہ عصمتِ انبیاء کے بھی منافی ہیں۔ موصوف نے ”وَهَمَّ بِهَا“ کے تحت جو ”مناظر“ پیش کئے ہیں ان کی موجودگی میں عقیدہ عصمتِ انبیاء کا کوئی معنی ہی باقی نہیں رہتا۔

دوسری طرف جوش میں آکر امام طبری نے اللہ تعالیٰ کی شہادت کو بھی مسترد کر دیا۔ قرآن کریم کی ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا“ سے پہلی آیت ہی سے امام طبری کی منقولہ روایات کی تکذیب ثابت ہوتی ہے: ”وَرَاوَدَتْهُ الْيَٰحْيَىٰ ٱلْحَوْثَىٰ فَنَجَّيَهَا عَنْ نَفْسِهِۦ وَٱغْلَقَ ٱلْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْت لَّكَ“ سے معلوم ہوا کہ زوجہ عزیز نے ہی یوسف علیہ السلام کو اپنی رائے اور ارادہ سے پھیرنے کی کوشش کی اور اگلی آیت ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا“ میں اسکی کوشش کا مزید ذکر کیا گیا ہے۔ اس ”مرادوت“ اور کوشش کا پہلی آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ جواب دیا کہ: ”مَعَاذَ ٱللَّهِ إِنِّي لَرَجُلٌۭ أَخْشَىٰ ٱلْأَخْشَىٰ ۚ إِنَّهُۥ لَا يَفْلَحُ الظَّالِمُونَ“ اللہ کی پناہ! یقیناً وہ میرا رب ہے، اس نے مجھے اچھا مقام عطا کیا ہے۔ بے شک ظالم لوگ کامیاب نہیں ہوتے۔

اس جواب سے واضح ہو گیا کہ اس عورت کے تمام جیلوں کا حضرت یوسف علیہ السلام کے ارادہ پر ذرہ برابر بھی کوئی اثر نہیں پڑا۔

جبکہ ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ“ اگر حضرت یوسف اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتے تو ان کے دل میں بھی اس عورت کا خیال آ جاتا لیکن چونکہ انہوں نے ”برہان رب“ دیکھ لی تھی اس لئے ان کے دل میں اس عورت کا خیال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوا۔ یعنی اس عورت کی پہلی کوشش ”مَعَاذَ ٱللَّهِ...“ کے جواب سے ناکام ہوئی اور اس کی دوسری کوشش یوسف کے ”برہان رب“ دیکھ لینے کی وجہ سے چکنا چور ہوئی۔

پھر جب زوجہ عزیز نے دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر تیسری مرتبہ یہ دھمکی آمیز کوشش کی کہ:

”وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَا ٱمَرُهُۥ لَيَسْجُنَّ ۖ وَلَيَكُونَا مِنَ الصَّاغِرِينَ“ (یوسف ۳۲)

”اور اگر وہ نہ بجالایا جو میں اس کو حکم دیتی ہوں تو اسے قید کر دیا جائے گا اور وہ ہو جائے گا ان لوگوں سے جو بے آبرو ہیں۔“

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس دھمکی آمیز کوشش کو یہ دعا کر کے ناکام بنا دیا کہ:

”قَالَ رَبِّ ٱلسَّجْنِ ٱحْبَبُ ۖ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَ ۖ نَبِيٌّۭ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي ۖ كَيْلَهُنَّ اَصْحَبُ ۖ اِلَيْهِنَّ ۚ وَ اَكُنْ مِنَ ٱلْجَاهِلِينَ ۝ فَٱسْتَجَابَ لَهُۥ رَبُّهُۥ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْلَهُنَّ ۚ اِنَّهُۥ هُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْعَلِيمُ ۝“ (یوسف ۳۳-۳۴)

”یوسف نے عرض کی: اے میرے پروردگار! قید خانہ (کی صعوبتیں) مجھے زیادہ پسند ہیں اس (گناہ) سے جس کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں اور اگر تو (اپنی عنایت سے) نہ دور کرے مجھ سے ان کے نکر کو تو میں مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور بن جاؤں گا نادانوں سے۔ پس قبول فرمائی اس کی دعا اس کے رب نے اور دور کر دیا اس سے ان عورتوں کے مکر و فریب کو۔ بے شک وہ (اپنے بندوں کی فریادیں) سننے والا اور (ان کے حالات) خوب جاننے والا ہے۔“

اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس زبردست ابتلاء کے موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام کو ثابت قدم رکھا اور اس عورت کی ”ترغیب و ترہیب“ پر مبنی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔

قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی اس واقعہ کا ذکر آیا ہے تو وہاں عموماً دو ہی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ا۔ عورت کی کوشش و مرادوت۔

۲۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا اس کے مکر و فریب سے محفوظ رہنا۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ”پھسلانے، بچلانے اور دھمکانے“ کی تمام کوششیں زوجہ عزیز کی طرف سے ہی سامنے آئیں اور وہ خود اس بات کی کوئی دہائی دے رہی ہے کہ ہر مرتبہ قصور وار میں ہی تھی اور یوسف علیہ السلام نے کوہ استقامت بن کر میری ہر کوشش کو ناکام بنایا اور وہ بالکل محفوظ رہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی یہی دعویٰ فرمایا کہ: ”يٰۤاَيُّهَا ٱلرَّٰوِدَتَيْنِ ۖ عَنْ نَفْسِيْ...“ (یوسف ۲۶) اس عورت نے ہی مجھے طرح طرح سے پھسلانا چاہا اس عورت نے بھی شہر کی عورتوں کے سامنے اس بات کا اقرار کیا کہ:

”وَلَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ“ (یوسف ۳۲) ”اور تحقیق میں نے یوسف کو اس کے ارادے سے پھیرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ بچا ہی رہا۔“

زہرہ عزیز نے دوسری مرتبہ تحقیق و تفتیش کے دوران بادشاہ کے سامنے اس بات کا اقرار کیا کہ: ”قَالَتِ امْرَأَةُ الْعَزِيزِ الْاِنْ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ وَاِنَّهُ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ“ (یوسف ۵۱) ”عزیز کی بیوی کہنے لگی۔ اب تو آشکارا ہو گیا حق۔ میں نے ہی یوسف کو اس کی رائے اور خیال سے پھیرنا چاہا اور یقیناً وہ چھوٹیوں میں سے ہے۔“ جس عورت کے ساتھ بقول امام طبری یوسف علیہ السلام کی طرف سے یہ واقعات پیش آئے ہوں: ”یوسف کا اس عورت کی طرف میلان و جھکاؤ بڑھ گیا، وہ ہر طرف سے اور ہر طرح سے محفوظ اور بند مکان کی خلوت گاہ میں چلے گئے، وہ عورت اس کے سامنے چت لیٹ گئی، یوسف اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان میں بیٹھ گئے، وہ اس عورت کی ”مجلس الخاتن“ کی جگہ بیٹھے، اس طرح بیٹھے کہ جس طرح ایک مرد اپنی بیوی کے ساتھ مقاربت کے وقت بیٹھتا ہے، پھر اس نے اپنی شلوار اور کپڑے اتار دیئے بلکہ اس عورت کے کپڑے بھی اتار دیئے۔“

کیا وہ عورت اس کے ساتھ مذکورہ سلوک کرنے والے یوسف کے بارے میں اس کی عدم موجودگی میں اور بادشاہ کے دربار میں کبھی یہ گواہی دے سکتی ہے کہ: ”وَ اِنَّهُ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ“ اور یقیناً وہ چھوٹیوں میں سے ہے۔

سخت حیرت ہے کہ امام المفسرین امام طبری کو اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان بھی پسند نہیں آیا کیونکہ انہوں نے اس اعلان کے بالکل برعکس حضرت یوسف علیہ السلام پر فرد جرم عائد کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَهُمْ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهِمْ كَذٰلِكَ لِنُصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَآءَ ۚ وَاِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ“ ”اور یوسف بھی اس عورت کا قصد کر لیتے اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتے۔ یوں ہوتا کہ ہم اس سے ہدی (برائی) اور بے حیائی کو پھیر دیں۔ بے شک وہ ہمارے بندوں میں سے تھا جو چن لئے گئے ہیں۔“

شہر کی عورتوں نے بھی یوسف علیہ السلام سے برائی کی نفی کرتے ہوئے کہا کہ: ”قَالَ مَا خَطْبُكُمْ اِذْ رَاوَدْتُنَّ يُوسُفَ عَنْ نَفْسِهِ ۚ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰہِ مَا عَلِمْنَا عَلَیْہِ مِنْ شَیْءٍ ۚ“ (یوسف ۵۱) ”(اس بادشاہ نے ان عورتوں کو بلا کر) پوچھا: کیا معاملہ تھا جب تم نے یوسف کو اپنے ارادے سے پھیرنا چاہا وہ (بیک زبان) بولیں اللہ پاک ہے۔ نہیں معلوم ہوئی ہمیں تو اس میں ذرا برائی۔“

جب اللہ تعالیٰ اور زہرہ عزیز سمیت شہر کی عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے ”برائی“ کی نفی کر دی تو پھر معلوم نہیں کہ امام طبری کو کیا ضرورت محسوس ہوئی کہ انہوں نے ڈیڑھ درجن سے زائد روایات نقل کر کے یوسف علیہ السلام کی ”برائی“ کو اجاگر کر دیا۔

کیا وہ شخص اللہ تعالیٰ کی اس تعریف: ”كَذٰلِكَ لِنُصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَآءَ ۚ وَاِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ“ کا مستحق ہو سکتا ہے

جو بقول طبری: ”جلس بین رجلیہما، قعد بین رجلیہما، جلس منہا مجلس السخائن، جلس منہا مجلس الرجل من امرأۃ و حلّ ثیابہ او ثیابہا، و حلّ الہمیان و حلّ السر او یل“ اس کردار کا مظاہرہ کرے؟ یقیناً ہر مومن بالقرآن بغیر کسی ادنیٰ تاویل کے اپنے عقیدہ عصمت انبیاء اور ایمان کے تقاضے کے تحت اس مغتری، کذاب و دجال راوی کی بات کو ٹھکرا کر کلام الہی کی صداقت کو ہی تسلیم کرے گا۔

جن حضرات نے بشری تقاضے کے تحت غیر اختیاری طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کا ”ہم“ (قصد و خیال) ثابت کیا ہے۔ انہوں نے بھی اپنی حدود سے قدرے ”تجاوز“ ہی کیا ہے کیونکہ ”ہم“ کے معنی قصد و خیال اور ارادہ و فکر کے ہیں جس کا ادراک حواس کے ذریعے نہیں ہو سکتا اور اس کا حقیقی محل بھی دل ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قلبی ارادے کو جس کا ادراک حواس کے ذریعے ممکن ہی نہیں تھا ان حضرات نے کیوں کر معلوم کر لیا؟ اور اگر بغرض محال ان کی غلط حرکات و سکنات کو دیکھ کر ان کا اصل ”قلبی ارادہ“ معلوم ہوا تو یہ چیز ”ہم“ سے نکل کر ”فعل“ کی حدود میں داخل ہو جائے گی۔ اگر

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

بالفرض ”ہم“ (یعنی دل میں خیال) عند اللہ ”سوء“ کے درجے میں بھی ہے تو وہ قابل مواخذہ نہیں ہے جب تک کہ اس کا ارتکاب نہ کیا جائے بلکہ اللہ کے خوف سے اس کے ترک کرنے والا بھی ثواب کا مستحق ہے نہ کہ ملامت کا۔

جبکہ امام طبری نے ”وہم بہا“ کے تحت جس قدر جھوٹی روایات کا انبار لگایا ہے اور ان میں جن ”اعمال“ کی نسبت حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے وہ یقیناً ”ہم“ سے بڑھ کر ”افعال“ اور ”فحشاء“ کے درجے کے ہیں۔ جن کی نفی وتردید نہ صرف اللہ تعالیٰ نے کی ہے بلکہ شہر کی عورتوں اور خود صاحب واقعہ زوجہ عزیز نے بھی واشگاف الفاظ میں کر دی ہے۔ جب امام طبری کی پیدائش سے بھی صدیوں پہلے ایک واقعہ کی بے لاگ تحقیق و تفتیش کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت و پاکدامنی کا اعلان کر کے اسے قرآن مجید میں محفوظ کر دیا گیا تو پھر کس طبقہ کی خوشنودی کی خاطر امام طبری نے ان ماکرہ قبیح ترین افعال کو حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا؟

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ انہوں نے ”ہم“ کے درجے میں ہی ارادہ بد کیا تھا یقیناً یہ تصور ہی بالکل باطل اور قرآن کریم کے صریح مخالف ہے۔ مگر امام طبری نے تو اسے ”ہم“ کے درجے سے ترقی دیتے ہوئے پہلے ”سوء“ اور پھر ”فحشاء“ کے درجے میں پہنچا دیا۔ کیونکہ امام طبری نے ”وہم بہا“ کی جو تفصیل دی ہے (کہ یوسفؑ کا اس عورت کی طرف میلان و جھکاؤ، خلوت گاہ میں جانا، اس عورت کا چپٹ لیٹ جانا، یوسفؑ کا اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان اس جگہ بیٹھ جانا جہاں بیٹھ کر ایک مرد عورت سے مقاربت کیا کرتا ہے پھر اپنے کپڑے اور شلوار اتار دینا وغیرہ) یہ سب مبادی زنا شمار ہوتے ہیں۔ امام طبری اگر باقی تفصیل نہ بھی دیتے صرف ”حل سراویل“ (یعنی شلوار اتارنے) کا ہی ذکر کر دیتے تو پھر بھی اس میں مذکورہ جملہ امور شامل ہی سمجھے جاتے کیونکہ ”حل سراویل“ تک نو بہت پہنچنے سے پہلے کچھ اور مبادی و مراحل بھی ہوتے ہیں۔ مگر امام طبری نے ان تمام مبادی کی خود ہی تفصیل بھی جاری کر دی۔

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

جو شخص امام طبری کے منقولہ ”مبادی“ میں مبتلا ہو جائے وہ ہرگز معصوم نہیں کہلا سکتا اور نہ ہی اسے ”صادق“ کہا جاسکتا ہے کیونکہ ان مبادی پر ”سوء و فحشا و ذنب“ کا اطلاق ہوتا ہے جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام تو لاریب ”معصوم و صادق“ ہیں البتہ انہیں مذکورہ ”مبادی“ میں مبتلا دکھانے والے ہی یقیناً کذاب اور دجال ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام سے ”سوء اور فحشاء“ دونوں کو ہٹا دیا ہے۔ امام آلوسی کے نزدیک ”سوء“ مقدمات الفحشاء من القبلة والنظر بشهوة“ کو کہتے ہیں (روح المعانی جلد ۱۲ ص ۲۱۶)

”سوء“ کے معنی ہیں دل میں بے حیائی کا خیال لانا جبکہ ”فحشاء“ کے معنی بے حیائی کے فعل کا ارتکاب ہے خواہ وہ زنا ہو یا مبادی زنا۔ پس اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام سے نہ صرف زنا اور ہر قسم کے مبادی زنا کی نفی کرتا ہے بلکہ اس گندے خیال کے آپ کے دل میں آنے کی بھی نفی کرتا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ زیر عنوان ”رذائل“ لکھتے ہیں کہ:

”رذائل یعنی بری خصلتیں وہ اخلاق ذمیرہ ہیں جن کو خدا تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے، جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گناہ گار ٹھہرتے ہیں، جن کی ہدائی کو ہر عقل مند جانتا ہے اور مانتا ہے۔ اس قسم کے رذائل کے متعدد اوصافی نام قرآن پاک میں آئے ہیں مثلاً اکثر ان کو ”منکر“ (ناشناسا) اور ”فحشاء“ (بے حیائی) اور کبھی ”فاحشۃ“ (فحش) ”سبۃ“ (برا) ”سوء“ (برائی) ”مکروہ“ (ناپسندیدہ) ”خطا“ (ماصواب یا بھول)، ”اثم“ (گناہ) ”عدوان“ (زیادتی) کو غیرہ کہا گیا ہے۔ ان ہی لفظوں سے اندازہ ہو گا کہ رذائل سے متصف ہونا کتنا گھناؤنا اور نفرت کے قابل ہے اور یہ کہ وہ ایسے کام ہیں جو عقل اور شرع دونوں کی نگاہوں میں بد نما ہیں: فرمایا: ”... ولا تقربوا الزنى انه كان فاحشة و ساء سيلا“ (بنی اسرائیل ۳) اور زنا کے پاس مت جاؤ۔ بے شبہ یہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔

اس آیت (النحل ۱۳) میں منہیات کے سلسلہ میں تین لفظ آئے ہیں۔ ”فحشاء“ اور ”منکر“ اور ”بغی“۔ ان میں پہلا لفظ ”فحشاء“ ہے جس کی دوسری صورت ”فاحشۃ“ کی

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

ہے، یہ لفظ ”فحش“ سے نکلا ہے جس کے اصل معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے لازمی معنی قبیح یعنی برائی کے ہیں۔ یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جائے وہی ”فحشاء“ کہلاتی ہے۔ قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدود الہی سے تعدی اور تجاوز کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوت شہوانی کی تسکین کے لئے کچھ حدیں مقرر فرمادیں اب جو ان حدود سے آگے بڑھتا ہے وہ تعدی حدود اور فحشاء اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی لئے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے اور اس کے معنی ہی امر قبیح کے ہو گئے ہیں (سیرت النبی جلد ۶ ص ۵۱۷-۵۱۸)

”ولا تقربوا الزنی“ کی نہی سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مبادی بھی اختیار مت کرو۔ مگر صد افسوس امام طبری نے اپنی منقولہ مکذوب روایات میں خرافات و باطل پر مبنی افعال حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیئے۔

امام ابن حزم اندلسی (م ۵۶۲ھ) ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ“ کے تحت لکھتے ہیں کہ:

زلیخا ارادہ کر چکی تھی اور اس نے بھی ارادہ کر لیا ہوتا اگر وہ برہان ربانی نہ دیکھتے۔ بعض کتاہ اندیش لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ یہاں پر بیٹھ گئے تھے جہاں مرد کی عورت سے ”بوقت جماع“ نشست ہوتی ہے۔ ایک ظاہر بین اور سطحی نظر رکھنے والے نے اس آیت سے یہ مفہوم لیا ہے۔ معاذ اللہ! یہ تو ایک ادنیٰ نیک مسلمان سے بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا چہ جائیکہ ایک برگزیدہ نبی کے متعلق یہ بدگمانی کی جائے۔ معترض کہے کہ یہ تو حضرت ابن عباسؓ سے بسند صحیح منقول ہے تو گزارش ہے کہ بجز قول رسولؐ کسی کا قول حجت نہیں۔ دیگر ابن عباسؓ کے قول میں غلطی دراصل ابن عباسؓ کے علاوہ نیچے کے کسی راوی سے لاحق ہوئی۔

درج ذیل دو معانی میں سے آیت کا ایک معنی یہی ہیں:

۱۔ مارگرانے اور زد و کوب کا ارادہ تھا۔ جیسا کہ ”وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَاْ خُلُوْهُ“ (المؤمن ۵) کہ ہر امت نے اپنے رسول کے بارے میں یہی ارادہ کیا کہ پکڑ لیں اس کو اور

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

مخادہ ہے ”هَمَّتْ بِهٖ“ کہ میں نے تمہارے متعلق ارادہ کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ”برہان“ دکھادی جس کے باعث آپ اس کے زد و کوب سے بے نیاز ہو گئے اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ یہاں سے بھاگ جانا زیادہ مفید ہے کہ عفت و پاکدامنی کا واضح ثبوت ہے۔ جیسا کہ بعد میں قیص پھٹنے کے واقعہ سے ”شاہد“ کے فیصلہ سے ظاہر ہوا۔

۲۔ آیت ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ“ تک تام اور مکمل ہو جائے اور دوسرا واقعہ: ”وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ“ سے شروع ہو۔ یعنی اگر یوسفؑ ”برہان ربانی“ نہ دیکھتے تو وہ بھی اس سے ارادہ کر لیتے۔ آیت کا ظاہر معنی بغیر کسی تاویل کے تکلف کے یہی ہیں اور یہی ہمارا مسلک ہے۔ یہاں ”برہان ربانی“ سے مراد عصمت و نبوت ہے۔ اگر برہان ربانی نہ ہوتی تو وہ بھی اس کا ارادہ کر لیتے۔ ممکن ہے کہ ایسے شخص کا دین تباہ ہو جائے جو ایک برگزیدہ مقدس رسول کی طرف گھٹاؤنے فعل کی نسبت کرتا ہے اور خود اپنی ذات کو اس سے پاک سمجھتا ہے۔ جس شخص کے پیش نظر آیت: ”كَذٰلِكَ لِنُصْرِِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَآءَ“ ہو، محال ہے کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی نسبت گناہ کے ارادہ کا گمان کرے۔

ہم منکر عصمت سے دریافت کرتے ہیں کہ ”قصد زنا“ کا کیا مطلب سمجھتا ہے؟ وہ ”سوء“ (برائی) ہے یا ”غیر سوء“ (نیکی) کہا تو خلاف دانش و اجماع کیا۔ کیونکہ وہ متفقہ طور پر سب کے نزدیک برائی ہے اور برائی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو پاک رکھا ہے تو یقیناً ”قصد برائی“ سے بھی ان کو باز رکھا ہے۔

نیز جب کہ عزیز کی بیوی نے کہا تھا کہ: ”فَمَا جَزَاءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِيْكَ سُوءًا“: یوسف (۲۵) ”جو تیری بیوی کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے اس کی کیا سزا ہے۔“ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے برائی کے ارادہ کا فوراً انکار کیا (امام طبری و امثالہ جو ”وَهَمَّ بِهَا“ سے قصد سوء، مراد لیتے ہیں وہ یہ بھی بتائیں کہ کیا یوسف صديقؑ نے عزیر مصر کے سامنے انکار کر کے جھوٹ بولا تھا؟ العیا فی اللہ۔ از مؤلف کتاب ہذا)

اور ایک حق پرست کو اہ نے فیصلہ کن بات کہی کہ اگر یوسفؑ کا قیص پیچھے سے پھٹا ہے تو

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

عورت جھوٹی اور وہ سچے۔ لہذا قرآن سے ثابت ہے کہ عورت جھوٹی تھی اور جب قرآن سے اس کا کذب ثابت ہو گیا تو معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ہرگز اس سے برائی کا ارادہ نہیں کیا۔۔۔

(اگر حضرت یوسف علیہ السلام طبری کی روایات کے مطابق ایسا ارادہ کرتے تو عزیز کی بیوی مَن اَزَادَ بِأَهْلِكَ سُوءَ کہنے میں سچی ہوتی پھر بعد میں وہ اس الزام سے بھی مخرف ہو گئی اور اس نے بادشاہ کے دربار میں یوسف علیہ السلام کی عدم موجودگی میں ”وَأَنَّهُ لَمِنَّ الصَّادِقِينَ“ (یوسف ۵۱) کہہ کر یوسف علیہ السلام کی صداقت کی کواہی بھی دے دی۔ صد افسوس کہ امام طبری کو پھر بھی اس پر یقین نہیں آیا اور صرف ”وَهُمْ بِهَا“ کے تحت ڈیڑھ درجن سے زائد روایات مجموعہ خرافات و باطل کا انبار لگا دیا۔)

اور اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق یہ آیت بھی مذکور ہے کہ: ”وَالَا تَصْرِفْ عَيْنِيَ كَيْلَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِينَ“ فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْلَهُنَّ... (یوسف ۳۳-۳۴) ”اے اللہ اگر آپ ان عورتوں کے کمرے سے دور نہیں رکھے گا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور ان کو عورتوں کے کمرے سے دور رکھا۔

لہذا واضح ہو گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کبھی زوجہ عزیز کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ (رسالہ عصمت انبیاء مترجمہ مولانا ہدایت اللہ ندوی ص ۵۵-۵۹)

امام طبری نے ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا“ کی بحث کے آخر میں بعض علماء کی اس رائے اور تاویل (کہ یوسف علیہ السلام نے عورت کو مارنے کا قصد کیا تھا یا برہان رب دیکھ لینے کی بناء پر انہوں نے برائی کا ارادہ ہی نہیں کیا تھا) کو رد کرتے ہوئے اسے قواعد عرب اور جمہور علماء کے خلاف قرار دے دیا: ”قال أبو جعفر وفسد هذين القولين، أن العرب لا تقدم جواب ”لَوْلَا“ قبلها... هذا مع خلافتها جميع أهل العلم بتأويل القرآن الذين عنهم يؤخذ تأويله“ (تفسير الطبري المجلد السابع ص ۱۸۳)

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) نے اس ”رائے“ پر سخت تنقید کرتے ہوئے اپنی انتہائی ماکواری اور ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے نیز موصوف اس قول کو حضرت یوسف علیہ السلام کے دامانی عصمت پر ایک ”ماروا بہتان“ قرار دیتے ہیں۔ اس کا خلاصہ مولانا کرم شاہ صاحب ازہری کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

”لَوْلَا أَنِّي رَأَيْتُهَا رِبَةً“ شرط موخر ہے اور ”هَمَّتْ بِهَا“ جزاء مقدم ہے۔ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ”زلیخا“ نے تو اس فعل کا عزم مصمم کیا اور اگر یوسف علیہ السلام برہان الہی کو نہ دیکھتے تو وہ بھی (ان انتہائی اشتعال انگیز حالات میں) اس فعل کا عزم اور قصد کرتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آپ نے چونکہ برہان الہی کا مشاہدہ فرمایا اس لئے ان سے اس فعل کا عزم و قصد وقوع پذیر نہیں ہوا۔۔۔

ابھی ایک چیز حل طلب باقی ہے۔ اہل لغت میں سے زجاج نے ”هَمَّتْ بِهَا“ کو جزاء مقدم بنانے سے انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں جزاء کی تقدیم شاذ ہے اور کلام فصیح میں موجود نہیں: ”ان تقدیم جواب لولا، شاذ و غیر موجود فی الکلام الفصیح“ اس کا امام (رازی) نے یہ جواب دیا ہے کہ:

بے شک احسن یہی ہے کہ جزاء شرط سے مقدم نہ ہو لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر کسی معنوی اہمیت کے پیش نظر اس کو مقدم کر دیا جائے تو یہ غلط ہے بلکہ علامہ ابو حیان نے تصریح کی ہے کہ جزاء کو شرط پر مقدم نہ کرنے کا قاعدہ نحو یوں کے نزدیک متفقہ نہیں ہے۔ کوئیوں نے تو اس تقدیم کو بالکل جائز قرار دیا ہے اور لصریوں میں سے ابو زید انصاری اور مبرد جیسے بلند پایہ عالم اس کے جواز کے قائل ہیں۔ زجاج نے دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ ”لَوْلَا“ کی جزاء پر ”لام“ آنا ضروری ہے اگر ”هَمَّتْ بِهَا“ جزاء مقدم ہوتی تو اس پر ”لام“ ضرور داخل ہوتا۔ ”لام“ کا نہ ہونا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس کا ”لَوْلَا“ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

امام رازی نے اس کا جواب یہ دیا کہ ”لام“ کا جزاء پر لے آنا جائز ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ”لام“ کے بغیر جزاء آ ہی نہیں سکتی۔ پھر انہوں نے یہ آیت بطور استشہاد پیش کر کے

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

زجاج کے دونوں اعتراضوں کو رد کر دیا: ”ان کانت لہدی بہ لو لا ان ربطنا علی قلبہا“ یہاں تو باتفاق ”ان کانت“، ”لو لا“ کی جزاء ہے۔ یہ مقدم بھی ہے اور اس پر ”لام“ بھی نہیں اور اگر اس پر کوئی بھند ہی ہو کہ ”لو لا“ کی جزاء مقدم نہیں ہو سکتی تو ہم کہیں گے چلو ہم مان لیتے ہیں کہ ”ہم بھا“ جزاء نہیں ہے کیونکہ یہ مقدم ہے اور تمہارے خیال میں اگر اس مقدم کو جزاء مان لیا گیا تو آسمان گر پڑے گا لیکن وہ کیا جزاء ہے جس کو تم مقدر مانتے ہو۔ قاعدے کے مطابق اسی چیز کو مقدر مانا جاسکتا ہے جس پر کلام سابق دلالت کرے۔ اس لئے جو جزاء مقدر مانی جائے گی وہ ”ہم بھا“ ہی ہوگی جس پر کلام سابق دلالت کر رہا ہے اس صورت میں بھی معنی وہی رہے گا جو ہم نے بیان کیا ہے۔

اس سلسلہ میں بعض اسلاف کے اقوال سے استدلال کیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں نے یہ کہا کہ: حضرت یوسف علیہ السلام نے عزم و ارادہ کیا تھا۔ امام رازی اور ابو حیان اور دیگر محققین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ اقوال آپس میں اتنے متضاد ہیں اور ایک دوسرے کی تکذیب کر رہے ہیں کہ انہیں صحیح نہیں تسلیم کیا جاسکتا۔ نیز یہ کسی مستند روایت سے ان اسلاف سے ثابت بھی نہیں جن کی طرف انہیں منسوب کیا جاتا ہے۔

علامہ ابو حیان رقم طراز ہیں:

”و أما أقوال السلف فنعتقد أنه لا يصح عن أحد منهم شيء من ذلك لأنها أقوال متكاذبة، يناقض بعضها بعضاً“

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں: ”قد طهرنا كتابنا هذا عن نقل ما في كتب التفسير مما لا يليق ذكره واقتصرنّا على ما دلّ عليه لسان العرب“۔ ”یعنی ہم نے اپنی کتاب کے صفحات کو ایسی روایات کے نقل کرنے سے پاک رکھا ہے اور آیت کی توضیح کرتے ہوئے لغت عرب کے قواعد پر اعتماد کیا ہے۔“ (نہج القرآن۔ جلد دوم ص ۴۲۲-۴۲۳)

امام رازی نے جو موقف حق اختیار کیا ہے وہ عصمت انبیاء کے عین مطابق اور حضرت یوسف علیہ السلام کے شایان شان ہے۔ موصوف ”وہم بھا“ کے تحت معترضین کو مسکت

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

جواب دے کر حضرت یوسف علیہ السلام کی کامل برأت بیان کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:

”انّ يوسف عليه السلام كان بريئاً عن العمل الباطل، والهمّ المحرمّ و هذا قول المحققين من المفسرين والمتكلمين و به نقول و عنه نذب...“

هؤلاء الجهّال الذين نسبوا إلى يوسف عليه السلام هذه الفضيحة، إن كانوا من أتباع دين الله تعالى فليقبلوا هذه شهادة الله تعالى على طهارته وإن كانوا من أتباع إبليس وجنوده فليقبلوا شهادة إبليس على طهارته۔“

(التفسير الكبير جلد ۶ ص ۴۴۱۔ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۹۹۷ء)

بے شک حضرت یوسف علیہ السلام عمل باطل اور قصد حرام سے بالکل پاک و بری تھے اور یہ محقق مفسرین اور متکلمین و اصولیین کا قول ہے اور ہم بھی یہی کہتے ہیں اور ان سے قصد حرام کی نفی کرتے ہیں۔۔۔ یہ جہلاء جنہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف عمل باطل اور قصد حرام کو منسوب کیا ہے، اگر وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور طریقے کی پیروی کرنے والے ہیں تو انہیں چاہئے کہ وہ یوسف علیہ السلام کی پاکیزگی پر اللہ تعالیٰ کی کواہی (اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ) قبول کر لیں۔

اور اگر وہ ابلیس کے پیروکار ہیں تو انہیں چاہئے کہ وہ یوسف علیہ السلام کی برأت و پاکیزگی پر ابلیس کی کواہی (وَلَا غَوِيْنَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ الحجر ۳۹-۴۰) قبول کر لیں۔

امام ابو عبد اللہ قرطبی ماکہ (۶۱ھ) ”ہم بھا“ کے تحت فرماتے ہیں کہ:

”أما يوسف عليه السلام، ”لَوْلَا أَنْ رَأَيْتُهَا نَزِيْهَةً“، وَلَكِنْ لَمَّا رَأَى الْبِرْهَانَ مَا هَمَّ، هَذَا لَوْجُوبِ الْعَصْمَةِ لِلْأَنْبِيَاءِ، قَالَ أَبُو عِيْبِيدَةَ: هَذَا عَلَى التَّقْدِيمِ وَ التَّأْخِيرِ، كَأَنَّهُ أَرَادَ: ”وَلَوْلَا أَنْ رَأَيْتُهَا نَزِيْهَةً“ لَهَمَّ بِهَا۔“ (الجامع لاحكام القرآن جلد ۹ ص ۱۴۲۔ طبع بیروت ۱۹۹۷ء)

”حضرت یوسف علیہ السلام کے قصد کا تعلق اپنے رب کی برہان دیکھنے سے مشروط ہے لیکن جب انہوں نے عظمت الہی کا نشان دیکھ لیا تو انہوں نے اس کا قصد ہی نہیں کیا۔ یہ چیز انبیاء کی عصمت کے لئے ضروری ہے۔“ امام ابو عبیدہ فرماتے ہیں کہ: اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔ یعنی ”لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهِ“ شرط مؤخر ہے اور ”هَمَّ بِهَا“ جزا مقدم ہے۔ اس عورت نے تو اس کا عزم کر ہی لیا تھا اور اگر یوسف علیہ السلام اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتے تو وہ بھی اس کا قصد کر لیتے لیکن چونکہ وہ اپنے رب کی برہان دیکھ چکے تھے اس لئے انہوں نے اس عورت کا قصد ہی نہیں کیا۔“

علامہ علاؤ الدین الخازن (م ۷۴۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

”وَأَمَّا مَا رَوَى عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ جَلَسَ مِنْهَا مَجْلِسَ الْخَاتَنِ، فَحَاشَا ابْنَ عَبَّاسٍ أَنْ يَقُولَ مِثْلَ هَذَا عَنْ يُوسُفَ، وَلَعَلَّ بَعْضَ أَصْحَابِ الْقِصَصِ وَالْأَخْبَارِ وَضَعُوهُ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، وَكَذَلِكَ مَارَوَى عَنْ مُجَاهِدٍ وَغَيْرِهِ أَيْضاً قَائِلَهُ لَا يَكَادُ يَصِحُّ بِسَنَدٍ صَحِيحٍ“ (لباب التأویل المعروف بتفسیر خازن جلد ۳ ص ۲۷۶)

”حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ”وَهَمَّ بِهَا“ کے تحت جو روایت بیان کی گئی ہے کہ یوسف علیہ السلام اس عورت کے اس مقام پر بیٹھ گئے جہاں عورت سے مقاربت کی جاتی ہے، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ایسی بات کہی ہو۔ یہ بعض قصہ کو دواعظین کی کارستانی ہے کہ انہوں نے اس روایت کو گھڑ کر ان کی طرف منسوب کر دیا، اور اسی طرح مجاہد وغیرہ سے اس بارے میں جو کچھ مروی ہے وہ بھی سند صحیح کے ساتھ صحت کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتی۔“

شیخ الاسلام امام ابوسعود (م ۹۸۲ھ) فرماتے ہیں:

”وَمَا قِيلَ بِأَنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ حَلَّ الْهَمِيَانِ وَجَلَسَ مَجْلِسَ الْخَتَانِ وَبَأَنَّهُ حَلَّ تَكَّةَ سِرَاوِيلَهُ وَقَعَدَ بَيْنَ شَعْبَاهَا، وَرَوَيْتَهُ لِلْبُرْهَانِ بِأَنَّهُ سَمِعَ صَوْتًا وَرَأَى تَمَثُّالَ يَعْقُوبَ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَاضًا عَلَى أُمْلَتِهِ فَخَرَجَتْ شَهْوَتُهُ مِنْ أَثَامِلِهِ، لَنْ

كُلِّ ذَلِكَ إِلَّا خَرَافَاتٍ وَأَبَاطِيلَ تَمَحُّهَا لَا كَهَا وَلَفَّقَهَا وَصَدَقَهَا۔“
(ارشاد العقل السليم إلى مزايا القرآن الكريم جلد ۴۔ ص ۲۶۷-۲۶۶)
”اور یہ جو کہا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنی شلوار اتار کر اس کی ٹانگوں کے درمیان بیٹھ گئے۔ انہوں نے ”برہان رب“ کے طور پر ایک آواز سنی پھر اپنے والد کی شبیہ دیکھی جو اپنے دانتوں سے اپنی انگلیاں کاٹ رہے تھے یہ سب باتیں باطل خرافات ہیں۔ عقول سلیمہ اور اذہان ان کو رد کرتے ہیں۔ ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے یہ باتیں گھڑی ہیں اور وہ لوگ بھی ہلاک ہوں جو ان کی تصدیق کرتے ہیں۔“

خاتم المفسرین علامہ سید محمود آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) نے ”وَهَمَّ بِهَا“ کے تحت امام طبری کی منقولہ بعض روایات کا حوالہ دے کر ان پر ”واہیات، خرافات و اباطیل“ کا حکم لگایا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ: ”لو نسب إلى أفسق خلق الله تعالى و بعد هم عن كل خير لاستكف منه، فكيف يجوز إسناده إلى هذا الصديق الكريم؟“

(روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی۔ الجزء الثانی عشر ص ۲۱۵)

”جو فعل شنیع (أفح المعاصی و أنکرھا) حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے اگر اس کی نسبت اللہ کی مخلوق میں کسی انتہائی بدکردار کی طرف بھی کی جائے تو وہ بھی اسے باعث عار ہی سمجھے گا۔ پھر اس کی نسبت صدیق و کریم حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف کیوں کر جائز ہو سکتی ہے؟“

اس تفصیل سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ”وَهَمَّ بِهَا“ کا جو معنی و مفہوم امام المفسرین جناب طبری نے (۱۹) روایات کی روشنی میں بیان کیا ہے وہ ہر امر حضرت یوسف علیہ السلام کی توہین پر مبنی اور عقیدہ عصمت انبیاء کے بالکل خلاف ہے۔ مگر اس کے باوجود امام طبری کا ”کلیجہ“ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا اور انہوں نے واقعہ میں شامل اور اس سے متعلق تمام کرداروں کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت ثابت ہو جانے کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ”شہادت“ کے ذریعے ان کے پاکیزہ کردار کو داغ دار کرنے کی مار و اجسارت کر ڈالی۔

آیت: ”وَلَمْ أَخْنُهِ بِالْغَيْبِ“ اور تفسیر طبری

ذَلِكَ لِیَعْلَمَ أَنِّی لَمْ أَخْنُهِ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا یَهْدِیَ الْکَافِرِیْنَ وَمَا أُوتِیْتُ نَفْسِیْ
إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَجَعْتُ رَبِّیْ ۚ إِنَّ رَبِّیْ غَفُورٌ رَّحِیْمٌ (سورہ یوسف ۵۲-۵۳)
مذکورہ آیات کے ترجمہ و تفسیر میں علمائے تفسیر کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے جس
کی بناء پر قطعیت کے ساتھ یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ ”لَمْ أَخْنُهِ“ وَمَا أُوتِیْتُ نَفْسِیْ کا
اصل ”قائل“ کون ہے؟ اور مخاطب کون؟

مصر کے بادشاہ کو جب اپنے خواب کی تعبیر ایک قیدی (حضرت یوسفؑ) سے ملی تو اس
نے انہیں جیل سے آزادی کا پیغام بھیجا مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے آزادی پر قید کو ترجیح
دیتے ہوئے اسے اصل الزام کی تحقیق کے ساتھ شروط کر دیا۔ ان کی غیرت و حمیت اور عزت
نفس نے الزام کی تحقیق کے بغیر جیل سے نکلنا کوارانہ کیا کیونکہ اس صورت میں حضرت یوسف
علیہ السلام کے بے قصور اور بے خطا ہونے پر، پردہ پڑا رہتا اور لوگ اسے بادشاہ کا احسان سمجھتے
کہ اس نے تعبیر ملنے کی خوشی میں ان کی قید ختم کی۔ لہذا حضرت یوسف علیہ السلام نے رہائی
سے پہلے باقاعدہ بادشاہ سے تحقیق کا مطالبہ کر دیا کہ معافی یا احسان کی بناء پر نہیں بلکہ میرے
فیصلہ سنایا جائے اور بالخصوص ان عورتوں سے تحقیق کی جائے جنہوں نے ایک ”ضیافت“ کے
موقع پر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے اور سازش کر کے مجھے جیل بھجوا دیا تھا۔

بادشاہ جو خواب کی تعبیر ملنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کے اعلیٰ و ارفع کردار
اور ان کے علم و صداقت کا قائل ہو چکا تھا اب اس ”انکار“ سے مزید متاثر ہوا چنانچہ اس نے
ان عورتوں کو طلب کر کے ان سے اس معاملہ کے متعلق دریافت کیا تو چونکہ انہوں نے بھی
اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ یوسف علیہ السلام کی بے گناہی اور صداقت بادشاہ سمیت سب

پر واضح ہو چکی ہے اور اب اس پر مزید پردہ نہیں ڈالا جاسکتا لہذا انہوں نے واضح طور پر اس
بات کا اقرار کیا کہ ہم نے اس میں کوئی برائی معلوم نہیں کی۔ اس موقع پر زوجہ عزیز سازش
کے بے نقاب ہونے سے تنہا رہ گئی اور اس نے بھی محسوس کر لیا کہ یوسف علیہ السلام کی
صداقت پر جتنے پردے ڈالے گئے تھے وہ سب اب دور ہو گئے ہیں لہذا اس نے بھی اپنی
خطا کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ:

”قَالَتِ امْرَأَةُ الْعَزِیزِ الْاِنِّیْ حَصَصْتُ الْخُبْرَ اَنَا وَارَاؤُذُنْہُ عَنْ نَفْسِہِ وَ اِنَّہُ لَمِنَ
الصَّادِقِیْنِ“ (یوسف ۵۱) ”عزیز کی عورت نے کہا: اب حق واضح ہو گیا، میں نے ہی اسے
اس کے ارادے سے پھیرنا چاہا اور یقیناً وہ بچوں میں سے ہے۔“

اس کے بعد زیر بحث عنوان میں مذکور آیت ۵۲، ۵۳ ہیں جن کے مفہوم کے تعین میں
مختلف اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ چنانچہ زیر بحث آیت کا ترجمہ چار طرح سے کیا گیا ہے اور
چاروں طرح سے کیا جاسکتا ہے اور ہر مفسر اپنے استدلال کی بناء پر ہی اسے ترجیح دے سکتا ہے:
۱۔ (زوجہ عزیز نے کہا) یہ (میں نے) اس لئے کہا کہ اس (یوسفؑ) کو معلوم ہو جائے کہ
میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس (یوسفؑ) کی خیانت نہیں کی۔ نیز اس لئے کہ (واضح ہو جائے
کہ) اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی راہ نہیں کھولتا۔ (اس ترجمہ کے مطابق یہ بیان
پہلی آیت کی طرح زوجہ عزیز کا ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام سے متعلق ہے۔)

۲۔ (زوجہ عزیز نے کہا) یہ (میں نے) اس لئے کہا کہ اس (عزیز مصر) کو معلوم ہو جائے
کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کی (اس سے زیادہ اور کوئی) خیانت نہیں کی (جس کا حال اس کو
معلوم ہے) اور بلاشبہ اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی راہ نہیں کھولتا (سواگر میں نے
اس سے زیادہ خیانت کی ہوتی تو اس کا بھی پردہ فاش ہو کر رہتا)۔ (اس ترجمہ کی رو سے بھی یہ
بیان زوجہ عزیز کا ہے جو یوسف علیہ السلام کے بجائے اس کے اپنے خاندان عزیز سے متعلق ہے۔)

۳۔ (یوسف نے کہا) یہ میں نے اس لئے کہا کہ اس (عزیز مصر) کو معلوم ہو جائے
کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس (عزیز مصر) کی خیانت نہیں کی نیز اس لئے کہ (واضح

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

ہو جائے اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی راہ نہیں کھولتا۔ (اس ترجمہ کی رو سے یہ بیان حضرت یوسف علیہ السلام کا ہے جو عزیز مصر کے متعلق ہے۔)

۴۔ (یوسف نے کہا) یہ میں نے اس لئے کہا کہ اس (بادشاہ) کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس (عزیز مصر) کی خیانت نہیں کی۔ نیز اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی راہ نہیں کھولتا۔ (اس ترجمہ کی رو سے بھی یہ بیان حضرت یوسف علیہ السلام کا ہے جو عزیز مصر کے بجائے بادشاہ سے متعلق ہے۔)

آیت میں ضمائر کے اعتبار سے چاروں طرح ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے مفسرین کرام نے اپنے اپنے رجحان اور استدلال کی بناء پر ترجیح و تطبیق کا بھی اہتمام کیا ہے۔

مؤخر الذکر دو ترجموں سے مفہوم کے تعین میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا کیونکہ بیان حضرت یوسف علیہ السلام کا ہی ہے خواہ عزیز مصر کو یقین دلانے کی خاطر ہو یا بادشاہ کو کہ میں نے اس کی خیانت نہیں کی۔ ”اُخْنُتُ“ میں ضمیر بادشاہ کی طرف راجع ہو یا بادشاہ کی خیانت سے مراد بھی عزیز ہی کی خیانت ہوگی کیونکہ وزیر کی خیانت بادشاہ کی خیانت ہی متصور ہوگی۔

اسی طرح پہلے قول میں زوجہ عزیز کا یہ کہنا صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ یہ میں نے اس لئے کہا تاکہ یوسف علیہ السلام کو معلوم ہو جائے کہ میں نے پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی۔ کیونکہ اس عورت کی خیانت تو ثابت ہے کیونکہ خیانت کر کے ہی اس نے انہیں قید خانہ میں ڈلوایا تھا۔

اس طرح اب دو قول ہی باقی رہ گئے ہیں ایک یہ کہ اسے زوجہ عزیز کا بیان قرار دیا جائے اور دوسرا یہ کہ اسے حضرت یوسف علیہ السلام کا قول تسلیم کیا جائے۔ اکثر مفسرین نے اسے حضرت یوسف علیہ السلام کا قول تسلیم کیا ہے جبکہ امام ابن تیمیہ اور امام ابن کثیر وغیرہ اسے زوجہ عزیز کا بیان قرار دیتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت تو ہر لحاظ سے ثابت ہو چکی تھی۔ ان شہادتوں کے بعد ایک کو نہ انہیں زوجہ عزیز پر باقی رہ گیا تھا اور قرآن کی بناء پر خاوند کو اس پر شک بھی تھا جس کی صفائی میں اس عورت نے اپنے خاوند کو یقین دلاتے ہوئے یہ بیان ”ذَلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ“

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

بِالْعَيْبِ“ دیا کہ برائی کی کوشش کے باوجود وہ اس کی مرتکب نہیں ہوئی۔ سورہ یوسف کی ان دونوں (۵۲-۵۳) آیتوں کو زوجہ عزیز اور حضرت یوسف علیہ السلام کا قول قرار دینے میں اختلاف اپنے اپنے دلائل کے ساتھ ہے لیکن حافظ ابن کثیر اور امام ابن تیمیہ کی رائے یہ ہے کہ: ”ان آیتوں کے سیاق و سباق پر اگر غور کیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں باتیں حضرت یوسف علیہ السلام کی نہیں بلکہ زوجہ عزیز کی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ جب بادشاہ نے خوش ہو کر قاصد کو جیل خانہ بھیجا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل سے نکال کر اپنے ساتھ لے آئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اس قاصد سے فرمایا کہ میں جیل سے نہیں نکلوں گا تم لوٹ کر جاؤ اور اپنے مالک سے کہو کہ: وہ عورتوں سے باز پرس کرے اور واقعہ کی تفتیش کرے اور صحیح صورت حال کو معلوم کرے کہ فرد جرم کس پر عائد ہوتا ہے اور مجھ پر جو الزام لگایا گیا ہے وہ غلط اور جھوٹا ہے یا نہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ محسوس فرمایا کہ اگر وہ بادشاہ کے پیغام پر فوراً جیل سے باہر آ جاتے ہیں اور اصل مسئلہ واضح ہو کر سامنے نہیں آتا تو یہ الزام آئندہ بھی قائم رہے گا کہ انہوں نے اپنے جرم کی بناء پر جیل کاٹی ہے اور ایک موقع پر بادشاہ نے خوش ہو کر ان کی رہائی کا حکم دے دیا۔ اس صورت میں جرم کا نہ مٹنے والا داغ لگ سکتا ہے لہذا انہوں نے فراست ایمانی سے اصل حقیقت کو سمجھ کر جیل سے نکلنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ بادشاہ نے ان تمام عورتوں کو جمع کیا جنہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر اپنے ہاتھ چھریوں سے کاٹ ڈالے تھے۔ ان سے پوچھا گیا تو سب نے متفقہ طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت کا اظہار کیا اور ان کی بے گناہی کی شہادت دی۔

اس کے بعد زوجہ عزیز کے لئے اعتراف جرم کے بغیر کوئی چارہ باقی نہ رہا۔ لہذا ”لَا تَنصَحُ الْحَقُّ“ سے لے کر ”وَمَا لِيْ بِنَفْسِيْ...“ تک زوجہ عزیز کا اقبال جرم ہے اور درحقیقت یہی اعتراف جرم حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اس کے برعکس جب اسے حضرت یوسف علیہ السلام کا قول قرار دیا جائے گا تو زوجہ عزیز

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

کے اعتراف جرم کا یہ پہلو ہلکا اور کمزور ہو جائے گا جو قرآن کی منشاء کے خلاف ہے۔ کیونکہ اصل الزام زوجہ عزیزہ کی طرف سے تھا اس لئے اپنے دعویٰ کے منافی خود اس کا اپنا اقبال جرم ہی سب سے اہم اور سب سے بڑا ثبوت تھا جو اس نے تحقیق کے وقت بر ملا اپنا جرم تسلیم کر کے دیا۔ واقعہ کے اس پہلو کا ذکر ہی قرآن کریم نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کو ظاہر کرنے کے لئے کیا ہے۔ اس لئے خود اس عورت کے تسلیم کرنے ہی سے واقعہ کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا بے قصور اور بے خطا ہونا قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس مجلس میں یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟ تیسری بات یہ کہ اگر ان دونوں جملوں (ذَلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ... وَمَا أُنِزُّ نَفْسِي...) کو حضرت یوسف علیہ السلام کا قول تسلیم کیا جائے تو ان کی ذات پر ایک طرح کا وہم چاہے وہ کتنا ہی ہلکا کیوں نہ ہو پھر بھی باقی رہ جاتا ہے جو شان نبوت کے شایان نہیں ہے جبکہ ان جملوں کو زوجہ عزیزہ کا قول قرار دینے میں صفائی کمزور نہیں بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی مزید مدلل ہو کر ثابت ہوتی ہے۔“

حافظ ابن تیمیہ نے ان جملوں کو زوجہ عزیزہ کا قول قرار دیا ہے یعنی اس عورت نے ”أَنَا رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِي“ کا اقرار کر کے کہا کہ میرا مقصد اس اقرار و اعتراف سے اپنے خاوند عزیز کو یہ یقین دلانا ہے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے کوئی خیانت نہیں کی ہے۔ بے شک میں نے یوسفؑ کو پھسلانا چاہا مگر میری ”مراودت“ ان پر کارگر نہیں ہوئی اگر میں نے مزید خیانت کی ہوتی تو اس کا پردہ بھی ضرور فاش ہو کر رہتا کیونکہ اللہ خانوں کے مکر و فریب کو چلنے نہیں دیتا۔

ہاں میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتی، جتنی غلطی مجھ سے ہوئی ہے میں اس کا اعتراف کر رہی ہوں دوسرے آدمیوں کی طرح نفس کی شراوتوں سے میں بھی پاک نہیں۔ ان سے تو یوسف علیہ السلام جیسا پاک با زانسان ہی محفوظ رہ سکتا ہے جن پر اللہ کی خاص مہربانی اور رحمت ہے۔

مشہور مفسر ابو حیان نے بھی اپنی تفسیر میں ان جملوں کو زوجہ عزیزہ ہی کا قول قرار دیا ہے

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

البدن ”لِيَعْلَمَ“ اور ”لَمْ أَخُنْهُ“ کی تفسیریں بجائے عزیزہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹائی ہیں یعنی میں اپنی غلطی اور خطا کا صاف اقرار اس لئے کرتی ہوئی کہ یوسف علیہ السلام کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں کوئی غلط بات نہیں کی ہے اور نہ اپنے جرم کو ان کی طرف منسوب کیا ہے۔

امام ابن کثیر (م ۷۴۷ھ) فرماتے ہیں کہ:

”وهذا القول هو الأشهر والأليق والأنسب بسباق القصة ومعاني الكلام، وقد حكاه الماوردي في تفسيره، وانتدب لقصته الإمام أبو العباس بن تيمية رحمه الله، فأفرده بتصنيف على حدة“ (تفسير القرآن العظيم۔ المجلد الثاني ص ۴۹۵۔ طبع بیروت)

”اور یہ قول (لِيَعْلَمَ، لَمْ أَخُنْهُ، وَمَا أُنِزُّ نَفْسِي...) زوجہ عزیزہ کا ہے نہ کہ یوسف علیہ السلام کا۔ اور یہی بات زیادہ مشہور اور قابل قبول ہے اور واقعہ کے سیاق و سباق سے بھی یہی بات زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور معنوی لحاظ سے بھی یہی زیادہ مطابق معلوم ہوتی ہے۔ اور اسی کو امام ماوردی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے اور امام ابن تیمیہؒ نے تو اس کے بارے میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے اور اس میں اس قول کی پوری حمایت و تائید کی ہے۔“

مذکورہ دونوں تفسیری اقوال میں سے ایک قول کی نسبت حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے جس کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا اس تحقیق سے مقصد یہ تھا کہ عزیزہ مصر کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں کوئی خیانت نہیں کی۔ اس قول کو اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے۔

جبکہ امام ابن تیمیہ اور امام ابن کثیر نے اسے زوجہ عزیزہ کا قول قرار دیا ہے جس سے اس کا مقصد اپنے شوہر عزیز مصر کو یہ یقین دلانا تھا کہ وہ ارادہ بد کے باوجود خیانت کی مرتکب نہیں ہوئی۔ ان دونوں اقوال سے یہ بات ثابت ہوئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور اس عورت دونوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ عزیز مصر کے علم میں یہ بات لائیں کہ وہ خیانت کے مرتکب نہیں ہوئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے تو ”وَمَا أُنِزُّ نَفْسِي إِلَى النَّفْسِ لَأَمَارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَجِمَ رَبِّي“ کے تحت اپنے ”نفسِ سوء“ کی بھی تردید فرمائی کہ اگرچہ میں اپنے نفس کی پاکی کا

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

جوئی تو نہیں کرتا کیونکہ اس کا کام ہی برائی پر ابھارنا ہے مگر میں اپنے رب کے رحم و فضل اور اس کی برہان دیکھنے کی وجہ سے اس سے بھی محفوظ رہا۔ جبکہ زوجہ عزیز نے اپنے ارادہ پر اور عزم کے اعتراف کے ساتھ مزید خیانت کے ارتکاب سے انکار کیا اور کہا کہ میرا نفس تو مجھے برائی پر آمادہ کر رہی رہا تھا لیکن یوسف (علیہ السلام) جیسے باکردار شخص کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا۔

مذکورہ دونوں قولوں میں عزیز مصر کو مخاطب کیا گیا ہے مگر امام قرطبی نے یہ اشکال اٹھایا ہے کہ اس مجلس تحقیق کے وقت عزیز مصر فوت ہو چکا تھا پھر ان دونوں نے اسے مخاطب کیوں کیا؟ شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان فرماتے ہیں کہ:

”اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ یہ ”امراة العزیز“ کا قول ہے یا حضرت یوسفؑ کا۔ حضرت قتادہ، حسن، اور حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک یہ حضرت یوسفؑ کا قول ہے۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ میں نے یہ اس لئے کہا ہے تا کہ بادشاہ کو معلوم ہو جائے کہ میں نے عزیز مصر کی عدم موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی۔ ”لَيُعْلَمَ“ کا فاعل بادشاہ ہے نہ کہ عزیز مصر۔ کیونکہ وہ اس وقت مر چکا تھا: ”قال ابن عباس: فأرسل الملك إلى النسوة وإلى امرأة العزيز و كان قدامت العزيز۔ (قرطبی جلد ۹ ص ۲۰۷)، ليعلم الملك أني لم أخنه بالغيب“ (کبیر جلد ۱۸ ص ۱۵۴۔ بحوالہ تفسیر جواہر القرآن جلد دوم ص ۵۳۲)

اس پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر فی الواقع عزیز مصر کی موت واقع ہو گئی تھی تو پھر ان دونوں نے اسے مخاطب ہی کیوں کیا؟ کیا اس کی بیوی بھی اس کی موت سے بے خبر تھی۔ صحیح بات یہ ہے کہ عزیز مصر، اس واقعہ کی تحقیق، حضرت یوسف علیہ السلام کی جیل سے باعزت رہائی اور حکومتی اہم عہدے پر فائز ہونے کے بعد فوت ہوا تھا۔

بہر حال تمام مفسرین نے بالاتفاق ”لَمْ أَخْنُہُ...“ کا قائل زوجہ عزیز کو قرار دیا ہے یا حضرت یوسف علیہ السلام کو۔ ان دو کے علاوہ کوئی تیسرا شخص مراد نہیں لیا گیا اور ان جملہ مفسرین نے ”وَهُمْ بِهَا، لَمْ أَخْنُہُ بِالْغَيْبِ، وَمَا أُبْرِئُ نَفْسِي...“ سے حضرت یوسف علیہ السلام کے ”ارادہ بد“ کی کامل نفی فرمائی ہے۔

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

مگر امام المفسرین امام طبری نے پہلے ”هَمْ بِهَا“ کے تحت ۱۹ روایات لا کر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف انتہائی کمزور انداز میں ”هَمْ سَوء“ کی نسبت کی ہے، پھر واقعہ کے تمام متعلقین کی طرف سے ان کی برأت کا اعلان کرنے کے بعد جب کوئی زمینی کواہ دستیاب نہ ہو سکا تو انہوں نے جبرئیل امین اور ایک دوسرے فرشتے کی شہادت سے اس معصوم پیغمبر کو ”هَمْ سَوء“ کا مرتکب قرار دے دیا چنانچہ وہ ”لَمْ أَخْنُہُ بِالْغَيْبِ...، وَمَا أُبْرِئُ نَفْسِي...“ (یوسف ۵۲-۳۵) کے تحت لکھتے ہیں کہ:

۱۔ حُلثْنَا أَبُو كَرِيبَ قَالَ: حُلثْنَا وَكَيْعَ عَنْ إِسْرَائِيلَ، عَنْ سَمَاكٍ عَنْ عِكْرَمَةَ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: لَمَّا جَمَعَ الْمَلِكُ النِّسْوَةَ فَسَأَلَهُنَّ: هَلْ رَأَوْا تَنَ يَوْسُفَ عَنْ نَفْسِهِ؟ قُلْنَ حَاشَا لِلَّهِ، مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سَوَاءٍ! قَالَتِ امْرَأَةُ الْعَزِيزِ: (الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ) الْآيَةَ۔ قَالَ يَوْسُفَ: (ذَلِكَ لِيُعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخْنُہُ بِالْغَيْبِ) قَالَ، فَقَالَ لَهُ جَبْرِيلُ: وَلَا يَوْمَ هَمَّتْ بِمَا هَمَّتْ! فَقَالَ: (وَمَا أُبْرِئُ نَفْسِي إِنْ النَّفْسُ لَا تَمَارَةَ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَجِمَ رَجِيًّا إِنْ رَجِي غَفُورٌ رَّحِيمٌ) (تفسیر طبری تحت رقم ۱۹۴۸)

۲۔ ۳۔ ... قَالَ يَوْسُفَ ”لَمْ أَخْنُہُ بِالْغَيْبِ“ فَعَمَزَهُ جَبْرِيلُ، فَقَالَ: وَلَا، حِينَ هَمَّتْ بِهَا! فَقَالَ يَوْسُفَ: وَمَا أُبْرِئُ نَفْسِي... (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۴۲-۱۹۴۳)

۴۔ ... لَمَّا قَالَ يَوْسُفَ: ”ذَلِكَ لِيُعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخْنُہُ بِالْغَيْبِ“ قَالَ جَبْرِيلُ لَوْ مَلِكُ: وَلَا، يَوْمَ هَمَّتْ بِمَا هَمَّتْ؟ فَقَالَ: ”وَمَا أُبْرِئُ نَفْسِي...“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۴۳)

۵۔ ... قَالَ لَهُ الْمَلِكُ: وَلَا حِينَ هَمَّتْ بِهَا؟... ثُمَّ ذَكَرَ سَائِرَ الْحَدِيثِ مِثْلَهُ۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۴۲)

۶۔ ... فَقَالَ لَهُ الْمَلِكُ۔ أَوْ جَبْرِيلُ: وَلَا، حِينَ هَمَّتْ بِهَا؟ فَقَالَ يَوْسُفَ: وَمَا أُبْرِئُ نَفْسِي... (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۴۳)

۷۔ ... وَلَا، يَوْمَ هَمَّتْ بِمَا هَمَّتْ؟ فَقَالَ: ”وَمَا أُبْرِئُ نَفْسِي...“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۴۳)

۸-۹ بمثلہ۔ (تحت رقم ۱۹۴۳۵-۱۹۴۳۶) (۱۹۴۳۶)

۱۰۔ قال له جبریل: اذكر همك۔ فقال: وَمَا أُبْرِي نَفْسِي ... (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۴۳۷)

۱۱۔ بمثلہ۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۴۳۸)

۱۲۔ حدثني يعقوب قال، حدثنا هشيم، عن إسماعيل بن سالم، عن أبي صالح في قوله: "ذَلِكَ لِيُعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ" قال هذا قول يوسف۔ قال فقال له جبريل: ولا، حين حلت سروليك؟ قال، فقال يوسف: وَمَا أُبْرِي نَفْسِي ... (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۴۳۹)

۱۳۔ بنحوہ۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۴۴۰)

۱۴۔ حدثنا بشر قال، حدثنا يزيد، قال حدثنا سعيد، عن قتادة، قوله: "ذَلِكَ لِيُعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ" ذكر لنا أن الملك الذي كان مع يوسف، قال له: اذكر ما هممت به؟ قال، نبي الله: "وَمَا أُبْرِي نَفْسِي ..." (حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۴۴۱)

۱۵-۱۶-۱۷-۱۸۔ بنحوہ و بمثلہ۔ بتغيير يسير۔

(حوالہ مذکور تحت رقم ۱۹۴۴۲، ۱۹۴۴۳، ۱۹۴۴۴، ۱۹۴۴۵)

تفسیر طبری چونکہ "ام التفاسیر" ہے اس لئے بعض دیگر مفسرین نے ان میں سے بعض روایات کو نقل کیا ہے۔ چنانچہ علامہ سید محمود آلوسی (۱۲۷۰ھ) فرماتے ہیں کہ:

وفي كثير من التفاسير أنه (يوسف) عليه السلام حين قال: "ذَلِكَ لِيُعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ" قال له جبريل عليه السلام: ولا، حين هممت؟ فقال: "وَمَا أُبْرِي نَفْسِي ..." (روح المعاني جلد ۱۳۔ الجزء الثالث عشر ص ۲۔ تحت "وَمَا أُبْرِي نَفْسِي ...")

امام طبری نے سورہ یوسف کی آیت ۵۲-۵۳ کی تفسیر میں ۱۸ روایات کی رو سے یہ بات "ثابت" کی ہے کہ شاہی دربار میں زوجہ عزیز کی حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں اس کو ابی: "الآن حَصَصَ الْحَقُّ أَنَا رَوْدَتُهُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ" (اب حق کھل چکا ہے وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی۔ بے شک وہ بالکل سچا ہے) کے بعد جب حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: "ذَلِكَ لِيُعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ"

بِالْغَيْبِ" (اس سے میری غرض یہ تھی کہ عزیز یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی تھی) تو جبریل امین اور ایک فرشتہ (جو یوسفؑ کے ساتھ ڈیوٹی پر مقرر تھا) نے انہیں ٹوکتے ہوئے بھوکا لگاتے ہوئے اور وہ سابقہ منظر یاد کراتے ہوئے کہا کہ: کیا اس دن تم نے خیانت نہیں کی تھی جب اس عورت نے تیرے ساتھ برائی کا ارادہ کر لیا تھا اور تم نے بھی اس کے ساتھ ایسا ہی ارادہ کیا تھا بلکہ کیا تم نے اس وقت خیانت نہیں کی تھی جب تم نے اپنی شلوار بھی اتار لی تھی؟ جبریل امین اور فرشتے کے اس طرح کے ہر سوال کے جواب میں یوسفؑ یہ اعتراف کرتے رہے کہ: میں کچھ اپنے نفس کی برأت نہیں کر رہا ہوں نفس تو ہدیٰ پر اکساتا ہی ہے لہذا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو۔ بے شک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔

امام طبری نے سورہ یوسف کی آیات: "وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ ۖ وَهَمَّ بِهَا" ، ذَلِكْ لِيُعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ ... ، وَمَا أُبْرِي نَفْسِي ... " (یوسف: ۵۲، ۵۳) کے ذیل میں جو تفسیری اقوال نقل کئے ہیں انہیں صحیح سمجھنے کی صورت میں یقینی طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت داغ دار ہوتی ہے۔

سخت تعجب ہے کہ امام طبری نے زوجہ عزیز کی کواہی کے بعد بھی اپنی روش ترک نہیں کی۔ پھر جب وہ "مقدمہ" کی اصل مدعیہ کے اپنے سابقہ بیان سے منحرف ہونے کے بعد اس کے "اعتزانی بیان" سے بھی مایوس ہو گئے تو انہوں نے حضرت جبریل اور ایک دوسرے فرشتے کی کواہی سے "۱۸" روایات لا کر اپنا باطل مدعا "ثابت" کرنا شروع کر دیا۔ معلوم نہیں کہ امام طبری نے "کراما کاتین" اور جبریل امین کے "نیامات" کا ریکارڈ کن "ذرائع" سے حاصل کیا؟

روزنامہ اسلام کے "فاضل" کالم نگار اور امام طبری کے دیگر "وکلاء صفائی" پر اس سوال کا "جواب" قرض رہے گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی پر گواہیاں

امام طبری کے حضرت یوسف علیہ السلام کے خلاف انتہائی نامناسب اور جارحانہ انداز اختیار کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ سے متعلق تمام ”کرداروں“ کے بیانات ایک ترتیب کے ساتھ مذکور قرار دینے کی ضرورت ہے:

جن حضرات کا اس واقعہ سے براہ راست تعلق ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام

(۲) زوجہ عزیز

(۳) عزیز مصر

(۴) شاہد (گواہ)

(۵) زنان مصر

(۶) اللہ تعالیٰ

(۷) ابلیس لعین

حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی پر ان گواہیوں کے مطالعہ کے بعد ہر مومن بالقرآن اس بات کے ساتھ اتفاق کرے گا کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے خلاف امام طبری کی منقولہ روایات عقیدہ عصمت انبیاء کے سراسر منافی اور توہین ہیں۔

۱۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا بیان

”قَالَ هِيَ رَاوَدْتَنِي عَنْ نَفْسِي“ (یوسف ۲۶)

یوسفؑ نے عزیز مصر کے سامنے اس کی بیوی کی موجودگی میں (جب اس نے ان پر ”ہم باطل“ اور ”سوء“ کا الزام لگاتے ہوئے کہا تھا کہ ”ما جزاء من ارادك باهلك سوء“): فرمایا: ”هِيَ رَاوَدْتَنِي عَنْ نَفْسِي“ ”درحقیقت یہی عورت مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی۔“

پھر جب زوجہ عزیز نے اپنے حکم کی تعمیل نہ کرنے پر انہیں ”قید“ کی دھمکی دی تو یوسف علیہ السلام نے اس کی سہیلیوں سمیت سب کے شر سے بچنے کے لئے اللہ کے حضور یہ دعا کی کہ:

”رَبِّ الْمَسْجُونِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ“ (یوسف ۳۳)

مجھے قید اس چیز کی نسبت جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں زیادہ پیاری ہے۔

اس سے واضح ہو گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے زوجہ عزیز کی طرف سے الزام ”سوء“ کی تردید کرتے ہوئے اصل حقیقت واضح فرمادی کہ یہ سب کچھ خود اسی کا کیا دھرا ہے۔ ان کا اس کی طرف کسی ”ہم“ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو اس پر قید کو زیادہ پسند کر رہے ہیں اور ترجیح دے رہے ہیں۔ پھر بعد میں ”رَبِّ الْمَسْجُونِ أَحَبُّ إِلَيَّ“ پر عمل کر کے بھی دکھا دیا۔ پھر ایک عرصہ کے بعد جب بادشاہ نے رہائی کا حکم دیا تو انہوں نے الزام و بہتان کی تحقیق و تفتیش کے بغیر جیل سے نکلنے سے بھی انکار کر دیا۔

۲۔ زوجہ عزیز کا اعتراف

زوجہ عزیز نے، حضرت یوسف کو اپنے دام تزدیر میں پھانسنے کی (ترغیب و ترہیب پر مشتمل) تمام کوششوں میں ناکام ہو کر جیل بھجوانے کا اپنا آخری ہتھکنڈا اور حربہ استعمال کر کے جب دیکھ لیا تو اس نے پہلے شہر کی عورتوں کے سامنے یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کا بایں الفاظ اعلان کیا کہ: ”وَلَقَدْ رَآوْنَهُ يُغْنِي عَنْ نَفْسِهِ فَاَسْتَعْصَمَ“ (یوسف ۳۲)
 ”البتہ تحقیق میں نے خود اسے اپنی طرف مائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ”معصوم“ ثابت ہوا۔“

پھر آخری مرتبہ شاہی دربار میں تحقیق کے دوران اپنا اعترافی بیان ریکارڈ کراتے ہوئے زوجہ عزیز نے کہا کہ:

”الْآنَ خَصَصْتُ الْحَقَّ اَنَا رَآوْنَهُ عَنْ نَفْسِهِ وَاِنَّهُ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ“ (یوسف ۵۱)
 اب حق واضح ہو ہی گیا ہے (اور حقیقت بھی یہی ہے کہ) وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی بے شک وہ (یعنی یوسف) بالکل سچا ہے۔
 جس عورت کے ساتھ بقول امام طبری حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے یہ واقعات پیش آئے ہوں کہ: ”حتی رقی لہا، ولم یخوف منها، خلوا فی بعض بیوتہ، حلّ الہمیان، حلّ السراویل، نزع ثیابہ، حلّ ثیابہ۔ اوثیابہا، جلس منها مجلس الخاتن، جلس منها مجلس الرجل من امرأۃ، جلس بین رجليہا، قعد بین رجليہا“
 کیا وہ عورت یوسف علیہ السلام کی عدم موجودگی میں بادشاہ کے دربار میں ان کی معصومیت اور صداقت کی گواہی دے سکتی ہے؟

۳۔ عزیز مصر کا بیان

اس عورت کے شوہر نے ”شاہد“ کی تجویز کے مطابق اپنی بیوی کو اپنے دعویٰ ”مَسَاجِرَءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِيْكَ سُوءًا اِلَّا اَيْسَجَنَ اَوْ عَذَابُ الْيَمِّ“ (یوسف ۲۵)
 (بتائیں) کیا سزا ہے اس کی جو تیری بیوی سے بدکاری کا ارادہ کرے، مجزاس کے کہ اسے قید کر لیا جائے یا اسے دردناک عذاب دیا جائے) میں جب جھوٹا پایا تو پکا راٹھا کہ:
 ”اِنَّهُ مِنْ كَيْدِ كُنٍّ اِنِّیْ كُنْتُ كُنٌّ عَظِيْمٌ“ (یوسف ۲۸-۲۹)
 ”وَاسْتَغْفِرُنِيْ لِذَنْبِكَ اِنَّكَ كُنْتَ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ“ (یوسف ۲۸-۲۹)
 ”بے شک یہ تمہاری چالاکیوں میں سے ہے۔ واقعی بڑی عظیم ہوتی ہیں تمہاری چالیں۔ یوسف! اس معاملے سے درگزر کر اور رازے عورت تو اپنے گناہ و قصور کی معافی مانگ بے شک تو ہی خطا کاروں میں سے ہے۔“

اس عورت کے شوہر (عزیز) نے بھی تحقیقی رپورٹ کے بعد بالآخر اس بات کی گواہی دے دی کہ یوسف علیہ السلام نے میری بیوی کے ساتھ برائی کا کوئی ارادہ نہیں کیا وہ معصوم ہیں اس معاملے میں قصور وار اور خطا کار میری بیوی ہی ہے۔ یوسف علیہ السلام پر برائی کا الزام لگانا بھی اس کے کمر میں سے ہے یقیناً عورتوں کا کمر بڑا ہی عظیم ہوتا ہے۔

۴۔ شاہد کا بیان

اس ”شاہد“ کا تعارف قرآن عزیز نے یوں کرایا ہے کہ:

”وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا...“ (یوسف ۲۶)

اور اس عورت کے خاندان میں سے ایک کو اہل نے گواہی دی۔

یہ شاہد کون تھا؟ اس کے بارے میں امام طبری کے اپنے بیان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک تفسیر کے مطابق وہ چھوٹا بچہ تھا جو ابھی گہوارہ میں ہی تھا۔ جبکہ دوسری تفسیر کے مطابق وہ شاہد ”کان رجلاً ذالحمیۃ“ ایک داڑھی والا مرد تھا۔ ملاحظہ ہو: تفسیر الطبری المجلد السابع ص ۱۹۱-۱۹۲۔

”بچے“ سے متعلق روایت سنداً و متناً و روایتاً و درایتاً قابل رد ہے۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ گہوارہ میں موجود ”بچہ“ کس کا تھا؟ عزیز مصر کا تو ہو نہیں سکتا کیونکہ تفسیر ابن کثیر میں عزیز کو ”عنین“ قرار دیا گیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر المجلد الثانی ص ۲۸۹ طبع بیروت) جبکہ روح المعانی میں اس عورت کا اپنا بیان یہ نقل کیا گیا ہے کہ: ”وکان صاحبی لا یأتی النساء“ (روح المعانی: الجزء الثالث عشر ص ۴)

مولانا مودودی صاحب اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اس سے معاملہ کی نوعیت یہ سمجھ آتی ہے کہ صاحب خانہ کے ساتھ خود اس عورت کے بھائی بندوں میں سے بھی کوئی شخص آ رہا ہوگا اور اس نے یہ قضیہ سن کر کہا ہوگا کہ جب یہ دونوں ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہیں اور موقع کا گواہ کوئی نہیں ہے تو قرینہ کی شہادت سے اس معاملہ کی یوں تحقیق کی جاسکتی ہے۔ بعض روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ شہادت پیش کرنے والا ایک شیر خوار بچہ تھا جو ہاں پنگھوڑے میں لیٹا ہوا تھا اور خدا نے اسے گویائی

عطا کر کے اس سے یہ شہادت دلوائی۔ لیکن یہ روایت نیکو کسی صحیح سند سے ثابت ہے اور نہ اس معاملے میں خواہ مخواہ معجزے سے مدد لینے کی کوئی ضرورت ہی محسوس ہوتی ہے۔ اس شاہد نے قرینے کی جس شہادت کی طرف توجہ دلائی ہے وہ سراسر ایک معقول شہادت ہے اور اس کو دیکھنے سے بیک نظر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص ایک معاملہ فہم اور جہاں دیدہ آدمی تھا جو صورت معاملہ سامنے آتے ہی اس کی تہہ کو پہنچ گیا۔ بعید نہیں کہ وہ کوئی نج یا مجسٹریٹ ہو۔ مفسرین کے ہاں شیر خوار بچے کی شہادت کا قصہ دراصل یہودی روایات سے آیا ہے۔ ملاحظہ ہو: (اقتباسات تلمود از پال اسحاق ہرشون۔ لندن ۱۸۸۰ء ص ۲۵۶۔ بحوالہ تفہیم القرآن جلد دوم ص ۳۹۴-۳۹۵)

اس عورت کے اپنے خاندان کے ایک ”شاہد“ نے نزاع کے وقت عزیز مصر کو جس قرینے کی شہادت کی طرف متوجہ کیا وہ قرآنی الفاظ میں یہ ہے:

”إِنِّ كُنَّا قَمِيصُةً قُلْعَيْنِ قُبُلٍ فَصَلَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۝ وَإِنِّ كُنَّا قَمِيصُةً قُلْعَيْنِ قُبُلٍ فَكَلَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ فَلَمَّا رَأَى قَمِيصُةً قُلْعَيْنِ قُبُلٍ...“ (یوسف ۲۶-۲۸)

”اگر یوسف کا کرتہ آگے سے پھٹا ہو تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچا۔ پھر جب اس (کے شوہر) نے دیکھا کہ یوسف کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا ہے۔“

تو اس طرح زوجہ عزیز اپنے خاندان کے ایک فرد کی تجویز اور گواہی کے مطابق بھی جھوٹی قرار پائی۔

۵۔ زنانِ مصر کا بیان

بادشاہ کی طرف سے رہائی کے پیغام کے جواب میں حضرت یوسف علیہ السلام نے بطور خاص شہر کی ان عورتوں سے جنہوں نے زوجہ عزیز کی دعوت میں اپنی انگلیاں کاٹ ڈالی تھیں، تحقیق کا مطالبہ کر دیا۔ چنانچہ بادشاہ نے ان عورتوں کو طلب کر کے پوچھا:۔
”مَّا حَطَبْتُمْ إِذْ رَأَوُذُنَّ يُوسُفَ عَنْ نَفْسِهِ ۖ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ“ (یوسف ۵۱)

”کیا حقیقت تھی تمہاری (اس بات کی) جبکہ تم نے یوسف کو اس کی مرضی کے خلاف پھسلانا چاہا تھا؟ تو وہ بیک زبان بول پڑیں پاکی ہے اللہ تعالیٰ کے لئے، ہم نے تو اس میں بدی کا شائبہ تک نہیں پایا۔“

۶۔ اللہ تعالیٰ کی گواہی

سب سے پہلے زوجہ عزیز نے حضرت یوسف کی طرف ”سوء“ کی نسبت کی ہے کہ:
”مَّا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا“ (یوسف ۲۵)
جو تیری بیوی سے بدکاری کا ارادہ کرے اس کی سزا کیا ہو سکتی ہے۔۔۔
پھر شاہی دربار میں مصر کی عورتوں کی یہ گواہی کہ:

”مَّا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ“ (یوسف ۵۱) سننے کے بعد زوجہ عزیز نے بھی اپنا الزام واپس لیتے ہوئے ان کی صداقت کی گواہی دے دی۔

اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کی ابتداء میں ہی جب زوجہ عزیز نے مکان کے دروازے بند کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کو دعوتِ گناہ دی تو ان پر اپنی ”برہان“ واضح کر دی جس کی بناء پر انہوں نے اس عورت کا ارادہ ہی نہیں کیا جسے اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا:

”كُلُّلِكَ لِنُصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ ۚ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ“ (سورۃ یوسف ۲۴)
”یہ اس لئے کہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو ہٹائے رکھیں۔ یقیناً وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھے۔“

اس کی مزید وضاحت اگلے عنوان ”ابلیس کا اعتراف“ کے تحت آرہی ہے۔

۷۔ ابلیس کا اعتراف

شیطان نے اللہ تعالیٰ سے کہا: فَبِعِزَّتِكَ لَا غَوْيُهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ ۝ (سورہ ص ۸۲-۸۳) پس تیری عزت کی قسم! ضرور میں ان سب کو گمراہ کر دوں گا۔ سوائے ان میں سے تیرے مخلص بندوں کے۔

ابلیس کا یہ اعتراف اس لئے نہیں کہ اسے اس کے مخلص بندوں سے کوئی ہمدردی ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ اختیار دیا ہی نہیں کہ اس کے مخلص بندوں پر اس کا کوئی داؤ بیچ چل سکے: ”إِنِّي عَبْدِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ ابْتِغَاكَ مِنَ الْغَاوِينَ ۝“ (الحجر ۴۲) ”یقیناً جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔ سوائے ان کے جو گمراہ ہونے والوں میں سے تیری پیروی کریں۔“

بہر حال شیطان کا یہ اعتراف واقراً موجود ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کو نہیں بہکا سکتا اور اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں بطور خاص فرماتے ہیں کہ: ”إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ“ یقیناً وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھے۔ لہذا خود ابلیس کے اقرار سے بھی یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو نہیں بہکایا اور یوسف علیہ السلام نے بھی زوجہ عزیز کا سرے سے کوئی قصد ہی نہیں کیا تھا۔ ”ہم“ کی تعریف پیچھے گزر چکی ہے اس کے معنی ”فکر و ارادہ اور قصد و خیال“ کے ہیں جس کا ادراک حواس سے نہیں ہو سکتا اور جس چیز کا ادراک حواس سے نہ ہو اسے ہم نہیں جان سکتے کیونکہ اس کا محل دل ہے اور دل کی بات سے صرف اللہ تعالیٰ (جو ”علیم بذات الصدور“ ہیں) ہی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ پس ”ہم حقیقی“ ارادے کا نام ہے فعل کا نہیں۔ اگر ایک شخص سے کچھ حرکات و سکنات ظاہر ہوں جن کا ادراک حواس سے ہوتا ہے تو انہیں دیکھ کر اس بات کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی یہ حرکات و سکنات اور افعال اس کے ”ہم حقیقی“ پر دلالت کرتے ہیں۔

امام طبری کی ”نزالی“ گواہی

حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی پر گواہیوں کے سلسلہ میں پیچھے حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنا بیان، زوجہ عزیز کا اعتراف، عزیز مصر کا بیان، ”شاہد“ کا بیان، شہر کی عورتوں کا بیان، اللہ تعالیٰ کی گواہی اور ابلیس کا اعتراف، قرآن کریم کی روشنی میں گزر چکا ہے جن کی رو سے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی ثابت ہوتی ہے۔ مگر ان تمام گواہیوں کے برعکس امام طبری نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی اور عصمت کے خلاف جو گواہی خود اپنی تفسیر میں ریکارڈ کرائی ہے وہ سب سے منفرد اور نزالی ہے۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ ان کے تفسیری اقوال سے حضرت یوسف علیہ السلام کا ”ہم“ بشری تقاضے کے تحت کیا ”غیر اختیاری قصد“ میں داخل متصور ہو گا یا ”اختیاری“ میں؟

پھر ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا اس ”ہم“ کا ادراک حواس سے ہو سکتا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہو تو پھر وہ ”ہم“ کی تعریف میں داخل ہے۔ اور اگر جواب اثبات میں ہو تو پھر اس پر ”ہم“ کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔

سوال یہ ہے کہ امام طبری کو یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی اس عورت کا ”غلط قصد“ کیا تھا؟ اگر موصوف نے حضرت یوسف علیہ السلام کی حرکات و سکنات کو ”دیکھ“ کر یا معتبر حضرات کی گواہی سے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ان کا ”قصد غلط“ تھا تو سوال یہ ہے کہ جس عورت کے ساتھ براہ راست ایک ہند کمرے میں یہ حرکات و سکنات کی گئی تھیں اس نے شاہی دربار میں یوسف علیہ السلام کی عدم موجودگی میں ان کی صداقت کی گواہی کیوں دی؟ پھر ”ہم“ تو غیر اختیاری بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ افعال اور حرکات و سکنات تو اختیاری تھے جو یقیناً صرف ”سوء“ ہی میں شامل نہیں تھے بلکہ اس قبیح فعل کے ”مبادی“ ہونے کی حیثیت سے ”فحشاء“ کے ذیل میں بھی شمار ہوتے ہیں۔ سوال

یہ ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کس ”سوء و فحشاء“ کو ہٹایا تھا؟
قارئین کرام! اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ کیا امام طبری کی بیان کردہ تفصیلات ”ہم مُحرَّم“ اور ”عمل باطل“ (یعنی حرام ارادے اور گندے عمل) میں داخل نہیں ہیں؟ کیا انہیں تسلیم کر لینے سے حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت داغ دار نہیں ہوتی؟ ”بینوا و توجروا، فأجرکم علی اللہ“

چنانچہ امام طبری مذکورہ تمام گواہیوں کو ”رو“ کر کے آیت ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا“ کے تحت متعدد روایات نقل کرتے ہیں:

”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ“ عورت کا ”ہم“ حرکات یہ تھیں:

”یا یوسف، ما أحسن شعرك، ما أحسن وجهك، حتی أطمعته، فدخل البيت و غلقت الأبواب، حتی خلوا فی بعض بیوته، و قلت هیت لك، أکبت علیہ و تدعوه لى لئلا من حاجة الرجال فی جمالها و حسنہا، تطمعه مرّة و تخفیه أخرى، استلقت له، استلقت علی قفاها...“ (تفسیر الطبری جلد ۱ ص ۱۸۱-۱۸۲)

اس عورت نے حضرت یوسف سے کہا:

آپ کے بال کتنے ہی خوبصورت ہیں، آپ کا چہرہ کس قدر حسین ہے، انہیں برابر لالچ اور ترغیب دیتی رہی، پس وہ دونوں محل میں داخل ہو گئے، اس عورت نے خود ہی تمام دروازے بند کر دیئے پھر وہ خلوت گاہ میں تنہا ہو گئے، اس عورت نے کہا جلدی خواہش پوری کر، (صاحب روح المعانی نے کہا کہ اس موقع پر ”تصدت هنالك لأفعال آخر من بسط یدها إلیه و قصد المعانقة و غیر ذلك“ یہاں اس سے اور بھی بہت سے افعال صادر ہوئے، اس نے ان کی طرف معانقہ کی غرض سے ہاتھ بھی بڑھایا۔ (روح المعانی جلد ۱۲ ص ۲۱۳)، وہ عورت ان پر جھک گئی اور اپنے جمال و حسن کی وجہ سے اس لذت کی طرف دعوت دینے لگی جو ایک جوان مرد کی حاجت و خواہش ہوتی ہے، کبھی انہیں لالچ دیتی اور کبھی انہیں خوف دلاتی۔ حتیٰ کہ وہ ان کے سامنے پیٹھ کے بل بالکل سیدھی و چپٹ لیٹ گئی۔

زوجہ عزیز کے مذکورہ افعال اور حرکات کی بناء پر اس کے ”ہم“ کے بارے میں یہ حکم لگایا گیا کہ اس عورت کا یہ فعل کا پختہ ارادہ تھا یعنی:

”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ“، بمعنی، القصد الجازم، العقد الثابت، والمعنی، قصدت المخالطة و عزمت علیہا عزمًا جازمًا، لا یلوہا عنہ صارف بعد ما باشرت مبادیہا و فعلت ما فعلت“... (روح المعانی جلد ۱۲ ص ۲۱۳)

”گویا اس عورت کے مذکورہ افعال و حرکات (جو مبادی زنا ہیں) اختیار کرنے کی بناء پر اس عورت کے ”عمل باطل، ہم مُحرَّم، قصد جازم بقصد عازم، عقد ثابت، مخاطبت و مباشرت“ کا ارادہ ثابت کیا گیا ہے۔ یعنی اگر یہ افعال و حرکات نہ ہوتے تو اس کا ”ہم“ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔“
ہم یوسف علیہ السلام (وَهَمَّ بِهَا) زوجہ عزیز کے مذکورہ ”عمل باطل اور“ ہم مُحرَّم“ کے ساتھ ملا کر ”۱۹“ روایات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ”ہم“ کے بارے میں بایں الفاظ وضاحت کی گئی ہے اور اکثر روایات میں اس ”ہم“ کی وضاحت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب کی گئی ہے کہ ان سے جب یہ سوال کیا گیا کہ: ”ما بلغ من ہم یوسف؟“ یوسفؑ کا ”ہم“ کہاں تک پہنچا؟ تو اس کے جواب میں وہ اس ”ہم“ کی حد اپنے شاگردوں کو بتاتے رہے جس کا سلسلہ بالآخر امام طبری تک پہنچا اور وہ خود ان روایات کو اپنی سند سے اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہیں: ”حلتنا، حدثنی“:

”وہو شباب مستقبل یجد من شبق الرجال ما یجد الرجل، حتی رقی لها مما یری من کلفها بہ، ولم یتخوف منها حتی ہم بہا و ہمّت بہ حتی خلوقی بعض بیوته، حلّ الهمیان، حلّ السراویل، حلّ ثیابہ فو ثیابہا، جلس منها مجلس الخائن، جلس بین رجلیہا، قعد بین رجلیہا، جلس منها مجلس الرجل من امرأته...“

”اور یوسفؑ بھر پور جوان تھے، وہی احساسات پائے جاتے تھے جو ایسے موقع پر ایک مرد محسوس کرتا ہے، اپنے ساتھ اس عورت کی بے تکلفی دیکھ کر وہ بھی اس کی طرف مائل ہو گئے، اس سے کوئی ڈر و خوف محسوس نہیں کیا، یہاں تک کہ اس عورت کا قصد کر لیا، خلوت گاہ میں چلے

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

گئے، ازار بند کھولا، شلوار اور کپڑے اتار دیئے، مجلس الخائن کی جگہ بیٹھ گئے، اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیٹھ گئے اور اس جگہ بیٹھے جہاں بیٹھ کر ایک مرد اپنی بیوی سے مقاربت کرتا ہے۔
گویا امام طبری نے اس قبیل کی '۱۹' روایات سے یہ بات واضح کر دی کہ ان افعال و حرکات سے پتہ چلتا ہے کہ یوسفؑ کا 'ہَمَّ' کہاں تک پہنچا تھا۔ موصوف اگر باقی 'حرکات' کی تفصیل نہ بھی دیتے تو پھر بھی 'حلّ سرویل' سے باقی 'مبادی' خود بخود معلوم ہو سکتے تھے کیونکہ 'حلّ سرویل' تک نوبت باقی 'مراحل' سے گزر کر رہی پہنچتی ہے مگر موصوف نے نہ صرف 'حلّ سرویل' اور 'حلّ ثياب' کے ذکر پر اکتفاء کیا بلکہ بیٹھنے کی جگہ تک کی بھی نشاندہی کر دی۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ 'ہَمَّ' اختیار نہیں ہے؟ کیا یہ افعال و حرکات 'سوء و فحشاء' میں شامل نہیں ہیں؟ کیا یہ افعال و حرکات 'فعل قبیح' کے زمرے میں نہیں آتے؟ کیا ان افعال و حرکات سے حضرت یوسف علیہ السلام کا 'فعل باطل' اور 'ہَمَّ فحرم' ثابت نہیں ہوتا؟

امام طبری نے یہ افعال و حرکات کسی عام شخص کی طرف نہیں بلکہ اللہ کے نبی حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کئے ہیں اور وہ خود بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

"قَالَ قَالَ قَائِلٌ: وَكَيْفَ يَجُوزُ أَنْ يُوصَفَ بِمِثْلِ هَذَا، وَهُوَ اللَّهُ نَبِيٌّ؟" پھر خود اس کا جواب دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایسے امور میں مبتلا کرے ان کی آزمائش کرتے رہتے ہیں تاکہ انبیاء:

۱۔ اس کی وسعت عفو و رحمت ہی کے بھر دے پر نہ رہیں۔

۲۔ تاکہ نعمت کے موقع پر انہیں جتلائے کہ اللہ نے ان کی اس خطا سے درگزر کر دیا ہے اور آخرت میں اس پر کوئی گرفت نہیں کرے گا۔

۳۔ تاکہ انبیاء کرام، گناہ گاروں کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید میں امام و پیشوا ثابت ہوں اور گناہ گار تو بہ کے وقت انبیاء کے ان واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مایوسی و ناامیدی کے شکار نہ ہوں۔

پھر جن علماء نے 'وَهَمَّ بِهَا' کی یہ توجیح کی کہ چونکہ انہوں نے اپنے رب کی 'برہان' دیکھ لی تھی اس لئے انہوں نے اس عورت کا قصد ہی نہیں کیا تھا چہ جائیکہ ان سے اس طرح

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

کے افعال و حرکات کا قصد رہو۔ یا جن علماء نے اس 'ہَمَّ' سے یہ مراد لی کہ انہوں نے اس عورت کو مارنے کا قصد کیا تھا تو امام طبری ان دونوں قولوں کو فاسد قرار دیتے ہیں ('و' یفسد ہلین القولین') ملاحظہ ہو: (تفسیر الطبری المجلد السابع ص ۱۸۲-۱۸۳)

قارئین کرام! یہاں 'وَهَمَّ بِهَا' (سورہ یوسف آیت ۲۴) کے تحت امام طبری کے منقولہ چند تفسیری اقوال پیش کئے گئے ہیں۔ موصوف نے ان ہی اقوال پر بس نہیں کی بلکہ آگے آیت ۵۲-۵۳ کی تفسیر میں وہ تمام حدود بھی پھیلا گئے۔ چنانچہ انہوں نے وہاں '۱۸' روایات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول کہ: "ذَلِكَ لِيُعَلِّمَ آتِي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ" (اس سے میری غرض یہ تھی کہ عزیر مصر یہ جان لے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی تھی) کی تردید حضرت جبرئیل علیہ السلام اور ایک دوسرے فرشتے (جو ان کے ساتھ ڈیوٹی پر مامور تھے) کے ذریعے کرائی کہ اے یوسف! تم یہ دعویٰ کیوں کر کر سکتے ہو؟ یا دیکھو کیا تم نے اس وقت خیانت نہیں کی تھی جب تم نے عورت کا قصد کیا تھا؟ جس وقت تم نے اپنی شلوار اتار دی تھی کیا اس وقت تم نے خیانت نہیں کی تھی؟ اس طرح کے ہر سوال کے جواب میں یوسف علیہ السلام بار بار یہ آیت پڑھتے رہے کہ: "وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَجَعْتُ رَبِّي" میں کچھ اپنے نفس کی برأت نہیں کر رہا ہوں کیونکہ نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے۔۔۔

اس طرح امام طبری نے ۱۸+۱۹+۳۷ روایات اور بالخصوص جبرئیل اور فرشتے کی گواہی کی بنیاد پر ۱۔ زوجہ عزیر، ۲۔ عزیر مصر، ۳۔ شاہد من اہلہا، ۴۔ زمان مصر، ۵۔ حضرت یوسفؑ، ۶۔ اللہ تعالیٰ اور ۷۔ اہلس کی گواہی کو رد کر کے یوسف علیہ السلام کی طرف قصد بالجزم، سوء اور فشاء کی بھی نسبت 'ثابت' کر دی۔ العیاذ باللہ! ثم العیاذ باللہ!

امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) نے انبیاء کرام کی عصمت کے تحفظ کی خاطر ایسے ضدی اور ہٹ دھرم طبقے کے حق میں جس درو اور سوز سے جو حتمی بات کی ہے یقیناً اس پر کوئی اضافہ ممکن نہیں ہے چنانچہ حضرت موصوف حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی پر تمام اہم

شہادتیں قلم بند کرنے کے بعد منکرین عصمت انبیاء سے یوں مخاطب ہوتے ہیں کہ:

”فولاء الجهال الذين نسبوا إلى يوسف عليه السلام هذه الفضيحة إن كانوا من أتباع دين الله تعالى فليقبلوا شهادة الله تعالى على طهارته، وإن كانوا من أتباع إبليس وجنوده فليقبلوا شهادة إبليس على طهارته“ (التفسير الكبير جلد ۶ ص ۴۴۱)

جن جاہلوں نے ان قبیح حرکات و شنیع افعال اور گندے عمل و حرام قصد و ہم کو حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کیا ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کے قانون اور طریقے کی اتباع کرنے والے ہیں تو اس کی یوسف علیہ السلام کے حق میں اس کو ابھی کو قبول کر لیں: ”وَهُمْ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ ط كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ ط إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ“ (سورۃ یوسف آیت ۲۴) (اور یوسف بھی اس عورت کا قصد کر لیتے اگر وہ اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتے مگر چونکہ وہ برہان دیکھ چکے تھے اس لئے انہوں نے اس کا ارادہ ہی نہیں کیا۔ یہ اس لئے کیا گیا تا کہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی کو پھیر دیں بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھے۔)

اور اگر وہ منکرین عصمت، جاہل لوگ ابلیس اور اس کے لشکروں کے پیروکار ہیں تو وہ یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی پر ابلیس کی شہادت قبول کر لیں جب اس نے کہا تھا کہ: ”فَبِعِزَّتِكَ لَا غَوِيَّ لَهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ“ (ص ۸۲-۸۳) (تیری عزت و جلال کی قسم! میں ان سب کو صراط مستقیم سے ضرور بہکاؤں گا مگر تیرے مخلص بندوں پر میرا کوئی داؤ فریب نہیں چل سکتا۔)

لیکن صد افسوس! امام طبری و امثالہ نے ان سب کو اہوں کی گواہیوں کو رد کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کے خلاف جبرئیل اور فرشتے کی موعومہ و مفروضہ گواہی قبول کر لی۔ جس کا کسی بھی ذریعے سے ثابت ہونا ممکن ہی نہیں۔ واللہ المستعان!

بیوہ عزیز سے حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح

امام طبری نے پہلے ”وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا... لَمْ أَخْنُهَا بِالْغَيْبِ... وَمَا أُبْرِئِي نَفْسِي...“ کے تحت حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف انتہائی قبیح افعال و حرکات منسوب کیں۔ پھر جب بادشاہ مصر نے انہیں باعزت بری کر کے اقتدار میں شریک کر لیا تو امام طبری نے دوبارہ حضرت یوسف علیہ السلام اور زبیرہ عزیز کا قصہ چھیڑ دیا جو بالآخر دونوں کے مابین ”نکاح“ پر منتج ہوا۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں کہ:

وكان تمكين الله ليوسف في الارض كما:

حدثنا ابن حميد قال، حدثنا سلمة، عن ابن اسحاق قال: لما قال يوسف للملك: (اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْكُمْ ۝) قال الملك قد فعلت! فولاه فيما يذكر عمل إطفير وعزل إطفير عما كان عليه، يقول الله: ”وَكُنَّا لِيُؤْسَفَ فِي الْأَرْضِ يَبْكُوا مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ... الآية“ قال فذكر لي، والله أعلم أن إطفير هلك في تلك الليالي بوأن الملك الزيان بن الوليد، زوج يوسف امرأة إطفير راعيل، و أنها حين دخلت عليه قال: أليس هذا خيرا مما كنت تريدن؟ قال فبزعمون أنها قالت: أيتها الصديق، لا تلمني، فاني كنت امرأة كماترى حسنا وجمالا ناعمة في ملك و دنيا، وكان صاحبي لا يأتي النساء و كنت كما جعلك الله في حسنك و هيئتك، فغلبتني نفسي على ما رأيت، فبزعمون أنه وجدها عنراء، فأصابها فولدت له رجلين أفرائيم بن يوسف و ميسا بن يوسف“ (تفسير الطبري - سورة يوسف تحت آیت ۵۶ - رقم ۱۹۴۵۹ - طبع اول بیروت - ۲۰۰۰ء)

امام طبری ابن حمید سے وہ سلمہ سے، اور وہ ابن اسحاق سے روایت کرتے ہیں کہ:

جب حضرت یوسف نے بادشاہ سے کہا کہ: آپ مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر

کردیں یقیناً میں بہت حفاظت کرنے والا اور بہت علم رکھنے والا ہوں۔ بادشاہ نے کہا: میں نے آپ کو تقرر کر دیا ہے، پھر انہیں باضابطہ طور پر اس منصب پر فائز کر دیا۔ اور یطغیر (عزیر مصر) جس کام پر مامور تھا اسے اس سے معزول کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو (مصر کی) زمین میں قدرت دے دی کہ اس میں جہاں جی چاہے وہاں رہے۔“

راوی نے کہا: مجھ سے یہ بھی بیان کیا گیا اور اللہ ہی بہتر جانتے ہیں، یطغیر ان دنوں فوت ہو گیا اور بادشاہ ریان بن ولید نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ اس کی بیوی راہیل کا نکاح کر دیا۔ اور جب راہیل یوسفؑ کے پاس آئی تو انہوں نے فرمایا کہ کیا یہ کام یعنی نکاح اس کام یعنی زنا سے بہتر نہیں جوتو چاہتی تھی۔ اس نے کہا: اے صدیق مجھے ملامت نہ کیجئے، آپ کو معلوم ہے کہ میں حسن و خوبصورتی والی، دھن دولت والی عورت تھی اور میرا شوہر قوت مردی سے محروم تھا، وہ عورت کے پاس آنے پر قادر ہی نہیں تھا، ادھر آپ کو قدرت نے جس فیاضی سے دولت حسن کے ساتھ مال مال کیا ہے وہ بھی ظاہر ہے پس میرے نفس نے اس وقت مجھ پر غلبہ کر لیا تھا جسے آپ دیکھ چکے ہیں۔ پس لوگوں کا خیال ہے کہ یوسفؑ نے اسے باکرہ پایا، اس کے پاس گئے اور صحبت کی پھر اس سے ان کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ افراتیم بن یوسف اور یثاہن یوسف۔

امام ابن کثیر یہی واقعہ نقل کرنے کے بعد آگے یوسفؑ کے بیٹوں کا تذکرہ کرتے ہیں: ”وولد لأفراتیم نون والد یوشع بن نون، ورحمة امرأة أيوب عليه السلام، وقال الفضيل بن عياض، وقفت امرأة العزيز على ظهر الطريق حتى مر يوسف، فقالت: الحمد لله الذي جعل العبيد ملوكاً بطاعته، والملوك عبيداً بمعصيته۔“ (تفسیر القرآن العظیم۔ المجلد الثانی ص ۶۹-۷۰ طبع بیروت)

”افراتیم کے ہاں ”نون“ پیدا ہوئے جو حضرت یوشع کے والد ہیں اور رحمت نامی بیٹی پیدا ہوئی جو حضرت ایوبؑ کی بیوی ہیں۔ فضیل بن عیاض فرماتے ہیں کہ عزیز کی بیوی راستے میں کھڑی تھیں تو یوسفؑ کا ادھر سے گذر ہوا تو بے ساختہ اس کی زبان سے یہ نکل گیا کہ تمام تعریفیں اس ذات کو سزاوار ہیں جس نے اپنی فرمانبرداری کی وجہ سے غلاموں کو بادشاہی کے

منصب پر پہنچایا اور اپنی مافرمائی کی وجہ سے بادشاہوں کو غلامی کے درجے پر لانا مارا۔“
امام جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) سورہ یوسف آیت ۵۶: ”وَكُنْ لَّكَ مَكْنًا يُؤْتِيكَ فِي الْأَرْضِ...“ کے تحت فرماتے ہیں:

وقى القصة أن الملك توجه وختمه وولاه مكان العزيز وعزله، ومات بعد فوجه إمرأته زليخا، فوجدها عذراء وولدت له ولدین، (تفسیر جلالین ص ۲۳۱)
”حضرت یوسفؑ کو زمین پر اقتدار دینے کا واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ نے انہیں ”ناج“ پہنایا، (ان کی طرف متوجہ ہوا) انہیں مہر حکومت دی اور عزیر مصر کے بجائے انہیں والی حکومت بنایا اور پہلے عزیر کو معزول کر دیا جو اس معزولی کے کچھ عرصہ بعد مر گیا پس بادشاہ نے یوسفؑ کی شادی عزیر مصر کی عورت (بیوہ) زلیخا سے کر دی تو یوسفؑ نے زلیخا کو جوان اور کنواری پایا پھر اس عورت نے ان کے لئے دو بیٹے جنم دیئے۔“

نجانے امام سیوطی یا ان کے شیوخ کو ”زلیخا“ کے ”کنواری“ ہونے کی اطلاع کس نے دی؟ حضرت یوسف علیہ السلام تو ایک عظیم المرتبت شخصیت ہیں۔ اس موقع پر اپنی بیوی کا یہ ”راز“ شاید روایت کے مقلدین بھی افشاء نہ کر سکیں۔

علامہ آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) نے بھی یہ سارا واقعہ نقل کیا ہے البتہ انہوں نے عزیر مصر کا نام یطغیر کے بجائے ”قطغیر“ لکھا ہے۔ قطغیر کے فوت ہونے کے بعد فوری طور پر بادشاہ نے اس کی بیوہ راہیل کے ساتھ یوسفؑ کا نکاح کر دیا۔ اس کی وجہ حاشیہ میں یہ لکھی گئی ہے کہ: ”وكان ذلك على الفور بناء على أنه لم تكن العلة من دينهم۔“

”قطغیر کے فوت ہونے کے بعد فوری طور پر اس نکاح کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں عدت کا تصور نہیں تھا۔“ موصوف نے دوسری روایت یہ لکھی ہے کہ: ”فتزوجها فوجدها بكرًا وكان زوجها عنيًا“ ”پس بادشاہ نے اس کا نکاح کر دیا پس یوسفؑ نے اسے کنواری پایا اور اس کا سابق شوہر نامرد تھا۔“

علامہ آلوسی نکاح سے متعلق روایات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”وَشَاعَ عِنْدَ الْقَصَاصِ أَنَّهَا عَادَتْ شَابَةً بَكَرًا إِكْرَامًا لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بَعْدَ مَا كَانَتْ ثِيْبًا غَيْرَ شَابَةٍ۔ وَهَذَا مِمَّا لَا أَصْلَ لَهُ وَخَبَرُ تَزْوِجِهَا أَيْضًا مِمَّا لَا يَعُولُ عَلَيْهِ عِنْدَ الْمُحَدِّثِينَ.....“ (روح المعانی الجزء الثالث عشر ص ۴-۵)

”داستان کو لوگوں کے ہاں مشہور ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اکرام کی خاطر بیوہ عزیز کو دوبارہ جوانی لوٹائی گئی اور یہ ان باتوں میں سے ہے جن کی کوئی اصل نہیں۔ اسی طرح بیوہ عزیز سے حضرت یوسف علیہ السلام کے نکاح کی بات بھی بے اصل ہے جس پر محدثین اعتقاد نہیں کرتے۔“

داستان کو حضرات نے زوجہ عزیز کا نام ”زلیخا“ لکھا ہے جو بجائے خود کل نظر ہے پھر اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح بھی ثابت نہیں ہے۔ قاضی سلمان منصور پوری لکھتے ہیں کہ: (یوسف علیہ السلام نے) ۱۱۰ سال کی عمر میں وفات پائی، پوتے اور پر پوتے دیکھے۔ ان کی شادی ملک مصر کے شہر ”اون“ کے کاہن کی دختر مسماۃ ”آسناتھ“ کے ساتھ ہوئی۔ ان کے ہر دو فرزند منسی و فراتیم اسی خاتون کے ہیں“ (سیرت رحمت للعالمین جلد ۳ ص ۱۰۷) علامہ شبیر احمد عثمانی زیر بحث آیت (یوسف ۵۶) کے تحت لکھتے ہیں کہ:

گویا ریان بن ولید برائے نام بادشاہ تھا حقیقت میں یوسف علیہ السلام بادشاہی کر رہے تھے اور ”عزیز“ کہہ کر پکارے جاتے تھے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ بادشاہ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔ نیز اسی زمانہ میں عزیز مصر کا انتقال ہوا تو اس کی عورت زلیخا نے آپ سے شادی کر لی۔ واللہ اعلم۔ محدثین اس پر اعتقاد نہیں کرتے۔ (فوائد عثمانی تحت لآیۃ حاشیہ نمبر ۵)

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (م ۱۳۹۶ھ) اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: ”بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اسی زمانہ میں زلیخا کے شوہر قطفیر کا انتقال ہو گیا تو شاہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کی شادی کر دی اس وقت یوسف علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ کیا یہ صورت اس سے بہتر نہیں ہے جو تم چاہتی تھیں۔ زلیخا نے اعتراف قصور کے ساتھ اپنا عذر بیان کیا۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے بڑی عزت و شان کے ساتھ ان کی مراد

پوری فرمائی اور عیش و نشاط کے ساتھ زندگی گزری۔ تاریخی روایات کے مطابق دو لڑکے بھی پیدا ہوئے جن کا نام افراتیم اور منشا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شادی کے بعد یوسف علیہ السلام کے دل میں زلیخا کی محبت اس سے زیادہ پیدا کر دی جتنی زلیخا کو یوسف علیہ السلام سے تھی۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ یوسف علیہ السلام نے ان سے شکایت کی کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تم مجھ سے اب اتنی محبت نہیں رکھتی جتنی پہلے تھی۔ زلیخا نے عرض کیا کہ آپ کے وسیلہ سے مجھے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہو گئی ہے اس کے سامنے سب تعلقات اور خیالات معطل ہو گئے۔ یہ واقعہ بعض دوسری تفصیلات کے ساتھ تفسیر قرطبی اور مظہری میں بیان ہوا ہے۔“ (معارف القرآن جلد پنجم ص ۸۹۔ مطبوعہ ادارہ المعارف کراچی)

حضرت موصوف کا بیان فرمودہ مذکورہ سارا واقعہ ہی از اول تا آخر بالکل باطل اور من گھڑت معلوم ہوتا ہے۔ کاش! موصوف اس واقعہ کو اس انداز میں اپنی تفسیر میں جگہ نہ دیتے۔ یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ”شب زفاف“ کے موقع پر اس سے فرمایا کہ: ”کیا یہ صورت اس سے بہتر نہیں ہے...“ ظاہر ہے کہ یہ قول حضرت یوسف علیہ السلام کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیا وہ اس بات سے بے خبر و لاعلم تھے کہ اس عورت کے عزیز مصر کے نکاح میں ہونے کی حالت میں ”یہ بہتر صورت“ پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی؟ کیا انہوں نے اس وقت ”اس بہتر صورت“ کے لئے کوئی تجویز پیش کی تھی؟ کیا وہ عزیز مصر اور زوجہ عزیز کو طلاق دینے یا لینے کا مشورہ دے سکتے تھے؟

تعب بالائے تعجب یہ کہ جس ”واقعہ“ کی سرے سے کوئی حقیقت و اصلیت ہی نہیں ہے اور جس ”واقعہ“ کو محقق مفسرین و محدثین نے ناقابل اعتنا ٹھہرایا ہے ”و خبر تزوجھا“ ایضاً (لا أصل له و) مما لا یعول علیہ عند المحدثین“ (روح المعانی جلد ۱۳ ص ۵۔ تفسیر عثمانی تحت سورہ یوسف آیت ۵۶) مگر حضرت مفتی صاحب اس بے اصل واقعہ کو کس قدر تیقن کے ساتھ پیش فرما رہے ہیں کہ: ”اللہ تعالیٰ جل شانہ نے بڑی عزت و شان کے ساتھ ان کی مراد پوری فرمائی اور عیش و نشاط کے ساتھ زندگی گزاری۔“

علاوہ ازیں مفتی صاحب کا یہ فرمانا بھی محل نظر ہے کہ: ”اللہ تعالیٰ نے شادی کے بعد یوسف علیہ السلام کے دل میں زلیخا کی محبت اس سے زیادہ پیدا کر دی جتنی زلیخا کو یوسف علیہ السلام سے تھی، یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے شکایت کی کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تم مجھ سے اب اتنی محبت نہیں رکھتیں جتنی پہلے تھی“

اس عبارت میں حضرت یوسف علیہ السلام کو زلیخا سے زیادہ ”مشتاق“ اور ”بے تاب“ ثابت کیا گیا ہے، کیونکہ بقول حضرت مفتی صاحب ”اللہ تعالیٰ نے بڑی عزت اور شان کے ساتھ ان کی مراد پوری فرمائی“ اور پھر ان کی محبت بھی اس عورت کی نسبت زیادہ بڑھادی یہاں تک کہ یوسف علیہ السلام کو ”زلیخا سے اس بات پر شکوہ بھی کرنا پڑا“۔ ”محبت“ کا یہ تقابل بجائے خود ایک ستم ہے کیونکہ قرآن میں زلیخا کی ”محبت“ کو زمان مصر کے حوالے سے ”قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا“ (یوسف ۳۰) (یقیناً یوسف کی محبت اس کے دل میں بیٹھ گئی ہے) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شادی کے بعد جب حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت اس کی ”محبت“ سے بھی بڑھ گئی تو کیا اس سے حضرت یوسف علیہ السلام پر حرف نہیں آئے گا؟

پھر حضرت مفتی صاحب نے اس ”ستم“ پر ایک ستم یہ بھی ڈھایا کہ دونوں کی محبت (قطع نظر کم و بیش) کو ”محبت“ ہی قرار دیا جبکہ زلیخا کی محبت کو محبت قرار دینا خود ”محبت“ کی توہین ہے کیونکہ جس قسم کی محبت کا اظہار اس نے کیا تھا اس پر ”محبت“ کی تعریف صادق ہی نہیں آتی۔ وہ عشق (جو جنون کی ایک قسم ہے) کی آخری حد بھی کر اس کر گئی تھی۔ اس سلسلے میں زمان مصر کی کوای ملاحظہ فرمائیں: ”وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ“ (سورہ یوسف ۳۰)

”اور شہر کی عورتوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے جواں مرد غلام (یوسف) کو اس کی مرضی کے خلاف پھسلاتی ہے۔ اس کے دل میں بیٹھ گئی ہے اس کی محبت۔ بے شک ہم تو اس (زوجہ عزیز) کو صریح خطا پر پاتی ہیں۔“

زوجہ عزیز کی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ اس ”محبت“ کی حقیقت کو زمان مصر

بھی پہلے ”تُرَاوِدُ فَتَاهَا“ (یعنی دیوانگی و فریفتگی) کے الفاظ سے تعبیر کر کے اس کی اصل حقیقت ظاہر کر رہی ہیں پھر ”قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا“ کہہ کر اس میں مبتلا دکھا رہی ہیں۔ مگر حضرت مفتی صاحب زوجہ عزیز کی اس دیوانگی و فریفتگی اور سخت جنون کو ”محبت“ کا نام دے کر اور اسے بنیاد بنا کر شادی کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت کو اس سے زیادہ ثابت فرما رہے ہیں۔ کیا وہ بھی اسی قسم کی ”محبت“ تھی؟ العیاذ باللہ۔

اسی عبارت میں حضرت مفتی صاحب نے ایک کمزور بات یہ بھی فرمائی ہے کہ: ”یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے شکایت کی کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تم مجھ سے اتنی محبت نہیں رکھتیں جتنی پہلے تھی“ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام پہلی ”محبت“ کی طرح محبت میں کمی دیکھ کر خود اس سے شکایت فرما رہے ہیں کہ مجھ سے پہلی محبت کی طرح اتنی ہی محبت اب کیوں نہیں ہے؟ کیا حضرت یوسف علیہ السلام اس ”جھمی“ یا اتنی ہی ”محبت“ کی شکایت فرما سکتے تھے؟

کیا یوسف علیہ السلام کو اس کی وہ محبت یاد نہیں تھی جب اس نے گھر کے دروازے پر اپنے خادم سے کہا تھا کہ: ”فَاخْرُجْ مِنْ أَرَاكِ بِكُلِّكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ“ کیا یوسف علیہ السلام اپنی طویل قید بھول گئے تھے جو اس عورت کی ”محبت“ کی وجہ سے ہی پیش آئی تھی؟ حضرت مفتی صاحب نے اس عورت کا جو جواب نقل کیا ہے اس سے تو اس عورت کو حضرت یوسف علیہ السلام پر ایک کونہ برتری حاصل ہو رہی ہے:

”زلیخا نے عرض کیا کہ آپ کے وسیلہ سے مجھے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہو گئی، اس کے سامنے سب تعلقات اور خیالات معطل ہو گئے“

اگر جس نبی کے وسیلے سے ایک عام عورت کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا یہ اثر پیدا ہوا کہ اس کی وجہ سے سب تعلقات اور خیالات معطل ہو گئے تو پھر خود نبی کے دل میں اللہ کی محبت کا کس قدر اثر ہوگا؟ کیا اللہ کی محبت سے اپنی امت کی نسبت سب سے زیادہ مرثا ربی اس طرح کا کوئی حرف شکایت زبان پر لاسکتا ہے؟ اس کے تصور سے بھی روٹ گئے کھڑے

ہو جاتے ہیں۔ لیکن مفتی صاحب کے منقولہ جواب سے زلیخا کی اس معاملے میں حضرت یوسف علیہ السلام پر ایک کوندہ برتری ”ثابت“ ہو رہی ہے۔ فیا اسفا۔

صحیح بات یہ ہے کہ ”زلیخا“ کا حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ نکاح ہوا ہی نہیں تھا۔ ”متن“ کا نمبر تو بعد میں آتا ہے پہلے مرحلے میں ہی اس روایت کی سند دیکھ کر اس کے جھوٹے ہونے کا یقین ہو جاتا ہے امام طبری اسے اپنے شیخ ”ابن عساکر“ سے وہ اسے ”سلمہ“ سے اور وہ ”ابن اسحاق“ سے روایت کرتے ہیں۔

امام طبری (م ۳۱۰ھ) سے ابن اسحاق (م ۱۵۱ھ) تک ”روایۃ“ کی یہ ساری لڑی و کڑی ہی ”سلسلۃ الکذب“ ہے۔ زیر نظر کتاب کا تو نام ہی ”امام طبری کون؟ مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز“ ہے جس میں ان کا یہ ”کارنامہ یا خدمت“ تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے کہ وہ جھوٹی روایات نقل کرنے اور وضع کرنے میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ جبکہ زیر بحث قصہ (یعنی نکاح زلیخا مع یوسف) نے تو موصوف کے ”افسانہ ساز“ ہونے پر بھی ہر تقدیر ثابت کر دی ہے۔

ان کے بعد اگلا راوی امام طبری کا استاذ اور شیخ ابن حمید ہے اس کے متعلق امام جوزجانی فرماتے ہیں: ”کان ردی المنہب غیر ثقہ“ (احوال الرجال تحت ترجمہ ۲۸)

یہ بد مذہب اور ناقابل اعتماد و استناد ہے۔

محدث اسحاق بن منصور (م ۲۵۱ھ) فرماتے ہیں کہ: ”میں اللہ تعالیٰ کے سامنے گواہی دوں گا کہ محمد بن حمید جھوٹا تھا“ (تہذیب الکمال جلد ۲۵ ص ۱۰۳)

یعقوب ابن شیبہ فرماتے ہیں کہ: ”یہ کثرت سے منکر روایتیں بیان کرتا ہے، امام ابو زرعد فرماتے ہیں: ”جھوٹا ہے، امام ابن خراش فرماتے ہیں: ”ہم سے محمد بن حمید نے حدیث بیان کی اور اللہ کی قسم! وہ جھوٹ بولتا تھا اور بہت سے علماء سے منقول ہے کہ ابن حمید احادیث چوری کرتا تھا، امام نسائی فرماتے ہیں: ”ثقہ نہیں“ اور امام صالح جزرہ فرماتے ہیں: ”میں نے جھوٹ بولنے میں ابن حمید سے بڑھ کر کوئی تجربہ کار نہیں دیکھا“ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۵۳۰)

امام ابن حبان (م ۳۵۴ھ) فرماتے ہیں: ”ابن حمید ثقہ راویوں کے نام لے کر مقلوب

روایات بیان کرنے میں منفرد ہوتا ہے خصوصاً جب اپنے گاؤں کے اساتذہ سے روایت لیتا ہے“ (کان ممن ینفرد عن الثقات بالأشیاء المقلوبات ولا سیما إذا حدث عن

شیوخ بلدہ“ (المجروحین من المحللین جلد ۲ ص ۳۲۱۔ ترجمہ ۱۰۰۵)

ابن حمید کے بعد اگلا راوی جناب ”سلمہ“ ہیں۔ یہ ”سلمہ بن فضل امش“ ہیں جو ”رے“ کے قاضی رہے ہیں۔ امام بخاری (م ۲۵۶ھ) فرماتے ہیں: ان کے پاس منکر احادیث ہیں (عندہ مناکیر)۔

امام علی بن المدینی فرماتے ہیں: ”زمینا بحلیثہ قبل أن نخرج من الری“ ہم نے ”ری“ سے نکلنے سے پہلے ہی ان کی احادیث پھینک دی تھیں۔ امام ابن معین نے ان کے تھنچ کی بھی تصریح فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو: میزان الاعتدال الجزء الثانی ص ۱۹۲، تاریخ الکبیر الجزء الرابع ص ۸۲۔

حافظ ابن عدی فرماتے ہیں: ”فی حدیثہ بعض المناکیر... ولہ افرادات و غرائب“ سلمہ کی احادیث منکر، افرادات اور غرائب ہوتی ہیں۔ (الکامل فی ضعفاء الرجال۔ الجزء الرابع ص ۳۶۹)

زیر بحث روایت کے آخری راوی جناب محمد بن اسحاق (م ۱۵۱ھ) ہیں۔ اکثر محدثین نے انہیں مجروح قرار دیا ہے کہ یہ بزرگ ”مدلس اور شیعہ تھے“، ہشام بن عروہ بن زبیرؓ نے ان کی تکذیب کی ہے۔ امام یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں ”میں نے اللہ کے لئے ان سے روایت لینا ترک کر دیا ہے“ (الکامل فی ضعفاء الرجال۔ الجزء السابع ص ۲۵۶)

امام جوزجانی لکھتے ہیں کہ: لوگ اس کی روایات پر فریفتہ ہیں حالانکہ یہ کئی قسم کی بدعات سے متہم تھا۔ (احوال الرجال ص ۱۳۲۔ ترجمہ ۲۳۰) امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدر نے محمد بن اسحاق پر خوب جرح کرتے ہوئے اسے ”دجال من الدجاجلة“ تک قرار دیا ہے (احسن الکلام جلد ۲ ص ۷۸-۷۹)

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ: ”امام مالک ان کے سخت مخالف ہیں... علامہ ذہبی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق یہود و نصاریٰ سے روایت کرتے تھے اور ان کو ثقہ سمجھتے تھے۔ ۱۵۱ھ میں وفات پائی۔“ (سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ جلد اول ص ۵۱)

اس تفصیل سے واضح ہو گیا ہے کہ امام طبری و امثالہ بیوہ عزیز کا نکاح حضرت یوسف علیہ

السلام کے ساتھ جس روایت سے کر رہے ہیں اس کی سند ”سلسلۃ الکذب“ میں شمار ہوتی ہے پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس روایت کے آخری راوی محمد بن اسحاق جو اہل اہل میں فوت ہوئے تھے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ۲۴۰۰ سال پہلے گزرنے والے پیغمبر حضرت یوسف علیہ السلام کی ”شب زفاف، ان کی باہمی محبت اور اولاد“ کی تفصیل دے رہے ہیں۔

زیر بحث روایت کی ”سند“ کے تجزیہ کے بعد اب اس کا ”دراپتی“ جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

اس روایت کے متن میں بھی کافی تضاد پایا جاتا ہے:

کہا جاتا ہے کہ لطفیر کے ہلاک ہونے کے بعد بادشاہ نے فوری طور پر اس کی شادی حضرت یوسف علیہ السلام سے کر دی کیونکہ اس وقت ”عزیز“ کا لقب ان کو مل گیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ”منصب“ پر اگرچہ ایک عزیز کی جگہ دوسرا عزیز فائز ہو گیا مگر ”زلیخا“ کی حالت میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی وہ بدستور اور حسب سابق ”عزیز“ ہی کی بیوی رہیں بس لطفیر عزیز کے بجائے یوسف عزیز ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات نے ”فی الفور“ شادی کا انتظام کر دیا اور ”عدت“ کے حوالے سے ایک بات یہ کہی کہ ان کے مذہب میں یہ قانون الا کوئیں تھا اور دوسرا جواز یہ پیش کیا کہ پہلا ”عزیز“ نامزد تھا ”فوجلدھا بکراً“ و کان زوجھا عیننا“ (روح المعانی) یوسف علیہ السلام نے ”زلیخا کو باکرہ پایا کیونکہ ان کا خاوند شادی کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود اس کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم کرنے میں ناکام رہا۔ اور بعض نے یہ ”شکوہ“ چھوڑا کہ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے اکرام کی خاطر ادھیڑ عمر ”زلیخا“ کو ”شیبہ“ ہونے کے باوجود اس کی جوانی لوٹا کر اسے ”باکرہ“ بنا دیا (جبکہ سید الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس ”اعزاز“ سے محروم ہی رہے)

امام طبری اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے تو ”شب زفاف“ کے موقع پر ”رازدارانہ“ گفتگو سے پردہ ہٹاتے ہوئے یہ ”انکشاف“ کر دیا کہ جب یوسف علیہ السلام نے زلیخا کو اس کا ماضی یاد دلاتے ہوئے (جس کا نقشہ امام طبری ”وَعَمَّ بَهَا“ کے تحت کھینچ چکے ہیں) کہا کہ:

”الیس هذا خیراً مما كنت تریدین؟ ... قالت ایھا الصلیق، لا تلمنی فانی

كنت امرأة كما ترى حسنا وجمالاً ناعمة في ملك و دنيا، و كان صاحبی لا يأتي النساء و كنت كما جعلك الله في حسنك و هيبتك، فغلبتني نفسي على ما رأيت۔ فیزعمون أنه وجدها علراء، فأصابها، فولدت له رجلين أفرائیم بن یوسف و میشا بن یوسف“ (تفسیر الطبری سورة یوسف آیت ۵۶ تحت رقم ۱۵۴۵۹۔ طبع بیروت)

”کیا یہ صورت اس سے بہتر نہیں ہے جو تم چاہتی تھیں؟ اس نے کہا: اے صدیق! مجھے ملامت نہ کیجئے، آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں حسن و خوبصورتی والی دھن، دولت والی عورت تھی جبکہ میرے شوہر کو نامرد ہونے کی بناء پر عورتوں کی طرف کوئی رغبت ہی نہیں تھی۔ دوسری طرف قدرت نے آپ کو جس فیاضی کے ساتھ دولت حسن سے مالا مال کیا ہے، وہ بھی خوب ظاہر ہے پس میرے نفس نے اس وقت مجھ پر غلبہ کیا جسے آپ مشاہدہ کر چکے ہیں۔“

امام طبری اور ان کے شیوخ کا خیال ہے (فیزعمون...) کہ یوسف نے اسے دوشیزہ اور باکرہ پایا۔ پھر یوسف اس کے پاس گئے تو اس کے ہاں دو آدمی (رَجُلَانِ) افرائیم و میشا پیدا ہوئے۔

اس سے پہلے امام طبری حضرت یوسف علیہ السلام کی ”خیانت“ (آیت ۵۲ کے تحت) کو جبرئیل امین کی گواہی سے ”ثابت“ کر چکے ہیں لیکن یہاں انہیں جب کوئی ”بشر و ملک“ بطور کاہنہ دستیاب نہیں ہوا تو انہوں نے ”فیزعمون“ کے صیغے سے ”زلیخا“ کا نکاح اور باکرہ پن ثابت کر دیا کہ صدیوں سے لوگ یہی کہتے چلے آ رہے ہیں۔ پھر امام طبری (م ۳۱۰ھ) کی وساطت سے صدیوں بعد بھی عام لوگ ہی نہیں بلکہ بعض مفسرین بھی اسی خیال کا اظہار کر رہے ہیں۔ سخت تعجب ہے کہ اس روایت کے ناقلین ”یزعمون“ کے لفظ پر بھی غور نہ کر سکے جبکہ ”زعم“ کا لفظ زیادہ تر جھوٹ اور بے پروا قصوں کے لئے ہی استعمال ہوتا ہے کہ یہ غیر ذمہ دار لوگوں کا شیوہ ہے۔ پہلے ان حضرات نے ”لوگوں“ کی زبانی عزیز اول کو ”نامرد“ بنایا پھر خود اس کی بیوی کی گواہی ”و کان صاحبی لا يأتي النساء“ سے اس بات کی تصدیق کرا دی جس کی بیچ سے ”عدت“ گزرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی پھر مزید ثبوت کے طور پر اس کے ہاں ”و آدمیوں“ کی ولادت بھی ظاہر کر دی۔ اس طرح بقول حضرت مفتی محمد شفیع صاحب:

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

”اللہ تعالیٰ جل شانہ نے بڑی عزت و شان کے ساتھ ان کی مراد پوری فرمائی اور عیش و نشاط کے ساتھ زندگی گزاری۔ تاریخی روایات کے مطابق دو لڑکے بھی پیدا ہوئے جن کا نام افرامیم اور نشا تھا“ (معارف القرآن جلد ۵ ص ۸۹)

معلوم نہیں اس ”مراد“ سے کس کی مراد، مراد ہے: زلیخا کی یا حضرت یوسف علیہ السلام کی۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی مراد کو ”اللہ تعالیٰ جل شانہ نے بڑی عزت و شان کے ساتھ“ پورا فرما دیا۔

قرآن کریم نے ایک عام اصول بتایا ہے کہ: ”الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ، وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ...“ (سورۃ النور آیت ۲۶)

”ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے ہیں اور پاک (دامن) عورتیں پاک (دامن) مردوں کے لئے اور پاک (دامن) مرد پاک (دامن) عورتوں کے لئے ہیں۔ یہ مبرا ہیں ان (تہمتوں) سے جو وہ (ناپاک) لگاتے ہیں۔ ان کے لئے ہی (اللہ کی) بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے۔“

جب عام پاک دامن مردوں کے لئے یہ اصول ہے تو پھر کسی نبی یا رسول کے ساتھ کسی حیباختہ خاتون کا عقد نکاح کیوں کر ممکن ہے؟

قرآن کریم کی روشنی میں زبیحہ عزیز کی ”حیباختگی“ اور اس کا منوہ اخلاق ملاحظہ فرمائیں:

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْت لَكَ... وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ ۖ وَهَمَّ بِهَا... ”مما حَزَّاهُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسَجِّنَ لَوْ غَدَابَ إِلَيْكُمْ... فَلَمَّا رَأَى قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كِبْدٍ كُنْتُ ۖ إِنْ كُنْتُ كُنْتُ عَظِيمًا...“ واستغفرتي لذنبك إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ ۝ ”وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۖ إِنَّا نَنَازِعُهَا فِي صَلَاتِ مُبِينٍ ۝...“ وَلَقَدْ رَاوَدَتْهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ ۖ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَا امْرَأُهُ يُفْسِدْ لَكُمْ الْبُكُورَ مِنَ الصَّغِيرَاتِ...“ إِنَّا رَاوَدُّنَا عَنْ نَفْسِهِ...

”اور جس عورت کے گھر میں یوسف تھا اس نے خود اس (یوسف) سے اس کی مرضی

امام طبری۔۔۔ کون؟

تفسیر طبری اور توہین یوسف علیہ السلام

کے خلاف خواہش کی اور سب دروازے بند کر دیئے اور کہنے لگی لو آؤ جلد کرو... اور یقیناً اس ”زلیخا“ نے اس (یوسف) سے ارادہ کر ہی لیا تھا... (پھر زلیخا نے اپنے شوہر سے کہا: جو تیرے اہل (بیوی) سے بدکاری کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ قید کیا جائے یا دردناک عذاب دیا جائے... پس جب انہوں نے دیکھا کہ اس (یوسف) کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو (عزیز نے زلیخا سے) کہا: یقیناً یہ تمہارے چلتروں میں سے ہے۔ بے شک تم عورتوں کا چلتروں (مکر) بہت بڑا ہے... اور (زلیخا) تو اپنے گناہوں کی معافی مانگ۔ بے شک تو ہی خطا کاروں میں سے ہے... اور شہر کی عورتوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے جواں مرد غلام (یوسف) کو اس کی مرضی کے خلاف پھسلاتی ہے۔ یقیناً اس کی محبت اس کے دل میں بیٹھ گئی ہے۔ بے شک ہم تو اس (زلیخا) کو صریح خطا پر پاتی ہیں۔ (زلیخا نے کہا: بے شک میں نے خود اسے اس کی مرضی کے خلاف پھسلانا چاہا۔ مگر وہ معصوم ثابت ہوا۔ اور اگر اس نے وہ فعل نہ کیا جس کا میں اسے حکم دیتی ہوں تو یہ ضرور قید کیا جائے گا اور ذلیل بھی ہو جائے گا۔ میں نے ہی اسے اس کی مرضی کے خلاف پھسلانا چاہا...)

قرآن کریم کی مذکورہ گواہی کے بعد زلیخا کے کردار سے متعلق اس نکاح کے ”مبلغ“، جناب امام طبری کی اپنی گواہی ملاحظہ فرمائیں:

”يا يوسف، ما أحسن شعرك، ما أحسن وجهك، حتى أطمعته، قد خلا البيت و غلقت الأبواب، حتى خلوا في بعض بيوته، و قالت هيت لك، أكتبت عليه و تدعوه إلى لذة من حاجة الرجال في جمالها و حسنها، تطعمه مرة و تخفيه أخرى، استلقت له، استلقت على قفاها...“ (تفسير الطبري جلد ۷ ص ۱۸۱-۱۸۲)

زلیخا نے کہا آپ (یوسف) کے بال کتنے ہی خوبصورت ہیں، آپ کا چہرہ کس قدر حسین ہے، پھر انہیں برابر لالچ اور ترغیب دیتی رہی، پھر وہ دونوں گھر میں داخل ہو گئے، زلیخا نے خود ہی گھر کے تمام دروازے بند کر دیئے، پھر وہ خلوت گاہ میں تنہا ہو گئے، زلیخا نے کہا: آ بھی جاؤ، جلدی خواہش پوری کرو۔ (علامہ آلوسی نے کہا: ”تصلت هنالك الأفعال اخر من بسط

يَلْهَى إِلَيْهِ وَقَصْدَ الْمَعَانِقَةِ وَغَيْرِ ذَلِكَ“ یہاں زلیخا سے بعض دوسرے افعال بھی صادر ہوئے، اس نے یوسفؑ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور معانقہ کرنا چاہا۔ (روح المعانی جلد ۱۲ ص ۲۱۳)

امام طبری مزید فرماتے ہیں کہ: زلیخا یوسفؑ پر جھک گئی اور اپنی خوبصورتی اور حسن کی وجہ سے اس لذت کی طرف دعوت دینے لگی جو ایک جوان مرد کی ضرورت اور خواہش ہوتی ہے۔ زلیخا کبھی انہیں لالچ و ترغیب دیتی اور کبھی خوف دلاتی حتیٰ کہ وہ ان کے سامنے پیٹھ کے بل بالکل سیدھی و چت لیٹ گئی۔

کیا اس کردار کی حامل خاتون ”الطیبات“ میں شامل ہو سکتی ہے؟ کیا ایسی خاتون کا کسی عام ”طیب“ سے بھی نکاح ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی مفسر، محدث، فقیہ، پیر طریقت ایسی حیاباختہ خاتون کے ساتھ نکاح و شادی کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے؟

یقیناً مذکورہ سوالات کا جواب صرف نفی میں ہی ممکن ہے۔ تو پھر کیا زلیخا جیسی حیاباختہ عورت کے ساتھ نکاح کے لئے ایک یوسف علیہ السلام ہی رہ گئے ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق صرف ”طیب“ ہی نہیں بلکہ:

”الکریم ابن الکریم، ابن الکریم، ابن الکریم یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام...“

اکرم الناس یوسف نبی اللہ، ابن نبی اللہ، ابن نبی اللہ ابن خلیل اللہ علیہم السلام ہیں۔“ (صحیح بخاری رقم الحدیث ۳۳۸۲، ۳۳۸۳، ۳۳۹۰، ۳۶۸۸)

مذکورہ تفصیل سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی ہے کہ زلیخا نامی عورت کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح نہیں ہوا تھا اور نہ ہی زوجہ عزیز کا نام ”زلیخا“ تھا۔ نیز اس نکاح سے متعلق امام طبری و امثالہ کی روایت عقلاً و نقلاً، سنداً و متناً، روایتاً و درایتاً ہر اعتبار سے لغو، موضوع، باطل منافی عقیدہ عصمت انبیاء اور تہیٰ برتوہین ہے۔ واللہ اعلم

تفسیر طبری اور توہین حضرت داؤد علیہ السلام

”تَهْلُ أَتَاكَ نَبُؤًا الْخَصْمُ إِذْ تَمَسُّوْا الْمِخْرَابَ“ (ص ۲۱)

اور کیا آئی ہے آپ کے پاس خبر فریقان مقدمہ (جھگڑنے والوں) کی۔ جب انہوں نے دیوار پھاندی عبادت گاہ کی۔

جب کسی واقعہ کی اہمیت پر مخاطب کو متوجہ کرنا ہوتا ہے تو اس کا آغاز اس قسم کے استفہام سے کیا جاتا ہے تاکہ سننے والا ہمہ تن گوش ہو کر اس واقعہ کو سننے اور اس سے عبرت حاصل کرے۔ یعنی کیا آپ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی ہے کہ جب مدعی اور مدعا علیہ دونوں فریق دیوار پھاند کر حضرت داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ میں اچانک آدھمکے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا معمول تھا کہ وہ ایک روز حکومت کے کاروبار کو انجام دیتے، مقدمات کا فیصلہ کرتے، ایک روز اپنے گھر کے فرائض انجام دیتے۔ تیسرا دن انہوں نے صرف عبادت کے لئے مخصوص کیا ہوا تھا اور اس دن اپنی عبادت گاہ پر پاسبان مقرر کر دیتے تاکہ لوگ ان کی عبادت میں خلل نہ ہوں۔ اس روز کسی کو اندر آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ایک دفعہ وہ عبادت میں مصروف تھے ایسے وقت میں ان فریقان مقدمہ کا دیوار پھاند کر اجازت طلب کئے بغیر اندر گھس آنا بڑا حیرت انگیز واقعہ تھا اس لئے انہیں گھبراہٹ سی لاحق ہوئی، وہ بھی اس چیز کو بھانپ گئے اور کہنے لگے ڈریئے نہیں، ہم تو دو فریق ہیں اور اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرانے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ آپ ازراہ نوازش، حق و انصاف کے ساتھ ہمارا فیصلہ فرما دیجئے اور ہم میں سے کسی پر بھی ظلم و زیادتی نہ ہو۔ جو فریق بھی ظلم و زیادتی کے راستے پر گامزن ہے اسے عدل و انصاف کی سیدھی راہ پر چلنے کی ہدایت فرما دیجئے۔۔۔

زیر بحث اور مابعد آیات میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک ”ابتلاء“ کا ذکر ہے جو

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین حضرت داؤد علیہ السلام

من جانب اللہ انہیں پیش آیا جسے وہ شروع میں نہ سمجھ سکے مگر جلد ہی اسی پر متنبہ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور استغفار کیا جو بارگاہ الہی میں قبول ہو کر ان کی عظمتِ شان اور تقرب الی اللہ کا باعث بنا۔

معاملہ صرف اسی قدر تھا لیکن بعض مفسرین نے جب یہ دیکھا کہ قرآن عزیم نے حضرت داؤد علیہ السلام کے امتحان کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی اور توہرات اور ”اسرائیلی روایات میں“ ”اوریاہ“ کی بیوی کی ایک داستان موجود ہے جس میں حضرت داؤد علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا بھی ذکر ہے تو انہوں نے بلا تامل اس ”خرافاتی داستان“ کو زیر بحث آیت کی تفسیر بنا کر، آزمائش، استغفار اور قبول استغفار کو اس کے ساتھ چسپاں کر دیا۔

یہاں زیر بحث آیت کی تفسیر یا آزمائش و ابتلاء اور مقدمہ کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اصل مقصد اسی ”اسرائیلی“ داستان سے قارئین کو آگاہ کرنا ہے جسے بعض مفسرین نے بالکل غیر ضروری اور غلط طور پر اس آیت کی تفسیر بنا دیا ہے۔ لہذا پہلے وہ ”اسرائیلی روایت“ ملاحظہ فرمائیں:

”اور شام کے وقت داؤد اپنے پٹنگ پر سے اٹھ کر بادشاہی محل کی چھت پر ٹپلنے لگا اور چھت پر سے اس نے ایک عورت کو دیکھا جو نہار نہی تھی اور وہ عورت نہایت خوبصورت تھی۔ تب داؤد نے لوگ بھیج کر اس عورت کا حال دریافت کیا اور کسی نے کہا: کیا وہ العام کی بیٹی بنت سبغ نہیں جو تھی اوریاہ کی بیوی ہے؟ اور داؤد نے لوگ بھیج کر اسے بلا لیا۔ وہ اس کے پاس آئی اور اس نے اس سے صحبت کی (کیونکہ وہ اپنی ناپاکی سے پاک ہو چکی تھی) پھر اپنے گھر کو چلی گئی اور وہ عورت حاملہ ہو گئی۔ سو اس نے داؤد کے پاس خبر بھیجی کہ میں حاملہ ہوں۔۔۔

صبح کو داؤد نے ”یوآب“ کے لئے ایک خط لکھا اور اسے اوریاہ کے ہاتھ بھیجا اور اس نے خط میں یہ لکھا کہ اوریاہ کو گھمسان میں سب سے آگے رکھنا اور تم اس کے پاس سے ہٹ جانا تاکہ وہ مارا جائے۔۔۔

اور اس شہر کے لوگ نکلے اور ”یوآب“ سے لڑے اور وہاں داؤد کے خادموں میں سے

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین حضرت داؤد علیہ السلام

تھوڑے سے لوگ کام آئے اور تھی اوریاہ بھی مر گیا۔ تب ”یوآب“ نے آدمی بھیج کر جنگ کا سب حال داؤد کو بتا دیا۔۔۔

جب اوریاہ کی بیوی نے سنا کہ اس کا شوہر اوریاہ مر گیا تو وہ اپنے شوہر کے لئے ماتم کرنے لگی اور جب سوگ کے دن گزر گئے تو داؤد نے اسے بلوا کر اس کو اپنے محل میں رکھ لیا اور وہ اس کی بیوی ہو گئی اور اس سے اس کا ایک لڑکا ہوا۔ پر اس کام سے جسے داؤد نے کیا تھا، خداوند ناراض ہوا۔“ (سموئل (۲) باب ۱۱-آیات ۲-۲۷۔ بحوالہ قصص القرآن جلد دوم ۷۴۔ مؤلفہ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی)

اس داستان میں حضرت داؤد علیہ السلام کا جو اخلاقی نقشہ پیش کیا گیا ہے اس کے مطالعہ کے بعد ان کو نبی اور پیغمبر تو کچھ ایک صحیح اخلاق کا انسان بھی نہیں سمجھا جاسکتا۔ دوسرے کی بیوی پر نظر بد ڈالنا، اس سے ناجائز طور پر ملوث ہونا اور پھر سازش کر کے اس کے شوہر کو ناحق قتل کروانا انسانی زندگی کے وہ ناپاک اعمال ہیں جن کے لئے علم اخلاق کی زبان میں ”بدکاری“ سے کم کوئی دوسرا لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ سبحنک ہذا بہتان عظیم۔

مذکورہ ”اسرائیلی روایت“ کے بعد امام المفسرین ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید طبری ”سنی“ کی روایت ملاحظہ فرمائیں:

حلیثنا محمد بن الحسین، قال: ثنا أحمد بن المفضل، قال: ثنا أسباط، عن السدي، في قوله: ”هَلْ أَتَاكَ نَبُؤُا الْخُضُمِ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ“

قال: كان داود قد قسم الدهر ثلاثة أيام: يوم يقضي فيه بين الناس، ويوم يخلو فيه لعبادة ربه، ويوم يخلو فيه لنسائه و كان له تسع وتسعون امرأة، وكان فيما يقرأ من الكتب أنه كان يجد فيه فضل إبراهيم وإسحاق ويعقوب، فلما وجد ذلك فيما يقرأ من الكتب قال: يا رب إن الخير كله قد ذهب به أبائي الذين كانوا قبلي، فأعطني مثل أعطيتهم، وأفعل بي مثل ما فعلت بهم، قال: فأوحى الله إليه: إن آباءك ابتلوا ببلايا لم تبتل بها، ابتلى إبراهيم بنبح إبنه، وابتلى إسحق

یذہب بصره و ابتلی یعقوب بحزنه علی یوسف، انک لم تبتل من ذلک بشئ، قال: یا رب ابتلنی بمثل ما ابتلیتہم بہ، وأعطنی مثل ما أعطیتہم، قال: فأوحی الیہ: انک مبتلی فاحترس، قال: فمکت بعد ذلک ما شاء اللہ أن یمکت، اذ جاء الشیطان قد تمثل فی صورة حمامة من ذهب، حتی وقع عند رجلہ وهو قائم یصلی، فمد یدہ لیاخذہ، فتنحی فتبعہ، فتباعہ حتی وقع فی کوة، فذهب لیاخذہ، فطار من الکوة، فنظر ابن یقع، فبیعت فی أثرہ قال: فأبصر امرأة تغتسل علی سطح لہا، فرأى امرأة من أجمل الناس خلقاً، فحانت منها التفاتة فأبصرہ، فألقت شعرها فاستترت بہ، قال: فزادہ ذلک فیہا رغبة، قال: فسأل عنها، فأخبر أن لہا زوجاً، وأن زوجها غائب بمسلحة کذا و کذا، قال: فبعث إلی صاحب المسلحة أن یبعث "أمریبا" (أوریبا) إلی علو کذا و کذا، قال: فبعث إلی صاحب المسلحة أن یبعث "أمریبا" (أوریبا) إلی علو کذا و کذا، قال: فبعثہ، ففتح لہ۔ قال: وکتب إلیہ بثلک، بأساء، قال: فبعثہ ففتح لہ أيضاً۔ قال: فکتب إلی داؤد بثلک، قال فکتب إلیہ أن یمکن لہ علو کذا و کذا، فبعثہ فقتل المرأة الثالثة، قال: وتزوج امرأته۔ (تفسیر الطبری۔ المجلد العاشر ص ۵۷۱۔ طبع بیروت ۱۴۲۰ھ / ۱۹۹۹ء)

امام طبری ہر روایت سدی زیر بحث آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

”حضرت داؤد علیہ السلام نے تقسیم کار کے پیش نظر اپنے معمولات کو تین دنوں پر اس طرح تقسیم کر دیا تھا کہ ایک دن حکومتی امور انجام دینے اور لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے، ایک دن انہوں نے اپنے رب کی عبادت کے لئے اور ایک دن گھریلو امور انجام دینے کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔

ان کی ننانوے (۹۹) بیویاں تھیں۔ انہوں نے سابقہ کتب میں اپنے آباء حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے فضائل و مناقب پڑھ کر کہا: اے پروردگار! یہ تمام خوبیاں میرے آباء و اجداد جو مجھ سے پہلے گزرے ہیں وہ لے گئے ہیں۔ پس مجھے بھی وہ عطا کر جن سے آپ نے انہیں نوازا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ جن

آزمائشوں میں آپ کے آباء کو مبتلا کیا گیا ان سے آپ نہیں گزرے۔ ابراہیم کو بیٹے کے ذبح کرنے کے معاملے میں آزمایا گیا، اسحاق کو بشارت کے زائل ہونے پر اور یعقوب کو یوسف کے غم میں آزمائش کی گئی۔ آپ کو ان میں سے کسی چیز میں بھی نہیں آزمایا گیا۔ داؤد نے عرض کیا: اے پروردگار! مجھے بھی ان چیزوں میں مبتلا کر جن میں انہیں مبتلا کیا گیا تھا اور مجھے بھی وہ عطا کر جو آپ نے انہیں عطا کیا تھا۔ تو ان کی طرف وحی کی گئی کہ آپ بھی عنقریب آزمائش میں ڈالے جائیں گے، اس کے بعد تھوڑی ہی وقت گزرا کہ ان پر یہ آزمائش آئی کہ:

ان کے پاس شیطان ایک سونے کی کبوتری کی صورت میں آیا اور وہ کبوتری آپ کے پاؤں پر آ بیٹھی۔ حضرت داؤد اس وقت کھڑے نماز پڑھ رہے تھے تو انہوں نے اسے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا وہ وہاں سے اڑ گئی، انہوں نے پیچھا کیا تو وہ دور ہو گئی حتیٰ کہ منڈیر پر جا کر بیٹھ گئی۔ حضرت داؤد دیکھ کر اس کے قریب گئے تاکہ اسے پکڑ لیں لیکن وہ منڈیر سے بھی اڑ گئی۔ وہ منڈیر پر پہنچے تاکہ دیکھیں کہ چڑیا اڑ کر کدھر گئی۔ جب انہوں نے نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ ایک خوبصورت ترین عورت اپنے سانبان میں غسل کر رہی ہے۔ اس عورت نے بھی جب انہیں دیکھا تو اپنے بال جھٹک دینے اور اس کے لمبے لمبے بالوں نے اس کے جسم کو ڈھانک لیا تو اس جھٹک سے داؤد کے دل میں اس عورت کی رغبت بڑھ گئی۔ انہوں نے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی تو انہیں بتایا گیا کہ اس کا شوہر جہاد کے لئے گیا ہوا ہے۔ حضرت داؤد نے سپہ سالار فوج کو حکم دیا کہ ”اوریا“ کو اس طرح کے دشمن کی طرف بھیج دے تو اس نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اسے بھیج دیا تو وہ ہلاک ہونے کے بجائے فتح سے ہمکنار ہو گیا۔ سپہ سالار نے داؤد کو اس مہم سے آگاہ کیا تو انہوں نے جواباً ایک دوسری کٹھن مہم اور بڑے دشمن کی طرف بھیجنے کا حکم دیا جو پہلوں کی نسبت زیادہ طاقتور تھے چنانچہ سپہ سالار نے اسے ان کے مقابلے کے لئے بھیج دیا تو وہاں سے بھی وہ فاتح کی حیثیت میں لوٹا۔

سدی کہتے ہیں کہ سپہ سالار نے داؤد کو اس فتح سے آگاہ کیا تو انہوں نے جوابی خط لکھا کہ اب اسے ایسے ایسے دشمن کی طرف بھیج دیا جائے تو اس نے اسے بھیج دیا تو اس طرح تیسری مرتبہ وہ

امام طبری۔۔۔ کون؟ تفسیر طبری اور توہین حضرت داؤد علیہ السلام

قتل ہو گیا۔ راوی کہتا ہے کہ اس کے قتل ہو جانے کے بعد داؤد نے اس کی بیوہ سے شادی کر لی۔“

امام جلال الدین محلی (م ۸۶۴ھ) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”کان له تسع وتسعون امرأة، وطلب امرأة شخص لیس له غیرها و

نزوحها و دخل بها“ (تفسیر جلالین ص ۴۰۷)

”حضرت داؤد کی ننانوے (۹۹) بیویاں تھیں اس کے باوجود انہوں نے ایسے آدمی سے اس کی بیوی کا مطالبہ کر دیا جس کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسری بیوی نہیں تھی، حتیٰ کہ حضرت داؤد نے اس کے ساتھ نکاح کیا اور پھر مباشرت کی۔“

”تورات“ کی تحریف روایت میں حضرت داؤد علیہ السلام پر جو الزامات عائد کئے گئے تھے اور ان کا جو اخلاقی نقشہ پیش کیا گیا تھا معمولی فرق کے ساتھ (یعنی اوریا کی زندگی میں ہی اس عورت کے ساتھ صحبت کے علاوہ) امام التفسیر جناب طبری نے بھی عینہ وہی نقشہ پیش کیا ہے بلکہ اس میں تو یہ اضافہ بھی ملتا ہے کہ داؤد نے ایک چڑیا کو پکڑنے کی خاطر نماز جیسی عبادت کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ چڑیا تو ارگئی البتہ خوبصورت ترین عورت کو اپنے حرم میں داخل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

امام طبری نے ”اسرائیلی روایت“ ایک نئے ڈھنگ سے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے جو سراسر حضرت داؤد علیہ السلام کی توہین پر مبنی ہے۔ تفسیر طبری چونکہ ام التفسیر ہے اس لئے باقی غیر محتاط مفسرین نے بھی بلا نقد و جرح اسے آگے ”چلتا“ کر دیا ہے:

امام طبری کی تفسیری روایت کے برعکس قرآن کریم نے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول اور معصوم پیغمبر ہیں، اللہ کے خلیفہ اور بنی اسرائیل کے امیر و حکمران ہیں:

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَى بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا ۝ (الاسراء ۵۵)

اور بے شک ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی اور داؤد کو ہم نے زبور عطا کی تھی۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ ۖ نِعْمَ الْعَبْدُ ۚ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۝ (ص ۳۰)

امام طبری۔۔۔ کون؟ تفسیر طبری اور توہین حضرت داؤد علیہ السلام

اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا، داؤد دہترین بندہ تھا۔ یقیناً وہ (اللہ تعالیٰ کی طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا۔

وَسَلَّمْنَا لَهُ مُلْكًا وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَضَّلْنَا الْخِطَابَ ۝ (ص ۲۰)

اور ہم نے اس (داؤد) کی سلطنت کو مضبوط کیا اور حکمت سے نوازا اور حق و باطل کے فیصلہ کی قوت عطا فرمائی۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِنَّا فَضْلًا (سبا آیت ۱۰)

اور بلاشبہ ہم نے داؤد کو اپنی جانب سے فضیلت بخشی۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَ سُلَيْمَانَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي فَضَّلَنَا عَلَى كَثِيرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (النمل ۱۵)

اور یقیناً ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا اور دونوں نے کہا کہ ہر قسم کی حمد اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں اپنے مومن بندوں میں سے اکثر پر فضیلت دی۔

مذکورہ تمام آیات میں اللہ تعالیٰ نے کتب سابقہ کے ان خیالات کی تردید اور اصلاح فرمائی ہے جو ان کے پیروکاروں کی تحریف کی بدولت ان میں بطور معتقدات داخل ہو گئے ہیں۔ اس نے تاریخ کے اس تاریک پردہ کو چاک کر کے بتایا کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان بنی اسرائیل میں مقدس ہتیاں گزری ہیں وہ اس کے سچے نبی اور پیغمبر ہیں اور ہر قسم کے گناہ اور منافرانہوں سے مقدس اور پاک ہیں۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہاوی حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ میں امام طبری و امثالہ کی کذب و افتراء پر مبنی روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”مگر افسوس اور صد ہزار افسوس کہ قرآن عزیز کے اس مقدس اعلان کے باوجود بھی اوریا کی بیوی کی اس خرافی داستان کو قوراۃ اور اسرائیلیات سے لے کر بعض مفسرین نے قرآن عزیز کی تفسیر میں نقل کر دیا اور اسرائیلی ہفتوات کو بلا دلیل و سند اسلامی روایات کی سند دے دی۔

ان سادہ لوح بزرگوں نے یہ مطلق خیال نہیں فرمایا کہ جن خرافی داستانوں کو آج

وہ اسرائیلی روایت کی حیثیت سے قرآن عزیز کی تفسیر میں نقل کر رہے ہیں کل وہ آیات قرآنی کی تفسیر و تشریح بھی جا کر امت مرحومہ کے لئے فتنہ سامانی کا باعث بنیں گی اور ان کی گمراہی کا سبب ثابت ہوں گی۔

اور حیرت و صد حیرت ہے بعض ان جدید و قدیم متکلمین پر جنہوں نے اس قسم کی ہزلیات کو سختی کے ساتھ رد کر دینے اور ان بہتان طرازیوں کو مردود قرار دینے کے بجائے ان روایات کے نیک حمل تلاش کر کے ان کو قابل قبول بنانے کی سعی نامشکو فرمائی ہے اور بے محل حسن ظن سے کام لے کر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ یہ تاویلات جو اس خرافانی روایت کے بارہ میں کی جارہی ہیں، ریت کی دیوار اور تار عنکبوت ہیں اور کسی نہ کسی اسلوب کے ساتھ اس کو تسلیم کرنے سے ”عصمت انبیاء“ جیسے اہم اور نیا دی اسلامی عقیدہ پر ضرب کاری لگتی ہے اور یہ کہ انبیاء و رسل کی جانب اس قسم کے انتساب سے جب قرآن عزیز کا دامن پاک اور بے لوث ہے اور وہ اس قسم کی روایات کو بہتان عظیم سمجھتا ہے، تو پھر کسی شخص کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کی تفسیر میں اس قسم کی خرافات کا تذکرہ کرے۔ (قصص القرآن جلد دوم ص ۷۸-۷۹۔ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی)

پیچھے ”حضرت یوسف“ کے عنوان کے تحت یہ بتایا جا چکا ہے کہ امام طبری نے ”يُوسُفُ بْنُ يَحْيَى...، لَمْ أَخْنُفْ بِالْغَيْبِ“ کی تفسیر میں اللہ تعالیٰ، حضرت یوسف علیہ السلام، ”زلیخا“، زلیخا کے رشتہ دار ”شاہد“، عزیز مصر، زمان مصر، ابلیس کی کواہیاں مسترد کر کے جبرئیل امین اور ایک دوسرے فرشتے کی کواہی کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام کو العیاذ باللہ ”خائن“ ثابت کرنے کی مذموم کوشش کی تھی۔ اسی طرح یہاں بھی سُدی کذاب کی مروی اسرائیلی و یہودی روایت لا کر قرآن کریم کی صفائی کو نظر انداز کر دیا۔ امام فخر الدین رازی نے ”قصہ یوسف“ کے ضمن میں مفصل و مدلل بحث کے بعد (تک آ کر) بڑے درد کے ساتھ متکثرین عصمت انبیاء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اے جاہلو! اگر تم اللہ تعالیٰ کے طریقے اور سنت کے پیرو کار ہو تو اس کی کواہی قبول کر لو اور اگر ابلیس کے تابع ہو تو پھر اس کی شہادت قبول کر لو۔

یہاں بھی حضرت داؤد علیہ السلام کے خلاف زیر بحث روایت نقل کرنے والے امام التفسیر جناب طبری (کی روح) کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ:

اگر آپ فی الواقع ”حدیث موالات و حدیث غدیر خم“ کے پرچارک ہیں اور صحیح معنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے محب ہیں تو پھر اس سلسلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ہی تسلیم کر لو جسے سنی و شیعہ نے بالاتفاق نقل کیا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؑ (م ۴۰ھ) فرماتے ہیں کہ:

”من حدث بحديث داود عليه السلام على ما يرويه القصاص جلدته ماء و سمين ذلك حدا الفرية على الأنبياء صلوات الله تعالى و سلامه عليهم أجمعين“ (روح المعاني جلد ۲۳- ص ۱۸۵، مدارك جلد ۴- ص ۲۹-۳۰، خازن جلد ۶ ص ۴۹، بیضاوی جلد ۲ ص ۲۴۵، قرطبی جلد ۱۵ ص ۱۸۱) ”حضرت علیؑ نے فرمایا: جو شخص حضرت داؤد کے متعلق اور یا کا قصہ بیان کرے گا میں اس کو ۱۲۰ کوڑے ماروں گا جو انبیاء پر بہتان کی حد ہے۔ غیر انبیاء کے لئے اس قسم کی تہمت پر ”حد قذف“ ۸۰ کوڑوں کی سزا ہے۔ انبیاء کرام کی عظمت کے پیش نظر حضرت علیؑ نے اس سزا کو دگنا کر دیا ہے۔“

صاحب تفسیر صافی بحوالہ امام جعفر صادق لکھتے ہیں کہ:

”نہ تو سب لوگوں کو راضی کیا جاسکتا ہے اور نہ سب کی زبان بند کرنا ممکن ہے۔ کیا لوگوں نے حضرت داؤد پر یہ اتہام نہیں لگایا کہ وہ نماز چھوڑ کر پرندہ کے پیچھے دوڑ گئے تا آنکہ زوجہ اور یا پر نظر جا پڑی، جس پر عاشق ہو گئے۔ پھر اور یا کو کسی جہاد پر بھیج کر تابوت سے آگے بڑھا دیا کہ وہ قتل ہو گیا اور اس کی زوجہ سے شادی کر لی۔ تفسیر مجمع البیان میں جناب امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب میرے سامنے کوئی ایسا شخص پیش کیا گیا جو حضرت داؤد کی شادی اور یا کی بیوی کے ساتھ ہونے کا اسی طرح سے قائل تھا، میں نے اسے دو حدیں لگوائیں۔ ایک متعلق بہ نبوت اور ایک متعلق بہ اسلام۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ جو شخص حضرت داؤد کا قصہ اس طرح بیان کرے جس طرح قصہ کو بیان کرتے ہیں

امام طبری --- کون؟ تفسیر طبری اور توہین حضرت داؤد علیہ السلام

تو میں اس کو ایک سوساٹھ کوڑے ماروں گا۔“ (القرآن المبین یعنی تفسیر المبین ۵۸۹- مرتبہ سید امداد حسین شاہ کاشمی)

امام ابن حزم (م ۴۵۶ھ) زیر بحث آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

”واقعہ صرف اس قدر ہے کہ دو شخص اچانک محراب داؤد میں داخل ہو گئے جہاں حضرت داؤد عبادت الہی میں مشغول تھے اور چونکہ ان دونوں کا معاملہ واقعی اور حقیقی تھا اور ان کو اس کے طے کرانے میں غلبت تھی اس لئے وہ دیوار پھانڈ کر چلے آئے۔ حضرت داؤد نے مدعی کا بیان سن کر تذکیر کے پیش نظر اول، زمانے کے فساد حال کا ذکر کیا اور فرمایا: زیر دستوں پر ارباب قوت کے مظالم کا ہمیشہ یہی حال رہا ہے کہ وہ ان کی زندگی کو صرف اپنی راحت کا ایک آلہ سمجھتے رہے ہیں اور یہ بہت ہی بری بات ہے۔

اس کے بعد حضرت داؤد نے انصاف پر مبنی فیصلہ کر کے معاملہ کو ختم کر دیا۔ جب فریقین چلے گئے تو حضرت داؤد کے بلند احساسات نے ان کے قلب و دماغ کو ادھر متوجہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم الشان حکومت اور بے نظیر سطوت جو ان کو بخشی ہے درحقیقت یہ ان کے لئے بہت بڑی آزمائش ہے اور امتحان ہے اس امر کا کہ ذات واحد نے اپنی اس کثیر مخلوق پر مجھ کو جو عزت و بلندی عطا فرمائی ہے اس سے متعلق عائد شدہ فریضہ کو میں کہاں تک صحیح طور پر انجام دیتا اور اللہ کی اس نعمت کا اپنی عملی زندگی سے کس طرح شکر ادا کرتا ہوں۔ چنانچہ حضرت داؤد پر اس وجدانی کیفیت کا اس قدر اثر پڑا کہ وہ فوراً درگاہ الہی میں سر بسجود ہو گئے اور طلب مغفرت کرتے ہوئے اعتراف کرنے لگے کہ یا اللہ اس عظیم المرتبت ذمہ داری سے سبکدوش ہونا بھی میری اپنی طاقت سے باہر ہے جب تک کہ تیری اعانت شامل حال نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو حضرت داؤد کا یہ عمل پسند آیا اور اس کی مغفرت نے ان کو اپنی آغوش میں ڈھانپ لیا۔۔۔

استغفار، اللہ کی درگاہ میں ایسا محبوب عمل ہے کہ اس کے لئے ہرگز یہ ضروری نہیں کہ اس سے پہلے گناہ اور معصیت وجود میں آئے اور پھر اس کے رد عمل کے طور پر طلب مغفرت کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ استغفار فرشتوں سے بھی ثابت ہے حالانکہ قرآن عزیز نے یہ

امام طبری --- کون؟ تفسیر طبری اور توہین حضرت داؤد علیہ السلام

تصریح کی ہے کہ ان کی شان یہ ہے: ”لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ“ (وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے) چنانچہ قرآن عزیز نے فرشتوں کے استغفار کا اس طرح ذکر کیا ہے:

وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ۔ (المومن ۷۷) اور وہ فرشتے استغفار کرتے ہیں مومنوں کے لئے (اور کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار تو ہر شئی پر اپنی رحمت اور اپنے علم سے چھایا ہوا ہے تو بخش دے ان کو جو تیری جانب رجوع ہوتے ہیں اور تیری راہ کی پیروی کرتے ہیں۔

امام ابن حزم کی مذکورہ تفسیر پر مولانا حفظ الرحمن سیوہادی اس قدر اضافہ کرتے ہیں کہ: حضرت داؤد کے زیر بحث واقعہ میں قرآن عزیز نے ان کے عصیان اور گناہ کا مطلق کوئی تذکرہ نہیں کیا بلکہ ”فَعَفَا“ کہہ کر صرف یہ بتایا ہے کہ ان کو کسی آزمائش میں ڈال دیا گیا اور آزمائش کے لئے ہرگز یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی گناہ اور خطا سے ہی متعلق ہو جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ امتحان کا معاملہ پیش آیا لہذا حضرت داؤد کا یہ معاملہ بھی کسی معصیت یا گناہ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ پیغمبرانہ شان کے مطابق احساس فرض اور اللہ کے حضور میں اپنی عبودیت و بے چارگی کا بہترین مظاہرہ تھا۔ (قصص القرآن جلد دوم ص ۸۳۔ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی) امام ابن حزم ”فَعَفَا“ کا لفظ ”فَعَفَا“ کے تحت ”نَفْس“ واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

”وهذا قول صادق صحيح لا يدل على شيء مما قاله المستهزون الكاذبون المتعلقون بخرافات ولها اليهود“

”یہ واقعہ بالکل صحیح اور درست ہے۔ مسخر و نچوٹوں اور یہود کی خود ساختہ روایات اور خرافات سے استدلال کرنے والوں کے لئے اس واقعہ میں کوئی دلیل نہیں۔“

آیت کے ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنے والے اہل مقدمہ تھے وہ اپنی اپنی بھیڑوں کے تنازع میں حضرت داؤد علیہ السلام سے فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ جس کا خیال ہے

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین حضرت داؤد علیہ السلام

کہ ”خصمان“ ملائکہ تھے اور ”نہجہ“ کے لفظ عورتوں کے تنازع کی طرف تفسیر کر رہے تھے اس نے اللہ تعالیٰ پر بہتان لگایا، افتر پردازی کی، قرآن میں اضافہ کیا، اللہ تعالیٰ کی تکذیب کی اور ملائکہ کی غلط بیانی کا اعتراف کیا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”هَلْ أَتَاكَ نَبَؤُا الْخَطُصِ“ کیا آپ کو اہل مقدمہ کا واقعہ معلوم ہے۔ جبکہ معترض کہتا ہے کہ اہل مقدمہ انسان نہ تھے، نہ ایک دوسرے پر ظلم کا ارتکاب کیا، نہ کبھی ایک کی ننانوے بھیڑیں اور دوسرے کی ایک تھی اور ایک نے دوسرے سے کہا کہ اپنی ایک بھی مجھے دے دو۔

حیرت ہے کہ اہل باطل خود کو اس بات میں کیوں تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ مزید برآں یہ دعویٰ بلا دلیل و برہان ہے:

”وَتَاللّٰهِ اِنْ كُلِّ امْرِئٍ مِّنَّا لَيُصَوِّئُ نَفْسَهُ وِجَارِهِ الْمُسْتَوْرِ عَنْ اَنْ يَّعْشُقَ امْرَاةً وَّجَارَهُ ثُمَّ يَعْزُضُ زَوْجَهَا لِلْقَتْلِ عَمَلًا لِّتَزْوِجَهَا، و عَنْ اَنْ يَّتْرَكَ صَلَوتَهُ لَطَائِفِ يَرَاهُ هَٰذِهِ اَفْعَالُ السُّفَهَاءِ الْمُتَهَوِّكِينَ الْفَسَاقِ، الْمُتَمَرِّدِينَ لِأَفْعَالِ الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ فَكَيْفَ بِرَسُولِ اللّٰهِ دَاوُدَ الَّذِي اُوْحِيَ اِلَيْهِ كِتَابُهُ وَاُجْرِيَ عَلَيْهِ لِسَانُهُ كَلَامُهُ، لَقَدْ نَزَّهَهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ عَنْ اَنْ يَمُرَّ بِمِثْلِ هَٰذَا الْفَحْشِ بِبَالِهِ فَكَيْفَ اَنْ يَسْتَضْيِفَ اِلَيْهِ اَفْعَالَهُ“ (الفصل فی الملل والاهواء والنحل جلد ۴ ص ۱۸)

”اور اللہ کی قسم! ہم میں سے ہر آدمی اپنی ذات کو اور اپنے پاک دامن ہمسایہ کو اس بات سے محفوظ و مصون رکھتا ہے کہ وہ ہمسایہ کی بیوی سے معاشقہ کرے اور پھر اس سے شادی رچانے کی غرض سے اس کے شوہر کو قتل کرائے۔

نیز ہر شخص محض ایک پرندہ دیکھ کر نماز ترک کرنے سے بھی خود کو بالا و برتر سمجھتا ہے۔ ایسے افعال و کردار فاسقوں، فاجروں، احمقوں اور لاپاہلی اشخاص سے تو سرزد ہو سکتے ہیں مگر اہل ورع و تقویٰ کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ ایسے گندے اور انتہائی مکروہ افعال ایک ایسے رسول سے منسوب کئے جائیں جو مظهر وحی الہی اور کلام اللہ کی تلاوت کرتا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا پاکیزہ نفس عطا کیا ہوتا ہے کہ ایسے فحش خیالات کا ان کے دل و

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین حضرت داؤد علیہ السلام

دماغ میں تصور تک نہیں آ سکتا تو پھر یہ ان سے کیسے سرزد ہو سکتے ہیں۔“

قاضی عیاض (م ۵۴۴ھ) امام طبری و امثالہ کی منقولہ روایات کے بارے میں ایک فیصلہ کن بات فرماتے ہیں کہ:

”لا يجوز أن يلتفت إلى ماسطره الأخباريين من أهل الكتاب الذين بدلوا وغيروا، نقله بعض المفسرين ولم ينص الله تعالى على شيء من ذلك، ولا ورد في حديث صحيح والذي نص عليه الله في قصة داود، وظن داود، إثماته، وليس في قصة داود، ولا خبر ثابت۔ (الشفاء بتعريف حقوق المصطفى۔ جلد ۲۔ ص ۱۸۵)

حضرت داؤد کے اس قصہ کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے جسے اہل کتاب میں سے ان مؤرخین نے لکھا ہے جنہوں نے تغیر و تبدل کیا ہے اور بعض مفسرین نے بھی ان خرافات کو اپنی تفاسیر میں نقل کر لیا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر کوئی تصریح نہیں کی ہے اور نہ کسی صحیح حدیث میں اس قصہ کا کوئی ذکر ہے۔ اور وہ جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کے واقعہ میں صراحت سے بیان فرمایا وہ تو صرف یہ ہے کہ:

”وَوَظَنُّ دَاوُدُ اَنَّمَا فَتَنَّاہُ فَاَسْتَعْفِفَ رَبُّہُ...“ داؤد نے سمجھ لیا کہ ہم نے اس کی آزمائش کی ہے تو انہوں نے اپنے رب سے مغفرت طلب کی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ میں ”اور یا“ کی خبر ثابت ہی نہیں ہے۔

امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) تفسیر کبیر میں اس آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ:

”یہاں ایک افسانہ بیان کیا جاتا ہے بعض لوگوں نے تو اس افسانہ کو ایسا رنگ دیا ہے کہ گناہ و کبیرہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر بندے کی طرف ہوتی ہے اور بعض نے اس واقعہ کو اس طرح ذکر کیا ہے کہ گناہ و صغیرہ کا ارتکاب لازم آتا ہے۔“ (واللہ اعلم بہ و اذهب الیہ اَنَ ذَلِکَ باطل) جبکہ میرا عقیدہ اور میری تحقیق یہ ہے کہ یہ واقعہ سراسر لغو اور باطل ہے۔“ اگر ایسی حرکت فاسق ترین آدمی کی طرف بھی منسوب کی جائے تو وہ بھی اس کو برداشت نہیں کرے گا اور جس بد بخت نے ایسی فحش بات اللہ تعالیٰ کے نبی کی طرف منسوب

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین حضرت داؤد علیہ السلام کی ہے اگر خود اس پر ایسا الزام لگایا جائے تو وہ اپنی کمینگی اور خباثت طبع کے باوجود اس کی ہر زور تر دید کرے گا اور بہتان لگانے والے پر لعنت بھیجے گا۔ ایسا گھناؤنا جرم جسے ایک آدمی درجے کا امتی اپنے لئے پسند نہیں کرتا ایک نبی کا دامن عصمت اس سے کب آلودہ ہو سکتا ہے۔ نیز اگر قصہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو حضرت داؤد علیہ السلام پر دو سنگین جرم ثابت ہوں گے۔ ایک قتل بے گناہ اور دوسرا فعل قبیح۔

قرآن کریم میں یہ آیات اس لئے نازل کی گئیں تاکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دل جوئی ہو اور حضرت داؤد کے اسوہ حسنہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ کفار کی دل آزاری سے کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ اگر حضرت داؤد سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہوتی تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے ذکر سے اپنے محبوب کی دل جوئی نہ فرماتا جو اپنی خواہش نفس کے سامنے بے بس ہے اور قتل بے گناہ کے ارتکاب کی جرأت کرتا ہے۔

علاوہ ازیں سابقہ آیات میں حضرت داؤد کو جن صفات عالیہ سے موصوف فرمایا گیا ہے ”عبدنا“ (ہمارا بندہ)، ”ذَا الْأَيْدِ“ (عبادت و طاعت میں بڑا طاقتور) ”اَوْتَابَ“ (ہر وقت رجوع کرنے والا)، ”فَضَّلَ الْخِطَابَ“ (فیصلہ کن بات کرنے کا مکمل علم) وغیرہا، اگر آپ سے ایسی ردیل حرکت سرزد ہوئی ہوتی تو آپ کو ان اوصاف جمیلہ سے موصوف کرنے کا پھر کوئی مقصد نہ رہتا اور آپ کو ”وَإِنَّ لَآءِ عَيْنُنَا لَآ لُفْی وَحُسْنُ مَآبٍ“ کی خوش خبری ہر گز نہ دی جاتی۔ اس لئے آیات کا سیاق و سباق دونوں اس قصہ کی پر زور تر دید کرتے ہیں اور اسے سراپا لغو اور بے ہودہ قرار دیتے ہیں۔

مشہور صوفی بزرگ حضرت ابن عربی (م ۶۳۸ھ) فرماتے ہیں کہ:

”وَلَا يَتَعَرَّضُ لِمَا ذَكَرَهُ الْمُؤَرِّخُونَ عَنِ الْيَهُودِ مِنْ زَلَّاتٍ مِنْ أَثْنَى اللَّهِ عَلَيْهِمْ وَاجْتِبَاهِهِمْ وَيَجْعَلُ ذَلِكَ تَفْسِيرَ الْكِتَابِ لِلَّهِ“ (فتوحات مکیہ جلد دوم ص ۳۵۶ طبع مصر)

”وواعظ پر فرض ہے کہ وہ ایسی باتوں سے اجتناب کرے جو مؤرخین نے بلا تحقیق یہودیوں سے نقل کی ہیں جن میں ان مقدس ہستیوں کی اغزشوں کا بیان ہوتا ہے جن کی اللہ

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین حضرت داؤد علیہ السلام تعالیٰ نے ثابوت صیغہ فرمائی ہے اور انہیں دوسرے لوگوں سے چن لیا ہے۔ اور پھر وہ واعظ یہ کہے کہ وہ قرآن کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔“

امام ابو حنیان اندلسی (م ۴۵۵ھ) فرماتے ہیں کہ: ”ہماری تحقیق یہ ہے کہ دیوار کو پھاند کر محراب میں آنے والے انسان تھے، وہ ایسے راستے سے داخل ہوئے تھے جو داخل ہونے کا راستہ نہ تھا اور ایسے وقت آئے تھے جو آپ کی عدالت کا وقت نہ تھا۔ آپ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ مجھے قتل نہ کر دیں لیکن جب واضح ہو گیا کہ یہ دونوں کسی مقدمہ کا فیصلہ کرانے کے لئے آئے تھے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے تو حضرت داؤد کو پتہ چل گیا کہ یہ سارا واقعہ یعنی ان لوگوں کا بے وقت آدھمکنہ، غیر معروف راہ سے آنا اور آپ کا ان کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ یہ قتل کے ارادہ سے آئے ہیں اور اس وجہ سے آپ کا گھبرا جانا یہ سب آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے آزمانا چاہا ہے اور ان کے بارے میں ان کا سوء ظن کرنا ان کی شان نبوت سے فروتر ہے۔ اس لئے وہ مغفرت طلب کرنے لگے۔“ (آخر میں انبیاء کرام کی عصمت کے بارے میں واشگاف الفاظ میں لکھتے ہیں کہ:)

”وَنَعْلَمُ قَطْعًا أَنَّ الْأَنْبِيَاءَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ مَعْصُومُونَ مِنَ الْخَطَايَا لَا يُمْكِنُ وَقُوعُهُمْ فِي شَيْءٍ مِنْهَا، ضَرُورَةٌ أَنَا لَوْ حُوزْنَا عَلَيْهِمْ شَيْئًا مِنْ ذَلِكَ بَطَلَتْ الشَّرَائِعُ وَلَمْ تَقْبَلْ بِشَيْءٍ مِمَّا يَذْكُرُونَ أَنَّهُ وَحْيٌ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى فَمَا حَكَمَ اللَّهُ تَعَالَى فِي كِتَابِهِ بِمَرِّ عَلَى مَا أَرَادَهُ اللَّهُ وَمَا حَكَمَ الْقَضَاءُ مِمَّا فِيهِ نَقْصٌ لِمَنْصَبِ الرِّسَالَةِ طَرَحْنَاهُ وَنَحْنُ كَمَا قَالَ الشَّاعِرُ:

وَنُؤَثِّرُ حَكْمَ الْعَقْلِ فِي كُلِّ شَيْءٍ إِذَا أَثَرُ الْأَخْبَارِ تُجَالَسُ قُصَّاصُ

(البحر المحيط جلد ۷- ص ۳۲۳)

”ہمارا پختہ یقین ہے کہ انبیاء کرام گناہ اور خطا سے پاک اور معصوم ہوتے ہیں۔ ان سے ایسے امور قطعاً سرزد نہیں ہو سکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو شرعی احکام پر اعتماد باقی نہ رہتا اور انبیاء کے فرمودات سے اعتبار اٹھ جاتا۔ قصہ کو لوگوں نے منصب نبوت کے منافی جو کہانیاں گھڑ لی ہیں ہم ان کو پھینک دیا کرتے ہیں۔ ہمارا مسلک تو وہ ہے جو شاعر نے اس شعر میں بیان کیا ہے:

جس چیز کے بارے میں شک و شبہ ہو وہاں ہم عقل کا فیصلہ مانتے ہیں جبکہ قصہ کو لوگوں کے ہم نشین حکایتوں اور کہانیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔“

امام ابن کثیر (م ۷۴۲ھ) فرماتے ہیں کہ: ”قد ذکر المفسرون ہا هنا قصۃ اکثر ہا ما خود من الاسرائیلیات، ولم یثبت فیہا عن المعصوم حدیث یجب اتباعہ“ (تفسیر القرآن العظیم المجلد الرابع ص ۳۲۔ سورۃ صحن آیت ۲۱ طبع بیروت)

”مفسرین نے یہاں ایک قصہ بیان کیا ہے لیکن اس کا اکثر حصہ بنی اسرائیل کی روایتوں سے لیا گیا ہے اور اس بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث بھی ثابت نہیں ہے کہ جس کی پیروی ضروری ہو۔ موصوف اپنی تاریخ میں قدرے تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں کہ:

وقد ذکر کثیر من المفسرین من السلف والخلف ہا هنا قصصاً و أخباراً اکثر ہا اسرائیلیات و منها ما هو مکتوب لا محالۃ ترکنا ایرادہا فی کتابنا قصداً اکثفاً واقتصاراً علی مجرد تلاوۃ القصۃ من القرآن العظیم۔ ”واللہ یہدئ من یشاء إلی صراط مستقیم“ (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۱۳)

اور بہت سے اگلے اور پچھلے مفسروں نے اس مقام پر چند قصے اور کہانیاں نقل کی ہیں۔ ان میں سے اکثر بیشتر یہودیوں کی من گھڑت روایتیں ہیں اور بعض ان میں سے یقینی طور پر جھوٹی اور باطل ہیں۔ اس لئے ہم نے قصداً ان کو بیان نہیں کیا اور قرآن عظیم نے جس قدر واقعہ بیان کیا ہے صرف اسی قدر بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ پر چلاتا ہے۔

علامہ سید محمود آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) نے اس سلسلہ میں ان تمام روایتوں کو تفصیلاً جمع کر دیا ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام سے متعلق ہے جس میں اوریا سے متعلق زیر بحث قصہ بھی ہے کہ حضرت داؤد نے اپنے پڑوس میں ایک عورت کو غسل کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا پھر ان کے دل میں یہ بات آئی کہ اگر اوریا قتل ہو جائے تو میں اس کی بیوی سے نکاح کر لوں گا۔ ابن حجر کی یہی رائے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ عورت حضرت داؤد کے ایک وزیر کی بیوی تھی۔ (وقیل انہ اضمرفی نفسه، لئن قتل لوریا تزوج بها وإلیہ مال ابن حجر فی تحفۃہ)

ایک روایت میں ہے کہ اہل ایمان میں سے کسی شخص کی بیوی تھی، حضرت داؤد نے اس سے کہا کہ: تم طلاق دے دو تو میں اس سے شادی کر لوں پھر اس نے شرم میں آ کر طلاق دے دی اور انہوں نے شادی کر لی۔ ان کی شریعت میں یہ کوئی معیوب بات نہیں تھی لیکن عتاب کی وجہ یہ تھی کہ داؤد کا ایک ایسے شخص سے طلاق کا مطالبہ کرنا جس کی صرف ایک ہی بیوی تھی جبکہ حضرت داؤد دکی بہت سی (۹۹) بیویاں تھیں، مناسب نہیں تھا۔ بیویوں کی کثرت کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے اس طبعی رجحان کو دہاتے اور اپنے نفس پر قابو رکھتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اس لئے امتحان میں مبتلا ہو گئے۔

تیسری روایت یہ ہے کہ وہ اوریا کی بیوی نہیں تھی بلکہ ابھی صرف منگنی ہوئی تھی، اس کے بعد حضرت داؤد نے بھی منگنی کا پیغام دیا تو اس عورت کے خاندان والوں نے حضرت داؤد کو ترجیح دی اور انہوں نے اس سے شادی کر لی۔ حضرت داؤد کی یہی خطا تھی کہ انہوں نے ایک شخص کے ساتھ اس کی منگنی ہو جانے کے بعد اسے شادی کا پیغام دیا۔ چوتھی روایت یہ ہے کہ حضرت داؤد کو پہلی منگنی کا علم ہی نہیں تھا لہذا عتاب اس بات پر ہوا کہ انہوں نے پیغام دینے سے پہلے اس بات کی تحقیق کیوں نہیں کی؟

پانچویں روایت میں ہے کہ ان کی شریعت میں دستور تھا کہ جب کسی عورت کا شوہر مر جاتا تھا تو شوہر کے اولیاء کو حق ہوتا تھا کہ وہ اپنے خاندان میں سے ہی کسی سے شادی کر دیں اور اگر ان سے انکار ہو تو دوسروں کو منگنی کا حق حاصل ہو جاتا تھا۔

جب اوریا کا قتل ہوا تو حضرت داؤد نے سمجھا کہ اس کے خاندان والے اپنوں میں شادی کرنا نہیں چاہتے اس لئے انہوں نے منگنی کر دی اور جب شوہر کے خاندان والوں کو منگنی کی اطلاع ملی تو حضرت داؤد کی بادشاہت کے رعب و داب کی وجہ سے خاموش ہو گئے۔

چھٹی روایت ہے کہ حضرت داؤد اپنی عبادت میں مصروف تھے کہ ایک عورت اور ایک مرد فریق بن کر آپ کے پاس آئے، آپ نے فریقین کو پہچاننے کی غرض سے دیکھا لیکن طبعی طور پر دل کا میلان عورت کی طرف ہو گیا جس کی وجہ سے ان کی عبادت میں خلل آیا اور وہ معتبہ ٹھہرے۔

ساتویں روایت میں ہے کہ ان کے پاس دو فریق آئے۔ حضرت داؤدؑ نے صرف ایک فریق یعنی مدعی کا بیان سن کر اپنا فیصلہ سنا دیا اور مدعا علیہ کو صفائی کا موقع نہیں دیا اور یہ طریقہ عدل و انصاف کے منافی تھا۔ اس لئے ان پر عتاب ہوا۔ یہ دونوں فریق انسان تھے فرشتے نہیں تھے، جیسا کہ ظاہر نص سے معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اگر آیت میں لفظ ”نہجہ“ سے مراد عورت مان لی جائے تو جتنی روایتیں اس سلسلے میں بیان کی جاتی ہیں ان تمام روایتوں سے عصمت انبیاء کی نفی ہو جاتی ہے جو اہل اسلام کا متفقہ عقیدہ ہے۔ اس لئے یہ روایتیں کسی حال میں ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتیں۔ ”وللقصاص کلام مشہور لا یکاد یصح لما فیہ من مزید الا خلال بمنصبہ علیہ السلام“ ملاحظہ ہو: روح المعانی جلد ۲۳ ص ۱۸۵۔

اس سلسلے میں قصہ کو اور افسانہ تراشوں نے جتنی تفصیل بیان کی ہے وہ سب کی سب منصب نبوت کے خلاف اور ایک نبی کے شایان شان نہیں ہیں۔۔۔ مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ امام طبری نے زیر بحث آیت کی تفسیر میں ”سدی“ کذاب کی جو روایت بیان کی ہے وہ سراسر عقیدہ عصمت انبیاء کے منافی اور حضرت داؤد علیہ السلام کی توہین پر مبنی ہے۔ علاوہ ازیں مذکورہ روایت اصول روایت و درایت کے اعتبار سے بھی خلاف حقیقت، باغواور باطل ہے۔

تفسیر طبری اور توہین سلیمان علیہ السلام

”وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَ اَلْقَيْنَا عَلٰی كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ“ (ص ۳۴)
اور یقیناً ہم نے سلیمانؑ کو آزمائش میں ڈالا اور ڈال دیا ہم نے ان کے تخت پر ایک بے جان جسم بچھروہ (ہماری طرف) متوجہ ہوئے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ ہم نے اپنی سنت کے مطابق سلیمانؑ کو امتحان میں ڈالا اور انہیں سلطنت و بادشاہت عطا کر کے ان کی اطاعت شعاری کا امتحان لیا۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی ”جبرم“ ہی کی سزا کے طور پر امتحان میں ڈالے گئے۔ امتحان تو تمام انبیاء و رسل کو پیش آئے ہیں جس سے ان کے صبر یا شکر کی آزمائش ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کا مقولہ نقل فرمایا کہ:

”اِنَّ هٰٓیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُفَضِّلُ بَیْهَا مَنْ تَشَاءُ وَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ“ (الاعراف ۱۵۵)
”یہ محض تیرا فتنہ اور آزمائش ہے تو اس سے جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت سے سرفراز فرماتا ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ بعض ”فتنہ“ ہدایت کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

”اَحْسِبِ النَّاسَ اَنْ يُّخْرَجُوْا اَنْ يَقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یَفْقَهُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَغْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَلَفُوْا وَ لَیَغْلَمَنَّ الْكَٰذِبِیْنَ ۝“ (العنکبوت ۲-۳)

”کیا لوگوں نے یہ گمان کر لیا کہ وہ چھوڑ دیئے جائیں گے اگر وہ اتنا ہی کہہ دیں کہ ہم ایمان لے آئے اور وہ فتنہ میں نہ ڈالے جائیں گے۔ اور یقیناً ہم نے ان لوگوں کو بھی فتنہ میں ڈالا ہے جو ان سے پہلے تھے۔ سو اللہ ان کو ضرور معلوم کرے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں کو

بھی ضرور معلوم کرے گا۔“

جیسا کہ آیت مذکورہ میں بیان کردہ ”فتنہ“ ایک امتحان و آزمائش تھا کہ ہدایت یافتہ گمراہ سے ممتاز اور جدا ہو جائے اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام بھی فتنہ میں مبتلا ہوئے اور کامیاب ہوئے۔

علاوہ ازیں حضرت سلیمانؑ کے تخت پر جس ”جسد“ کے ڈالنے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے جو کچھ اللہ تعالیٰ کا مقصد تھا وہ پورا حاصل ہوا اور ہم بعینہ اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ من جانب اللہ ہے۔ اگر قرآن یا حدیث میں اس ”جسد“ کی تشریح و تعبیر منقول ہوتی تو ہم اس کے بھی قائل ہوتے مگر اس کی تفسیر میں کوئی صحیح حدیث منقول نہیں ہے تو کسی کے لئے بھی ”ظن و تخمین“ سے جو بدترین جھوٹ (اکذب الحدیث) ہے تفسیر کرنا روا نہیں کیونکہ یہ نہ صرف حضرت سلیمانؑ پر بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھی افتراء اور بہتان تراشی ہے۔ اس سلسلہ میں مفسرین کرام نے اپنی تفاسیر میں جن اسرائیلی روایات کے انبار لگائے ہیں وہ سب کذب و افتراء پر مبنی ہیں۔

ان مفسرین نے ”جسد“ سے مراد شیطان لیا ہے جس کے مختلف نام ”حمر، آصف، صرد، حقیق، بتائے گئے ہیں۔ (ابن کثیر تحت لآیہ)۔ اس شیطان نے سلیمانؑ کا روپ دھار کر ان کے تخت و سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ بعض روایات کے بموجب آصف شیطان نے آپ کی بیویوں پر بھی تسلط حاصل کر لیا۔ چالیس دن کی حکومت کے بعد جب علماء کرام کو اس ”شیطان“ بادشاہ کے ”سلیمان“ ہونے پر شک گذرا تو انہوں نے ان کی بیویوں سے ”تحقیق و تفتیش“ شروع کر دی کہ آپ نے سلیمان کے ”معمولات“ میں کیا فرق محسوس کیا ہے تو وہ کہنے لگیں کہ ہمیں بھی اس کے سلیمان ہونے میں شک ہے کیونکہ وہ حالت حیض میں بھی ہم سے صحبت کر لیتا ہے۔

(قال: شیطاناً یقالہ آصف فقال لہ سلیمان علیہ السلام کیف تفتنون الناس؟... ومن أنکرھا ما قالہ ابن ابی حاتم... فأرسلوا إلی نساء سلیمان فقالوا لھن... أنکرن من سلیمان شیثاً؟ قلن: نعم إثمہ یأیننا ونحن حیض و

ماکان یأیننا قبل ذلک۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۳۶-۳۷ طبع بیروت)

امام طبری نے بھی شیطان کے تحت سلیمانی پر قبضہ کرنے کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔ چنانچہ موصوف زیر بحث آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ: حدثنا بشر، قال: ثنا یزید، قال: ثنا سعید، عن قتادہ قوله: ”وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ وَ اَلْقَيْنَا عَلٰی كُرْسِیِّہٖ حِجْمَلًا ثُمَّ اَنَابَ“۔۔۔

حضرت سلیمانؑ کو بیت المقدس کی تعمیر کا حکم ہوا کہ اس طرح بناؤ کہ لوہے کی آواز بھی نہ سنی جائے۔ آپ نے ہر چند مدہیریں کیں لیکن کارگر نہ ہوئیں۔ پھر آپ نے سنا کہ سمندر میں ایک شیطان ہے جو ایسی ترکیب بتا سکتا ہے۔ آپ نے اسے طلب کیا۔

ایک چشمہ سمندر میں ملتا تھا۔ ہر ساتویں دن اس میں لبالب پانی آ جاتا تھا اور یہی پانی شیطان پیتا تھا۔ اس کا پانی نکال دیا گیا اور بالکل خالی کر کے، پانی کو بند کر کے اس کے آنے والے دن اسے شراب سے پُر کر دیا گیا۔ شیطان جب آیا اور یہ حال دیکھ کر کہنے لگا: ہے تو یہ مزے کی چیز لیکن دشمن عقل ہے اور جہالت کو ترقی دینے والی ہے۔ (إنك لشراب طیب إلا أن تصیین الحلیم و تزیلین الجاہل جہلاً) چنانچہ وہ بیاسا ہی چلا گیا۔ جب پیاس کی شدت ہوئی تو مجبوراً یہ سب کچھ کہتے ہوئے بیٹھا ہی پڑا۔ اب عقل جاتی رہی اور اسے حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی دکھائی گئی یا کندھوں کے درمیان اس سے مہر لگا دی گئی۔ شیطان بے بس ہو گیا۔ حضرت سلیمانؑ کی حکومت اسی انگوٹھی کے دم سے قائم تھی (فكان ملكه فی خاتمہ) جب یہ حضرت سلیمانؑ کے پاس پہنچا تو آپ نے اسے اس کام کے سرانجام دینے کا حکم دیا۔ (چنانچہ اس نے حسب خواہش و ہدایت اپنی ترکیب و تدبیر سے بیت المقدس کی تعمیر کی)۔

حضرت سلیمانؑ جب بیت الخلاء میں یا حمام میں جاتے تو انگوٹھی اتار جاتے۔ ایک دن حمام جانا تھا اور یہ شیطان آپ کے ساتھ تھا۔ آپ اس وقت فرضی غسل کے لئے جا رہے تھے، انگوٹھی اسی کو سونپ دی اور حمام میں چلے گئے۔ شیطان نے انگوٹھی سمندر میں پھینک دی اور شیطان پر سلیمانؑ کی شکل ڈال دی گئی جس کی بناء پر آپ سے تخت و تاج

چھن گیا سب چیزوں پر شیطان نے قبضہ کر لیا۔ بجز آپ کی بیویوں کے۔

اب اس سے بہت سی غیر معروف باتیں بھی ظہور میں آنے لگیں تو اس زمانے میں ایک صاحب تھے جو ایسے ہی تھے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضرت عمر فاروقؓ۔ انہوں نے کہا: آزمائش کرنی چاہئے، مجھے تو یہ شخص سلیمان معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک روز انہوں نے سوال کیا: اگر کوئی شخص رات کو جہنمی ہو جائے اور سردی ہونے کی وجہ سے وہ سورج کے طلوع ہونے تک غسل نہ کرے تو کوئی حرج تو نہیں؟ اس نے جواب دیا: ہرگز نہیں۔

چالیس دن تک شیطان سلیمانؑ کے تخت پر بیٹھ کر حکمرانی کرتا رہا۔ پھر آپ کو مچھلی کے پیٹ سے انگوٹھی مل گئی۔ ہاتھ میں پہنتے ہی پھر تمام چیزیں آپ کی مطیع ہو گئیں۔ اسی کا بیان اس (زیر بحث) آیت میں ہے (وَ اَلْقَيْنَا عَلٰی كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا) راوی نے کہا ”هو الشیطان صخر“ وہ سلیمانؑ کی شکل اختیار کر کے چالیس دن تک بادشاہت کرنے والا، شیطان صخر تھا۔ (تفسیر الطبری المجلد العاشر ص ۵۸۱۔ تحت رقم ۲۹۹۰۰۔ طبع بیروت)

حدثنا محمد بن الحسين، قال: ثنا أحمد، ثنا أسباط، عن السدي في قوله: ”وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ...“

حضرت سلیمانؑ کی ایک سو بیویاں تھیں۔ ان میں سے ایک بیوی کا نام ”جرادة“ تھا، یہ تمام بیویوں میں سب سے زیادہ مؤثر، امین، آپ کی چہیتی اور قابل اعتماد تھی۔ جب آپ جہنمی ہوتے یا رفع حاجت کے لئے جاتے تو اپنی انگوٹھی ان ہی کو سونپ جاتے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے کو اس پر امین مقرر نہ کرتے۔ ایک دن جرادہ نے کہا: میرے بھائی اور فلاں شخص کے درمیان کچھ جھگڑا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا بھائی جب آپ کے پاس آئے تو آپ اس کے حق میں فیصلہ کر دیں۔ آپ نے کہا اچھا۔ لیکن فیصلہ کیا نہیں۔ اسی قول پر آپ آزمائش میں مبتلا کئے گئے۔ غرض ایک دن مہر ”جرادہ“ کو دے کر بیت الخلاء کو چلے گئے۔ اس دوران میں ایک شیطان آپ کی شکل و صورت میں جرادہ کے پاس آیا اور کہا: مہر دے دو۔ اس نے (اسے سلیمانؑ سمجھ کر) مہر دے دی پھر وہ سلیمانؑ کے تخت پر بیٹھ گیا۔ پھر

سلیمانؑ بیت الخلاء سے باہر آئے اور جرادہ سے اپنی مہر طلب کی۔ تو اس نے کہا: کیا آپ نے ابھی نہیں لی تھی؟ آپ نے کہا: نہیں۔ پھر آپ یہاں سے نکل کر کسی دوسرے مقام پر چلے گئے۔ اور چالیس روز تک شیطان سلیمانؑ کی شکل میں لوگوں پر حکومت کرتا رہا۔ لوگوں نے اس کے احکام کو (سلیمانؑ کے احکام سے) بدلا ہوا پایا اور محسوس کیا تو بنی اسرائیل کے علماء اور قراء آپ کی بیویوں کے پاس گئے اور ان سے کہا: ہم کو احکام سلیمانی سے اس کے احکام بدلے ہوئے نظر آتے ہیں اس لئے اگر یہ فی الواقع سلیمان ہی ہیں تو پھر ان کی عقل جاتی رہی ہے۔ اس پر بیویاں رونے لگیں۔ علماء اور قراء چلے آئے اور رات کھول کر اس کی تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ شیطان نے جب یہ دیکھا تو ان کے سامنے سے اڑ کر روشن دان میں جا پڑا مہر اس کے پاس ہی رہی۔ پھر وہاں سے اڑ کر سمندر کی طرف چلا گیا۔ پس مہر اس کے ہاتھ سے گر کر سمندر میں گر گئی جس کو سمندر کی مچھلیوں میں سے ایک مچھلی نے نگل لیا۔ حضرت سلیمانؑ بھی سمندری شکاریوں کے پاس پہنچ گئے تھے اور سخت بھوکے تھے۔ اس لئے ایک شکاری سے اس کے شکار کی ایک مچھلی مانگی اور کہا میں سلیمان ہوں۔ یہ بات سن کر ایک شکاری نے اٹھ کر آپ کے لالچی ماری اور زخمی کر دیا۔ آپ سمندر کے کنارے بیٹھے خون دھونے لگے۔ پس دوسرے شکاریوں نے مارنے والے کو ملامت کی اور جو مچھلیاں پکڑی تھیں ان میں سے دو مچھلیاں آپ کو دے دیں۔ آپ نے دونوں کا پیٹ چاک کیا اور دھونے لگے۔ ایک مچھلی کے پیٹ کے اندر سے آپ کو اپنی مہر مل گئی اور آپ نے اس کو پہن لیا۔

اس طرح اللہ نے آپ کو حکومت اور شان و شوکت واپس کر دی اور پرندے آپ کے گرد گھومنے لگے۔ اس وقت لوگوں نے انہیں پہچان لیا کہ یہ سلیمانؑ ہی ہیں۔ پھر لوگ اپنی حرکت پر معذرت کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا: نہ میں تمہاری اس معذرت کی تعریف کرتا ہوں اور نہ تمہارے فعل پر تمہیں ملامت کرتا ہوں۔ یہ معاملہ تو ہونا ہی تھا۔ اس کے بعد آپ اپنی حکومت پر آ گئے اور جس شیطان نے آپ کی مہر اڑائی تھی اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ وہ گرفتار ہو کر آ گیا۔ اس دن ہوا اور شیطان آپ کے لئے مسخر ہو گئے۔ اور اس سے پہلے اس طرح مسخر نہیں ہوئے

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین سلیمان علیہ السلام

تھے۔ پھر اس شیطان کو حاضر کیا گیا جسے لوہے کے ایک صندوق میں بند کر کے، اس صندوق کو مقفل کر کے، اس پر اپنی مہر لگا کر سمندر میں پھینکوا دیا۔ وہ قیامت تک اسی حالت میں رہے گا اور اس کا نام ”حقیق“ ہے۔ (تفسیر الطبری المجلد العاشر ص ۵۸۲۔ تحت رقم ۲۹۹۰۱۔ طبع بیروت)

امام جلال الدین محلی (م ۸۶۲ھ) لکھتے ہیں:

”اہلیناہ بسلب ملکہ و ذلک لتزوجه بامرأة هویہا، و کانت تعبد الصنم فی داره من غیر علمه، و کان ملکہ فی خاتمه، فزعه مرة عند إرادة الخلاء و وضعه عند امرأته المسماة بالأمینة علی عادته، فجاءها جنی فی صورة سلیمان علیہ السلام فأخله منها، و ألقینا علی کرسیه جسدا، هو ذلک الجنی و هو صخر أو غیره، جلس علی کرسی سلیمان و عکفت علیہ الطیر و غیرها، فخرج سلیمان فی غیر هیئته فراه علی کرسیه و قال للناس أنا سلیمان فأنکروه۔“ (تفسیر جلالین ص ۴۰۸)

ہم نے سلیمان کو ان کی حکومت ”سلب“ کر کے آزمایا۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ انہوں نے ایک ایسی عورت سے شادی کر لی تھی جس کے ساتھ انہیں محبت و عشق تھا اور یہ عورت سلیمان کے گھر میں ان کی بے خبری میں ایک بت کی عبادت کرتی تھی جبکہ ان کی بادشاہت و حکومت کا راز ان کی انگوٹھی میں تھا۔ ایک دن سلیمان نے قضائے حاجت کے وقت اسے اتار کر حسب عادت ”امینہ“ نامی بیوی کے پاس رکھا جس کے پاس سلیمان کی صورت و شکل میں ایک جن آیا اور اس نے اس عورت سے وہ انگوٹھی حاصل کر لی، اور ہم نے ان کی کرسی پر ایک ”جسد“ ڈال دیا وہ وہی جن تھا اس کا نام صخر یا اس کے علاوہ آصف وغیرہ تھا وہ سلیمان کی کرسی پر بیٹھ کر حکومت کرنے لگا اور پرندے وغیر سب اس کے مطیع ہو گئے۔ قضائے حاجت کے بعد سلیمان نکلے اور شیطان کو اپنی کرسی پر براجمان دیکھا اور لوگوں سے کہا: سلیمان تو میں ہوں مگر انہوں نے سلیمان کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔

یہ امام طبری، امام محلی و امثالہ ہی کا حوصلہ ہے جنہوں نے یہودیوں کی وضع کردہ روایات کو اپنی تفسیر میں جگہ دے دی۔ کیا شیطان نبی کی صورت اختیار کر سکتا ہے؟ حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور توہین سلیمان علیہ السلام

علیہ وسلم کافر مان تو یہ ہے کہ شیطان خواب میں بھی میری صورت اختیار نہیں کر سکتا: ”من رانی فی المنام فقد رانی فان الشیطان لا یتمثل فی صورتی“ (صحیح بخاری۔ کتاب التعبير باب من رای النبی فی المنام رقم الحدیث ۶۹۹۴)

سخت تعجب ہے جو شیطان خواب میں بھی نبی کی صورت اختیار نہیں کر سکتا وہ شیطان امام طبری کے شیخ اشبوخ کے بقول ۴۰ دن تک سلیمان کی صورت اختیار کر کے حکومتی و خانگی امور سرانجام دیتا رہا اور علماء و قراء، مصاحبین، وزراء حتیٰ کہ ان کی بیویاں بھی انہیں نہ پہچان سکیں اور یہ سارے شیطان کے ہی مطیع و فرمانبردار رہے۔

امام طبری کی منقولہ، مکذوبہ روایات میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ سلیمان کی حکومت کا سارا راز اس انگوٹھی میں بند تھا کہ جس کے ہاتھ وہ انگوٹھی لگ جاتی اس کی شکل و صورت بھی سلیمان کی سی ہو جاتی اور اصلی سلیمان کو پہچاننے سے اس کی بیوی بھی انکار کر دیتی پھر یہی نہیں بلکہ وہ حکومت کے تخت پر بیٹھ کر حکم جاری کرتا اور سارے پرندے، درندے، جن، شیاطین اور انسان اس کی اطاعت شروع کر دیتے۔ امام طبری تک اگر بالفرض حضرت سدی کی یہ روایت کسی ذریعے سے پہنچ ہی گئی تھی تو انہوں نے اسے اپنی تفسیر میں درج کرنے کے بجائے یہ کیوں نہ کہہ دیا تھا کہ:

وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَّكِلَ بِهِذَا سُبْحَنَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ۝ (سورہ النور۔ ۱۶)

اور جب تم نے اسے سنا تھا تم نے کیوں نہ کہہ دیا کہ ہمارے لئے یہ مناسب نہیں کہ ہم اس کے متعلق باتیں کریں۔ (اے اللہ) تو پاک ہے یہ تو ایک بہت بڑا بہتان ہے۔

قاضی عیاض (۵۴۴ھ) فرماتے ہیں کہ:

”لا یصح ما نقله الاخباریین من تشبیہ الشیطان به و تسلیطه علی ملکہ و تصرفه فی أمتہ بالجور فی حکمه ان الشیاطین لا یسلطون علی مثله و قد عصم اللہ تعالیٰ الانبیاء من مثل هذا“ (تفسیر الخازن جلد ۶۔ ص ۴۹)

”شیطان کے حضرت سلیمان کی صورت اختیار کرنے، ان کی حکومت پر مسلط ہونے اور ان کی رعایا و امت پر ظالمانہ فیصلے ٹھونسنے کے سلسلے میں قصہ کولوکوں نے جو کچھ نقل کیا ہے، کچھ بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ شیاطین کا تسلط انبیاء کرام پر ممکن ہی نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں شیطانی تسلط سے بچایا ہوا ہے۔“

امام ابو حیان اندلسی (م ۴۵۵ھ) فرماتے ہیں کہ:

”إن هذه المقالة من أوضاع اليهود و زنادقة السوفسطائية، ولا ينبغي لعاقل أن يعتقد صحة ما فيها، وكيف يجوز تمثل الشيطان بصورة نبي حتى يلتبس أمره عند الناس و يعتقدوا أن ذلك المتصور هو النبي، ولو أمكن وجود هذا لم يوثق بإرسال نبي نساء الله تعالى سلامة ديننا و عقولنا، و من أقبح ما فيها زعم تسلط الشيطان على نساء نبيه حتى وطئهن و هن حيض، الله أكبر هذا بهتان عظيم۔“ (روح المعاني جلد ۲۳ ص ۱۹۹)

”یہ قصہ یہودیوں اور زندقوں کا وضع کردہ ہے اور کسی عقل مند کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ ذرہ برابر بھی اس کی صحت کا اعتقاد رکھے۔ شیطان کا کسی نبی کی شکل و صورت اختیار کرنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ ممکن ہو تو پھر سارا منصب نبوت و رسالت با زپیچہ اطفال بن جاتا ہے اور کسی بھی نبی و رسول کی شریعت کا اعتماد باقی نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دین اور عقول کو سلامت رکھے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ فتنج اور بے ہودہ بات یہ ہے کہ شیطان نبی کی بیویوں پر بھی تسلط حاصل کر کے لیا م حیض کے دوران بھی ان سے وطی کرتا رہا۔ (کوئی دشمن پیغمبر اور پرلے درجے کا بے غیرت و دیوث ہی اسے صحیح تسلیم کر سکتا ہے) اللہ اکبر! یہ بہت بڑا بہتان ہے۔“

تفسیر طبری اور توہین سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم

تفسیر طبری کے حوالے سے زیر نظر کتاب میں حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت یوسف، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم الصلوٰۃ والسلام سے متعلق مختلف منافی عصمت انبیاء اور توہین آمیز روایات پر بحث پیچھے گذر چکی ہے۔ اب سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق منافی عصمت اور منی بر توہین دو واقعات قصہ غرائق اور نکاح سیدہ زینبؓ کے تحت امام طبری کی منقولہ روایات کا ایک تنقیدی جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ متعلقہ آیات کا صحیح مفہوم بھی ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے تاکہ وہ سنی امام طبری و امثالہ کے دکلائے صفائی کی جسارت کا بھی بخوبی اندازہ لگا سکیں۔

افسانہ غرائیق

”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ إِلَيْهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ“ (سورہ الحج ۵۲)

”اور ہم نے آپ سے پہلے نہ کوئی رسول بھیجا اور نہ کوئی نبی (جس کے ساتھ یہ معاملہ نہ پیش آیا ہو کہ) جب اس نے تمنا کی تو شیطان اس کی تمنا میں اڑنگے ڈالے۔ پس اللہ تعالیٰ مٹا دیتا ہے شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسوں کو پھر اللہ اپنی باتوں کو قہراً بخشتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دے رہے ہیں کہ آپ سے پہلے جتنے رسول اور نبی ہم نے مبعوث فرمائے ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوا کہ جب انہوں نے ہماری آیتیں لوگوں کو پڑھ کر سنائیں تو شیطان نے ان لوگوں کے دلوں میں ان احکامات کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کر دیئے۔ بجائے اس کے کہ وہ ان آیات و احکامات کو قبول کرتے انہیں ان کے خلاف محاذ قائم کر لیا اور اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

لفظ ”شیطان“ یہاں بطور اسم جنس کے آیا ہے اور اس سے مراد شیاطین انس و جن دونوں ہیں۔ ”أَلْقَى الشَّيْطَانُ“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ نبی کے کام میں روڑے لگاتے ہیں اور ان کے کلام و پیغام کے اثر کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ”تَمَنَّى“ کے معنی یہ ہیں کہ کسی انسان کے دل میں کسی خواہش و آرزو کا پیدا ہونا جو ایک فطری چیز ہے۔

اب یہ سوال کہ ایک رسول اور نبی کے دل میں کیا خواہش پیدا ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہر رسول اور نبی کی یہی خواہش رہی ہے کہ جس دعوت کو لے کر وہ قوم کے پاس آیا ہے لوگ اس کو برضا و رغبت قبول کر لیں۔ جبکہ

شیطان نے ہمیشہ ان کی اس خواہش کے پورا ہونے میں رخنے ڈالے اور طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کیں تاکہ کسی رسول و نبی کی آرزو پوری نہ ہو سکے۔

اس بات کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا ہے کہ:

”وَكُنْزِلَكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عُلُوًّا شَبَابًا وَالْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَلَمِ غُرُورًا وَكَذَلِكَ مَا فَعَلُوهُ فَلَمَّا فُلِّرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ“ (الانعام ۱۱۳)

”اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے انسانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو دشمن ٹھہرایا ہے جو دھوکا دینے کے لئے ایک دوسرے کے کان میں بنا دیتی باتیں پھونکتے ہیں اور اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے پس آپ ان کو اور ان چیزوں کو لگھی جو وہ افتراء کرتے ہیں چھوڑ دیں۔“

”وَكُنْزِلَكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عُلُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ هَادِيًا وَنَصِيرًا“ (الفرقان ۳۱)

”اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے مجرموں میں سے ایک دشمن قرار دیا تھا اور آپ کا پروردگار رہداریت دینے والا اور نصرت کرنے والا کافی ہے۔“

ان آیات کی روشنی میں سورہ الحج کی زیر بحث آیت کا مطلب مزید واضح ہو جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو اور خواہش دوسرے انبیاء کرام کی طرح بلاشبہ یہی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم اس دعوت کو قبول کر لے لیکن شیطان اور اس کے کارندوں نے اس دعوت و پیغام میں شکوک و شبہات پیدا کئے۔ لہذا زیر بحث آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ ہر نبی کے ساتھ قوم کی طرف سے اسی طرح کا سلوک کیا گیا۔ بہت سے قدیم و جدید مفسرین نے زیر بحث آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ مگر امام طبری و امثالہ اس کی تفسیر میں ایک ہی مضمون کی متعدد روایات ایسی لائے ہیں جن کی بناء پر دشمنان اسلام ہر دور میں قرآن، صاحب قرآن اور اسلام کی صداقت پر تازو توڑ حملے کرتے رہے۔ بلاشبہ اس کام کے لئے امام طبری وغیرہ نے انہیں مہلک ہتھیار فراہم کیا ہے۔

چنانچہ امام طبری زیر بحث آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

... جلس رسول الله صلى الله عليه وسلم في ناد من أندية قريش كثير

أَهْلَهُ، فَمَتْنِي يَوْمَئِذٍ أَنْ لَا يَأْتِيَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْءٌ، فَيَنْفِرُوا عَنْهُ فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْهِ:
 ”وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ“ (النجم ۱-۲) فقرأها
 رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى إذا بلغ: ”أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ ۝ وَمَنَاةَ
 الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ ۝“ (النجم ۱۹-۲۰)

ألقى عليه الشيطان كلمتين: تلك الغرائقة العلى، وإن شفاعتهن لترتجى، فتكلم
 بهاء، ثم مضى فقرأ السورة، كلها، فسجد في آخر السورة، وسجد القوم جميعاً معه،
 ورفع الوليد بن مغيرة تراباً إلى جبهته، فسجد عليه، وكان شيخاً كبيراً لا يقدر على
 السجود، فرضوا بما تكلم به وقالوا: قد عرفنا أن الله يحيى ويميت، وهو الذي يخلق و
 يرزق، ولكن آلهتنا هذه تشفع لنا عنده، إذ جعلت لها نصيباً، فحن معك، قالاً: فلما
 أمسى أتاه جبرائيل عليه السلام، فعرض عليه السورة، فلما بلغ الكلمتين اللتين ألقى
 الشيطان عليه قال: ما جئت بك بهاتين، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم اقترع
 على الله، وقلت على الله ما لم يقل، فأوحى الله إليه:

”وَأَنْ كَذَّبُوا لِيُفْتِنُوكَ عَنِ الْبَيْتِ أَوْ خِينًا إِلَيْكَ لِيُفْتَرَىٰ عَلَيْكَ غَيْرُهُ...“
 (الاسراء ۷۳) إلى قوله: ”ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْهِمْ نَصِيرًا ۝“ (الاسراء ۷۵)

فما زال مغموماً مغموماً حتى نزلت عليه: ”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا
 نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَتِهِ
 وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝“ قال: فسمع من كان من المهاجرين بأرض الجشة أن أهل
 مكة قد أسلموا كلهم، فرجعوا إلى عشائهم وقالوا: هم أحب إلينا، فوجدوا القوم قد
 ارتكسوا حين نسخ الله ما ألقى الشيطان۔

(تفسير الطبري المجلد التاسع ص ۱۴۱-۱۴۵ تحت رقم ۲۵۳۲۷ طبع بيروت)

...محمد بن كعب القرظي اور محمد قيس دونوں سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 ایک دن قریش کی ایک مجلس میں بیٹھے تھے اور وہاں بہت سے آدمی تھے۔ آپ نے یہ تمنا کی

کہ اللہ اب کوئی بات ایسی آپ پر نازل نہ فرمائے جس سے وہ لوگ آپ سے متغفر
 ہو جائیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی: ”وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝ مَا ضَلَّ
 صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ“ (قسم ہے ستارہ کی جب کہ وہ اتر اترے ہمارے ساتھی (محمدؐ) نہ گمراہ
 ہوئے نہ بہکے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قریش کے سامنے پڑھا اور جب اس مقام
 پر آئے: ”أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ ۝ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ“ (پھر کیا تم نے لات اور
 عزی کو غور سے دیکھا اور کچھلی تیسری منات کو) (بھی) تو شیطان نے یہ دو جملے: ”ثُمَّ لَئِكَ
 الْغَرَانِیظُ الْعُلَى، وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتَرْتَجِی“ (یعنی یہ بت مرغان بلند پرواز ہیں اور ان کی
 شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے) آپ کے دل میں القاء کئے۔ آپ نے (شیطان کے القا
 کئے ہوئے) ان دونوں جملوں کو پڑھا۔ پوری سورت ختم کر کے آخر میں آپ نے سجدہ کیا۔
 آپ کے ساتھ تمام حاضرین بھی سجدہ میں گر پڑے۔ ولید بن مغیرہ چونکہ پیرانہ سالی کی وجہ
 سے سربسجود نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے مٹی اٹھا کر، اس پر، پیشانی رکھ کر سجدہ کیا۔ قریش آپ
 کے ان الفاظ سے بہت خوش ہو گئے اور کہنے لگے:

ہاں ہم اس بات سے واقف ہیں کہ اللہ ہی زندہ کرتا اور موت دیتا ہے، وہی پیدا کرتا
 ہے، وہی رزق دیتا ہے مگر یہ ہمارے معبود اللہ کی جناب میں ہماری شفاعت کرتے ہیں
 جب تم نے بھی ان کو اپنے رب کے ساتھ شریک کر لیا تو اب ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

امام طبری زیر بحث آیت کے تحت چند روایات لائے ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ
 نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سورۃ النجم کی آیات تلاوت فرما رہے تھے تو شیطان نے ان کی
 تلاوت میں ”تلك الغرائیق العلی.....“ کے کلمات کا اضافہ کر دیا پھر رات کو جبرئیل علیہ
 السلام نے آکر آگاہ کیا کہ جو آپ پڑھ رہے ہیں میں تو یہ ”کلام“ نہیں لایا تھا جس پر آپ
 رنجیدہ اور ملول ہو گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کی تسلی کی خاطر زیر بحث آیت نازل فرمائی۔

لَسَا رَأَى رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَلَّى قَوْمَهُ عَنْهُ، وَشَقَّ عَلَيْهِ مَا يَرَى
 مِنْ مَبَاعَدَتِهِمْ مَا جَاءَهُمْ بِهِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ، تَمْنَى فِي نَفْسِهِ أَنْ يَأْتِيَهُ مِنَ اللَّهِ مَا يَقَارِبُ بِهِ

و بین قومہ، وکان یسرہ، مع حبہ و حرصہ علیہم أن یلین له بعض ما غلظ علمہ من أمرہم، حین حدث بئذک نفسہ، و تمنی و أحبه، فأُنزل اللہ: "وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝..... أَقْرَأَ یُتْمُ الْآلَتِ وَالْعَزَىٰ ۝ مَنَآةَ الثَّالِثَةِ الْآخِرَىٰ"

ألقى الشیطان علی لسانہ، "تلك الغرائق العلی....." فلما سمعت قریش ذلك فرحوا و سرهم و أعجبهم ما ذکر به آلهتهم، فأصاخوا له، والمؤمنون مصدقون نبیہم فیما جاءهم به عن ربهم ولا یتهمونه علی خطاء ولا وهم ولا زل، فلما انتهی الی السجدة منها و ختم السورة سجد فیہا، فسجد المسلمون بسجود نبیہم، تصدیقا لما جاء به و اتباعا لأمرہ، وسجد من فی المسجد من المشرکین، من قریش و غیرہم، لما سمعوا من ذکر الهتهم، فلم یبق فی المسجد مؤمن ولا کافر الا سجد..... و خرجت قریش و قد سرهم ما سمعوا من ذکر الهتهم، یقولون: قد ذکرنا محمد الهتنا بأحسن الذکر..... و أتى جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: یا محمد ماذا صنعت؟ لقد تلوت علی الناس ما لم ینک به عن اللہ، و قلت ما لم یقل لك، فحزن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند ذلك، و خاف من اللہ خوفا کبیرا، فأُنزل اللہ تبارک و تعالیٰ علیہ: "وَكَانَ بِهِ رَحِیْمًا" یعزیه و یخفض علیہ الأمر، و یخبرہ أنه لم یکن قبلہ رسول ولا نبی منی کما تمنی، ولا أحب کما أحب، إلا والشیطان قد ألقى فی أمتیہ، کما ألقى علی لسانہ صلی اللہ علیہ وسلم،

نسخ اللہ ما ألقى الشیطان، و أحکم آیاتہ، أی فانت کبعض الأنبیاء والرسل، فأُنزل اللہ: "وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَلَا نَبِیٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّیْطَانُ فِي أُمْنِیَّتِهِ".... فأذهب اللہ عن نبیہ الحزن، منه من الذی کان یخاف، و نسخ ما ألقى الشیطان علی لسانہ من ذکر الهتهم، أنها الغرائق العلی و أن شفاعتہن ترتضی....

فلما جاءه من اللہ ما نسخ ما کان الشیطان ألقى علی لسان نبیہ، قالت قریش: نلیم محمد علی ما کان من منزلة آلهتکم عند اللہ، فغیر ذلك و جاء بغيره، وکان ذلك الحرقان اللذان ألقى الشیطان علی لسان رسولہ قد وقعا فی قم کل مشرک، فازدادوا شرا إلی ما کانوا علیہ۔ (حوالہ مذکور تحت رقم ۲۵۳۲۸)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ان کی قوم نے ان سے اعراض کیا ہے اور صرف اس حکم کی وجہ سے جو اللہ نے آپ کو دیا تھا، آپ کی قوم آپ سے علیحدہ ہو گئی ہے۔ آپ کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا حکم نازل فرماتا جس سے آپ کے اور ان کے درمیان تعلقات پھر سے قائم ہو جاتے۔ آپ اپنی قوم سے محبت اور ان کی فلاح کے خیال سے یہ چاہتے تھے کہ ان کے معاملے میں جو شدت برتی ہے اس میں نرمی کر دیں۔ یہ خیال آپ کے دل میں آیا اور آپ نے اس کی آرزو اور تمنا کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ (النجم) اتاری جب آپ نے یہ آیت پڑھی: "أَقْرَأَ یُتْمُ الْآلَتِ..." "تو شیطان نے آپ کی اس خواہش کی وجہ سے جو آپ چاہتے تھے کہ اپنی قوم کو خوش کریں آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری کر دیئے: "تلك الغرائق العلی..." یہ الفاظ سن کر قریش بہت خوش ہوئے کہ محمد نے تعریفی الفاظ میں ہمارے معبودوں کا ذکر کیا ہے، انہوں نے خوشی میں نعرہ لگایا۔

مسلمان تو اپنے نبی پر ایمان کامل رکھتے ہی تھے کہ جو کچھ آپ ہمارے رب کی طرف سے کہتے ہیں وہ بالکل سچ ہے اور وہ آپ کو خطا، وہم اور لغزش سے معصوم سمجھتے تھے۔ جب اس سورۃ میں سجدہ کا مقام آیا اور سورت ختم ہوئی، رسول اللہ نے سجدہ کیا اور تمام مسلمانوں نے اپنے نبی کی اتباع حکم اور وحی کی تصدیق میں آپ کے ساتھ سجدہ کیا اور چونکہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اپنے معبودوں کی تعریف سنی تھی، اس لئے مشرکین قریش اور دوسرے لوگوں نے بھی سجدہ کیا۔ اس طرح ساری مسجد میں جس قدر مومن یا کافر تھے سب سجدے میں گر پڑے البتہ ولید بن مغیرہ چونکہ نہایت بوڑھا تھا وہ سجدے میں نہ جا سکا مگر اس نے مٹھی بھر کنکریاں اٹھا کر ان پر سر رکھ دیا اور اس طرح اس نے بھی سجدہ کر لیا۔ اس کے بعد تمام لوگ مسجد سے چلے گئے، قریش بھی بڑے خوش وہاں سے گئے اور ایک دوسرے سے بیان کرنے لگے کہ محمد نے ہمارے معبودوں کا بڑے اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے اور اپنے قرآن میں یہ بات کہی ہے کہ "یہ دراز گردن مورتیں ہیں ان کی شفاعت مقبول ہوگی"

اس سجدے کی خبر ان مسلمانوں کو بھی ہوئی جو حشرہ میں ہجرت کر کے جا رہے تھے اور

ان سے بھی یہ کہا گیا کہ قریش اسلام لے آئے ہیں اس خبر کو سن کر ان میں سے بعض وطن آنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور کچھ ہیں رہ گئے۔

حضرت جبریل رسول اللہ کے پاس آئے اور کہا: آپ نے یہ کیا، کیا؟ آپ نے وہ الفاظ بطور وحی لوگوں کے سامنے پڑھے جو میں اللہ کی طرف سے آپ کے پاس نہیں لایا تھا اور آپ نے وہ کہہ دیا جو آپ سے نہیں کہا گیا۔ یہ سن کر رسول اللہ بہت سخت رنجیدہ اور ملول ہوئے اور آپ کو اللہ کا بڑا خوف ہوا کہ کیا ہوگا؟ مگر اللہ تعالیٰ چونکہ آپ پر نہایت مہربان تھا اس نے آپ کی تسلی و تشفی کے لئے وحی کے ذریعے آپ کو بتایا کہ آپ سے پہلے بھی جس نبی یا رسول نے خود کوئی خواہش کی ہمیشہ شیطان اس میں اس طرح شریک ہوا ہے جس طرح کہ آپ کے ساتھ معاملہ گذرا کہ اس نے اپنی بات آپ کی زبان سے کہلا دی مگر اللہ نے ہمیشہ شیطان کی بات منسوخ کر کے اپنی بات جمائی ہے۔ چونکہ آپ بھی دوسرے انبیاء کی طرح ہیں اس لئے اس کی فکر مت کرو پھر اللہ نے یہ آیت نازل کی: ”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ...“ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے خوف کو دور کیا اور ان کو اطمینان دیا اور جو بات شیطان نے آپ کی زبان سے مشرکین کے معبودوں کے ذکر و تعریف میں کہلا دی... محو کر کے ”لات وعزى“ کا ذکر کر کے اپنی یہ آیات نازل فرمائیں:

”الْكُفْرُ الذِّكْرُ وَلَهُ الْأَنْتَى... لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضَى“ یعنی اب کیوں کرتے ہمارے معبودوں کی سفارش اللہ کے ہاں کام دے سکتی ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس بات کو منسوخ کر دیا جو شیطان نے آپ کی زبان سے کہلا دی تھی۔ قریش کو اس منسوخی کی خبر ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ اللہ کے ہاں ہمارے معبودوں کی جس قدر منزلت کا محمد نے پہلے ذکر کیا تھا اس پر وہ اب مام ہوا ہے اور اسی لئے اسے بدل کر اب اس نے کچھ اور کہا ہے۔ یہ دو جملے تھے جن کو شیطان نے آپ کی زبان سے ادا کر دیا تھا۔ یہ ہر مشرک کی زبان پر تھے مگر ان کے منسوخ ہونے کے بعد مسلمانوں (صحابہ کرام) پر وہ اب تک جو سختیاں کرتے آئے تھے ان میں کفار نے اور شدت کر دی۔

امام طبری نے منقولہ تمام روایات کے ذریعے یہ بات ”کتابت“ کی ہے کہ شیطان

نے بتوں کی تعریف پر مبنی کلمات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر سورۃ النجم کی تلاوت کے دوران جاری کرا دیئے تھے:

موصوف ”تمنى“ کا معنی ”التلاوة والقرأة“ سے کرتے ہوئے وهذا القول أشبه بتأويل الكلام بدلالة: ”فَيَنْسُخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ...“ على ذلك لأن الآيات التي أخبر الله جل ثناؤه أنه يحكمها، لا شك أنها آيات تنزيله، ”فَيَنْسُخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ“ کے تحت لکھتے ہیں کہ: ”فمعلوم أن الذي ألقى فيه الشيطان هو ما أخبر الله تعالى ذكره أنه نسخ ذلك منه و أبطله ثم أحكمه بنسخه ذلك منه“

”تمنى“ سے مراد ”تلاوت وقرأت“۔ یہ معنی ”فَيَنْسُخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ...“ سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے پس آیت سے معلوم ہوا کہ شیطان نے جو کلمات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری کرائے تھے ان ہی کو اللہ تعالیٰ باطل اور منسوخ فرما رہے ہیں۔ کو یہ موصوف نہ صرف اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں کہ شیطان نے آپ کی زبان پر دوران تلاوت یہ کلمات جاری کرائے تھے بلکہ اس پر خود قرآن اور روایات سے دلائل بھی قائم کر رہے ہیں۔

امام طبری مزید فرماتے ہیں کہ:

”فَيَنْسُخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ“ فبطل الله ما ألقى الشيطان... نسخ جبرائيل بأمر الله ما ألقى على لسان النبي صلى الله عليه وسلم وأحكم الله آياته۔ وقوله: ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ“ يقول ثم يخلص الله آيات كتابه من الباطل الذي ألقى الشيطان على لسان نبيه... (حوالہ مذکورہ تحت رقم ۲۵۳۳۰-۲۵۳۳۱) جملہ روایات کے لئے ملاحظہ ہو: تفسیر الطبری۔ المجلد التاسع ص ۱۷۸ تا ۱۷۹ تحت رقم ۲۵۳۳۲-۲۵۳۳۱

امام طبری نے اپنی تاریخ میں بھی قصہ غرائیق کو صحیح سمجھ کر نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

تاریخ الامم والملوک۔ الجزء الثاني ص ۸۵ تا ۸۶۔ طبع بیروت ۱۸۷۹ء۔

مشہور شیعہ سکالر ابو مصعب جوادی نے اپنی کتاب ”تحقیقی دستاویز“ ص ۱۹۵ پر قصہ غرائیق سے متعلق تاریخ طبری کا عکس دیا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ مذکورہ کتاب ”تاریخی دستاویز“ مؤلف مولانا ضیاء الرحمن فاروقی کے جواب میں لکھی گئی ہے۔

تفسیر طبری چونکہ ”ام القاسم“ ہے اس لئے بعد میں آنے والے مفسرین، ارباب میر اور بعض صوفیاء نے بھی اس جھوٹے اور خلاف قرآن واقعہ کو اپنی کتب میں صحیح سمجھ کر نقل کر دیا ہے۔

پاکستان کے معروف پیر طریقت مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی امام طبری و امثالہ کی منقولہ مہلک اسلام روایت کی توثیق کر بیٹھے چنانچہ موصوف ارشاد فرماتے ہیں کہ:

”ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں سورۃ النجم کی تلاوت کرتے ہوئے جب اس جگہ پہنچے: ”قَدْ أَفَاءَ بَنُیْمُ الْآلَتِ وَالْعُزَّىٰ وَ مَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ“ (النجم ۱۹-۲۰)

بھلا تم نے لات، عزیٰ اور تیسرے منات کے حال میں غور بھی کیا ہے؟ تو صحابہ کو ایسے محسوس ہوا کہ جیسے آپ نے اس سے آگے یہ کہا کہ ان کی عبادت کرو اور اللہ کی بھی۔ صحابہ کرام بہت حیران ہوئے، نماز سے فراغت پر عرض کیا، کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نئی آیتیں اتری ہیں جو آپ نے پڑھی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تو نہیں پڑھیں۔ چنانچہ جبریل نازل ہوئے اور آیات اتریں: ”الْقَلْبُ الشَّيْطَانُ فِيْ اُفْئِيْطِهٖ“ (الحج نمبر ۵۲) شیطان نے اپنی گفتگو (وقف کے دوران) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت سے ملا دی تھی۔

پھر پتہ چلا کہ شیطان نے اپنی آواز نبی علیہ السلام کی مبارک آواز کی مانند بنا کر یہ عبارت پڑھی تا کہ صحابہ کرام کو دھوکا دے سکے۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں پھر حالت نماز کی یکسوئی میں صحابہ کرام جیسے پاکیزہ حضرات کو دھوکا دینے سے شیطان باز نہیں آیا تو پھر ہم کس کھیت کی گاجر مولیٰ ہیں کہ بلند و بانگ دعوئی کریں، (قصوف و سلوک ص ۷۵-۷۶۔ مطبوعہ دارالعلوم جھنگ ۱۹۹۵)

کاش! موصوف اس واقعہ کو نقل کرنے سے پہلے بعض تفاسیر کا مطالعہ فرمالیتے۔ ان کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نفس واقعہ کی صحت پر یقین رکھتے ہیں کہ جب شیطان حضور

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں، حالت نماز میں صحابہ کرام جیسے پاکیزہ حضرات کو دھوکا دے سکتا ہے تو پھر ہم کس کھیت کی گاجر مولیٰ ہیں کہ بلند و بانگ دعوئی کریں۔

”پیر صاحب“ نے نفس واقعہ کی صورت بھی بدل دی کہ نماز کی حالت میں صحابہ کرام کو محسوس ہوا کہ بتوں کی تعریف ہو رہی ہے۔ پھر نماز کے بعد خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے شیطانی کلمات نہیں پڑھے پھر جبریل زیر بحث آیت لے کر اترے۔ ”الْقَلْبُ الشَّيْطَانُ فِيْ اُفْئِيْطِهٖ“ شیطان نے اپنی گفتگو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت سے ملا دی تھی۔

کیا عجیب تضاد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو انکار فرما رہے ہیں لیکن اللہ وحی نازل کر کے صحابہ کرام کی تائید کر رہے ہیں کہ شیطان نے اپنا کلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کے ساتھ ملا دیا تھا۔ پھر پیر صاحب نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ شیطان نے اپنی آواز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک آواز کی مانند بنا کر یہ عبارت پڑھی تا کہ صحابہ کرام کو دھوکا دے سکے۔ پھر اس واقعہ کی توثیق کرتے ہوئے پیر صاحب نے یہ فرمایا کہ:

”یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں پھر حالت نماز کی یکسوئی میں صحابہ کرام جیسے پاکیزہ حضرات کو دھوکا دینے سے شیطان باز نہیں آیا تو پھر ہم کس کھیت کی گاجر مولیٰ ہیں کہ بلند و بانگ دعوئی کریں“

جبکہ بعض مفسرین نے یہاں یہ لکھا ہے کہ شیطان کے یہ کلمات کہنے سے صحابہ نہیں بلکہ خود مشرکوں کو دھوکا دے گا۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرما رہے ہیں۔

روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار مولانا اسماعیل رحمان صاحب نے اپنے ایک کالم میں ان کتب کی فہرست پیش کی ہے جن میں قصہ غرائیق نقل کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

”جہاں تک ”غرائیق“ والے واقعے کا تعلق ہے، وہ اس (یعنی قصہ زید و زینب) سے بھی زیادہ مشہور ہے۔ کیلئے طبری نے یہ روایت نقل نہیں کی۔ محمد بن سعد نے الطبقات الکبریٰ میں، امام بزار نے اپنی مسند میں، امام طبرانی نے اپنی معجم کبیر میں، امام بیہقی نے مجمع الزوائد میں، امام

نبیؐ نے دلائل النبوة میں، علامہ سہیلی نے الروض الانف میں، قسطلانی نے المواہب اللدنیہ میں، ابن اثیر نے الکامل فی التاریخ میں اور حافظ ذہبی نے تاریخ الاسلام میں اسے نقل کیا ہے۔ مفسرین میں سے (امام) ابواسحاق الزجاج (۳۱۱ھ) نے معانی القرآن میں، ابن ابی حاتم (۳۲۷ھ) نے تفسیر القرآن العظیم میں، فقیہ ابواللیث سرقندی (۳۷۳ھ) نے تفسیر بحر العلوم میں، امام ابواسحاق ثعلبی (۴۲۷ھ) نے الکشف والبیان عن تفسیر القرآن میں، قاضی القضاة ماوردی (۴۵۰ھ) نے تفسیر التکت والعیون میں، علامہ سمعانی (۴۸۹ھ) نے تفسیر القرآن میں، امام بغوی (۵۱۰ھ) نے معالم التنزیل میں، امام فخرالدین رازی (۶۰۶ھ) نے تفسیر مغایع الغیب میں، علامہ عزالدین عبدالسلام (۶۶۰ھ) نے اپنی تفسیر میں، بیضاوی (۶۸۵ھ) نے انوار التنزیل میں، امام نسفی (۷۱۰ھ) نے مدارک التنزیل میں اور علامہ خازن (۷۴۱ھ) نے لباب التأویل میں، غرائیق کا یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ اکیلے امام طبری پر رفض، اعتراض، روایت سازی اور توہین رسالت کا الزام کیوں؟ یہاں تو محدثین اور مفسرین کی پوری قطاران ”جرائم“ میں شریک ہے۔“ (روزنامہ اسلام ۱۰/ اگست ۲۰۱۵ء۔ بہ عنوان ”احتیاط لازم ہے“ قسط نمبر ۲ تحت کالم ”براہ راست“)

موصوف ”احتیاط لازم ہے“ کی تیسری قسط میں لکھتے ہیں کہ:

”غرائیق والے قصبے پر بھی علماء کی جرح موجود ہے۔ امام بغوی اور امام رازی دونوں نے اپنی اپنی تفاسیر میں غرائیق والی روایات نقل کی ہیں اور ان کے باعث عصمت انبیاء پر واروہات کے جوابات دیے ہیں اور ان روایات کی مناسبت تو جیہات پیش کی ہیں۔ امام بغوی نے واضح کیا ہے کہ اگر قصبے کو مان بھی لیا جائے تو ظاہری مطلب نہیں لیا جائے گا جو عصمت انبیاء سے متعارض ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ”تسلک الغرائیق العلوی“ کے شرکیہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں شیطان نے کہے تھے، مشرکین کو وہم ہو گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرما رہے ہیں۔ دوسری طرف قاضی عیاض نے الشفا میں اور حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی مشہور تفسیر میں تو جیہات اور تاویلات کی جگہ سند پر محدثانہ و محققانہ نگاہ ڈالی

ہے اور مختلف طرق کو جانچ کر فیصلہ کیا ہے کہ یہ روایات ضعیف الاسناد ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں۔“ (روزنامہ اسلام ۱۱/ اگست ۲۰۱۵ء)

صد افسوس ”موصوف“ یہاں انصاف کا خون کر گئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت کے سراسر منافی ایک من گھڑت و باطل قصہ کو رد کرنے کے بجائے کتب کی ایک طویل فہرست دے کر ”روزنامہ اسلام“ کے قارئین کو نہ صرف ”تذبذب“ میں مبتلا کر گئے بلکہ ایک طرح اس کی توثیق بھی کر بیٹھے۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ فہرست میں مذکور کتب کے مؤلفین ابن سعد اور امام بزار کے علاوہ سب کے سب نے امام طبری کے بعد وفات پائی ہے، گویا باقی سب حضرات طبری ہی کے خوشہ چیں ہیں۔ پھر یہ کس قدر مضحکہ خیز دلیل ہے کہ: ”شرکیہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں شیطان نے کہے تھے مشرکین کو وہم ہو گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرما رہے ہیں“

امام طبری کی ایک درجن سے زائد روایات ”چیچ چیچ“ کر کہہ رہی ہیں کہ شرکیہ کلمات شیطان نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جاری کرائے۔ اگر بفرض محال امام بغوی کی اس لغو اور باطل توجیہ کو ایک لمحہ کے لئے تسلیم بھی کر لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ شیطان نے شرکیہ الفاظ کس کی آواز میں کہے تھے جس سے مشرکوں کو ”وہم“ ہو گیا تھا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر مشرکوں کو بالفرض وہم ہو ہی گیا تھا تو موصوف نے جس کثیر تعداد میں جن مؤلفین و جامعین کا حوالہ دیا ہے انہوں نے ”مشرکوں کے اس وہم“ کو اس قدر اہمیت کیوں دی جس سے عصمت انبیاء کا دامن تارنا رہو گیا؟

موصوف نے اس بحث کے آخر میں قاضی عیاض اور حافظ ابن کثیر کا یہ فیصلہ سنایا کہ ”یہ روایات ضعیف الاسناد ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں“ جب یہ روایات قابل قبول ہی نہیں ہیں تو پھر معلوم نہیں کہ فاضل کالم نگار نے امام طبری کے دفاع میں مفسرین و محدثین کی اتنی طویل فہرست کس مقصد کی خاطر پیش کر دی؟ جبکہ ان کی پیش کردہ فہرست میں شامل اکثر مفسرین اور اباب سیر نے اس لغو اور باطل قرائدیا ہے۔ گویا ان حضرات نے اس واقعہ کو رد کرنے کے لئے ہی نقل کیا ہے تو

پھر معلوم نہیں فاضل کالم نگاران حضرات کو کیونکر امام طبری کا ”شریک جرم“ ٹھہرا رہے ہیں۔ نجانے کس جواز کے تحت کالم نگاران مفسرین کو مذکورہ جرم کے ”مجرم“ قرار دے رہے ہیں۔

آگے بتایا جائے گا کہ یہ روایات ”سندا“ ہی ضعیف نہیں ہیں بلکہ ”متنا“ بھی قرآن، حدیث اور عقیدہ عصمت انبیاء کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل ہیں۔ مگر یہاں ضعیف روایات کے بارے میں مفتی اعظم پاکستان مفتی رشید احمد صاحب کا ایک فیصلہ مذکور قرار دینا کیا جاتا ہے:

”یہ صحیح ہے کہ روایات ضعیفہ کے تعدد سے قوت آجاتی ہے مگر کتب مذکورہ کے بیشتر روایات ایسے ہیں کہ ان جیسوں کا عدد ہزار سے بھی بڑھ جائے تو بھی ان پر اعتماد کرنا جائز نہیں۔

”التحیث لایزید الا خبثاً“ (احسن الفتاویٰ جلد ۱۰ ص ۱۲۵۔ الحجاز پبلشرز کراچی ۱۳۳۱ھ)

یہ ملحوظ رہے کہ حضرت موصوفؒ نے یہ فیصلہ ”فضائل میں“ ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے بارے میں سنایا ہے۔ جبکہ ”عصمت انبیاء“ کا تعلق فضائل سے نہیں بلکہ عقیدہ کے ساتھ ہے۔ لہذا ایک طبری نہیں بلکہ لاکھوں طبری بھی قصہ غرائیق بیان کریں یا نقل کریں تو اس روایت کے ”خبث“ میں بھی اسی تناسب سے ہی اضافہ ہوگا۔

سخت تعجب ہے کہ امام طبری و امثالہ سورۃ النجم کی آیات ۱۹-۲۰ کی تفسیر میں منقول ایک لغو اور باطل واقعہ کو سورۃ الحج کی آیت ۵۲ کی تفسیر میں بھی کھینچ لائے جس کا زیر بحث آیت سے سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں بنتا۔ کیونکہ سورۃ النجم بعثت کے پانچویں سال ہجرت حبشہ کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئی جبکہ سورۃ الحج کو بعض علماء نے مکی اور بعض نے مدنی قرار دیا ہے لیکن جمہور علماء کے نزدیک اس سورت میں وہ آیات بھی ہیں جو مکی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئیں اور وہ آیات بھی جو مدنی زندگی کے آغاز میں نازل ہوئیں۔ اگر اس کا نزول مکہ کے آخری ایام میں بھی تسلیم کر لیا جائے تو دونوں سورتوں کے نزول میں آٹھ سال کافرق بنتا ہے۔ کیا شرکیہ کلمات آٹھ سال تک پڑھے جاتے رہے؟ اس کی تردید خود قصہ غرائیق کی روایات سے ہو رہی ہے۔ امام طبری کی منقولہ روایات کے مطابق دن کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد حرام میں مشرکین مکہ کی موجودگی میں سورۃ النجم پوری تلاوت کر کے اس کے آخر میں سجدہ کیا اور مشرکوں نے بھی اس

خوشی میں سجدہ کیا کہ آپؐ نے ہمارے معبودوں کو ”شفیع“ تسلیم کر لیا ہے۔ پھر رات کے وقت جبرئیل تشریف لائے تو آپؐ کی زبان مبارک سے سورۃ النجم دہراتے وقت ”شیطانی کلمات“ سن کر فرمایا: ”ما جئتک بہاتین“ میں نے تو یہ کلمات آپؐ کو نہیں پہنچائے۔ تفسیر طبری میں اس سے اگلی روایت میں جبرئیل کے یہ الفاظ آئے ہیں کہ:

”یا محمد ماذا صنعت؟ لقد تلوت علی الناس ما لم ائک بہ عن اللہ، وقلت ما لم یقل لک، فحزن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند ذلک، و خاف من اللہ خوفاً کبیراً...“

اے محمد! یہ آپؐ نے کیا کیا؟ آپؐ نے وہ الفاظ لوگوں کے سامنے پڑھے جو میں اللہ کی طرف سے آپؐ کے پاس نہیں لایا تھا اور آپؐ نے وہ کہہ دیا جو آپؐ سے نہیں کہا گیا تھا۔ یہ سن کر آپؐ بہت سخت رنجیدہ اور غمگین ہوئے اور آپؐ کو اللہ کا بڑا خوف ہوا۔

امام طبری کی مذکورہ روایات سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ آپؐ نے دن کے وقت سورۃ النجم کی تلاوت کے دوران شیطانی کلمات پڑھے تھے پھر اسی رات میں جبریل سورۃ الحج کی آیت ۵۲ لے کر نازل ہوئے جس کی رو سے شیطانی کلمات منسوخ ہو گئے اور اس آیت میں آپؐ کو تسلی بھی دے دی گئی۔

لہذا دونوں سورتوں (سورۃ النجم اور سورۃ الحج) کے نزول میں تقریباً آٹھ سال کافرق تسلیم کر لینے کے بعد یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اسی رات ان کلمات کو منسوخ کر دیا گیا؟ پھر یہ کیسی تسلی ہے جس میں باقی تمام انبیاء و رسل کے بارے میں بھی یہ باور کرا دیا گیا کہ ان کے ساتھ بھی شیطان نے یہی سلوک کیا ہے۔ ”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِیٍّ...“

سخت تعجب ہے کہ اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے حصر تو یہ کیا جا رہا ہے کہ کوئی نبی اور رسول ایسا ہوا ہی نہیں جس کی وحی میں شیطان نے القاء نہ کیا ہو مگر کسی نبی و رسول کی کوئی ایک مثال بھی پیش نہیں کی گئی کہ اس کے کلام میں شیطان نے القاء کیا تھا۔

جس آیت کی تفسیر میں امام طبری نے عقیدہ عصمت انبیاء کے خلاف باطل روایات کا انبار لگایا ہے اس کا بے غبار اور صاف مفہوم زیر بحث آیت کے آغاز میں بیان کر دیا گیا ہے۔

”شیطانی آیات“ مؤلفہ سلمان رشدی

روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار مولانا محمد اسماعیل رحمان صاحب کی محنت یقیناً ”قابلِ داد“ ہے کہ انہوں نے محبتِ شائق کے بعد ”قصہ غرائیق“ کے قائلین کی ایک ”جامع“ فہرست مرتب فرمائی ہے۔ جس میں اگرچہ مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے بالخصوص امام جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی ”الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور“ (اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ امام طبری کی تفسیر و تاریخ اور امام سیوطی کی ”الدر المنثور“ سے شیعہ، سنی کے علاوہ مستشرقین اور اعداء اسلام سب ہی کو براہ ”استدلال“ کی قوت فراہم ہوتی ہے) جس میں مذکورہ قصہ سے متعلق امام طبری کی نسبت کچھ زائد روایات جمع کی گئی ہیں۔ شاید وہ امام سیوطی صاحب ”الدر المنثور“ کا ذکر کرنا ”بھول“ گئے ہوں حالانکہ انہوں نے امام طبری سے بھی کچھ زیادہ قصہ غرائیق پر روایات کا ”اتوار بازار“ یا انبار لگایا ہے۔

البتہ موصوف نے شاید قصدِ اوعدا اس اہم موقع پر سلمان ”رشدی“ کی کتاب شیطانی آیات / شیطانی کلام۔ ”THE SATANIC VERSES“ کا حوالہ دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ”رشدی“ کی ۲۷ صفحات پر مشتمل یہ کتاب برطانوی پبلشرز وائلنگ پریس (Viking Press) نے شائع کی ہے جو لندن سے ۲۶ ستمبر ۱۹۸۸ء کو ریلیز کی گئی ہے۔ مسٹر پال گرے (Paul Gray) نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ: کتاب کے خلاف مسلمانوں کے عوامی احتجاجات غیر ضروری تھے کیوں کہ یہ کتاب (خود مسلم مفسرین و مؤرخین کے اعتراف کے مطابق) اصلاً تاریخی واقعات پر مبنی ہے اور جب ایسا ہے تو اس کے خلاف ہنگامہ اور احتجاج کیوں؟ (فت روزہ ٹائم نیویارک۔ ۱۳ فروری ۱۹۸۹ء) امام طبری نے ۱۵ روایات میں جو مفہوم بیان کیا ہے اور جو الفاظ نقل کئے ہیں ان میں تو

واضح طور پر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ:

شیطان نے شرکیہ کلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری کر دیا تھا۔

”لَقِيَ عَلَيْهِ الشَّيْطَانُ كَلِمَتَيْنِ، أَلْقَى الشَّيْطَانُ عَلَى لِسَانِهِ، فَأَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أَمْنِيَّتِهِ، فَأَجْرَى الشَّيْطَانُ عَلَى لِسَانِهِ، فَأَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي تِلَاوَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، تِلْكَ الْغَرَائِقُ الْعَلِيَّةُ...، إِذَا حَدَّثَ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي حَدِيثِهِ“ اس کے بعد آپ نے یہ کلمات اپنی زبان سے ادا بھی کئے: فَكَلِمَ بَهَاءٍ فَجَعَلَ يَتْلُوَهَا، فَقَرَأَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِلْكَتِهِ۔

یہی نہیں بلکہ امام طبری نے متعدد روایتوں میں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا حزن و ملال اور اعتراف بھی ثابت کیا ہے کہ میں نے یہ شرکیہ کلمات پڑھ کر غلط بات اللہ کی طرف منسوب کر دی اور جبریل امین نے بھی آپ پر واضح کر دیا تھا کہ یہ کلمات میں نے آپ کو نہیں بتائے۔ بلکہ روایت کے بموجب آپ کی اپنی تمنا اور خواہش بھی یہی تھی کہ قریش اسلام کی وجہ سے بہت دور ہو گئے ہیں کوئی ایسی صورت پیدا ہو کہ دوبارہ خوشگوار تعلقات بحال ہو جائیں اور اب اللہ ایسی کوئی بات نازل نہ فرمائے جس سے وہ لوگ متنفر ہو جائیں۔ حوالہ جات پیچھے گزر چکے ہیں۔

سلمان ”رشدی“ نے اپنی کتاب ”شیطانی آیات“ کی بنیاد امام طبری کی مذکورہ تفسیری و تاریخی روایات پر ہی رکھی ہے جس پر ”پال گرے“ نے تبصرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کے احتجاج کو غیر ضروری قرار دیا تھا۔

”رشدی“ نے اس کتاب میں انبیاء کرامؑ اور صحابہؓ اہل بیتؑ کے خلاف جو زبان استعمال کی ہے وہ کوئی شیطان کا ایجنٹ ہی استعمال کر سکتا ہے۔ اس کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد کتاب اور مؤلف کے خلاف عالم اسلام میں شدید رد عمل کے طور پر احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۲ فروری ۱۹۸۹ء کو اسلام آباد کے ایک مظاہرے میں پولیس کی فائرنگ کے نتیجے میں سات مسلمان جام شہادت نوش کر گئے۔ مگر کوئی مسلمان بھی

افسانہ غرائیق اور مستشرقین

قصہ غرائیق سے متعلق مستشرقین کی آراء پڑھنے کے بعد ہر انصاف پسند قاری یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگا کہ تمام تر کوششوں کے باوجود مستشرقین، امام طبری و امثالہ سے سبقت لینے میں ناکام رہے۔

اس بحث کو پیر محمد کرم شاہ ازہری کی تالیف لطیف ”ضیاء النبی“ کے حوالے سے ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے:

”قصہ غرائیق کو مستشرقین نے نعت غیر مترقبہ سمجھ کر قبول کیا ہے اور نہ صرف اس افسانے کو حقیقت سمجھا ہے بلکہ اس کو مختلف انداز میں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ جس واقعے کو بے شمار مسلمان محققین نے بے شمار دلائل کی مدد سے عقلاً اور ظلاً غلط ثابت کیا ہے، اس کے متعلق سرولیم میورا اپنا فیصلہ بغیر کسی دلیل کے یوں صادر فرماتے ہیں:

”بظاہر ایک خوب معترضہ قصہ موجود ہے جس سے محمد صاحب کا کفار مکہ کے ساتھ ایک عارضی موافقت اور مصالحت کرنا ثابت ہوتا ہے“ (سیرت محمدی۔ ص ۲۸۶)

منکمری واٹ نے اس افسانے کو اپنی تمام کتابوں میں خوب استعمال کیا ہے۔ وہ اس افسانے کی مدد سے ثابت کرتا ہے کہ اسلام ہمیشہ ایک تو حیدی مذہب نہیں رہا بلکہ حالات کے بدلنے سے اس میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں وہ کہتا ہے:

"It must be remember that the outlook of

Muhammad's more enlightened contemporaries has been described as a vague monotheism".

(محمد: پرافٹ اینڈ سٹڈیسمین، صفحہ ۶۲)

امام طبری و امثالہ کے اس مفروضے کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا، نہ ہے اور نہ ہی ہوگا۔ اگرچہ روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار اس سے دگنی فہرست مرتب کر کے یہ باور کراتے رہیں کہ:

”جہاں تک غرائیق والے واقعے کا تعلق ہے۔ اکیلے امام طبری نے یہ روایت نقل نہیں کی۔۔۔ یہاں تو محدثین اور مفسرین کی پوری قطاران ”جرائم“ میں شریک ہے۔“ ملاحظہ ہو: روزنامہ اسلام ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء

کوئی مومن بالقرآن امام طبری کے منقولہ لغو اور باطل واقعہ کو ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتا بلکہ ایک ہندوستانی جرنلسٹ مسٹر ان شرمانے ”رشدی“ کی کتاب پر طعنیہ تبصرہ کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ:

Third Rate Theme, By a Second Rate Author, on a First Rate Paper.

تیسرے درجے کی ”تھیم“ دوسرے درجے کا مصنف اور اول درجہ کا کاغذ۔

روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار نے اپنے کالم میں امام طبری کی حمایت میں قصہ غرائیق کے ناقل مفسرین و محدثین کی ایک طویل فہرست پیش کر کے سلمان رشدی، پال گرے اور ”شیطانی آیات“ کے ناشر کو آئندہ کے لئے یہ موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ اس فہرست کو بھی اپنی کتاب یا تبصرہ کا حصہ بنا دیں جس میں ان تمام ناقل مفسرین و محدثین کی قطار کو امام طبری کے ساتھ ان ”جرائم“ میں شامل دکھایا گیا ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہم عصر زیادہ روشن خیال مسلمانوں کے عقیدے کو ہم تو حید الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔“

اسی افسانے کے سہارے اس نے یہ مفروضہ بھی تراشا ہے کہ ابتدا میں اسلام نہ بت پرستی کے خلاف تھا اور نہ ہی قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں میں تو حید پر زور دیا گیا ہے۔ اسی افسانے کی مدد سے اس نے ماسخ اور منسوخ کے تصور کو غلط معنی پہنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی آیت کو مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے تو اس کو منسوخ کر دیتے تھے۔ اسی افسانے کی مدد سے اس نے قرآن حکیم میں تغیر و تبدل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی واقعے کی مدد سے اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان شیطانی آیات کے مائل ہونے اور ان کے منسوخ ہونے کے دونوں واقعات کے پیچھے سیاسی عوامل کا فرما تھے۔ منگمری واٹ کی کتابوں میں جا بجا اس افسانے کے آٹا نظر آتے ہیں۔ کبھی تو وہ اس روایت کو زیادہ قابل اعتماد نہیں سمجھتا اور کہتا ہے:

"... but the details of the accounts do not inspire much confidence and may be neglected here, since there is no reference in the Quran. Likewise the Sira gives no clear indication of how long it was before Muhammad discovered that the verses were satanic".

(Muhammad At Makkah, Page 88)

”لیکن واقعات کی تفصیلات انسان کے دل میں زیادہ اعتماد پیدا نہیں کرتیں، اس لئے اس (واقعے) کو یہاں نظر انداز کر دینا چاہئے۔ کیونکہ قرآن (حکیم) میں اس واقعے کا کوئی اشارہ نہیں۔ اسی طرح سیرت کی کتابوں میں بھی اس بات کا کوئی واضح اشارہ موجود نہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ معلوم کرنے میں کتنا وقت لگا کہ وہ آیات شیطانی تھیں۔“

پھر یہی مستشرق اپنی دوسری کتاب میں اسی ناقابل اعتماد واقعے کو حقیقت ثابت کرنے کے لئے یہ اچھوتا انداز اختیار کرتا ہے۔

"This is a strange and surprising story. The prophet of the most uncompromisingly monotheistic religion seems to be authorizing polythesim. Indeed the story is so strange that it must be true in essentials. It is unthinkable that anyone should have invented such a story and persuaded the vast body of Muslims to accept it". (Muhammad Prophet and States Man. Page 61)

”یہ ایک عجیب اور حیران کن کہانی ہے۔ اصولوں پر سودے بازی نہ کرنے والے تو حیدی مذہب کا پیغمبر، شرک کو جواز مہیا کرنا نظر آتا ہے۔ البتہ کہانی اتنی حیران کن ہے کہ اس کی بنیادی باتیں ضرور سچی ہوں گی۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی شخص نے یہ کہانی تراشی ہو اور پھر مسلمانوں کی اتنی کثیر تعداد کو اس کہانی کو قبول کرنے کی طرف مائل کر لیا ہو۔“

مستشرقین ایسی باتیں خود بھی گھڑنے کے ماہر ہیں جن کا اسلامی ادب میں کوئی نشان نہیں۔ قصہ غرائیق کو تو خود متعدد مسلمان مصنفین نے بیان کیا ہے، اس لئے اس کو اگر مستشرقین اپنے مقاصد کے لئے استعمال کریں تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔

منگمری واٹ نے اس قصے پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ایسی چیز بیان کی ہے جس کا سیرت اور تفسیر کی کتابوں میں ذکر نہیں ہے۔ اسے اس واقعے میں دو چیزیں یقینی نظر آئی ہیں۔ پہلی یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یقیناً کسی وقت قرآن کے حصے کے طور پر ایسی آیات تلاوت کی تھیں جن میں بتوں کی شفاعت کے عقیدے کو تسلیم کیا گیا تھا اور دوسری یہ کہ بعد میں ان آیات کو منسوخ کر دیا گیا۔ منگمری واٹ کے اس بے بنیاد دعوے کو سمجھنے کے لئے، اس کے اپنے الفاظ یہاں نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

"At some times Muhammad must have recited as part of the Quran certain verses which apparently permitted intercession to idols. One version of these is:

Did you consider al-Lat and al-Uzza and al-Manat, the third, the other? Those are the swans exalted;

Their intercession is expected;

Their likes are not neglected.

Then, some time later, he received another

revelation cancelling the last three verses here and substituting others for them:

Did you consider al-Lat and al-Uzza and al-Manat,

the third, the other? For you males and for him females?

That would be unfair sharing.

They are but names you and your fathers named;

God revealed no authority for them; they follow only

opinion and their souls' fancies, though from their lord

there has come to them guidance".

(Muhammad Prophet and States Man. Page 60)

”یہ بات یقینی ہے کہ کسی وقت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن کے حصے کے طور پر کچھ آیات پڑھیں جن میں بظاہر بتوں کی شفاعت کو تسلیم کیا گیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہ آیات یہ تھیں:

کیا تم نے غور کیا لات اور عزی کے بارے میں اور منات کے بارے میں جو تیسری

ہے۔ وہ شاندار پرندے ہیں۔ ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے اور ان جیسی چیزوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پھر کچھ عرصے بعد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس ایک اور وحی آئی جس نے مذکورہ بالا وحی کی آخری تین آیتوں کو منسوخ کر دیا اور ان کے بدلے میں دوسری آیتیں مازل ہوئیں جو یہ ہیں۔

کیا تم نے غور کیا لات اور عزی کے بارے میں اور منات کے بارے میں جو تیسری ہے۔ کیا تمہارے لئے تو بیٹے ہیں اور اللہ کے لئے نری بیٹیاں۔ یہ تقسیم تو بڑی ظالمانہ ہے۔ نہیں پیروی کر رہے یہ لوگ مگر اپنے گمان اور اپنے خیال کی۔ حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آگئی ہے۔“

منگمری واٹ نے ماسخ منسوخ کا یہ افسانہ اپنے تخیل سے گھڑا ہے۔ تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں۔ مستشرق مذکور اس کے ذریعے اسلام پر ایک بڑا خطرناک وار کرنا چاہتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے نزدیک مسلم ماسخ اور منسوخ کی اصطلاحوں کو اپنی مرضی کے معنی پہنا چاہتا ہے۔ وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ ماسخ و منسوخ کا دائرہ لاحدود ہے، یہ ممکن ہے کہ قرآن میں ایک آیت شرک کے حق میں مازل ہو اور دوسری آیت اس کو منسوخ کر دے حالانکہ ماسخ اور منسوخ کا جو قاعدہ مسلمانوں کے نزدیک مسلم ہے، عقائد اس کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔

اس واقعے کے موضوع ہونے کو پہلے بڑی تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔ یہاں ہم مستشرقین کے موقف کے پیش نظر چند باتیں ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

مسلمان کسی واقعے کی حقیقت کو پرکھنے کے لئے دو طریقے اختیار کرتے ہیں۔ پہلے روایت کی سند کو دیکھتے ہیں اور پھر اس کے متن کو پرکھتے ہیں۔ جس روایت کی سند اور متن ہر قسم کی علتوں سے پاک ہوتے ہیں، اس خبر کو مان لیتے ہیں۔ اگر سند اور متن میں کمزوریاں ہوں تو ان کمزوریوں کی نوعیت کے مطابق اس خبر پر حکم لگاتے ہیں۔ اس طرح یا تو روایت کو کلیۃً تسلیم کر لیتے ہیں یا اسے کلیۃً مسترد کر دیتے ہیں اور یا اسے ایسی خبر قرار دیتے ہیں جس

کے صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ غلط ہونے کے امکانات بھی ہیں۔

مستشرقین کے ہاں کسی خبر کی صحت کو پرکھنے کے لئے سند کو پرکھنے کا رواج نہیں حالانکہ خبر کی صداقت کی پہلی کسوٹی خبر کی صداقت ہی ہوتی ہے۔ ان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ مذہبی میدان میں جن خبروں پر ایمان لانے پر مجبور ہیں، ان کے بارے میں ان کو نہ تو یہ پتہ ہے کہ وہ خبریں دینے والے کون ہیں اور نہ ان کو یہ پتہ ہے کہ ان خبروں کے راویوں کا کردار کیا ہے۔ اپنی اس کمزوری کی وجہ سے وہ خبر کی صحت پر کھنے کے اس نظام ہی کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ گویا جس خوبی سے ان کا پندہب محروم ہے، وہ اس خوبی کو اسلام میں بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ روایت کو پرکھنے کا دوسرا طریقہ متن کی جانچ پڑتال ہے اور اس طریقے کو مستشرقین بھی استعمال کرتے ہیں بلکہ ان کے نزدیک خبر کو پرکھنے کا واحد طریقہ ہی یہی ہے۔

مسلمانوں نے ان دونوں کسوٹیوں پر پرکھ کر اس واقعہ کو جھوٹ ثابت کیا ہے اور مدلل انداز میں اس کو مسترد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی معتبر کتابوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ مستشرقین کی خدمت میں عرض ہے کہ ان کے کچھ ہمنو مستشرقین نے ”ہفٹنگ“ کی نگرانی میں صحاح ستہ اور حدیث کی دیگر متن معتبر کتابوں کا جو اشاریہ ”المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث“ کے نام سے مرتب کیا ہے، اس میں اس روایت کا کوئی حوالہ نہیں۔ گویا انہوں نے جن نو کتابوں کو خود منتخب کیا ہے وہ اس قصے کے بیان سے پاک ہیں۔

جب یہ قصہ عقلی اور نقلی طور پر ناقابل اعتبار ہے تو پھر اس کو قابل اعتبار سمجھنے اور اسی کی بنیاد پر اپنے مزمومات کا محل تعمیر کرنے کا مستشرقین کے پاس کیا جواز ہے؟

منطکری واٹ اور دیگر مستشرقین کی یہ منطق بھی عجیب ہے کہ چونکہ یہ واقعہ بہت ہی عجیب ہے، اس لئے ضرور سچا ہوگا۔

کیا ہر حیران کن بات کے سچا ہونے کے اصول کو وہ اپنے روزمرہ معاملات میں تسلیم کرتے ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام کے اکثر واقعات، جن کا تعلق معجزات سے ہے، ان کو مستشرقین اسی لئے مسترد کر دیتے ہیں کہ وہ حیران کن ہیں اور عقل ان کی توجیہ نہیں کر سکتی۔

مستشرقین کہتے ہیں کہ اگر یہ واقعہ سچا نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ایک ایسی بات جو اسلام کے اصولوں کے خلاف تھی، اسے کوئی شخص گھڑتا اور پھر بے شمار مسلمانوں کو اس من گھڑت بات کو تسلیم کرنے کی طرف راغب کر لیتا۔ مستشرقین کی یہ سوچ غلط ہے کیونکہ ایسے ہوتا رہتا ہے کہ کسی مذہب کے دشمن، اس مذہب کے خلاف باتیں گھڑتے ہیں اور پھر اس مذہب کے ماننے والوں سے ان خود تراشیدہ باتوں کو تسلیم کروا لیتے ہیں۔ جیسے کچھ ظالموں نے خدا کے معصوم پیغمبروں پر الزام تراشیاں کیں اور پھر انہیں بائبل کا حصہ بنا دیا گیا۔ سینٹ پال یہودی نے عقیدہ توحید کو تثلیث کا رنگ دیا، خدا کے مقدس رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا افسانہ گھڑا، جس بندے کو خدا نے زندہ آسمانوں پر اٹھالیا تھا، اس کے مصلوب ہونے کا شوشہ چھوڑا اور پھر ان تمام کفریہ عقائد کو بائبل کا حصہ بنا دیا اور عیسائیت کے دشمنوں نے ان کے مذہب کے اصولوں کے خلاف جو باتیں گھڑی تھیں، عیسائیوں کی اکثریت انہیں تسلیم کرتی آرہی ہے۔

اسلام کی شان اس سلسلے میں امتیازی ہے۔ مسلمانوں کے پاس قرآن حکیم ہے جس کی حفاظت نزول قرآن کے دوران بھی اور بعد میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ قدرت پر لے رکھی ہے۔ اس میں باطل کسی طرح سے دخل انداز نہیں ہو سکتا۔ احادیث کا معاملہ قرآن حکیم سے مختلف ہے۔ احادیث طیبہ کو خدائی حفاظت کی ضمانت میسر نہیں ہے۔ ان کی حفاظت اسی طرح امت مسلمہ کے ذمہ لگائی گئی ہے جس طرح تو رات وانجیل کی حفاظت متعلقہ امتوں کے ذمہ لگائی گئی تھی۔

جس طرح تو رات وانجیل میں تراجم اور اضافے کئے گئے ہیں، اسی طرح انسانوں نے اپنی مختلف خواہشات کے تحت احادیث طیبہ میں بھی اسرائیلیات اور موضوعات کو داخل کرنے کی کوششیں کیں۔ لیکن اس میدان میں بھی امت مسلمہ کی شان زالی نظر آتی ہے۔

بائبل کی تمام ایسی باتیں جو یہودیت اور عیسائیت کے اصولوں کے بھی خلاف ہیں اور ان میں سے بے شمار چیزیں عقل اور علوم جدیدہ کی تحقیقات کے بھی خلاف ہیں، وہ بائبل کا حصہ بن چکی ہیں۔ اب ان مذاہب کے ماننے والوں کے پاس دو ہی طریقے ہیں کہ یا تو

بائبل میں جو رطب و یابس ہے، اسے جوں کا توں قبول کر لیں اور یا ساری بائبل کو مسترد کر دیں۔ اور عملاً یہی ہو رہا ہے کہ جو لوگ مذہب کے ٹھیکہ دار بنے ہوئے ہیں، وہ موجودہ بائبل کے ہر لفظ کو کلام اللہ ثابت کرنے پر مصر ہیں اور عام عیسائی بائبل کو ایک ناقابل قبول کتاب سمجھ کر مسترد کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے غلط اور صحیح میں امتیاز کرنے اور سچ اور جھوٹ کو پرکھنے کے لئے ایک نہیں کئی علوم ایجاد کئے ہیں۔ وہ صحیح اور غلط کو پرکھنے کے اصولوں پر ہر روایت کو پرکھتے ہیں۔ اگر وہ روایت ان اصولوں پر پوری اترتی ہے تو اسے تسلیم کر لیتے ہیں وگرنہ اسے مسترد کر دیتے ہیں۔

قصہ غرائیق کو بھی مسلمانوں نے جرح و تعدیل کے انہی اصولوں پر پرکھا ہے اور اسے اس لئے مسترد کر دیا ہے کہ وہ ان مقررہ اصولوں کے مطابق ناقابل اعتماد ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ مسلمان یہ کسوٹی صرف ان روایات کو پرکھنے کے لئے استعمال نہیں کرتے، جو اسلام میں کوئی نقص ثابت کر رہی ہوں بلکہ ایسی روایات جن میں اسلام یا اسلام کے کسی شاعر کی تعریف کی گئی ہو اور جو بظاہر اسلام اور مسلمانوں کے حق میں نظر آتی ہوں، انہیں پرکھنے کے لئے بھی مسلمان یہی معیار استعمال کرتے ہیں۔

قصہ غرائیق کو بعض مسلمان مصنفین نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس قصے کو گھڑنے والا مستشرقین ہی کا کوئی ہموار ہے۔ جس طرح قرون وسطیٰ میں مستشرقین اسلام کے متعلق افسانے گھڑ کر مشہور کرتے رہے ہیں، اسی طرح یہ افسانہ بھی مستشرقین ہی کے کسی پیشرو نے گھڑا ہے۔ بعض مسلمان مصنفین نے اس افسانے کو اپنی کتابوں میں جگہ دینے کی فحش غلطی کی لیکن امت نے کبھی اجتماعی طور پر اس افسانے کو تسلیم نہیں کیا بلکہ محقق علماء نے اس قصے کے بطلان کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا، اور امت مسلمہ جس کو اس افسانے کے ذریعے گمراہ کرنے کی کوشش دشمنان اسلام

نے کی تھی، اسے اس گمراہی سے بچالیا۔ والحمد للہ علی منہ و کرمہ و فضلہ

(ضیاء النبی جلد ۶ ص ۶۳۶ تا ۶۳۳ - ضیاء القرآن پبلیکیشنز لاہور)

روایات غرائیق میں تضادات

امام طبری و امثالہ نے افسانہ غرائیق کے سلسلہ میں جتنی روایات بھی نقل کی ہیں ان کے متن میں شدید اضطراب اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور ان میں ایسی ایسی خرافات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے جو سراسر قرآن کریم سے متصادم اور مقام نبوت و رسالت کی اہانت پر مبنی ہیں۔

اب روایات کا تضاد ملاحظہ فرمائیں:

ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دن کے وقت مسجد حرام میں نماز کی حالت میں تھے اور صحابہ بھی اس میں شریک تھے (معلوم نہیں کہ یہ حضرات اس وقت کون سی نماز ادا کر رہے تھے، یہ صبح و مغرب کی نماز کا وقت بھی نہیں تھا جبکہ پانچ نمازیں تو اس واقعہ کے بہت بعد معراج کے موقع پر فرض قرار دی گئی تھیں)

دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی حالت میں نہیں تھے اور قریش کی مجلس میں شریک تھے۔

ایک روایت میں ہے کہ ”شرکیہ کلمات“ بھول چوک سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکل گئے تھے۔

دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اونگھ آئی تو شیطان نے آپ کی زبان پر یہ کلمات ڈال دیئے۔

تیسری روایت میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقف کیا تو اس دوران شیطان نے آپ کی آواز سے آواز ملا کر کہے۔

ایک روایت میں ہے کہ شیطان نے مشرکین کو اس وہم میں مبتلا کیا کہ یہ کلمات آپ نے ہی ادا کئے ہیں۔

دوسری روایت میں ہے کہ صحابہ کرامؓ نے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک اور آپ ہی کی آواز میں یہ کلمات سنے تھے اسی لئے انہوں نے نماز کے بعد آپ سے دریافت کیا تھا کہ کیا یہ نئی وحی مازل ہوئی ہے؟

ایک روایت میں ہے کہ صحابہ کرامؓ نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ان کلمات کو وحی سمجھ کر خاموشی اختیار کر لی تھی کیونکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی غلطی، وہم اور لغزش کا ہرگز کوئی شک نہیں کرتے تھے اور بلا چوں و چرا جو کچھ آپ اپنے پروردگار کی طرف سے پیغام دیتے تھے اس کی تصدیق کرتے تھے۔ اس لئے انہیں اس بات کا سرے سے کوئی احساس ہی نہیں ہوا کہ یہ کلمات شیطان کے القاء کئے ہوئے ہیں۔

دوسری روایت میں ہے کہ صحابہ کرامؓ نے ان شیطانی کلمات کو سرے سے سنا ہی نہیں تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ مشرکوں نے اپنے معبودوں کی تعریف سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سجدہ کیا تھا۔

دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کی عظمت و صداقت سے متاثر ہو کر سجدہ کیا تھا۔

ایک تیسری روایت میں ہے کہ آپ نے جب سر مبارک سجدے سے اٹھایا تو کفار مکہ نے آپ کو اٹھا کر مکہ کے طول و عرض میں پھرایا اور یہ نعرے لگاتے رہے کہ یہ بنو عبد مناف کے نبی ہیں۔ (الدر المنثور جلد ۳ ص ۳۶۸)

امام طبری ہی کی روایت میں ہے کہ:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید خواہش تھی کہ اللہ اب کوئی ایسی بات مازل نہ فرمائے جس سے مشرکین مزید نفرت کریں اور ہمارے درمیان فاصلہ پیدا ہو،

دوسری روایت میں ہے کہ یہ کلمات ادا کرتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا کہ یہ کلمات شیطان کے القاء کردہ ہیں اور آپ نے اسے وحی الہی سمجھ کر ادا کیا پھر بعد میں بھی اسے وحی ہی سمجھتے رہے۔ یہاں تک کہ جبریل اسی رات یا کئی

سالوں کے بعد آپ کے پاس آئے اور آپ نے سورۃ النجم ان کے سامنے تلاوت کی تو یہ شریک کلمات بھی پڑھے تو جبریل نے ٹوکا اور کہا یہ آپ کیا پڑھ رہے ہیں میں نے تو آپ کو نہیں بتائے تھے؟ یہ سن کر آپ بہت غمگین اور ملول ہوئے اور سخت ڈر گئے کہ میں نے اللہ تعالیٰ پر افتراء پردازی کی اور ایسی بات اس کی طرف منسوب کر دی جو اس نے نہیں کہی تھی، میں نے شیطان کی بات مان لی اور وہ اللہ تعالیٰ کے امر میں میرے ساتھ شریک ہو گیا۔

آپ کے اس احساس اور مغموم و پریشان ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کی تسلی و اطمینان کی خاطر سورۃ الحج کی زیر بحث آیت (۵۲) مازل فرمائی۔

روایات کے اختلاف و تضاد کے علاوہ جن شریک کلمات کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ شیطان نے آپ کی زبان مبارک پر جاری کئے تھے ان شیطانی کلمات کے الفاظ بھی مختلف نقل کئے گئے ہیں۔ امام طبری کی تفسیر میں بھی اس کے مختلف نمونے ملتے ہیں:

۱۔ تلك الغرائيق العلي وان شفاعتهن لترتجي

۲۔ تلك الغرائيق العلي وان شفاعتهن ترتضي

۳۔ تلك الغرائيق العلي و شفاعتهن، مثلهن لا ينسى

۴۔ وهي الغرائيق العلي و شفاعتهن ترتجي

۵۔ تلك الغرائيق العلي وان شفاعتهن لترتجي

۶۔ ان تلك الغرائيق العلي منها الشفاعة ترتجي

۷۔ تلك الغرائيق العلي منها الشفاعة ترتجي

۸۔ ان شفاعتهن ترتجي

(تفسير الطبري المجلد التاسع ص ۱۷۷ تا ۱۷۸)

امام جلال الدین سیوطی نے ”افسانہ غرائیق“ سے متعلق ۱۸ روایات نقل کی ہیں۔ ان میں مذکورہ شیطانی کلمات کے علاوہ کچھ مزید الفاظ بھی ملتے ہیں:

۹۔ اتھن لفي الغرائيق العلي وان شفاعتهن لترتجي

- ۱۰۔ و اتھن الغرائیق العلی و ان شفاعتھن لہی التی ترتجی
۱۱۔ و ہی الغرائیق العلی و شفاعتھن ترتجی
۱۲۔ و ان شفاعتھا لترتجی و اتھا لمع الغرائیق العلی

(الدر المثور جلد ۴ - ص ۳۶۷-۳۶۶)

مختلف الفاظ پر مبنی ”شیطانی آیات“ کے بارے میں یہی بتایا گیا ہے کہ ان کا اجراء سورۃ النجم کی آیات ۱۹-۲۰ کے بعد ہوا جبکہ امام سیوطی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے یہ کلمات آیت ۱۹-۲۰ کے بعد نہیں بلکہ آیت ۲۱ (وَلَا إِذَا قَسَمْتَ بِهٖ زُی) کے بعد جاری کرائے۔ (حوالہ مذکور)

افسانہ غرائیق کی روایات میں لفظی تغیر اور تضاد و اضطراب دیکھنے سے ہی ان کی اصل حقیقت بھی خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ ہر وہ مسلمان جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت، ناموس اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ و ارفع مقام کا ذرہ بھی لحاظ و پاس ہے وہ فوری طور پر افسانہ غرائیق سے متعلق تمام روایات کو لغو اور باطل ٹھہرا دے گا۔

روایات غرائیق کی استنادی حیثیت

امام طبری نے سورۃ الحج آیت ۵۲ کی تفسیر میں افسانہ غرائیق کے حوالے سے کل پندرہ روایات نقل کی ہیں، ہر روایت کے آخری راوی کی روایات کی تعداد حسب ذیل ہے:

۱۔ محمد بن کعب القرظی، ۲ روایتیں

۲۔ ابو العالیہ، ۲ روایتیں

۳۔ سعید بن جبیر، ۲ روایتیں

۴۔ مجاہد، ۲ روایتیں

۵۔ ابن شہاب، ایک روایت

۶۔ العساک، تین روایتیں

۷۔ ابن عباسؓ، تین روایتیں

(تفسیر الطبری لمجلد التاسع ص ۱۷۸ تا ۱۷۷ تحت رقم ۳۲۷ تا ۳۳۱ طبع بیروت)

امام طبری کی مذکورہ روایات کے علاوہ دیگر مؤلفین و جامعین کی اسناد سمیت تمام روایات کی محدثین کرام نے خوب تر و دید و تضعیف کی ہے اور انہیں باطل ثابت کرتے ہوئے یہ قرار دیا ہے کہ غرائیق کی روایت ہر سند سے مرسل ہے یا منقطع ہے۔

اگر افسانہ غرائیق کی ذرہ برابر بھی کوئی حقیقت ہوتی تو یہ واقعہ مکہ کا ایک تاریخی واقعہ ہوتا اور متعدد و کثیر صحابہؓ اسے بیان کرتے مگر سخت حیرت ہے کہ اس افسانے کو بیان کرنے والوں میں کوئی صحابیؓ شامل نہیں ہیں۔ چالاک اور کذاب راویوں نے صرف حضرت ابن عباسؓ کا نام استعمال کیا ہے۔ اس افسانے کی ان کی طرف نسبت ہی غلط ہے۔

اب اس افسانے کی اسناد ملاحظہ فرمائیں: سعید بن جبیر، ابو العالیہ، ابن شہاب، قتادہ

امام طبری --- کون؟

روایات غرائیق کی استنادی حیثیت

اور ضحاک کی روایات مرسل ہیں۔ ان کے نیچے کے راویوں میں ضعیف، مدلس اور کذاب راوی بھی شامل ہیں۔ پیچھے زیر عنوان ”رواۃ طبری“ ابن حمید، سلمہ امش، ابن اسحاق، سدی، کلبی کے حالات گزر چکے ہیں۔

طبری کی ایک روایت محمد بن کعب قرظی و محمد بن قیس اور ایک روایت اکیلے محمد بن کعب قرظی سے مروی ہے۔ قرظی کی ایک روایت میں ابو معشر ضعیف اور لیس ہشتی ہے۔ دوسری روایت جس میں قرظی اکیلے ہیں اس کے نیچے راویوں میں ابن حمید، سلمہ امش، اور ابن اسحاق ہیں جو ضعیف، کذاب اور مدلس ہیں جبکہ محمد بن کعب القرظی خود بھی ”ذو عد“ کے وقت موجود نہیں تھے انہوں نے اپنے ”بزرگوں“ سے سن کر اسے آگے روایت کیا ہے۔ معلوم نہیں کہ کس سے یہ افسانہ سنا تھا۔

افسانہ غرائیق کے راویوں میں صرف حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ صحابی ہیں لیکن وہ ہجرت سے تین سال پہلے مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے تھے جبکہ ”غرائیق“ کا قصہ ان کی پیدائش سے بھی پانچ سال پہلے پیش آچکا تھا۔

علاوہ ازیں حضرت ابن عباسؓ کی روایت چار طرق سے مروی ہے۔ پہلے طریق میں کلبی ہے جو کذاب ہے۔ دوسرے میں ایک مجہول راوی ہے۔ تیسرے میں ابو بکر ہذلی ہے جو متروک ہے۔ چوتھے طریق میں محمد بن سعد، ان کے والد سعد بن محمد، ان کے چچا حسین بن حسن، ان کے والد حسن بن عطیہ اور ان کے والد عطیہ العوفی سب ضعیف اور بعض کذاب ہیں۔ امام طبری کی منقولہ روایت کی سند ملاحظہ فرمائیں:

حلیثی محمد بن سعد قال: ثنی اُبی، قال: ثنی عُمی، قال: ثنی اُبی، عن اُبیہ عن ابن عباسؓ... (تفسیر الطبری المجلد التاسع ص ۱۷۶، تحت رقم ۲۵۳۳۳)

امام طبری کہتے ہیں کہ مجھ سے یہ روایت محمد بن سعد نے بیان کی انہوں نے اسے اپنے باپ سعد سے سنا، محمد کے باپ سعد نے اسے اپنے چچا حسین سے سنا، حسین نے اسے اپنے اُحس سے سنا (یہ حسن امام طبری کے شیخ محمد کے پردادا تھے) حسین کے باپ اُحس نے اسے اپنے

امام طبری --- کون؟

روایات غرائیق کی استنادی حیثیت

باپ عطیہ عوفی سے اور انہوں نے اسے عبداللہ بن عباسؓ سے سن کر روایت کیا ہے۔ اس سند پر مفصل بحث پیچھے زیر عنوان ”تو بن آدم...“ منقولہ روایات کی استنادی حیثیت“ گزر چکی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ”افسانہ غرائیق“ سے متعلق روایات کو کثرت اسانید کی وجہ سے قبول کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

إما ضعيف و إما منقطع، ولكن كثرت الطرق تدل أن للقصة أصلاً، (فتح الباری، جلد ۸- ص ۴۹، کتاب التفسیر- تفسیر سورة الحج)
ان روایات کی تمام اسانید ہر چند کہ ضعف، انقطاع اور ارسال سے خالی نہیں لیکن چونکہ یہ روایت متعدد اسانید سے منقول ہے اس لئے اس کی کثرت اسانید سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی اصل ہے۔

جو حضرات ”مرسل“ حدیث کو جہت تسلیم کرتے ہیں ان کے لئے ابن حجر کے اس قول سے کچھ ”گنجائش“ نکل سکتی ہے کہ وہ قرآن کے مقابلے میں ان روایتوں سے واقعہ کی صحت پر استدلال کریں۔ اگر بالفرض قرآن سے یہ روایات متصادم نہ بھی ہوتیں تو جو لوگ ”مراسیل“ کو جہت نہیں مانتے تو وہ اس بناء پر ان روایات کا انکار کر سکتے تھے کہ ان کی صحت ثابت ہی نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر نے ”مراسیل“ کو جہت تسلیم کرنے کی صورت ہی میں واقعہ کی صحت کا دعویٰ کیا ہے لیکن جمہور محدثین کے نزدیک ”مراسیل“ جہت نہیں ہیں انہوں نے ”مراسیل“ کو ضعیف کے درجے میں رکھا ہے جن پر ”فضائل“ کے باب میں بھی غیر مشروط طور پر عمل نہیں کیا جاسکتا، عقائد کے ضمن میں تو ”ضعیف“ سے استدلال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ ظاہر ہے کہ ”عصمت انبیاء“ کا تعلق ”عقیدہ“ کے ساتھ ہے۔

جمہور محدثین (جو مراسیل کو ضعیف کے درجے میں رکھتے ہیں) کی دلیل یہ ہے کہ سند میں آخری راوی کا نام جو چھوڑ دیا گیا ہے ہو سکتا ہے وہ صحابی کا نہ ہو، کسی دوسرے شخص کا ہو۔ کیا یہ ضروری ہے کہ تابعی نے جو نام چھوڑ دیا ہے وہ یقینی طور پر صحابی ہی کا ہوگا؟ جب یہ

احتمال پیدا ہو گیا تو پھر اس میں ایک احتمال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”متر وک“ راوی ثقہ بھی ہے یا نہیں، اگر وہ ثقہ نہیں ہے تو پھر اس کے کذاب ہونے کا بھی احتمال ہو سکتا ہے۔ ان احتمالات کی وجہ سے مرسل روایت کیوں کر حجت ہو سکتی ہے؟

صحیح مسلم کے مقدمے میں یہ وضاحت موجود ہے کہ مرسل روایت اہل علم کے اصل قول میں حجت نہیں ہے۔ ابن الصلاح نے بھی اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ مرسل سے احتجاج نہیں ہو سکتا کیونکہ مرسل پر ضعیف ہونے کا حکم لگایا گیا ہے۔ اسی راے پر جمہور محدثین کا اتفاق ہے اور انہوں نے اپنی کتابوں میں اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ جن فقہاء نے ”مراسل“ سے احتجاج کیا ہے تو انہوں نے بھی اس پر کچھ ”شرائط“ عائد کی ہیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مرسل روایتوں سے وہاں احتجاج ہو سکتا ہے جہاں ”ظن“ کافی ہوتا ہے لیکن ان مسائل میں اس کو حجت بنانا کسی کے بھی نزدیک صحیح نہیں ہے جو عقیدہ سے متصادم ہیں یا وہ باتیں جو عصمت انبیاء کے منافی ہوں یا جن سے اسلام کے بنیادی عقیدہ پر زور پڑتی ہو، ایسے تمام مقامات پر مرسل روایتوں سے احتجاج قطعاً جائز نہیں ہے۔

علماء امت کے نزدیک یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ خبر واحد اگرچہ صحیح ہو لیکن وہ کسی عقیدہ کی بنیادی دلیل نہیں بن سکتی ہے کیونکہ عقیدہ جس یقین کو چاہتا ہے وہ خبر واحد سے حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ جب صحیح خبر واحد کا یہ حال ہے تو پھر ضعیف، منکر اور موضوع روایتوں کو عقیدہ کے سلسلہ میں کیوں کر حجت بنایا جاسکتا ہے؟

افسانہ غرائیق کے سلسلہ میں امام طبری نے جتنی بھی روایتیں پیش کی ہیں ان میں سے صرف تین روایتوں کی سند میں حضرت عبداللہ بن عباس کا نام موجود ہے لیکن ان سے آگے روایت کرنے والے ضعیف، غیر ثقہ اور کذاب سے بھی مہم ہیں۔

حافظ ابن حجر پر سخت تعجب ہے کہ انہوں نے افسانہ غرائیق کی روایات کے متعلق محض کثرت اسانید اور کثرت طرق کی بناء پر یہ کہہ دیا کہ ”ان کی کوئی نہ کوئی اصل ہے۔“ یہ بات بعید از فہم ہے کہ ایک روایت جس کا تسلیم کرنا عقلاً محال ہے اور جس کی تمام

اسانید میں خود ابن حجر کے بقول ”ضعف، انقطاع اور ارسال“ جیسی علین موجود ہیں صرف کثرت طرق سے اس کی ”اصل“ کیسے ثابت ہو جاتی ہے؟ جو لوگ حدیث وضع کرنے سے نہیں شرماتے اور حدیث پر حدیث وضع کئے جا رہے ہیں تو ان کے لئے کثرت طرق اور کثرت اسانید کا اہتمام کرنا کون سا مشکل امر ہے؟

علامہ شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) لکھتے ہیں کہ:

... مگر باقی قصہ (غرائیق) بے ہودہ اور ناقابل ذکر ہے اور اکثر کبار محدثین مثلاً بیہقی، قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری، علامہ نووی نے اس کو باطل اور موضوع لکھا ہے۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ بہت سے محدثین نے اس روایت کو بہ سند نقل کیا ہے ان میں طبری، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مرددہ، ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، ابو معشر شہرستانی عام رکھتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر تعجب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کو جن کے کمال فن حدیث پر زمانہ کا اتفاق ہے، اس روایت کی صحت پر اصرار ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس روایت کی تین سندیں صحیح کی شرط کے موافق ہیں اور یہ روایتیں مرسل ہیں اور ان سے وہ لوگ استدلال کر سکتے ہیں جو مرسل روایتوں کے قائل ہیں۔ (سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ جلد اول ص ۲۳۶-۲۳۷۔ تحت ہجرت حبش)

اس تفصیل سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ”افسانہ غرائیق“ کی روایات سنداً ضعیف، منقطع اور مرسل ہیں جبکہ ”مناہ“ موضوع و باطل ہیں۔ کیونکہ ان میں ایسی باتیں بیان ہوئی ہیں جو عقیدہ عصمت انبیاء کے منافی اور قرآن مجید اور دین کے بنیادی اصولوں سے متصادم ہونے کے علاوہ اہلسنت والجماعت اور اسلام کے مسلمہ عقائد کے خلاف ہیں۔

افسانہ غرائیق کا قرآن عزیز سے تصادم

امام طبری نے سورۃ الحج آیت ۵۲ کی تفسیر میں افسانہ غرائیق سے متعلق جو پندرہ روایات نقل کی ہیں ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ:

سورۃ النجم کی آیات ۱۹-۲۰ کی تلاوت کے بعد شیطان نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر ”شرکیہ کلمات“ ڈال دیئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ ان آیات کے ساتھ ان کلمات کو بھی پڑھا جسے موجود صحابہ کرامؓ اور مشرکین نے سنا۔ بعد میں حضرت جبریل علیہ السلام کے توجہ دلانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت غمگین ہوئے اور فرمایا: میں نے اللہ تعالیٰ کی ذات پر افتراء باندھا اور جو بات انہوں نے نہیں فرمائی تھی میں نے وہ کہہ دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں تسلی دینے کے لئے سورۃ الحج کی آیت ۵۲ نازل فرمائی۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ شیطان اپنی مرضی سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو چاہے کہلا سکتا ہے۔ نعوذ باللہ من ذلك۔

یہ قطعاً محال اور ناممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قصداً قرآن میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ فرمائیں۔ اسی طرح بھول چوک سے بھی آپ وحی الہی میں اضافہ نہیں فرما سکتے تھے اور پھر جو بات عقیدہ تو حید کے منافی ہو وہ ایک رسول یا نبی کی زبان سے کیوں کر نکل سکتی ہے؟ اگر ”سہو و نسیان“ کے طور پر بھی اس ”افسانہ“ کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس سے سارا سلسلہ رسالت ہی بے وزن اور ناقابل اعتبار ہو جاتا ہے اور دین کے ہر پہلو میں اہل باطل ”سہو و نسیان“ کی گنجائش نکال سکتے ہیں۔

اس تصور اور شک وارتباب کی بیخ کنی کے لئے ”عصمت انبیاء“ کا بنیادی عقیدہ ضروری ہے جس کی رو سے دین کی بنیادی تعلیم میں ”سہو و خطا“ کی راہ سے بھی ”غرض“ نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ نے جب حکم عدولی پر شیطان کو قیامت تک مردود و ملعون ٹھہرا کر جنت سے نکلنے کا حکم دیا تو اس نے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک مہلت مانگی: (رَبِّ فَانْظُرْنِي إِلَى يَوْمِ يُنْعَثُونَ ۝) جو اسے اس کی خواہش کے مطابق مل گئی: (فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ۝) یہ مہلت ملنے کے بعد شیطان نے اعلان کیا کہ: ”فَبِعِزَّتِكَ لَا غَوْيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلَصِينَ ۝“ (ص ۸۲-۸۳)

”تیری عزت کی قسم! ضرور میں ان سب کو گمراہ کروں گا سوائے ان میں سے تیرے مخلص بندوں کے۔“

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے شیطان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

”رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَا تُزِيقْهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَا غَوْيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلَصِينَ ۝“ (سورۃ الحجر ۳۹-۴۰)

”اے میرے پروردگار! اس وجہ سے تو نے مجھے ناامید کر دیا تو میں بھی ان کے لئے زمین میں (برے کاموں کو) ضرور خوش نمائندوں گا اور میں ضرور گمراہ کروں گا ان سب کو سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔“

اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: ”هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ إِنَّ عِبَادِي لَوِشُّ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ۝“ (الحجر ۴۱-۴۲)

”یہ سیدھا راستہ ہے جو میری طرف آتا ہے بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا مگر وہ جو تیری پیروی کرتے ہیں گمراہوں میں سے۔“

یہ ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو نسل انسانی کے لئے ایک امتحان تو بنایا ہے لیکن اس نے شیطان کو ان پر مسلط نہیں کیا۔ اس کا ہر پیر صرف یہ ہے کہ وہ چھپ کر انسان کے دل میں دوسرہ ڈالتا ہے، وہ برے کاموں کو خوش نمائند کر دیتا ہے۔ جب انسان ہدایت ربانی کو نظر انداز کر کے شیطان کے مزے سن کر وہ کاموں کو اختیار کر لیتا ہے تو تب اس کے دامنِ دیر میں پھنس جاتا ہے۔

جو لوگ شیطان کی اتباع کر کے جہنم اور عذاب الہی کا مستحق ٹھہریں گے ان سے

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائبق کا قرآن عزیز سے تصادم

شیطان مخاطب ہو کر کہے گا کہ: ”وَمَا كَانَ لِيْ عَلَیْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ اِلَّا اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاَسْتَجِیْبُكُمْ لِيْ فَلَا تَلُوْا مُؤْمِنِيْ وَلَوْ مُؤْمَا اَنْفُسُكُمْ“ (سورۃ ابراہیم ۲۲)

”اور میرا تم پر کوئی زور نہ تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں بلایا تو تم نے میرا کہنا مان لیا۔ پس تم مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ہی ملامت کرو۔“

اس گروہ کے برعکس جو لوگ صراط مستقیم پر قائم رہتے ہیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ ان پر شیطان کا زور ہرگز نہیں چل سکتا۔ ارشاد باری ہے:

”اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلٰی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَكَّلُوْنَ ؕ اِنَّمَا سُلْطٰنُہٗ عَلٰی الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَہٗ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِہٖ مُّشْرِکُوْنَ ؕ“ (سورۃ النحل ۹۹-۱۰۰)

”یقیناً اس کا ان لوگوں پر کچھ زور نہیں (چلتا) جو ایمان لائے ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔ سوا اس کے نہیں کہ اس کا زور ان لوگوں پر (چلتا) ہے جو اس کے دوست بنتے ہیں اور ان لوگوں پر جو اس کی وجہ سے شرک کرنے والے ہیں۔“

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ: ”اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمۡ سُلْطٰنٌ ط وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِبٰلًا“ (سورۃ بنی اسرائیل ۶۵)

”یقیناً جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا اور کافی ہے تیرا رب اپنے بندوں کی کارسازی کے لئے۔“

قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات سے واضح ہوتا ہے کہ:

اللہ کے وہ بندے جن کے دلوں میں ایمان کی شمع صوفشاں ہے، جن کے قول و عمل میں خلوص کی چاشنی ہے، جو اپنے رب پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں اور جنہیں ان کے رب نے خود ”عِبَادِی“ کہہ کر پکارا ہے شیطان کا ان پر کچھ زور نہیں چل سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ شیطان حضرت عمرؓ کے سائے سے بھی بھاگتا تھا اور حضرت عمرؓ جس راستے سے گزر رہے ہوتے تھے شیطان وہ راستہ بھی چھوڑ دیتا تھا۔

یا ابن الخطاب! والذی نفسی بیدہ مالقیک الشیطان سالکاً فجاً الا

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائبق کا قرآن عزیز سے تصادم

سلک فجاً غیر فجک (متفق علیہ)

ایک دوسری روایت میں ہے: ”ان الشیطان لیخاف منک عمر“ (ترمذی) تحقیق شیطان تم سے اے عمر ڈرتا ہے۔

امام اہل سنت مولانا عبدالحکیم لکھنویؒ لکھتے ہیں کہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کی کسی بات میں شیطان کا دخل نہیں ہو سکتا۔ یہ صفت اگر عصمت نہیں تو ”طل عصمت“ ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ (خلفائے راشدین ص ۱۶۶، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی)

جب شیطان کا اللہ تعالیٰ کے ان مخلص عام بندوں (جو ایمان اور توکل کی صفات سے متصف ہوں) پر کچھ زور نہیں چل سکتا تو پھر اس کا انبیائے کرام پر اثر انداز ہونا کیوں کر تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر بھی ”صادق، مخلص، مومن اور متوکل علی اللہ“ کوئی ہو سکتا ہے؟

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ”افسانہ غرائبق“ کی نسبت کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ انبیاء و رسل کے آسمانی علوم و پیغامات کی حفاظت کا یوں ذکر فرماتے ہیں کہ: فَاِنَّہٗ یَسْئَلُکَ مِنْ یَدِیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ رَّصَدًا ؕ لَیَعْلَمَنَّ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسَالَتِ رَبِّہِمۡ وَ اَحَاطَ بِمَا لَکُمۡہِمۡ وَ اَخْضٰی کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ (سورۃ الجن ۲۷-۲۸)

”پس وہ یقیناً اس کے آگے اور اس کے پیچھے نگاہبان و محافظ مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے ہیں۔ (درحقیقت پہلے ہی) اللہ ان کے حالات کا احاطہ کئے ہوئے ہوا ہر چیز کو اس نے گنتی کے لحاظ سے شمار کر رکھا ہے۔“

جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کی حفاظت کا سخت اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ جنوں کا قول ہے کہ:

وَ اَنَا لَمُسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْتُ ہَا مُلَیْکَ حَرَسًا سَلِیْلًا وَ شُہْبًا ؕ وَ اَنَا کُنَّا نَقْعُدُ مِنْہَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ یَسْتَمِعُ الْاَنَ یَجِدُ لَہٗ شَہَابًا رَّصَدًا ؕ (سورۃ الجن ۸-۹)

”اور یقیناً ہم نے آسمان کو چھوا تو اسے سخت طاقتور نگہبانوں اور شہابوں سے بھرا ہوا

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائبق کا قرآن عزیز سے تصادم

پایا اور یقیناً ہم اس کے پھٹنے کی جگہوں میں سننے کے لئے بیٹھا کرتے تھے۔ پس جو کوئی سننا چاہے تو وہ اپنے لئے ایک بھڑکتا شعلہ نگہبان پائے گا۔“

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے۔ اس کتاب مقدس میں کوئی کمی کی جاسکتی ہے اور نہ ہی زیادتی: ”إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ“ (الحجر ۹) بے شک ہم ہی نے یہ قرآن نازل کیا اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ”لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلُ مِّنْ حِجَابٍ خَبِيرٍ“ (م ۴۲) بطل اس کے پاس پھٹک بھی نہیں سکتا اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے، یہ کتاب بڑی حکمت والی اور قابل تعریف ہستی کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔

آسمانی ہدایت کی حفاظت کا یہ اہتمام اسے ہر قسم کی دخل اندازی سے محفوظ رکھنے کے لئے ہی کیا گیا تھا۔ اس وحی میں نیو نیو جنوں اور شیطانوں کو کسی قسم کی دخل اندازی کی جرأت تھی اور نہ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی طرف سے اس میں کچھ تغیر و تبدل کرنے کی اجازت تھی:

قُلْ مَا يَكُونُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعْ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ اِنِّىْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَّبِّىْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ“ (سورہ یونس ۱۵)

”اے رسول! کہہ دو کہ مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو میں بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔“

کفار مکہ کے مختلف حربوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

وَإِنْ كَانُوا لَيُفْسِدُنَّكَ فِى الْبَحْرِ لَوَحْيًا إِلَيْكَ فَتَنَّاكَ فِى الْبَحْرِ ۖ وَإِذَا لَأَخْلُوكَ بِحُلَيْنٍ ۖ وَلَوْ لَا اَنْ يُفْسِدَكَ لَقَدْ كُنْتَ تَرَكُنَّ اِلَيْهِمْ شِئًا قَلِيْلًا ۚ اِذَا لَذَقْنَكَ ضِعْفَ الْخَبْرَةِ وَضِعْفَ الْمَمَآةِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا“ (سورہ بنی اسرائیل ۷۵-۷۳)

”اور قریب تھا کہ جو کچھ ہم نے آپ کی طرف وحی کیا تھا یہ لوگ اس کی نسبت آپ کو فتنہ میں ڈال دیتے تاکہ آپ اس کے خلاف ہم پر افتراء کر دیں اور اس صورت میں وہ آپ

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائبق کا قرآن عزیز سے تصادم

کو دوست بنا لیتے۔ اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو یقیناً آپ ان کی طرف ضرور بہت تھوڑا سا جھکنے کے قریب ہو جاتے۔ (بفرض محال اگر آپ ایسا کرتے) تو اس وقت ہم آپ کو کچھ کھاتے دو گنا عذاب دنیا میں اور دو گنا عذاب موت کے بعد۔ پھر آپ نہ پاتے اپنے لئے ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار۔“

امام طبری نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ مذکورہ آیات افسانہ غرائبق کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں (تفسیر الطبری جلد ۹ ص ۱۷۵ تحت رقم ۲۵۳۲۷)

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ ۚ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۚ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۚ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ“ (سورہ الجاثیہ ۲۷-۲۴)

”اور اگر یہ (محمد) ہم پر بعض باتوں کا افتراء کرتے تو ہم ضرور ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے پھر ہم ضرور ان کی شاہ رگ کاٹ ڈالتے۔ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔“

اللہ تعالیٰ یہ آگاہ فرما رہے ہیں کہ کفار یہ کوشش کرتے رہے کہ آپ وحی میں کچھ تغیر و تبدل کر دیں یا ہم پر ہی کوئی افتراء کر دیں اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ ان کی طرف ضرور مائل ہو جاتے۔ اگر آپ ہم پر کوئی افتراء پر دازی کرتے تو ہم شاہ رگ کاٹ ڈالتے۔

لیکن ہمارے ثابت قدم رکھنے کی وجہ سے آپ نے نہ تو وحی میں کچھ تغیر و تبدل کیا، نہ آپ کفار کی طرف مائل ہوئے اور نہ ہی آپ نے ہم پر کوئی افتراء پر دازی کی۔

اللہ تعالیٰ تو ”افتراء پر دازی“ کی تردید فرما رہے ہیں مگر امام طبری خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یہ اعتراف نقل کر رہے ہیں کہ:

”فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: افتريت على الله وقلت على الله ما لم يقل“ (تفسیر الطبری جلد ۹ ص ۱۷۵ تحت رقم ۲۵۳۲۷)

”میں نے ”شیطانی آیات“ پڑھ کر اللہ پر افتراء مہاندھا ہے اور میں نے اللہ کی طرف وجہات منسوب کی ہے جو اس نے نہیں کہی تھی۔“

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق کا قرآن عزیز سے تصادم

یہی نہیں بلکہ امام طبری (العیاذ باللہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی افتراء پر دازی پر جبریل امینؑ کو کواہ بھی ٹھہرا رہے ہیں۔

و اُتٰی جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: یا محمد ما ذا صنعت؟ لقد تلوت علی الناس ما لم اُتک به عن اللہ، وقلت ما لم یقل لک، فحزن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند ذلک، و خاف من اللہ خوفاً کبیراً...“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۲۵۳۳۸)

جب جبریلؑ نے وضاحت کی کہ میں نے یہ ”شیطانی آیات“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بتائی تھیں، یہ آپ نے کیا کر دیا اور لوگوں کے سامنے ان شرکیہ کلمات کو بھی پڑھ دیا تو اس وقت آپ نے فرمایا کہ میں نے اللہ پر افتراء باندھا ہے اور میں نے غلط بات اللہ کی طرف منسوب کر دی۔ پھر آپ بہت رنجیدہ اور غمگین ہوئے اور اللہ کا بہت خوف محسوس کیا۔

قارئین کرام! مذکورہ تفصیل کی روشنی میں اس بات پر ذرا غور فرمائیں کہ جس کتاب مقدس کی حفاظت کے لئے خود پروردگار عالم نے اتنے انتظامات فرمائے، ان تمام راستوں کو ہی مسدود کر دیا جن کے ذریعے ابلیس اور اس کی ذریت کسی بھی حیثیت میں اس کلام پاک میں دخل اندازی کر سکے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو اتنے سخت الفاظ (کہ زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی دو گنا عذاب دیتے، آپ کا کوئی مددگار نہ ہوتا، ہم آپ کی شہ رگ کاٹ ڈالتے...) میں تنبیہات فرمائیں کیا یہ ممکن ہے کہ شیطان آپ کی زبان پر ایسے کلمات جاری کر دے جو اس کتاب میں کے پیغام کی روح سے متصادم ہوں؟

یا کیا یہ ممکن ہے کہ شیطان اپنی آواز کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کے مشابہ بنا کر یہ شرکیہ کلمات ادا کرے اور سامعین واضح طور پر یہ محسوس کریں کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اپنی آواز ہے۔ حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف اور صریح اعلان فرمایا ہے کہ:

”مَنْ رَأٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَأٰنِیْ فَإِنَّ الشَّیْطَانَ لَا یَتَمَثَّلُ فِیْ صُورَتِیْ“

(صحیح بخاری۔ کتاب التعمیر باب من رأى النبی فی المنام۔ رقم الحدیث ۶۹۹۳)

جس شخص نے مجھ کو خواب میں دیکھا تحقیق مجھ ہی کو دیکھا اس لئے کہ شیطان میری

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق کا قرآن عزیز سے تصادم

صورت (خواب میں بھی) اختیار نہیں کر سکتا۔

”مَنْ رَأٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَسَیَرَانِیْ فِی الْبَقْعَةِ وَلَا تَتَمَثَّلُ الشَّیْطَانُ بِیْ“

(حوالہ مذکور رقم الحدیث ۶۹۹۳)

جس نے مجھ کو خواب میں دیکھا پس عنقریب مجھ کو بیداری میں بھی دیکھے گا اور شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا۔

افسانہ غرائیق کو امام طبری نے سورۃ النجم آیات ۱۹-۲۰، سورۃ الحج آیات ۵۲، سورۃ بنی اسرائیل آیات ۴۳-۴۵ کی رو سے صحیح ثابت کیا ہے۔ جبکہ ان آیات کا افسانہ سے کوئی تعلق ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ ان سورتوں کا نزول اور سورۃ النجم کی آیات کا سیاق و سباق خود اس من گھڑت قصہ و افسانے کی تردید کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النجم کے آغاز میں ارشاد فرمایا کہ:

”وَمَا یَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحٰیٌ یُّوحٰی ۝“ (النجم ۳-۴)

”اور وہ (محمدؐ) اپنی خواہش سے نہیں بولتے یہ نہیں ہے مگر وحی جو (ان کی طرف) بھیجی جاتی ہے۔“

اس کے بعد آیات ۱۹ تا ۲۳ میں بتوں کی شدید مذمت کی گئی ہے:

”تو کیا تم نے لات وعزٰی کو دیکھا اور تیسری ایک اور (دیوی) منات کو کیا تمہارے لئے لڑکے ہیں اور اس (اللہ تعالیٰ) کے لئے لڑکیاں۔ یہ تو پھر بڑی نا منصفانہ تقسیم ہے۔ نہیں ہیں یہ مگر ”نام“ جو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں کوئی سند نہیں اتاری۔ یہ لوگ تو صرف ظن و گمان ہی کی پیروی کرتے ہیں اور اس کی جو (ان کے) نفس چاہتے ہیں اور یقیناً ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت آچکی ہے۔“

”لات، عزٰی، منات“ یہ سب نام مؤنث پر ہیں کو یا یہ ان کی دیویاں تھیں جنہیں وہ اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ افسانہ غرائیق گھڑنے والوں نے سورۃ النجم کی ان آیات (۱۹-۲۰) کے بعد ”تلك الغرائیق العلی.....“ کی آمیزش کر کے یہ دعویٰ کر دیا کہ شیطان نے اس موقع پر یہ کلمات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو القا کئے تھے۔

اگر کسی ”شیطان“ راوی نے یہ کلمات گھڑ ہی لئے تھے تو کم از کم امام طبری و امثالہ تو

انہیں اپنی تفاسیر میں محفوظ نہ کرتے۔ مذکورہ آیات کے سیاق و سباق پر معمولی غور کرنے سے بھی ایک معمولی عقل و دانش رکھنے والا انسان بھی اس ”عدم مناسبت اور تناقض“ کو محسوس کر لیتا ہے۔ کہاں اللہ تعالیٰ کا پاک کلام اور کہاں یہ شیطانی خرافات؟

سخت تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو سردارانِ قریش سے گفتگو کے دوران اپنے مایہ ناز صحابی ابنِ ام مکتومؓ سے معمولی اعراض اور عدم التفات کی بناء پر سخت الفاظ میں تنبیہ کر دی اور جن کلمات سے عقیدہ تو حید کی بنیادیں بل جائیں، ان پر کسی ”تنبیہ“ کے بجائے الثانیہ تسلی دی جائے کی ایسا معاملہ تو ہر نبی و رسول کے ساتھ شیطان نے اختیار کیا ہے۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ”افسانہ غرائیق“ زنا و قدح و ملاحظہ کا وضع کردہ ہے جو سنداً و متنناً، روایتاً و درایتاً ہر اعتبار سے بے ہودہ، باطل، عقیدہ عصمتِ انبیاء کے سرسرمنافی اور قرآن کریم سے متصادم ہونے کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین پر بھی مبنی ہے۔

صد افسوس! روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار نے اس ”افسانے“ کے مقلدین کی ایک طویل فہرست پیش کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ:

”اکیلے امام طبری پر فرض، امتزاج، روایت سازی اور توہینِ رسالت کا الزام کیوں؟ یہاں تو محدثین اور مفسرین کی پوری قطاران ”میراثہ“ میں شریک ہے۔ (روزنامہ اسلام۔ ۱۰/ اگست ۲۰۱۵ء۔ بہ عنوان ”احتیاط لازم ہے“ قسط نمبر ۲۔ تحت کالم ”میراثہ راست“) آئیے دیکھتے ہیں کہ کیا فی الواقع مفسرین و محدثین کی پوری قطاران ”میراثہ“ میں شریک ہے؟

افسانہ غرائیق، علمائے اسلام کی نگاہ میں

اس عنوان کے تحت حسب ذیل مشاہیر اسلام کے اسمائے گرامی شامل کئے گئے ہیں جنہوں نے قصہ غرائیق کو زنا و قدح و ملاحظہ کا گھڑنٹو اور لغو و باطل قرار دیا ہے:

(۱) امام ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ)	(۲) امام ابن حزم اندلسی (م ۴۵۶ھ)
(۳) امام بیہقی (م ۴۵۸ھ)	(۴) قاضی ابوبکر ابن العربی (م ۵۴۳ھ)
(۵) امام قاضی عیاض (م ۵۴۴ھ)	(۶) امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ)
(۷) امام ابو عبد اللہ قرطبی (م ۶۷۱ھ)	(۸) علامہ ابوالبرکات نیشی حنفی (م ۷۱۰ھ)
(۹) علامہ خازن (م ۷۴۱ھ)	(۱۰) امام ابو حیان اندلسی (م ۷۴۵ھ)
(۱۱) امام ابن کثیر (م ۷۷۴ھ)	(۱۲) علامہ کرمانی (م ۸۶۶ھ)
(۱۳) علامہ بدر الدین عینی حنفی (م ۸۵۵ھ)	(۱۴) علامہ قسطلانی (م ۹۲۳ھ)
(۱۵) شیخ الاسلام امام ابوسعود (م ۹۸۲ھ)	(۱۶) امام شوکانی (م ۱۲۵۰ھ)
(۱۷) علامہ محمود آلوسی (م ۱۲۷۰ھ)	(۱۸) مفتی محمد عبدہ (م ۱۳۲۳ھ)
(۱۹) مفسر احمد مصطفیٰ المراغی (م ۱۳۶۴ھ)	(۲۰) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۳۹۹/۱۹۷۹ء)
(۲۱) شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان (م ۱۹۸۰ء)	(۲۲) مفکر اسلام مولانا مفتی محمود (۱۳۹۰/۱۹۸۰ء)
(۲۳) مولانا امین احسن اصلاحی (م ۱۹۹۷ء)	(۲۴) سید محمد کرم شاہ ازہری (م ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۸ء)
(۲۵) علامہ صوالدین البانی (م ۱۴۲۹ھ/۱۹۹۹ء)	(۲۶) علامہ غلام رسول سعیدی (م ۱۴۳۷ھ/۲۰۱۶ء)
(۲۷) مولانا سلیم اللہ خان صدوق اعرابیہ پاکستان	

مذکورہ مشاہیر کے علاوہ شیعہ مفسر محسن علی نجفی اور محمد علی لاہوری قادیانی (م ۱۹۵۱ء) کی آراء بھی نقل کر دی گئی ہیں۔

۱۔ امام ابن خزمیہ (م ۳۱۱ھ)

ابو عبد اللہ محمد بن اسحاق بن خزمیہ سلمی، امام طبری کے ہم عصر رہے ہیں ان سے ایک سال قبل ۲۲۳ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے اور طبری سے ایک سال بعد نیشاپور میں ہی ۳۱۱ھ میں وفات پائی۔ امام بخاری (م ۲۵۶ھ) کے شاگرد تھے اور خود بھی محدث، فقیہ، مجتہد اور امام تھے۔

محدث ابن خزمیہ سے جب ”افسانہ غرائیق“ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ”هَذَا مِنْ وَضْعِ الزِّنَادِقَةِ، وَصَنَفَ فِي ذَلِكَ كِتَابًا..... أَمَا أَهْلُ التَّحْقِيقِ فَقَالُوا هَذِهِ الرِّوَايَةُ بِاطْلَالٍ“ اسے زنادقہ نے گھڑا ہے۔ نیز ابن خزمیہ نے اس کے رو میں ایک مستقل کتاب بھی تصنیف کی ہے..... اہل تحقیق تو یہ کہتے ہیں کہ یہ روایت باطل ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی تحت سورۃ الحج آیت ۵۲۔ جلد ۶ ص ۲۲۵، البحر المحیط لابن حیان جلد ۶ ص ۳۸۳، روح المعانی جلد ۱ ص ۱۷۷)

ابن خزمیہ اپنے اور دادا کے نام میں مشہور امام سیرت محمد بن اسحاق کے ہم نام ہیں۔ مذکورہ نسبت کے بغیر محمد بن اسحاق کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے بعض حضرات نے اس قول کے قائل محمد بن اسحاق سے صاحب المغازی مراد لیا ہے۔ جیسے ابو حیان اندلسی نے جو صحیح نہیں ہے۔ بعد میں بہت سے علماء نے ان کی پیروی میں محمد بن اسحاق صاحب مغازی ہی مراد لیا ہے جیسا کہ شرعی عدالت کے سابق جج پیر محمد کرم شاہ صاحب ازہری لکھتے ہیں کہ: ”اس روایت کے متعلق سیرت کے معتبر ترین سوانح نگار امام محمد بن اسحاق سے جب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا... (ضیاء القرآن جلد ۳ ص ۲۲۴) لیکن امام رازی کی تصریح کے مطابق اس قول کے قائل مشہور محدث محمد بن اسحاق بن خزمیہ ہیں۔

ابن خزمیہ امام طبری سے ایک سال پہلے (۲۲۳ھ میں) پیدا ہوئے اور ایک سال بعد ۳۱۱ھ میں فوت ہوئے۔ انہوں نے افسانہ غرائیق کو ملاحدہ و زنادقہ کا گھڑنٹو قرار دیا ہے۔

۲۔ امام ابن خزمیہ اندلسی الظاہری (م ۴۵۶ھ)

حافظ ابن خزمیہ کا نام علی بن احمد اور کنیت ابو محمد ہے۔ خزم ان کے جد اعلیٰ کا نام ہے۔ خزم کے والد کا نام غالب بن صالح ہے۔ موصوف فارسی الاصل اندلسی قرطبی تھے۔ ابن خزم کے خاندان میں سب سے پہلے ان کے جد اعلیٰ یزید نے عہد فاروقی میں اسلام قبول کیا اور انہوں نے حضرت معاویہؓ کے بھائی سیدنا یزید بن ابی سفیانؓ سے عقد موالات کیا۔ پھر جب بنو امیہ اندلس میں وارد ہوئے تو یہ خاندان بھی ان کے ساتھ اندلس چلا گیا۔ اس طرح ابن خزم فارسی الاصل ہونے کے ساتھ اندلسی قرطبی کی نسبت سے معروف ہو گئے۔ ابن خزم ۳۸۴ھ میں پیدا ہوئے اور ایک خوش حال گھرانے میں تربیت پائی۔ انہوں نے علوم و فنون کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تا آنکہ حدیث و فقہ اور تاریخ و ادب میں کمال حاصل کر لیا۔

ابن خزم نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے تاریخ مذاہب پر ایک بے نظیر کتاب ”الفصل فی الملل والأہواء والنحل“ کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اسی کتاب کا ایک اہم باب ”عصمۃ الانبیاء“ ہے۔ اس باب میں موصوف نے عصمت انبیاء سے متعلق تمام پہلوؤں پر مدلل گفتگو کر کے منکر بن عصمت کے تمام اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں۔ موصوف افسانہ غرائیق کے حوالے سے معترضین کو (بمصدق ”ایک لوہار کی سونٹاری“) شاندار اور جاندار جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”وَأَمَّا الْحَدِيثُ الَّذِي فِيهِ: ”وَأَتَاهُمُ الْغَرَانِيقُ الْعَلِيُّ...“ وَإِنْ شَفَاعَتُهُمْ لَتَرْتَجَى“ فَكَلْبٌ بِحَثٍ مَوْضُوعٍ لَمْ يَصْحَ قَطُّ مِنْ طَرِيقِ النُّقْلِ، وَلَا مَعْنَى لِلْإِسْتِغَالِ بِهِ لِإِذْ وَضَعَ الْكَلْبُ لَا يَعْبُزُ عَنْهُ أَحَدٌ“ (الفصل فی الملل والأہواء والنحل جلد ۴ ص ۲۳)

جس ”حدیث“ میں غرائیق کا افسانہ بیان کیا گیا ہے وہ سفید جھوٹ اور موضوع یعنی من گھڑت ہے اس لئے کہ اس کی کوئی صحیح سند نہیں ہے۔ نیز اس میں مشغول ہونے کی بھی کوئی تنگ نہیں ہے کیونکہ جھوٹ گھڑنے سے کوئی شخص عاجز نہیں ہے۔

۳۔ امام بیہقی (م ۴۵۸ھ)

ابوبکر احمد بن حسین شافعی نیشاپور کے ایک مضافاتی گاؤں ”مہرق“ میں ۳۸۴ھ میں پیدا ہوئے۔ طلب علوم کے لئے کوفہ، بغداد، خراسان، حجاز اور دیگر بلاد اسلامیہ کا سفر کیا۔ بہت کثیر التصانیف محدث تھے۔

امام الحرمین فرماتے تھے کہ ہر شافعی مذہب والے پر امام شافعی کا احسان ہے لیکن ایک بیہقی ہیں جن کا احسان خود امام شافعی پر ہے کیونکہ ان کی فقہ کو اس طرح مضبوط و مدلل طور پر مدقون کرنے اور اس کے رائج کرنے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ بلاخر ۴۵۸ھ میں نیشاپور میں وفات پا گئے۔

امام بیہقی قصہ غرائیق کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

”هذه القصة غير ثابتة من جهة النقل“ (البحر المحيط جلد ۶ ص ۳۸۳) یہ قصہ نقل کے اعتبار سے ثابت نہیں ہے۔

سخت تعجب ہے کہ اس تبصرہ کے باوجود روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار مولانا اسماعیل ریحان صاحب نے امام بیہقی کو امام طبری کے ساتھ ”مجرموں“ کی قطار میں شامل کر دیا۔ (ملاحظہ ہو: روزنامہ اسلام ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء۔ تحت ”احتیاط لازم ہے“ قسط نمبر ۲)

۴۔ قاضی ابوبکر ابن العربی (م ۵۴۳ھ)

قاضی ابوبکر محمد بن عبد اللہ اندلسی ۲۲ شعبان ۴۶۸ھ کو پیدا ہوئے۔ حدیث، فقہ، تفسیر اور ادب و تاریخ میں نام پیدا کیا۔ ”اشبیلیہ“ کے قاضی بھی رہے ہیں۔ ۶ ربیع الاول بروز شنبہ ۵۴۳ھ کو وفات پائی۔

یہ ملحوظ رہے کہ ”ابوبکر ابن عربی“ کے نام سے ایک مشہور صوفی بزرگ بھی گذرے ہیں جن کی ولادت ۵۶۰ھ اور وفات ۶۳۸ھ میں ہوئی جبکہ ان کا نام ابوبکر محمد بن علی بن محمد بن احمد بن عبد اللہ ہے مگر نام، کنیت، سکونت اور نسبت کی وجہ سے بعض حضرات مغالطہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مشہور مفسر، محدث اور فقیہ کے نام کے ساتھ ”ابن العربی“ (الف لام کے ساتھ العربی) لکھا جاتا ہے جبکہ صوفی بزرگ کے نام کے ساتھ بغیر الف لام کے ”ابن عربی“ لکھا جاتا ہے۔

قاضی امام ابوبکر ابن العربی مالکی ”افسانہ غرائیق“ کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

اعلموا انار الله اقللتكم بنور هداة، ويسر لكم مقصد التوحيد و مغزاه۔
أن الهدي هدى الله، فسبحان من يفضل به على من يشاء، ويصرفه عن يشاء،
وقد بينا معنى الآية في فصل تنبيه الغبي على مقدار النبي بما ترجوه عند الله
الجزاء الأوفى، في مقام الزلفى، ونحن الآن نجلو بتلك الفصول الغماء، و نرقيقكم
بها عن حضيض الدهماء، إلى بقاع العلماء في عشر مقامات: المقام الأول: أن
النبي إذا أرسل الله إليه الملك بوحيه، فإنه يخلق له العلم به، حتى يتحقق أنه
رسول من عنده، ولولا ذلك ما صحت الرسالة، ولا تبين النبوة، فإذا خلق الله

امام طبري --- كون؟

افسانة غرائيق: قاضي ابوبكر ابن العربي

له العلم به تميز عنده من غيره، وثبت اليقين، واستقام سبيل الدين، ولو كان النبي إذا شاقه الملك بالوحي لا يدري أملك هو أم إنسان، أم صورة مخالفة لهذه الأجناس ألقت عليه كلاماً، وبلغت إليه قولاً لم يصح له أن يقول: إنه من عند الله، ولا ثبت عندنا أنه أمر الله، فهذه سبيل متيقنة، وحالة متحققة، لا بد منها، ولا خلاف في المنقول ولا في المعقول فيها، ولو جاز للشيطان أن يتمثل فيها، أو يتشبه بها ما أمناه على آية، ولا عرفنا منه باطلاً من حقيقة، فارتفع بهذا الفصل اللبس، وصح اليقين في النفس...

مسألة: الله قد عصم رسوله من الكفر

المقام الثاني: أن الله قد عصم رسوله من الكفر، وآمنه من الشرك، واستقر ذلك من دين المسلمين بإجماعهم فيه، وإطباقهم عليه؛ فمن ادعى أنه يجوز عليه أن يكفر بالله، أو يشك فيه طريقة عين، فقد خلع ربة الإسلام من عنقه؛ بل لا تجوز عليه المعاصي في الأفعال، فضلاً عن أن ينسب إلى الكفر في الاعتقاد؛ بل هو المنزه عن ذلك فعلاً واعتقاداً. وقد مهدنا ذلك في كتب الأصول بأوضح دليل.

مسألة: الله قد عرف رسوله بنفسه و بصره بأدله

المقام الثالث: أن الله قد عرف رسوله بنفسه، وبصرة بأدله، وراه ملكوت سمواته وأرضه، وعرفه سنن من كان قبله من إخوته، فلم يكن يخفى عليه من أمر الله ما نعرفه اليوم، ونحن حثالة أمته؛ ومن خطر له ذلك فهو ممن يمشي مكباً على وجهه، غير عارف بنبيه ولا بربه. المقام الرابع: تأملوا - فتش الله أغلاق النظر عنكم - إلى قول الرواة الذين هم بجهلهم أعداء على الإسلام، ممن صرح بعداوتهم أن النبي صلى الله عليه وسلم لما جلس مع قريش تمنى ألا ينزل عليه من الله وحي، فكيف يجوز لمن معه أدنى مسكة أن

امام طبري --- كون؟

افسانة غرائيق: قاضي ابوبكر ابن العربي

يخطر بباله أن النبي صلى الله عليه وسلم أثر وصل قومه على وصل ربه، وأراد ألا يقطع أنسه بهم بما ينزل عليه من عند ربه من الوحي الذي كان حياة جسمه وقلبه، وأنس وحشته، وغاية أمنيته. وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم أجود الناس؛ فإذا جاءه جبريل كان أجود بالخير من الريح المرسلة فيؤثر على هذا مجالسة الأعداء.

مسألة قول الشيطان تلك الغرائقة العلاء وإن شفاعتها تترجى للنبي

المقام الخامس: أن قول الشيطان تلك الغرائقة العلاء، وإن شفاعتها تترجى للنبي صلى الله عليه وسلم قبله منه؛ فالتبس عليه الشيطان بالملك، واختلط عليه التوحيد بالكفر، حتى لم يفرق بينهما. وأنا من أدنى المؤمنين منزلة، وأقلهم معرفة بما وقفني الله له، وآتاني من علمه، لا يخفى على عليكم أن هذا كفر لا يجوز وروده من عند الله، ولو قاله أحد لكم لتبادر الكل إليه قبل التفكير بالإتكار والردع، والتشريب والتشنيع، فضلاً عن أن شفاعتها تترجى. وقد علم علما ضروريا أنها جمادات لا تسمع ولا تبصر، ولا تنطق ولا تنضر، ولا تنفع ولا تنصر ولا تشفع، بهذا كان يأتيه جبريل الصباح والمساء، وعليه اتبني التوحيد، ولا يجوز نسخه من جهة المعقول ولا من جهة المنقول، فكيف يخفى هنا على الرسول؟ ثم لم يكف هذا حتى قالوا: إن جبريل لما عاد إليه بعد ذلك ليعارضه فيما ألقى إليه الوحي كررها عليه جاهلاً بها تعالى الله عن ذلك فحينئذ أنكرها عليه جبريل، وقال له: ما جئتك بهذه. فحزن النبي صلى الله عليه وسلم لذلك، وأنزل عليه: ﴿وَلَمَّا كَادُوا لِيَفْتَنُونَكَ ابْنِ الْوَحْيِ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ تَفْتَرِي عَلَيْنَا (٦) ٣٠﴾ غيره إقيا لله والمتعلمين والعالمين من شيخ فاسد وسوس هامد، لا يعلم أن هذه الآية نافية لما زعموا، مبطل لما رووا وتقولوا، وهو: المقام السادس: وذلك أن قول العربي: كاد يكون كذا: معناه قارب ولم

امام طبری --- کون؟

افسانہ غرائیق: قاضی ابوبکر ابن العربی

یكن، فأخبر الله في هذه الآية أنهم قاربوا أن يفتوه عن الذي أوحى إليه، ولم تكن فتنة، ثم قال: لتفتري علينا غيره. وهو: المقام السابع: ولم يفتري، ولو فتوك واقتربت لا تخلفوك خليلاً، فلم تفتن ولا اقتربت، ولا علمك خليلاً... وقد أوعدنا إليكم توصية أن تجعلوا القرآن إمامكم، وحرّوه إمامكم، فلا تحملوا عليها ما ليس فيها، ولا تربطوا فيها ما ليس منها، و ما هدى لهذا إلا الطبري بجلالة قدره، و صفاء فكره، و سعة باعه في العلم، و شدة ساعده و ذراعه في النظر؛ وكأنه أشار إلى هذا الغرض، و صوب على هذا المرمى فقرطس بعدما ذكر في ذلك روايات كثيرة كلها باطلة، لا أصل لها، ولو شاء ربك لما رواها أحد ولا سطرها، ولكنه فعال لما يريد، عصمنا الله و إياكم بالتوفيق والتسديد، وجعلنا من أهل التوحيد بفضلته و رحمته۔

اللہ تعالیٰ آپ کے دلوں کو ہدایت کی روشنی سے منور کرے اور بے شک ہدایت تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ وہ ذات پاک ہے جس کو چاہے ہدایت فرما دے اور جس کو چاہے ہدایت سے دور کر دے۔ ہم نے ایک فصل میں اس آیت کی تشریح کی ہے اور ہمیں اس تشریح پر اللہ کے ہاں بہت بڑے اجر کی امید ہے۔ یہاں ہم دس کلمات بیان کرتے ہیں جن کے ذریعے غبار صاف ہو جائے گا اور اندھیرا ختم ہو جائے گا۔

اولاً:- یہ بات سمجھ لیجئے کہ جب اللہ تعالیٰ فرشتے کو وحی دے کر بھیجتے ہیں تو رسول کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ وہ اللہ ہی کا فرشتہ ہے، اور اس بات کا قطعی کوئی امکان ہرگز نہیں کہ نبی کو شک ہو جائے کہ آیا یہ وہی فرشتہ ہے کوئی انسان ہے یا کچھ اور۔ اگر یہاں شیطان کے لئے صورت گری ممکن ہوتی تو پھر کسی ایک آیت پر بھی بھروسہ نہ ہو سکتا، اور حقیقت اور باطل میں کوئی فرق نہ ہو سکتا

ثانیاً:- یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو کفر اور شرک سے محفوظ رکھا ہے اس پر امت مسلمہ کا اتفاق اور اجماع ہے۔ پس جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ نبی کے لئے کفر کرنا ممکن ہے، یا صرف اس شک میں ہی پڑے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو افعال میں بھی

امام طبری --- کون؟

افسانہ غرائیق: قاضی ابوبکر ابن العربی

معاصی سے پاک ہیں چنانکہ اعتقاد میں آپ کی طرف کفر کی نسبت کی جائے۔
ثالثاً:- یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اپنی معرفت سے نوازا تھا، اور آسمانوں و زمین کی ملکوت دکھائی تھی پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ پر وہ بات مخفی رہ جائے جس کو آپ کی امت میں سے کم ترین لوگ بھی جانتے ہیں۔ جس کے دل میں یہ خیال گذرتا ہے تو وہ اپنے منہ کے بل اوندھاپڑا ہوا ہے، اور اسے نہ نبی کا پتہ ہے نہ رب کا۔

رابعاً:- غور کریں، خدا آپ کی نظر کے تالوں کو کھول دے، کہ راوی جو کہ اپنی جہالت کی وجہ سے دین اسلام کے دشمن ہیں، وہ اپنی عداوت کی صراحت کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمنا کی کہ آپ پر جو آج کوئی وحی نہ آئے“؛ کسی ذرہ بھر عقل والے کے نزدیک بھی یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی اللہ کی ملاقات پر دشمن کی رفاقت کو ترجیح دیں! حالانکہ وحی تو آپ کے قلب و جسم کی غذا و ریہانس اور آپ کی انتہائے تمنا تھی۔

خامساً:- یہ کہ روایت کے مطابق آپ نے شیطان کے قول کو قبول کر لیا۔ آپ نے شیطان کو فرشتہ سمجھ لیا اور آپ کو حید اور کفر میں خلط ہو گیا!! حالانکہ میں ایک ادنیٰ امتی ہوں، مجھے اللہ تعالیٰ نے جو تھوڑی سی سمجھ دی ہے اس کے ذریعے مجھے ذرا بھر شک نہیں ہو سکتا کہ یہ کفر ہے، رب اس کو نازل نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی شخص آپ کے سامنے یہ بیان کرے تو آپ بھی اسے سنتے ہی رد کر دیں گے، طعن و تشنیع کریں گے تو پھر کیا نبی علیہ السلام سے یہ مخفی رہ سکتا ہے؟ نعوذ باللہ! پھر اس پر بھی بس نہیں راوی کہتے ہیں کہ جبریل آئے اور آپ نے ان کو بھی یہ ”آیات“ پڑھ کر سنائیں، پھر جبریل نے آپ کو تنبیہ کیا تب آپ کو رنج و غم ہوا! اس کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں: وان كساد و ليفتنونك عن الذي اوحينا اليك لتفتري علينا غيره و اذا لاتخذنوك خليلاً“ (سورة الاسراء: ۷۳)

”وہ قریب تھے کہ آپ کو فتنے میں ڈال دیتے، اس چیز سے جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی، تا کہ آپ اس کے سوا ہم پر کچھ گھڑ لیں، اور اگر آپ ایسا کرتے تو یہ آپ کو دوست بنا لیتے“ میں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، ہے کوئی معلم یا عالم جو (اسلام کی) اس دوسوہ ڈالنے

والے اور فاسد شخص کے مقابلے میں مدد کرے۔ یہ ایسا غبی شخص ہے کہ اسے نہیں پتہ چل رہا کہ یہ آیت ان کے زعم باطل کے منافی ہے، اور جو کچھ انہوں نے روایت کیا ہے اور گھڑا ہے اس کو یہ آیت باطل کر رہی ہے۔ وہ اس طرح کہ آیت میں ہے کہ وہ قریب تھے کہ فتنے میں ڈال دیتے، مطلب یہ کہ وہ ڈال نہیں سکے تو نہ انہوں نے فتنے میں ڈالنا فتراہوا، اور نہ ہی کافروں نے آپ کو دوست بنایا۔ آخر میں امام ابن العربی فرماتے ہیں:

ہم آپ کو وصیت کر رہے ہیں کہ قرآن کریم کو اپنا امام بنائیں اور اس کے حروف کو اپنا مقتدا بنائیں اس کے ذمہ وہ نلگائیں جو اس میں نہیں ہے، اور جس چیز کا تعلق اس کے ساتھ نہیں ہے اس کو اس کے ساتھ مت جوڑیں۔ اور ان روایات کی طرف طبری کے علاوہ کسی کو ہدایت نہیں ہوئی۔ حالانکہ ان کا مقام بلند، فکر صاف، علم میں وسعت اور نظر میں پختگی ہے۔ اور شاید کہ انہوں نے اس غرض کی طرف اشارہ کر دیا یا اس طور کہ واقعہ ذکر کرنے کے بعد کثیر تعداد میں ایسی روایات ”اکٹھی“ کر دیں جو سب کی سب باطل ہیں جن کی کوئی اصل نہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو کوئی ان کو روایت کرتا نہ لکھتا لیکن آپ کا رب جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اپنی توفیق اور تسدید سے سرفراز رکھے۔ (احکام القرآن جلد ۳۔ سورۃ الحج تحت آیت ۵۲)

پیر سید محمد کرم شاہ صاحب ازہری لکھتے ہیں کہ: ”قاضی ابوبکر ابن العربی الاندلسی جب اس آیت کی تفسیر کرنے لگے ہیں تو اس روایت کا ذکر کر کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غصہ سے ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے اور دل بے چین اور بے قرار ہو گیا ہے۔ اپنی سابقہ روش کے بالکل برعکس اس روایت کو باطل کرنے کے لئے ایک مستقل فصل لکھی ہے جس کا عنوان ہے: ”تنبیہ الغبی علی مقدار النبی“ (غبی شخص کے لئے مقام نبی کی وضاحت) اور لکھتے ہیں: ”ونر جو بہ عند اللہ الجزاء الاوفی فی مقام الزلفی“ کہ اس فصل کے لکھنے سے مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقام قرب میں مجھے عظیم جزا عودے گا۔

(پیر صاحب لکھتے ہیں کہ) تنگی داماں کی شکایت نہ ہوتی تو آپ کی اس فصل کا پورا ترجمہ یہاں درج کرتا۔ اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ ہنرور اس فصل کا مطالعہ کریں“ (ضیاء القرآن جلد سوم ص ۲۲۶)

۵۔ امام قاضی عیاض (م ۵۴۴ھ)

ابو الفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرو ۴۷۶ھ میں ”سبئہ“ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بزرگ اندلس کے رہنے والے تھے۔ آپ کے دادا وہاں سے نقل مکانی کر کے پہلے ”فاس“ آئے پھر وہاں سے ”سبئہ“ (مغرب) تشریف لے گئے۔ قاضی عیاض امام مالک کے مقلد تھے اور آپ کا شمار مذہب مالکی کے اساطین میں ہوتا ہے۔ آپ کافی عرصہ ”سبئہ“ میں قاضی رہے، کچھ عرصہ غرناطہ پھر قرطبہ میں منصب قضاء پر فائز رہے۔

امام نووی شرح صحیح مسلم میں جگہ جگہ ان کا حوالہ دیتے ہیں۔ امام بدرالدین عینی، ابن حجر عسقلانی احادیث کے فوائد و نکات میں ان کی خوشہ چینی کرتے نظر آتے ہیں۔ شارحین حدیث جہاں ”قال القاضی“ کہتے ہیں وہاں اس سے قاضی عیاض ہی مراد ہوتے ہیں۔

آپ کی تمام تصانیف میں سے سب سے زیادہ مقبولیت ”الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم“ کے حصہ میں آئی بلکہ دیگر تصانیف اور خود قاضی عیاض کے نام کی بقاء کا سبب بھی یہی کتاب ہے۔

”الشفاء“ کی تقریباً ۲۶ شروحات و تلخیصات ہو چکی ہیں جن میں ”شرح لماعلی قاری“ اور ”نسیم الریاض“ (از علامہ احمد شہاب الدین خفاجی) زیادہ مقبول ہیں۔

علامہ خفاجی فرماتے ہیں ”الشفاء“ کا اسم اس کے مستثنیٰ کے موافق ہے۔ اس کا پڑھنا پیاریوں سے شفاء ہے۔ الشفاء دلوں کی شفاء ہے۔ قاضی عیاض نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد آپ کے حق کی رعایت کی ہے جبکہ آپ کے حقوق سے غفلت یقیناً جفا ہے۔

قاضی عیاض کو زہر دیا گیا جس کی وجہ سے وہ عمر ۶۹ برس ۹۔ جمادی الثانیہ ۵۴۴ھ

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق: امام قاضی عیاض

شہب جمعہ کو وفات پا گئے اور مراکش میں مدفون ہوئے۔

امام قاضی عیاض ”افسانہ غرائیق“ کے حوالے سے معترضین کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ”يَكْفِيكَ هَذَا أَنَّ هَذَا حَدِيثٌ لَمْ يَخْرُجْ عَنْ أَحَدٍ مِنْ أَهْلِ الصَّحَّةِ وَلَا رَوَاهُ ثِقَّةٌ بِسَنَدٍ سَلِيمٍ مُتَّصِلٍ وَأَمَّا لَوْلَا بَعْضُ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُؤَرِّخِينَ وَالْمَوْلَعِينَ بِكُلِّ غَرِيبٍ، الْمُتَلَفِّقِينَ مِنَ الصَّحَفِ كُلِّ صَحِيحٍ وَسَقِيمٍ... وَ مِنْ حِكَايَةِ عَنْهُ هَذِهِ الْمَقَالَةُ مِنَ الْمَفْسَرِينَ وَالتَّابِعِينَ لَمْ يَسْنِدْهَا أَحَدٌ مِنْهُمْ وَلَا رَفَعَهَا إِلَى صَحَابِيٍّ وَ أَكْثَرَ الطَّرِيقِ عَنْهُمْ فِيهَا ضَعِيفَةٌ وَاهِيَةٌ“ (الشفاء بتعريف حقوق المصطفى)

”تمہیں اتنا ہی کافی ہے کہ صحت کا التزام کرنے والوں میں سے کسی نے اسے بیان نہیں کیا، نہ اسے کسی ثقہ راوی نے درست اور متصل سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اس اور اس جیسی احادیث میں وہی مفسرین اور مؤرخین لچکی رکھتے ہیں جو ہر عجیب و غریب روایت بیان کرنے کے شوقین ہیں اور کتابوں سے ہر صحیح و ضعیف روایت فوراً نقل کر لیتے ہیں۔ اور جن مفسرین اور تابعین سے یہ قصہ مروی ہے ان میں سے کسی نے بھی اس کو کسی صحابی سے متصل سند کے ساتھ روایت نہیں کیا۔ اکثر طرق جن سے یہ قصہ مروی ہے وہ ضعیف اور فضول ہیں۔“

اس کے بعد قاضی عیاض اس قصے کی ایک ایک سند کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کوئی روایت بھی ضعیف اور سقم سے خالی نہیں۔ پھر کلبی کی روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ”وَأَمَّا حَدِيثُ الْكَلْبِيِّ فَمِمَّا لَا يَجُوزُ الرَّاوِيَةُ مِنْهُ وَلَا ذِكْرُهُ لِقُوَّةِ ضَعْفِهِ وَ كُنْهِهِ۔“ اب رہی کلبی کی حدیث تو یہ اس قبیل سے ہے جس کی روایت اس سے جائز ہی نہیں اور انتہائی ضعیف اور جھوٹ ہونے کی وجہ سے اس کا ذکر بھی جائز نہیں۔۔۔

اب رہی اس روایت کی معنوی حیثیت تو اس پر مضبوط دلیل قائم ہو چکی ہے اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ آپ اس قسم کی رذیل روایتوں سے منزہ و معصوم ہیں لیکن آپ کی یہ تمنا کہ آپ پر محبوبانِ باطلہ کی تعریف میں آیتیں اتریں تو یہ کفر ہے، یا یہ کہ آپ پر شیطان غالب آ جائے اور آپ پر قرآن مشتبہ کر دے یہاں تک کہ آپ قرآن میں وہ داخل کر دیں

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق: امام قاضی عیاض

جو قرآن سے نہیں ہے اور آپ اس قسم کا اعتقاد کر لیں کہ قرآن کی کچھ آیتیں ایسی ہیں قرآن کی نہیں ہیں حتیٰ کہ جبریل آپ کو اس پر خبردار کریں۔ یہ تمام باتیں آپ کے حق میں محال اور ممتنع ہیں۔ یا یہ کہ آپ عہدِ اپنی طرف سے ایسا فرمائیں۔ یہ بھی کفر ہے، یا یہ کہ آپ سہواً (بھول کر) ایسا فرمائیں، آپ ان تمام باتوں سے معصوم ہیں۔

بلاشبہ ہم نے دلائل اور اجماع سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ کے قلب و زبان سے کلمہ کفر کا اجرا خواہ عہدِ ہوا یا سہواً آپ کے پاس جو فرشتہ وحی لائے اس میں شیطانی القاء ہو جائے یا شیطان کو آپ پر غلبہ و تسلط کا کوئی راستہ مل جائے یا اللہ تعالیٰ پر آپ اپنے دل سے ایسی باتیں گھڑ کر نسبت کریں جو آپ پر نازل نہیں ہوئیں جیسا کہ اللہ نے فرمایا: ”وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ“ (الحاقة ۴۴) ”اگر وہ ہم پر ایک بات بھی گھڑ کر کہتے۔“

اور فرمایا کہ: ”إِذَا لَا أَذَقْنَكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ“ (الاسراء ۷۵) ”اور ایسا ہوتا تو ہم آپ کو زندگی میں بھی دو گنا عذاب دیتے اور آخرت میں بھی دو گنا عذاب کا مزہ چکھاتے۔“

دوسری وجہ یہ کہ نظر اور طرف کے لحاظ سے یہ قصہ ہی ناممکن الوجود ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ کلام ایسا ہو جیسا کہ قصہ میں مذکور ہے تو یہ باہمی اتصال سے بعید ہوگا کیونکہ یہ متناقض الاقسام ہے کہ تعریف و مذمت یکجا ہوں جو کہ تالیف و نظم کے خلاف ہے۔ اگر یہ بات ہوتی تو یقیناً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور موجود مسلمانوں اور مشرکوں سے پوشیدہ نہ رہتی جبکہ یہ بات ادنیٰ تا مل کرنے والے پر مخفی نہیں ہے تو اس ذاتِ مبارکہ کا کیا حال ہوگا جس کا حلم سب سے زائد، جس کا علم بیان و معرفت اور فصاحت کلام میں اعلیٰ وجہ پر فائق ہو۔

اور تیسری وجہ یہ کہ منافقوں، دشمنوں، مشرکوں، کمزوروں اور جاہل مسلمانوں کی عادت معلوم ہے کہ پہلی ہی دفعہ ان کو نفرت ہو جاتی اور قلیل فتنہ کی خاطر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف فتنہ کھڑا کر دیا کرتے تھے۔ اور مسلمانوں کو عار دلاتے تھے اور ان کے پے در پے مصائب پر خوش ہوا کرتے تھے اور وہ لوگ جو دل کے روگی ہوا کرتے تھے مگر اسلام کا اظہار

کرتے تھے، ان کی یہ کیفیت تھی کہ ادنیٰ شبہ سے بھی وہ متاثر ہو جاتے تھے اگر اس قصہ کی بھی کوئی حقیقت ہوتی تو یقیناً قریش اس بناء پر مسلمانوں پر غالب آ جاتے اور یہودی ضروران پر حجت قائم کرتے، اگر اس کا وجود ہوتا تو دشمن زیادہ شور مچاتے مگر کسی دشمن سے اس قصہ میں ایک کلمہ بھی منقول نہیں اور نہ ہی کسی مسلمان سے اس سلسلہ میں کوئی بات منہ سے نکلی۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو اس قصہ کے باطل ہونے اور جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے کافی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ کچھ شیطین انس و جن نے اس روایت کو بعض بے وقوف نادان (مفسرین و محدثین کے دل میں ڈال دیا تھا تا کہ ضعیف الایمان مسلمان اس سے شبہ میں پڑ جائیں۔ چوتھی وجہ یہ کہ اس قصہ کے راویوں نے بیان کیا کہ اس سلسلہ میں آیت کریمہ ”قُلْ اِنَّمَا اُنشَاؤُا لِيُفْتِنُوْكَ.....“ (سورۃ بنی اسرائیل ۷۳) نازل ہوئی۔ حالانکہ یہ دونوں آیتیں اس قصہ کا رد کر رہی ہیں جو یہ بیان کر رہے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ آپ کو فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتے تھے تا کہ آپ اللہ تعالیٰ پر افتراء کریں (معاذ اللہ) اگر آپ کو اللہ بت قدم نہ رکھتا تو آپ ان کی طرف مائل ہو ہی جاتے۔

اس آیت کا مضمون و مفہوم بتلا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کام سے محفوظ رکھا کہ آپ اللہ پر افتراء کریں اور آپ کو بت قدم رکھا کہ ان کی طرف ادنیٰ جھکاؤ بھی نہ ہو چہ جائیکہ زیادہ۔ جبکہ وہ (امام طبری و امثالہ) اس دہی روایت میں بیان کرتے ہیں کہ ان کے معبودان باطلہ کی تعریف میں میلان و افتراء سے بڑھ کر حصہ لیا (معاذ اللہ) کہ آپ نے فرمایا: ”میں نے اللہ پر افتراء کیا اور وہ بات کہی جو نہ کہی گئی تھی“ حالانکہ یہ مفہوم آیت کے بالکل خلاف ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو صرف یہی بات اس روایت کو بت کر دیتی۔ اب جبکہ یہ بات سرے سے ہی درست نہیں تو اس کا حال ظاہر ہے..... اس آیت کی تفسیر میں دیگر اقوال بھی مذکور ہیں۔ جیسا کہ ہم نے عصمت رسالت کے بیان میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر آپ کی عصمت بیان فرمائی ہے جو ان نادانوں کی بے وقوفی کی تردید کر رہی ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے مکرو فتنہ سے آپ کو بت قدم رکھ کر احسان فرمایا۔ اسی سے ہماری مراد آپ کی عصمت ہے اور یہی آیت کا مفہوم ہے۔ (حوالہ مذکور)

۶۔ امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ)

امام ابو عبد اللہ فخر الدین رازی طبرستان کے علاقے ”رے“ میں ۵۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور ”ہرات“ میں عمر ۶۳ سال ”شہادت“ پائی اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ”کرامیہ“ نے انہیں عناد و زہر دے کر اپنے راستے سے ہٹایا۔ امام رازی نے دیگر مسائل کی طرح افسانہ غرائیق کا بھی ”پوسٹ مارٹم“ کر کے مقام نبوت کے دفاع کا فریضہ انجام دیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ: ”انما اهل التحقيق فقد قالوا: هذه الرواية باطلة موضوعة... واحتجوا عليه بالقرآن والسنة والمعقول... ان هذه القصة موضوعة...“ (التفسير الكبير جلد ۸ ص ۲۳۷)

”محقق علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ روایت جھوٹی و باطل ہے اور گھڑی ہوئی ہے۔ اس کے باطل اور موضوع ہونے پر اہل تحقیق نے قرآن، سنت اور عقلی دلائل پیش کئے ہیں۔ یقیناً یہ سارا قصہ ہی من گھڑت ہے۔“

امام رازی اس بحث میں عقلی دلائل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: جو شخص یہ کہتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوں کے بارے میں تعریفی جملے کہے، وہ کافر ہے، کیونکہ اس طرح تو آپ کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے نیز شریعت، قرآن اور دین اسلام کی کسی بات پر اعتماد نہیں رہتا۔ لہذا ”ان هذه القصة موضوعة“ یقیناً یہ قصہ موضوع ہے۔ اس کے حق میں زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بعض مفسرین نے اسے نقل کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ: ”خبر الواحد لا يعارض الدلائل العقلية والعقلية“ یہ اگر خبر واحد بھی ہو تو پھر بھی دلائل عقلیہ و عقلیہ کے معارض نہیں ہو سکتی۔ جن حضرات نے اس روایت کی تاویل میں پیش کی ہیں تو امام رازی نے ان تاویلات کو ”بعیدہ، فاسدہ و باطلہ“ سمجھتے ہوئے رد کر دیا ہے کہ اس کی کوئی تاویل درست نہیں، اس کا کوئی صحیح محمل اور مصداق تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ روایت اپنی تمام تاویلات، احتمالات اور اختلاف الفاظ کے ساتھ مسترد کر دینے کے قابل ہے۔

۷۔ امام ابو عبد اللہ قرطبی (م ۶۱۷ھ)

امام ابو عبد اللہ قرطبی اندلسی (م ۶۱۷ھ) نہایت ہی محقق مفسر تھے۔ موصوف افسانہ غرائیق کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

الأحاديث المروية في نزول هذه الآية ليس منها شيء يصح... قال النحاس: هذا حديث منكر منقطع (الجامع الأحكام القرآن جلد ۲ ص ۷۶)
سورة الحج آیت ۵۲ کے تحت قصہ غرائیق سے متعلق منقول روایات میں سے ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ امام نحاس کے نزدیک یہ روایت منکر اور منقطع ہے۔

”في ذلك روايات كثيرة كلها باطل لا أصل لها“
اس قصہ سے متعلق تمام روایات باطل ہیں اور ان کی کوئی اصل نہیں۔ ”وضعف الحديث معن عن كل تاويل“۔ چونکہ یہ روایت ضعیف ہے اس لئے اس کی تاویل کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔

اس بحث کے آخر میں امام قرطبی فرماتے ہیں کہ اگر اس روایت کی کوئی سند ثابت بھی ہو جائے تو بھی وہ قرآن کے مخالف ہونے کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہوگی۔
پھر موصوف قاضی عیاض کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ:

”ان الأمانة اجمعت في ما طريقه البلاغ انه معصوم فيه من الاضرار عن شيء بخلاف ما هو عليه لا قصداً ولا عمداً ولا سهواً ولا غلطاً“
یعنی امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ تبلیغ کلام الہی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہرگز غلطی صادر نہیں ہو سکتی نہ قصداً، نہ عمداً، نہ سہواً اور نہ ہی غلطاً۔

۸۔ علامہ ابوالبرکات نسفی حنفی (م ۷۱۰ھ)

علامہ ماوراء النہر کے قصبہ ”نسف“ میں ولادت کی نسبت سے ”نسفی“ مشہور ہوئے۔ فقہ حنفی اور علم کلام کے بہت بڑے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ تفسیر قرآن کے بھی محقق عالم تھے۔ قرآن کریم کی ایک تفسیر بنام ”مدارک التنزیل وحقائق التأویل“ لکھی جو تفسیر نسفی یا تفسیر مدارک کے نام سے مشہور ہے۔ امام نسفی کی دیگر تصانیف میں ”کنز الدقائق“، المنار، کشف الاسرار، الوافی، الکافی“ جیسی قابل قدر کتب شامل ہیں۔ سورۃ الحج آیت ۵۲ کی تفسیر میں ”شیطانی کلمات“ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر اسے (بفرض محال) صحیح تسلیم کر لیا جاتا ہے تو پھر اس کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں جن میں سے کوئی ایک صورت بھی قابل قبول نہیں ہے:

”فإن يتكلم النبي عليه السلام بها عمداً وأنه لا يجوز لأنه كفر ولأنه بعث طاعناً للأصنام، لا مادحاً لها“

أو أجرى الشيطان على لسان النبي جبراً بحيث لا يقدر على الامتناع منه فهو ممتنع لأن الشيطان لا يقدر على ذلك في حق غيره لقوله تعالى: ”إِنَّ عِبَادِي لَأَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ“ ففی حقہ اولیٰ، أو جرى على لسانه سهواً أو غفلة وهو مردود أيضاً لأنه لا يجوز مثل هذه الغفلة عليه في حال تبليغ الوحي ولو جاز لبطل الاعتماد على قوله۔“ (تفسیر نسفی جلد ۳ ص ۱۰۶)

پہلی صورت یہ ہے کہ نیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ”شیطانی کلمات“ کو جان بوجھ کر زبان مبارک سے ادا کیا ہے تو یہ صورت جائز ہی نہیں کیونکہ یہ کفر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو جنوں کی توہین اور مذمت کے لئے مبعوث ہوئے ہیں نہ کہ ان کی مدح و ستائش کے لئے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ شیطان نے یہ ”شکیہ الفاظ و کلمات“ زبردستی اور جبراً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر جاری کر دیئے ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اسے اس سے روکنا ممکن نہ ہو تو یہ صورت بھی محال اور ناممکن ہے کیونکہ ”إِنَّ عِبَادِي لَأَنسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ“ کے مصداق شیطان اللہ کے دوسرے بندوں پر بھی اس قسم کی قدرت نہیں رکھتا تو آپ کے حق میں بدرجہ اولیٰ یہ طاقت نہیں رکھتا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ ”شیطانی کلمات“ بھول چوک یا غفلت کی وجہ سے نکل گئے ہوں تو یہ صورت بھی غلط، مردود اور ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ ایک نبی کے لئے تبلیغ وحی میں یہ غفلت جائز نہیں اور اگر اس کو جائز مان لیا جائے تو پھر نبی کی ہر بات سے اعتماد ختم ہو جائے گا۔ لہذا یہ صورت بھی ممکن نہیں۔ اس طرح ”افسانہ غرائیق“ سے متعلق کوئی روایت کسی بھی تادیل سے قابل تسلیم ہرگز ہرگز ہرگز نہیں ہے۔

۹۔ علامہ خازن (م ۷۴۱ھ)

عظیم مفسر علامہ خازن کا نام علی بن محمد بن ابراہیم الشیخی علاؤ الدین ہے جو ”خازن“ کے لقب سے ہی معروف ہیں۔ یہ حلب کے ایک علاقے ”شیخہ“ سے منسوب ہو کر ”شیخی“ کہلائے۔ ۶۷۸ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ زیادہ تر دمشق میں ہی قیام رہا۔ ”صوفی“ مزاج اور شافعی المسلک تھے۔ دمشق کے ایک مدرسہ سمیسیطیہ کے کتب خانہ میں ”خازن“ تھے۔ ۷۴۱ھ میں حلب میں وفات پا کر مقبرہ ”صوفیاء“ میں دفن ہوئے۔ امام خازن نے اپنی تفسیر میں اگرچہ ”اخبار قصص اور اسرائیلی روایات“ کافی تعداد میں جمع کر دی ہیں مگر اس کے باوجود قصہ غرائیق کے متعلق فرماتے ہیں:

”انه لم يروها أحد من أهل الصحة ولا أسندها ثقة بمسند صحيح أو سليم متصل“ (لباب التأویل فی معانی التنزیل۔ المعروف بتفسیر خازن جلد ۵۔ ص ۲۳) یعنی اہل صحاح میں سے کسی نے بھی اس قصہ کو روایت نہیں کیا اور نہ ہی کسی ثقہ نے اس کی کوئی سند بیان کی جو صحیح و سالم اور متصل ہو۔

۱۰۔ امام ابو حیان اندلسی (م ۴۵۷ھ)

محمد بن یوسف بن علی بن حیان غرناطہ میں ۲۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ اشیر الدین کے لقب اور ابو حیان کی کنیت سے مشہور ہیں۔ سلف صالحین کے قبیح اور مقلد تھے۔ قرآن کریم کی تفسیر ”البحر المحیط“ کے علاوہ بہت سی مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۲۸۰ھ صفر ۴۵۷ھ کو قاہرہ میں فوت ہوئے اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی تصانیف کو شرف قبولیت بخشا۔ بقول علامہ ابن حجر عسقلانی: ”ابو حیان ان علماء کرام میں سے ہیں جن کی تصانیف ان کی زندگی میں مقبول ہو چکی تھیں۔“ امام ابو حیان اپنے تفسیر میں لکھتے ہیں:

”وہی قصۃ سئل عنها الامام محمد بن اسحاق جامع السیرۃ النبویۃ فقال ہذا من وضع الزنادقۃ، وصنف فی ذلك کتاباً وقال الامام الحافظ ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی: ہذہ القصۃ غیر ثابتۃ من جهة النقل، وقال ما معناه: ان رواتها مطعون علیہم، ولس فی الصحاح ولا فی التصانیف الحلیثۃ شیء مما ذکرہ، فوجب إطرأہ“ (البحر المحیط جلد ۶۔ ص ۳۸۱)

اور اس غرائیق کے قصبے کے متعلق امام محمد بن اسحاق جامع ”السیرۃ النبویۃ“ سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اسے زنادقہ نے گھڑا ہے نیز ابن اسحاق نے اس کے رو میں ایک مستقل کتاب بھی تصنیف کی ہے۔

امام حافظ ابوبکر احمد بن حسین بیہقی نے کہا کہ: سند کے لحاظ سے یہ روایت ثابت نہیں کیونکہ اس کے راوی مطعون ہیں، پھر صحاح اور حدیث کی دیگر کتابوں میں یہ روایت نہیں پائی جاتی لہذا اسے رد کی چیز کی طرح پھینک دینا ضروری ہے۔

امام ابو حیان اندلسی نے مذکورہ روایت محمد بن اسحاق بن خزیمہ کے حوالے سے لکھی ہے مگر سہواً انہوں نے محمد بن اسحاق بن خزیمہ سے امام المغازی محمد بن اسحاق مراد لے لی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ محترم جناب مولانا سجاد بخاری صاحب لکھتے ہیں کہ:

محمد بن اسحاق سے اگر امام المغازی مراد ہے تو امام ابی حیان مؤلف البحر المحیط کو اس میں سہو ہو گیا ہے۔ یہ قول محمد بن اسحاق امام المغازی کا نہیں ہے بلکہ یہ محمد بن اسحاق بن خزیمہ صاحب الشیخ کا قول ہے جو ابن خزیمہ کے نام سے مشہور ہیں اور بڑے پایہ کے محدث تھے۔ ثقہ اور مستند ہیں جیسا کہ امام رازی کی عبارت میں اس کی صراحت موجود ہے۔ جواہر القرآن جلد دوم ص ۴۳۳ بر حاشیہ)

امام ابو حیان، امام ابن خزیمہ اور امام بیہقی کے اقوال نقل کر کے فرماتے ہیں کہ: اسی لئے میں نے اپنی تفسیر کو اس کے بیان سے آلودہ نہیں کیا۔ مجھے ان لوگوں پر حیرت ہے کہ انہوں نے اپنی تالیفات میں اس واقعہ کو لکھنے کی کیسے جسارت کی حالانکہ قرآن کریم کی ان آیات کو تلاوت کرتے ہیں جو اسی سورۃ النجم کے آغاز میں ہیں:

”وَ النَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۝ وَمَا يَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝“ (النجم ۱-۴)

قسم ہے ستارہ کی جب کہ وہ اترتا تھا راہِ راستھی (محمدؐ) نہ گمراہ ہوا نہ بھٹکا۔ وہ تو اپنی خواہش سے بات بھی نہیں کرتا، وہ وہی کہتا ہے جو اس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔

ان روشن آیات کی روشنی میں یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ اسی سورت کی (آیات ۱۹-۲۰) تلاوت کے دوران میں ایسے قبیح مشرکانہ کلمات زبانِ پاک سے نکلے ہوں۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا:

”قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَلِّغَ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ اتَّبِعْتُ إِلَّا مَا يُوْحَىٰ إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝“ (سورہ بقرہ ۱۵)

آپؐ کہہ دیجئے کہ میری یہ مجال نہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کے کلام میں اپنی مرضی سے

رد و بدل کردوں میں تو صرف وحی کا اتباع کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں یہ اعلان کر دیا کہ: ”وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ
 لَا خَلْدَ لَنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۚ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۚ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ
 حَاجِزِينَ“ (سورۃ الحاققہ ۴۷-۴۸) اور اگر یہ (محمدؐ) ہم پر بعض باتوں کا افتراء کرتے تو
 ہم ضرور ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے پھر ہم ضرور ان کی شاہ رگ کاٹ ڈالتے۔ پھر تم میں سے کوئی
 بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔

یہ قرآنی نصوص ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت پر دلالت کرتی ہیں۔ علاوہ
 ازیں عقلی طور پر غرائیق کی روایت من گھڑت ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا ممکن ہوتا تو تمام احکام،
 آیات اور سارا دین ہی مشکوک ہو جاتا۔ (المحرر المہبط جلد ۶۔ تحت الآیہ۔ ملخصاً)

۱۱۔ امام ابن کثیر (م ۷۷۷ھ)

اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن کثیر القیس، القرشی دمشقی ابوالفداء عماد الدین
 امام، مفتی، فقیہ، مفسر، مورخ اور محدث تھے۔ تاریخ الہدایہ والنہایہ کے علاوہ ان کی تفسیر
 القرآن العظیم (تفسیر ابن کثیر) کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ موصوف سورۃ الحج آیت ۵۲ کی
 تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

”قد ذکر کثیر من المفسرین ہہنا قصۃ الغرائیق..... ولكنها من طرق
 کلها مرسلۃ، ولم أرھا مسئلة من وجہ صحیح واللہ اعلم“
 (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۲۳۳۔ طبع بیروت تحت الآیہ)
 اس مقام پر اکثر مفسرین نے ”الغرائیق“ کا قصہ نقل کیا ہے لیکن اس کی تمام اسناد
 مرسل ہیں اور مجھے اس کی کوئی صحیح اور متصل سند دکھائی نہیں دی۔

۱۲۔ علامہ کرمانی (م ۸۶۷ھ)

محدث جلیل علامہ کرمانی ۷۱۷ھ میں پیدا ہوئے ان کا نام ”محمد بن یوسف بن علی بن سعید شمس الدین“ ہے۔ ”کرمان“ سے تعلق کی بناء پر ”کرمانی“ کہلائے۔ بغداد میں شہرت پائی۔ بغداد میں تیس سال تک علم کی نشر و اشاعت میں مصروف رہے۔

کچھ عرصہ مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے جہاں اپنی مشہور کتاب ”الکواکب الدراری فی شرح صحیح البخاری“ کی تکمیل کی۔ ۸۶۷ھ میں حج سے فراغت کے بعد وطن کی طرف مراجعت کرتے ہوئے فوت ہوئے۔ چونکہ موصوف نے اپنے لئے قبر پہلے سے تیار کر رکھی تھی لہذا اسی میں دفن کر دیئے گئے۔

علامہ کرمانی قصہ غرائیق کے متعلق لکھتے ہیں:

”تلك الغرائيق والى رواية باطل ہے۔ عقلاً صحیح ہے نہ نقلًا۔ کیونکہ مشرکین کے معبودوں کی تعریف کرنا کفر ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت کرنا صحیح نہیں اور نہ ہی یہ کہنا صحیح ہے کہ (العیاذ باللہ) آپؐ نے یہ شرکیہ و شیطانی کلمات کہے تھے۔ آپؐ اس سے بری ہیں۔

آگے چل کر سورۃ النجم کی تفسیر میں بھی علامہ کرمانی نے اس لغو اور باطل قصے کا رد کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: (شرح الکرمانی جلد ۶ ص ۱۵۳، جلد ۸ ص ۱۱۶)

۱۳۔ علامہ بدرالدین عینی حنفی (م ۸۵۵ھ)

مشہور محدث شارح بخاری اور مؤرخ علامہ عینی کا نام ”محمود بن احمد بن موسیٰ بن احمد ابو محمد بدرالدین عینی“ ہے۔ ۷۶۲ھ میں ”عین تاب“ میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے ”عینی“ کہلائے۔ حلب، مصر اور دمشق میں قیام پذیر رہے۔ قاہرہ میں ۸۵۵ھ میں وفات پائی۔

علامہ عینی قصہ غرائیق کے متعلق واشگاف الفاظ میں فرماتے ہیں:

”قلت الذى ذكره هو لا يثق بجلالة قبر النبي صلى الله عليه وسلم فانه قد قامت الحجة واجتمعت الامة على عصمته عليه الصلوة والسلام و نزاهته عليه الصلوة والسلام عن مثل هذه الرذيلة۔

وحاشا عن أن يجرى على قلبه أو لسانه شيء من ذلك لاعتماداً ولا سهواً أو يكون للشيطان عليه سبيل أو يتقول على الله عز وجل لا اعتماداً ولا سهواً۔ والنظر والعرف أيضاً يستحيلان ذلك۔ ولو وقع لأرتد كثير ممن أسلم ولم ينقل ذلك ولا كان يخفى على من كان بحضرته من المسلمين“ (عملة القاری شرح صحیح بخاری جزء ۱۹ ص ۶۶)

علامہ بدرالدین عینی اس بحث میں ابن حجر عسقلانی پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: میں کہتا ہوں کہ ان دونوں (ابن العربی اور قاضی عیاض) نے اس سلسلہ میں جو ذکر فرمایا ہے یہی چیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت قدر اور شان اقدس کے لائق ہے کیونکہ اس قسم کے ردیل قصہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نزاہت اور عصمت پر حجت قائم ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے۔

اور اللہ کی پناہ کہ اس قسم کے کفریہ اور شیطانی کلمات آپؐ کے قلب اطہر پر یا آپؐ کی

امام طبری۔۔۔ کون؟ افسانہ غرائیق: علامہ بدرالدین عینی حنفی

زبان مبارک پر جان بوجھ کر یا بھول کر جاری ہوں، یا شیطان کا آپ پر کسی قسم کا تسلط ہو یا آپ کے خیال پر شیطان کا راہ گزر ہو۔ یا آپ بخود (العیاذ باللہ) کوئی بات گھڑ کر عمداً سہواً اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کریں۔ یہ چیز دلائل عقلیہ اور نقلیہ کے اعتبار سے بھی محال ہے۔ اگر فی الواقع اس طرح کا کوئی واقعہ رونما ہوا ہوتا تو بہت سے مسلمان مرتد ہو گئے ہوتے مگر ایسی کوئی بات کسی کتاب میں منقول نہیں ہے نیز اگر ایسا ہوا ہوتا تو موقع پر موجود حاضر صحابہ کرام پر یہ واقعہ مخفی نہ ہوتا۔

امام طبری۔۔۔ کون؟ افسانہ غرائیق: علامہ قسطلانی

۱۳۔ علامہ قسطلانی (م ۹۲۳ھ)

مشہور محدث شارح صحیح بخاری علامہ قسطلانی کا نام ”احمد بن محمد بن ابی بکر بن عبد الملک (قسطلانی، قینی، مصری) ہے۔ ۸۵۸ھ میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ ۹۲۳ھ میں قاہرہ میں فوت ہوئے۔ علامہ قسطلانی قصہ غرائیق کے متعلق فرماتے ہیں:

”وقد طعن فیہا غیر واحد من الائمة حتی قال ابن اسحاق (أی ابن خزيمة) وقد سئل عنها ہی من وضع الزنادقة“

یعنی بہت سے ائمہ نے اس قصہ کے بارے میں طعن کیا ہے حتیٰ کہ امام ابن اسحاق ابن خزيمة نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا: کہ یہ زندیقوں کا کلام ہے۔

پھر امام قسطلانی نے امام تہذیبی کا قول نقل فرمایا کہ: ”غیر ثابتہ، نقلاً و رواًتھا مطعونین“، نقلاً اس قصے کا کوئی ثبوت نہیں اور روایت اس کے سب راوی مطعون ہیں۔ پھر انہوں نے قاضی عیاض مالکی کے متعلق ارشاد فرمایا:

”وأطنب القاضي عیاض فی الشفاء فی توهین أصلها، فشفی و کفی“

یعنی قاضی عیاض نے اپنے کتاب الشفاء میں اس قصہ کی اصلیت کو کمزور کرنے میں بڑی لمبی چوڑی بحث کی جس سے دل کو شفاء حاصل ہوئی اور انہوں نے کافی بحث کی۔ (بحوالہ احسن التفسیر المعروف بتفسیر بے نظیر مع بدر منیر ص ۸۵-۸۶)

سخت تعجب ہے کہ امام قسطلانی کو بھی روزنامہ اسلام میں امام طبری کے ساتھ ”مجرموں“ کی قطار میں دکھایا گیا ہے۔

۱۵۔ شیخ الاسلام امام ابو سعود (م ۹۸۲ھ)

دسویں صدی ہجری کے مشہور مفسر امام ابو سعود کا نام: ”محمد بن محمد بن مصطفیٰ العمادی“ ہے۔ ترکی مستعربین میں سے تھے۔ ۸۹۸ھ میں قسطنطنیہ کے قریب ”آمد“ میں پیدا ہوئے۔ فقہ حنفی اور تفسیر قرآن عزیم میں یکتائے روزگار تھے۔ ہم عصر علماء نے آپ کو ”خطیب المفسرین“ کا لقب دیا تھا۔ خلافت عثمانیہ میں تیس سال تک شیخ الاسلام کے منصب پر فائز رہے۔ سلطان سلیم نے تخت نشینی کے موقع پر اپنی دستار خلافت کو آپ کے ہاتھ سے مشرف کرایا تھا۔ دوسری کتابوں کے علاوہ آپ نے قرآن عزیم کی ایک تفسیر لکھی جس کا نام ”ارشاد العقل السلیم الی مزایا القرآن الکریم“ ہے۔ (اس نام میں بھی سلطان سلیم کی طرف تلمیح ہے)

امام ابو السعد کا انتقال جمادی الاولیٰ ۹۸۲ھ میں ہوا اور میزبان رسول حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے پہلو میں دفن کر دیئے گئے۔ آپ کی یاد کے طور پر قسطنطنیہ کی ایک سڑک کا نام ”شارع ابی السعد“ رکھا گیا۔

امام ابو السعد قصہ غرائیق کے متعلق فرماتے ہیں: ”وهو المردود عند المحققین“ یعنی محققین کے نزدیک یہ سارا قصہ مردود ہے۔ (بحوالہ جواہر القرآن جلد دوم ص ۴۳۷۔ کشف الباری۔ کتاب التفسیر سورۃ الحج ص ۴۴۹)

۱۶۔ امام شوکانی (م ۱۲۵۰ھ)

ابو علی محمد بن علی بن عبد اللہ شوکانی، یمن کے مشہور قصبہ ”شوکان“ میں ۲۸۔ ذی قعدہ ۱۱۷۳ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد یمن کے قاضی تھے۔ بعد میں امام شوکانی خود بھی یمن کے ”قاضی القضاۃ“ مقرر ہوئے۔ آپ کثیر التصانیف ہیں۔ ”نیل الاوطار“ اور ”فتح القدر“ کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۲۵۰ھ میں وفات ہوئی۔

امام شوکانی سورۃ الحج آیت ۵۲ کی تفسیر میں ”قصہ غرائیق“ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

”لم یصح شیء من هذا، ولا ثبت بوجه من الوجوه، ومع عدم صحته بل بطلانه فقد دفعه المحققون بكتاب الله“ (فتح القدر جلد ۲ ص ۱۹۴)

ان روایات میں سے کوئی روایت بھی صحیح نہیں اور یہ کسی بھی طور پر اور کسی بھی سند سے ثابت نہیں۔ اس کے صحیح نہ ہونے بلکہ باطل ہونے کے باوجود محققین نے کتاب اللہ کے دلائل و شواہد کے ساتھ اس کا رد کیا ہے۔

امام شوکانی مزید لکھتے ہیں کہ: اس قصے کی تمام روایات مرسل یا منقطع ہیں، ان میں سے کسی روایت سے کوئی حجت قائم نہیں ہوتی۔

۱۔ علامہ محمود آلوسی (م ۱۲۷۰ھ)

ابوالثناء شہاب الدین السید محمود بن عبد اللہ افندی، بغدادی آلوسی بغداد کے قریب ”کرخ“ نامی مردم خیز قصبہ میں ۱۲۱۷ھ میں پیدا ہوئے مگر چونکہ آپ کے باء واحد کا اصلی وطن ”آلوس“ تھا اس لئے اسی نسبت سے ”آلوسی“ کہلائے۔ آپ کی تصانیف میں ایک اہم کتاب تفسیر: ”روح المعانی“ ہے جو انہوں نے ۱۲۵۲ھ میں ۳۴ سال کی عمر میں شروع کی اور ۴۹ سال کی عمر میں ۱۲۶۷ھ میں اسے مکمل کیا۔ اس طرح یہ تفسیر مکمل کرنے میں ۱۵ سال کا عرصہ صرف ہوا۔ یہ عجیب بات ہے کہ علامہ آلوسی تفسیر کی تکمیل کے بعد بھی اس کا خود کوئی نام تجویز نہ کر سکے بالآخر انہوں نے خلافت عثمانیہ کے تاج دار عبد المجید الاول بن محمود الثانی کے وزیر اعظم علی رضا پاشا کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے اس تفسیر کا نام ”روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی“ رکھا۔

علامہ آلوسی نے ”غرائیق“ سے متعلق تمام روایتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

”وقد أنکر کثیر من المحققین هذه القصة“

محقق علماء کی اکثریت نے اس قصہ کی صحت سے انکار کیا ہے۔

پھر علامہ آلوسی نے امام بیہقی، قاضی عیاض، محمد بن اسحاق اور شیخ ابو منصور ماتریدی کے اقوال نقل کئے ہیں۔ مؤخر الذکر کا قول (جو یقیناً سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے) ملاحظہ فرمائیں:

وذكر الشيخ أبو منصور الماتريدي في كتاب حصص الاقبياء الصواب أن قوله: ”تلك الغرائيق العلي“...

من جملة إحياء الشيطان إلى أوليائه من الزنادقة حتى يلقوا بين الضعفاء وأرقاء الدين فيرتابوا في صحة الدين وحضرة الرسالة بريئة من مثل هذه الرواية...

امام ابو منصور ماتریدی نے ”حصص الاقبياء“ میں اس پورے واقعہ کو موضوع قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ (تلك الغرائيق العلي) یہ ان باتوں میں سے ایک بات ہے جو شیطان اپنے زندیق پیروکاروں کے دلوں میں ڈالتا ہے تاکہ کمزور ایمان والے لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کریں اور انہیں شک و بدگمانی میں مبتلا کریں۔ اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کی روایتوں سے مبرا و منزہ ہیں۔

علامہ آلوسی نے سات دلیلین قائم کر کے ان کے تفصیلی جوابات دیئے ہیں اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ موصوف نے ایک اور لطیف جواب دیا ہے کہ قرآن نے ایک سے زائد بازنچہ کیا ہے کہ اگر تم اسے انسانی کلام سمجھتے ہو تو اس کی چھوٹی سی سورۃ (بلکہ ایک قرآنی جملہ: ”قَلِيلًا نُّؤَا بِحَلِيفٍ فَبِئْسَ الْكَاثِبُونَ“ (سورۃ الطور آیت ۳۴) کے برابر بنا کر لاؤ۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ تم اپنے اعوان و انصار کو بھی جمع کر کے لاؤ گے تب بھی تم اس کی چھوٹی سی چھوٹی سورۃ کے برابر اس جیسا کلام پیش نہیں کر سکتے ہو۔

اگر ”تلك الغرائيق العلي“ کے جملوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن ہونے کا شبہ ہو اور اس پر جبرئیل کو متنبہ کرنا پڑا اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ گویا شیطان نے قرآن کے چیلنج اور تحدی کا جواب دے دیا (یا ان روایات کو صحیح سمجھنے والے اپنے پیلوں کے ذریعے دلوادیا)

علامہ آلوسی نے قصہ غرائیق کو صحیح سمجھنے والوں کی تمام روایات کو بعیدہ، فاسدہ اور باطلہ قرار دینے کے بعد کیا خوب فرمایا ہے:

”ولعمري أن القول بأن هذا الخبر مما ألقاه الشيطان على بعض ألسنة الرواة ثم وفق الله تعالى جمعاً من خاصة لا بطلاله أهي من القول بأن حديث الغرائيق مما ألقاه الشيطان على لسان رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم نسخته سبحانه وتعالى لا سيما وهو مالم يتوقف على صحته أمر ديني ولا معنى آية ولا، لا سوى أنها يتوقف عليها حصول شبه في قلوب كثير من ضعفاء المؤمنين لا تكاد تلتفع إلا بجهد جهيد..... (روح المعاني جلد ۱ ص ۱۸۲)

(میری زندگی کی قسم) اس روایت کے بارہ میں یہ بات مان لیما بہت آسان ہے کہ اسے شیطان نے خود اس روایت کے راویوں کی زبان پر جاری کر دیا ہے بہ نسبت اس کے کہ یہ مان لیا جائے کہ شیطان مردود نے ان شریک کلمات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر القاء کر دیا تھا بعد میں اللہ تعالیٰ کو اس میں مداخلت کر کے منسوخ کرنا پڑا۔

جبکہ اس روایت کی صحت پر نیکو کوئی شرعی حکم موقوف ہے اور نہ ہی کسی آیت کے سمجھنے کا قصہ غرائیق پر وارو مدار ہے۔ البتہ اس کا یہ نقصان ضرور ہے کہ اس سے بہت سے کمزور معنوں کے دلوں میں شبہات ضرور پڑ جائیں گے جن کا دور کرنا عظیم اور زبردست ہنگامہ کا متقاضی ہے۔

علامہ آلوی آگے چل کر اس بحث کے آخر میں فرماتے ہیں کہ: ”وَأُبْحِ الْاَقْوَالِ الَّتِي رَأَيْنَا هَا فِي هَذَا الْبَابِ وَ أَظْهَرُهَا فَسَاداً أَنَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَدْخَلَ تِلْكَ الْكَلِمَةَ مِنْ تَلَقُّاهُ نَفْسَهُ حَرِصاً عَلَى إِيْمَانِ قَوْمِهِ ثُمَّ رَجَعَ عَنْهَا، وَيَجِبُ عَلَى قَائِلِ ذَلِكَ التَّوْبَةُ، ”كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنَّ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا“ (سورۃ الکہف: ۵) وقريب منه ما قيل أنها كانت قرأنا منزلاً في وصف الملكة عليهم السلام فلما توهم المشركون أنه يريد عليه الصلوة والسلام مدح الهتهم بها نسخت.....“ (روح المعاني جلد ۱ ص ۱۸۶)

اس باب میں انتہائی بدترین قول جو ہم نے دیکھا اور جس کا فساد ظاہر ہے ان لوگوں کا قول ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ان شریک جملوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود آیتوں کے درمیان اس لئے داخل کر لیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ایمان کے حریص تھے پھر آپ نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ ایسے قائلین پر تو بہ کرنا واجب ہے: بہت بڑی بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے، وہ سوائے جھوٹ کے کچھ نہیں کہتے۔

اسی طرح بدترین اقوال میں سے ایک قول یہ بھی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ کلمات فرشتوں کی تعریف میں مازل کئے گئے تھے لیکن مشرکوں نے اسے اپنے معبودوں کی تعریف سمجھا تو بعد میں یہ کلمات منسوخ ہو گئے۔

۱۸۔ مفتی محمد عبدہ (م ۱۳۲۳ھ)

مفتی محمد عبدہ بن حسن (محلہ نضر طلع بحیرہ مصر) ۱۲۶۵ھ یا ۱۲۶۶ھ میں پیدا ہوئے۔ جامع ازہر کے سند یافتہ ہیں۔ سید جمال الدین افغانی کے منصوبے کے مطابق دینی امور میں مشغول رہے۔ مصر کے مفتی اعظم مقرر ہوئے اور اسی عہدہ پر ۵۔ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ کو اسکندریہ میں وفات پائی۔

حضرت مفتی صاحب قصہ غرائیق کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

”العصمة من العقائد التي يطلب فيها اليقين، فالحديث الذي يريده خرمها و نقضها لا يقبل على ائى وجه جاء، و قلعد الأصوليون الخبر الذي يكون على تلك الصفة من الأخبار التي يجب القطع بكنبها۔ هذا لو فرض اتصال الحديث فما ظنك بالمراسيل۔“ (محمد رسول اللہ جلد ۲ ص ۱۵۱۔ مؤلفہ محمد صادق امراہیم عرجون)

”معصمت انبیاء ان عقائد میں سے ہے جن پر یقین رکھنا شرعاً مطلوب ہے۔ ایسی حدیث جو اس عقیدے کو نقصان پہنچائے وہ کسی بھی طریقے سے مردی ہو، قبول نہیں کی جائے گی۔ علماء اصول کا فیصلہ یہ ہے کہ جو حدیث اس قسم کی ہو اس کو قطعیت کے ساتھ جھوٹ قرار دینا واجب ہے۔ یہ حکم تو اس صورت میں ہے کہ جب اس قسم کی حدیث متصل و مرفوع ہو۔

جب اس قسم کی متصل و مرفوع حدیث و روایت کے متعلق حکم یہ ہے کہ اسے قطعیت کے ساتھ جھوٹ قرار دینا واجب ہے تو اس کے مقابلے میں پھر مرسل احادیث کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے؟“

علامہ عرجون نے اپنی کتاب میں ”غرائیق“ کے متعلق امام رازی، علامہ ابوالبرکات نسفی اور امام شوکانی کے اقوال نقل کر کے خود بھی عقلاً و ظہراً ان روایات کو موضوع اور ناقابل

اعتبار قرار دیا ہے۔ جن علمائے ملت نے اسانید کی کمزوری کے باوجود اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ کثرت طرق اس بات کی نشان دہی کر رہے ہیں کہ اس واقعہ کی کوئی اصل ہے، علامہ عربون ان پر خوب بر سے ہیں بلکہ وہ علماء جنہوں نے اس واقعہ کی صحت کا انکار کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ اگر بالفرض اس واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کی یہ تاویل ممکن ہے، علامہ عربون نے یہ ”پور“ دروازہ نکالنے والوں کا بھی خوب رد کیا ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ یہ قصہ اول تا آخر جھوٹ ہے، اس کی کوئی تاویل ممکن نہیں ہے:

”وهي أقصوصة مختلقة باطل في أصلها وقصصها و آكلوبة خبيثة في جنورها وأغصانها و قرينة متزلفة اخترقها (غرتوق) أبله جهول أو شيخ حاقد على الإسلام زنديق فو منافق فاجر عرييد ألقى بها إليه شيطان عابث مريب“

(محمد رسول اللہ جلد ۲ ص ۳۰ بحوالہ ضیاء النبی جلد ۶ ص ۶۳۱۔ مؤلفہ محمد کرم شاہ الازہری)

یہ ایک گھڑا ہوا افسانہ ہے جو ہر لحاظ سے باطل ہے۔ یہ اول و آخر ایک خمیشت جھوٹ ہے۔ یہ ایک کافرانہ جھوٹ ہے جسے گھڑنے والا یا تو کوئی احمق اور جاہل جوان ہے یا کوئی حاسد اور بے ایمان بوڑھا جو اسلام کا دشمن ہے یا کوئی فسادی منافق اور فاجر ہے اور یہ افسانہ اس کے دل میں ڈالنے والا شیطان مردود ہے۔

۱۹۔ مفسر احمد مصطفیٰ المراغی (م ۱۳۶۴ھ)

احمد مصطفیٰ بن محمد بن عبد اللعیم ”مراغی“ (مصر) میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے مراغی کہلائے۔ مفتی محمد عبدہ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ پہلے مصر میں ”قاضی“ بعد ازاں سوڈان میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہے۔ آخر میں جامعہ ازہر کے صدر مقرر ہوئے اور اسی منصب پر ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۵ء میں وفات پائی اور قاہرہ میں دفن ہوئے، آپ نے قرآن عزیز کی ایک مفصل تفسیر لکھی جو ”تفسیر مراغی“ کے نام سے مشہور ہے۔ موصوف ”افسانہ غرائیق“ کے متعلق لکھتے ہیں کہ: ”وإذا قد دس بعض الزنادقة في تفسير هذه الآية أحاديث مكنوبة لم ترد في كتاب من كتب الصحابة، و أصول الدين تكذيبها، والعقل السليم يرشد إلى بطلانها، و أنها ليست من الحق في شيء وهي مما تشكك المسلمين في دينهم، وتجعلهم في حيرة من أمر الوحي، و كلام الرسول صلى الله عليه وسلم فيجب على العلماء طرحها ورآ هم ظهرياً ولا يضيعون الزمن في تأويلها و تخريجها ولا سيما بعد أن نص الثقات من المحققين على وضعها و كذبها لمصادمتها لأصول الدين، التي لا تقبل شكاً ولا إمتراء“ (التفسير المراغی جلد ۱ ص ۱۳۰)

بعض زنادقہ و ملاحدہ نے اس آیت (الحج ۵۲) کی تفسیر میں ایسی جھوٹی احادیث کی آمیزش کی ہے کہ جن کا وجود کتب صحاح میں سے کسی کتاب میں بھی نہیں پایا جاتا۔ دین کے تمام اصول غرائیق کے قصے کو جھٹلاتے ہیں اور عقل سلیم بھی اس کے بطلان کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور یہ کہ اس قصے میں کوئی چیز بھی صحیح نہیں۔ اور یہ قصہ مسلمانوں کو ان کے دین کے بارے میں شک میں مبتلا کرتا ہے اور یہ قصہ مسلمانوں کو کلام رسول اور وحی کے معاملے میں حیرت میں ڈالتا ہے۔ پس علماء پر واجب و لازم ہے کہ وہ اس من گھڑت قصے کو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیں اور اس کی تاویل و تخریج میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ کیونکہ ثقہ محدثین نے اس قصہ کے اصول دین جو ہر قسم کے ریب و شک سے پاک ہیں، سے متصادم ہونے کی بناء پر اس کے وضعی اور جھوٹا ہونے کو دو ٹوک لفظوں میں بیان کیا ہے۔

۲۰۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

(۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء)

مولانا مودودی کے والد کا نام مولوی سید احمد حسن تھا۔ آپ ۳۔ رجب ۱۳۲۱ھ کو اورنگ آباد کن میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہندوستان کے بعد لاہور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۱ء میں ”۷۵“ افراد کے اجتماع میں جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی اور پھر پورتحریکی زندگی گزاری۔ ۱۹۷۲ء میں جماعت اسلامی کی امارت سے مستعفی ہو کر ہمہ تن علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ عصمت انبیاء، مشاجرات صحابہ اور بعض فقہی مسائل میں متاخر رہے۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۷۹ء کو امریکا کے ایک ہسپتال میں فوت ہوئے اور لاہور میں تدفین عمل میں آئی۔

موصوف سورۃ الحج آیت ۵۲ کی تفسیر میں قصہ غرائیق پر مفصل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ابن کثیر، بیہقی، قاضی عیاض، ابن خزیمہ، قاضی ابوبکر ابن العربی، امام رازی، قرطبی، بدرالدین عینی، شوکانی، آلوسی وغیرہ حضرات اس قصے کو بالکل غلط قرار دیتے ہیں..... امام رازی، قاضی ابوبکر اور آلوسی نے اس پر مفصل بحث کر کے اسے بڑے پر زور طریقے سے رد کیا ہے۔

لیکن دوسری طرف حافظ ابن حجر جیسے بلند پایہ محدث اور ابوبکر حصص جیسے نامور فقیہ اور زحرفی جیسے عقلیت پسند مفسر اور ابن جریر جیسے امام تفسیر و تاریخ و فقہ اس کو صحیح مانتے ہیں اور اسی کو آیت زیر بحث کی تفسیر قرار دیتے ہیں.....

پہلی چیز خود اس کی اندرونی شہادت ہے جو اسے غلط ثابت کرتی ہے۔ قصے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب ہجرت حبشہ واقع ہو چکی تھی اور اس واقعے کی خبر پا کر مہاجرین حبشہ میں سے ایک گروہ مکہ واپس آ گیا۔ اب ذرا تاریخوں کا فرق ملاحظہ کیجئے:

ہجرت حبشہ معتبر تاریخوں کی رو سے رجب ۵ نبوی میں واقع ہوئی اور مہاجرین

حبشہ کا ایک گروہ مصالحت کی غلط خبر سن کر تین مہینے بعد (یعنی اسی سال تقریباً شوال کے مہینے میں) مکہ واپس آ گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ لا محالہ ۵ نبوی کا ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل جس کی ایک آیت کے متعلق بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل پر بطور عتاب مازل ہوئی تھی، معراج کے بعد اتری ہے اور معراج کا زمانہ معتبر ترین روایات کی رو سے ”۱۱“ یا ”۱۲“ نبوی کا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس فعل پر پانچ چھ سال جب گذر چکے تب اللہ تعالیٰ نے عتاب فرمایا۔

اور زیر بحث آیت (سورۃ الحج آیت ۵۲) جیسا کہ اس کا سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے ”۱“ ہجری میں مازل ہوئی ہے یعنی عتاب پر بھی جب مزید دو ڈھائی سال گذر گئے تب اعلان کیا گیا کہ یہ آمیزش تو القائے شیطانی سے ہوئی تھی اللہ نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ کیا کوئی صاحب عقل آدمی باور کر سکتا ہے کہ آمیزش کا فعل آج ہو، عتاب چھ سال بعد اور آمیزش کی تنبیخ کا اعلان ”۹“ سال بعد؟.....

ہم اس سے پہلے بھی بار بار کہہ چکے ہیں اور یہاں پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ کوئی روایت خواہ اس کی سند آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہو، ایسی صورت میں قابل قبول نہیں ہو سکتی جبکہ اس کا متن اس کے غلط ہونے کی کھلی کھلی شہادت دے رہا ہو۔ اور قرآن کے الفاظ، سیاق و سباق، ترتیب، ہر چیز اسے قبول کرنے سے انکار کر رہی ہو۔ یہ دلائل تو ایک مشکل اور بے لاگ محقق کو بھی مطمئن کر دیں گے کہ یہ قصہ قطعی غلط ہے۔

رہا مومن، تو وہ اسے ہرگز نہیں مان سکتا جبکہ وہ علانیہ یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ روایت قرآن کی ایک نہیں بیسیوں آیتوں سے ٹکراتی ہے۔ ایک مسلمان کے لئے یہ مان لینا بہت آسان ہے کہ خود اس روایت کے راویوں کو شیطان نے بہکا دیا نہ بہت اس کے کہ وہ یہ مان لے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اپنی خواہش نفس سے قرآن میں ایک لفظ بھی ملا سکتے تھے، یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال آ سکتا تھا کہ توحید کے ساتھ شرک کی کچھ آمیزش کر کے کفار کو راضی کیا جائے،

یا آپ اللہ تعالیٰ کے فرامین کے بارے میں کبھی یہ آرزو کر سکتے تھے کہ کاش اللہ میاں ایسی کوئی بات نہ فرما بیٹھیں جس سے کفار ناراض ہو جائیں یا یہ کہ آپ پر وحی کسی ایسے غیر محفوظ اور مشتبہ طریقے سے آتی تھی کہ جبرئیل کے ساتھ شیطان بھی آپ پر کوئی لفظ القاء کر جائے اور آپ اسی غلط فہمی میں رہیں کہ یہ بھی جبرئیل ہی لائے ہیں۔

ان میں سے ایک ایک بات قرآن کی کھلی کھلی تصریحات کے خلاف ہے۔ اور ان ثابت شدہ عقائد کے خلاف ہے جو ہم قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں رکھتے ہیں۔ خدا کی پناہ اس روایت پرستی سے جو محض سند کا اتصال یا راویوں کی ثقاہت یا طریق روایت کی کثرت دیکھ کر کسی مسلمان کو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کے بارے میں ایسی سخت باتیں بھی تسلیم کرنے پر آمادہ کر دے۔“ (تفہیم القرآن جلد سوم ص ۲۴۲-۲۴۰)

۲۱۔ شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان (۱۹۸۰ء)

مولانا غلام اللہ خان المعروف شیخ القرآن ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں ملک فیروز خان کے ہاں ضلع انک کے ایک گاؤں ”دریا“ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام ”غلام خان“ رکھا گیا۔ دورہ حدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت میں حضرت علامہ محمد انور شاہ کاشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی سے پڑھا۔ فراغت کے بعد ابتداء میں اسلامیہ ہائی سکول راولپنڈی میں عربی ٹیچر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیئے، بعد میں مستعفی ہو کر ہرمجاز پر (تحریری، تقریری، تدریسی) دین اسلام کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ دیگر تصانیف کے علاوہ اپنے شیخ حضرت حسین علی صاحب کی املائی تفسیر مع اضافات ”جواہر القرآن“ کے نام سے شائع کی۔ بالآخر موصوف ۱۱۔ رجب ۱۴۰۰ھ/۲۶ مئی ۱۹۸۰ء عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد دہرائی کے ایک تبلیغی سفر کے دوران داعی اجل کو لبیک کہہ گئے اور مد رسہ اشاعت الاسلام انک کے صحن میں تدفین عمل میں آئی۔

موصوف سورۃ الحج آیت ۵۲ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

”اس آیت کی تفسیر میں ایک داعی اور باطل قصہ نقل کیا جاتا ہے، ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ شریف میں سورۃ النجم تلاوت فرما رہے تھے۔ سامعین میں مسلمانوں کے علاوہ مشرکین بھی تھے جب اس آیت پر پہنچے ﴿وَمِنَ اللَّيْلِ أَتَىٰكَ الشَّيْطَانُ﴾ نے آپ کی زبان مبارک سے یہ کلمات جاری کر دیئے: ”تَمْلِكُ الْغَرَائِيقُ الْعَلَىٰ“۔ وان شفاعتھن لشر تھی“ یعنی ہمارے یہ معبود بہت بلند رتبہ ہیں اور آڑے وقت میں ان کی شفاعت کی امید ہے۔ ان کلمات میں مشرکین کے معبودان باطلہ کی تعریف تھی اس لئے مشرکین بہت خوش ہوئے کہ آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے معبودوں کی تعریف کی

امام طبری۔۔۔ کون؟ افسانہ غرائیق: شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان

ہے۔ چنانچہ حضرت جبریلؑ نے آکر حضور علیہ السلام کو اس غلطی پر متنبہ کیا۔ یہ شیطانی القاء تھا۔ یہ قصہ موضوع اور من گھڑت ہے۔ زندیقوں اور ملحدوں کا ساختہ ہے اور نقل کے اعتبار سے ثابت نہیں۔“

اس کے بعد موصوف نے اس دعویٰ کی تائید میں ابن خزیمہ، امام بیہقی، امام قرطبی، علامہ خازن، امام رازی، امام ابوالسعود کے اقوال نقل کئے ہیں۔ جن کی رو سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ ”غرائیق“ کا قصہ لغو، باطل، من گھڑت اور زنا وقتہ و ملاحدہ کا وضع کردہ ہے۔ ملاحظہ ہو: تفسیر جواہر القرآن۔ جلد دوم ص ۷۳۔

امام طبری۔۔۔ کون؟ افسانہ غرائیق: مفکر اسلام مولانا مفتی محمود

مفکر اسلام مولانا مفتی محمود

۲۲۔ مفکر اسلام مولانا مفتی محمود

(م ۱۴۰۰/۱۹۸۰ء)

مولانا مفتی محمود خلیفہ محمد صدیق مرحوم کے ہاں پنیالہ ڈیرہ اسماعیل خان میں ۶۔ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ/ جنوری ۱۹۱۹ء کو پیر کی رات پیدا ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند اور مراد آباد سے تحصیل علم کے بعد وطن مراجعت ہوئی۔ مختلف مدارس میں تدریس کے فرائض سرانجام دیئے پھر ۱۹۵۰ء میں مدرسہ قاسم العلوم ملتان تشریف لے آئے جہاں نہایت ہی قلیل عرصے میں صدر مدرس، صدر مفتی اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہو گئے۔ راقم الحروف ۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۲ء جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں زیر تعلیم رہا۔ اس دوران میں حضرت مفتی صاحب اکثر علامہ شمس الحق افغانی سے ملاقات و استفادے کی غرض سے تشریف لاتے جہاں ان سے بارہا ملاقاتیں ہوئیں۔ بعد میں بھی حضرت والد صاحب (قاضی چن پیر الہاشمی) کی معیت میں ان کی متعدد نجی و علمی محافل میں شرکت کے مواقع ملتے رہے۔

مفتی صاحب ہمہ گیر علمی شخصیت تھے۔ انہوں نے میدان تدریس اور میدان سیاست دونوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے بالآخر چودہویں صدی کے آخری حج میں شرکت کی غرض سے کراچی پہنچے جہاں ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء/ ۵ ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ بروز بدھ کی پرواز سے حرمین شریفین روانہ ہو گئے۔ طے تھی مگر اس سے ایک دن پہلے ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء مطابق ۴۔ ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں قانون زکوٰۃ کے بعض پہلوؤں پر علماء کرام کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ”پان“ پیش کیا جسے دو منٹ تک منہ میں رکھنے کے بعد اگالان میں ڈال دیا۔ ۱۰ منٹ تک شرعی مسئلہ پر گفتگو فرماتے رہے۔ اچانک خاموش ہو گئے، ہایاں ہاتھ پیشانی پر رکھا اور یکایک بانیں پہلو کی طرف مائل پیچھے کو

گر گئے، پھر اس جہاں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

موصوف کے نام کے ساتھ ”مفتی“ کے سابقے سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی علمی خدمات کا دائرہ ”فقہ افتاء“ کی حد تک ہی محدود ہوگا (جس کا اندازہ ”فتاویٰ محمود“ سے لگایا جاسکتا ہے) مگر اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ ”تفسیر“ کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ چنانچہ ۱۹۷۶ء میں موصوف نے علماء اور اہل علم کی خواہش پر شیرانوالہ گیٹ لاہور کے مرکز میں دورہ تفسیر پڑھانے کی ذمہ داری قبول فرمائی۔ بعد میں ان کے ”تفسیری امالی“ کو کتابی صورت دی گئی جو تین جلدوں میں ”تفسیر محمود“ کے نام سے منصہ شہود پر آ گئی۔

موصوف سورۃ الحج آیت ۵۲ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

بعض مفسرین نے یہاں ایک قصہ نقل کیا ہے جیسے صاحب جلالین وغیرہ نے کہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب سورۃ نجم کی تلاوت فرما رہے تھے جب آپؐ نے یہ آیتیں پڑھیں تو شیطان نے آپؐ کی زبان پر یہ جاری کر دیا: ”هَلْ لَكَ الْغَرَائِقُ الْعَلَى۔“ وان شفاعتہن لئلا ترجی، یعنی یہ خوبصورت مورتیاں ہیں اور ان کی سفارش کی امید کی جاسکتی ہے۔

لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بتوں کی تعریف پر مشتمل جملے سن کر مشرکین مکہ بہت خوش ہو گئے اور آپؐ نے سورۃ نجم کے آخر میں سجدہ کیا تو تمام کفار نے آپؐ کے ساتھ سجدہ ادا کیا، سوائے ایک کے کہ اس نے ٹھٹھی بھر مٹی اٹھا کر چہرہ کے ساتھ لگالی۔ لیکن اس قصے کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہی شیطان کے اثر سے محفوظ نہیں رہی تو آپؐ کے لائے ہوئے دین پر اعتماد کیوں کر ہوگا؟ لہذا صاحب جلالین کی یہ تفسیر لغو و فضول ہے۔“ (تفسیر محمود جلد دوم ص ۴۵۱)

۲۳۔ مولانا امین احسن اصلاحی (۱۹۹۷ء)

مولانا امین احسن اصلاحی ۱۹۰۴ء میں حافظ محمد مرتضیٰ بن وزیر علی کے ہاں انڈیا کے ضلع اعظم گڑھ (یو پی) کے گاؤں ”ہمپور“ کے ایک متوسط درجہ کے زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے لیکن صحیح تاریخ پیدائش محفوظ نہیں رہ سکی۔

موصوف ماہر قرآنیات مولانا حمید الدین فراہی (۱۸۶۳ء-۱۹۳۰ء) کے شاگرد رشید تھے۔ عربی زبان لغت و ادب، تفسیر وحدیث اور فلسفہ و علم سیاسیات میں انہیں مہارت حاصل تھی اور قدیم صحف سماوی پر گہری نظر رکھتے تھے۔

مولانا اصلاحی تقریباً ۷۵ سال تک درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور خطابت و صحافت کے ذریعے دعوت دین اور علم قرآن کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیتے رہے۔ مولانا کی تصانیف میں: ”تذکرہ قرآن کے علاوہ تقریباً ۲۶ کتب ہیں لیکن مولانا کی وجہ شہرت ان کی عظیم الشان تفسیر ”تذکرہ قرآن“ ہے جو ۱۹۵۷ء تا ۱۹۸۰ء ۲۳ سال میں مکمل ہوئی۔ ان میں ان کے بعض تفسیری تفردات بھی شامل ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی کے مفصل حیات و خدمات کے لئے ملاحظہ ہو ماہنامہ ”شمس الاسلام“ بھیرہ کا ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ”مولانا امین احسن اصلاحی نمبر“ دسمبر ۲۰۱۵ء۔

موصوف سورۃ الحج آیت ۵۲ کی تفسیر کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

”اس توضیح کے بعد اس فضول سی روایت کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی جو ہمارے مفسرین نے، اللہ ان کو معاف کرے اپنی کتابوں میں اس آیت کے شان نزول کی حیثیت سے درج کر دی ہے۔ اول تو یہ آیت جیسا کہ آپؐ نے دیکھا، کسی شان نزول کی محتاج نہیں ہے بلکہ اپنے مفہوم و مدعا میں بالکل واضح اور اپنے سابق و لاحق سے بالکل مربوط ہے۔“

پھر ستم یہ ہے کہ جو روایت یہ حضرات نقل کرتے ہیں نہ اس کا روایت کے اعتبار سے کوئی وزن ہے، نہ روایت کے پہلو سے بلکہ وہ محض زنا و قدح کا ایک القائے شیطانی ہے جو انہوں نے حضرات انبیاء کی عصمت کو مخدوح کرنے کے لئے گھڑا ہے اور حضرات مفسرین اپنی ”سادہ لوحی“ کی بیچ سے اس کو اپنی کتابوں میں نقل کرتے آ رہے ہیں۔“ (مدبر قرآن جلد ۵ ص ۲۷۱)

موصوف کی یہ بات صد فی صد درست ہے کہ شیطان نے یہ کلمات نہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر القاء کئے تھے اور نہ ہی آپ کی آواز میں آواز ملا کر اس نے خود ادا کئے تھے بلکہ اس نے براہ راست مذکورہ شریک کلمات زنا و قدح و ملاحدہ اور امام طبری کے راویوں پر القاء کئے تھے جنہیں امام طبری و امثالہ نے صحیح سمجھ کر سورۃ الحج آیت ۵۲ کی تفسیر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔

۲۲۔ پیر سید محمد کرم شاہ ازہری

(م ۱۴۱۸ھ / ۱۹۹۸ء)

پیر سید محمد کرم شاہ ازہری بھیرہ ضلع سرکودھا میں پیر محمد شاہ کے ہاں یکم جولائی ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کورنٹ ہائی سکول بھیرہ اور دارالعلوم محمدیہ غوثیہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد دورہ حدیث کے لئے صدر الافاضل سید نعیم الدین مراد آبادی کی خدمت میں حاضر ہو کر سند حاصل کی۔ دستار بندی کے موقع پر استاذ مکرم نے فرمایا: ”میں آج مطمئن ہوں کہ میرے پاس جو امانت تھی وہ میں نے ایک لائق فرد کے سپرد کی ہے۔“

بعد ازاں موصوف نے عالم اسلام کی قدیم ترین یونیورسٹی ازہر مصر سے ”اسلامک لاء“ میں ایم اے آنرز کیا اور وطن مراجعت کے بعد تعلیم و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ بیعت کا شرف خواجہ ضیاء الدین سیالوی سے حاصل ہے جبکہ خواجہ قمر الدین سیالوی نے خلافت عطا کی۔ مؤخر الذکر نے ان کے بارے میں فرمایا: ”محمد کرم شاہ میری آنکھوں کا نور ہے بلکہ پیر سیال کے روئے کا مینار ہے۔“ موصوف نے ۷ جلدوں پر مشتمل ”ضیاء النبی“ کے نام سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور پانچ جلدوں پر مشتمل ”ضیاء القرآن“ کے نام سے قرآن عزیز کی تفسیر رقم فرمائی۔ ”ضیاء القرآن“ میں مقام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور بالخصوص عصمت انبیاء کا بھرپور اور وہاں ہندو دفاع کیا گیا ہے۔

موصوف پہلے وفاقی شرعی عدالت اور بعد ازاں سپریم کورٹ کے شریعت بیج میں جج کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ بالآخر ۸۰ سال کی عمر میں ۷۔ اپریل ۱۹۹۸ء / ۱۴۱۸ھ عید الاضحیٰ کی رات وفات پا گئے۔ (روزنامہ جناح ۱۹۔ مارچ ۲۰۱۰ء)

موصوف سورۃ الحج آیت ۵۲ کی تفسیر میں ”مقام مصطفیٰ“ اور عصمت مصطفیٰ کا دفاع

امام طبری --- کون؟ افسانہ غرائیق: پیر سید محمد کرم شاہ ازہری

کرتے ہوئے پورے جلال میں نظر آتے ہیں اور انصاف کی بات یہ ہے کہ موصوف نے ضیاء القرآن اور ضیاء النبی میں قصہ غرائیق سے متعلق جملہ روایات اور ان کی تاویلات باطلہ کے تار و پود کھیر کر دفاع کا حق ادا کر دیا ہے۔

کاش! کہ روزنامہ اسلام کے سرپرستوں کو بھی اس کا ”کچھ حصہ“ حاصل ہوتا اور وہ بھی اس حوالے سے مقام مصطفیٰ اور عصمت انبیاء کے دفاع کا فریضہ ادا کرتے مگر صد افسوس انہوں نے الٹا ”عصمت انبیاء“ کے سراسر منافی مکروہ کالم کو اپنے اخبار میں شائع کر دیا۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ بعض حضرات کے احتجاج اور توجہ دلانے کے باوجود اخبار کی انتظامیہ کے کانوں پر جوں تک نہ رنگی حالانکہ انہیں تو چاند کے طلوع ہونے سے دنوں پہلے اس کی تاریخ ولادت اور وقت ولادت کا بھی علم ہو جاتا ہے مگر انہیں اپنے ہی اخبار کے ادارتی صفحہ پر بالاقساط کالموں میں ”عصمت مصطفیٰ“ مجروح اور داغ دار ہوتے ہوئے نظر نہ آئی۔ (متعلقہ کالم زیر نظر کتاب کے آغاز میں شامل کر دیئے گئے ہیں) اور حریف درحیف اکابر اور ذمہ دار ہم مسلک سیاسی علماء نے بھی ”سکوت“ اختیار کر کے مسلکی تعصب کا خوب مظاہرہ کیا۔ (جن علماء نے یہ ”کالم“ نہیں پڑھے یا انہوں نے اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا وہ بہر حال مستثنیٰ ہیں)

پیر کرم شاہ صاحب زیر بحث آیت کا قرآن وحدیث کی روح کے مطابق مفہوم و مطلب واضح کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

”آیت کا یہ مفہوم اتنا واضح اور دوسری آیات کے عین مطابق ہے کہ کسی قسم کا تذبذب نہیں رہتا لیکن بعض کتابوں میں ایک روایت کے درج ہو جانے سے اس آیت کا مطلب کچھ سے کچھ کر دیا گیا جس سے صرف اپنوں کے دلوں میں اضطراب کی اہر پیدا نہیں ہوئی بلکہ دشمنان اسلام کو قرآن، صاحب قرآن اور دین اسلام کی صداقت پر حملہ کرنے کے لئے ایک مہلک ہتھیار مل گیا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ آیت کی اس واضح اور صاف تشریح پر ہی یہ فقیر اکتفاء کرتا اور اس روایت کی طرف التفات کئے بغیر آگے بڑھ جاتا لیکن کیونکہ یہ روایت ہماری کتابوں میں راہ پا گئی ہے اور دشمنان اسلام نے اس سے فائدہ اٹھا کر اسلام کے خلاف

امام طبری --- کون؟ افسانہ غرائیق: پیر سید محمد کرم شاہ ازہری

طوفان برپا کر رکھا ہے۔ اب اس سے تعرض نہ کرنا بھی ادائے فرض میں کوتاہی کے مترادف ہے۔ اس لئے بادل خواستہ وہ روایت نقل کر رہا ہوں۔ اس کے بعد علمائے محققین نے جس طرح اس کے پرچھے اڑائے ہیں ان کا بالاجمال ذکر کروں گا تا کہ کسی طالب حق کے لئے تردد و تذبذب کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ واللہ المستعان و علیہ التکلیل

”ایک معمولی سمجھ بوجھ کا انسان جسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کا کچھ بھی علم ہے وہ تو اس روایت کو سنتے ہی کہہ دے گا کہ یہ جھوٹ کا پلندہ ہے اور دشمنان اسلام کی سازش ہے۔۔۔۔۔“

نیز یہ امر بھی غور طلب ہے کہ سورۃ الحج کی آیت ۵۲ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی اور سورۃ نجم کا نزول اور یہ قصہ جو گھڑا گیا ہے اس کا وقوع ہجرت سے پہلے کئی سال مکہ مکرمہ میں ہوا تو عجیب بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کرنے سے جو حزن و ملال ہوا اسے دور کرنے کے لئے اتنے عرصہ دراز تک کوئی آیت نازل نہ ہوئی اور کئی سالوں کے بعد اللہ تعالیٰ کو خیال آیا کہ اپنے رسول کو مطمئن کرے اور یہ آیت نازل کی۔ کیا ایسی بے تکلی بات کوئی صاحب عقل سلیم تسلیم کر سکتا ہے؟

اس آیت میں کوئی ایسی چیز مذکور نہیں جو رحمت عالمیاں صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جاسکے بلکہ اس میں صرف پہلے رسولوں اور نبیوں کا ذکر ہے اس لئے اس آیت سے یہ اخذ کرنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی فعل سرزد ہوا اور اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی سرے سے ہی غلط ہے۔۔۔۔۔ یہ بات تو ایک معمولی مسلمان سے بھی سرزد نہیں ہو سکتی، چہ جائیکہ اس کو اس ذات پاک کی طرف منسوب کیا جائے جو ہر قسم کی غلطی اور خطا سے معصوم ہے، یہ روایت تو زندیقوں کی گھڑی ہوئی ہے، اس کو ردی چیز کی طرح پھینک دینا ضروری ہے، یہ روایت جھوٹی ہے، باطل ہے اور گھڑی ہوئی ہے، اس روایت کی کوئی تاویل درست نہیں، اس کا کوئی صحیح محمل اور مصداق تلاش نہیں کیا جاسکتا، یہ روایت اپنی تمام تاویلات، احتمالات اور اختلاف الفاظ کے ساتھ مسترد کر دینے کے قابل ہے۔

امام طبری --- کون؟

افسانہ غرائیق: پیر سید محمد کرم شاہ ازہری

(اول تو) یہ روایت ضعیف، موضوع اور زنا و قدح کی گھڑی ہوئی ہے اس لیے اس کی تاویل کرنے کی بھی قطعاً کوئی ضرورت نہیں اور اگر (بفرض محال) اس روایت کی کوئی سند صحیح بھی ثابت ہو جائے تو بھی وہ ضعیف اور ناقابل اعتبار ہوگی کیونکہ آیات قرآنی کے صریح مخالف ہے اور اب تو یہ آیات قرآنی کے بھی خلاف ہے اور اس کی کوئی سند بھی نہیں ہے۔ ان حالات میں اہل نظر کے لئے یہ کب قابل التفات ہو سکتی ہے، امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ تبلیغ کلام الہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہرگز غلطی نہیں ہو سکتی نہ قصداً، نہ عمداً، نہ ہوا اور نہ غلطاً۔ اس میں نبی ہر طرح معصوم ہیں۔

قاضی ابوبکر ابن العربی اللاندی جب اس آیت کی تفسیر کرنے لگے ہیں تو اس روایت کا ذکر کر کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غصہ سے ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے اور دل بے چین و بے قرار ہو گیا ہے اپنی سابقہ روش کے بالکل برعکس اس روایت کو باطل کرنے کے لئے ایک مستقل فصل لکھی ہے جس کا عنوان ہے: ”تنبیہ الغیبی علی مقدار النبی“ اور لکھتے ہیں:

”وَنَرَّ جَوْبَهُ عِنْدَ اللَّهِ الْجَزَاءُ الْأَوْفَى فِي مَقَامِ الزُّلْفَى“

کہ اس فصل کے لکھنے سے مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقام قرب میں مجھے عظیم جزاء دے گا۔ اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ ضرور اس فصل کا مطالعہ کریں۔

یہ ان باتوں میں سے ایک بات ہے جو شیطان اپنے زندیق پیروکاروں کے دلوں میں ڈالتا ہے تاکہ لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کریں جناب رسالت مآب اس قسم کی روایتوں سے مبرا و منزہ ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ان روایات کو کثرت اسانید کی وجہ سے قبول کیا ہے جس میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے۔ ان روایات کی اسانید کے متعلق وہ بھی یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ”ان روایات کی تمام اسانید ہر چند کہ ضعیف، انقطاع اور ارسال سے خالی نہیں لیکن چونکہ یہ روایت متعدد اسانید سے منقول ہے اس لئے اس کی کثرت اسانید سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی اصل ہے۔“

امام طبری --- کون؟

افسانہ غرائیق: پیر سید محمد کرم شاہ ازہری

علامہ ابن حجر کا مقام علم حدیث میں بہت بلند ہے ہم ان کی گرد راہ کو بھی نہیں پہنچ سکتے لیکن یہاں یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ ایک روایت جس کو تسلیم کرنا عقلاً محال ہے اور جس کی تمام اسانید میں خود بقول ان کے ضعف، انقطاع اور ارسال جیسی علل موجود ہیں صرف کثرت اسانید سے اس کی اصل کیسے ثابت ہو جاتی ہے؟ کیا کثرت اسانید اور ان سب کے مرسل، منقطع یا ضعیف ہونے کی وجہ سے یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی کہ جن لوگوں نے اس قصہ کو تراشا ہے، انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اس کے لئے متعدد اسانید بھی وضع کر دی ہیں تاکہ ان کی کثرت کو دیکھ کر لوگ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اس کی کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہوگی؟

قصہ غرائیق کو بیان کرنے والی روایات کی صرف اسناد ہی قابل اعتماد نہیں بلکہ ان روایات کے متن کی بھی یہی حالت ہے۔ ان روایات کے متن میں اتنا بے خطر اب ہے کہ اس اضطراب کی موجودگی میں، ان روایات کو کوئی وقعت نہیں دی جاسکتی۔

یہ قصہ نقل بھی ناقابل اعتبار بلکہ دو ٹوک الفاظ میں مسترد کر دینے کے قابل ہے اور عقلاً بھی اس کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اول تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت اور الہامی ہدایت کی حفاظت کی خدائی انتظامات کی موجودگی میں اس قسم کے الفاظ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پاک سے ادا ہونا ممکن ہی نہیں۔ معمولی عربی جاننے والا شخص بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ الفاظ اسلام کے عقیدہ و حید سے متصادم ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ مشرکین نے تو یہ کلمات سنتے ہی فوراً سمجھ لیا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (العیاذ باللہ) اسلام سے منہ موڑ کر اپنے آبائی دین کی طرف رجوع کر لیا ہے۔ لیکن نہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی بڑی بات کو محسوس کیا ہو اور نہ ہی صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے اتنی بڑی بات کی نشاندہی کی ہو اور اس وقت تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنے بڑے سانچے کا علم ہی نہ ہوا ہو جب تک حضرت جبریلؑ امین نے آکر آپ کو متنبہ نہ کیا ہو؟ کیا اس واقعے کے وقت سب ایماندار سو رہے تھے یا ان سب پر عالم بے ہوشی طاری تھا؟ خدا کا کلام تو مخلوق کے کلام سے ممتاز ہوتا

امام طبری --- کون؟

افسانہ غرائیق: پیر سید محمد کرم شاہ ازہری

ہے۔ ولید بن مغیرہ وغیرہ سرداران عرب کفر کے باوجود قرآن حکیم کو دوسرے کلاموں سے ممتاز کر لیتے تھے کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) شیطان کے کلام کو خدا کے کلام سے ممتاز نہ کر سکے؟

جن روایات میں یہ افسانہ بیان کیا گیا ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف کفار کی طرف مائل ہونے کا الزام نہیں لگا رہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ رہی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر قرآن کو قرآن کہا اور بتوں کی تعریف کی حالانکہ ثقیف اور قریش نے ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کش کی تھی کہ آپ صرف ان بتوں کی طرف رخ کریں تو وہ مسلمان ہو جائیں گے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ کیا اس تضاد کو عقل سلیم تسلیم کر سکتی ہے؟

اگر یہ واقعہ پیش آیا ہوتا تو جہاں کفار خوش ہوئے تھے وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جتنے مسلمان جمع تھے وہ اسلام سے کنارہ کش ہو جاتے۔ انہیں نہ ان کلمات کی یہ وضاحت مطمئن کر سکتی کہ یہ شیطان کی کارروائی تھی اور شیطان پہلے نبیوں کے ساتھ بھی یہی کرتا رہا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی اور تاویل انہیں مطمئن کر سکتی۔ وہ سوچتے کہ جب الہامی ہدایت ہی شیطانی دغل اندازی سے محفوظ نہیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی وحی ربانی اور القائے شیطانی میں تمیز نہیں کر سکتے تو پھر حق کے حق ہونے پر کس طرح اکتفا کر لیا جائے۔

وہ لوگ اسلام کی خاطر قربانیاں دے رہے تھے وہ قوت یقین کے بغیر ممکن ہی نہ تھیں۔ جب اس قسم کے واقعے سے یقین متزلزل ہو جاتا تو نفع و ہلاک اسلام کی خاطر قربانیاں دے سکتے اور نہ اسلام پر قائم رہنا ان کے لئے ممکن ہوتا۔ اس واقعے کی بناء پر کسی ایک مسلمان کی طرف سے کسی قسم کے احتجاج کا ظاہر نہ ہونا، اس حقیقت کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ یہ واقعہ بے اصل اور اسے اسلام دشمن قوتوں نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے گھڑا ہے۔

مزید برآں یہ حدیث متواتر ہے کہ شیطان خواب میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں کسی کو دکھائی نہیں دے سکتا تا کہ مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں دھوکہ

امام طبری --- کون؟

افسانہ غرائیق: پیر سید محمد کرم شاہ ازہری

دے سکتا تو اس کی کیا مجال کہ سرچشمہ ہدایت کو وہ گمراہ کر سکے۔

علامہ محمد صادق عرجون نے اپنی کتاب ”محمد رسول اللہ“ کی دوسری جلد میں اس واقعے کی ایک ایک روایت کو علیحدہ بیان کر کے اس کو عقلاً اور نظراً ناقابل اعتبار ثابت کیا ہے۔ انہوں نے اس قصے کے مختلف راویوں کے متعلق یہ ثابت کیا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

جن علمائے ملت نے اسانید کی کمزوری کے باوجود اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ کثرت طرق اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ اس واقعہ کی کوئی اصل ہے، علامہ (عرجون) ان پر خوب برسرے ہیں بلکہ وہ علماء جنہوں نے اس کی صحت کا انکار کیا لیکن ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ اگر بالفرض اس واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کی یہ تاویل ممکن ہے، علامہ نے ان کے خلاف بھی خوب لکھا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے انہوں نے اپنے اس موقف کو بیان کرنے کے لئے کیا انداز اختیار کیا ہے؟ فرماتے ہیں:

یہ ایک گھڑا ہوا افسانہ ہے جو ہر لحاظ سے باطل ہے۔ یہ اول و آخر ایک خمیشت جھوٹ ہے۔ یہ ایک کافرانہ جھوٹ ہے جسے گھڑنے والا یا تو کوئی احمق اور جاہل جوان ہے یا کوئی حاسد اور بے ایمان بوڑھا، جو اسلام کا دشمن ہے یا کوئی فسادی منافق اور فاجر ہے اور یہ افسانہ اس کے دل میں شیطان مردود نے ڈالا ہے۔

پیر کرم شاہ صاحب نے اس بحث کے آخری سات صفحات میں قصہ غرائیق کے حوالے سے مستشرقین کے اعتراضات کا بھی مسکت جواب دیا ہے۔ فجزاء اللہ أحسن الجزاء عنا وعن سائر المسلمين۔

ملاحظہ ہو: تفسیر ضیاء القرآن جلد سوم ص ۲۲۲ تا ۲۲۶، ضیاء النبی جلد دوم ص ۳۴۷ تا ۳۵۵، ضیاء النبی جلد ششم از صفحہ نمبر ۶۰۵ تا ۶۳۳

۲۵۔ علامہ ناصر الدین البانی (م ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء)

اسم گرامی محمد ناصر الدین بن نوح نجاتی ہے۔ یہ کل چھ بھائی تھے۔ والد محترم نے تمام بھائیوں کا نام ”محمد“ رکھا تھا اور پھر فرق کرنے کے لئے ایک نام اور ساتھ لگا دیا تاکہ تمام بھائیوں میں امتیاز ہو سکے۔ موصوف کی ولادت ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۴ء میں البانیہ کے دار الحکومت ”اشتودرہ“ میں ہوئی۔ ان کے والد محترم نوح نجاتی البانی اپنے وقت کے بہت بڑے حنفی فقیہ تھے، حکمرانوں کے مغربی تہذیب و ثقافت کی طرف میلان کے باعث اس خاندان نے دمشق شام کی طرف ہجرت کر لی۔

موصوف علمی طبقہ میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں وہ بجا طور پر ”محدث العصر، حافظ الحدیث، عظیم محقق اور عظیم نقاد“ ہیں۔ تصنیفات، مؤلفات اور تعلیمات کی تعداد دو سو سے زائد ہے۔ شیخ البانی نے ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ/ ۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اردن کے شہر عمان میں عصر اور مغرب کے درمیان وفات پائی اور وصیت کے مطابق مقامی قبرستان میں نماز عشاء کے فوراً بعد دفن کر دیئے گئے۔ (بحوالہ فتاویٰ البانیہ۔ ملخصاً ص ۲۴ تا ۳۵)

شیخ البانی قصہ غرائیق کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

ایسی خبر کو قبول کرنے کے لئے صحیح نقلی دلیل کا پایا جانا ضروری ہے اور یہ کوئی بعید بات نہیں کہ یہ جھوٹی خبر بعد میں گھڑی گئی ہے بلکہ یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس لئے کہ کسی بھی صحابی سے معتبر سند کے ذریعے یہ جھوٹی خبر مروی نہیں ہے بلکہ اس کی تمام سندیں مرسل ہیں یعنی سلسلہ سند سے صحابی کا نام مفقود ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ عہد نبوت و رسالت پانے والے کسی صحابی نے اسے بیان کیا ہے اور میں نے اس قصے کے باطل ہونے کو پوری تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ”نَصَبُ الْمَجَانِبِ لِتَنْفِيهِ الْغَرَائِبِ“ میں بیان کر دیا ہے۔ (تعلیق شیخ البانی علی فقہ السنہ، محمد غزالی ص ۱۱۵-۱۱۸۔ بحوالہ ”اصدق الامین“ ص ۲۱۲۔ مؤلفہ ڈاکٹر محمد لقمان السلفی۔)

شیخ البانی نے ۲ صفحات پر مشتمل اپنی مذکورہ کتاب میں ”قصہ غرائیق“ کا ہر لحاظ سے رد کیا ہے اور ان لوگوں کا بھی تعاقب کیا ہے جنہوں نے تاویل کر کے اسے ثابت کرنا چاہا ہے۔

۲۶۔ علامہ غلام رسول سعیدی (۱۴۳۷ھ/ ۲۰۱۶ء)

علامہ سید غلام رسول سعیدی بریلوی مسلک کے ایک متبحر، محقق اور متقی عالم ہیں۔ موصوف ۱۹۳۷ء میں دہلی میں معروف تاجر سید محمد منیر کے ہاں پیدا ہوئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سعیدی صاحب کا ابتدائی نام احمد منیر تھا۔ بعد میں شمس الزمان بھی رکھا گیا اور پھر ۲۱ سال کی عمر میں خود اپنا نام تبدیل کر کے ”غلام رسول“ رکھ لیا۔ علامہ سید احمد سعید شاہ کافلی (م ۱۴۰۶ھ) سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے ساتھ بیعت کے تعلق کی بناء پر ”سعیدی“ کا لاحقہ بھی لگ گیا۔

موصوف کی ساری زندگی قرآن و حدیث کی تعلیم و تدریس اور تالیف و تصنیف میں بسر ہوئی۔ ایک کامیاب زندگی گزارنے کے بعد بالآخر شب جمعہ ۲۵۔ ربیع الثانی (اگرچہ جمعرات کو ۲۴ تاریخ تھی مگر غروب آفتاب کے بعد قمری تاریخ تبدیل ہو جاتی ہے) ۱۴۳۷ھ/ ۴ فروری ۲۰۱۶ء کو رحلت فرما گئے۔ موصوف نے انفرادی حیثیت میں قرآن و حدیث کی جو خدمت کی ہے مندرجہ ذیل تصانیف سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

۱۔ تبیان القرآن ۱۳ جلدیں

۲۔ تبیان الفرقان ۶ جلدیں

۳۔ نعمۃ الباری شرح صحیح بخاری ۱۶ جلدیں

۴۔ شرح صحیح مسلم ۸ جلدیں

علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے مفسرین کے اقوال کی روشنی میں سورۃ الحج آیت ۵۲ کی تفسیر میں قصہ غرائیق کی روایت و روایتاں دجیاں نکھیر کر عقیدہ ”عصمت مصطفیٰ“ کا خوب تحفظ اور دفاع کیا ہے۔

امام طبری --- کون؟ افسانہ غرائیق: علامہ غلام رسول سعیدی

موصوف ”غرائیق“ کی روایت نقل کر کے لکھتے ہیں:

یہ روایت اپنی تمام اسانید کے ساتھ سند باطل اور عقلاً مردود ہے۔ کیونکہ نہ یہ ممکن ہے کہ شیطان آپ کی زبان سے کلام کرے اور نہ یہ کہ اپنی آواز کو آپ کی آواز کے مشابہ کر سکے اور سننے والے اس کی آواز کو آپ کی آواز قرار دیں۔ اگر بالفرض یہ ممکن ہو تو تمام شریعت سے اعتما داٹھ جائے گا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ہم تک صحابہ کی روایت سے جو احکام پہنچے ہیں وہ آپ کا فرمان نہ ہوں بلکہ شیطان کا کہا ہوا ہو۔

نیز حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ شیطان خواب میں آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مثل نہیں بن سکتا تو جب شیطان آپ کی صورت کے مماثل نہیں ہو سکتا تو آواز کے مماثل کیسے ہو سکتا ہے، اور جب وہ سونے والے پر اشتباہ نہیں ڈال سکتا حالانکہ وہ اس حال میں مکلف نہیں ہوتا تو بیدار پر کیسے اشتباہ ڈال سکتا ہے جبکہ وہ مکلف ہوتا ہے۔۔۔۔۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس روایت کی یہ تاویل کی ہے کہ شیطان نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مشابہ آواز میں یہ کلمات کہے اور سننے والوں نے یہ سمجھا کہ آپ نے یہ کلمات فرمائے ہیں۔ اس جواب کو بعض علماء نے اپنی تصانیف میں نقل کیا ہے۔ لیکن یہ جواب اس لئے صحیح نہیں ہے کہ جس طرح شیطان آپ کی مثل نہیں بن سکتا اسی طرح آپ کی آواز کی مثل بھی نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ مماثلت کی نفی یا اس وجہ سے ہے کہ ہدایت و گمراہی میں اشتباہ نہ ہو یا تعظیم کی وجہ سے ہے اور اگر شیطان آپ کی آواز کی مثل پر قادر ہو تو یہ تعظیم کے خلاف ہے اور اگر شیطان آپ کی آواز کی نقل اتار سکے اور لوگ شیطان کی آواز کو آپ کی آواز سمجھ لیں تو ہدایت، گمراہی کے ساتھ مشتبہ ہو جائے گی۔

بعض علماء نے اس پر اس سے استدلال کیا ہے کہ لوگ شیطان کی آواز سنتے تھے کیونکہ جنگ بدر میں شیطان نے کفار سے کہا تھا کہ:

”لا غالب لکم الیوم“ اور جنگ احد میں شیطان نے آواز دی تھی کہ ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے“ لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں شیطان کی آواز، حضور صلی

امام طبری --- کون؟ افسانہ غرائیق: علامہ غلام رسول سعیدی

اللہ علیہ وسلم کی آواز کے مشابہ تھی نہ کسی نے اس کی آواز کو آپ کی آواز کے مشابہ سمجھا تھا پھر اس سے اس پر کیسے استدلال ہو سکتا ہے کہ شیطان آپ کی آواز کی مشابہت کر سکتا ہے؟ میرے نزدیک چونکہ یہ روایت بارگاہ رسالت کی عظمتوں کے منافی تھی، اس لئے میں نے اس کے رد اور ابطال میں کافی تفصیل اور تحقیق سے گفتگو کی ہے۔ میں نے دیکھا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی اتباع میں بعض جید علماء نے بھی اس موضوع روایت کو اس باطل تاویل کے سہارے اختیار کر لیا ہے جس کو ابھی ہم نے حافظ ابن حجر عسقلانی کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ تاہم یہ علماء صحیح العقیدہ ہیں اور ان کی نیت فاسد نہیں ہے صرف روایت پرستی کے روگ کی وجہ سے انہوں نے اس روایت کو اس باطل تاویل کے ساتھ اپنی تصانیف میں درج کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور مصنف کے دل میں محبت رسول کو اور نیا وہ کرے۔

اے اللہ! تو گواہ ہے کہ میں شخصیت پرست نہیں ہوں، اللہ اور اس کے رسول کی حرمت سے بڑھ کر مجھے کسی کی حرمت عزیز نہیں ہے۔ میں نے جو یہ سعی کی ہے وہ صرف اور صرف مقام رسول کے تحفظ کی خاطر کی ہے۔ اے اللہ! اس کوشش کو قبول فرما اور اس کو مصنف کے لئے توشیح آخرت اور مغفرت اور رحمت کا ذریعہ بنا دے۔

(تبیان القرآن جلد ہفتم ص ۷۷۷-۷۸۵)

۲۷۔ مولانا سلیم اللہ خان صدر وفاق العربیہ پاکستان

جامعہ فاروقیہ کراچی کے مہتمم و شیخ الحدیث، صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان اور صاحب کشف الباری مولانا سلیم اللہ خان صاحب برصغیر پاک و ہند کے علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔

آپ کے اجداد ”تیراہ“ کے قریب ”چورا“ خیبر ایجنسی سے ہندوستان منتقل ہوئے تھے۔ آپ ۲۵ دسمبر ۱۹۲۶ء کو ہندوستان کے ضلع مظفر نگر کے مشہور قصبہ ”حسن پور لوہاری“ کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق آفریدی پٹھانوں کے ایک خاندان ”ملک دین خیل“ سے ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ازہر ہند دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی۔ مولانا مسیح اللہ خان صاحب کے مدرسہ میں ۸ سال تک تدریسی و تنظیمی امور سرانجام دینے کے بعد ٹنڈوالہ یار میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے قائم کردہ مدرسہ میں تین سال تک تدریس کی، بعد ازاں دارالعلوم کراچی میں دس سال تک تدریس میں مشغول رہے پھر ایک سال تک حضرت بنوریؒ کے اصرار پر جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں تدریسی فرائض سرانجام دیئے۔ ۱۹۸۰ء میں وفاق المدارس کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۹ء سے تاحال (۲۰۱۶ء) یعنی ۲۸ سال سے مسلسل منصب صدارت پر فائز چلے آ رہے ہیں۔

مولانا سلیم اللہ خان صاحب ”قصہ غرائیق“ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

اکثر حضرات نے اس قصہ کو بالکل غلط اور موضوع قرار دیا ہے۔ علامہ بیہقی، حافظ ابن کثیر، قاضی عیاض، ابوبکر ابن العربی، ابن خزیمہ، امام رازی، قرطبی، علامہ عینی، علامہ شوکانی اور علامہ آلوسی نے اس کی تردید کی ہے۔ نووی، کرمائی، ذہبی اور ابومنصور ماتریدی نے بھی تردید کی ہے۔

محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے فرمایا: ”ہذا من وضع الزنادقة“ اور اس کے رد میں مستقل ایک کتاب لکھی۔ امام قرطبی فرماتے ہیں: ”وولیس منها شیء بصرح“ علامہ خازن فرماتے ہیں: ”انہ لم

یروھا أحد من أهل الصحۃ ولا أسندھا ثقة بسند صحیح لوسلیم متصل“، امام ابوسعود رقم طراز ہیں: ”وہو المردود عند المحققین“، امام رازی فرماتے ہیں: ”ہذہ القصۃ موضوعۃ“، ابن العربی فرماتے ہیں: ”ذکر الطبری فی ذلک روایات کثیرۃ باطلۃ لا أصل لھا“، قاضی عیاض نے شفاء میں فرمایا: ”یکفیک فی توہین ہذا الحدیث انہ لم یخرجه أحد من أهل الصحۃ ولا رواہ ثقة بسند صحیح سلیم متصل“، اور علامہ قنوی فرماتے ہیں: ”وہو مردود عند المحققین..... بل یجب أن یکون مردودا عند جمیع المسلمین“۔

لیکن حافظ ابن حجر، علامہ زحشری اور حافظ ابن جریر اس قصہ کو درست مانتے ہیں۔ حافظ ابن حجر اس قصہ کے مختلف طرق ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وکلھا سوی طریق سعید بن جبیر اما ضعیف ولا منقطع لکن کثرة الطرق تدل علی ان للقصۃ أصلا، مع أن لھا طریقین آخرین مرسلین، رجال ھما علی شرط الصحیحین، أحدهما ما أخرجه الطبری من طریق یونس بن یزید عن ابن شہاب... والثانی أيضا ما أخرجه من طریق المعتمر بن سلیمان وحماد بن سلمۃ عن داؤد بن أبی ہند عن أبی العالیۃ“۔

آگے جولوگ اس واقعہ کو درست قرار نہیں مانتے ان پر رد کرتے ہوئے (ابن حجر) لکھتے ہیں: ”وجمیع ذلک لا یتسمی علی القواعد، فان الطرق اذا کثرت و تباينت مخرجھا دل ذلک علی أن لھا أصلا، وقد ذكرت أن ثلاثة أسانید منها علی شرط الصحیح، وہی مراسیل یحتج بمثلھا من یحتج بالمرسل، و کذا من لا یحتج بہ لا اعتضاد بعضها ببعض“۔ (فتح الباری جلد ۸ ص ۴۳۹)

حافظ ابن حجر کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے تمام طرق کے علاوہ تین طرق اس قصہ کے درست ہیں اور مرسل ہیں۔ دو طریق ان میں سے ابن جریر نے ذکر کئے ہیں اور ایک کی بڑا رے تخریج کی ہے۔ ان تمام طرق کو پیش نظر رکھ کر انصاف کی بات یہی ہے کہ اس قصہ کی کچھ اصل ضرور ہے۔ روایات کو ضعیف کہہ کر اس کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

اور جب قصہ کو روایات کی بنیاد پر درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس پر اشکال ہوگا کہ

امام طبری۔۔۔ کون؟ افسانہ غرائیق: مولانا سلیم اللہ خان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اطہر پر شیطان کو کیوں کر قدرت حاصل ہوئی کہ اس نے آپ کی زبان سے یہ شریک الفاظ القاء کرائے، یہ تو تمام نصوص کے معارض ہے بلکہ اگر اس کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر تو پورا دین مشکوک ہو جائے گا۔ اس لئے جن حضرات نے اس قصہ کو روایت کی بناء پر درست مانا ہے، انہوں نے اس کی مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ حافظ ابن حجر نے سات توجیہات نقل کی ہیں:

۱۔ اس وقت آپ کو اذیت آگئی تھی اور اس بے خبری کی حالت میں یہ الفاظ نکلے، لیکن یہ توجیہ درست نہیں کیونکہ شیطان کو نیند میں بھی آپ پر قدرت حاصل نہیں ہے۔

۲۔ آپ کو شیطان نے مجبور کیا اور غیر اختیاری حالت میں یہ الفاظ آپ کی زبان سے نکلے۔ لیکن یہ توجیہ بھی درست نہیں، شیطان میں آپ کو مجبور کرنے کی قوت نہیں ہے خود اس کا کہنا ہے: ”مَّا كَانَ لِيْ عَلَيْنَا مِنْ سُلْطَانٍ“ شیطان کو اگر اس طرح کی قوت حاصل ہو تو پھر کوئی بھی اللہ جل شانہ کی اطاعت نہیں کر سکے گا۔

۳۔ بعض نے کہا مشرکین اپنے معبودوں کا جب ذکر کرتے تو مذکورہ الفاظ کہتے اور آپ نے چونکہ یہ الفاظ ان سے کئی بار سنے تھے اس لئے آپ کی زبان پر بھی ان کے معبودوں کے ذکر کے وقت مذکورہ الفاظ ہو اُجاری ہو گئے۔

لیکن قاضی عیاض نے اس توجیہ کو بھی رد کیا ہے کہ آپ سے اس طرح کا سہو ممکن نہیں۔ ۴۔ بعضوں نے کہا کہ آپ نے مذکورہ الفاظ تو بیٹھا کہے تھے۔

قاضی عیاض نے کہا کہ اس قسم کے الفاظ اس وقت تو بیٹھا کہے جاسکتے ہیں جب آدمی کی مراد پر کوئی قرینہ پایا جاتا ہو، باقلانی کا میلان اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔

۵۔ بعض کہتے ہیں کہ مشرکین میں سے کسی نے یہ الفاظ کہے تھے، ابن عاشور وغیرہ نے کہنے والے کا نام ابن الزبیری لکھا ہے۔ آیت میں نسبت شیطان کی طرف اس لئے کی گئی ہے کہ یہ الفاظ اس نے شیطان کے القاء سے کہے تھے، یا شیطان سے شیطان الہام سے کہے۔

۶۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ”غرائیق“ سے فرشتے مراد ہیں۔ مشرکین کے معبود اصرام

امام طبری۔۔۔ کون؟ افسانہ غرائیق: مولانا سلیم اللہ خان

مراد نہیں ہیں لیکن مشرکین نے جب اس کو اپنے اصرام پر محمول کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں جملوں کو منسوخ قرار دیا اور اپنی آیات کو مستحکم اور پختہ کر دیا۔

۷۔ ایک اور توجیہ یہ کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”وَمَنْ لَّا يُؤْمَرْ بِالْعَمَلِ“ پر وقف کیا تو شیطان نے اس درمیان مذکورہ الفاظ کہے، سمجھایا گیا کہ آپ نے کہے ہیں۔

قاضی عیاض، ابن العربی نے اس توجیہ کو پسندیدہ قرار دیا ہے، حافظ ابن حجر نے بھی اسی کو راجح قرار دیا (فتح الباری جلد ۸، ص ۴۴۰)

یہ توجیہات قاضی عیاض نے کی ہیں۔ قاضی عیاض اس واقعہ کو درست نہیں مانتے ہیں لیکن یہ توجیہات انہوں نے روایت کو ”صلى سميل الغرض والتقدير“ ثابت ماننے کے بعد نقل کی ہیں۔ لیکن جس توجیہ کو ابن حجر نے راجح قرار دیا وہ ان روایات کا جواب نہیں بن سکتی ہیں جس میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ مذکورہ الفاظ شیطان نے آپ کی زبان مبارک سے ادا کرائے، حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ قصہ موضوع، من گھڑت اور غلط ہے اور اس کے غلط ہونے پر کئی شہادتیں ہیں۔ (کشف الباری۔ کتاب التفسیر۔ سورۃ الحج آیت ۵۲۔ ص ۴۳۹ تا ۴۵۲)

زیر نظر کتاب کے مؤلف کے نزدیک مذکورہ ساتوں توجیہات فاسد اور باطل ہیں جو نص کے خلاف ہونے کی بناء پر مردود ہیں اگر بغرض محال ان میں سے جسے بھی راجح قرار دیا جائے تو امام طبری کی منقولہ روایات پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ ان میں واضح طور پر یہ بات پائی جاتی ہے کہ شریک کلمات خود شیطان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر القاء کئے تھے، آپ نے خود ان کلمات کو صحابہ مشرکین کی عام محفل میں اپنی زبان سے ادا کیا تھا۔ بعد میں حضرت جبریلؑ کے سامنے بھی یہ کلمات دہرائے، جبریلؑ نے بتایا کہ میں نے تو آپ کو یہ کلمات نہیں بتائے تھے آپ نے کس طرح ان کی تلاوت کر دی۔ آپ نے تو اللہ پر افتراء کر دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جبریلؑ کے سامنے اقرار کیا کہ میں نے یہ کلمات پڑھ کر اللہ پر افتراء کیا ہے۔ اللہ نے جو بات نہیں کہی تھی میں نے وہ کہہ دی پھر سخت مغموم ہوئے اور بہت خوف محسوس کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے تسلی دیتے ہوئے سورۃ الحج کی آیت ۵۲ نازل فرمائی۔

افسانہ غرائیق، اہل تشیع کی نگاہ میں

شیعہ مفسر شیخ محسن علی نجفی

شیخ محسن علی نجفی سورۃ الحج کی آیت ۵۲ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ:

غیر امامیہ کے مصادر میں روایت کی گئی ہے:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں بات آگئی کہ کاش قرآن میں کوئی ایسی آیت نازل ہو جائے کہ جس سے کفار قریش کی نفرت دور ہو۔

ایک دن آپ قریش کی ایک بڑی مجلس میں تشریف فرما تھے، آپ پر سورۃ نجم نازل ہوا: ”اَفَرَأَءِیْکُمْ الْاَلٰتَ وَالْعُزٰی وَ مَنَآءَ النَّالِیَةِ الْاٰخِرٰی“ اس جگہ آپ کی زبان سے یہ عبارت جاری ہوئی ”تِلْکَ الْغَرَائِیْقُ الْعَلٰی وَ اِنْ شَفَاعَتِهِنَّ لَتَرْجٰی“ یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں۔ ان کی شفاعت کی ضرور امید کی جاتی ہے۔

یہ حدیث ”غرائیق“ کے نام سے مشہور ہے کہ حافظ حدیث ابن حجر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ”مگر طریقوں کی کثرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کی کوئی اصل ضرور ہے۔ اس کے ساتھ ایک طریقہ سے سند صحیح بھی نقل ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو شرح صحیح البخاری، ابوبکر حصص، زحشری اور ابن جریر جیسی قدآور علمی شخصیات اس روایت کو صحیح تسلیم کرتی ہیں۔ چنانچہ رشدی نے اپنی شیطانی کتاب میں اسی قسم کی روایات کو اساس بنا کر رسول اسلام کی شان میں گستاخی کی ہے۔

جبکہ سورۃ نجم بعثت کے ابتدائی سالوں میں نازل ہوا ہے اور سورۃ حج کے مدنی ہونے کی صورت میں تو واضح ہے کہ ہجرت کے بعد نازل ہوا اور اگر کئی فرض کر لیا جائے تو واقعہ معراج کے بعد نازل ہوا ہے کیونکہ اس روایت میں سورۃ بنی اسرائیل کی ایک آیت کے

نزول کا بھی ذکر ہے۔

نیز سورۃ نجم کی پوری عبارت بتوں کی مذمت میں ہے۔ درمیان میں ان ہی بتوں کے حق میں کوئی جملہ آجائے تو اس تضاد بیانی سے شرکین کیسے متاثر ہو سکتے ہیں؟ بہر حال اس روایت کے باطل ہونے پر دیگر بہت سے شواہد موجود ہیں۔ اسی لئے امامیہ کے ساتھ بہت سے غیر امامیہ محدثین نے اس روایت کو عصمت رسول کے منافی قرار دے کر رد کیا ہے۔

اس بے اساس روایت کو مستشرقین نے اپنی اسلام دشمنی کے اظہار کے لئے اساس قرار دی اور اسے اچھا لےنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ حالانکہ یہ روایت تاریخ نزول قرآن، متن اور سند کے اعتبار سے قابل توجہ ہی نہیں ہے۔ (القرآن الکریم ترجمہ و حواشی فاضل جلیل چیمہ الاسلام والمسلمین شیخ محسن علی نجفی ص ۳۳۲-۳۳۳۔ مطبوعہ امامیہ پبلی کیشنز پاکستان - لاہور)

افسانہ غرائیق، قادیانیوں کی نگاہ میں محمد علی لاہوری قادیانی (م ۱۹۵۱ء)

مرزائی مفسر محمد علی لاہوری دسمبر ۱۸۷۴ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں ریاضی کے لیکچرار رہے۔ ۱۸۹۷ء میں قادیان حاضر ہو کر بزم خود مرزا غلام احمد قادیانی سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔ ۱۳- اکتوبر ۱۹۵۱ء کو وفات پائی۔ موصوف سورۃ الحج آیت ۵۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت کی تفسیر میں بہت سے مفسرین نے ایک جھوٹا قصہ (غرائیق) لکھ دیا ہے جس کی کوئی صحیح سند نہیں۔ اس قصہ کو سورۃ حج کی اس آیت سے ملانا واقعات تاریخی کی پوری لاعلمی کا ثبوت دیتا ہے۔ سورۃ النجم ابتدائی زمانہ کی سورت ہے اور ہجرت حبشہ کے ابتدائی ایام کی ہے یعنی پانچویں سال بعثت کی اور سورۃ حج اس قدر پچھلے زمانہ کی ہے کہ بہت سے لوگوں نے اسے مدنی قرار دیا ہے اور اصل یہ ہے کہ یہ مکہ کے آخری ایام کی ہے جس پر کافی اندرونی شہادت موجود ہے۔ اب ان دونوں سورتوں میں آٹھ سال کا فرق بتایا ہے کہ یا تو وہ ”تسلک الغرائیق العلی“ آٹھ سال تک پڑھا جاتا رہا جس کی غلط روایات خود ہی تردید کرتی ہیں اور پھر کفار کی ایذا رسانی اور شعب میں محصور کرنا وغیرہ سب فرضی قصے ہونے چاہئیں اور یا اس آیت (الحج ۵۲) کا کوئی تعلق سورۃ النجم کی اس آیت سے نہیں اور یہی لازمًا ممانہ پڑے گا۔ نبی کی وحی میں شیطان القاء نہیں کرتا۔ اگر سیاق و سباق پر غور کیا جائے تو خود معلوم ہو جائے گا کہ جو معنی اس آیت کے عام طور پر سمجھے گئے ہیں وہ ہرگز مراد نہیں۔ ان آیات سے پہلے بھی مخالفت حق کرنے والوں اور ان کی سزا کا ذکر ہے:

”وَكَايْنٍ مِّنْ قَرْيَةٍ أَفْلَحَتْ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ أَخَذْنَاَهَا“ (الحج ۴۸)

اور پیچھے بھی یہی ذکر ہے: ”حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ“ (الحج ۵۵) اور اس مسلسل مضمون کے درمیان ایک بالکل غیر متعلق واقعہ کا آ جانا جس کا اس مضمون سے ادنیٰ تعلق بھی نہیں دکھایا جاسکتا کسی صورت میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں ذکر نبی کی مخالفت کا ہے اور یہی ذکر پہلے اور پیچھے ہے۔ خود الفاظ آیت کو لفظ بھی صاف یہی نتیجہ نکلتا ہے اصل غلطی صرف لفظ ”تَمَنَّى“ کے استعمال سے لگتی ہے جو اس میں شک نہیں کہ اکثر جھوٹی آرزوؤں کے لئے بولا گیا ہے مگر جیسا کہ امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے، اس کا استعمال ایسی خواہش اور ایسے اندازہ پر بھی ہوتا ہے جس کی بناء اصلیت پر ہو پس نیک آرزو اور نیک خواہش بھی ”أَمْنِيَّةٌ“ ہے اور یہاں وہی مراد ہے اور غلط آرزو ہرگز مراد نہیں اور الفاظ ”قَبْلِي أَمْنِيَّةٌ“ خود اس قصہ کی غلطی کو ظاہر کرتے ہیں اس لئے کہ قصہ تو یہ ہے کہ شیطان نے وحی میں دخل دے کر وحی کو بدل دیا اور الفاظ قرآنی میں یہ نہیں ہے کہ: ”الْقَلْبُ الشَّيْطَانُ أَوْ فِيهِ وَخِيَةٌ“ بلکہ ”قَبْلِي أَمْنِيَّةٌ“ ہے اور اس کے معنی صرف اسی قدر ہیں کہ نبی کی نیک آرزو کے بارے میں شیطان لوگوں کے دلوں میں وساوس ڈالتا رہتا ہے نہ یہ کہ وہ نبی کی وحی میں کچھ ڈالتا رہتا ہے۔

پھر الفاظ کے حصر کو دیکھو: ”کوئی نبی اور رسول ایسا نہیں بھیجا کہ اس کے ساتھ یہ معاملہ نہ ہوا ہو“ (”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيَّ أَمْنِيَّةً...“) ایک بھی نبی کا ذکر قرآن میں نہیں جس کی وحی میں القاء شیطان کا ذکر آیا ہو حالانکہ دوسرے معاملات میں جہاں ایسا حصر کیا ہے اس کی مثالیں بھی دی ہیں مثلاً: جب یہ فرمایا کہ سب نبیوں سے استہزاء ہوا، سب نبیوں کی تکذیب ہوئی تو ایک ایک نبی کا ذکر کر کے اس کی تکذیب کا بھی ذکر کر دیا۔ پھر کیا یہ جائے تعجب نہیں کہ حصر تو یہ کیا جائے کہ نبی اور رسول ایسا ہوا ہی نہیں جس کی وحی میں شیطان نے القاء نہ کیا ہو اور ایک نبی کی مثال پیش نہ کی جائے کہ اس کی وحی میں یوں شیطان نے القاء کر دیا تھا پھر نتیجہ اس کا یہ بتایا کہ:

”وَلْيَعْلَمَ الَّذِينَ لَوْ تَوَلَّوْا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ“ (الحج ۵۴) تو کیا صاحب علم لوگوں کو اس کے حق ہونے کا علم نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ شیطان وحی میں القاء نہ کرے۔ یہ کیسی بدیہ ابطالان بات ہے؟

... یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ وحی نبی میں شیطان کا القاء ایک ایسا امر ہے جس کی تردید قرآن شریف کا لفظ لفظ کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے: ”قَاتِلْهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق: محمد علی لاہوری قادیانی

يَكْفُرُ بِهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا۝ لِّيُتْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوا رِسَالَتِي...“ (سورۃ الجن ۲۷-۲۸)
یعنی وحی کے آگے پیچھے اللہ تعالیٰ پہرہ لگا دیتا ہے تاکہ جان لے کہ ان کے رب کا صحیح
صحیح پیغام پہنچا دیا گیا ہے۔

اور ہمارے مفسرین قہر گھڑتے ہیں کہ خدائی پہرہ پر شیطان غالب آ جاتا ہے۔ پھر وہ فرماتا
ہے کہ شیطان کا میرے بندوں پر کچھ تسلط نہیں اور اس لغو قصہ سے یہ اصول تسلیم کیا جاتا ہے کہ انبیاء
پر بھی شیطان کا تسلط ہو جاتا ہے۔ یہاں تو ذکر نہیں کہ شیطان کس کی طرف القاء کرتا ہے مگر قرآن
کریم نے دوسری جگہ خود بتا دیا کہ شیطانوں کا القاء شیطانوں یا ان کے متبعین کی طرف ہی ہوتا ہے۔

”وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُؤْمِنُونَ بِالْحُبُوتِ إِلَىٰ أُولِيَاتِهِمْ لِيُجَادِلُوهُمْ“ (الانعام ۱۲۱)

اور درحقیقت اس آیت کی تفسیر اس دوسری آیت سے ہوتی ہے:

”وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ
بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا“ (الانعام ۱۱۲) ہر نبی کے لئے ہم نے شیطان، انسان اور جن
دشمن بنائے ہیں جو ایک دوسرے کے دل میں باتیں دھوکا دینے کے لئے ڈالتے رہتے ہیں۔

پس یہی مراد یہاں ہے نبی کی آواز کو باطل کرنے کے لئے شیطان اپنے اولیاء کے دلوں میں
طرح طرح کی باتیں مخالفت کی ڈالتا رہتا ہے مگر اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں کو منسوخ کر دیتا ہے اور اپنی
آیات کو مضبوط کر دیتا ہے یعنی حق کو قائم کر دیتا ہے۔ (بیان القرآن جلد دوم ص ۹۳۲-۹۳۷)

موصوف سورۃ النجم آیات ۱۹-۲۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں: اس موقع پر واقعہ کی
روایت پر (غرائیق کی) جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ ایسی پلچر ہے کہ قرآن کریم کے کھلے الفاظ
کے سامنے وہ قابل غور بھی نہیں..... ایسی خرافات اور قرآن جیسے پُر حکمت کلام!

اس سورت کے متعلق یہ مسلمہ امر ہے کہ علی الاعلان کفار میں پڑھی گئی، اور ابن مسعودؓ
کی ایک روایت میں ہے کہ یہ پہلی سورت ہے جو نبی کریمؐ نے علی الاعلان کفار کو سنائی اور یہ
پہلی سورت تھی جس میں سجدہ نازل ہوا اور سجدہ کے موقع پر نبیؐ نے سجدہ کیا اور آپ کے
ساتھ ہی سب سامعین نے بھی جن میں مشرک بھی تھے لیکن سوال یہ ہے کہ اس خیال کو تو

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق: محمد علی لاہوری قادیانی

سورت کا لفظ لفظ دھکے دے رہا ہے۔ اگر بالفرض دو آیتیں چھوڑ کر ان کے بجائے یہ لفظ
رکھے بھی جائیں تو اگلی تمام آیات پھر اس خیال کی کھلی کھلی تردید کر رہی ہیں۔ کیونکہ آیت
۲۳ میں صاف طور پر ان بتوں کو ”نام“ قرار دیا ہے جن کے نیچے کوئی حقیقت نہیں اور اس
سے بھی آگے چل کر آیت ۲۶ میں فرشتوں کی شفاعت کو بھی اذن الہی سے مشروط کیا ہے۔
بتوں کی شفاعت کا اقرار یہاں کس طرح موزوں ہو سکتا تھا؟ اور آیت ۲۷-۲۸ میں پھر وہی
مضمون ہے جس کی طرف اشارہ: ”الَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ الْآلَتُنَّ“ (النجم ۲۱) میں ہے۔ پھر اس
سے آگے ساری سورت کو پڑھ جاؤ جن کفار کو یہ کہہ دیا کہ تمہارے بت بھی واقعی خدا کے ہاں
سفارشی ہیں۔ کیا انہیں ایسے الفاظ میں مخاطب کیا جاسکتا تھا؟:

ذَلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ ... (۳۰) لِيَجْزِيَ الَّذِينَ اَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ اَحْسَنُوا
بِالْحُسْنِ (۳۱) اَفَرَأَيْتِ الَّتِي تُوَلَّىٰ (۳۳)، اَلَا تَذَرُوْنَ وَزُرُّوا نَحْرِي (۳۸) وَمَا لِي لَيْسَ
لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَسَافِحٰی (۳۹) پھر اس سے آگے مختلف قوموں کی ہلاکت کا ذکر ہے۔ اگر بتوں کی
شفاعت تسلیم کر لی تھی تو پھر باقی اختلاف کس بات پر تھا جس پر اس قدر تہدید کفار سے کی جاتی جو اس
سورت میں موجود ہے یہاں تک کہ آخر میں ان کو نسا دیا کہ ان کی ہلاکت کی گھڑی سر پر آ پہنچی ہے۔

واقعہ نے بہتری موضوع حدیثوں کو لکھ مارا ہے اور محدثین اس کی سند کو کچھ بھی
وقع نہیں دیتے۔ کسی زندیق نے ایک روایت بنا کر مشہور کر دی اور واقعہ کی یا زہری نے
اسے قبول کر لیا تو یہ اتنے اہم معاملے پر کوئی دلیل نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی
نبوت سے پہلے بھی تاریخی طور پر شرک اور بت پرستی کی آمیزش سے پاک ثابت ہے چہ
جائیکہ نبوت کے اندر ایسے واقعات کا وہم دل میں لایا جائے۔ پھر ایسے وقت میں جب کفار
کی طرف سے سخت ترین تکلیفیں پہنچ کر مسلمان ہجرت کر کے حبش جا چکے تھے۔ کسی محقق نے
اس روایت کو قبول نہیں کیا اور حدیث کی کسی کتاب میں اس کو جگہ نہیں ملی، پھر یہ مسلمہ تاریخ
کے خلاف ہے اس لئے سوائے سخت تعصب یا حدودہ کی سادگی کے کوئی شخص ایسی روایات کا
نام تک بھی نہ لے گا۔ (بیان القرآن جلد دوم ص ۱۳۱۶)

خلاصہ بحث افسانہ غرائیق

گذشتہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ تمام مفسرین حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث سلفی حتیٰ کہ اہل تشیع اور قادیانیوں نے بھی قصہ غرائیق سے متعلق تمام روایات کو عصمت انبیاء کے منافی اور انہیں زنا و ملاحہ کی سازش قرار دے کر رد کر دیا ہے۔ اسی طرح امت مسلمہ کے محقق مفسرین نے ابن حجر و امثالہ کی تمام تاویلات کو بھی ”بعیدہ، فاسدہ و باطلہ“ گردانتے ہوئے رد کی ٹوکری میں پھینک دیا ہے۔

”امام المفسرین والمؤرخین“ جناب طبری نے اس سلسلے میں جو روایات پیش کی ہیں کوئی مومن بالقرآن و بالرسول ایک لمحہ کے لئے بھی ان کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتا کیونکہ ان کی رو سے یہ بات ”ثابت“ ہوتی ہے کہ ”شیطانی کلمات“ ادا کرنے سے پہلے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی مخالفت کم کرنے اور ان سے تعلقات بہتر بنانے کی خاطر اس ”خواہش“ کا اظہار فرمایا تھا کہ قریش قریب آگئے ہیں اب کہیں اللہ کوئی ایسا حکم نازل نہ کر دے جس کی وجہ سے یہ مشرکین مجھ سے نفرت کرنے لگیں اور مزید دو روز جائیں: (ہم منیٰ یومئذ ان لا یتبہ من اللہ شیئ فینفروا عنہ فانزل اللہ علیہ ...) اس کے بعد امام طبری نے سورۃ النجم کا حوالہ دے کر کہا کہ جب آپ اس سورۃ مبارکہ کی آیت ۱۹-۲۰ پر پہنچے تو شیطان نے آپ پر زیر بحث کلمات القاء کر دیئے جنہیں باقاعدہ آپ نے پڑھا۔ امام طبری اور ان کے راوی کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر یہ بدترین الزام ہے کہ آپ یہ خواہش رکھتے تھے کہ اس موقع پر اللہ کوئی ایسا حکم نازل نہ کر دے جس سے مشرکین متنفر ہو جائیں۔

امام طبری کی منقولہ روایات سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ شیطان نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر ”حالت بیداری میں“ بتوں کی تعریف پر مبنی کلمات القاء

کئے تھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہی آواز میں ان کی ”تلاوت“ فرمائی تھی، یہی نہیں بلکہ بعد میں بھی پڑھتے رہے حتیٰ کہ جب جبریل تشریف لائے اور انہیں بھی وہی ”شیطانی آیات“ پڑھ کر سنائیں جس پر انہوں نے تردید کرتے ہوئے کہا کہ: میں تو آپ کے پاس یہ کلمات نہیں لایا ہوں، یہ آپ نے کیا کہہ دیا ہے؟ یقیناً آپ نے لوگوں کے سامنے ان کلمات کی بھی تلاوت کر ڈالی جو میں نے آپ کو نہیں بتائے، آپ نے وہ بات کہہ دی جو آپ کے لئے نہیں کہی گئی تھی۔

جبریل کی اس بات کے جواب میں آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ: میں نے تو یہ کلمات نہیں کہے یا میں اونگھ کی حالت میں تھا یا میں نے آیات کے درمیان وقف کیا تھا تو شیطان نے میری آواز میں آواز ملا کر انہیں پڑھ دیا تھا، یا مشرکین نے خود یہ کلمات میری طرف منسوب کر دیئے تھے۔ یا شیطان نے مجھ پر جبر کیا تھا اور غیر اختیاری حالت میں یہ الفاظ میری زبان سے نکل گئے، یا یہ الفاظ ”سہواً“ میری زبان سے نکل گئے، یا میں نے ”توہیناً“ یہ الفاظ کہے تھے، یا میں نے ”الغرائیق“ سے فرشتے مراد لئے تھے مگر مشرکین نے انہیں اپنے بتوں کی تعریف پر محمول کر لیا (فتح الباری جلد ۸ ص ۴۴۰-۴۳۹)۔

بلکہ روایت امام طبری نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا اعتراف کیا اور فرمایا کہ میں نے اللہ پر ”افتراء“ باندھا ہے اور میں نے وہ کلمات کہے جو اس نے نازل نہیں کئے تھے۔ پھر آپ اس فعل پر سخت ملول ورنجیدہ ہوئے اور آپ کو اللہ کا بڑا خوف لاحق ہوا۔

امام طبری کی منقولہ روایات اس بحث کے آغاز میں گزر چکی ہیں۔ کیا ان ”روایات“ کو قبول کیا جاسکتا ہے؟ کیا مذکورہ الفاظ کی کوئی تاویل ممکن ہے؟ کیا ان روایات بلکہ ”خرافات“ اور وہیات“ کو تسلیم کر لینے سے نصوص قرآنیہ کی مخالفت لازم نہیں آتی؟ کیا ان ”خرافات“ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت، عصمت اور نبوت کو داغ اور جھٹکا نہیں لگتا؟ کیا مذکورہ ”خرافات“ عقیدہ عصمت انبیاء کے منافی نہیں ہیں؟ کیا امام طبری کی ان ”خرافات“ پر امام بغوی کی اس ”توضیح“ کا اطلاق صحیح ہے؟

”امام بغوی نے واضح کیا ہے کہ اگر قصے کو مان بھی لیا جائے تو ظاہری مطلب نہیں لیا جائے گا جو عصمت انبیاء سے متعارض ہے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ:

”تلك الغرائيق العلی“ کے شرکیہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں، شیطان نے کہے تھے، مشرکین کو وہ ہم ہو گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرما رہے ہیں۔“ (روزنامہ اسلام ۱۱ اگست ۲۰۱۵ء زیر عنوان ”احتیاط لازم ہے“ قسط نمبر ۳)

اگرچہ نصوص قرآنیہ کے مقابلے میں ابن حجر اور امام بغوی کی تاویلات بالکل ہی باطل ہیں مگر ان ”باطل“ تاویلات کا اطلاق بھی طبری کی منقولہ خرافات پر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ ”خرافات“ پیچھے گزر چکی ہیں۔ انصاف پسند قارئین سے درخواست ہے کہ وہ روزنامہ اسلام کے کالم نگار مولانا اسماعیل ربیعان کی طرف سے امام بغوی کی پیش کردہ خلاف واقع اور باطل تاویل کا امام طبری کی خرافات کے ساتھ موازنہ کر کے خود ہی کوئی فیصلہ کر لیں۔

امام بغوی کی مذکورہ باطل تاویل سے معلوم ہوتا ہے کہ شرکیہ الفاظ شیطان نے کہے تھے مگر مشرکین کو یہ وہم ہو گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہہ رہے ہیں پھر معلوم نہیں کہ امام طبری یا ان کے شیوخ کو یقینی طور پر یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ یہ شرکیہ الفاظ شیطان نے نہیں بلکہ آپؐ نے خود ادا فرمائے تھے۔

سخت تعجب ہے کہ مشرکوں کو وہم ہوا ہے مگر امام طبری کو یقین ہے کہ شیطان نے یہ شرکیہ کلمات خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو اور خواہش کے مطابق آپؐ کی زبان پر جاری کر دیئے تھے۔ اسی لئے امام طبری نے ۱۵ روایات نقل کی ہیں جن میں یہ تکرار بتایا گیا ہے کہ شیطان نے ہی یہ الفاظ القاء کئے تھے، پھر موصوف نے اپنے باطل دعویٰ کی تائید میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ”اعتراف“ اور جبریل امینؑ کی کوئی بھی پیش کردی!!

اس تفصیل سے روز روشن کی طرح یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ”قصہ غرائیق“ لغو، باطل اور زنا و قدح و ملاحدہ کا وضع کردہ ہے جو ”عصمت مصطفیٰ“ کے منافی ہونے کے علاوہ سراسر آپؐ کی توہین پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین کرام اور علمائے اسلام کے کتاب و سنت سے ماخوذ اقوال پیچھے گزر چکے ہیں۔ اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے باوجود جو حضرات کسی

بھی اعتبار سے، کسی بھی تاویل کی رو سے، کسی بھی درجے میں اور کسی بھی ”اصل“ کی بناء پر امام طبری کی منقولہ روایات کی صحت کے اب بھی قائل ہیں تو وہ امام فخر الدین رازی اور علامہ سید محمود آلوسی کے مندرجہ ذیل فیصلے پر غور کر لیں:

امام فخر الدین رازی ان لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں جو ”وَهُمْ بِهَا“ کے تحت حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف اس قبیح فعل کی نسبت کرتے ہیں:

هؤلاء الجهال الذين نسبوا لي يوسف عليه السلام هذه الفضيحة، إن كانوا من اتباع دين الله تعالى فليقبلوا شهادة الله تعالى على طهارته، وإن كانوا من اتباع إبليس و جنوده فليقبلوا شهادة إبليس على طهارته۔“ (التفسير الكبير جلد ۶ ص ۴۴۱)

یہ جاہل جنہوں نے اس گندے عمل کو حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کیا ہے اگر اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرماں برداروں میں سے ہیں تو وہ اس امر میں یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی پر اللہ تعالیٰ کی کوئی کو قبول کر لیں (کہ یوسف میرے مخلص بندے ہیں اور مخلص بندوں پر شیطان کا کوئی زور نہیں چل سکتا۔ نیز ”إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ“ اور اگر وہ شیطان اور اس کے لشکروں کے پیروکار ہیں تو پھر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی پر ابلیس کی شہادت کو قبول کر لیں (کہ تیرے مخلص بندوں پر میرا کوئی دائرہ نہیں چلتا)۔

علامہ سید محمود آلوسی ”قصہ غرائیق“ کا روایتاً و درایتاً بطلان کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:

”ولعمري أن القول بأن هذا الخبر مما ألقاه الشيطان على بعض أئمة الرواة ثم وفق الله تعالى جمعاً من خاصة لا بطلاله أعون من القول بأن حديث الغرائيق مما ألقاه الشيطان على لسان رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم نسخه سبحانه وتعالى...“ (روح المعاني جلد ۷ ص ۱۸۲)

”میری زندگی کی قسم! اس روایت کے بارے میں یہ بات مان لیما بہت آسان ہے کہ اسے شیطان نے خود راویوں کی زبان پر جاری کر دیا ہے، بہ نسبت اس کے کہ یہ مان لیا جائے کہ شیطان مردود نے ان شرکیہ کلمات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر القاء کر دیا تھا بعد میں اللہ تعالیٰ کو اس میں مداخلت کر کے منسوخ کر پڑا۔“

سُبْحَنَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ۔

افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ”کثر طرق“ کی بناء پر یہ قرار دیا ہے کہ یہ چیز اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس واقعہ یعنی ”غرائیق“ کی کوئی نہ کوئی اصل موجود ہے جبکہ بعض علماء نے صحیح حدیث کی روشنی میں اس کی ایک دوسری ”اصل“ بیان کی ہے جس میں مشرکوں کے سجدہ کرنے کا تو ذکر ہے لیکن ”غرائیق“ کا نہیں۔

شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب قصہ غرائیق کو رد کرنے کے بعد اس بحث کے آخر میں لکھتے ہیں کہ:

”البتہ یہ اشکال باقی رہ جاتا ہے کہ جب اس قصہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو پھر اتنی بڑی بات اتنے راویوں کے ذریعے کیسے مشہور ہو گئی جبکہ ان میں بعض نامور بزرگ اور مشہور محدث بھی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل قصہ حدیث کی معتبر کتابوں میں موجود ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور مسند احمد میں اصل واقعہ اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ النجم تلاوت فرمائی، آخر میں جب آپؐ نے سجدہ کیا تو مسلمانوں اور مشرکین سب نے آپؐ کے ساتھ سجدہ کیا۔ چنانچہ آگے سورۃ نجم کی تفسیر میں امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ ہی سے روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ ہیں: ”سجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالنجم، وسجد معه المسلمون والمشرکون، والجن والانس“

ظاہر ہے قرآن کی اپنی ایک تاثیر ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ملہا نہ انداز سے اس کی ادائیگی نے سب پر ایک وجد کی سی حالت طاری کر دی اور پورا مجمع سجدے میں گر گیا۔ بہت ممکن ہے کہ بعد میں مشرکین میں کچھ لوگ اپنی اس وقتی

تاثر پر پشیمان ہوئے ہوں اور انہوں نے یہ بے پیر کی اڑادی ہو کہ ہم نے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے یہ فقرہ سنا تھا اس لئے ہم بھی ان کے ساتھ سجدے میں گر گئے، اس طرح بعض ثقہ راوی بھی اس غلط روایت میں مبتلا ہو گئے اور قصہ اپنی اصلی صورت کے بجائے دوسرے انداز میں بیان ہونے لگا۔ واللہ اعلم بالصواب

مشرکین کے سجدہ کرنے کی وجہ شاہ ولی اللہ نے بیان کی ہے کہ: آیت نجم کی تلاوت کے وقت اللہ تعالیٰ کی تجلی قہری نمودار ہوئی تھی اس کی وجہ سے مشرکین بے اختیار سجدے میں چلے گئے تھے۔“ (کشف الباری۔ کتاب التفسیر۔ سورۃ الحج ص ۴۵۳-۴۵۴)

پیر محمد کرم شاہ صاحب ازہری قصہ غرائیق کی بحث کے آخر میں لکھتے ہیں:

”اصل واقعہ جو صحیحین اور دیگر کتب حدیث میں ہے وہ صرف اتنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع عام میں یہ سورۃ (نجم) پڑھی اور اس میں آیت سجدہ آنے کی وجہ سے آخر میں سجدہ کیا تو تمام حاضرین جن میں کفار بھی تھے سب سجدہ میں گر پڑے اور ایسا ہونا عین ممکن ہے کیونکہ کلام الہی ہوا اور زبان حبیب کبریا اس کی تلاوت کر رہی ہو تو کیوں نہ کفار بے ساختہ سجدے میں گر پڑیں۔ بس اتنی بات تھی جس کو زنادقہ کی وضع و تحریف نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟“ (ضیاء القرآن جلد سوم ص ۲۲۷۔ تحت سورۃ الحج آیت ۵۲)

موصوف ایک دوسری کتاب میں لکھتے ہیں:

”کفار کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر سجدہ کرنا، روایات صحیحہ سے ثابت ہے لیکن اس کی توجیہ کے لئے قصہ غرائیق کو تسلیم کرنا ضروری نہیں۔ کلام خدا کو حبیب خدا کی زبان پاک سے سن کر ہزاروں عربوں نے اپنا دین چھوڑ دیا تھا۔ عمرؓ نے اپنی بہن سے کلام الہی کی چند آیات سن کر ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اکابر قریش قرآن کی عظمتوں کے سامنے بے ساختہ گردنیں جھکا رہے تھے اسی کلام کی قوت تاثیر تھی جب سورۃ نجم تلاوت کرنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا تو وہ کافر جو تلاوت کے دوران اس کلام کی عظمتوں پر حیران ہو رہے تھے وہ بھی بے ساختہ سجدے میں گر گئے اور جب انہیں احساس ہوا کہ انہوں

امام طبری --- کون؟

افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟

نے کیا کیا جتو اپنے کئے پر پچھتاتے لگے۔“ (ضیاء النبیؐ جلد ششم ص ۶۳۶-۶۳۵)
اس کے برعکس امام طبری نے سورۃ نجم کی تلاوت کے دوران جہاں شیطانی کلمات پڑھنے کا ذکر کیا ہے وہیں سورۃ کے اختتام پر نہ صرف مسلمانوں اور مشرکوں کے ایک ساتھ سجدہ کرنا بیان کیا ہے بلکہ یہ کہانی بھی نقل کی ہے کہ:

فسمع من كان من المهاجرين بأرض الحبشة ان اهل مكة قد أسلموا
كلهم، فرجعوا الى عشائيرهم وقالوا: هم أحب الينا، فوجدوا القوم قد ارتكسوا
حين نسخ الله ما ألقى الشيطان ...

وبلغت السجدة من بأرض الحبشة من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم،
وقيل: أسلمت قريش، فنهضت منهم رجال، وتخلّف آخرون...“ (تفسير الطبري
المجلد التاسع ص ۱۷۴-۱۷۵ تحت رقم ۲۵۳۲۷-۲۵۳۲۸ طبع بيروت)

اس سلسلے میں مہاجرین حبشہ کو جب معلوم ہوا کہ تمام اہل مکہ اسلام لے آئے ہیں تو وہ اپنے خاندانوں کی طرف واپس لوٹ آئے اور کہا کہ وہ ہمیں (جلا وطنی سے) زیادہ محبوب ہیں، مگر یہاں آکر انہوں نے دیکھا کہ ان شیطانی کلمات کو اللہ کی جانب سے منسوخ قرار دینے کے بعد اہل مکہ پھر کافر ہو چکے ہیں۔

دوسری روایت کے مطابق امام طبری لکھتے ہیں:

اس سجدے کی خبر ان مسلمانوں کو بھی ہوئی جو ہجرت کر کے حبشہ گئے ہوئے تھے اور ان سے کہا گیا کہ قریش اسلام لے آئے ہیں۔ اس خبر کو سن کر بعض حضرات واپس آنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور بعض وہیں رہ گئے۔

امام طبری نے تفسیر کے علاوہ مذکورہ روایات اپنی تاریخ میں بھی نقل کی ہیں۔ ملاحظہ ہو:
تاریخ الامم والملوک الجزء الثاني ص ۷۶، ۷۸۔ طبع بیروت

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری سورۃ نجم مسلمانوں اور مشرکوں کے اجتماع میں سنائی اور آخر میں سب

امام طبری --- کون؟

افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟

نے سجدہ بھی کیا۔ علماء کرام نے مشرکوں کے سجدہ کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ انہوں نے قرآن کی عظمت اور تاثیر سے متاثر ہو کر سجدہ کیا تھا یا آیت نجم کی تلاوت کے وقت اللہ تعالیٰ کی ”جلی قاہری“ نمودار ہوئی تھی جس کی وجہ سے مشرکین بے اختیار سجدے میں چلے گئے جس سے بعد میں قصہ غرائیق وضع کر لیا گیا۔

مشرکین کے سجدہ کرنے کی وجہ علماء کرام نے بتائی ہے وہ محض ”قیاسی“ ہے جس پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اس کے بالمقابل امام طبری اور قصہ غرائیق کی دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ شیطان نے شرکیہ کلمات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر جاری کئے تھے اس لئے مشرکین نے خوش ہو کر مسلمانوں کے ساتھ سجدہ کیا تھا اور یہی سجدہ کی بات جب ارض حبشہ مہاجرین کے پاس پہنچی تو وہ مکہ واپس لوٹ آئے۔

سورۃ نجم کی تلاوت کے بعد سجدہ کی ادائیگی اور اس خبر کا حبشہ پہنچنا جسے سن کر مہاجرین واپس مکہ مکرّمہ آئے ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا زمانہ نزول ۵ نبوی متعین ہو جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ سورۃ نجم کی ہے اور اس کی آیات کی تعداد ۶۲ ہے کیا یہ پوری سورت یکبارگی نازل ہوئی تھی؟ کیا یہ قریش کے اجتماع میں ہی آپؐ پر نازل ہوئی تھی؟ غرائیق کا قصہ سورۃ نجم کی آیات ۱۹-۲۰ کے ساتھ جوڑا گیا ہے جبکہ سجدہ کا حکم اس کی آخری آیت ۶۲ میں دیا گیا ہے۔

روایات سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ پوری سورت آپؐ نے یکبارگی قریش کے اجتماع یا حرم میں تلاوت کی تھی جس کے آخر میں سب نے اٹھ کر سجدہ کیا تھا۔

اس بات کا ثابت کرنا کہ یہ مکمل سورت یکبارگی نازل ہوئی تھی ایک مشکل امر ہے، جس روایت سے اس کی یکبارگی نزول کا ”قیاسی“ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے اس میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا، اس میں صرف یہ الفاظ آئے ہیں کہ: ”اول سورة انزلت فيها سجدة، النجم“ وہ پہلی سورت جس میں آیت سجدہ نازل ہوئی وہ سورۃ النجم ہے۔

اس روایت سے یہ بات بھی از خود ثابت ہو جاتی ہے کہ سورۃ العلق کا آخری حصہ جس میں سجدے کا حکم ہے وہ سورۃ نجم کے آخری حصے کے بعد نازل ہوا ہے۔ اگر اسے تسلیم نہ کیا جائے تو پھر

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟

ان الفاظ کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے کہ ”وَلِ سُوْرَةِ اَنْزَلَتْ فِيْهَا سَجْدَةٌ، النجم“ علاوہ ازیں اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سورۃ تعلق کے دوسرے حصہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حرم میں نماز پڑھنے سے روکے جانے کا ذکر ہے: ”اَزَاَيْتَ الْاَيْتِيْ يٰنَبِيَّ ۝ عِبْدُنَا اِذَا صَلَّيْ ۝“ جبکہ نجم میں مشرکین کے خود سجدہ کرنے کا ذکر ہے نہ کہ رکاوٹ ڈالنے کا۔

یہ بات تو صحیح ہے کہ یہی وہ سورت ہے جس کی آخری آیت (۶۲) میں پہلی مرتبہ ”سجدہ“ کرنے کا حکم دیا گیا لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں ہے کہ یہ پوری سورت ہی یکبارگی نازل ہوئی تھی۔

علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں کہ:

”حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں کبھی ایک آیت، کبھی چند آیتیں، کبھی پوری سورت اتری۔ کبھی ایک ایک سورۃ چند سالوں میں متفرق طور پر نازل ہو کر پوری ہوتی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اس آیت کو فلاں مقام پر رکھو۔“

سب کو معلوم ہے کہ سورۃ مائدہ کی آیت ”الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ“ ۱۰۷ھ میں حجۃ الوداع میں اتری اور سورۃ مائدہ کی بہت سی آیتیں اس سے پہلے ۵ھ میں اتریں، جیسے تیمم کا حکم وغیرہ۔ جانوروں کی حلت و حرمت کے احکام جو اس میں ہیں وہ غالباً اس کے دو برس بعد خیبر کے زمانہ کی ہیں۔ سورۃ البقرہ کی آخری آیتیں معراج میں مکہ میں نازل ہوئیں مگر باقی سورہ بقرہ مدینہ میں پوری ہوئی۔ اسی طرح یہ سب جانتے ہیں کہ ”اقراء باسم ربك“ چند ابتدائی آیتیں اولین وحی ہیں مگر آخر سورۃ میں نماز سے روکنے کا واقعہ بہت بعد کا ہے۔

وہ آیت جس کو سورۃ نجم کے قصہ کے تعلق سے ان باطل روایتوں میں نقل کیا گیا: ”اذا تمنى الْاَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيْ اَمْنِيَّتِهِ“ سورۃ حج میں ہے اس لئے اس کا نزول ۵ھ نبوی میں ہوگا۔ لیکن قتال کی اجازت کی پہلی آیت ”اِذْ لِلَّذِيْنَ“ بھی اسی میں ہے جو ہجرت کے بعد بدر سے پہلے نازل ہوئی، پھر اس میں حج ابراہیمی کا ذکر ہے وہ اس کے بعد کا واقعہ ہوگا اور اکثر آیتیں اس کی مدنی ہیں۔

سورۃ نجم کے نزول کی قطعی تاریخ ۵ھ نبوی بتانا بھی صحیح نہیں۔ آپ یہ زمانہ اس لئے قطعی سمجھتے

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟

ہیں کہ یہی وہ سورت ہے جس کو رمضان ۵ھ نبوی میں تلاوت کرتے وقت آپ نے یا شیطان نے نعوذ باللہ بتوں کی تعریف (میں) ”تَمَلَّكَ الْغُرَانِيْقُ“ ملا دی تھی اور سب نے مع مسلمانوں اور مشرکوں کے سجدہ کر لیا تھا اور یہ سن کر مہاجرین حبش نے جنہوں نے رجب ۵ھ نبوی میں ہجرت کی تھی، شوال ۵ھ نبوی میں حبشہ سے واپس چلے آئے۔ اس لئے یہ سورۃ ۵ھ نبوی میں اتری۔ لیکن تمام مآخذین حدیث جانتے ہیں کہ یہ واقعہ تمام تر لغو ہے۔ سورۃ نجم کی تلاوت اور تمام کفار کے سجدہ کرنے کا ذکر بلا وقت کی تعیین کے اور بغیر اس کے کہ اس میں ”تَمَلَّكَ الْغُرَانِيْقُ“ والا لکھا ہوا ہو اور بغیر اس کے کہ یہ واقعہ مہاجرین حبشہ کی واپسی کا غلط سبب بنے احادیث صحیحہ میں مذکور ہے۔۔۔۔۔

میں کہتا ہوں کہ سورۃ نجم کا ۵ھ نبوی میں نازل ہونا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پوری سورۃ کی اس وقت قرأت کرنا، ناممکن ہے کیونکہ اس سورۃ کی ابتداء میں معراج کے روحانی مناظر و مشاہد کا ذکر ہے اور معراج کی تاریخیں ۱۱۔ نبوی یا ۱۲۔ نبوی ہیں۔ اس لئے کیوں کر ممکن ہے کہ ۵ھ نبوی میں یہ سورۃ پوری اتری ہے اور تلاوت کی گئی ہے۔ (سیرت عائشہ ص ۳۳۰۔ مع ”حضرت عائشہ کی عمر پر تحقیقی نظر“ مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور)

موصوف اس تفصیل کے باوجود اصل مسئلہ حل نہ کر سکے اور اسے بالکل مبہم چھوڑ گئے اور صرف اس بات پر ہی اکتفاء کیا کہ قصہ غرائیق، مہاجرین حبش سے مراجعت اور وقت کی تعیین کے بغیر مسلمانوں اور مشرکوں نے سورۃ نجم کی سماعت کے بعد ایک ساتھ ”سجدہ“ کیا۔ پھر یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ ۵ھ نبوی میں اس کا نزول ناممکن ہے کیونکہ اس سورۃ کی ابتداء میں معراج کا ذکر ہے جس کا تعلق ۱۱ یا ۱۲ نبوی کے دور سے ہے۔ اس طرح تو ہجرت سے پہلے ایک یا دو سال کا عرصہ ہی رہ جاتا ہے جس میں اس سورۃ کی تکمیل ہوئی ہوگی۔

علماء کرام کا ایک گروہ قصہ غرائیق کے بغیر، مخلوط سجدہ کا تعیین ۵ھ نبوی کے زمانے سے کرتا ہے۔ جبکہ امام طبری و امثالہ قصہ غرائیق کو تسلیم کر کے مخلوط سجدہ اور مہاجرین حبش کی مکہ مراجعت ۵ھ نبوی میں بتلاتے ہیں۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ محقق علماء ”قصہ غرائیق“ کو لغو اور باطل قرار دے کر مشرکین

امام طبری --- کون؟

افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟

کے سجدہ کرنے کی وجہ اللہ تعالیٰ کی عظمیٰ قاہری اور قرآن کی عظمت بتلاتے ہیں اس کے برعکس امام طبری سجدہ کرنے کی وجہ ”تلك الغرائيق“ کے شیطانی جملوں پر مشرکین کی خوشی قرار دیتے ہیں۔ اس سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ علماء کے مابین صرف سجدہ کرنے کی ”وجہ“ میں اختلاف ہے۔ سورۃ نجم کی تلاوت کے آخر میں مشرکین کے ۵ نبوی میں سجدے کرنے پر تقریباً سب کا ”اتفاق“ ہے، مہاجرین حبش کے حوالے سے اتنی بات تمام تفسیری و تاریخی روایات سے ثابت ہے کہ وہ حبش میں رجب، شعبان، رمضان (۵ نبوی) تین ماہ تک قیام پذیر رہے اور شوال ۵ نبوی میں مشرکین کے مشرف بہ اسلام ہونے کی بات سن کر واپس مکہ آئے لیکن سوال یہ ہے کہ انہوں نے حبش کی طرف ہجرت کب کی تھی؟ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ وہ رجب میں ہی گئے تھے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ روایت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ رجب ۵ نبوی میں آپؐ نے پوری سورۃ نجم ازاو ل تا آخر مسلمانوں اور مشرکوں کے مجمع میں پڑھ کر سنائی اور آیت ۱۹-۲۰ کی تلاوت کے بعد (روایت کے مطابق) شیطان نے آپؐ کی زبان پر شرکیہ کلمات ”تلك الغرائيق العلی.....“ جاری کر دیئے۔ پھر باقی سورت آیت ۶۲ تک آپؐ نے تلاوت فرمائی جس کے بعد آپؐ نے جب سجدہ کیا تو آپؐ کے ساتھ موجود سب مسلمانوں اور مشرکوں نے بھی سجدہ کیا۔ یہ خبر سن کر مہاجرین حبش بھی لوٹ آئے۔

لیکن ان روایات کی سورۃ نجم کے اندرونی مضمون سے تائید نہیں ہوتی اس لئے علامہ سید سلیمان ندوی نے فرمایا کہ ۱۲-۱۱ نبوی تک اس سورۃ کا مکمل نزول ناممکن ہے۔ دوسری طرف صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ مشرکوں نے بھی (اس کی وجہ خواہ کوئی بھی ہو) مسلمانوں کے ساتھ اس موقع پر سجدہ کیا تھا اس لئے موصوف نے ”عجیب“ راستہ نکالا کہ:

”قصہ غرائیق“ میں ”شیطانی کلمات“ کے بغیر مہاجرین حبشہ کی مراجعت اور وقت کی تعیین کے بغیر مشرکوں کا سجدہ کرنا تسلیم کر لیا جائے۔ مگر اس صورت میں یہ اشکال باقی رہتا ہے کہ جب موصوف کے نزدیک مکمل سورۃ نجم کا نزول ۱۲-۱۱ نبوی تک ناممکن ہے تو پھر مشرکوں نے یہ سجدہ کب کیا تھا اور مہاجرین حبش کی مکہ واپسی کب ہوئی تھی۔ ۱۲-۱۱ نبوی کے بعد ”سجدہ اور مراجعت“ ناممکن

امام طبری --- کون؟

افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟

ہے کیونکہ اس سے پہلے حبشہ کی طرف دوسری ہجرت بھی واقع ہو چکی تھی، شعب بنی ہاشم میں ۳ سالہ محصور بھی عمل میں آ کر اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی اور سب سے بڑھ کر ۱۲-۱۱ نبوی کے بعد مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے لئے فضا ہموار ہو گئی تھی۔

اب عجیب صورت حال پیدا ہو گئی ہے، قصہ غرائیق کو غوا اور باطل قرار دے کر مشرکوں اور مسلمانوں کے سجدہ کرنے کے زمانے کا تعین نہیں ہو پا رہا۔ کیونکہ آیت سجدہ نجم کی آخری آیت ہے اور ۱۱-۱۲ نبوی سے پہلے اس کا نزول ناممکن ہے۔ اس سے پہلے ”سجدہ“ کا وقوع ہو نہیں سکتا جبکہ بعد میں مشرکوں کے سجدہ کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کی تائید کسی روایت سے ہوتی ہے۔ قصہ غرائیق اور مہاجرین حبش کی واپسی کا انکار تو صحیح ہے لیکن ”سجدہ“ کا انکار صحیحین میں ہونے کی وجہ سے نہیں ہو سکتا۔ علامہ ندوی صاحبؒ کی مبہم بات سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ یہ سوال اپنی جگہ جواب طلب ہے کہ صحیحین کی حدیث میں مذکور سجدہ مسلمانوں اور مشرکوں نے کب کیا تھا؟

جہاں تک اس قول کا تعلق ہے کہ سورۃ نجم رجب ۵ نبوی میں نازل ہوئی تو اس کے آخری راوی جناب محمد بن عمرو واندی ہیں جو ۱۳۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۹ھ یا ۲۰۹ھ میں فوت ہوئے اگر بالفرض واندی کو ثقہ بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ خود واقعہ کے گواہ نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ ان کی پیدائش سے بھی ۱۳۰+۸=۱۳۸ سال پہلے کا ہے۔

نیز یہ بھی واندی ہی کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب ۵ نبوی میں سورۃ نجم پوری پڑھ کر سنائی۔ ظاہر ہے کہ اس حوالے سے بھی یہ موقع کے گواہ نہیں ہیں۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قصہ ”غرائیق“ کے راویوں میں کوئی ایک راوی بھی سورۃ نجم کی تلاوت کے وقت موجود نہیں تھا۔ صرف ایک سند میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا نام شامل ہے۔ ظاہر ہے یہ بھی موقع کے گواہ نہیں ہیں کیونکہ یہ واقعہ ان کی ولادت سے ۵ سال پہلے کا ہے۔ راویوں پر بحث پیچھے گذر چکی ہے۔

سورۃ نجم کی تلاوت کے وقت صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت مطلب بن

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟

ابی وداعہؓ یعنی شاہدین میں شامل ہیں (مؤثر الذکر نے اس وقت اسلام قبول نہیں کیا تھا) مگر ان میں سے کسی نے بھی ”افسانہ غرائیق“ بیان نہیں کیا۔

سنن نسائی اور مسند احمد کے مطابق حضرت مطلب بن ابی وداعہؓ بیان کرتے ہیں کہ: جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ نجم پڑھ کر سجدہ فرمایا اور سب حاضرین آپ کے ساتھ سجدہ میں گر گئے تو میں نے سجدہ نہ کیا اور اسی کی تلاوت میں اس طرح کرتا ہوں کہ اس سورۃ کی تلاوت کے وقت سجدہ کبھی نہیں چھوڑتا۔

امام طبری کی قصہ غرائیق سے متعلق ۱۵ روایات میں سے تین روایات کی سند میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا نام آیا ہے۔ سند مع متن ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ حدثني علي قال: ثنا عبد الله، قال: ثنا معاوية، عن علي، عن ابن عباس، قوله: ”إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ“ يقول: إذا حدث ألقى الشيطان في حديثه“ (تفسير الطبري المجلد التاسع ص ۱۷۷- تحت رقم ۲۵۳۳۶- طبع بيروت)..... حضرت عبداللہ بن عباسؓ اللہ تعالیٰ کے اس قول کہ: ”جب اس نے تمنا کی تو شیطان نے اس کی تمنا میں (کچھ) ڈال دیا“ کے تحت فرماتے ہیں:

جب آپ نے کلام فرمایا تو شیطان نے آپ کے کلام میں کچھ ڈال دیا۔

۲۔ كما حدثني علي قال: ثنا عبد الله، قال: ثنا معاوية، عن علي، عن ابن عباس: ”فَيَسْخُطُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ“ فيبطل الله ما ألقى الشيطان۔ (حوالہ مذکور ص ۱۷۸- تحت رقم ۲۵۳۳۰)

حضرت ابن عباسؓ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ”پس جو کچھ شیطان ڈالتا ہے اسے اللہ تعالیٰ مٹا دیتا ہے“ کے تحت فرماتے ہیں:

جو کچھ شیطان (نبی کی زبان پر) القاء کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے باطل ٹھہرا دیتے ہیں۔

۳۔ حدثني محمد بن سعد، قال: ثني أبي، قال: ثني عمي، قال: ثني أبي، عن أبيه عن ابن عباس، قوله: ”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ“

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟

إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ۔“ إلى قوله: ”وَاللَّهُ عَلَيْكُمْ حَكِيمٌ“۔ وذلك أن نبي الله بينما هو يصلي إذ نزلت عليه قصة آلهة العرب، فجعل يتلوها فسمعه المشركون، فقالوا: إنا نسمعه يذكر آلهتنا بخير، فلقنوا منه، فبينما هو يتلوها وهو يقول: ”أَفَرَأَيْتُمْ الْأَلَتِ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ“ (النجم ۱۹- ۲۰) ألقى الشيطان: ”ان تلك الغرائيق العلى، منها الشفاعة ترتجي“، فجعل يتلوها، فنزل جبرئيل عليه السلام، فنسخها، ثم قال له: ”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ.....“ (حوالہ مذکور ص ۱۷۷- تحت رقم ۲۵۳۳۳)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے جب ان پر مشرکین عرب کے معبودوں (لات، عزی، منات) کا قصہ نازل ہوا، پس آپ نے تلاوت شروع کر دی تو مشرکوں نے اسے سنا تو کہنے لگے کہ ہم سن رہے ہیں کہ نبی ہمارے معبودوں کا عہد پیرائے میں ذکر کر رہے ہیں، پس وہ آپ کے قریب ہو گئے، پس آپ ان کے درمیان اس قصہ کی تلاوت کرتے رہے اور جب آپ ”أَفَرَأَيْتُمْ الْأَلَتِ...“ پڑھتے تو اس وقت شیطان آپ کو یہ کلمات القاء کرویتا ”تلك الغرائيق العلى...“ تو آپ ان شریک کلمات کی بھی تلاوت کرتے۔ پس جبریلؑ آئے انہوں نے اسے منسوخ کر دیا پھر سورۃ الحج آیت ۵۲ پیش کی۔

اس روایت کے سلسلہ سند پر بحث پیچھے گزر چکی ہے، طبری نے کہا مجھ سے محمد بن سعد نے یہ روایت بیان کی، اس (محمد) نے کہا مجھ سے میرے باپ (سعد) نے، سعد نے کہا مجھ سے میرے چچا (حسین) نے، سعد کے چچا نے کہا مجھ سے میرے باپ (الحسن) نے، سعد کے چچا کے باپ (الحسن) جو سعد کے دادا ہیں اپنے باپ (عطیہ عوفی جو سعد کے پردادا ہیں) سے روایت کرتے ہیں۔ یہ سارا سلسلہ ہی کذابوں پر مبنی ہے۔

یہاں زیر بحث عنوان کے تحت تفسیر طبری سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایات پیش کرنے کا مقصد قارئین کرام کو یہ بتانا ہے کہ ان روایات میں ”قصہ غرائیق“ کا تو ذکر ہے

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟

لیکن سجدے کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے برعکس صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت قصہ غرائیق سے پاک ہے لیکن ”سجدہ“ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یہاں اسی روایت کا تجزیہ کرنا مقصود ہے۔

... عن عكرمة عن ابن عباس أن النبي صلى الله عليه وسلم سجد بالنجم و سجد معه المسلمون والمشركون والجن والانس۔

(صحیح بخاری۔ کتاب سجود القرآن۔ باب سجود المسلمین والمشرکین والمشرک نجس لیس له وضوء۔ رقم الحدیث ۱۰۷۱۔ کتاب التفسیر۔ سورۃ النجم باب قوله: ”فَأَسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا“۔ رقم الحدیث ۴۸۶۲)۔

... حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ النجم میں سجدہ کیا اور آپؐ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں، جنوں اور انسانوں نے بھی سجدہ کیا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ موقع کے کواہ نہیں ہیں وہ ہجرت سے تین سال پہلے پیدا ہوئے جبکہ یہ واقعہ ان کی ولادت سے پانچ سال پہلے ۱۵ نبوی کا بتایا جاتا ہے۔ سخت حیرت ہے کہ اتنے اہم واقعہ کو موصوف کے علاوہ کبار و صغارا صحابہؓ میں سے کسی نے بھی بیان نہیں کیا۔ اگر بالفرض ابن عباسؓ نے ”سجدہ“ کی بات اہل مکہ سے سن کر بیان کی تو پھر مذکورہ روایت کو ”وسجد معہ المسلمون والمشرکون“ پر ختم ہو جانا چاہئے تھا مگر انہوں نے اس کے ساتھ ”والجن والانس“ کا بھی اضافہ کیا۔ اگر ”انس“ سے مراد موقع پر موجود مسلمان اور مشرک ہی ہیں تو پھر الگ سے اس کے ذکر کی کوئی ضرورت نہ تھی یا ہو سکتا ہے کہ بعد میں جس جس نے اس واقعہ کے متعلق سنا ہو تو اس نے بھی ”غائبانہ“ سجدہ کرنے کی سعادت حاصل کر لی ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کو ”جنوں“ کے سجدہ کرنے کی اطلاع کیوں کر ہوئی؟ ظاہر ہے کہ یہ ”مبالغہ“ حضرت ابن عباسؓ سے مروی نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہ کسی نیچے کے راوی کی کارستانی ہے۔

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟

دوسری اہم بات یہ ہے کہ موقع پر موجود مطلب بن ابی وداعہؓ (جو بعد میں اسلام لائے تھے) کی روایت پیچھے گزر چکی ہے۔ اس میں بھی اس کا ذکر نہیں پایا جاتا، ان کے علاوہ موقع پر موجود ایک دوسرے یعنی شاہد جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کے مذکورہ الفاظ کی تصدیق نہیں ہوتی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت صحیح بخاری میں ہی پانچ مختلف مقامات پر بیان ہوئی ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

”أَوَّلُ سُورَةِ أَنْزَلَتْ فِيهَا سَجْدَةٌ النجم قال: فسجد رسول الله صلى الله عليه وسلم وسجد من خلفه ألا رجل رأيته أخذ كفًا من تراب فسجد عليه فرأيت بعد ذلك قتل كافرًا وهو أمية بن خلف“ (صحیح بخاری کتاب التفسیر۔ سورۃ النجم۔ رقم الحدیث ۴۸۶۳)

دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

”عن عبدالله (بن مسعود) عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قرأ والنجم فسجد بها وسجد من معه غير أن شيخاً أخذ كفًا من تراب فرقعته إلى جبهته فقال: يكفيني هذا۔ قال عبدالله فلقدرأيت بعد قتل كافرًا“

(حوالہ مذکور کتاب المغازی۔ باب قتل ابی جہل رقم الحدیث ۳۹۷۲)

تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

”قرأ النبي صلى الله عليه وسلم النجم فسجد فما بقي أحد إلا سجد ألا رجل رأيته أخذ كفًا من حصاً فرقعته فسجد عليه وقال: هذا يكفيني فلقدرأيت بعد قتل كافرًا بالله“ (حوالہ مذکور کتاب مناقب الانصار باب ذكر ما لقي النبي صلى الله عليه وسلم وأصحابه من المشرکین بمكة۔ رقم الحدیث ۳۸۵۳)

چوتھی روایت کا متن یہ ہے:

”أن النبي صلى الله عليه وسلم قرأ سورة النجم فسجد بها فما بقي أحد من القوم إلا سجد فأخذ رجل من القوم كفًا من حصي أو تراب فرقعته إلى

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟

وجہہ وقال یکفینی هذا قال عبد اللہ فلقد رأیتہ بعد قتل کافراً“ (حوالہ مذکور کتاب سجود القرآن۔ باب سجدة النجم۔ رقم الحدیث ۱۰۷۰)

پانچویں روایت کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

”قرأ النبی النجم بمکة فسجد فیہا و سجد من معہ غیر شیخ أخذ کفاً من حصی أو تراب فرقعہ إلی جہتہ وقال یکفینی هذا فرأیتہ بعد قتل کافراً“ (حوالہ مذکور باب ماجاء فی سجود القرآن و سنتہا۔ رقم الحدیث ۱۰۶۷)

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں: سب سے پہلے جو سجدے والی سورت مازل ہوئی وہ سورۃ ”والنجم“ تھی۔ راوی فرماتے ہیں: پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت میں سجدہ کیا اور آپ کے پیچھے جتنے لوگ بیٹھے تھے سب نے سجدہ کیا مگر ایک شخص (امیہ بن خلف) نے مٹھی بھر مٹی اٹھائی (ما تھے سے لگا کر) اس پر سجدہ کیا۔ میں نے دیکھا اس کے بعد کفر کی حالت میں (جنگ بدر میں) مارا گیا۔

بغیر الفاظ یہی مفہوم دوسری روایات میں بھی بیان ہوا ہے۔

موقع پر موجود یعنی شاہد صحابی رسول کے بیان کی مذکورہ پانچوں روایات میں نہ صرف یہ کہ حضرت ابن عباسؓ والا اضافہ ”والجن والانس“ نہیں ہے بلکہ سرے سے ”المسلمون والمشرکون“ سمیت پوری روایت کے الفاظ ہی نہیں پائے جاتے۔

حضرت ابن عباسؓ کی صحیح بخاری میں منقول دونوں روایتوں کے الفاظ ”وسجد معہ المسلمون والمشرکون والجن والانس“ ایک جیسے ہیں۔ اس روایت کی رو سے ان علماء کرام نے جو ”قصہ غرائیق“ کو لغو، باطل اور زنا و قد کا وضع کردہ خیال کرتے ہیں انہوں نے اس بات کو قصہ غرائیق کی ”اصل“ قرار دیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوں کی کوئی مدح نہیں فرمائی تھی مشرکین نے قرآن کی عظمت یا اللہ تعالیٰ کی ”عجلی قاہری“ نمودار ہونے کی بناء پر سجدہ کیا تھا۔ مگر یعنی شاہد کے بیان میں سرے سے ”مشرکین اور جن و انس“ کے الفاظ ہی نہیں ہیں جس سے اس ”خیال“ کو تقویت ملتی ہے کہ نہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شریکۃ الفاظ

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟

کہے اور نہ ہی مشرکوں نے خوش ہو کر یا قرآن کی عظمت سے متاثر ہو کر سجدہ کیا تھا۔ پھر یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ موقع پر موجود مشرکین میں سے صرف امیہ بن خلف نے سجدہ نہیں کیا تھا۔ پیچھے حضرت مطلب بن ابی وادعہ کا ذکر گزر چکا ہے۔ انہوں نے اس وقت اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ مگر سجدہ بھی نہیں کیا تھا۔

بعض علماء کرام کی امیہ بن خلف کے حوالے سے یہ توضیح بھی محل نظر ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ سجدہ کرنا چاہتا تھا لیکن بڑھاپے کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکا بس ایک مٹھی مٹی یا کنکریوں کی اٹھا کر پیشانی یا چہرے پر مل لی تھی جسے سجدے کا ”قائم مقام“ قرار دے دیا گیا۔ معلوم نہیں جو شخص کی دور میں بڑھاپے کی بناء پر سجدہ کرنے سے معذور ہو وہ مدنی دور میں مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے مکہ سے طویل مسافت طے کر کے ”بدر“ کے میدان میں کیسے پہنچ گیا جہاں وہ حالت کفر میں ہی مارا گیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مذکورہ پانچ روایتوں میں سے پہلی روایت میں: ”وسجد من خلفہ الآخر رجل رأیتہ أخذ کفاً من تراب.....“

دوسری روایت میں: ”وسجد من معہ غیر أن شیخاً أخذ کفاً من تراب“

پانچویں روایت میں: ”وسجد من معہ غیر أن شیخاً أخذ کفاً من حصی“

تیسری روایت میں: ”فسجد فما بقی أحد ألا سجد ألا رجل رأیتہ أخذ کفاً من حصاً.....“

چوتھی روایت میں: ”فسجد بها فما بقی أحد من القوم ألا سجد فأخذ رجل من القوم کفاً من حصی أو تراب.....“

پہلی تین روایتوں میں ”من خلفہ“ اور ”من معہ“ سے صحابہ کرامؓ ہی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ مشرک آپ کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔

جہاں تک ”من معہ“ کا تعلق ہے تو اس سے بھی صحابہ کرامؓ ہی مراد ہیں۔

”محمدرسول اللہ والذین معہ“ اور ”طائفة من الذین معک“ کے تحت

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟

”ومن خلفه، ومن معه“ پر بھی غور کر لیا جائے۔

مذکورہ پانچوں روایتوں میں ”مشرکوں اور جن و انس“ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ ”ومن خلفه، ومن معه، ومن القوم“ سے صرف ایک شخص کو ”ألا رجل، أن شيعاً، رجل من القوم“ سے امیہ بن خلف کی تصریح کے ساتھ مستثنیٰ کر کے آگے چل کر اس کا انجام بد بھی بتا دیا گیا۔

علاوہ ازیں صرف اسی ایک کے ”سجدے“ کو مسلمانوں کے سجدے سے ممتاز کر کے پیش کیا گیا کہ اس نے مٹھی بھرٹی یا کنکریوں کی لے کر اپنی پیٹھانی یا اپنے چہرے کی طرف بلند کی ”فرقعہ إلى جبهته“، ”فرقعہ إلى وجهه“ کیا اس طرح کے ”فعل“ پر ”سجدے“ کا اطلاق ہو سکتا ہے؟

دوسری طرف جس انداز سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کے سجدے کا ذکر کیا گیا ہے کیا اس میں مشرکوں کے ”سجدے“ کی بھی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے؟ فلیتدبر۔
”فسجد رسول الله صلى الله عليه وسلم وسجد من خلفه، فسجد (النبي) بها وسجد من معه، قرأ النبي النجم بمكة فسجد فيها وسجد من معه.....“

یہاں ”سجدہ“ کے حوالے سے کسی کے قول کی تردید یا تعلیل قطعاً مقصود نہیں ہے۔ یہ بحث علماء کرام کے اس قول کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ بعض نے سجدے کا سبب تجلی قاہری اور عظمت قرآن بتایا ہے۔ جبکہ قصہ غرائیق کو صحیح سمجھنے والوں نے مشرکوں کے سجدہ کو اپنے معبودوں کی تعریف کے ساتھ خاص کیا ہے۔

دوسری طرف صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ (جو واقعہ غرائیق اور ”سجدہ“ کے پانچ برس بعد پیدا ہوئے تھے) کی روایت میں مبالغہ ہے جبکہ سورۃ نجم کی تلاوت اور سجدہ کے موقع پر موجود جلیل القدر صحابی (جو واقعہ کے عینی گواہ ہیں) یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی پانچوں روایتوں میں ”مشرکین اور جن و انس“ کی کوئی تصریح نہیں پائی جاتی اور انہوں نے ”کسی روایت میں بھی“ سجدا المسلمون والمشرکون والجن والانس“ نہیں کہا۔

امام طبری۔۔۔ کون؟

افسانہ غرائیق کی ”اصل“ کیا ہے؟

سوال یہ ہے کہ اس اختلاف کے وقت کس کی روایت کو ترجیح حاصل ہوگی۔ یعنی شاہد کی روایت کو یا وقوعہ کے پانچ برس بعد پیدا ہونے والے کی روایت کو جبکہ دونوں روایات صحیح بخاری میں موجود ہیں؟

بہر حال حافظ ابن حجر عسقلانی نے جملہ ”روایات غرائیق“ میں ضعف، ارسال اور انقطاع کے اعتراف و اقرار کے باوجود محض کثرت طرق سے اس قصہ کی ”اصل“ معلوم کی۔ جبکہ دوسری طرف جمہور علماء اسلام نے قصہ غرائیق کا انکار کرتے ہوئے مشرکین کے سجدے کو قرآن کی عظمت و تاثیر میں اس کی ”اصل“ کو تلاش کر لیا۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایات سے یہ رائے بھی اخذ کی جاسکتی ہے کہ مشرکوں نے اس موقع پر سجدہ کیا ہی نہیں تھا جسے اس واقعہ کی ”اصل“ قرار دیا جاتا اور جس طرح کا سجدہ امیہ بن خلف نے کیا تھا تو دنیا کی کسی ”لغت“ میں بھی اس پر ”سجدہ“ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔
بہر حال اس واقعہ کی کوئی ”اصل“ ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا جبکہ قصہ غرائیق کو صحیح سمجھنے سے لاریب ایمان سے ہی محروم ہونا پڑتا ہے کیونکہ وہ سراسر عصمت مصطفیٰ کے منافی، نصوص قرآنیہ کے یکسر خلاف اور مبنی بر توہین ہے۔

تفسیر طبری اور قصہ زید و زینبؓ

”وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ ۖ فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا“ (سورۃ الاحزاب آیت ۳۷)

”اور یا دیکھئے جب آپ نے فرمایا اس شخص کو جس پر اللہ نے بھی احسان فرمایا اور آپ نے بھی احسان فرمایا، اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور اللہ سے ڈر اور آپ مخفی رکھے ہوئے تھے اپنے جی میں وہ بات جسے اللہ ظاہر فرمانے والا تھا اور آپ کو اندیشہ تھا لوگوں (کے طعن و تشنیع) کا حال تاکہ اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس سے ڈریں۔

پھر جب پوری کر لی زید نے اسے طلاق دینے کی خواہش تو ہم نے اس کا آپ سے نکاح کر دیا تاکہ (اس عملی سنت کے بعد) ایمان والوں پر کوئی حرج نہ ہو اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں جب وہ انہیں طلاق دینے کا وعدہ پورا کر لیں اور اللہ کا حکم تو ہر حال میں ہو کر رہتا ہے۔ ”وَطَرًا“ کے معنی: خواہش، ضرورت اور حاجت کے ہیں۔ لہذا قضائے وطر کے معنی: حاجت کا پورا کر لینا ہوئے۔ یہاں مراد قطع تعلق اور طلاق ہے۔ اسی ”مراد“ کا لحاظ رکھتے ہوئے اوپر آیت کا ترجمہ کیا گیا ہے جو ”متن“ کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل آگے اپنے مقام پر آئے گی۔

امام طبری سورۃ الاحزاب آیت ۳۷ ”أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ“ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہ آیت حضرت زیدؓ کی بیوی سیدہ زینب بنت جحشؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو وہ انہیں پسند آ گئی۔ ”راہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فأعجبته“ پس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ان کی محبت کے آنے سے حضرت زیدؓ کے دل میں ان کی کراہت واقع ہو گئی لہذا حضرت زیدؓ نے انہیں طلاق دینے کا ارادہ کر کے اس کا ذکر خود آپ سے کر دیا تو آپ نے فرمایا:

”أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ“ اپنی بیوی کو اپنے نکاح میں روکے رکھو جبکہ دل میں یہ خواہش لئے ہوئے تھے کہ زیدؓ، زینبؓ کو طلاق دے دیں تاکہ وہ خود ان سے نکاح کر لیں۔ ”وہو یحب أن تكون قد بانت منه ینکحها“

امام طبری دوسری روایت میں ”وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ“ کے تحت فرماتے ہیں: ”وكان يخفي في نفسه وذاته طلقها“ اور آپ اپنے دل میں اس خواہش کو چھپا رہے تھے کہ زیدؓ انہیں طلاق دے دیں۔ (تفسیر الطبری المجلد العاشر ص ۳۰۲ تحت رقم ۲۸۵۱۸)

اس کے بعد موصوف یونس بن ابی وجب عن ابن زید کی سند سے یہ روایت لائے ہیں کہ: ”وكان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد زوج زید بن حارثة، زینب بنت جحش، ابنة عمته، فخرج رسول الله صلى الله عليه وسلم يوما يريدہ و علی الباب ستر من شعر، فرفعت الريح الست فأنكشف، وهي فی حجرتها حاسرة، فوقع إعجابها فی قلب النبی صلی الله عليه وسلم فلما وقع ذلك كرهت إلی الآخر، فجاء فقال: یا رسول الله إني أريد أن أفارق صاحبتي، قال: مالك، أراك منها شيء؟ قال: لا، والله ما رايتي منها شيء یا رسول الله، ولا رأيت إلا خيرا، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: ”أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ.....“ تخفي في نفسك إن فارقها تزوجتها۔“ (حوالہ مذکور تحت رقم ۲۸۵۱۹)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہؓ کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن سیدہ زینبؓ کے ساتھ فرمائی۔ ایک دن آپ زیدؓ سے ملنے کے لئے ان کے گھر گئے، دروازے پر اوئی پردہ پڑا تھا، ہوا سے پردہ اٹھ گیا اور وہ کھل گیا۔ زینبؓ جو اپنے کمرے میں برہنہ سر اور بے دھیانی کے عالم میں

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور قصہ زید و زینبؓ

بیٹھی تھیں تو ان کی خواہش تھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں جاگزیں ہوگئی اور کھب گئی جب یہ چیز واقع ہوئی تو سیدہ زینبؓ حضرت زیدؓ کے لئے ناپسندیدہ ہوگئی۔

پس زیدؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: یا رسول اللہ! میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں۔ آپؐ نے پوچھا کیوں، کیا ان کی طرف سے بدگمان ہو؟ زیدؓ نے کہا: جی نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ اللہ کی قسم! میں نے سوائے خیر کے اور کوئی بات ان کے متعلق نہیں دیکھی۔ آپؐ نے ان سے فرمایا: اپنی بیوی کو اپنے نکاح میں روکے رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو..... آپؐ اپنے دل میں اس بات کو چھپا رہے تھے کہ اگر زیدؓ انہیں طلاق دیدے تو میں ان سے نکاح کر لوں۔

امام طبری نے اسی سند کے ساتھ یہ روایت اپنی تاریخ میں بھی نقل کی ہے بلکہ ایک دوسری سند کے ساتھ یہ واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ:

”حدثت عن محمد بن عمر قال حدثني عبد الله بن عامر الاسلمي عن محمد بن يحيى بن حبان قال:

جاء رسول الله صلى الله عليه وسلم بيت زيد بن حارثة و كان زيد اتما يقال له زيد بن محمد رما فقلده رسول الله صلى الله عليه وسلم الساعة فيقول أين زيد فجاء منزله يطلبه، فلم يجده، وقامت اليه زينب بنت جحش زوجته فضلا، فأعرض عنها رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقالت: ليس هو هاهنا يا رسول الله فادخل بأبي أنت و أمي، فأبى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يدخل، و اتما عجلت زينب أن تلبس ان قبل لها رسول الله صلى الله عليه وسلم على الباب، فوثب عجلة فأعجبت رسول الله صلى الله عليه وسلم، فولى و هو يهيمهم بشئ لا يكاد يفهم ألا أنه أعلن: ”سبحان الله العظيم، سبحان الله مصرف القلوب“

قال فجاء زيد إلى منزله، فأخبرته امرأته أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أتى منزله، فقال زيد: ألا قلت له ادخل، فقالت: قد عرضت عليه ذلك

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور قصہ زید و زینبؓ

فأبى، قال: فسمعتيه يقول شيئاً، قالت: سمعته يقول حين ولى ”سبحان الله العظيم، سبحان الله مصرف القلوب“

فخرج زيد حتى أتى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال يا رسول الله بلغني أنك جئت منزلي فهلا دخلت بأبي أنت امي يا رسول الله،

يا رسول الله لعل زينب أعجبتك فأفارقها، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ”أفيسك عليك رَوْحُكَ“ فما استطاع زيد إليها سبيلا بعد ذلك اليوم... (تاريخ الامم والملوك الجزء الثاني طبع بيروت ص ۲۳۱ - تحت ثم كانت السنة الخامسة من الهجرة)

امام طبری کہتے ہیں کہ مجھے محمد بن عمر کی روایت سے یہ بتایا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن زید بن حارثہ کے گھر آئے، ان کو زید بن محمد کہا جاتا تھا آپؐ ان کی تلاش میں ان کے گھر آئے وہ اس وقت موجود نہ تھے، ان کی بیوی زینب بنت جحشؓ ہلکا سا لباس پہنے آپؐ کے سامنے آئیں۔ آپؐ نے دیکھ کر منہ پھیر لیا اور زینبؓ نے آپؐ سے کہا: وہ تو اس وقت یہاں نہیں ہیں۔ میرے ماں باپ آپؐ پر ثار، آپؐ اندر تشریف لائیں، مگر آپؐ نے اندر جانے سے انکار کر دیا۔

واقعہ یہ ہوا تھا کہ جب زینبؓ سے کہا گیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہر دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے جلدی میں کپڑے پہنے اور پوری طرح نہیں پہنے تھے کہ آپؐ کے سامنے آ گئیں تو ان کی صورت آپؐ کے دل میں کھب گئی اور آپؐ منہ میں کچھ کہتے ہوئے وہاں سے پلٹے اور کوئی الفاظ تو سمجھ میں نہیں آئے۔ البتہ یہ آپؐ نے قدرے بلند آواز میں فرمایا: ”سبحان الله العظيم، سبحان الله مصرف القلوب“ پاک ہے اللہ بزرگ، پاک ہے اللہ دلوں کا پھیرنے والا۔ زید جب اپنے گھر آئے، ان کی بیوی نے ان کو اطلاع دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔ انہوں نے کہا: آپؐ نے اندر کیوں نہ بلایا؟ بیوی نے کہا: میں نے یہ بات عرض کی تھی مگر آپؐ نے نہ مانا۔ زیدؓ نے

پوچھا: آپ کو کچھ فرماتے ہوئے سنا؟ کہا: جی ہاں۔ جب آپ واپس جانے لگے تو آپ نے ”سبحان اللہ العظیم، سبحان اللہ مصرف القلوب“ کہا تھا۔ یعنی پاک ہے اللہ جو عظیم ہے، پاک ہے اللہ جو دلوں کو پھیرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ یہ سن کر زید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: مجھے معلوم ہوا کہ آپ میرے گھر پر تشریف لائے تھے۔ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ گھر کے اندر کیوں نہ گئے؟ ”یا رسول اللہ لعل زینب أعجبتك فأفارقها“ اے اللہ کے رسول! شاید زینب آپ کو پسند آگئی ہیں میں اسے طلاق دیتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اپنی بیوی کو اپنے نکاح میں روکے رکھو۔ مگر اس روز کے بعد زید اپنی بیوی پر قادر نہ ہو سکے۔

امام جلال الدین محلی زیر بحث آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”قَزَوْجَهَا النَّبِيُّ لَزِيدَ ثُمَّ وَقَعَ بَصْرُهُ عَلَيْهَا بَعْدَ حِينَ قَوْعِ فِي نَفْسِهِ حُبُّهَا وَ قِي نَفْسِ زَيْدٍ كَرَاهَتُهَا ثُمَّ قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُرِيدُ فِرَاقَهَا فَقَالَ... ”أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ (فی امر طلاقها) وَ تَخَفِ فِی قِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ“ مظهرہ من محبتہا وان لو فارقہا زید تَزَوَّجْتُهَا“ (تفسیر جلالین ص ۳۸۱)

(حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور ان کی بہن سیدہ زینبؓ کی رضا حاصل کرنے کے بعد) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ زینبؓ کا نکاح حضرت زیدؓ کے ساتھ کرادیا۔ پھر اس کے کچھ عرصہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ سیدہ زینبؓ پر پڑی تو آپؐ کے دل میں ان کی محبت واقع ہوگئی جبکہ زیدؓ کے دل میں ان کی ناپسندیدگی آگئی۔ پھر انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں زینبؓ کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ تو آپؐ نے فرمایا: اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو اور اسے طلاق دینے کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ زیدؓ کو یہ ہدایت دیتے وقت) آپؐ اپنے دل میں اس بات کو چھپا رہے تھے جس کو اللہ ظاہر فرمانے والا تھا۔ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیدہ زینبؓ سے ”محبت“ کو ظاہر فرمانے والا تھا نیز یہ کہ اگر زیدؓ اسے طلاق دے دیں تو پھر میں اس سے نکاح کر لوں۔

یہی وہ واقعہ ہے جسے تاریخ طبری میں پڑھنے کے بعد جذبہ ”حُب النبیؐ“ سے سرشار پاکستان کے ایک ممتاز صحافی جناب اوریا مقبول جان نے ایک ہی قسط میں ”ہمارے افسانہ ساز مؤرخین“ کے عنوان سے روزنامہ ایکسپریس (۷ جولائی ۲۰۱۵ء کی اشاعت میں) میں ایک کالم لکھا جس میں ”تاریخ طبری“ کا یوں تعارف کرایا کہ:

”جس کتاب کو بازاری قصوں کی کتاب ہونا چاہئے تھی اسے مستند ترین تاریخ سمجھ کر یورپ نے پیش کیا۔ طبری عام مسلمانوں کی بات کرتا تو برداشت تھا لیکن اس نے تو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے بارے میں بھی دو عدد من گھڑت قصے اس قدر فضول اور بیہودہ انداز میں تحریر کئے ہیں کہ انہیں درج کرنے کی بھی ہمت نہیں پاتا۔“

موصوف کے اس کالم کا جواب روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار مولانا محمد اسماعیل رحمان نے ”علامہ طبری۔ مؤرخ، مجتہد یا افسانہ ساز“ (پانچ اقساط) اور ”احتیاط لازم ہے“ (چار اقساط) کے عنوانات سے دیا۔ جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے بارے میں بے ہودہ قصے نقل کئے گئے اور امام طبری کا نہ صرف دفاع کیا گیا بلکہ اوریا مقبول جان سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ:

”اگر میری باتوں میں انہیں کوئی وزن محسوس ہو تو عشق رسالت ہی کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی رائے سے رجوع کریں۔ شریعت یہی حکم دیتی ہے کہ جو غلطی علانیہ ہو، اس سے رجوع بھی علانیہ ہونا چاہیے۔ ایک جلیل القدر عالم (طبری) کی اہانت، کوئی معمولی بات نہیں، (صرف انبیاء و صحابہؓ کی اہانت معمولی بات ہے؟ از: مؤلف) آخرت میں اس پر شدید پکڑ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ حرکت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی نہیں سخت ناراضی کا باعث بن سکتی ہے۔ (روزنامہ اسلام ۱۲- اگست ۲۰۱۵ء تحت ”احتیاط لازم ہے“ قسط نمبر ۴)

امام طبری و امثالہ کی انبیاء کرامؓ اور حضرات صحابہؓ کی شان میں توہین آمیز عبارات کی نشاندہی اور ان سے برأت کا اعلان کرنے والے ہرگز ہرگز ”ماخوذ“ نہیں ہوں گے بلکہ یقیناً ”ماجور“ ہوں گے البتہ ان توہین آمیز روایات کے واضعین، (بلا جرح و نقد) ناقلین اور ان کا دفاع کرنے والے ضرور ”ماخوذ“ ہوں گے۔ اس لئے فاضل کالم نگار اور

روزنامہ اسلام کی ”انتظامیہ“ کی خدمت میں ایک یہی خواہ، ہمدرد اور ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ استدعا ہے کہ ”وہ اپنی رائے سے رجوع کریں۔ شریعت یہی حکم دیتی ہے کہ جو غلطی علانیہ ہو، اس سے رجوع بھی علانیہ ہونا چاہئے۔ انبیاء کرامؑ اور حضرات صحابہؓ کی اہانت اور اس کا دفاع پھر اس اہانت پر تاویلات بعیدہ، فاسدہ و باطلہ کے رڈے چڑھانا کوئی معمولی بات نہیں، آخرت میں اللہ کی شدید پکڑ اور سخت ناراضی کا باعث بن سکتی ہے۔“

فاضل کالم نگار نے ”دعوت رجوع“ کے فوراً بعد، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کی تحریر کا ایک ٹکڑا (جس میں موبہن علماء کو امت محمدیہ سے خارج ”قرار“ دیا گیا ہے) غور سے پڑھنے پر زور دیا ہے۔ اگر شیخ الحدیث صاحب کی علامہ منذری کی کتاب ”ترغیب“ سے پیش کردہ روایت کی رو سے امام طبری و امثالہ کی منقولہ و مکتوبہ روایات سے برأت کرنے والوں کو گستاخ و موبہن علماء قرار دے کر خارج از امت محمدیہ قرار دیا جاسکتا ہے تو پھر ان لوگوں کا کیا انجام ہوگا جو انبیاء کرامؑ اور حضرات صحابہؓ کی شدید ترین توہین پر مبنی روایات وضع کرتے ہوں یا انہیں صحیح سمجھ کر بلا کسی نقد و جرح کے نقل کرتے ہوں یا ان کا کسی بھی درجے میں دفاع کرتے ہوں۔ اس کے تصور سے بھی روٹ گئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کا حکم ”ترغیب“ کی روایت میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں تلاش کریں:

”... اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ“ (سورۃ الحجرات آیت ۲) (اس

بے ادبی سے) کہیں ضائع نہ ہو جائیں تمہارے اعمال اور تمہیں خبر تک نہ ہو۔

یعنی اگر تم سے آواز اونچا کرنے کی بے ادبی ہو گئی تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ تمہارے سارے اعمال برباد ہو جائیں گے۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہاں اولاً اور بالذات خطاب صحابہ کرامؓ سے ہو رہا ہے جن کا ایثار بے نظیر، جن کی قربانیاں بے مثال، جن کی عبادتیں خشوع و خضوع میں ڈوبی ہوئی تھیں اور جو سرتاپا تسلیم و رضا تھے۔ انہیں کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نے میرے پیارے نبیؐ کی جناب میں آواز بھی اونچی کی تو یہ ایسی گستاخی تصور ہوگی کہ تمہاری سب نیکیاں ملیا میٹ ہو جائیں گی۔ ”وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ“ کے جملہ میں گستاخانہ انبیاء کی اس

محرربی و بد نصیبی کا بیان ہے۔ اس کو سن کر یا پڑھ کر بھی اگر علم و زہد کا شمار نہ اترے، فضیلت و پارسائی کا طلسم اگر نہ ٹوٹے تو بد قسمتی کی انتہاء ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ تمہارے سارے اعمال غارت ہو جائیں گے، سب نیکیاں ملیا میٹ ہو جائیں گی اور تمہیں ”شعور“ تک نہ ہوگا۔

”شعور و احساس“ اس وقت ہوتا ہے جب انسان یہ سمجھے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی نافرمانی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ غور کیجئے کہ یہاں آپؐ کی کسی نافرمانی اور معصیت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا بلکہ مجرد سوئے ادب کی وجہ سے سارے اعمال کے جھٹ ہو جانے کی وعید سنائی جا رہی ہے۔ آپؐ کی نافرمانی، حکم عدولی اور معصیت کا ارتکاب یا آپؐ کی زبان پر شیطان کا ”تَلْكَ الْغَرَاتِيقُ الْعَلِيّ۔ اِنْ شَفَاعَتِهِمْ لَتَرْجِي“ جیسے شرکیہ کلمات کا جاری کر دینا اور آپؐ کا دوسرے کی بیوی پر نگاہ پڑنے سے اس کی محبت میں مبتلا ہو جانا، بے ظاہر طلاق کا مشورہ دینا اور بے باطن اس محبت کی بناء پر یہ خواہش رکھنا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے تاکہ میں خود اس سے نکاح کر لوں وغیرہ الزامات کی نسبت تو بڑی دور کی بات ہے، اس کے عظیم ترین جرم اور توہین و گستاخی ہونے میں کوئی مومن بالقرآن کلام نہیں کر سکتا مگر محلولہ بالا آیت میں تو ”رَفْعُ صَوْتٍ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ“ کے ”سوء ادب“ پر ”جھٹ اعمال“ کی وعید سنائی گئی ہے کہ محض آپؐ کی آواز پر آواز بلند کرنے سے تمام کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا، سب اعمال اکارت اور سب نیکیاں برباد ہو جائیں گی اور تمہیں شعور تک نہ ہوگا کہ تم نے اس بے احتیاطی سے کیا کچھ کھو دیا۔ تم کیسے نقصان اور خسارے سے دوچار ہو گئے اس لئے کہ تم اس غلط فہمی اور مغالطہ میں رہو گے کہ تم ”بڑے مفسر ہو، تم بڑے محدث ہو، تم بڑے فقیہ ہو، تم بڑے مجتہد ہو، بڑے مؤرخ ہو، بڑے علامہ ہو، بڑے کالم نگار ہو، بڑے نمازی و غازی ہو، صائم الدھر اور قائم اللیل ہو مگر روز قیامت تمہیں پتہ چلے گا کہ ”اعمال“ کا جو باغ تم نے لگایا تھا اسے تو بے ادبی و استہزاء اور توہین و گستاخی کی باجھڑی نے خاک سیاہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ عاذا اللہ منہ

یہ روایت ”سوء ادب“ پر ہی مشتمل نہیں بلکہ اس میں ایذائے رسول بھی پائی جاتی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے کہ:

”إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرُسُلَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا“ (الاحزاب ۵۷) بے شک جو لوگ ایذا پہنچاتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اس نے تیار کر رکھا ہے ان کے لئے رسوا کن عذاب۔

اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

”وَمِنْهُمْ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ... وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ“ (التوبہ ۶۱) اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جو اذیت دیتے ہیں نبی کو اور کہتے ہیں: یہ کانوں کا کچا ہے... اور جو لوگ دکھ پہنچاتے ہیں اللہ کے رسول کو ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

کیا یہ جملہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ”اذیت“ کا باعث نہیں ہے کہ زید زید کی محبت آپ کے دل میں کھب گئی تھی؟ اِذْ لَيْسَ فَلَيْسَ۔

روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار نے جناب اوریا صاحب کو ”دعوت رجوع“ دیتے وقت خود بھی رسالت مآب کی طرف ”لا شعوری“ طور پر ایسے گھٹیا لفظ کی اضافت کی ہے جس سے ”سوء ادب“ ہی ٹپکتا ہے یعنی: ”مگر میری باتوں میں انہیں کوئی وزن محسوس ہو تو عشق رسالت ہی کا تقاضا ہے...“ (روزنامہ اسلام ۱۱۲ اگست ۲۰۱۵ء)

مشہور امام لغت ابن فارس بن زکریا الرازی لکھتے ہیں:

”العشيق، الاغرام بالنساء“ (مجلد ۵ ص ۵۲۴۔ طبع بیروت ۱۹۹۲ء) عورتوں پر فریفتہ ہو جانے کا نام عشق ہے۔ مشہور سیرت نگار قاضی محمد سلیمان منصور پوری لکھتے ہیں: قاموس میں ہے: ”الجنون فنون، والعشيق من فنه يستجلبه المرء على نفسه باستحسان بعض الصور والشمال“ یعنی جنون کے بہت سے اقسام میں عشق بھی جنون کی ایک قسم ہے۔ اس مرض کو انسان اپنے نفس پر بعض صورتوں یا خصلتوں کے اچھا سمجھ لینے سے خود وار دکر لیا کرتا ہے۔

پس جب عشق کے معنی قیسے از جنون ہوئے تو ضروری تھا کہ خدا و رسول کے پاک

کلام میں اس لفظ کا استعمال نہ کیا جاتا اور اسے فضائل محمود یا محاسن جمیلہ سے شمار نہ کیا جاتا۔ بے شک قرآن حکیم اور احادیث رسول کریمؐ میں لفظ محبت کا استعمال ہوا ہے اور اس سے ثابت ہو گیا کہ محبت ہی صفت کمال انسانی ہے۔ (سیرت رحمۃ للعالمین جلد دوم ص ۳۲۶)

یہی وجہ ہے کہ لفظ عشق عربی کا ہونے کے باوجود قرآن اور حدیث کے وسیع ذخیرے میں استعمال نہیں ہوا بلکہ ہر جگہ ”حب“ کا لفظ ہی وارد ہوا ہے۔ امام بخاری نے ایک باب کا عنوان ہی یہ قائم کیا ہے کہ: ”باب: حب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من الایمان“ (صحیح بخاری۔ کتاب الایمان...)

حافظ ابن قیم فرماتے ہیں: ”ولا يحفظ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم لفظ العشق في حديث صحيح البتة“ (زاد المعاد جلد ۳ ص ۲۵۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لفظ ”عشق“ کسی صحیح حدیث میں قطعاً محفوظ نہیں۔

یعنی کسی صحیح حدیث میں اس کا ذکر نہیں۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: ”وهو من الامراض التي تفسد دين صاحبه، و عرضه ثم قد تفسد عقله ثم جسمه“ (مجموع الفتاویٰ جلد ۵ ص ۴۳، جلد ۱۰ ص ۱۳۱)

یہ ان امراض میں سے ہے جو آدمی کے دین اور اس کی عزت کو خراب کر دیتے ہیں بلکہ کبھی اس کی عقل اور جسم کو بھی خراب کر دیتے ہیں۔

علامہ ابن ابی العزخانی لکھتے ہیں:

”العشيق: وهو الحب المفرط الذي يخاف على صاحبه منه، ولكن لا يوصف به الرب تعالى ولا العبد في محبة ربه، وإن كان قد أطلقه بعضهم، واختلف في سبب المنع..... ولعل امتناع إطلاقه: أن العشق محبة مع شهوة“ (شرح العقيدة الطحاوية ص ۱۲۴۔ تحقیق الشیخ احمد شاكر)

یعنی عشق اس مبالغہ آمیز محبت کو کہتے ہیں کہ جس کی وجہ سے عاشق کی ہلاکت اور بربادی کا خطرہ لاحق ہو۔ مگر اس لفظ سے رب تعالیٰ اور نہ ہی بندے کو اپنے رب سے محبت کی

وجہ سے متصف کیا جائے گا اگرچہ بعض نے اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔۔۔۔۔ اس لفظ کی ممانعت کے سبب میں اختلاف ہے شاید اس کے استعمال کی ممانعت کی وجہ یہ ہو کہ عشق ایسی محبت ہے کہ جس کے ساتھ ہوت بھی ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لفظ عشق کا استعمال درست نہیں ہے کیونکہ یہ ایک ایسی خصلت ہے جو جنوں کی قسم میں سے ہے مگر روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار ”عشق رسالت“ کے تقاضے کے تحت جناب اوریا صاحب کو ”رجوع“ کی دعوت دے رہے ہیں۔

”حب النبیؐ“ اور کالم کے عنوان: ”احتیاط لازم ہے“ کا تقاضا یہ ہے کہ الفاظ کے چناؤ میں بھی احتیاط ملحوظ رکھنی چاہئے بلکہ بقول شاعر

ہے شان تیری اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ

جو لفظ تیری شان کے شایاں نظر آیا

مولانا اسماعیل ریحان صاحب نے خود بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:

”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عالی کے لحاظ سے ہم یقیناً یہی چاہتے ہیں کہ اعلیٰ سے اعلیٰ بات آپ کی طرف منسوب ہو، ادنیٰ نامناسب چیزوں کی بھی آپ سے نفی کی جائے“ (روزنامہ اسلام - ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء تحت ”احتیاط لازم ہے“)

کاش! موصوف اپنی اس بات پر عمل کرتے ہوئے ”رسالت“ کے ساتھ نامناسب، بازاری اور گھٹیا لفظ ”عشق“ کی اضافت نہ کرتے۔ کیونکہ اس لفظ کے ”نامناسب، گھٹیا اور ادنیٰ“ ہونے میں تو اہل علم کو کوئی شک نہیں ہو سکتا۔

مولانا اسماعیل ریحان صاحب تفسیر جلالین اور تاریخ طبری سے سیدنا زیدؓ اور سیدہ زینبؓ سے متعلق روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”مجھے یہ روایت نقل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر صورت حال ایسی بن گئی کہ اسے نقل کرنا ناگزیر ہو گیا۔ خاموشی کی صورت میں نہ صرف طبری بلکہ جلالین پڑھنے پڑھانے والے

کبھی علماء و طلبہ اور اسلاف کی بہت سی نامی گرامی شخصیات پر کفر کی شدید ترین قسم یعنی توہین رسالت کا لیبل لگ رہا تھا۔ کچھ لوگ اسلاف کو بے ایمان اور گستاخ کہہ رہے تھے۔ اور کچھ لوگ دوسری انتہاء پر جا کر پوچھ رہے تھے کہ توہین رسالت پر سزا کیوں ہے جبکہ علماء خود اس کے مرتکب ہوتے آ رہے ہیں اور انہیں کوئی سزا نہیں دی گئی۔ یہ مواد اخبارات اور سوشل میڈیا میں آ کر عجیب بد مزگی پیدا کر رہا تھا، پس اظہار حقیقت کے لیے قلم حرکت میں لانا لازم تھا۔“ (روزنامہ اسلام - ۹ اگست ۲۰۱۵ء) مذکورہ عبارت کا مدلل جواب زیر عنوان ”عرض مؤلف“ گزر چکا ہے۔

موصوف نے یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ اوریا مقبول جان صاحب کے کالم کی اشاعت کے بعد کون لوگ اسلاف کو ”بے ایمان اور گستاخ“ کہہ رہے تھے؟ امام طبری اور علامہ جلال الدین کو ”بے ایمان اور گستاخ“ کہنے والے اپنے عمل اور قول کے خود ذمہ دار ہیں البتہ اس بات میں کسی مومن بالقرآن کو ہرگز کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت یوسف، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت محمد مصطفیٰ علیہم السلام کے متعلق امام طبری، علامہ جلال الدین محلی اور علامہ جلال الدین سیوطی کی بلا نقد و جرح منقولہ روایات یقیناً عقیدہ عصمت انبیاء کے منافی اور توہین و تنقیص انبیاء پر مبنی ہیں۔ ان بزرگوں کے حق میں مغفرت کی دعا تو کی جاسکتی ہے مگر روایات کی تائید ہرگز نہیں کی جاسکتی۔

موصوف مزید لکھتے ہیں:

”قارئین! واقعہ میں من و عن نقل کر چکا ہوں۔ آپ نے پڑھ لیا ہے۔ اس میں کون سی بات ایسی ہے جسے بے ہودہ اور گستاخانہ کہا جائے اور طبری پر توہین رسالت کا الزام عائد کیا جائے۔ کیا یہ بات معیوب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت کو جسے طلاق ملنے والی تھی اور سیرت و صورت، حسب و نسب ہر لحاظ سے اعلیٰ تھی، سہارا دینے کا سوچ رہے تھے۔۔۔۔۔ اسے عیب شمار کیا جائے گا یا اخلاق کی انتہاء۔“

یہ بات ناقابل یقین ہے کہ ایک دن سیدہ (زینب) رضی اللہ عنہا دوپٹے کے بغیر گھر میں تشریف فرما تھیں؟ اگر ایسا تھا تو یہ کوئی محال بات نہیں۔ ایک گرم ملک میں، گھر کی

تہائی میں کوئی عورت کچھ دیر کے لیے اڑھنی اتارے ہوئے ہو تو کیا اسلام میں اس پر پابندی ہے! یا یہ اخلاق سے ماوراء حرکت ہے! یا غیر محرم پر نگاہ رسالت کا اچانک پڑ جانا محال بات ہے؟ اس کا ذکر عصمتِ انبیاء کے منافی اور اسے نقل کرنا تو بدین رسالت ہے؟ یہ تو تب ہوتا جب انبیاء کرام بشری تقاضوں یا سہو سے مبرا ہوتے۔ اُمت کا کبھی بھی یہ عقیدہ نہیں رہا کہ پیغمبر اپنے تمام کمالات و امتیازات کے باوصف بشری خصوصیات سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ انبیاء کرام کو نیند آتی تھی، بھوک لگتی تھی، وہ کھاتے پیتے تھے، خرید و فروخت کرتے تھے۔ انہیں غصہ بھی آتا تھا، رنج بھی ہوتا تھا...

سہو یا بھول چوک کے ایسے اکاد کا واقعات گناہ کے زمرے میں نہیں آتے کہ عصمت کے منافی ہوں۔ یہ سب نگوینی حکمتوں کے تحت ہوتا تھا، تا کہ ہر قسم کے حالات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور سیرت امت کے سامنے آجائے۔ کسی غیر محرم پر اچانک بلا قصد نگاہ پڑ جانا بھی سہو کی ایک شکل ہے۔ علماء و فقہاء نے اچانک نگاہ پڑ جانے کو بغیرہ گناہ بھی نہیں کہا۔ کسی کا اس میں اختلاف نہیں، کیونکہ خود ارشاد نبوی ہے: پہلی (اچانک) نظر تجھے معاف ہے، اور دوسری کی تیرے لیے گنجائش نہیں۔ ﴿مسند احمد ج ۲ ص ۶۶۲﴾ فان الاولى لك والآخره عليك ﴿﴾

جو حضرات واقعہ زینب کو تو بدین رسالت کی حد تک بے ہودہ قرار دے رہے ہیں وہ بتائیں کہ جو چیز شریعت میں ایک عام امتی کے لیے گناہ نہیں، کیا پیغمبر کے لیے گناہ ہو جائے گی۔ جو چیز صغیرہ گناہ بھی نہیں، کیا نبی سے اس کا صادر ہو جانا، عصمتِ انبیاء کے خلاف ہوگا؟ ہم مسلمان ہیں مگر فسوس کہ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کے بارے میں عقیدہ کیا ہونا چاہیے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا صفات ہیں، کیا امتیازات ہیں، کیا اخلاق و کمالات ہیں، کن چیزوں سے آپ موصوف ہیں۔ ہم میں سے بعض لوگ اپنی نادانیت یا محبت رسول کے بارے میں اپنے مخصوص تصورات کی بناء پر پیغمبروں کے بارے میں ایسے خیالات رکھتے ہیں کہ کو یا بشری صفات کو ان کے لیے تسلیم کرنا یا بشری تقاضوں کی بھول کر بھی ان کی طرف نسبت کر دینا ان کے خیال میں تو بدین رسالت ہے۔

اگر کوئی اصل عربی میں طبری کی روایت پڑھے شاید روایت کا یہ فقرہ سب سے زیادہ عجیب بلکہ سخت ناگوار محسوس ہوگا۔ ”فوقع اعجابها في قلب النبي صلى الله عليه وسلم“ (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی پسندیدگی آئی۔) ہم اپنی سطحی و جذباتی ذہنیت کی بناء پر کم از کم اس عبارت کو ضرور گستاخانہ قرار دے دیتے مگر کیا کیجئے کہ خود اللہ کے فرمان کے مطابق یہ ناممکن بات نہیں۔ پیغمبر کے دل میں حسن کی پسندیدگی آ جانے کا مکان کا ذکر خود خالق کائنات نے کیا ہے: ”لَا يَجِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدِكَ وَلَا أَنْ تَبْتَغِيَ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ اُنْهَضْتَ حُسْنُهُنَّ“ ان کے علاوہ اور عورتیں آپ کے لئے حلال نہیں ہیں اور نہ یہ درست ہے کہ آپ ان بیویوں کی جگہ دوسری بیویاں کر لیں اگرچہ آپ کو ان (دوسری عورتوں) کا حسن اچھا معلوم ہو (الاحزاب: ۵۲)

طبری کی روایت میں صرف ”اعجاب“ (پسندیدگی) کا ذکر ہے۔ آیت میں زیادہ صراحت کے ساتھ ”اعجاب حسن“ (حسن کی پسندیدگی) کا لفظ ہے۔ اچھی چیز کا اچھا لگنا، ایک فطری بات ہے۔ قلب و فطر کے صحت مند ہونے کی علامت ہے۔ خوشبو ہر کسی کے مشام کو معطر کرتی ہے اور اگر کسی کو نہیں محسوس ہوتی تو یہ خوبی نہیں، احساس کی کمزوری شمار ہوگی۔ پس اس روایت کو کس لحاظ سے گستاخانہ کہا جائے گا! ایک متاثر کن شخصیت سے متاثر ہونا کوئی انہونی بات ہو سکتی ہے؟ جمال اور بد صورتی میں فرق کر لینا اگر گناہ ہے تو ضرور روایت کو عصمتِ انبیاء کے مخالف قرار دیا جاسکتا ہے، اور اگر یہ کوئی گناہ نہیں بلکہ اللہ کی دی ہوئی ان فطری نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو کم و بیش ہر انسان کو نصیب ہے تو پھر اس واقعے کو تو بدین رسالت پر مبنی قرار دے کر طبری کو گستاخ قرار دینا بھی غلط ہے۔

اتنا ضرور ہے کہ طبری میں اس امکان کو واقعاتی شکل میں بیان کیا گیا ہے، یعنی ایسا ہوا تھا۔ قرآن مجید میں امکان بیان کیا گیا ہے یعنی ایسا ہو سکتا ہے، یہ ذکر نہیں ہے کہ ایسا کبھی ہوا بھی تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عالی کے لحاظ سے ہم یقیناً یہی چاہتے ہیں کہ اعلیٰ سے اعلیٰ بات آپ کی طرف منسوب ہو۔ ادنیٰ یا مناسب چیزوں کی بھی آپ صلی اللہ علیہ

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور قصہ زید و زینبؓ

وسلم سے نفی کی جائے۔ اس لیے محققین کی پیروی کرتے ہوئے اس واقعے کا انکار کرنا ہی بہتر ہے کیونکہ یہ ایک ضعیف روایت ہے، مگر ساتھ میں قرآن میں مذکور ”امکان“ کا پہلو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمارے لیے اس روایت پر عصمتِ انبیاء کی نفی اور راوی پر توہینِ رسالت کا حکم لگانے کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ اس بحث کے دو پہلو ہیں۔ (۱) یہ واقعہ ثابت ہے یا نہیں (۲) یہ واقعہ عصمتِ انبیاء کے منافی اور گستاخانہ ہے یا نہیں، اسے نقل کرنے والے توہینِ رسالت کے مرتکب ہیں یا نہیں۔

محققین کے نزدیک یہ واقعہ پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔ راقم بھی انہی حضرات کی رائے کا قائل ہے۔ رہائش واقعہ کا توہینِ رسالت پر مبنی ہونا، تو یہ مسئلہ غور و فکر کا تقاضا کرتا ہے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا مذکورہ قصہ طبری میں دو اسناد سے منقول ہے۔ ایک ابن زید کے حوالے سے جو میں نے پوری روایت لفظ بلفظ نقل کر دی ہے۔ دوسری روایت واقدی کی ہے جو ذرا طویل ہے، مگر قصہ بالکل یہی ہے، صرف چند باتیں زیادہ ہیں: ☆ ایک یہ کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اس وقت آٹا کوندھ رہی تھیں۔ ☆ دوسرے یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر جلدی سے چادر اوڑھ لی اور اندر تشریف آوری کا کہا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوٹ گئے۔ ☆ تیسرے یہ کہ لوٹتے ہوئے آپ ”سبحان اللہ العظیم سبحان اللہ مصرف القلوب“ کا ورد کر رہے تھے۔

☆ چوتھی بات یہ کہ حضرت زید کو واقعے کا اندازہ ہو گیا تھا، اس لیے حاضر ہو کر عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، شاید زینب آپ کو پسند آئی ہوں، میں انہیں طلاق دے دیتا ہوں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کر دیا۔

واقدی کی روایت میں موجود ان چار زاید اجزاء کو لے لیں تب بھی انصاف سے بتائیے کہ ان میں کون سی بات گستاخی والی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن سے متاثر ہونا ہی عجیب لگ سکتا ہے، مگر اعجابِ حسن کے امکان کا ذکر خود قرآنی آیت

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور قصہ زید و زینبؓ

میں ہے۔ اگر روایت کو گستاخانہ کہا جائے تو اس آیت کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ اور اگر آیت میں کوئی تاویل ہو سکتی ہے تو وہی اس روایت میں بھی مانی جاسکتی ہے۔ اگر قرآن مجید کی بات سچ ہے (اور کسی مسلمان کو اس کی صداقت میں شبہ نہیں ہو سکتا) تو جو کچھ روایت میں نقل ہوا وہ بھی نہ محال ہے نہ عصمتِ انبیاء کے منافی۔

یاد رہے کہ یہ واقعہ طبری سے پہلے سیرت نگاری کے امام محمد بن سعد نے طبقات الکبریٰ میں، مشہور محدث امام حاکم نیثا پوری نے اپنے شہرہ آفاق حدیثی مجموعے ”مستدرک حاکم“ میں، علامہ سیوطی نے تفسیر الدر المنثور میں، علامہ شربینی نے تفسیر السراج المبرور میں، علامہ حلبی نے سیرت حلبیہ میں بھی نقل کیا ہے۔ عرب محقق ڈاکٹر خلیل عبدالکریم مرحوم (م ۲۰۰۲ء) نے ”الحدیث الخیر“ میں واقعہ زینب بنت جحش پر بہت معتدل اور مفصل کلام کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس بارے میں مفسرین کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ نے اس واقعے کی روایات کو معتبر مانا ہے اور انہی کو شانِ نزول میں نقل کیا ہے، ان حضرات میں قتادہ، عبدالرحمن بن زید، عکرمہ، محمد بن یحییٰ، مقاتل، امام شعبی، ابن جریر، ابن جریر طبری، زنجبیری، بیضاوی، ابوسعود، ابن جزئی، علامہ عینی اور امام سیوطی جیسے لوگ ہیں۔ (کیا یہ بھی توہینِ رسالت کے محرم سمجھے جائیں گے۔)

دوسرا گروہ ان روایات کو سند کی کمزوری کی وجہ سے مسترد کرتا ہے۔ ان میں زہری، سدی، ابوبکر باقلانی، ابن حزم، ابن العربی، قاضی عیاض، قرطبی، ابن کثیر، ابن قیم اور ابن حجر جیسے حضرات شامل ہیں۔ راقم بھی اسی دوسرے گروہ کی رائے کو درست سمجھتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے گروہ کے علماء پر کچھڑا اچھالا جائے۔

قریبی دور کے نامور محقق، فقیہ و مفسر علامہ آلوسی نے اپنی شاہکار تفسیر ”روح المعانی“ میں اس واقعے کو ذکر کر کے کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسا قصہ نقل کرنے سے احتراز ضروری ہے لیکن اگر یہ قصہ درست ہو تو اسے قلبی میلان پر محمول کیا جائے گا جو انسان کے بس میں نہیں۔ ﴿روح المعانی: ج ۲۲ ص ۲۵﴾ کفر یا گستاخی کا فتویٰ انہوں نے بھی کسی پر نہیں لگایا۔ (روزنامہ اسلام۔ ۹۔ ۱۰۔ اگست ۲۰۱۵ء)

موصوف نے اور یا مقبول جان صاحب کے ایک کالم کے جواب میں ۹ کالم (علامہ طبری مؤرخ، مجتہد...) پانچ قسطیں + ”احتیاط لازم ہے“ چار قسطیں) لکھے ہیں، اور وہی اس بحث میں اصل فریق ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے ان جوابی کالموں کو نہایت غور و خوض اور بغرض اصلاح پڑھا ہوگا مگر انہوں نے موصوف کے متضاد، بے مقصد اور غیر متعلقہ ”دلائل“ کا مطلقاً کوئی اثر قبول نہیں کیا چنانچہ اور یا مقبول جان صاحب اپنے ”جواب الجواب“ میں لکھتے ہیں:

میں نے اس سلسلے میں تاریخ طبری کا حوالہ خاص طور پر دیا تھا، کیونکہ یہ مغرب کے ان مصنفین کی محبوب کتاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں پر دشنام طرازی کرنا چاہتے تو انہیں حوالے اسی قسم کی کتابوں سے ملتے ہیں۔ اس پر یا رکھوں نے ”طبری“ کے دفاع میں بہت کچھ لکھا اور میں نے جواب میں صرف یہ نوٹ تحریر کیا کہ ”طبری پر لکھنا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کیونکہ دو واقعات ایک حضرت زینبؓ اور حضرت زیدؓ کی طلاق اور دوسرا واقعہ غرائیق طبری نے جس انداز میں بیان کیا ہے کوئی انہیں کالم میں لکھنے کی ہمت تو ایک طرف پڑھنے کی برداشت نہیں رکھتا۔“

میری حیرت کی اس وقت انتہاء نہ رہی جب میرے سیکولر دوست تو میری اس وضاحت پر خاموش ہو گئے، لیکن چند علمائے امت اپنی تلواریں سنوت کر مجھ پر پل پڑے۔ وہ لوگ جن کا دفاع میں صرف اللہ کی رضا کے لئے کرتا رہا ہوں۔ ان علماء نے طبری کا دفاع صرف اس لئے کیا کہ گذشتہ چند سو سالوں سے ان کے مدارس میں ”تفسیر جلالین“ پڑھائی جاتی ہے اور اس میں اس واقعہ غرائیق کا ذکر ہے، جس کا ماخذ طبری کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔۔۔۔۔

میرا معاملہ نہ طبری سے پر خاش کا ہے اور نہ ہی بلاذری اور ابن سعد سے۔ میرا دکھ یہ ہے کہ جس کسی نے میرے سلاف پر انگلی اٹھائی ہو، میرے دین کے نقص بیان کرنا ہوں وہ ان مؤرخین کے جمع کئے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیتا ہے۔ الحاد کا دروازہ انہی کے جمع کئے گئے جھوٹ سے کھلتا ہے۔ آپ اسلام کے خلاف لکھی جانے والی تمام کتابوں کو اٹھالیں، تو بین رسالت پر مبنی کتب کا مطالعہ کریں اور ان میں کہیں نہ کہیں طبری اور اس کے قبیل کے مؤرخین جہاں تک نظر آئیں گے۔

وہ لوگ انہی کی روایات کو بنیاد بناتے ہیں۔ حیرت ہے وہ تمام ”شائمین رسول اللہ“ تو ایسی باتیں تحریر کرنے پر واجب القتل قرار دیئے جاتے ہیں اور جس مؤرخ نے یہ جھوٹ اکٹھا کر کے تاریخ کا حصہ بنایا وہ محترم۔

پتہ نہیں کیوں میرے ان صاحبان علم علماء کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث یاد نہیں آتی کہ ”کسی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنی بات بغیر تحقیق کے آگے سنانا پھرے۔ کیا ہمارے مؤرخین (مفسرین) نے ایسا نہیں کیا؟“ (روزنامہ ایکسپریس ۲ ستمبر ۲۰۱۵ء ماہنامہ الاحرار لاہور۔ اکتوبر ۲۰۱۵ء۔ زیر عنوان ”خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے“)

روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار نے اپنے مذکورہ مضمون میں امام طبری و امثالہ کا جو دفاع کیا ہے وہ گذشتہ پوری تاریخ میں کوئی ”صاحب علم“ نہیں کر سکا۔ نفس مسئلہ پر بحث تو آگے آ رہی ہے یہاں یہ بتانا ہے کہ موصوف ایک طرف تو اس واقعہ کو سنداً غیر ثابت اور ضعیف مانتے ہیں اور محققین کی پیروی کرتے ہوئے اس کا انکار بھی کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف اسے صحیح سمجھنے والوں کا پورا پورا دفاع ہی نہیں کرتے بلکہ قرآن سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ امام طبری نے تو صرف ”پسندیدگی“ کا ذکر کیا جبکہ قرآن نے ”اعجاب حسن“ کا ذکر کیا۔ ایک طرف وہ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن نے ”اعجاب حسن“ کا صرف امکان ظاہر کیا جبکہ امام طبری نے اسے واقعاتی شکل میں بیان کیا ہے۔ اس لئے اس واقعہ یا روایت کو قرآن کی روشنی میں نہ تو منافی عصمت قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس پر توہین رسالت کا حکم لگایا جاسکتا ہے۔

دوسری طرف انہوں نے وہ انداز اختیار کیا ہے جس سے قرآن کی رو سے بھی ”اعجاب حسن“ کا وقوع ثابت ہو رہا ہے بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ اگر روایت کو گستاخانہ کہا جائے تو اس آیت کا بھی انکار کرنا پڑے گا اگر آیت میں کوئی تاویل ہو سکتی ہے تو وہی اس روایت میں بھی مانی جاسکتی ہے۔ اگر قرآن مجید کی بات سچ ہے تو جو کچھ روایت میں نقل ہوا وہ بھی نہ محال ہے اور نہ ہی عصمت انبیاء کے منافی۔ (العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ)

موصوف نے انتہائی غلو سے کام لیتے ہوئے آیت کریمہ کو ”ذہال“ کے طور پر

استعمال کیا اور اس سے بالکل باطل استدلال کیا۔ یہ دلیل تو واضعین قصہ و روایت کو بھی سمجھی نہیں سوجھی تھی۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۲ میں تو ازدواج مطہرات کی فضیلت بیان ہو رہی ہے کہ انہوں نے آیت تنخیر (الاحزاب ۲۹) کے جواب میں دنیا اور آسائش دنیا کو ٹھکرا کر عسرت اور تنگی کی زندگی کو اختیار کر لیا تھا جس کے انعام میں اللہ تعالیٰ نے ”اعجاب حسن“ کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پابندی عائد کر دی کہ ان ازدواج مطہرات کی موجودگی میں کسی اور آزاد خاتون کو شرف زوجیت نہ بخشا جائے اور نہ ہی ان میں سے کسی کو طلاق دے کر کسی دوسری کو نکاح میں لایا جائے۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طلاق کا حق بھی سلب کر لیا گیا۔ ”اعجاب حسن“ والی آیت تو ۷ھ کے بعد نازل ہو رہی ہے اس وقت آپ کے عقد میں ۹ بیویاں موجود تھیں (جبکہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا قبل از ہجرت ۱۰ نبوی میں اور سیدہ زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا ۴ھ میں وفات پا چکی تھیں) اس آیت کے نزول کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خاتون کے ساتھ نکاح نہیں فرمایا۔ آپ نے آخری نکاح ذی قعدہ ۷ھ میں حضرت عباسؓ کی تحریک پر سیدہ میمونہؓ کے ساتھ احرام کی حالت میں کیا۔ جبکہ سیدہ زینب بنت جحشؓ آپ کے حبلہ عقد میں ذی قعدہ ۵ھ میں آئی تھیں۔

”وَلَوْ اَخْبَبَكَ حُسْنُهُنَّ“ میں شرط اور جزا دونوں غیر ممکن القوع ثابت ہوئے۔ یعنی نہ ”اعجاب حسن“ کا معاملہ پیش آیا اور نہ ہی نکاح کا۔ اگر کسی خاتون کا حسن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تعجب میں ڈالتا تو پھر بھی نکاح و طلاق کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ اگر ”اعجاب حسن“ کی شرط نہ بھی ہوتی تو اس صورت میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نکاح پر پابندی کا حکم ہی کافی تھا۔ اور آپ اس حکم الہی کے بعد کسی مزید نکاح کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن یہاں ”جزاء“ تو ہے ہی نہیں یعنی شرط پوری ہو یا نہ ہو نکاح پر پابندی ہے تو اس صورت میں ”اعجاب حسن“ کا امکان بھی ختم ہو گیا، ویسے مولانا اسماعیل ریحان صاحب نے ”اعجاب حسن“ کی جو تشریح کی ہے وہ اس سے پہلے کسی مفسر، شیخ التفسیر اور شیخ القرآن کے تصور میں بھی نہ آئی ہوگی۔ اگر بالفرض نکاح پر کوئی پابندی نہ ہوتی تو کیا

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم موصوف کے موعومہ و مفروضہ ”اعجاب حسن“ کے تفسیری و تشریحی قول کے مطابق نکاح فرما سکتے تھے؟ کیا آپ کے سابقہ تمام نکاحوں میں اس کی کوئی نظیر پائی جاتی ہے کہ آپ نے ”حسن و جمال“ اور ”اعجاب حسن“ کے تحت ایسا کیا ہو؟ حسن و جمال کی وجہ سے تو آپ نے کسی امتی کو نکاح کرنے کی ترغیب نہیں دی۔ کیا آپ اپنی تعلیم کے برعکس خود محض حسن و جمال کی بناء پر کسی خاتون سے نکاح فرما سکتے تھے؟ آپ کا ارشاد مبارک تو یہ ہے کہ: ”تَنكِحُ الْمَرْأَةَ لِأَرْبَعٍ لِمَا لَهَا وَلِحُسْبِهَا وَجَمَالِهَا وَلِدِينِهَا فَاطْفَرُ بَنَاتِ الْبَلَدِ تَرَبَّتْ بِدَاك“ (صحیح بخاری کتاب النکاح - باب الاكفاء فی الدین رقم الحدیث ۵۰۹۰) عورت سے لوگ چار مقاصد میں سے کسی مقصد کی بناء پر نکاح کرتے ہیں۔ مال، نسب، حسن اور دین داری۔ تو دین دار (نیک سیرت) عورت اختیار کر اگر تو نہ مانے تو تیرے ہاتھوں کو مٹی لگے گی (یعنی ندامت ہوگی)

ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ: ”اذا جاء کم من ترصون دینہ و خلقہ فانکحوه الا تفعلوا تکن فتنة فی الارض و فساد“ (جامع الترمذی) جب تمہارے پاس ایسا شخص آئے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اس سے نکاح کرو۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ و فساد پھیلے گا۔

مذکورہ ارشادات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کے معاملے میں عورت کے انتخاب میں ”حسن سیرت“ کو معیار قرار دے رہے ہیں جبکہ مولانا اسماعیل ریحان صاحب ”اعجاب حسن“ کے تحت خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آپ کی تعلیمات کے برعکس ”خوبصورتی اور حسن و جمال“ کو ترجیح دے رہے ہیں۔ فی اسفا

یہ بات بھی بعید از فہم ہے جب موصوف کے نزدیک امام طبری کی منقولہ ”اعجاب“ والی روایت سنداً ”ثابت“ ہی نہیں ہے تو پھر اس ”اعجاب“ کو ثابت کرنے پر اتنا زور کیوں دے رہے ہیں کہ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بشری تقاضے کے تحت ”سہو یا بھول چوک، نیند، بھوک پیاس، کھانا پیانا، خرید و فروخت وغیرہ“ امور پیش آتے تھے اسی طرح کسی

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور قصہ زید و زینبؓ

خواصورت خاتون کا حسن بھی دل میں آسکتا ہے۔ اچھی چیز کا اچھا لگنا ایک فطری بات ہے، قلب و نظر کے صحت مند ہونے کی علامت ہے۔ یہ چیز منافی عصمت نہیں ہے کیونکہ انبیاء بشری تقاضوں سے مبرا نہیں ہیں۔“

موصوف نے اپنے کالم میں ”خلط بحث“ سے کام لیا ہے اور واقعات کی ترتیب بھی الٹ دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

”کیا یہ بات معیوب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت کو جسے طلاق ملنے والی تھی اور سیرت و صورت، حسب و نسب ہر لحاظ سے اعلیٰ تھی، سہارا دینے کا سوچ رہے تھے۔۔۔ اسے عیب شمار کیا جائے گا یا اخلاق کی انتہاء؟“

حالانکہ بقول طبری طلاق کا ذکر تو سیدہ زینبؓ کے حسن کا آپ کے دل میں کھب جانے کے بعد چلا ہے۔

موصوف کا یہ لکھنا بھی محل نظر ہے کہ ”سہو، بھول چوک یا کسی غیر محرم پر اچانک نگاہ کا پڑ جانا وغیرہ سب نگوینی حکمتوں کے تحت ہوتا تھا تا کہ ہر قسم کے حالات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور سیرت امت کے سامنے آجائے۔“

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ”وَ تَخْفِيْ فِىْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۖ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَنْ تَخْشَاهُ“ اسوہ حسنہ اور امت کے لئے عمل کے طور پر نازل نہیں ہوئی بلکہ جمہور مفسرین کے نزدیک ”بطور عتاب“ نازل ہوئی ہے اور ”عتابی امور“ میں بیرونی نہیں ہوتی۔

موصوف زور دے کر پوچھ رہے ہیں کہ: ”جو حضرات واقعہ زینب کو توہین رسالت کی حد تک بے ہودہ قرار دے رہے ہیں وہ بتائیں کہ جو چیز شریعت میں (یعنی غیر محرم پر پہلی نظر پڑ جانا) ایک عام امتی کے لئے گناہ نہیں، کیا بغیر کے لئے گناہ ہو جائے گی۔“

یہ عجیب تقابل ہے؟

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں کہ:

”چونکہ مصالح ہمد شریعہ کے مقابلہ میں اس قسم کی جھجک بھی پیغمبر کی شان رفیع سے نازل تھی اس

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور قصہ زید و زینبؓ

لئے بقاعدہ ”حسنات الابرار سیئات المقربین“ اس کو عتاب آمیز رنگ میں بھاری کر کے ظاہر فرمایا گیا جیسا کہ عموماً انبیاء علیہم السلام کی زلات کے ذکر میں واقع ہوا ہے“ (تفسیر عثمانی تحت لآیہ) مولانا اسماعیل ریحان صاحب نے ”احتیاط لازم ہے“ کی پہلی قسط میں تفسیر جلالین اور تاریخ طبری سے بروایت ”یونس، ابن وہب، ابن زید“ زیر بحث واقعہ نقل کیا ہے۔ پھر اپنی دوسری قسط میں فرماتے ہیں کہ:

”حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا مذکورہ قصہ طبری میں دو اسناد سے منقول ہے۔ ایک ابن زید کے حوالے سے جو میں نے پوری روایت لفظ بلفظ نقل کر دی ہے۔ دوسری روایت واقدی کی ہے جو ذرا طویل ہے، مگر قصہ بالکل یہی ہے، صرف چند باتیں زیادہ ہیں: ”ایک یہ کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اس وقت آٹا گوندھ رہی تھیں۔“ دوسرے یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر جلدی سے چادر اوڑھ لی اور اندر تشریف آوری کا کہا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوٹ گئے۔“ قارئین کرام! تفسیر طبری اور تاریخ طبری سے ابن زید اور واقدی کی روایات اصل متن کے ساتھ پیچھے گزر چکی ہیں۔ واقدی کی روایت میں موصوف کی پہلی دونوں اضافی چیزیں نہیں پائی جاتیں۔ اس پوری روایت میں ”خوردین“ کے ذریعے بھی دیکھ لیا جائے تو یہ بات سرے سے نہیں ملے گی کہ ”حضرت زینبؓ اس وقت آٹا گوندھ رہی تھیں“ اسی طرح دوسری اضافی بات بھی نہیں ملے گی کہ ”حضرت زینبؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر جلدی سے چادر اوڑھ لی۔“ واقدی کی زیر بحث روایت میں اس بات کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ ”گھر کے دروازے پر بالوں سے بنا ہوا پردہ تھا، ہوانے پردہ اٹھا دیا اور وہ کھل گیا حضرت زینبؓ اپنے کمرے یا مدآدے میں تھیں۔“

بلکہ روایت میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیدؓ کی تلاش میں ان کے گھر آئے وہ اس وقت موجود نہ تھے۔ حضرت زینبؓ ہلکے لباس میں ان کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر اعراض فرمایا۔ ”فجاء منزله یطلبه قلم یجده وقامت الیہ زینب بنت جحش زوجته فَعَرَضَ عَنْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَم۔۔۔“

اس کا پس منظر و اقدی نے یہ بتایا کہ:

جب زینبؓ سے کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر دروازے پر کھڑے ہیں انہوں نے عجلت میں کپڑے پہنے اور پوری طرح نہیں پہنے تھے کہ خود ایک دم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آگئیں تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند آگئیں...

”و اتما عجلت زینب أن تلبس أن قبل لها رسول الله صلى الله عليه وسلم على الباب فوثب عجلة فأعجبت رسول الله صلى الله عليه وسلم...“

جبکہ ابن زید والی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

”و على الباب ستر من شعر، فرفعت الريح الست فانكشف، وهي في حجرتها حاسرة، فوقع إعجابها في قلب النبي صلى الله عليه وسلم فلما وقع ذلك كرهت إلى الآخر...“

دروازے پر اونی پردہ پڑا تھا ہوا سے وہ پردہ اٹھ گیا پس وہ کھل گیا، زینبؓ جو اپنے کمرے میں برہنہ سر بیٹھی ہوئی تھیں اسی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہو گئیں اس سے ان کی صورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں جا گزری ہو گئی جب یہ چیز واقع ہوئی تو زینبؓ دوسرے (یعنی زیدؓ) کے لئے ناپسندیدہ بنا دی گئیں۔

صاحب جلالین نے یہ الفاظ لکھے ہیں:

”ثم وقع بصره عليها بعد حين فوقع في نفسه حبها وفي نفس زید كراهتها...“

فاضل کالم نگار ”فوقع اعجابها في قلب النبي صلى الله عليه وسلم“ کے الفاظ کی بناء پر اس قدر اعتراف کرتے ہیں کہ:

”ہم اپنی سچی و جذباتی ذہنیت کی بناء پر کم از کم اس عبارت کو ضرور گستاخانہ قرار دے دیتے مگر کیا کیجئے کہ خود اللہ کے فرمان کے مطابق یہ ناممکن بات نہیں۔ پیغمبر کے دل میں حسن کی پسندیدگی آجانے کا امکان کا ذکر خود خالق کائنات نے کیا ہے“

روزنامہ اسلام کے کالم نگار نے امام طبری و امثالہ کے دفاع میں پہلے عصمت رسالت کو مخرج کیا پھر اللہ تعالیٰ پر بھی افتراء کر ڈالا۔ ”وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ سِرًّا وَ عَلَانِيَةً“

کیا چودہ صدیوں میں کسی بھی مفسر نے ”وَلَوْ أَنَّهُ جَبَلٌ حُشْنٌ“ سے یہ مراد لی ہے؟ معلوم نہیں کہ آیت ”عجائب حسن“ کے ساتھ اس مکروہ و موضوع روایت کا کیا تعلق ہے؟ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ موصوف نے اس مکروہ اور منافی عصمت روایت کو آیت کے ساتھ ”لازم و ملزوم“ قرار دے دیا کہ:

”اگر روایت کو گستاخانہ کہا جائے تو اس آیت کا بھی انکار کرنا پڑے گا اگر آیت میں کوئی تاویل ہو سکتی ہے تو وہی اس روایت میں بھی مانی جاسکتی ہے۔ اگر قرآن مجید کی بات سچ ہے تو جو کچھ روایت میں نقل ہوا وہ بھی نہ محال ہے اور نہ ہی عصمت انبیاء کے منافی۔“

یہ ملحوظ رہے کہ خود موصوف کے نزدیک بھی یہ روایت ثابت نہیں ہے اور انہوں نے اس گروہ کی رائے کو درست قرار دیا ہے جنہوں نے اس روایت کو مسترد کیا ہے لیکن وکالت بھی خوب کی ہے۔ آگے چل کر یہ بتایا جائے گا کہ بہت سے مفسرین نے اس روایت کو منافی عصمت قرار دے کر اس کا انکار کیا ہے تو کیا ان مفسرین کو بھی ”منکر آیت“ قرار دیا جائے گا؟ موصوف اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

”یاد رہے کہ یہ واقعہ طبری سے پہلے سیرت نگاری کے امام محمد بن سعد نے طبقات الکبریٰ میں، مشہور محدث امام حاکم نیشاپوری نے اپنے شہرہ آفاق حدیثی مجموعے ”مستدرک حاکم“ میں، علامہ سیوطی نے تفسیر الدر المنثور میں، علامہ شربینی نے تفسیر السراج المبین میں، علامہ حلبی نے سیرت حلبیہ میں بھی نقل کیا ہے۔“ (روزنامہ اسلام ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء)

کالم نگار نے عجیب طریقے سے روزنامہ اسلام کے قارئین کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے کہ ”یاد رہے کہ یہ واقعہ طبری سے پہلے...“ اس عبارت سے یہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارے بزرگ امام طبری سے پہلے گزرے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ابن سعد کے علاوہ مذکورہ بزرگ سب ہی طبری کے بعد آئے ہیں اور ان ہی کے خوشہ چین ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیا ان بزرگوں کے نقل کر دینے سے ایک جھوٹا اور من گھڑت قصہ صحیح سمجھ لیا جائے گا؟ روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار اس بحث کے آخر میں لکھتے ہیں:

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور قصہ زید و زینبؓ

”قریبی دور کے نامور محقق، فقیہ و مفسر علامہ آلوسی نے اپنی شاہکار تفسیر ”روح المعانی“ میں اس واقعے کو ذکر کر کے کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسا قصہ نقل کرنے سے احتراز ضروری ہے لیکن اگر یہ قصہ درست ہو تو اسے قلبی میلان پر محمول کیا جائے گا جو انسان کے بس میں نہیں۔ (روح المعانی: ج ۲۲ ص ۲۵) کفر یا گستاخی کا فتویٰ انہوں نے بھی کسی پر نہیں لگایا۔“ (روزنامہ اسلام ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء)

اس قول کو واضح طور پر علامہ آلوسی کی طرف منسوب کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ وہ تو ناقل ہیں اصل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

”وفی شرح المواقف أن هذه القصة مما يجب صيانة النبي صلى الله عليه وسلم عن مثله فان صحت فمیل القلب غیر مقلود مع ما فيه من الابتلاء لها.....“

یہ قول علامہ آلوسی کا اپنا نہیں ہے بلکہ انہوں نے یہ بات ”شرح مواقف“ کے حوالے سے نقل فرمائی ہے۔ اور اس میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا ہے کہ ایسا قصہ نقل کرنے سے احتراز ضروری ہے۔ اگر درست ہوتا تو اسے نقل کرنے سے منع نہ کیا جاتا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ”فان صحت فمیل القلب غیر مقلود“ (اگر یہ قصہ صحیح ہو تو اسے قلبی میلان پر محمول کیا جائے گا جس کے ضبط پر انسان قادر نہیں) تو یہ بھی بلاشبہ ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت بھی بالکل غلط ہے کیونکہ پیغمبر علیہ السلام کے قلب مبارک کو عام انسان کے دل پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک تو نیند کی حالت میں بھی بیدار رہتا ہے۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ”قلبی میلان“ سے یہ حضرات کس طرح باخبر ہوئے؟ کیونکہ اس ”قلبی میلان“ سے یا اللہ تعالیٰ آگاہ کر سکتے تھے یا خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لیکن اللہ تعالیٰ نے آگاہ کیا اور نہ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ پھر راوی پر یہ شیطان کا ”القاء“ ہی معلوم ہوتا ہے اور یہ بات کسی حد تک خود فاضل کالم نگار نے بھی تسلیم کی ہے کہ:

”یہ کہنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور قصہ زید و زینبؓ

پسندیدگی آئی“ یقیناً سند میں موجود کسی راوی کا اپنا خیال اور بیان ہے، جو اس قدر رازک معاملے میں دلیل نہیں بن سکتا۔“ (روزنامہ اسلام ۱۱ اگست ۲۰۱۵ء)

سخت حیرت ہے کہ اس اقرار کے باوجود کالموں میں راوی اور روایت دونوں کا بھرپور دفاع کیا گیا ہے۔

فاضل کالم نگار نے جس قول کو علامہ آلوسی کا قول قرار دیا ہے وہ ان کا قول نہیں ہے۔ ان کا اپنا قول اور فیصلہ تو یہ ہے کہ:

”وللقصاص في هذه القصة كلام لا ينبغي أن يجعل في حيز القبول“ (روح المعانی الجزء الثانی والعشرون ص ۲۴)

قصہ کو اور داستان سرا لوگوں نے اس قصہ کے متعلق جو لچر باتیں اور افسانے تراش رکھے ہیں وہ کسی حیثیت سے اس لائق نہیں کہ انہیں قبول کیا جائے۔

علامہ آلوسی کے اس فیصلہ سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ وہ اس قصہ کو ”قصہ کو داستان سرا“ لوگوں کا وضع کردہ اور لغو و باطل قرار دیتے ہوئے کسی ”تاویل“ کے ساتھ بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ سخت تعجب ہے کہ روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار نے جو بات علامہ آلوسی نے نہیں کہی وہ ان کی طرف منسوب کر دی اور جو فیصلہ انہوں نے سنایا تھا اسے نہ صرف یہ کہ نظر انداز کر دیا بلکہ غیر کے قول کو ان کا قول سمجھتے ہوئے اس پر یہ ”حکم“ بھی لگا دیا کہ ”کفر یا گستاخی کا فتویٰ انہوں نے بھی کسی پر نہیں لگایا۔“

موصوف اگر تھوڑا سا غور کر لیتے تو ”گستاخی“ کا فتویٰ انہیں اسی ”فیصلہ“ میں نظر آ سکتا تھا۔ کیا جس قصے کو علامہ آلوسی خود بے ہودہ، لغو اور باطل سمجھتے ہوئے کسی تاویل سے بھی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو اگر اس لچر اور بے ہودہ قصے کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا جائے تو کیا وہ اسے گستاخی نہیں قرار دیں گے؟ کیا ایک لچر اور بے ہودہ قصہ کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت بذات خود ایک گستاخانہ عمل نہیں ہے؟

کیا علامہ آلوسی نے قصہ غرائق کی بحث میں امام طبری و امثالہ کی منقولہ روایات کے

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور قصہ زید و زینبؓ

بارے میں اپنا یہ ”فیصلہ“ نہیں سنایا کہ:

”وَأَقْبَحَ الْأَقْوَالِ الَّتِي رَأَيْنَا هَاهُنَا هَذَا الْبَابِ وَ أَظْهَرَ هَذَا فَسَاداً أَنَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَدْخَلَ تِلْكَ الْكَلِمَةَ مِنْ تَلَقُّاءِ نَفْسِهِ حَرْصاً عَلَى إِيْمَانِ قَوْمِهِ ثُمَّ رَجَعَ عَنْهَا، وَيَجِبُ عَلَى قَائِلِ ذَلِكَ التَّوْبَةُ، ”كَبُرَتْ كَلِمَةُ تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يُقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا“ (سورة الكهف ٥) ملاحظہ ہو: روح المعانی جلد ۱۷ ص ۱۸۶۔

”اس باب میں جو ہم نے دیکھا (غور کیا، محسوس کیا اور سمجھا) یہ انتہائی بدترین قول ہے، اور جس کا فساد ظاہر ہے ان لوگوں کا قول ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ان شریک جہلوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود آیتوں کے درمیان اس لئے داخل کر لیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ایمان کے حریص تھے پھر آپ نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ ایسے قائلین پر تو بہ کرنا واجب ہے: بہت بڑی بات ہے جو ان کے منہوں سے نکلتی ہے، وہ سوائے جھوٹ کے کچھ نہیں کہتے۔“ کیا کسی بدترین قول کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت ”بدترین گستاخی“ نہیں ہے؟ ہر مومن بالقرآن و بالرسول اسے یقیناً بدترین گستاخی ہی قرار دے گا۔

فاضل کالم نگاریہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ علامہ آلوسی نے کسی پر ”فتویٰ“ نہیں لگایا جس قول کے قائل پر علامہ آلوسی تو بہ کے ”واجب“ ہونے کا فتویٰ دے رہے ہیں کیا وہ اس ”واجب التوبہ“ قول کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کو گستاخی نہیں سمجھیں گے۔

علامہ آلوسی کا ان قصوں کے بارے میں بے لاگ اور اٹل فیصلہ یہ ہے کہ:

”ولعمري أن القول بأن هذا الخبر مما ألقاه الشيطان أن على بعض السنة الرواة ثم وفق الله تعالى جمعاً من خاصة لا بطلاله أهن من القول بأن حديث الغرائيق مما ألقاه الشيطان على لسان رسول الله صلى الله عليه وسلم..... (روح المعانی جلد ۱۷ ص ۱۸۲)

میری زندگی کی قسم! اس روایت کے بارے میں یہ بات مان لیما بہت آسان ہے کہ اسے شیطان نے خود اس روایت کے راویوں کی زبان پر جاری کر دیا ہے بہ نسبت اس کے کہ یہ مان لیا جائے کہ شیطان مردود نے ان شریک کلمات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر القاء کر دیا تھا۔

امام طبری --- کون؟

تفسیر طبری اور قصہ زید و زینبؓ

کیا علامہ آلوسی نے یہاں یہ فتویٰ نہیں دیا کہ قصہ غرائیق کو شیطان نے اس کے راویوں کی زبان پر جاری کر دیا تھا؟

فاضل کالم نگار نے قصہ زینبؓ کے ساتھ اپنے ”عدم اتفاق“ کے باوجود اسے منافی عصمت قرار دینے والوں کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ:

”یہ براہ راست دوسروں کی نیت اور ایمان پر حملہ ہے اور اسلاف اس سے بہت احتیاط کرتے تھے“ (روزنامہ اسلام ۱۱- اگست ۲۰۱۵ء)

اگر امام طبری کی منقولہ و مکتوبہ روایات کو ”منافی عصمت“ قرار دینا ”ان کی نیت اور ایمان پر حملہ ہے“ تو جن حضرات نے براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب و نظر اور نیت پر حملہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ”سیدہ زینبؓ کی محبت نبی کے دل میں کھب گئی تھی جس کی وجہ سے زیدؓ کے دل میں ان کی کراہت آگئی اور یوں معاملہ طلاق تک پہنچ گیا“ تو ان راویوں اور اس روایت کو صحیح سمجھ کر نقل کرنے والوں یا ایسے قائلین کا دفاع کرنے والوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

یہاں کسی خاتون پر ”اچانک نظر پڑنے سے“ اس کی تاویل نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہاں نظر پڑنے کے بعد دوسرے کی بیوی کی محبت کا دل میں کھب جانا بتایا گیا ہے جو یقیناً منافی عصمت ہونے کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان ہرگز نہیں ہے اور یہ یقیناً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت اور قلب و نظر پر براہ راست حملہ ہے۔

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ”پروہ“ کے احکام اس واقعہ اور سیدہ زینب بنت جحشؓ کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ عقد میں آنے کے بعد مزل ہوئے تھے۔

قصہ زید و زینبؓ اور مستشرقین

زیر بحث عنوان ممتاز اسکالر جناب ڈاکٹر حافظ محمد ثانی کے تبصرہ کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں:

”رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی“ ڈاکٹر حافظ محمد ثانی کی سیرت طیبہ پر اپنے موضوع کے حوالے سے اہمیت کی حامل کتاب ہے۔ اس کتاب میں مؤلف نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد ازواج مطہراتؓ کے آپ کے نکاح میں آنے کی وجوہ اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور حقائق کو اجاگر کیا ہے، ان کے نتائج و ثمرات کی وضاحت کی ہے۔ مستشرقین اور دیگر غیر مسلم حلقوں کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی پر اعتراضات و شبہات کے ازالے کے لئے مدلل انداز میں بحث کرتے ہوئے تقابلی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اور ”رسول اکرمؐ کی شادیاں“ حقائق، اسباب و ثمرات کے زیر عنوان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد شادیوں کے اسباب و وجوہات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ہمہ گیر اثرات کا بھی جائزہ پیش کیا ہے اور ہر شادی کی حکمت، اس کے دور رس و ہمہ گیر اثرات کو بیان کیا ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر حافظ محمد ثانی ”نتائج و اثرات“ کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ:

”مستشرقین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سے زائد شادیوں (تعدد ازواج) کے سلسلے میں سب سے زیادہ ہرزہ مرائیاں اور رنگ آمیزی حضرت زینب بنت جحشؓ کے ساتھ آپ کے نکاح کے متعلق کی ہیں۔ انہوں نے اس تاریخی واقعے کو افسانوی رنگ دے کر لوگوں کے سامنے پیش کیا اور اس کے ذریعے اہل اسلام کے دلوں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے نقوش کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شادی پر عہد نبویؐ کے یہودیوں، منافقوں اور دیگر دشمنان اسلام نے بھی بہت اعتراضات کئے تھے۔ اس نکاح کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ اس کے ہم پہلوؤں پر قرآن حکیم نے روشنی ڈالی ہے۔

اپنے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہؓ کی مطلقہ حضرت زینب بنت جحشؓ (جو کہ درحقیقت خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بیٹی) سے نکاح سے عرب کے جاہلی معاشرے میں عرصے سے جاری رسم تبئیت (منہ بولا بیٹا) کا خاتمہ ہوا۔ جو کہ درحقیقت ایک غیر اسلامی رسم تھی، اس کے متعلق خود قرآن کریم نے واضح ارشاد فرمادیا کہ:

”وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَ كَمِ ابْنَاءِ كَمِ (الاحزاب: ۴)

تمہارے منہ بولے بیٹوں کو اللہ نے تمہارے (حقیقی) بیٹے نہیں بنایا۔

آگے جا کر مزید ارشاد ہوا: ”أَدْعُوهُمْ لِأَسْمَاءِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ فَإِنْ لَمْ تَعْلَمُوا

أَسْمَاءَهُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ فِي الدِّينِ وَ مَوَالِيكُمْ (الاحزاب: ۵)

بلایا کرو انہیں ان کے باپوں کی نسبت سے، یہ زیادہ قرین انصاف ہے اللہ کے نزدیک، اگر تمہیں علم نہ ہو ان کے باپوں کا تو پھر وہ تمہارا سید بنی بھائی اور تمہارا دوست ہیں۔

اس ارشاد ربانی کے نزول کے بعد حضرت زیدؓ کو زید بن محمد کے بجائے زید بن حارثہؓ کے نام سے پکارا جانے لگا۔“ (رسول اکرمؐ کی ازدواجی زندگی ص ۱۱۳-۱۱۴)

موصوف ”مستشرقین کی یادہ کوئی کی حقیقت“ کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ:

”کہ مستشرقین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی کے حوالے سے تمام ہی ازواج مطہراتؓ سے شادیوں کو ثبوت پرستی اور جنسی میلان کا نام دے کر رنگ آمیزی اور آپ کی باعفت و عصمت زندگی پر اتہامات کی بھرمار کی ہے، تاہم حضرت زینب بنت جحشؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی پر سب سے زیادہ دواویلا مچایا گیا۔ اس نکاح پر مستشرقین نے خوب رنگ آمیزی، اعتراضات و اتہامات کی بھرمار کر دی۔ ان کے اعتراضات کے دور رخ ہیں۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت زید بن حارثہؓ کی مطلقہ سے شادی جو کہ درحقیقت آپ کے حتمی (منہ بولے) تھے، اس اشوکو اٹھایا گیا کہ آپ نے اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کی۔

(۲) دوسرا اعتراض انتہائی توہین آمیز، خرافات کا مجموعہ اور خالصتاً ان کی ذہنی اختراع ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت زینبؓ بنت جحش کے نکاح کو معاشقے کا نام

امام طبری --- کون؟

قصہ زید و زینب اور مستشرقین

دے کر خوب رنگ آمیزی کی گئی ہے، جس کا نقل کرنا بھی گستاخی کے مترادف ہوگا۔

مستشرق ولیم میور (William Muir) مندرجہ بالا دونوں اعتراضات کو افسانوی رنگ میں بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"Even in Arabia, to marry the divorced wife of an adopted son was a thing unheard of, and he foresaw the scandal it would create. But the flame would not be stifled. And so, Casting his scruples to the winds, he resolved at last to have her". (William Muir/ Muhammad and Islam. London P: 126.

منہ بولے بیٹے (ہتھی) کی طلاق شدہ بیوہ سے شادی ایسی بات تھی جو عرب جیسے ملک میں بھی نئی تھی، محمد کی اس شادی سے ان کی بڑی بدنامی ہوگی، لیکن محبت کا شعلہ سرد ہونے والا نہ تھا، انہوں نے ضمیر کی ہر غلش کو جھٹک دیا اور ہر قیمت پر زینب کو حاصل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ (نعوذ باللہ) (حوالہ مذکور ص ۱۱۶-۱۱۷)

موصوف زیر عنوان ”مسلم سیرت نگاروں کا سماج“ لکھتے ہیں کہ:

مستشرقین نے حضرت زینبؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کو افسانوی رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں کئی ایسی باتیں لکھی ہیں جو صرف اور صرف ان کے اپنے ذہن کی اختراع ہیں، حقیقت سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ نکاح سے قبل حضرت زینبؓ سے رسالت مآبؐ کے معاشرے کا قصہ بھی خالصتاً خود ساختہ اور فنی اختراع ہے، رسالت مآبؐ کی عفت مآب حیات طیبہ اس کی عملی تکذیب کرتی نظر آتی ہے۔ آثار و قرائن اس کو باطل اور لغو قرار دیتے ہیں۔ حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہاں اس معاملے میں کسی حد تک غلطی ہمارے بعض سیرت نگاروں اور مفسرین کی بھی ہے، جنہوں نے اس قصے کی اختراع میں مستشرقین کو موافقہ کیا جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔

امام طبری --- کون؟

قصہ زید و زینب اور مستشرقین

علامہ ابن کثیر اس حوالے سے لکھتے ہیں: ”تذکر ابن ابی حاتم و ابن جریر لھنا عن بعض السلف احبنا ان تضرب عنها صفحاً لعدم صحتها فلا نوردھا۔“

بعض علمائے سلف (ابن ابی حاتم اور ابن جریر طبری) نے یہاں کئی (موضوع) روایات نقل کی ہیں، لیکن وہ صحیح نہیں۔ لہذا ہم ان کا ذکر نہیں کرتے۔

علامہ ابن حبان اندلسی نے لکھا ہے کہ:

”لبعض المفسرين كلام في الآية يقتضي النقص من منصب النبوة ضربنا عنه صفحاً“
یعنی بعض مفسرین نے یہاں ایسی باتیں لکھی ہیں جو شان رسالت کے منافی ہیں، اس لئے ہم نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں: ”اما ما روى ان النبي صلى الله عليه وسلم هوى زينب امرأة زيدو ربما اطلق بعض المجان لفظ عشق فهذا اتما يصدر عن جاهل لعصمة النبي صلى الله تعالى عليه وسلم على مثل هذا او مستخف بحرمته“
کہ یہاں جو افسانہ گھڑا گیا ہے، یہ ان لوگوں کی طرف سے ہے جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت کا علم نہیں یا انہوں نے دانستہ شان نبوت کو گھٹانے کی کوشش کی۔

علامہ آلوسی کی بھی یہی رائے ہے۔ (الازہری، پیر کرم شاہ، ضیاء القرآن، لاہور ضیاء القرآن پبلیکیشنز، ۱۴۰۲ھ/۴-۶۳- ضیاء النبی ۷/۵۲۹)

علامہ ابوبکر ابن عربی اس اعتراض کی حقیقت اور اس قصے کے من گھڑت ہونے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”انه باطل لا يصح النظر اليه فانه كان معها في كل وقت و موضع ولم يكن هناك حجاب يمنعها منه فكيف تنشأ معه و ينشأ معها و ينظرها في كل ساعة ولا تقع في قلبه الا اذا كان لها زوج وقد وهبته نفسها و كرهت غيره فلم يخطر ذالك بباله فكيف يتجدد الهوى بعد العلم حاشا لئلا يلبس القلب المطهر من هذه العلاقة الفاسدة“
(محمد محمود الصواف / زوجات النبي الطاهرات و حكمة تعددهن، ص ۶۴)

یہ (من گھڑت) قصہ باطل ہے، اسے دیکھنا بھی درست نہیں ہے، حضرت زینب ہمہ وقت اور ہر جگہ آپؐ کے سامنے ہوتی تھیں، ان کے درمیان پردہ نہ تھا کہ رسول اللہؐ ان کو دیکھ نہ سکتے۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ دونوں نے ایک ساتھ پرورش پائی ہو، رسول اللہؐ انہیں دیکھتے رہے ہوں (وہ رسول اللہؐ کے سامنے رہی ہوں) لیکن ان کی محبت آپؐ کے دل میں پیدا نہ ہوئی ہو، اور جب ان کی شادی ہو چکی ہو تو اچانک آپؐ کے دل میں ان کی محبت پیدا ہو گئی ہو۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے جان آپؐ کی نظر کی تھی، اور کسی دوسرے کو پسند نہ کیا تھا، تاہم ان تمام باتوں کی آپؐ نے پروا نہیں کی تھی، تو جو محبت اتنے عرصے آپؐ کے دل میں پیدا نہ ہوئی، وہ بہ یک وقت اچانک کیسے پیدا ہو گئی؟ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب اطہر اس قسم کی خرافات سے قطعاً پاک ہے۔

جب حضرت زینب بنت جحشؓ کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا اس وقت ان کی عمر ۳۶ سال تھی، اسلام میں حجاب کا حکم بھی اس وقت تک نازل نہ ہوا تھا۔ ان دونوں فقروں کو یاد رکھنے کے بعد کوئی بھی شخص مستشرقین کی اس لغو داستان کو باور نہ کر سکے گا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینبؓ کے حسن کو یکا یک دیکھ کر ان پر فریفتہ ہو گئے تھے، حضرت زینبؓ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے پللی بڑھیں، ان کی شکل و صورت کیوں کر آنحضرتؐ سے پوشیدہ رہ سکتی تھی، خصوصاً جب کہ ابھی پردے کا حکم بھی نازل نہ ہوا تھا۔ ۳۶ سالہ عورت کا حسن اور وہ بھی عرب جیسے گرم خطے کی خاتون جہاں عورتوں کا شباب جلد ڈھل جاتا ہے، ایسا کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ زید بن حارثہؓ (ایک آزادہ کردہ غلام) تو ان سے بے زار ہو جائے اور سید الانبیاء، امام الاقطیاء ان پر شیفتگی کا اظہار کریں۔ عقل اور عادات و تجربہ اور مشاہدہ ایسی وہی باتوں کی تکذیب کے لئے کافی ہیں۔ (قاضی محمد سلیمان منصور پوری/ رحمۃ اللعالمین ۱۹۱/۲)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عظمتیں عطا کرنے والا خود رب کریم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین آپؐ کے مقام کو گھٹانے کی جتنی کوشش کرتے ہیں ان پر ان کو سوائے حسرت کے کچھ

نہیں ملتا۔ مستشرقین نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کردار کشی کے لئے حضرت زینبؓ کی محبت میں گرفتار ہونے کا جو افسانہ تراشا تھا، اس سے بھی وہ مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں کر سکے بلکہ خود ان کی صفوں میں سے متعدد لوگ سامنے آئے جنہوں نے اس افسانے کی تردید کر دی۔ وہ مغربی اہل علم جنہوں نے مستشرقین کے اس افسانے کو تاریخی حقائق کی روشنی میں پرکھا ہے، انہوں نے اس کو بے بنیاد اور ناقابل تسلیم قرار دیا ہے۔ منگمری واٹ ان لوگوں میں سے ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے کے مواقع تلاش کرتے ہیں۔ لیکن یہ افسانہ اس کو بھی ناقابل تسلیم نظر آیا ہے اور اس نے اس افسانے کے متعلق ایسے تاثرات کا اظہار کیا ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قبیح الزام سے بری ثابت کرتے ہیں۔ منگمری واٹ لکھتا ہے:

"Despite the stories, then, it is unlikely that he was swept off his feet by the physical attractiveness of Zaynab. The other wives are said to have feared her beauty, but her age when she married Muhammad was thirty-five, or phrhaps rather thirty-eaght, which is farily advanced for an Arab woman".

(Montgomery Watt/Muhammad At Medina, P:133)

ہر قسم کی کہانیوں کے باوجود یہ بات ناممکن ہے کہ زینب کی جسمانی کشش کی وجہ سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قدم ڈمگائے ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دوسری بیویاں زینب کے حسن سے خائف تھیں لیکن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ شادی کے وقت ان کی عمر پینتیس بلکہ اڑتیس سال تھی۔ ایک عرب عورت کے لئے یہ بڑی عمر شمار ہوتی ہے۔ منگمری واٹ ایک اور مقام پر اس افسانے کے متعلق یہ تبصرہ کرتا ہے:

"It is most unlikely that at the age of fifty-six such a man as he should have been carried away by a passion

for a woman of thirty-five or more".

یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسا ایک چھپن سالہ شخص ایک ایسی عورت کے متعلق جذبات کی رو میں بہہ گیا ہو جس کی عمر پینتیس سال یا اس سے بھی زیادہ تھی۔ یہی مستشرق حضرت زینب کے ساتھ حضورؐ کی شادی کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"The criticism of Muhammad, then was based on a pre-Islamic idea that was rejected by Islam, and one aim of Muhammad in contracting the marriage was to break the hold of the old idea over men's conduct. How important was this aim compared with others which he might have had?" (Montgomery Watt/ Muhammad At Medina, P:330)

نیز دیکھئے: الا زہری/ ضیاء النبی ۷/ ۵۳۷، ۵۳۸

زینب بنت جحش سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شادی کے وقت، ان پر جو تنقید ہوئی تھی، اس کی وجہ زمانہ جاہلیت کی ایک رسم تھی جس کو اسلام نے ختم کر دیا تھا۔ اس شادی سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ لوگوں کے رویے پر اس پرانی رسم کا جو غلبہ تھا، اس کو ختم کیا جائے۔ اس شادی کا یہ مقصد اس کے دیگر ممکنہ مقاصد کے مقابلے میں کتنا اہم تھا؟

سطور بالا میں جو حقائق پیش کئے گئے ہیں، ان کے پیش نظر یہ بات بلا خوف تر دید کہی جاسکتی ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر تمام شادیاں خواہشات کی تسکین کے لئے نہیں ہوئی تھیں بلکہ عظیم سیاسی، سماجی اور علمی مقاصد کی خاطر تھیں، اسی طرح حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ آپ کا نکاح بھی انہی عظیم مقاصد کی خاطر ہوا تھا۔ اور آپ اس قسم کے انسان نہ تھے جس قسم کا انسان آپ کو مستشرقین قرار دیتے ہیں۔

یہاں مستشرقین اور دیگر معترضین سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نکاح پر رنگ آمیزی کر کے آپ کی حیات طیبہ کو داغ دار کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتوں اور منفی

کوششوں کو صرف کرتے نظر آتے ہیں، یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ وہ یہ بتائیں کہ حضرت زینبؓ سے نکاح کے حوالے سے جو افسانہ تراشا گیا ہے کیا اس قسم کے خود ساختہ افسانے کے مرکزی کردار سے زندگی میں کسی عظیم کارنامے کی توقع کی جاسکتی ہے؟

(مستشرقین کی ذہنی اختراع کے مطابق) جو شخص ساٹھ سال کی عمر میں بھی اپنے جذبات قابو میں نہیں رکھ سکتا، (نعوذ باللہ) صنف نازک کی کشش سے وہ رشتوں کے تقدس کو بھی بھول جاتا ہے، اپنی شہرت اور وقار کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایسے کام کرتا ہے جو خود اس کے اصولوں کے بھی خلاف ہوں اور اس کے وقار کے لئے بھی تباہ کن ہوں، کیا یہ ممکن ہے کہ ایسا شخص جب غفوان شباب میں تھا تو اس وقت اس کے جذبات کنٹرول میں ہوں گے اور وہ جذبات سے آزاد ہو کر انسانیت کی خدمت میں مگن ہوگا؟

اس بات کو نہ عقل سلیم تسلیم کرتی ہے اور نہ انسانی تجربہ، ساٹھ برس کی عمر جذبات کی طغیانی کی عمر نہیں، اس عمر میں انسان کی عقل اس کے جذبات پر غالب ہوتی ہے۔ جس شخص کی حالت ساٹھ سال کی عمر میں یہ ہو، لامحالہ وہ اپنے دور شباب میں اپنی خواہشات کے ہاتھوں ایک کھلوٹا بنا ہوگا اور ایسے شخص سے کسی عظیم کام کی توقع نہیں کی جاسکتی، لیکن مستشرقین جس مقدس ہستی کو افسانے کا مرکزی کردار بتاتے ہیں، اس کے کارہائے نمایاں کا انکار کرنے کی جرأت کوئی دشمن بھی نہیں کر سکتا۔

راج پال لعلین جس نے اپنی کتاب کامرزی محور کردار ہی رسالت مآبؐ کی ازدواجی زندگی کو بنایا، اپنی ناپاک کتاب کو اسی عنوان سے معنون کرنے کی ناپاک جسارت کی، وہ بھی آپؐ کی باعفت و عصمت زندگی بالخصوص جوانی کے دور کے بارے میں حقیقت کے اعتراف سے باز نہ رہ سکا۔ وہ بھی اعتراف حقیقت پر مجبور رہا، اس نے لکھا:

”محمدؐ کا پہلا نکاح پچیس سال کی عمر میں ہوا۔ یہاں تو آریہ سماجیوں کو ماننا پڑے گا کہ محمدؐ نے شاستر کے مطابق زندگی کا پہلا حصہ محرومہ کر گزارا، محمدؐ بڑھپاری تھے۔“ اور وہ ان کا حق تھا کہ وہ شادی کریں“ (مطبوعہ ۱۹۲۳ء ص ۷)

وہ یہ بھی مانتا ہے کہ: ”محمدؐ برہمچاری تھے، انہوں نے بچپن برس کی عمر تک شادی نہیں کی اور عالم جوانی کے نمونہ جات کے باوجود بدکاری سے بچے رہے۔ (ایضاً، ص ۸) مخالف کو یہ بھی تسلیم ہے: ”میعاد خانہ داری کے بچپن برس محمدؐ ایک ہی بیوی پر قانع رہے اور وہ بھی دو خاوندوں کی بیوہ جو نکاح کے وقت چالیس برس کی اور انتقال کے وقت پینسٹھ برس کی تھی، اس بوڑھی خاتون سے محمدؐ کی بھگتی۔ یہ بات محمدؐ کی پاکیزہ خاطر پر دلالت کرتی ہے۔ (ایضاً، ص ۱۸، نیز دیکھئے! ثناء اللہ امرتسری، مقدس رسول، ص ۳۹) جان ڈیون پورٹ (John Davenport) اسی تاریخی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی تصنیف (An Apology for Muhammad and Kuran) میں لکھتا ہے:

It should be remembered that he lived from the age of five-and-twenty to that of fifty years satisfied with one wife; that until she died at the age of sixty-three he took no other, and that left him without male issue; and it may then be asked, is it likely that a very sensual man, should be contented for five and twenty years with one wife, she being fifteen years older than himself; (John Davenport/ An Apology for Muhammad and Kuran, P: 25, 26)

(محترم نظیر علی قریشی نے اپنی کتاب "The Mother of the Believers" میں اس قسم کی بہت سی آراء ذکر کی ہیں۔)

یہ یاد رہے کہ آپؐ بچپن سے پچاس سال کی عمر تک ایک ہی بیوی پر قانع رہے اور ان کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے، اور ان کی ۶۳ سال کی عمر میں وفات تک آپؐ نے کوئی اور شادی نہیں کی، اور اس وقت آپؐ کی کوئی زینہ اولاد بھی نہیں تھی، تب یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا یہ بات حقیقت ہے کہ ایک نفسانی خواہش کا تابع شخص مکمل بچپن سال تک ایک ہی اور وہ بھی اپنے سے چند سال بڑی بیوی پر قانع رہے؟

روایت طبری کی استنادی حیثیت

امام طبری نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں قصہ زینبؓ ’یونسؑ، ابن وہبؒ، ابن زیدؒ‘ کی سند سے روایت کیا ہے۔ (تفسیر الطبری المجلد العاشر ص ۳۰۲۔ تحت رقم ۲۸۵۱۹، تاریخ الامم والملوک الجزء الثانی ص ۲۳۲)

سند کا یہ سلسلہ ’’ابن زید‘‘ پر ختم ہوتا ہے۔ ان کا نام ’عبدالرحمن بن زید بن اسلم العدوی المدنی‘ ہے۔ یہ ۱۸۲ھ میں فوت ہوئے ہیں اس طرح ان کا تابعی ہونا بھی محل نظر ہے، لہذا روایت میں انقطاع پایا جاتا ہے اور منقطع روایت سے احتجاج نہیں کیا جاسکتا۔ عبدالرحمن بن زید پر ائمہ کی جرح ملاحظہ فرمائیں:

امام بخاری فرماتے ہیں: ”ضعفه علی بن المدینی نے ان کو بہت ضعیف کہا ہے۔

امام نسائی، امام احمد اور امام ابو زرعد نے بھی ان کی تضعیف کی ہے۔ امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ زید بن اسلم کے تمام بیٹے ضعیف ہیں۔

امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں: ”یس هو ممن یحتج أهل العلم بحديثه السوء حفظه و هو رجل ضاعته العبادة والتشرف“ وہ ان لوگوں میں سے نہیں جن کی حدیث سے ان کے کمزور حافظ کی بناء پر اہل علم استدلال کر سکیں ان کا اصل کام عبادت و زہد ہے۔

امام ابن جوزی فرماتے ہیں: ”اجمعوا علی ضعفه“ ان کے ضعف پر اجماع ہے۔ امام ابن حبان فرماتے ہیں: ”کان یقلب الاخبار و هو لا یعلم حتی کثر ذلك فی روايته من رفع المراسیل و بأسناد الموقوف فاستحق الترك“ وہ روایات کو لاشعوری طور پر پلٹ دیتے تھے یہاں تک کہ ان کی مراسیل میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ

امام طبری --- کون؟ قصہ زید و زینب: _____ روایت طبری کی استنادی حیثیت

مرسل کو مرفوع بنادیا اور موقوف کو مسند کر دیا لہذا ان کی روایات قابل ترک ہیں۔

امام طحاوی فرماتے ہیں:

”حدیثہ عند اهل العلم بالحديث في النهاية من الضعف“

علمائے حدیث کے نزدیک ان کی احادیث انتہائی ضعیف ہیں۔

امام حاکم عبد الرحمن بن زید بن اسلم کے متعلق لکھتے ہیں: ”روی عن أبيه أحاديث

موضوعة لا يخفى على من تأملها من أهل الصنعة أو الحمل فيها عليه“

ابن زید نے اپنے والد کے نام سے موضوع احادیث روایت کی ہیں اور اس فن سے

شغف رکھنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں کہ اس کی تمام تر ذمہ داری خود اس پر ہی پڑتی ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ: ایک شخص نے عبد الرحمن بن زید بن اسلم سے پوچھا: کیا تم

نے اپنے والد سے یہ روایت سنی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی نے بیت اللہ کا طواف کیا

اور مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھی؟ اس نے جواب دیا: ہاں میں نے یہ روایت سنی ہے۔

اس کے علاوہ امام مالک، امام ابن معین، امام ابن سعد، ابو نعیم اور جوزجانی سے بھی

اس راوی پر سخت جرح منقول ہے۔ ملاحظہ ہو: التاريخ الكبير للامام بخاری جلد ۳

ص ۲۸۴، تہذیب التہذیب جلد ۶۔ ص ۱۷۷ تا ۱۷۸ و تقریب التہذیب

جلد ۱۔ ص ۴۸۰ لابن حجر، میزان الاعتدال جلد ۲۔ ص ۵۶۵۔ للذهبی،

المدخل الى الصحيح جلد ۱۔ ص ۱۷۱۔ للحاکم۔

امام طبری نے اپنی تاریخ میں قصہ زینب سے متعلق دوسری روایت اس سند سے بیان

کی ہے کہ: حدثت عن محمد بن عمر قال حدثني عبد الله بن عامر الاسلمي

عن محمد بن يحيى بن حبان ... (تاريخ الامم والملوك الجزء الثاني ص

۲۳۱۔ تحت ”ثم كانت السنة الخامسة من الهجرة“)

امام طبری کہتے ہیں کہ مجھ سے بیان کیا گیا اور وہ اسے محمد بن عمر سے روایت کرتا ہے۔ امام

طبری ماشاء اللہ خود بھی اپنے مخصوص ”افکار و نظریات“ کے حوالے سے ناقابل اعتبار ہیں ہی مگر

امام طبری --- کون؟ قصہ زید و زینب: _____ روایت طبری کی استنادی حیثیت

یہاں وہ یہ فرما رہے ہیں کہ مجھ سے بیان کیا گیا یعنی میں نے خود محمد بن عمر سے یہ روایت نہیں سنی۔

وہ خود سن بھی کیسے سکتے تھے کیونکہ محمد بن عمر طبری کی ولادت سے بھی ۷۱ سال پہلے فوت ہو چکے

تھے۔ اب جس شخص نے بھی محمد بن عمر سے یہ روایت سن کر اسے طبری تک پہنچایا، طبری نے اس کا

نام نہیں لیا، اگر وہ یہ نام ذکر کر دیتے تو پھر یہ معلوم کرنا آسان ہو جاتا کہ ان کا ”شیخ“ کس کردار،

کس قماش اور کس جنس کا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی ”شیطان“ جسے ہوا اور اگر وہ انسان ہی ہو تو

شیطان انسانوں میں سے بھی ہو سکتا ہے اور اس نے ان پر یہ روایت القاء کر دی ہو۔

اگر بقول طبری شیطان شریک کلمات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جاری

کر سکتا ہے (العیاذ باللہ) تو پھر شیطان راوی پر القاء کیوں نہیں کر سکتا۔ بلکہ قرآن مجید کے

اعلان کے مطابق اس کی وحی شیطانوں ہی کی طرف ہوتی ہے خواہ ان کا تعلق جنوں سے ہو یا

انسانوں سے ”وَكَمْ لَكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عُلُوًّا شَيَاطِينُ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ

إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا... (الانعام ۱۱۲)

ہر نبی کے لئے ہم نے شیطان انسان اور جن دشمن بنائے ہیں جو ایک دوسرے کے دل

میں باتیں دھوکا دینے کے لئے ڈالتے رہتے ہیں۔

”قُلْ الشَّيَاطِينُ لِيُؤْخَذُوا إِلَى أُولِيَاءِهِمْ لِئَجْأِدُلُوكُمْ“ (الانعام ۱۲)

اور بے شک شیطان ڈالتے ہیں اپنے دوستوں کے دلوں میں (اعتراضات) تاکہ وہ

تم سے جھگڑیں۔

روایت کے متن سے لگتا یہی ہے کہ وہ کسی ”شیطان“ ہی کی القاء کر رہے ہیں۔ بہر حال

امام طبری ہی بہتر جانتے ہیں کہ اپنے ”شیخ“ راوی کا نام مخفی رکھنے میں کیا حکمت پنہاں ہے؟

اگر کسی ظالم راوی نے ان پر یہ روایت القاء کر ہی دی تھی تو پھر بھی انہیں اس کمرہ و

موضوع روایت کو اپنی کتاب میں محفوظ کر کے دشمنان اسلام کو ہتھیار فراہم نہیں کرنا چاہئے

تھا۔ کاش امام طبری ارشاد باری:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنِّ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا.....“ (الحجرات)

امام طبری --- کون؟ قصہ زید و زینب: روایت طبری کی استنادی حیثیت

اور ارشاد نبی: ”كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحْلِلَتْ بِكُلِّ مَا سَمِعَ يَكُونُ بِشَيْءٍ نَظَرَ رَكَهَ لَيْتَ۔“
اگر بالفرض امام طبری کا راوی فی الواقع ”ثقة“ تھا اور اس نے محمد بن عمر سے بٹائی ہوش و
حواس یہ روایت سن کر امام طبری تک پہنچائی ہے تو پھر اس تمام فساد کا منبع و سرچشمہ یہی راوی ہے۔
اس راوی کا پورا نام محمد بن عمر بن واقد الاسلمی المدنی ہے۔ اس کا دادا واقد، عبداللہ بن
بریدہ بن الحصیب کا غلام تھا۔ یہ راوی ”واقدي“ کے نام سے معروف ہے۔ ۱۳۰ھ میں پیدا
ہوا اور ۲۰۷ھ یا ۲۰۹ھ میں فوت ہوا۔

امام شافعی فرماتے ہیں: ”كتب الواقدي كلها كذب“ واقدي کی کتابیں جھوٹ کا
پلندہ ہیں۔ بلکہ سمعانی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ واقدي کی جانب جتنی کتابیں منسوب ہیں
یہ اس کی اپنی تصانیف نہیں بلکہ ابراہیم بن محمد المدنی رافضی کی تصانیف ہیں چونکہ وہ بہت
بدنام ہو چکا تھا اس لئے واقدي نے اس کی کتابوں کو اپنے نام سے پھیلایا۔ یہی بات نواب
مہدی علی خان نے اپنی کتاب ”آیات بینات“ میں تحریر کی ہے۔

امام اسحاق بن راہویہ (م ۲۳۷ھ) نے کہا:

”عندی ممن يضع الحديث“ میرے نزدیک یہ حدیث گھڑنے والوں میں سے تھا۔
امام بخاری: ”سكتوا، ما عندی له حرف، متروك الحديث“ محدثین نے واقدي
سے اعراض کیا ہے، میرے پاس اس کا ایک حرف بھی نہیں، وہ متروك الحدیث ہے۔
ابو حاتم رازی نے کہا: ”متروك..... واستقر الاجماع على وهن الواقدي“
واقدي متروك ہے..... اس کے وہ بن پر اجماع ہے۔

امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ واقدي نے فتح یمن اور عسّی کے بارے میں زہری سے
احادیث روایت کی ہیں: ”ليست من حديث الزهري“ حالانکہ وہ زہری کی احادیث نہیں۔
امام نسائی فرماتے ہیں:

”والكنابون المعروفون بوضع الحديث على رسول الله صلى الله عليه
وسلم أربعة: ابن أبي يحيى بالملينة والواقدي ببغداد ومقاتل بن سليمان

امام طبری --- کون؟ قصہ زید و زینب: روایت طبری کی استنادی حیثیت

بخراسان و محمد بن سعيد بالشام“
اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حدیثیں گھڑنے والے مشہور و معروف جھوٹے راوی چار ہیں۔
(۱) مدینے میں ابن ابی یحییٰ (۲) بغداد میں واقدی
(۳) خراسان میں مقاتل بن سلیمان (۴) اور شام میں محمد بن سعید
امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

”كان يكذب و يضع الحديث..... هو كذاب يقلب الاحاديث“
واقدي جھوٹ بولتا تھا اور احادیث گھڑتا تھا، وہ کذاب ہے اور احادیث کو الٹ پلٹ دیتا تھا۔
امام ابن عدی فرماتے ہیں:
”وهو في جملة من يضع الحديث“ یہ ان لوگوں میں سے تھا جو حدیث گھڑتے تھے۔
امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں: ”ليس بشيء“ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔
امام علی بن المدینی فرماتے ہیں:

”لا أرضاه في الحديث ولا في الأنساب ولا في شيء“ میں واقدي کو نہ
حدیث میں، نہ علم انساب میں اور نہ ہی کسی اور شئی میں پسند کرتا ہوں۔
(میزان الاعتدال للذہبی جلد ۳ ص ۱۱۰۔ طبع قدیمی مصری تحت محمد بن عمر بن واقد
الاسلمی، تہذیب التہذیب لابن حجر جلد ۹ ص ۳۶۲۔ ۳۶۶ تحت محمد بن عمر الواقدي، الجرح
والتعديل لابی حاتم جلد ۸ ص ۲۱)

مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۳ء) واقدي کے متعلق لکھتے ہیں:

”سيرت نبوی کے متعلق ان کی دو کتابیں ہیں۔ کتاب السیرت اور کتاب التاريخ
المغازی والمبعث، امام شافعی فرماتے ہیں کہ واقدي کی تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہے۔
ایک ظریف محدث نے خوب کہا ہے کہ ”اگر واقدي سچا ہے تو دنیا میں کوئی اس کا ثانی نہیں
اور اگر جھوٹا ہے تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں.....“

ان میں سے واقدي تو بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہے۔ محدثین بالاتفاق لکھتے

امام طبری --- کون؟ قصہ زید و زینب: روایت طبری کی استنادی حیثیت

ہیں کہ وہ خود اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے اور حقیقت میں واقعہ کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی کوما کوم اور دلچسپ تفصیلیں وہ بیان کرتا ہے آج کوئی بڑے سے بڑا واقعہ نگار چشم دید واقعات اس طرح قلم بند نہیں کر سکتا۔ (سیرت النبی جلد اول ص ۲۵۹۔ تحت ”واقعہ ی اور سیرت، فن سیرت پر تبصرہ)

اس تفصیل سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ قصہ سیدہ زینب سے متعلق امام طبری کی تفسیری و تاریخ میں منقولہ روایات کے راوی عبد الرحمن بن زید بن اسلم اور محمد بن عمر واقعہ انہر رجال کے نزدیک ناقابل اعتبار، ناقابل احتجاج، ضعیف، متروک الحدیث، کذاب اور واضح الحدیث یعنی احادیث گھڑنے والے تھے۔

صد افسوس کہ امام طبری و امثالہ نے ایسے وضاع اور کذاب راویوں سے مروی روایات کی بناء پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت، عصمت، نہیت اور دل و نگاہ پر براہ راست حملہ کر دیا۔ یہ تو خیر پھر اس ”کردار“ کے حامل راوی ہیں اگر بالفرض سارے ہی راوی صدوق و ثقہ ہوتے تو پھر بھی ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی منافی عصمت روایات ہرگز قبول نہیں کی جاسکتیں۔

مگر صد افسوس! روزنامہ اسلام کے کالم نگاران روایات کو ”علمی ورثہ“ قرار دے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

”درحقیقت مستشرقین اور ان کے تلامذہ منکرین حدیث کے فکری حیلوں سے دفاع کا یہ طریقہ بہت ہی کمزور ہے کہ وہ جس روایت پر اشکال کریں، ہم اسے اپنے علمی ورثے سے خارج کرنے (کا) اعلان کر دیں۔ ایسی کون سی چیز ہے جو ان کج فہموں کے نزدیک قابل اعتراض نہیں۔ واقعہ زینب سے کہیں زیادہ زور و شور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعدا و ازدواج پر اعتراض کیا جاتا ہے!“ (روزنامہ اسلام ۱۲۔ اگست ۲۰۱۵ء)

انبیائے کرامؑ اور حضرات صحابہؓ کی توہین پر مبنی روایات اگر ”علمی ورثہ“ ہے تو یہ آپ کو مبارک ہو۔

قصہ زینب سے متعلق روایات کی ”استنادی حیثیت“ کے بعد ان کی ”دراستی حیثیت“ ملاحظہ فرمائیں:

امام طبری --- کون؟ قصہ زید و زینب: روایت طبری کی درایتی حیثیت

روایت طبری کی درایتی حیثیت

امام طبری و امثالہ نے سیدہ زینب کا جو قصہ بیان کیا ہے کہ ”جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر سیدہ زینب پر پڑی تو آپ کے دل میں ان کی محبت کھلبلی تھی“، ”زروئے درایت بھی باطل ہے۔ کیونکہ سیدہ زینب آپ کے لئے کوئی اجنبی خاتون نہ تھیں بلکہ آپ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ آپ کے گھر کے سامنے ان کا بچپن گزرا، آپ کے سامنے وہ پلی بڑھیں، بچپن اور جوانی آپ کے سامنے تھی، آپ کا اپنی پھوپھی کے گھر آنا جانا رہتا، آپ نے ایک دفعہ نہیں بلکہ ہزاروں مرتبہ انہیں دیکھا ہوا تھا، سیدہ زینب اسلام کے ابتدائی دور میں ایمان سے مشرف ہوئیں، ہجرت سے بھی سرفراز ہوئیں۔ غرضیکہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جو آپ سے مخفی تھا۔ آپ نے خود بہ اصرار حضرت زید کے لئے ان کا رشتہ طلب فرمایا۔ ان کے نکاح، مہر اور رخصتی سمیت تمام لوازمات ادا کئے۔ اس وقت پردہ کے احکام بھی مازل نہیں ہوئے تھے وہ تو ان کے ام المؤمنین کے شرف سے مشرف ہونے کے بعد مازل ہوئے تھے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ جب وہ کنواری تھیں اور آپ کے حرم کی زینت بننے کو اپنے لئے اور اپنے کنبہ کے لئے باعث صد عزت محسوس کرتی تھیں، سیدہ خود اور ان کے بھائی بھی چاہتے تھے کہ آپ ان سے نکاح کر لیں۔ سخت حیرت ہے کہ اس وقت تو آپ کے دل میں کوئی کشش پیدا نہ ہوئی اور جب ایک سال سے زائد عرصہ حضرت زید کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کر چکیں تو اچانک ”ہوا“ نے سیدہ زینب کے گھر کا پردہ اٹھا دیا اور آپ انہیں برہنہ سر دیکھ کر ان پر فریفتہ ہو گئے۔ کیا اس بے سرو پا، بے ہودہ، منافی عصمت اور سراسر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تنقیص پر مشتمل قصہ کو ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے؟

امام طبری --- کون؟ قصہ زید و زینب: _____ روایت طبری کی درایتی حیثیت

بلکہ کیا کوئی مسلمان اس قصہ کا تصور بھی کر سکتا ہے؟

اس طرح کے بے ہودہ قصے کسی تفسیر یا مذہبی کتاب کی زینت بننے کے بجائے روئی کی ٹوکری میں پھینک دینے کے قابل ہیں کیونکہ یہ قصے اور روایات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا کا باعث ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے اسی سورۃ الاحزاب ہی کے آخری رکوع میں اہل ایمان کو منع فرمایا کہ:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا“ (الاحزاب ۶۹)

اے ایمان والو! نہ بن جانا ان (بدبختوں) کی طرح جنہوں نے موسیٰ کو ستایا۔ پس بری کر دیا انہیں اللہ تعالیٰ نے اس سے جو انہوں نے کہا۔ اور آپ اللہ کے نزدیک بڑی شان والے تھے۔

بنی اسرائیل کا دطیرہ یہ تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بات بات پر دکھ دیتے تھے، قدم قدم پر مخالفت کرتے تھے اور انہیں تہمتوں اور سازشوں سے اذیتیں پہنچاتے تھے، باوجود اس کے کہ انہیں اپنا رسول بھی مانتے تھے لیکن ان کے احکام سے سر تابی کرنا ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ تو رات میں موسیٰ علیہ السلام کی دل آزاری کے کئی واقعات پائے جاتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر الزام و تہمت سے بری کر کے نہایت عزت و آبرو کے ساتھ اس دنیا سے اٹھالیا۔ بنی اسرائیل نے اپنے جلیل القدر پیغمبر پر حضرت ہارون علیہ السلام کے قتل کا الزام لگایا حتیٰ کہ آپ پر بدکاری کا بھی الزام لگا دیا۔ بعض روایات کے مطابق مذکورہ آیت حضرت زینبؓ سے نکاح کے قصہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر اصل مقصود نہیں بلکہ بتانا یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی الزامات لگائے گئے، حضرت زینبؓ سے متعلق زیر بحث قصہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا کا ذکر کر کے اہل ایمان کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو! کہ تم بنی اسرائیل کی روش اختیار کر کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دل آزاری نہ کرنا ورنہ تم

امام طبری --- کون؟ قصہ زید و زینب: _____ روایت طبری کی درایتی حیثیت

کو اس گستاخی کی ایسی سزا ملے گی جس سے نجات کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر وہ چیز جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچے وہ قطعاً ممنوع اور حرام ہے۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ سے خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن عام طور پر منافقین کی طرف ہے کیونکہ مخلص اور سچا مسلمان آپ کو اذیت پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے:

”إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا“ (المزمل ۱۵)

یقیناً ہم نے بھیجا ہے ہماری طرف ایک (عظیم الشان) رسول تم پر گواہ بنا کر جیسے ہم نے فرعون کی طرف (موسیٰ) کو رسول بنا کر بھیجا۔

یعنی جو سلوک بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا وہی سلوک آپ کی قوم اور منافق بھی آپ کے ساتھ کریں گے۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اذیت پہنچائی تو یہ بھی آپ کو ہر طرح کی اذیت سے دوچار کریں گے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

”تَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِيرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ لَوْ سَلَكَوا لُجَجَرَ ضَبَّ لَسَلَّكُمْ مَوْءُ قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى؟ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَمَنْ؟ (صحيح البخاری کتاب الانبياء باب ما ذكر عن بنی اسرائيل - رقم الحديث ۳۴۵۶، کتاب الاعتصام باب لتبعن سنن من كان قبلکم - رقم الحديث ۷۳۲۰)

تم لوگ ضرور ان لوگوں کی پیروی کرو گے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں وہ جدھر بالشت بھر گئے تم بھی بالشت بھر جاؤ گے، وہ جدھر گز بھر گئے تم بھی گز بھر جاؤ گے یہاں تک کہ اگر وہ سوسمار کے سوراخ میں گھسے تو تم بھی ضرور سوسمار کے سوراخ میں گھسو گے۔ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! کیا پہلے گزرے ہوئے لوگوں سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا: یہو دو نصاریٰ نہیں تو اور کون؟

اس حدیث میں بالشت اور گز سے مراد اہل کتاب کے ساتھ ہر امر قلیل و کثیر اور ادنیٰ و اعلیٰ میں موافقت کرنا ہے۔ صحیح مسلم میں بھی یہ روایت آئی ہے۔ امام نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ تھا جو پورا ہو گیا وہ اگر اس زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھتے تو یقیناً کہتے کہ یہ یہو دو نصاریٰ سے بھی بدتر ہو گئے ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا:

”ثُمَّ تَبَيَّنَ عَلَى أُمَّتِي كَمَا أَتَى عَلَٰ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ حَذُو النَّعْلِ بِالنَّعْلِ.....“

جو کچھ بنی اسرائیل پر گز راوی ماجرا میری امت پر بھی گزرنے والا ہے جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے۔

جب کہ حدیث ابی واقد لیشی میں قصہ ذات انواط کے ذیل میں فرمایا:

”وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتُرَكَّبَنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ“ (رواۃ الترمذی)

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم ضرور اگلے لوگوں کی چال پر چلو گے۔

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب کی اعتقادی خرابیاں اور بد اعمالیاں مسلمانوں میں پیدا ہونی ضروری و لازمی ہیں۔ عوام و خواص کے حالات خود اس پر شاہد ہیں۔

قصہ زینبؓ کے حوالے سے بھی سورۃ الاحزاب کی آیت ۶۹ میں اہل ایمان کو جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا دہی اور آپ پر الزام تراشیوں سے منع کیا گیا ہے وہیں ان الزامات سے موسیٰ علیہ السلام کی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برأت کا بھی اعلان کیا گیا ہے۔ جو حضرات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ عبارات اور ان بے ہودہ قصوں کو ”علمی ورثہ“ قرار دیتے ہیں یا ان کا دفاع کرتے ہیں انہیں مذکورہ تفصیل کی روشنی میں اپنے ”موقف“ کا ضرور جائزہ لینا چاہئے۔

قصہ زینبؓ علماء اسلام کی نگاہ میں

اس عنوان کے تحت یہاں بطور نمونہ حسب ذیل مفسرین و محقق علماء کی آراء و نظریات کی جاتی ہیں:

(۱)	قاضی ابوبکر ابن العربی (م ۵۴۳ھ)
(۲)	قاضی عیاض (م ۵۴۴ھ)
(۳)	امام ابو حنیان اندلسی (م ۷۴۵ھ)
(۴)	امام ابن کثیر (م ۷۴۷ھ)
(۵)	حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)
(۶)	علامہ محمود آلوسی (م ۱۲۷۰ھ)
(۷)	مولانا عبدالحق حقانی دہلوی (م ۱۳۳۵ھ)
(۸)	مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء)
(۹)	مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاری (م ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء)
(۱۰)	مولانا محمد ادریس کاندہلوی (م ۱۹۷۷ء)
(۱۱)	مولانا عبدالمجید دریابادی (م ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۷ء)
(۱۲)	شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان (م ۱۹۸۰ء)
(۱۳)	پیر سید محمد کرم شاہ ازہری (م ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۸ء)
(۱۴)	شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

۱۔ قاضی ابوبکر ابن العربی (م ۵۴۳ھ)

یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ زینبؓ کو دیکھا تو وہ آپؐ کے دل میں گھر کر گئیں۔ زینبؓ کو تو آپؐ نے پہلے بھی دیکھا ہوا تھا۔ اس وقت تو پردہ بھی مانع نہیں تھا۔ بعد میں یہ تعلق کیسے پیدا ہو گیا۔ پہلے تو ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی لیکن جوں ہی زینبؓ کا نکاح ہوا ایک دم سے یہ معاملہ کیوں کر ہو گیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل ایسی بے ہودگیوں اور آلودگیوں سے پاک تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَلَا تَمْلِكُنَّ عُيُوبَكُمُ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فَبِئْسَ مَا يَرْزُقُونَ“ (طہ - ۱۳۱)

اور (اے نبی!) اپنی نگاہیں، ہرگز ان چیزوں کی طرف نہ دوڑانا جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو دنیاوی زندگی کی آرائش (کی خاطر) دے رکھی ہیں تاکہ انہیں اس میں آزمائیں، تمہارے رب کا دیا ہوا اس سے بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔

بلاشبہ عورتیں دنیا کی زیب و زینت ہیں مگر مطلقہ عورت میں جاذبیت کہاں اور پھر شادی شدہ عورت میں وہ کشش کب باقی رہتی ہے۔ فرمان الہی ہے:

”وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ“ (الاحزاب ۳۷)

اور آپ اپنے دل میں وہ بات چھپاتے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس نکاح کا معاملہ دل میں چھپائے ہوئے تھے، اس کے علاوہ کوئی بات نہیں تھی جو بعد میں سامنے آئی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں زینبؓ کی محبت ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور ظاہر فرما دیتے۔ یوں ہمیں یقین ہے کہ آپؐ نے جو بات دل میں چھپا رکھی تھی وہ ارادہ نکاح ہی کی بات تھی۔ گھٹیا اور گمراہ لوگ

جو کچھ تصور کئے بیٹھے ہیں وہ یہ معاملہ ہرگز نہیں تھا۔

(احکام القرآن لابن العربی جلد ۳ ص ۳۶۴-۳۶۵، بحوالہ سیرت انسائیکلو پیڈیا جلد ۷ ص ۱۲۶-۱۲۵) علامہ قرطبی مزید فرماتے ہیں کہ:

”اما ما روى أن النبي صلى الله عليه وسلم هوى زينب امرأة زيد و ربما اطلق بعض المجان لفظ عشق فهذا إنما يصدر عن جاهل لعصمة النبي صلى الله عليه وسلم على مثل هذا أو مستخف بحرمة“

یہاں جو افسانہ گھڑا گیا یہ ان لوگوں کی طرف سے ہے جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت کا علم نہیں ہے یا انہوں نے دانستہ شان نبوت کو گھٹانے کی کوشش کی۔

(بحوالہ ضیاء القرآن جلد چہارم ص ۶۴)

۲۔ امام قاضی عیاض (م ۵۴۴ھ)

امام قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ اگر وہ بات ہوتی جو قنادہ کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے محبت ہو گئی تھی اور آپ کو وہ پہلی معلوم ہوئی تھیں اور یہ کہ آپ اس کے خواہاں تھے کہ حضرت زیدؓ ان کو طلاق دے دیں، تو یقیناً یہ بات بڑے عیب کی تھی اور یہ ایسی بات ہے جو آپ کے شایان شان نہ تھی کہ آپ اس طرف نگاہ مبارک اٹھائیں جس کی ممانعت فرمادی گئی تھی یعنی دنیاوی زندگی کی خوبصورتی کی طرف:

”لکان هذا نفس الحسد المنعوم الذي لا يرضاه لا يتم به الانتفاء فكيف سيد الانبياء صلى الله عليه وسلم؟ قال القشيري: وهذا اقدام عظيم من قائله و قلّة معرفة بحق النبي صلى الله عليه وسلم وبفضله وكيف يقال: راها النساء يحتجبن منه (الشفاء بتعريف حقوق المصطفى جلد ۲ - ص ۶۷)

تو یقیناً یہ بات مذموم حسد کی بناء پر ہوتی جو آپ کو پسند نہیں ہے۔ اس فعل کو تو عام متقی لوگ بھی برا سمجھتے ہیں چہ جائیکہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مرتکب ہوں؟

امام قشیری فرماتے ہیں کہ: آپ کی طرف ایسے قول کی نسبت بھی بہت بڑی جرأت ہے اور اس قول کا قائل آپ کے حقوق اور آپ کی فضیلت کے بارے میں قلیل المعرفت ہے۔

اور یہ کیوں کر کہا جاسکتا ہے کہ آپ سیدہ زینبؓ کو دیکھتے ہی حیرت میں پڑ گئے اور ان کی محبت آپ کے دل میں کھب گئی حالانکہ وہ آپ کی پھوپھی کی بیٹی ہیں اور ان کی ولادت سے ہی برابر انہیں دیکھتے رہے ہیں اور نہ ہی یہ سب صحیح ہے کہ عورتیں آپ سے پردہ کرتی ہوں۔

علامہ آلوسی نے قاضی عیاض کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ”وقد رد ذلك القاضي عياض في الشفاء و

قال: لا تسترب في تنزيه النبي صلى الله عليه وسلم عن هذا“ (روح المعاني جلد ۲۲ ص ۲۴)

قاضی عیاض نے اس قول کا رد کیا ہے اور کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنزیہ ضروری ہے۔

۳۔ امام ابو حنیان اندلسی (م ۷۴۵ھ)

امام ابو حنیان اندلسی فرماتے ہیں کہ:

”والنبي معصوم في حركاته وسكناته، ولبعض المفسرين كلام في الآية يقتضي النقص من منصب النبوة، ضربنا عنه صفحاً“

(البحر المحيط جلد ۷ - ص ۲۳۴)

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حرکات و سکنات میں معصوم ہیں۔ بعض مفسرین نے یہاں ایسے قصے نقل کئے ہیں جن سے شان نبوت کی تنقیص ہوتی ہے اس لئے ہم نے ان کو نقل کرنا بھی کوارا نہ کیا۔

۳۔ امام ابن کثیر (م ۷۷۷ھ)

امام ابن کثیر ”وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ.....“ کے تحت فرماتے ہیں کہ:
 ”ذکر ابن ابی حاتم و ابن جریر لھنا آثاراً عن بعض السلف، أحببنا أن
 نضرب عنها صفحاً لعدم صحتها، فلا نوردھا“
 (تفسیر القرآن العظیم المجلد الثالث ص ۹۳ - طبع بیروت)
 ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے بعض سلف سے اس جگہ کچھ آٹا نقل کئے ہیں جن کا
 نقل کرنا بھی ہم نا مناسب جان کر ترک کرتے ہیں کیونکہ ان میں سے ایک بھی ثابت اور
 صحیح نہیں۔

۵۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی قصہ زینبؓ سے متعلق روایات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:
 ”ووردت آثار أخرى، أخرجها ابن أبي حاتم والطبري، ونقلها كثير
 من المفسرين، لا ينبغي التماثل بها، والذی أوردته منها هو المعتمد (فتح
 الباری جلد ۸ - ص ۵۲۴)
 اس سلسلے میں دوسرے آثار بھی وارد ہیں جنہیں ابن ابی حاتم اور طبری نے لیا ہے اور
 بہت سے مفسرین نے بھی نقل کیا ہے لیکن وہ تمام روایتیں اس لائق نہیں ہیں کہ ان کا ذکر بھی
 زبان پر لایا جائے۔ قابل اعتماد آثار وہی ہیں جن کو ہم نے اس جگہ بیان کر دیا ہے۔

۶۔ علامہ محمود آلوسی (م ۱۲۷۰ھ)

علامہ محمود آلوسی قصہ زینبؓ سے متعلق غلط اور باطل روایات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

”وللقصص في هذه القصة كلام لا ينبغي أن يجعل في حيز القبول“
قصہ کو اور داستان سرا لوگوں نے اس قصہ کے متعلق جو لچر باتیں اور افسانے تراشے ہیں وہ کسی حیثیت سے بھی اس لائق نہیں ہیں کہ انہیں قبول کر لیا جائے۔

موصوف علامہ خفاجی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

”إن القصة شبيهة بقصة داود عليه السلام...“

حضرت زینبؓ کے اس قصے میں حضرت داؤد علیہ السلام کے قصے کی مشابہت پائی جاتی ہے یعنی جس ڈھنگ سے یہودیوں نے حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے ایک سپاہی کی بیوی کا واقعہ پیش کیا ہے کہ حضرت داؤد ایک مرتبہ اپنے محل کی چھت پر ٹہلنے کے دوران پڑوس میں اپنے سپاہی اور یا کی بیوی کو غسل کرتے ہوئے دیکھ کر اس عورت پر فریفتہ ہو گئے تھے بعد میں اسی عورت کے ساتھ خود نکاح کر لیا۔ یہاں بھی یہ معاملہ پیش آیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ کو برہنہ سر دیکھ لیا تھا اور امام طبری و امثالہ کی تفسیر کے مطابق سیدہ زینبؓ کی محبت آپ کے دل میں کھب گئی تھی جس کی وجہ سے حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی تاکہ آپ ان کے ساتھ نکاح کر لیں۔

(روح المعانی الجزء الثاني والعشرون ص ۲۴-۲۵)

۷۔ مولانا عبدالحق حقانی دہلوی (م ۱۳۳۵ھ)

مولانا عبدالحق حقانی فرماتے ہیں کہ:

”واضح ہو کہ اسلام میں ظاہر ہو کر مخالف ہمیشہ سے اپنی کاریگری کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے بہت سی جھوٹی حدیثیں بھی گھڑی ہیں جن سے اسلام اور پیغمبرؐ پر بدناما دھبہ لگانا مقصود ہوتا ہے اور قرآن مجید کی تفسیر کرنے میں بھی وہ ایسی روایات شامل کر دیتے ہیں کہ جن سے آیات کا مطلب الٹ پلٹ ہو جاوے اور اسلام پر کوئی عیب لگے۔ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر انہوں نے ایسا کیا ہے۔

مجمملہ ان کے یہاں بھی عجیب و غریب روایات گھڑی ہیں: کسی نے کہہ دیا کہ زینبؓ اچھے کپڑے پہنے کھڑی تھی، پیغمبرؐ جو زیدؓ کے گھر میں گئے، زینبؓ کو دیکھ کر فریفتہ ہو گئے اور ”اللهم مقلب القلوب“ پڑھ کر چلے آئے۔ زینبؓ اس لگاؤٹ کو سمجھ گئی اس نے زیدؓ سے کہہ دیا زیدؓ کو غیرت آئی، طلاق دے دی۔

آپؐ نے جھٹ پٹ نکاح کر لیا بلکہ بے نکاح کئے شوق میں آ کر اس کے گھر میں گھس گئے اور اس سے ہم بستر ہوئے اور جو کسی نے پوچھا تو کہہ دیا کہ میرا نکاح اس سے آسمان پر ہو چکا ہے۔

”قَدْ تُخْفِي فِي نَفْسِكَ“ کے معنی زینبؓ کی محبت اور اس کا عشق مراد لیا ہے اور بعض نے کہا ہے اس سے مراد کہ دل میں تقیہ تھا کہ زیدؓ اس کو چھوڑ دے لیکن اس کو لوگوں سے ڈر کر ظاہر نہیں کرتے تھے اور بظاہر زیدؓ کو کہتے تھے کہ اس کو طلاق نہ دے۔

معاذ اللہ، معاذ اللہ نبی علیہ السلام پر کیا کیا بہتان باندھے ہیں، زینبؓ تو آپؐ کی پھوپھی زاد بہن تھی، لڑکپن سے آپؐ کے سامنے ہوتی تھی اور کون عورت تھی کہ جو حضرتؐ سے پردہ کرتی

تھی۔ پھر کیا آج ہی حضرتؑ نے نہیب کو دیکھا تھا اور اگر ابتداء سے محبت تھی تو زیدؑ سے کیوں نکاح کروایا جو مشکل اس کے ورثہ راضی ہوئے تھے آپؐ ہی نے کیوں نہ کر لیا جو بڑی خوشی سے اس کے وارث منظور کر لیتے۔ ان بے دینوں سے تو یہ بہتان بندی کچھ بھی تعجب نہیں۔ مگر تعجب تو اپنے بعض سیدھے سادھے، بھولے بھالے مفسرین سے ہے کہ انہوں نے ان کی روایات کو اپنی تفاسیر میں نقل کر دیا اور ان کے اس کہنے سے ڈھوکے میں آ گئے: ”حدثنا فلان عن فلان“ یہ حضرات تو بس ”حدثنا“ پر غش ہیں پھر نہیں دیکھتے کہ اس کے راوی کیسے ہیں اور یہ روایت کیسی ہے؟ جو مخالفین اسلام ان روایات یا ان سادہ لوح مفسرین کے اقوال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عیب لگاتے ہیں۔ وہ عیب دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ بھی نہیں لگتا بلکہ ان راویوں پر۔ نہ ہم بے ہودہ روایات کی صحت کے قائل ہیں اور نہ ان پر جو اعتراضات پڑتے ہیں ان کے جواب کے ذمہ دار ہیں۔ (تفسیر حقانی جلد ششم ص ۹۳)

۸۔ مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۱۳۶۹ھ / ۱۹۴۹ء)

مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ:

”ہم نے جو لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نکاح کی خبر پہلے سے دے دی تھی۔ اس کی روایات فتح الباری سورہ احزاب کی تفسیر میں موجود ہیں۔ باقی جوفوا و ردوا زکار قصے اس مقام پر حاطب اللیل مفسرین و مؤرخین نے درج کر دیئے ہیں ان کی نسبت حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

”لا ينبغي التماغل بها“

(وہ مقام روایتیں اس لائق نہیں ہیں کہ ان کا ذکر بھی زبان پر لایا جائے)

اور ابن کثیر لکھتے ہیں:

”أحببنا أن تضرب عنها صفحاً لعدم صحتها فلا نوردها“

(جن کا نقل کرنا بھی ہم نامناسب جان کر ترک کرتے ہیں کیونکہ ان میں سے ایک

بھی ثابت اور صحیح نہیں)

(تفسیر عثمانی تحت لآیہ۔)

۹۔ مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی (م ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء)

مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

”قرآن عزیز کی ان آیات کا مفہوم اپنے متعلقہ مسائل کے ساتھ اس قدر صاف اور واضح ہے کہ اس میں کسی دوسرے مفہوم کی گنجائش تک نہیں اور نہ کسی قسم کی کوئی پیچیدگی ہی ہے کہ جو معاملہ کے رخ کو کسی دوسری جانب پھیرنے کا موجب ہو۔ مگر حیرت اور حیرت سے زیادہ رنج و ملال ہے ان راویانِ روایت پر جنہوں نے روایت و درایت کی کسوٹی پر گئے بغیر ہی یہودی اسرائیل کی اسلام دشمنی اور رسول دشمنی میں گڑھی ہوئی خرافی داستان کو ان آیات کی تفسیر کے ضمن میں درج کر دیا اور یہ قطعاً محسوس نہ کیا کہ جب ان بے سرو پا روایات کا نہ قرآن کی آیات سے جوڑ لگتا ہے اور نہ ذخیرہ حدیث میں کوئی ایک صحیح روایت بھی اس کی جانب اشارہ کرتی ہے تو پھر ہمارے لئے کس طرح یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ہم ایسی روایات کو بیان یا نقل کر کے ایک جانب دشمنانِ اسلام کے لئے غلط اور پُر از بہتان نکتہ چینی کا سامان مہیا کریں اور دوسری طرف بے علم مسلمانوں کے دینی و دنیائی انتشار رکھا عث بنیں۔

اگر یہ خرافی داستان کتب تفسیر میں نقل نہ ہوتی اور اس کے مفاسد کا اثر موافق و مخالف دونوں جانب پر نہ پڑا ہوتا تو ایک لمحہ کے لئے بھی قلم اس کے لئے آمادہ نہ ہوتا کہ اس ہرزہ سرائی کو روایت کہہ کر پیش کرے۔ مگر اصل حقیقت کو واشگاف کرنے کے بعد محض اس لئے اس داستان کو سپر قلم کیا جا رہا ہے کہ جب کبھی اس پر نگاہ پڑے تو فوراً ذہن میں آجائے کہ یہ ایک خرافی داستان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اور اس لئے دشمنانِ اسلام کو اس کی سند لیما محض تعصب اور اسلام دشمنی پر مبنی ہے نہ کہ حقیقت حال کی طلب و جستجو کے پیش نظر۔

(اس کے بعد حضرت موصوف نے زیر بحث موضوع، باطل، منافی عصمت اور خرافی

روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا کہ: ”أعاذ نألسلہ من ہذہ الخرافات“ ان خرافات سے اللہ کی پناہ! پھر طبری و امثالہ کی اس روایت کو قاضی عیاض، ابن حجر، ابن کثیر، ابن حبان اور سید محمود آلوسی کی تحقیق کی روشنی میں باطل ثابت کر کے آیت کی تفسیر کے ضمن میں جمہور مفسرین کا مدلل موقف بھی پیش کیا ہے۔ موصوف اس بحث کے آخر میں فرماتے ہیں کہ:

غرض اسرائیلی داستانوں میں سے یہ بھی ایک خرافی داستان تھی جس کا پردہ فاش ہونا از بس ضروری تھا، ورنہ تو یہ روایت خرد و عقل کے نزدیک یوں بھی ناقابل اعتماد اور لغو ہے کہ زینبؓ جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور بچپن سے جوانی تک مسلسل آپ کے سامنے رہیں اور شادی کے بعد بھی آپ سے پردہ نہیں کرتی تھیں تو اس واقعہ کے دن کون (سی) خاص بات تھی کہ زینبؓ آپ کی نگاہ میں اجنبی بن کر نظر آنے لگیں اور آپ نے اخلاقی کریمانہ کے خلاف دل و زبان کی مطابقت بھی چھوڑ دی۔

اگر قرآن کی آیت کا یہ مطلب لے لیا جائے تو کیا پھر ایک لمحہ کے لئے بھی قرآن کو یہ حق ہے کہ ذات اقدس کو ایک نبی، رسول، اولوالعزم پیغمبر کی حیثیت میں پیش کر سکے۔

”سبحنک ہذا بہتان عظیم“

(نقص القرآن جلد چہارم ص ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۸۔ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی جنوری ۱۹۷۷ء)

۱۰۔ مولانا محمد ادریس کاندہلوی (۱۹۷۷ء)

مولانا محمد ادریس کاندہلوی فرماتے ہیں:

... حضرت نہیبؑ کے نکاح کا قصہ محققین کے نزدیک اسی طرح ہے جس طرح ہم نے نقل کیا اور مخالفین اسلام اور بے دینوں نے جو یہ مشہور کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر حضرت نہیبؑ پر پڑ گئی اور آپ کا دل ان کی طرف مائل ہو گیا اور یہ فرمایا: ”سبحان اللہ مقلب القلوب“ اور ”وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ“ سے دل میں نہیبؑ کی محبت کا چھپانا مراد ہے۔ سو یہ قصہ منافقوں کا کذب اور افتراء ہے۔ اہل ایمان کو ہرگز ہرگز اس پر یقین نہ کرنا چاہئے۔ یہ قصہ ملاحدہ اور زنا و دہ کے منقریات اور منقرعات میں سے ہے جس کی کوئی سند نہیں۔ جمہور مفسرین نے اس قصہ کا موضوع اور کذب و افتراء ہونا بیان کیا ہے۔

علاوہ ازیں کہ یہ قصہ بالکل بے اصل اور بے سند ہے۔ خلاف عقل بھی ہے۔ اس لئے کہ نہیبؑ آپؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ لڑکپن سے آپؐ کے سامنے ہوتی تھیں اور بار بار آپؐ نے ان کو دیکھا تھا۔ آپؐ سے کوئی پردہ نہ تھا اور نہ پردہ کا حکم اب تک مازل ہوا تھا اور حضرت نہیبؑ شادی کے بعد بھی آپؐ سے پردہ نہیں کرتی تھیں اور آپؐ کے سامنے آتی تھیں تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت نہیبؑ کو زیدؑ سے نکاح کے بعد پہلی بار دیکھا تھا اور اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اگر آپؐ کو ان کا حسن و جمال پسند تھا تو پہلے ہی زیدؑ سے کیوں نکاح کرنے دیا جس پر خود نہیبؑ اور ان کے ورثاء اور اولیاء بمشکل راضی ہوئے۔ آپؐ نے خود ہی کیوں نہ ان سے نکاح کر لیا۔ ان کے اعزاء اور اقارب آپؐ سے نکاح کو بڑی خوشی کے ساتھ منظور کرتے۔۔۔

نیز عقل اور نقل سے یہ امر قطعی طور پر ثابت ہے کہ اللہ کا نبی معصوم ہوتا ہے اس کی بصر اور نظر طاہر اور مطہر اور پاک اور منزہ ہوتی ہے۔ فتح مکہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند

آڈیوں کا خون بہانا مباح فرمایا اور کہا کہ اگر یہ لوگ غلاف کعبہ کو بھی پکڑیں تو ان کو نہ چھوڑنا اور قتل کر ڈالنا، ان ہی لوگوں میں سے ایک عبداللہ بن سعد بن ابی سرح بھی تھے۔ حضرت عثمانؓ ان کا ہاتھ پکڑ کر حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر آئے اور بار بار عرض کیا کہ آپ ان سے بیعت لے لیں یعنی ان کا قصور معاف کر دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ آخر بڑے اصرار اور الحاج کے بعد ان کی بیعت قبول کر لی۔ پھر مجمع کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: میں اس لئے خاموش رہا کہ تم میں سے کوئی شخص اٹھ کر عبداللہ کی گردن مار دے۔ کسی انصاری نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے آنکھ سے اشارہ کیوں نہ کر دیا؟

آپؐ نے فرمایا: ”مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ خَائِنَةٌ الْأَعْيُنُ“ یعنی کسی پیغمبر کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اس کی آنکھ سے کوئی خیانت سرزد ہو۔ کما قال تعالیٰ: ”يَسْلُمُ خَائِنَةٌ الْأَعْيُنُ وَمَا تُخْفِي الصُّلُوفُ“ (المؤمن ۱۹)

معلوم ہوا کہ نبی کی آنکھ خیانت سے پاک اور منزہ ہوتی ہے۔ جس طرح اللہ کا نبی معصوم ہوتا ہے، اسی طرح اس کی آنکھ بھی معصوم ہوتی ہے۔ نیز: ”قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّونَ الْأَبْصَارَ لَهُمْ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ ”غضض بصر“ یعنی نامشروع چیز کے دیکھنے سے نگاہ کو نیچی رکھنا ایمان کے مقتضیات میں سے ہے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو اول المؤمنین ہیں۔ جس طرح تمام عالم کا ایمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کا ایک ادنیٰ ساکس اور پرتو ہے، اسی طرح تمام عالم کی نگاہوں کی عفت اور حیا اسی ذات قدسی صفات کی عصمت مآب اور نزہت جناب کی نزاہت نظر اور طہارت بصر کا ایک ادنیٰ ساکس اور پرتو ہے۔

نیز آپؐ کا نفس قدسی صفات اور ملکی سمات تھا، ہوائے نفسانی سے پاک اور منزہ تھا اور آپؐ کا ہمزاد یعنی شیطان جو ہر شخص کے ہمارا رہتا ہے وہ آپؐ کا مسخر اور منقاد اور جبراً قہراً مسلمان یعنی آپؐ کا مطیع و فرمانبردار بن چکا تھا۔ سوائے خیر کے کسی جانب اس کو میلان کی قدرت ہی نہ رہی تھی۔۔۔۔۔ ہمارے اس بیان سے یہ امر بخوبی واضح ہو گیا کہ بد باطنوں کا یہ کہنا کہ ”وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ“ سے نہیبؑ کی محبت کا دل میں چھپانا مراد ہے بالکل غلط ہے اور سرتاپا دروغ و بے فروغ ہے۔۔۔ (سیرت المصطفیٰ جلد سوم ص ۱۸۷-۱۸۸ تحت ”۱۴ المؤمنین نہیب بنت جحش“)

۱۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی (م ۱۳۹۸ھ / ۱۹۷۷ء)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

”یہاں بعض اہل تفسیر کے قلم کو لغزش ہو گئی ہے اور بعض ایسے قصے درج کر دیئے ہیں جو ایک طرف تو عقلاً بے سند ہیں اور دوسری طرف عقلاً بے سرو پا اور شان رسالت کے منافی۔ یعنی ناقابل قبول نہروایتاً نہ درایتاً۔ محققین مفسرین نے اسی لئے ایسے قصوں کی بلا نقل کئے بھی تردید و تکذیب کر دی ہے۔۔۔ (تفسیر ماجدی ص ۸۴۹ تحت الآیۃ)

۱۲۔ شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خانؒ (م ۱۹۸۰ء)

شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خانؒ لکھتے ہیں کہ:

”وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ...“ اس کے تحت بعض تساؤل اور غیر محقق مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے دل میں حضرت زینبؓ کی محبت تھی لیکن بظاہر آپؐ زید سے کہتے اسے مت طلاق دو۔

لیکن یہ سراسر غلط اور باطل ہے اور حضور علیہ السلام کی شان کے منافی ہے۔ اس لئے یہاں آپؐ جو کچھ دل میں چھپا رہے تھے اس سے مراد وہی ہے جسے اللہ نے ساتھ ہی ”وَتُخْفِي النَّاسَ“ سے ظاہر فرمادیا۔ یعنی آپؐ دل میں منافقین کے اعتراض اور پروپیگنڈے سے ڈر رہے ہیں“ (تفسیر جواہر القرآن جلد سوم ص ۹۴۰)

۱۳۔ پیرسید محمد کرم شاہ ازہری (۱۳۱۸ھ/۱۹۹۸ء)

پیرسید محمد کرم شاہ ازہری فرماتے ہیں کہ:

بعض غلط اور بالکل باطل روایات کا سہارا لے کر یہ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت زہنبؑ کا نکاح زیدؑ سے ہو گیا تو ایک روز اچانک حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر تشریف لے گئے وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ حضرت زہنبؑ بے دھیانی کے عالم میں بیٹھی تھیں اچانک جب ان پر نظر پڑی تو حضور ان پر فریفتہ ہو گئے اور یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے: ”سبحان اللہ مقلب القلوب“ پاک ہے دلوں کو بدلنے والا۔ یہ آواز حضرت زہنبؑ نے سن لی۔

زیدؑ نے ساری بات کہہ سنائی۔ حضرت زیدؑ نے یوں ہی مناسب سمجھا کہ وہ اپنی زوجہ کو طلاق دے دیں تاکہ حضور ان سے نکاح کر سکیں۔ انہوں نے حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ حضور نے زبان سے تو یہ فرمایا کہ زید اپنی زوجہ کو طلاق نہ دے اور اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈر۔ لیکن حضور کی دلی خواہش یہی تھی کہ زید طلاق دیدے تو حضور ان سے نکاح کریں۔ محض ظاہر داری کے طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں طلاق دینے سے منع فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات پر عتاب فرمایا اور کہا کہ تم زبان سے کچھ کہہ رہے ہو اور دل میں کچھ چھپائے ہو۔ میں تمہارے دل کے پوشیدہ رازوں کو ظاہر کر دوں گا۔ چنانچہ ان بد باطنوں نے اس آیت کے ان جملوں:

”اَفْتَسِلْكَ عَلٰیكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ“

کا یہی معنی لیا ہے اور اپنی جھٹ باطنی کے باعث بارگاہ رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام میں گستاخی کی جرأت کی۔

دل ہرگز برداشت نہیں کرتا کہ ان کی اس یا وہ کوئی کو لکھنے کی جرأت کرے لیکن جب

تک اسے لکھا نہ جاتا اس کا رد ممکن نہ تھا۔ میں آپ کو ایک عقیدت مند کی حیثیت سے نہیں ایک حقیقت پسند کی حیثیت سے ان کی اس ہرزہ سرائی میں غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ صداقت خود بخود نکھر کر سامنے آ جائے گی۔

جب حقیقت حال یہ ہے تو کوئی غیرت مند اور حقیقت پسند شخص اس داستان سراپا ہدیان کو قبول نہیں کر سکتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب حضرت زہنبؑ کنواری تھیں اور حضور کے حرم کی زینت بننے کو اپنے لئے اور اپنے کنبہ کے لئے باعثِ مد عزت محسوس کرتی تھیں اس وقت تو حضور کے دل میں کوئی کشش پیدا نہ ہوئی اور جب ایک سال سے زائد عرصہ آپ کے آ زاد کردہ غلام کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کر چکیں تو اچانک یہ صورت پیدا ہو گئی جو ان عقل کے اندھوں کو نظر آنے لگی۔“ (ضیاء القرآن جلد چہارم ۶۱-۶۲)

۱۴۔ شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ:

”اللہ تعالیٰ نے زید کے مشورہ (طلاق) سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ زید کے طلاق دینے کے بعد آپ کو سیدہ زینبؓ سے نکاح کرنا ہوگا تا کہ رسم تنہیت کا خاتمہ ہو۔ آپ مبنائین کے طعن سے ڈرتے تھے کہ آپؐ نے تنہیتی کی مطلقہ سے نکاح کر لیا ہے لہذا جب حضرت زید نے طلاق دینے کے بارے میں مشورہ کیا تو ”آپؐ نے یہ سوچا ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حتمی حکم آ جائے گا اس وقت تو سر تسلیم خم کرنا ہی ہوگا لیکن سر دست یہی مشورہ دینا چاہئے کہ طلاق سے بچو اور اللہ تعالیٰ سے ڈر کر ایک دوسرے کے حقوق ادا کرو۔ اور یہ بات ظاہر نہیں فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ کسی وقت زید طلاق دیں گے پھر وہ آپؐ کے نکاح میں آئے گی۔“

بعض دشمنان اسلام نے کچھ وہابی تباہی روايتوں کی بناء پر اس کا جو مطلب نکالا ہے وہ سراسر غلط ہے اور جو انتہائی کمزور روایتیں اس سلسلے میں پیش کی گئی ہیں وہ قطعی طور پر غیر معقول اور ناقابل توجہ ہیں۔“ (آسان ترجمہ قرآن۔ تشریحات کے ساتھ جلد سوم ص ۱۳۰۰)

قصہ زینبؓ: خلاصہ بحث

گذشتہ تفصیل سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ محقق مفسرین و علماء اور اسلاف نے قصہ زینبؓ سے متعلق امام طبری و امثالہ کی منقولہ روایات کو وہابی، کذب و افتراء، زنا و قدح و ملاحظہ، دشمنان اسلام اور یہود و نصاریٰ کی وضع کردہ نیز انہیں عقیدہ عصمت کے سراسر منافی اور شان نبوت کی واضح طور پر تنقیص قرار دیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس قصے کو نقل کئے بغیر اسے لغو، باطل اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تنقیص و گستاخی قرار دیا ہے جبکہ بعض نے نقل کرنے کے معالجہ لکھا ہے کہ: ”اعاذ نا الہ من ہذہ الخرافات“ سخت حیرت ہے کہ ان مسلمہ حقائق کے بالکل برعکس روایات اسلام کے فاضل کالم نگار مولانا اسماعیل ربیعان نے امام طبری و امثالہ اور ان کی منقولہ کذب و افتراء سے بھرپور اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تنقیص پر مبنی روایات کے متعلق یہ لکھ دیا کہ:

واقعہ میں من و عن نقل کر چکا ہوں۔ آپؐ نے پڑھ لیا ہے۔ اس میں کون سی بات ایسی ہے جسے بے ہودہ اور گستاخانہ کہا جائے اور طبری پر توہین رسالت کا الزام عائد کیا جائے۔ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں حضرت زینبؓ کی خوبصورتی آگئی تو یہ کوئی ناممکن بات نہیں کیونکہ اچھی چیز کا اچھا لگنا ایک فطری بات ہے، ایک متاثر کن شخصیت سے متاثر ہونا کوئی انتہائی بات نہیں۔ تاریخ طبری کی وادی والی روایت کو بھی پیش نظر رکھیں اور انصاف سے بتائیں کہ ان میں کون سی بات گستاخی والی ہے، اگر قصہ زینبؓ سے متعلق طبری کی منقولہ روایت کو منافی عصمت کہا جائے تو پھر اس آیت ”وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهَا“ کا بھی انکار کرنا پڑے گا، اگر آیت میں کوئی تاویل ہو سکتی ہے تو وہی اس روایت میں بھی مانی جاسکتی ہے، اگر قرآن مجید کی بات سچ ہے تو جو کچھ روایت میں نقل ہوا وہ بھی نہ محال ہے نہ ہی

عصمتِ انبیاء کے منافی، قصہ زینبؓ کے ناقل علماء کو گستاخ یا جعل ساز کہنا، یہ براہ راست دوسروں کی نیت اور ایمان پر حملہ ہے اور اسلاف اس سے بہت احتیاط کرتے تھے، امام طبری و امثالہ کی منقولہ روایت ہمارا علمی ورثہ ہے۔ مستشرقین اور متکرمین حدیث کے ان قصوں پر اعتراض و اشکال پیش کرنے سے ہم ان روایات کو اپنے ”علمی ورثے“ سے خارج نہیں کر سکتے۔ قریبی دور کے مامور محقق، مفسر، فقیہ و مفسر علامہ آلوسی نے اپنی شاہکار تفسیر ”روح المعانی“ میں اس واقعے کو ذکر کر کے کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسا قصہ نقل کرنے سے احتراز ضروری ہے لیکن اگر یہ قصہ درست ہو تو اسے قلبی میلان پر محمول کیا جائے گا جو انسان کے بس میں نہیں۔ (روزنامہ اسلام ۱۰ اگست ۲۰۱۵ء ملخصاً)

قارئین کرام! زیر بحث عنوان کے تحت مفسرین کرام کے منقولہ اقوال اور فاضل کالم نگار کے مذکورہ دعوے کا تقابل کر کے خود ہی حقیقت معلوم کر لیں کہ اگر امام طبری و امثالہ کی منقولہ روایت میں کوئی بے ہودگی اور گستاخی نہ ہوتی یا یہ روایت منافی عصمت نہ ہوتی تو مفسرین کرام یہ روایت نقل کرنے کے بعد یہ کیوں لکھتے کہ:

”اعاذنا اللہ من هذه الخرافات“

جس زوردار انداز سے موصوف نے مؤخر الذکر قول کی نسبت علامہ آلوسی کی طرف کی ہے اس کی وضاحت پیچھے گزر چکی ہے کہ یہ علامہ آلوسی کا اپنا قول ہی نہیں ہے بلکہ انہوں نے اسے ”شرح مواقف“ کے حوالہ سے نقل کیا ہے جبکہ ان کا اپنا فیصلہ بھی اسی مقام پر واضح کر دیا گیا ہے۔ مگر معلوم نہیں کہ موصوف نے اس مقام پر اسے نقل کرنا کیوں مناسب نہیں سمجھا؟

علامہ آلوسی کی بحوالہ ”شرح مواقف“ اصل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

”ان هذه القصة مما يجب صيانة النبي صلى الله عليه وسلم عن مثله فان صحت

فمیل القلب غیر مقلود مع ما فيه من الابتلاء لها.....“ (روح المعانی جز ۲۴ ص ۲۵)

اس طرح کے قصوں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنزیہ و صیانت واجب ہے۔ اگر

بالفرض اس قصے سے متعلق روایات کو صحیح قرار دیا جائے تو دل کا کسی کی طرف مائل ہو جانا خود اس کے اپنے اختیار میں نہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ان دونوں (یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت زینبؓ) کی آزمائش بھی ہے۔

بہر حال روزنامہ اسلام کے فاضل کالم نگار یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر اس قصہ کو صحیح بھی سمجھ لیا جائے تو اس سے کیا فرق پڑے گا زیادہ سے زیادہ یہی بات ثابت ہوگی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دل حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی طرف مائل ہو گیا تھا تو اس میں غلط یا حیرانگی کی کیا بات ہے کیونکہ قلبی میلان ایک بے اختیار جذبہ ہے جو انسان کے اپنے بس میں نہیں ہوتا۔

پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت زینبؓ کی طرف ”قلبی میلان“ (جسے خود حضرت زینبؓ نے بھی آپ کے الفاظ ”سبحان الله العظيم، سبحان الله مصرف القلوب“ سے محسوس کر لیا تھا بلکہ حضرت زیدؓ نے بھی یہی مفہوم مراد لیا تھا جس کا اظہار انہوں نے اس واقعہ کے فوراً بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کر دیا تھا) سے ان دونوں کا امتحان و ابتلاء بھی مقصود تھا۔ العیاذ باللہ

لہذا موصوف کا یہ کہنا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں حضرت زینبؓ کی محبت کے آجانے کو ”قلبی میلان“ پر محمول کر لیا جائے (جو انسان کے بس میں نہیں) تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا یقیناً یہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان تراشی کے زمرے میں آئے گا کیونکہ مولانا اسماعیل ریحان یا علامہ آلوسی یا صاحب شرح مواقف کے پاس اس بات کی کیا دلیل ہے کہ آپ کا دل حضرت زینبؓ کی طرف مائل ہو گیا تھا؟ انا للہ وانا الیہ راجعون

اللہ تعالیٰ ہمیں عقیدہ عصمتِ انبیاء پر قائم رکھے اور انبیاء کرام علیہم السلام اور حضرات صحابہ عظام رضی اللہ عنہم کے ناموس کا تحفظ اور دفاع کرنے کی کامل توفیق عطاء فرمائے۔ آمین یا الہ العالمین